شہید

ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات

اور پاکستان پیپلز پارٹی

اسلم گورداسپوری

(حصہ اول)

حصہ اول

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات

اور

پاکستان پیپلز پارٹی

اسلم گورداسپوری

فکشن ہاؤس

18- مزنگ روڈ لاہور

E-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

Ph:042-7249218, 7237430

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	:	شہید ذوالفقار علی بھٹو کی داستانِ حیات اور پاکستان پیپلز پارٹی (حصہ اوّل)
مصنف	:	اسلم گورداسپوری
پبلشرز	:	فکشن ہاؤس 18-مزنگ روڈ، لاہور فون:7249218-7237430
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق	:	عباس
اشاعت	:	2010ء
قیمت	:	-/500روپے

ہیڈ آفس : 18-مزنگ روڈ لاہور، پاکستان

برانچ لاہور
124- ٹیمپل روڈ لاہور
فون:042-7321040

سب آفس حیدرآباد
52,53 رابعہ اسکوائر حیدر چوک گاڑی کھاتہ حیدرآباد
فون:022-2780608

www.bhutto.org

انتساب

پاکستان کے معروف تاریخ دان

ڈاکٹر مبارک علی

کے نام

جن کے ساتھ میں بہت محبت کرتا ہوں!

اسلم گورداسپوری ــــــــــــــــــــ

www.bhutto.org

www.bhutto.org

فہرست

حرفِ آغاز	17
وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ملاقات	25
بھٹو صاحب کی لاہور ریلوے اسٹیشن پر آمد	30
باغبان پورہ کا پہلا جلسہ	37
پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور پاکستان کے سیاستدان	43
دانشوروں اور سیاسی لیڈروں کے ساتھ ملاقاتیں	48
امین مغل کے ساتھ ملاقات	54
خواجہ رفیق کے ساتھ ملاقات	56
دو بزرگوں کی ایک دلچسپ ملاقات	58
لندن میں بھٹو صاحب کی تقریر	61
حمید نظامی ڈے منانے کا اعلان	62
بھٹو صاحب کا حوصلہ شکن بیان	63
طالب علم لیڈر راشد بٹ کی اسلامیہ کالج کی دعوت	65
ایم۔ایس۔ایف کی طرف سے فلیٹیز ہوٹل میں بھٹو صاحب کی چائے پارٹی	68
نظم ''فریاد''	72
میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ	75
بھٹو صاحب کی لاہور میں پہلی کارنر میٹنگ اور لطیف بٹ کی ہنگامہ آرائی	75
بھٹو صاحب کا لائل پور جانا	77

www.bhutto.org

یہ جرمنی کی غلطی ہے 80

موزاریسٹورنٹ ریگل چوک لاہور 84

ڈیش بھگتی کے معنی کیا ہیں 85

میرا دیش بھگتی کا فیصلہ 89

اس وقت کی پاکستان کی قومی سیاست کا منظر نامہ 91

لارڈز ہوٹل کا تاریخی استقبالیہ 92

بابا ظہیر کاشمیری کے ساتھ بھٹو صاحب کی ملاقات 98

آغا شورش کی آمد 101

نوید ملک بھٹو صاحب کا بریف کیس لے کر غائب ہو گیا 101

خورشید حسن میر کا راولپنڈی کا پہلا استقبالیہ 104

حیات محمد خان شیر پاؤ 108

مسٹر جے۔اے۔رحیم 110

گول باغ لاہور کا جلسہ عام 113

تاریخ کی مسخیات(Distoration of the History) 122

وہ رکشے والا جعلی تھا 123

سی۔آر۔اسلم سے ملاقات 127

نئی سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان 128

بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید کے ساتھ میری پہلی ملاقات 128

میری نظم "منشور" اور بابا ظہیر کاشمیری 132

شیخ رشید کے بارے میں غلط افواہ 133

پاکستان پیپلز پارٹی کا یوم تاسیس 135

خورشید حسن میر بطور جنرل سیکرٹری 139

نظم "منشور" 141

بھٹو صاحب کو پارٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا 143

www.bhutto.org

شیخ سرور اقبال کے منہ پر آفتاب ربانی کا تھپڑ	145
سوشلزم کا پہلا پتھر نبی پاکؐ نے رکھا تھا	150
پارٹی کا بنیادی مسودہ	151
مسٹر جے۔اے۔رحیم نے پارٹی کا جھنڈا پیش کیا	153
عرش منارے تے بانگاں ملیاں مکے پے گیا شور، میری بُکل دے وچ چور	154
پاکستان پیپلز پارٹی کا بنیادی منشور	155
پاکستان کا آئین	156
خارجہ پالیسی	157
صنعت کو قومی تحویل میں لینا	157
اقتصادی اقدامات	158
زرعی اصلاحات	158
عوام کے حقوق	159
تعلیم اور ثقافت	160
قومی صحت	160
پارٹی کا موقف	161
صرف چیئرمین بھٹو کی ذات ہی لیڈر تھی	161
کہیں سے حوصلہ افزا امید نہ تھی	164
چیئرمین بھٹو کے سیاسی معرکوں کا آغاز	165
بھائی بھائی کے سامنے آ گئے تھے	167
چیئرمین بھٹو کا پہلا معرکہ	168
چیئرمین بھٹو کا دوسرا معرکہ	170
ملتان کے جلسے کی حکمت عملی	172
چیئرمین بھٹو کا ملتان کو فتح کرنے کا معرکہ	174
چیئرمین بھٹو کا چوتھا معرکہ	178

www.bhutto.org

شہر سومنات (لاہور) کی فتح کا اعلان 182
گورنر مغربی پاکستان جنرل موسیٰ خان کی بھٹو صاحب کو دھمکی 188
کوئلوں کے ساتھ دیواروں پر لکھنے کی مہم 191
پشاور کا پہلا کنونشن اور میری نظم 191
کلیم آمر کے نام 192
حیات محمد خان شیرپاؤ اور صوبہ سرحد کی سیاست 197
چیئرمین بھٹو مجھ سے ناراض ہو گئے 201
چھ ماہ کے لئے میری لاہور بدری اور زبان بندی کا حکم 202
چھ ماہ کی زبان بندی پر 205
ایک بھولی بھالی ماں کی دعا ''ایوب خان تیرے بچے جیتے رہیں'' 206
مرغابی کا شکار اور داتا جیمو کی پھبتی 208
بطخوں کا لطیفہ 208
''مجھے رہا کر دیا گیا'' بلکہ آزاد کر دیا گیا 210
رہائی کے بعد چیئرمین بھٹو سے ملاقات 212
شیخ رشید کی کسان ریلی 212
میری رہائی کی خوشی میں استقبالیہ 214
سندھ کنونشن 214
حیدرآباد کنونشن 216
اسلام کسی خطرے میں نہیں 217
چیئرمین بھٹو کی تقریر 221
بھٹو صاحب کا لاڑکانہ 224
محترم حنیف رامے اور ہفت روزہ نصرت کی اشاعت 225
پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کے دفتر کا قیام 227
سرحد کا دوسرا دورہ 229

www.bhutto.org

نظم ''بغاوت'' 231

پشاور کا جلسہ عام 234

ڈیرہ اسماعیل خان کا جلسہ اور پنڈی میں طالب علم حمید کا قتل 237

آہ مرحوم حق نواز گنڈاپوری 237

طالب علم عبدالحمید شہید 239

چیئرمین بھٹو کی لاہور آمد 240

چیئرمین بھٹو کو اپنی گرفتاری کا علم ہو چکا تھا 240

12 نومبر 1968ء کو بھٹو صاحب کو گرفتار کر لیا گیا 244

حکومت نے شیخ رشید اور ملک حامد سرفراز کو کیوں گرفتار نہیں کیا 245

لاہور میں ہمارا پہلا جلوس 247

پاکستان پیپلز پارٹی میں اختلافات کا آغاز 248

سرگودھا کا احتجاجی جلوس 250

آگ اور خون 251

افتخار احمد فتنہ کے ساتھ ملاقات 255

چیئرمین بھٹو کو ساہیوال جیل سے لاہور بورسٹل جیل میں منتقل کر دیا گیا 259

مولوی مشتاق نے مقدمے کا آغاز کر دیا 259

ایوب حکومت کو مشرقی پاکستان کا خیال ہی نہیں تھا 261

چیئرمین بھٹو پر غداری کا مقدمہ بنا دیا گیا 262

حکومت کی فردِ جرم 263

یہ حکمران خزاں کے موسم میں جشن بہار منا رہے ہیں 264

ایئر مارشل اصغر خان کی سیاست میں آمد 265

چیئرمین بھٹو کی سیاسی حکمتِ عملی 269

ملک اسلم حیات 271

جنرل ایوب خان کی حکومت کا پاکستان پیپلز پارٹی کو توڑنے کی سازش 273

www.bhutto.org

باغیوں کا میر علی احمد تالپور کو قائمقام چیئرمین بنانے کا مطالبہ	274
ایک سیاسی جماعت کے اندر خرابی پیدا ہونے کی ابتدا	278
قابل احترام بیگم نصرت بھٹو کی سیاست میں آمد	279
ڈاکٹر مبشر حسن کی شامت آ گئی	284
پٹیشن کی تائید میں نظر بند مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا حلفیہ بیان	285
چیئرمین بھٹو کا جیل میں حکومت کو الٹی میٹم	288
چیئرمین بھٹو نے مولوی مشتاق کی عدالت کا بائیکاٹ کر دیا	288
میاں صاحب میں عوام کا کریڈٹ مولوی مشتاق کو نہیں دینا چاہتا	288
جیل سے چیئرمین بھٹو کی لاڑکانہ روانگی	289
اسٹیبلشمنٹ کا ترتیب دیا گیا سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ (DAC)	290
1969ء کا متحدہ محاذ	292
قصہ گول میز کانفرنس	294
چیئرمین بھٹو کی بھوک ہڑتال	295
چیئرمین بھٹو نے گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا	296
ڈیموکریٹک الائنس ایوب خان کی بجائے چیئرمین بھٹو کے خلاف بنایا گیا تھا	298
مشرقی پاکستان کی پیپلز پارٹی میں بغاوت کروا دی گئی	298
چیئرمین بھٹو کی ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ملاقات	300
23-فروری 1969ء کو ڈھاکہ میں انگلش میگزین ہیرالڈ ٹریبون کو بھٹو صاحب کا دیا گیا بیان	302
24-فروری 1969ء کو بھٹو صاحب کا لاہور کا جلوس اور امریکہ مردہ باد کے نعرے	302
گول میز کانفرنس اور بھٹو صاحب کا تاریخی جلوس	305
یہ میرا تو بچی ہے	307
آغا شورش کشمیری کی پیپلز پارٹی کو گالیاں	308
پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی حالتِ زار، ہماری حالت بلال حبشیؓ کی طرح کی ہوتی تھی	310
مجھے قتل کرانے کی سازش	311

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو سے تحریک چھیننے کی خفیہ ایجنسیوں کی سازش	314
بشیر بختیار اور بابا بھاشانی کا اتحاد کرا دیا گیا	316
مولانا بھاشانی کا ماضی کا کردار	318
چیئرمین بھٹو کا مولانا بھاشانی پر اعتراض	319
فوج سیاست دانوں کو ٹریپ کرنے میں کامیاب ہوگئی	323
فوجی جنرل یحییٰ خان کے انتخابات اور ایل۔ ایف۔ او کا قانون	327
اسٹیبلشمنٹ کے سازشی انتخابات	328
چیئرمین بھٹو سے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا مطالبہ	329
پاکستان میں کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں کا اندازِ سیاست	333
درویش شاعر حبیب جالب کے ساتھ مکالمہ	340
چیئرمین بھٹو کا اندازِ سیاست	341
چیئرمین بھٹو اپنے تشخص کے آئینے میں	345
چیئرمین بھٹو کا اپنے ہم عصر سیاست دانوں سے تضاد	348
چیئرمین بھٹو عشقِ جنوں پیشہ تھے	351
دوسری سب سے بڑی خوبی	351
پاکستان پیپلز پارٹی کے چند لیڈروں کا تعارف	352
بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید	353
شاباش شیخ اشفاق	358
شیرِ پنجاب ملک غلام مصطفیٰ کھر	359
ڈاکٹر مبشر حسن صاحب مدظلہ	362
پیپلز پارٹی پر غیر سیاسی لوگوں کا قبضہ	369
دفتر پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب و بہاولپور 4/A مزنگ روڈ لاہور	371
سیاسی جماعت میں سیاسی کارکنوں کا کردار	373
فوجی حکومت کی نمائندگی	376

www.bhutto.org

امان اللہ خان کی دو ماہ کے لئے پارٹی رکنیت معطل کر دی گئی	379
مجھے بھٹو کا ایجنٹ کہنے کا قصہ	380
سیاسی کارکنوں کا المیہ	382
محترم حنیف رامے صاحب	387
پنجاب میں قادیانی جماعت کا پیپلز پارٹی کی حمایت کا اعلان	391
مولانا کوثر نیازی کی پارٹی میں شمولیت	395
میاں محمود علی قصوری کی پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت	399
1970ء کے انتخابات میں فوج کا منصوبہ کیا تھا؟	402
لاہور میں قرآن پاک جلانے کا جعلی واقعہ	403
جماعت اسلامی اور حکومت کی سازش یہ تھی	403
خود میری حماقت ملاحظہ کریں	404
فوج کا اصل منصوبہ خان عبدالقیوم خان کو پاکستان کا طفیلی وزیر اعظم بنانا تھا	404
1970ء کے انتخابات کو چیئرمین بھٹو نے ایک سیاسی اور معاشی انقلاب بنا دیا	406
چیئرمین بھٹو ایک باکمال Anthropologist تھے یعنی ماہر سماجیات تھے	407
چیئرمین بھٹو پر قاتلانہ حملوں کی داستان	409
ریٹائرڈ میجر جنرل اکبر خان کی سادہ بیانی	411
چیئرمین بھٹو کی ذات پر جماعت اسلامی کا دوسرا قاتلانہ حملہ	412
ہم پاکستان کو دوسرا انڈونیشیا بنا دیں گے	412
کامریڈ امان اللہ خان کا بازو توڑ دیا گیا	414
چیئرمین بھٹو کی ذات پر سانگھڑ میں قاتلانہ حملہ	416
سانگھڑ کے حملے پر حکومت اور دائیں بازو کے رجعت پسندوں کا موقف	426
حکومت کی وزارتِ اطلاعات کا موقف	426
آغا شورش کشمیری اور زندگی کے ایڈیٹر کا سانگھڑ کا دورہ	427
چیئرمین بھٹو کی قیادت میں یکم مئی 1970ء کا جلوس	430

www.bhutto.org

31- مئی کا یومِ شوکتِ اسلام	431
یومِ شوکتِ اسلام میں علماء کا مشترکہ فتویٰ	431
ہالہ کانفرنس	432
ایک کھلا سوال	434
معراج محمد خان کا مشن انتخابات کا بائیکاٹ کرانا تھا	434
ہالہ کانفرنس ایک ریفرنڈم تھا	435
کیا انقلابی دشمن کا ایجنٹ ہوتا ہے یا پاگل ہوتا ہے	438
پرچی اور برچھی کی بات	440
لوگو پرچی کو برچھی بنالو — بھٹو	440
بھٹو ڈوکٹرائن (Bhutto Doctrine)	440
عزت مآب مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ مدظلہ آف ہالہ شریف (سندھ)	
سینئر وائس چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی	441
قصہ میرے پارٹی کے مقرر بن جانے کا	446
لوگ انتخاب کو ہی انقلاب تصور کر بیٹھے تھے	449
کوثر نیازی کے ساتھ مناقشت اور ناچاکی کی ابتداء	451
دوسرا ٹاکرا	453
چیئرمین بھٹو کا کمبوڈیا کے حق میں بیان اور امریکی جارحیت کی مذمت	456
1970ء کے انتخابات میں بھٹو مخالف لیڈروں کے بیانات ملاحظہ فرمائیں	457
ہفت روزہ چٹان کی لغو گھٹیا اور شرمناک مخالفت	459
سیاست دانوں کی بدزبانی	459
ہوائی ڈرائیور	459
شاہی فقیر	460
چیئرمین بھٹو کے خلاف کعبے سے فتویٰ	462
ان تمام سیاست دانوں اور فتووں کے برعکس چیئرمین بھٹو کے بیانات	463

www.bhutto.org

اسلام پسندوں کے مقابلے میں چیئرمین بھٹو کے بیانات ملاحظہ کریں	464
پیپلز پارٹی کا انتخابی نشان تلوار تھا	465
الیکشن سے ایک دن پہلے کا بیان ۔ مساوات 1970ء	466
اسلامی سوشلزم	466
1970ء کے انتخابات اور پاکستان پیپلز پارٹی کی فتح	470
حنیف رامے کا ایڈیٹوریل روزنامہ مساوات 17 دسمبر 1970ء ''آج پھر تلوار کا کوندا لپکے''	471
پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا	473
انتخابات میں اصل فتح مشرقی پاکستان کو حاصل ہوئی تھی	473
جنرل پیرزادہ کا کردار	474
پاکستان پیپلز پارٹی کا پنجاب کے اندر اقتدار کی سیاست کا آغاز	475
میری بدقسمتی کا واقعہ	477
پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیمی بدقسمتی کا آغاز	479
1970ء کے انتخابات اور مشرقی پاکستان	481
فوجی حکمران انتقالِ اقتدار کے حق میں نہیں تھے، چھ نکات ایک بہانہ تھے	483
مشرقی پاکستان کے مسئلے میں چیئرمین بھٹو کا کردار	486
چیئرمین بھٹو کا موقف	486
مغربی پاکستان کی صورتحال اور پارٹی دفتر میں اشتہار چھاپنے کا معاملہ	489
جماعت اسلامی فوج کی مسلح ذیلی تنظیم کا کردار ادا کر رہی تھی	491
ہندوستان کے طیارے گنگا کی کہانی	492
ڈاکٹر مبشر حسن اور افتخار فتنہ نے ہائی جیکروں کے ساتھیوں کے جلوس کی قیادت کی	493
طیارے کا اغواء ایک سازش تھی	493
طیارہ اغواء مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ساتھ ہوائی رابطہ ختم کرنا تھا	494
مغربی پاکستان کے شکست خوردہ سیاست دانوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کا دماغ خراب کر دیا تھا	495
چیئرمین بھٹو دیوانگی کی حد تک پاکستان پرست تھے	497

www.bhutto.org

چیئر مین بھٹو کی ٹانگیں توڑنے والی بات اور یادگار کی غلط اصطلاح کی درستی	498
اِدھر تم اُدھر ہم	501
اخبار۔۔۔آزاد	503
جنرل یحییٰ خان نے قومی اسمبلی بلانے کا اعلان کر دیا، لیکن اب شیخ مجیب الرحمٰن نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا	507
نشتر پارک کی تقریر اور مجیب الرحمٰن کا فارمولا	508
مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اقتدار سونپ دیا جائے (بھٹو)	509
چھ نکات چھوڑ دو اور پورے ملک کی جمہوری حکومت کا حق لے لو (بھٹو)	511
مشرقی پاکستان صرف ایک بنگالی قوم پر مشتمل تھا	516
مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا آغاز	518
حفیظ کاردار کا خفیہ دستاویز کا انکشاف	519
دو پاکستان کے اعلان کا فارمولا	520
چیئر مین بھٹو، مجیب الرحمٰن اور جنرل یحییٰ خان کی مشترکہ ملاقات	521
جہانگیر بدر کی چیئر مین بھٹو کو یونیورسٹی میں خطاب کرنے کی دعوت	522
ولی خان اور دولتانہ کا چیئر مین بھٹو کے خلاف بیان	525
میری صاف گوئی کا واقعہ ملاحظہ کریں	526
لاہور پیپلز پارٹی کا دفتر	528
چیئر مین بھٹو پر اسٹیبلشمنٹ کی ایجنسیوں کا الزام	534
خدا کا شکر ہے پاکستان بچ گیا	535
چیئر مین بھٹو کا جنگ سے پہلے راولپنڈی میں جلسہء عام	535
دمادم مست قلندر کا نعرہ	536
راولپنڈی جلسہ میں طارق عزیز کا سفلہ پن	536
سقوطِ ڈھاکہ	538

www.bhutto.org

فوج کے پاس آسان راستہ موجود تھا 540

ہمارے فوجی حکمرانوں نے اپنی اَنا کی خاطر پاکستان دو ٹکڑے کر دیا مگر شیخ مجیب الرحمٰن کو
اقتدار نہ دیا 541

قوم کی ذہنی حالت 542

آج ہم طیش ہیں وحشت ہیں بہ میدانِ وفا 542

www.bhutto.org

786

حرفِ آغاز

پاکستان میں عہدِ حاضر کی سیاسی قیادتوں اور سیاسی جماعتوں کی تاریخ نویسی کا کام بہت کم کیا گیا دیکھنے میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں سیاسی قیادتوں اور سیاسی جماعتوں کو عزت و وقار کا کچھ مقام ہی دیا نہیں جاتا۔ جبکہ دنیا کی کوئی قوم اور دنیا کا کوئی ملک سیاسی قیادتوں اور سیاسی جماعتوں کا بغیر اپنا کوئی قومی تشخص ہی پیدا نہیں کر سکتا۔ پاکستان میں ہمیشہ سیاست دانوں کی اور سیاسی جماعتوں کی کردار کشی کی جاتی ہے ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ اور اگر کوئی قیادت پاکستان میں شہید ذوالفقار علی بھٹو اور شہید بے نظیر بھٹو کی طرح اپنی دانش و حکمت اور اپنی جرأت و ہمت سے اپنا کوئی تشخص پیدا بھی کر لے تو ان کو تختہ دار پر کھینچ کر یا راولپنڈی کی جلسہ گاہ لیاقت باغ میں شہید لیاقت علی خان اور شہید بے نظیر بھٹو کی طرح گولی کا نشانہ بنا کر راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

معاملہ یہ ہے کہ آخر پاکستان میں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ پاکستان میں ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ پاکستان نے جس نظام کی کوکھ سے، جنم لیا تھا وہ ایک کالونیل نظام تھا۔ ہندوستان برطانوی استعمار کی ایک مفتوحہ کالونی تھا۔ اور تقسیم ہندستان بھی برطانوی سامراج کی تقسیم کرو اور حکومت کرو کی ہی پالیسی کا ایک حصہ تھا۔ جس میں ہندوستان تو آزاد ہو کر اپنی آزادی اور خودمختاری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر پاکستان ایسا نہ کر سکا۔ پاکستان برطانوی استعمار سے باہر نکل کر امریکی استعمار کی کالونی بن گیا۔ واضح رہے کہ استعماری اور استحصالی سامراجی قوتوں کو آزاد اور خودمختار ممالک اور اقوام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کو محکوم قوموں کی

اور پسماندہ ممالک کی ضرورت ہوتی ہے کنٹرولڈ ریاستی نظام کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ کنٹرولڈ محکوم ریاستی نظام سیاست دانوں اور سیاسی لوگوں کے ذریعے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جمہوریت کے ذریعوں سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کنٹرولڈ مارشل نظام فوجی آمروں اور مارشل ایڈمنسٹریٹروں سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ استبدادی نظامِ حکومت ''ون مین شو'' ہوتا ہے، اور یہ ون مین شو ہی سامراجی ممالک کے حکمرانوں کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اس کو اپنے مفادات کی تکمیل کے لئے صرف ایک آدمی سے بات کرنی پڑتی ہے اور اس کے معاملات تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں۔ اس کو جمہوری ممالک کی طرح آئین اور قانون کی بندشوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور نہ ہی آزاد جمہوری پارلیمنٹ کے ساتھ اور منتخب قیادت کے ساتھ اپنا سر کھپانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ آجکل پاکستان میں ایک منتخب حکومت کے دور میں امریکنوں کو مختلف حوالوں سے اپنا سر کھپانا پڑ رہا ہے۔ پاکستان جنوبی ایشیاء کے خطے کا امریکی مفادات کے لئے روزِ اول سے ہی ایک اہم ترین ملک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے فوراً بعد پاکستان پر فوجی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا اور فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان کو پاکستان کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور پھر صدرِ پاکستان بنا کر امریکی امداد کا سہارا دیا گیا۔ اور پاکستان پر ایک طرح کا فوجی صدارتی نظام مسلط کر دیا گیا۔ اور پاکستان کے تمام سیاسی معاشی خارجی اور اندرونی حکومتی نظام میں فوج اور بیوروکریسی کو ملوث کر دیا گیا۔ اور پاکستان کے تمام نظامِ حکومت پر فوج کی ظاہری اور خفیہ قوتوں کا قبضہ کرا دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب پاکستان تو کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہے مگر کمبل پاکستان کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔

لہٰذا یہ وہ ماضی کی صورتِ حالات تھی جس صورتِ حالات میں ذوالفقار علی بھٹو نے فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان کے فوجی نظامِ حکومت سے بہ حیثیت وزیر خارجہ بغاوت کر کے بڑی فہم و فراست اور بڑی جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ پاکستان کی قومی سیاست میں قدم رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی قومی سیاسی تاریخ میں وہ پہلے سیاست دان تھے جو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے غیر آئینی اقتدار کے خلاف عوامی قیادت کا علم لے کر اٹھے تھے۔ اور ان کی تشکیل کی گئی پاکستان پیپلز پارٹی باحیثیت ایک قومی سیاسی جماعت کے پاکستان کی وہ واحد سیاسی جماعت تھی۔ جس کا خمیر عوام سے اٹھایا گیا تھا، اور پاکستان پیپلز پارٹی کو یہ شرف

حاصل ہے کہ اس جماعت کی عوامی جدوجہد کا آغاز ہی فوجی آمریت کی لاقانونیت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے سے ہوا تھا۔ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت کا یہ کمال تھا کہ انہوں نے پاکستان میں ایک عوامی سیاسی جماعت بنا کر پاکستان کے عوام کو قومی سیاست میں نہ صرف متحرک کیا بلکہ اس کو قومی سیاست میں بلاواسطہ شریک کر کے پاکستان میں عوامی حکومت بنانے کا تصور پیش کیا۔

چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت اور پاکستان پیپلز پارٹی سے پہلے پاکستان میں کئی ایک قیادتیں اور سیاسی جماعتیں اپنے اپنے سیاسی اور مذہبی رنگ میں موجود تھیں۔ ان قیادتوں اور جماعتوں کی اکثریت غیر فعال اور بے اثر اور بے مقصد بن کر رہ گئی تھیں۔ ان میں کچھ مذہبی جماعتیں اور قیادتیں بھی تھیں جن کا پاکستان کے عوام کی زندگی اور ان کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سراسر رجعت پسند شخصی مذہبی انتہا پسندی کی تنظیمیں تھیں۔ جن کے خیال فکر سے آمریت کے شخصی نظام کو ہی تقویت ملتی تھی۔ ان کا عوام کی جمہوری آزادیوں کے ساتھ کوئی رشتہ اور تعلق نہیں تھا۔ اور یہ مذہبی انتہا پسندی کی شخصی تنظیمیں معاشرے میں تمام استحصالی طبقوں کے مفادات اور استحصال کو مذہب کے نام پر تحفظ فراہم کرتی تھیں۔

پاکستان میں فوجی آمریت کے فاشزم کے نظام سے عوام مایوسی کا شکار ہو چکے تھے۔ لہٰذا فوجی آمریت کے اس فاشزم کی تاریکی کے ماحول میں چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے عوام کی قومی آزادی اور جمہوری اور معاشی آزادی کے شعور کا آفتاب بن کر پاکستان کے مطلع سیاست پر نمودار ہوئے۔ ان کی قیادت کی تابانی میں وہ تمام سیاسی تجلیاں موجود تھیں جو قوموں کی رہنمائی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کو کرشماتی قیادت کا لقب دیا گیا تھا۔ اسی طرح ان کی تخلیق کی گئی پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور و دستور اور فکر و فلسفے میں وہ تمام چیزیں موجود تھیں جو ایک قومی سیاسی جماعت کا لائحہ عمل کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے تو چیئرمین بھٹو کی شخصیت اور ان کے خوبصورت سراپے نے پاکستان کی نوجوان نسل کو سب سے زیادہ انسپائر اور متاثر کیا تھا۔

وہ بلاشبہ پاکستان کی نوجوان نسل کی قیادت کے بے لاگ قائد تھے اس کے بعد وہ اپنی عوامی فکر و عمل میں پاکستان کے عوام الناس کے ایک بیباک قائد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی عوامی

www.bhutto.org

مقبولیت کا ہی یہ ثبوت تھا کہ پاکستان کے دانش وروں نے ان کو قائد عوام کا خطاب دیا تھا۔اس کے علاوہ ان کی بنائی ہوئی پاکستان پیپلز پارٹی ان تمام سیاسی اور نظریاتی فکر کے اوزاروں سے لیس تھی جس کا کوئی دوسری جماعت مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کی قومی زندگی کے تمام شعبہ ہائے عوام کی ہردل عزیز پارٹی تھی۔اس میں جاگیردار بھی شامل تھے۔کچھ نیم قسم کے سرمایہ دار بھی شامل تھے مگر اس جماعت میں اکثریت غریب پسے ہوئے ڈاؤن ٹراڈن کی تھی۔محنت کش عوام کی تھی مزدوروں کسانوں کی تھی جو صدیوں سے ذہنی اور سیاسی اور معاشی غلامی کی زندگی کا شکار چلے آرہے تھے۔ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی بنائی ہوئی پیپلز پارٹی کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کے عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔لوگوں کو ان کے حقوق کا شعور دینا تھا۔لوگوں کے منہ میں زبان دینا تھا۔اس کے علاوہ پاکستان بھر کے تمام ترقی پسند پرولتاریہ دانش ور شاعر ادیب قلم کار مزدور اور کسان ٹریڈ یونینز کے رہنماء چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاست کا ہراول دستہ بن گئے تھے۔

شہید بھٹو کے عہد کی سیاست ایک ترقی پسند سیاست تھی۔سوشلزم اس وقت پوری دنیا کے عوام کا مقصدِ حیات بنا ہوا تھا۔شہید ذوالفقار علی بھٹو ایک بہت بڑے قومی اور بین الاقوامی سیاست اور فکر و فلسفے کے نہ صرف مدبر تھے وہ ایک بہت بڑے عوامی نباض تھے۔انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور ان چار اصولوں پر مرتب کر کے پاکستان پیپلز پارٹی کو دنیا کی تمام سوشلسٹ پارٹیوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔

1- اسلام ہمارا دین ہے۔
2- جمہوری ہماری سیاست ہے۔
3- سوشلزم ہماری معیشت ہے۔
4- طاقت کا سرچشمہ عوام ہے۔

ان چار آسان ترین اصولوں کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کو عوام کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوسکی۔اوپر سے ان کی جناتی قسم کی مہارت کی گرم رفتاری اور شعلہ گفتاری پاکستان تو کیا پوری دنیا کے عوام کے لئے مشعل راہ بن گئی۔

پاکستان کے غریب محنت کش عوام نے پاکستان پیپلز پارٹی کی عوامی سیاست اور عوامی منشور کو

www.bhutto.org

اس قدر پسند کیا کہ 1970ء کے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی۔ اس انتخابی کامیابی میں ان کی جدید ترقی پسند عوامی قیادت کے فعال ہونے کا بڑا عمل دخل تھا۔ ان کی محنت کا بڑا حصہ تھا۔ گویا چیئرمین بھٹو نے اپنی قیادت سے علامہ اقبال کے اس شعر کو عملی طور پر پورا کر کے دیکھا دیا تھا۔

چیئرمین بھٹو نے عملی طور پر ممولوں کو قومی انتخابات میں شہبازوں سے لڑا دیا تھا انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے اللہ رکھوں اور اللہ دتوں سے، دولتانوں، ٹوانوں، تمنوں اور نونوں کی ضمانتیں ضبط کروادی تھیں۔ ان کی عوامی تحریک نے تمام ظالم ایک طرف کر دیئے تھے اور تمام مظلوم ایک جانب کھڑے کر دیئے تھے۔ اس طریقے سے چیئرمین بھٹو نے پاکستان میں ایک نئی پرولتاریہ قومی اور عوامی قیادت کو جنم دیا تھا۔

انہوں نے پاکستان کے غریبوں کو جگا کر پاکستان میں کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیئے تھے۔ اور ان کی جدید سوشلسٹ ترقی پسند سیاست نے پاکستان کی قدیم سیاست کے تمام نقشِ کہن مٹا کر رکھ دیئے تھے۔ میری اس کتاب کے اس حصہ اوّل میں چیئرمین بھٹو کی قیادت کے آغاز اور پاکستان پیپلز پارٹی کے 1968ء میں وجود میں آنے سے لے کر 1970ء کے انتخاب کی تمام سیاسی جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے، اور مشرقی پاکستان کے سقوط پر ختم کیا گیا ہے۔ چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار کی کہانی کتاب کے حصہ دوم میں بیان کی گئی ہے۔ آخر میں چند باتیں حرفِ افسوس کے عنوان سے عرض کرنا چاہتا ہوں، ملاحظہ کیجئے۔

حرفِ افسوس

خواتین و حضرات میں نے پاکستان کی سیاسی سماجی اور معاشی قومی تاریخ کو ایک غیر حاضر مورخ کی طرح تحریر نہیں کیا۔ میں پاکستان کی اس قومی تاریخ کا ایک سیاسی کارکن اور ادیب ہونے کی حیثیت سے خود ایک حصہ تھا۔ میں نے اس کتاب کو تحریر کرنے سے پہلے خود پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ بنانے میں عملی طور پر ایک کردار ادا کیا تھا۔ میں پاکستان پیپلز پارٹی کو شہید ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت کو قومی امانت خیال کرتا ہوں۔ پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ اور بین الاقوامی سامراج شہید بھٹو کی قیادت اور شہید بی بی کی قیادت کو اور پاکستان پیپلز پارٹی کو

www.bhutto.org

تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ بھٹو خاندان کے ساتھ جو کچھ کیا گیا ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔ اس کا بچہ بچہ مار دیا گیا ہے۔ اسی طرح پاکستان پیپلز پارٹی کو نیست و نابود کرنے کی روزِ اول سے سازش اور کوششیں جاری ہیں۔ لہٰذا میں نے اپنی عقل و فکر کے مطابق بھٹو خاندان کی قیادت اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ورکروں اور پاکستان کے عوام کی جدوجہد کو کتابی شکل دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ مگر مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ ''شہید بی بی کی داستانِ حیات اور میری جدوجہد'' والی میری اس کتاب سے پہلی تصنیف جو پاکستان پیپلز پارٹی کی زمانہء حال کی جدوجہد تھی۔ جس کا اختتام شہید بی بی کی شہادت پر ہوا تھا۔ اس کو پاکستان پیپلز پارٹی اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت اور قیادت کی طرف سے کوئی پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ میرے لئے پارٹی کے لیڈران کا یہ رویہ انتہائی حوصلہ شکن اور اذیت ناک تھا۔ میری یہ کتاب صرف شہید بی بی کی داستانِ حیات ہی نہیں تھی بلکہ یہ کتاب پارٹی کے ان تمام قائدین اور کارکنوں کی جدوجہد کی کہانی تھی جنہوں نے شہید بی بی کی قیادت میں بے مثال جدوجہد کی تھی۔ افسوس کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار لوگ اپنی ہی قیادت اور اپنی ہی جدوجہد کی تاریخ کی خونچکاں کہانی کو پڑھنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ میرے نزدیک ایک نظریاتی سیاسی پارٹی کا یہ طرزِ عمل ہرگز ہرگز قابلِ تحسین خیال نہیں کیا جا سکتا۔

ماضی کی اس صورتِ حال کے میرے ذاتی تجربے سے مجھے پارٹی کی حکمران اشرافیہ سے اس بات کی کچھ امید نہیں کہ وہ شہید بھٹو کی داستانِ حیات اور پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ نویسی پر مجھے کوئی اعزاز بخشے گی۔ یا کتاب کو کوئی پذیرائی حاصل ہو گی۔ ترقی پسند ممالک میں ایک مصنف اپنی ایک ہی تصنیف سے اپنی فکر معاش سے آزاد ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں، میں تادمِ تحریر سات کتابیں تحریر کر چکا ہوں۔ مگر فکر معاش سے آزاد نہیں ہو سکا۔

اس معاملے میں میری حالت فارسی کے اس شعر کی سی ہے۔

زخمہ بر تارِ رگِ جاں می زنم
کس چہ داند از چہ دستاں می زنم

ترجمہ: زخمہ فارسی میں مضراب کو کہتے ہیں جو ستار بجانے والا انگلی کو تاروں
کے زخم سے بچانے کے لئے اپنی انگشت پر پہنتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں
اپنے دل کی رگِ جاں کی تاروں کو چھیڑتا ہوں۔ کوئی کیا جانتا ہے کہ میں
اپنے ہاتھوں سے اپنے ساتھ کیا کر رہا ہوں۔

بہر صورت میں نے شہید ذوالفقار علی بھٹو اور شہید محترمہ بےنظیر بھٹو کے کردار و عمل: راقم کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک بانی رکن ہونے کی حیثیت سے اپنی قیادت کی تاریخ نویسی کا کام سرانجام دے کر اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ میں اس سے زیادہ کوئی خواہش نہیں رکھتا کہ سیاست کے طالب علم اس کتاب سے مستفیض ہوں، اور تاریخ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادتوں کا کردار و عمل اور ان کی شہادتوں کی داستان اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی اور پاکستان کے عوام کی تاریخی جدوجہد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے۔
بقول شاعر اسلم گورداسپوری ؎

میرے سارے کسب و کمال میں وہی ایک لمحہ خوشی کا ہے
کوئی اہلِ فن جو مجھے کہے کہ کمال آپ نے کر دیا

جناب مخدوم امین فہیم صاحب اور پیر سید مظہر الحق صاحب کا شکریہ

جناب مخدوم امین فہیم سینئر وائس چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے شہید بی بی کی کتاب کو بہت پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔

پیر سید مظہر الحق جو سینئر صوبائی وزیر سندھ ہیں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی رکن ہیں۔ وہ میرے شہید بھٹو کے عہد کے ساتھی کامریڈ اور دوست ہیں۔ وہ واحد پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈر تھے جنہوں نے شہید بی بی کی کتاب کی 100 جلدیں خرید کر سندھ کے کارکنوں میں تقسیم کیں۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا میں اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔

مصنف اسلم گورداسپوری کی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ پہلی تصویر

www.bhutto.org

وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ملاقات

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب ایک کلیم سر بکف

1965ء کی جنگ ختم ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا کہ لاہور کے گورنر ہاؤس میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی جانب سے لاہور کے شہریوں کو ایک بہت بڑا استقبالیہ دیا گیا۔ استقبالیے کی دعوت کا اہتمام گورنر پنجاب نواب آف کالا باغ نے کیا تھا۔ اِس استقبالیے میں قومی زندگی سے تعلق رکھنے والے تمام اہم شعبوں کے اہم لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ اِس استقبالیے میں اُن شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا جن شاعروں نے 1965ء کی جنگ کے دوران پر جوش قومی ترانے تحریر کئے تھے یا نظمیں تحریر کی تھیں۔ ان شاعروں میں میرا نام بھی شامل تھا۔ گورنر ہاؤس لاہور کے استقبالیے میں دوسرے شاعروں کے ساتھ مجھے بھی اپنی نظم ''چھ ستمبر'' سنانے کیلئے کہا گیا۔ میں نے اپنی نظم کے دوران ایوب خان کی پرواہ کئے بغیر ذوالفقار علی بھٹو کو مخاطب کر کے اپنی نظم کے کچھ اشعار سنانے شروع کئے۔ وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کو مخاطب کرنے میں میں نے دیکھا کہ ایوب خان کے ماتھے پر کچھ بل سے آ گئے۔ مگر میں نے اپنی نظم کو ذوالفقار علی بھٹو سے ہی مخاطب رہ کر مکمل کر دیا۔

اِس استقبالیے میں ایک اور انتہائی دلچسپ واقعہ دیکھنے میں آیا۔ اُن دنوں ایوب خان اپنے وزیرِ خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ گورنر پنجاب نواب آف کالا باغ سے بھی ناراض ہو چکا تھا اور کالا باغ کو گورنری سے ہٹانے کی افواہ گرم تھی۔ گورنر کالا باغ نے ایوب خان کو اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے مسلم لیگ کے ایک بوڑھے کارکن محمد حسین ٹین ساز کو اپنی لابی کے ذریعے استقبالیے میں بلا رکھا تھا۔ محمد حسین ٹین ساز ایک بدنام زمانہ دہاڑی دار آدمی تھا۔ وہ خود کو پاکستان

www.bhutto.org

بننے سے پہلے کا مسلم لیگی کہا کرتا تھا۔ بڑا بھونکا قسم کا آدمی تھا۔ انتہائی منہ پھٹ تھا۔ اُس کا ذریعہ معاش بھی بس اِس قسم کی ایکسپلا ٹیننشن تھا، یعنی گالی گلوچ تھا۔

اس قسم کے آدمی کو جب گورنر کالا باغ کی شہ مل جائے تو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کو محمد حسین ٹین ساز اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ ہندوستان کے شہر امرتسر میں ٹین سازی کا کاروبار کرتا تھا۔ اس ٹین سازی کے مشکل کام کو چھوڑ کر اُس نے لیگ کی ورکری کے آسان پیشے کو اختیار کر لیا تھا۔ محمد حسین ٹین ساز نے ایوب خان کے اس استقبالیے کا تمام سلسلہ درہم برہم کرتے ہوئے اپنے مخصوص ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں گورنر نواب آف کالا باغ کے حق میں تقریر کرنا شروع کر دی۔ تقریر کیا تھی، وہ تو ایوب خان کی سراسر بے عزتی تھی۔ محمد حسین ٹین ساز نے اپنی تقریر کا آغاز ہی پنجابی کے لفظ ''اُوئے'' سے شروع کیا۔ پنجابی کا لفظ ''اُوئے'' ہمیشہ اپنے سے چھوٹے کیلئے یا کسی غیر اہم آدمی کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹین ساز نے کہا کہ اُوئے ایوب خان تیری کامیابی کا تمام سہرا اس گورنر کالا باغ کے سر ہے۔ اس نے تیرے مخالفوں کو فتح کیا۔ اس نے مادرِ ملت کے مقابلے میں تجھے الیکشن جتوایا۔ آج تو اس کو گورنری سے ہٹانا چاہتا ہے۔ یہ کالا باغ تیرا اصل ساتھی ہے۔ تیرے دشمن تجھے اس کے خلاف کر رہے ہیں۔ کالا باغ کے خلاف سازش ہو رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ محمد حسین ٹین ساز نے ابھی اتنی ہی باتیں کہی تھیں کہ ایوب خان غصے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور بہت غصے کے عالم میں گورنر ہاؤس کی عمارت کی جانب چل دیا۔ کالا باغ گھبرا کر اپنی نشست پر سے اُٹھا اور بھاگ کر ایوب خان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا اور ایوب خان کو اپنے دفتر کی طرف لے گیا۔

ایوب خان اور نواب آف کالا باغ کے چلے جانے کے بعد گورنر ہاؤس کے سبزہ زار میں وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اور عوام باقی رہ گئے۔ گورنر ہاؤس کے اس استقبالیہ کے مدعو مہمانوں نے ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور کچھ لوگوں نے اُنکے ہاتھ چومنا شروع کر دیئے۔

مجھے ذوالفقار علی بھٹو اس قدر خوبصورت انسان لگا کہ میں نے بھٹو صاحب کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا اور چند منٹ تک کندھوں پر ہی اُٹھائے رکھا۔ تمام لوگوں نے بھٹو صاحب کے ساتھ تصویریں بنوانا شروع کر دیں۔ اِن میں، میں بھی شامل تھا۔ جب نعروں اور تصویروں کا ہنگامہ کچھ مدھم ہوا تو بھٹو صاحب نے میرے کان میں کہا کہ شام کو فلیٹی ہوٹل آ جاؤ۔ میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں۔ بھٹو صاحب نعروں اور تالیوں کی گونج میں اپنی جھنڈے والی گاڑی میں بیٹھ کر گورنر

ہاؤس سے باہر چلے گئے۔ اِس استقبالیہ میں ایک بات بہت واضح ہوگئی کہ ایوب خان اور ذوالفقار علی بھٹو کے راستے الگ الگ ہوگئے ہیں۔ اِس لئے کہ ذوالفقار علی بھٹو کا ایوب خان کے پیچھے بھاگ کر نہ جانا، اِس کے ساتھ گورنر ہاؤس کی عمارت میں نہ جانا اور عوام میں تنہا کھڑے رہنا اِس بات کے کھلے ثبوت تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو اُن دنوں پوری جوانی اور مکمل شباب کے عالم میں تھے۔ میں نے اِس قدر حسین اور اِس قدر خوش لباس انسان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انسانی وجاہت اور خوبصورتی میں حسن یوسف کا محاورہ ماند پڑتا تھا۔ قد سرو کا بوٹا، رنگ چمپئی اور پیازی تھا اور بڑا مردانہ وار انسان تھا۔

شکل و شباہت اور دیدہ زیب قد و قامت کے ساتھ ساتھ گفتگو کا لہجہ، اِس قدر پُر کشش تھا کہ دنیا جہاں کے اداکار اور فنکار اُن کے سامنے جعلی اور کھوکھلے دکھائی دیتے تھے۔ بھٹو صاحب کا مجھے یہ کہنا کہ شام کو فلیٹی ہوٹل میں آ کر مجھے ملو، میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں، میرے لئے ایک خواب بن گیا۔ میں بھٹو صاحب کی ملاقات کے نشے میں گورنر ہاؤس سے نکل کر سیدھا فلیٹی ہوٹل پہنچ گیا۔ میں نے فلیٹی ہوٹل کے کاؤنٹر سے بھٹو صاحب کا کمرہ دریافت کیا۔ کمرہ نمبر 55 اور 56 تھا۔ میں کافی دیر فلیٹی ہوٹل کے لان میں ٹہلتا رہا۔ میرے ذہن میں بھٹو صاحب کے الفاظ بار بار آ رہے تھے کہ شام کو آ کر ملو۔ میں چاہتا تھا کہ شام ذرا اچھی طرح پڑ جائے تاکہ میرا اُن سے ملنا اُن کے لفظ شام سے پوری مطابقت رکھتا ہو۔ میں کافی دیر اُن کے کمرے کے برآمدے میں لوگوں کو آتے جاتے دیکھتا رہا۔

بالآخر میں نے اُن کے کمرے میں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں جب اُن کے کمرے کے برآمدے میں پہنچا تو اُن کے کمرے کے باہر شیخ صفدر علی کو کھڑے پایا۔ شیخ صفدر علی کو میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ کبھی پولیس انسپکٹر ہوا کرتا تھا مگر اُس وقت وہ پولیس کی نوکری چھوڑ کر وکالت کر رہا تھا۔ شیخ صفدر علی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ مجھے کہنے لگا کہ بھٹو صاحب سے ملنا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے گورنر ہاؤس میں بھٹو صاحب ملے تھے تو اُنہوں نے مجھے آنے کیلئے خود کہا تھا۔ شیخ صاحب اندر گئے۔ بھٹو صاحب کو کہا کہ ایک نوجوان شاعر آپ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ شیخ صفدر علی کے ساتھ بھٹو صاحب دروازے پر آ گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے کے اندر لے گئے۔ کہنے لگے کہ آپ کی شاعری بہت اچھی تھی۔ اِس کے ساتھ ہی شیخ صفدر علی کو کہنے لگے کہ

شیخ صاحب ہمارے مہمان کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ میں نے بھٹو صاحب کو کچھ خاموش خاموش دیکھ کر گفتگو کا خود آغاز کر دیا۔

میں نے کہا بھٹو صاحب! آپ کا ایوب خان کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہو چکا لگتا ہے۔ بھٹو صاحب کہنے لگے مشکل نہیں ناممکن ہو چکا ہے۔ میں نے آپ کو اِسی مقصد کیلئے یہاں آنے کو کہا تھا۔ آپ نوجوان ہیں۔ مجھے بتائیں کہ پاکستان کے نوجوان میرے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ آپ کو جنگ ستمبر کا ہیرو سمجھتے ہیں۔ میرے ان کو ہیرو کہنے سے اُن کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک اور روشنی مجھے دکھائی دی۔ وہ ہر لفظ سوچ سوچ کر کہہ رہے تھے اور بہت آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے۔ اپنے صوفے سے میرے کان کی طرف اپنا رُخ کر کے سرگوشی کے انداز میں بولے کہ جنگ تو ہم ہار چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ لوگ آپ کو ہارا ہوا خیال نہیں کرتے۔ کہنے لگے لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ نہ میں جنگ ہارا ہوں اور نہ قوم یہ جنگ ہاری ہے۔ یہ جنگ ایوب خان نے ہاری ہے۔ اِس کے ساتھ ہی گھڑی دیکھ کر کہنے لگے کہ مجھے تھوڑی دیر بعد جہاز پر اسلام آباد کے لئے سوار ہونا ہے۔ آپ مجھے ایک بات کا جواب دیں کہ میں اگر حکومت کو چھوڑ کر باہر نکلوں تو تم میرا ساتھ دو گے۔ میں نے بڑے جذبے کے ساتھ جواب دیا کہ ہر قدم پر آپ کا ساتھ دوں گا۔ کہنے لگے کہ دنیا کی ہر قوم کی عزت کے محافظ اُس کے نوجوان ہوا کرتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان کی قوم کے نوجوان اپنی قوم کی عزت کی حفاظت کے لئے آگے بڑھیں۔ خدا نے چاہا کبھی وقت ملے گا تو آپ سے بہت زیادہ باتیں ہوں گی۔

میں چند دنوں تک اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کرنے والا ہوں۔ میرے فیصلے کا آپ سب کو علم ہو جائے گا۔ میں ایوب خان کی حکومت کو چھوڑ رہا ہوں۔ میں استعفیٰ دے کر بہت جلد اسلام آباد سے لاڑکانہ واپس جاؤں گا۔ میری واپسی بذریعہ ٹرین ہوگی۔ میری ٹرین جب لاہور ریلوے اسٹیشن پر آئے گی تو آپ مجھے ضرور ملنے آئیں۔ میں نے چلنے سے پہلے بھٹو صاحب سے بڑی گرم جوشی سے گلے ملنا چاہا تو اُنہوں نے انتہائی محبت سے مجھے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ جب میں اُن کے سینے کے ساتھ لپٹا ہوا تھا تو اُنہوں نے اِس قدر زور سے ٹھنڈی آہ بھری کہ مجھے اُن کی آہ اُن کے سینے سے اپنے سینے میں منتقل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

میں خوشی اور غمی دونوں ہی کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر اُن کے کمرے سے باہر

www.bhutto.org

آ گیا۔ کمرے کے باہر مجھے شیخ صفدر علی صاحب دوبارہ ملے۔ کہنے لگے کل میرے دفتر ریگل سینما آ جانا۔ اگلے پروگرام پر بات چیت کریں گے۔ اِس کے ساتھ ہی شیخ صفدر علی صاحب نے کہا کہ کل میرے دفتر میں کچھ طالب علم لیڈر بھی آ رہے ہیں۔ آپ ضرور آ جائیں۔

دوسرے دن میں شیخ صفدر علی صاحب کے دفتر واقع ریگل سینما پہنچ گیا۔ وہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔ نمایاں لوگوں میں اُس وقت کا مشہور طالب علم رہنما برادرم راشد بٹ صاحب مرحوم طالب علم رہنما ادریس کھٹانہ اور چند دوسرے طالب علم بیٹھے تھے، جن کے ساتھ میری کوئی آشنائی اور واقفیت نہیں تھی۔

شیخ صفدر علی مرحوم نے اُن کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ ایک شاعر کی حیثیت سے راشد بٹ اور ادریس کھٹانے نے تعارف کے ساتھ ہی مجھ میں بہت کشش محسوس کی۔ کافی دیر ہم لوگ شیخ صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر بھٹو صاحب کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اُن دنوں بھٹو صاحب کے علاوہ اور کوئی دوسرا موضوع ہوتا ہی نہیں تھا۔ پھر راشد بٹ اور کھٹانہ شیخ صاحب کے دفتر سے مجھے اپنے ساتھ مال روڈ پر واقع ''لارڈ ہوٹل'' میں مدعو کر کے لے گئے۔ لارڈ میں اُنہوں نے میری بڑی خاطر تواضع کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جس طرح میں اُن لوگوں کا ایک مدت سے آشنا ہوں۔ ایک ہی ملاقات میں دونوں جانب اجنبیت کا قطعی کوئی احساس محسوس نہ ہوا۔ ہم لوگ اِس قدر گہرے دوست بن گئے کہ ہر شام لارڈ ہوٹل میں محفل جمنے لگی۔ لارڈ میں بیٹھنے والے تمام سیاسی رہنما، کارکنوں اور اخبار نویسوں کے ساتھ بہت مختصر وقت میں ذاتی دوستی کا تعلق پیدا ہو گیا۔

اُن دنوں لارڈ میں بیٹھنے والے نمایاں ترین لوگوں میں سید انور قدوائی، میاں محمد اسلم (بیڈن روڈ والا)، خالد چوہدری (بیڈن روڈ والا)، سردار محمد صادق، عباس بلوچ، ظہور بھائی، غلام حبیب سبحانی ایڈووکیٹ، شیر عالم خان ایڈووکیٹ، حبیب جالب، موسیقار بابا حسن لطیف، گلوکار پرویز مہدی، گلوکار شوکت علی، گلوکار رجب علی، اور اِن تمام گلوکاروں کے استاد استاد امانت علی خان بھی شامل تھے۔ اِن لوگوں کے علاوہ اُن دنوں لارڈ ہوٹل میں زندگی کے تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا مگر جن چند لوگوں کے ساتھ میری نشست ہوا کرتی تھی، اُن لوگوں میں جانے پہچانے لوگ یہی تھے جن کے نام میں نے اُوپر تحریر کر دیئے ہیں۔

بھٹو صاحب کی لاہور ریلوے اسٹیشن پر آمد

بزم ہستی میں فروزِ شمع کا تھا انتظار
اِک زمانہ رقصِ بسمل کے لئے بے تاب تھا

1965ء کی جنگ کے بعد محمد ایوب خان کی آمریت کے اقتدار کا سنگاسن ڈول چکا تھا۔ اُس کی آمریت کے تابوت میں ذوالفقار علی بھٹو کا وزارت خارجہ کے عہدے سے استعفیٰ دینا آخری کیل کے مصداق تھا۔ پوری پاکستانی قوم ذوالفقار علی بھٹو کی ایوب خان حکومت سے علیحدگی کی منتظر تھی۔ جیسے ہی بھٹو صاحب کے استعفیٰ کی خبر اخبار میں آئی، لوگوں نے بغیر کسی کے کہے ذوالفقار علی بھٹو کا ساتھ دینے کے لئے لنگر لنگوٹ کسنے شروع کر دیئے۔ ہر شخص یوں دکھائی دیتا تھا جس طرح کچھ کرنے کو ذہنی طور پر تیار ہو چکا ہے۔ ہم معدودے چند لوگ جو لاہور میں ذوالفقار علی بھٹو کے شیدائیوں میں عوامی حلقوں میں پہچانے جاتے تھے۔ لوگ ہم سے بھٹو صاحب کی لاہور آمد کا پوچھنے لگ گئے۔

ہم لوگوں کا خاص طور پر میرا اُس وقت بھٹو صاحب کے ساتھ سوائے دلی محبت کے اور کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ہمارے پاس صرف شیخ صفدر ہی ایک ایسا انسان تھا جس کا مسٹر بھٹو کے ساتھ روزانہ رابطہ رہتا تھا۔ میں نے شیخ صاحب کے دفتر جانا روز کا معمول بنالیا تھا۔ ایک دن میں شیخ صاحب کے دفتر پہنچا تو اُنہوں نے کہا کہ ٹھیک دو دن کے بعد مسٹر بھٹو بذریعہ ٹرین راولپنڈی سے لاہور آرہے ہیں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر اُن کا شاندار استقبال ہو جائے۔ حکومت چھوڑنے کے بعد بھٹو صاحب کی یہ پہلی عوامی رونمائی ہوگی۔ اِس کی کامیابی بے حد ضروری ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا پاکستان کی سیاست میں آنے کا تمام دارومدار اُن کے لاہور کے استقبالیے پر ہوگا۔ ہم یہ باتیں کر رہے ہیں کہ راشد بٹ اور ادریس کھٹانہ اور کچھ دوسرے طالب علم رہنما تشریف لے آئے۔ اُن کو جب بھٹو صاحب کی آمد کا بتایا گیا، وہ تمام جذباتی ہو گئے۔ اِن لوگوں نے وہاں بیٹھ کر فیصلہ کیا کہ تمام کالجوں میں جا کر طالب علموں کو بھٹو صاحب کی آمد کی اطلاع دی جائے گی۔

میرے ذمہ اور شیخ سرور اقبال کے ذمے مزدور یونین کے عہدے داروں کو اطلاع کرنا مقرر ہو گیا۔ مزدور ٹریڈ یونین کے عہدے داروں میں سے سب سے پہلے میری ملاقات آفتاب ربانی اور حکیم عمر دین کے ساتھ ہوئی۔ اِس کے بعد ہم لوکوشیڈ کے مزدور رہنماؤں کے پاس گئے۔ اِن دنوں

www.bhutto.org

اخبارات بہت کم تعداد میں شائع ہوتے تھے، لاہور میں نوائے وقت، مشرق اور امروز وغیرہ شائع ہوتے تھے۔ ہم نے اُن تمام اخباروں میں بھٹو صاحب کی آمد کی خبر کو شائع کرانے کی کوشش کی مگر سوائے نوائے وقت کے کسی دوسرے اخبار نے اُن کی آمد کی خبر کو شائع نہ کیا۔ مگر بھٹو صاحب کی آمد کی خبر عوام میں سینہ بہ سینہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہر کارخانے میں، ہر دوکان پر، ہر گلی محلے میں، ہر انسان کی زبان پر ذوالفقار علی بھٹو کا نام تھا۔ شیخ سرور اقبال اور میں نے ضلع کچہری لاہور میں جا کر وکلاء حضرات کو اِس خبر سے آگاہ کیا۔ اِس معاملے میں لاہور کے وکلا نے ہماری بہت حوصلہ افزائی کی۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ بھٹو صاحب کی لاہور آمد کے دن عدالتوں میں پیش نہیں ہوا جائے گا۔ اِس دن چھٹی کی جائے گی مگر یہ چھٹی حکومت کی مداخلت کی وجہ سے جزوی طور پر ہی کامیاب رہی۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ٹرین کے لاہور پہنچنے کا وقت تقریباً 9 بجے صبح کا تھا۔ شیخ صفدر علی مرحوم اور میں دونوں سیاست میں بالکل نووارد تھے، نہ ہم نے اِس سے پہلے کبھی کسی لیڈر کا کوئی استقبال دیکھا تھا نہ ہی ہم دونوں کسی سیاسی تحریک سے واقف تھے۔ ہمارے ذہن میں اِس استقبال کا تصور کچھ اِس طرح سے تھا کہ اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم ضرور ہوگا۔ مگر ہمارے ذہن میں استقبال کا تصور اِس طرح کا ہرگز نہیں تھا کہ پورا شہر لاہور اسٹیشن پر پہنچ جائے گا۔ شیخ صفدر علی نے، میں نے اور شیخ سرور اقبال نے باقاعدہ گوٹے تلے کے ہار خرید کئے جن کو ہم نے مسٹر بھٹو کے گلے میں ڈالنا تھا۔ استقبال کے دن لوگ صبح آٹھ بجے ہی جوق در جوق اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ ہم نے دیکھا تھا کہ صبح آٹھ بجے ہی لوگ اسٹیشن کے اندر آتے جا رہے تھے۔ 9 بجے تک لاہور ریلوے اسٹیشن پیک ہو چکا تھا۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کیلئے اسٹیشن کے اندر داخل ہونا ناممکن ہو گیا۔ ہجوم اِس قدر زیادہ تھا کہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے لوہے کے پل میں لوگوں کے وزن کی وجہ سے لرزش محسوس ہونے لگ گئی۔ ریلوے والوں نے اعلان کرنا شروع کر دیا کہ پل سے لوگ زیادہ سے زیادہ نیچے اُتر جائیں۔ اِس لئے کہ پل کے بیٹھنے کا خطرہ محسوس ہونے لگ گیا تھا۔ لوگوں کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا۔ ایوب کتا مردہ باد اور ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد۔ ہم لوگ پہلے ہی پل کی دوسری طرف اُتر گئے تھے۔ ہم کو علم تھا کہ یہ گاڑی کو کہاں کھڑا ہونا تھا۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر میلے کا سا سماں تھا۔ جتنے لوگ ریلوے اسٹیشن کے اندر تھے۔ اس سے کہیں زیادہ لوگ اسٹیشن سے باہر جمع تھے۔ میرے خیال میں ذوالفقار علی بھٹو اسی دن تک زندہ ہے

ہوگیا تھا۔ اِس پہلے استقبال کے دن ہی لوگوں نے اِن کو اپنا رہنما تسلیم کرلیا تھا۔ ہجوم کی وجہ سے گاڑی چیونٹی کی چال میں دور سے آتی دکھائی دی اور آہستہ آہستہ وہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے اندر داخل ہوتی گئی۔ گاڑی رکتے ہی لوگ گاڑی کے اُوپر چڑھ گئے۔ بھٹو صاحب کے سیلون کے دونوں جانب اِس قدر لوگوں کا ہجوم تھا کہ کوئی شخص اُن کے سیلون کے دروازے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

شیخ صفدر صاحب اور ہم ریلوے کے ایک بڑے افسر کے ساتھ اسٹیشن پر کھڑے تھے۔ اِس افسر کو شیخ صفدر صاحب نے پہلے ہی اطلاع کر دی تھی کہ شیخ صاحب بھٹو صاحب کا استقبال کریں گے مگر اُس وقت وہاں کسی کے استقبال کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ لوگ پاگلوں کی طرح بپھرے ہوئے نعرے مار رہے تھے۔ ایک مستی تھی جو لوگوں کے دل و دماغ پر طاری تھی۔ کوئی اُچھل کود رہا تھا تو کوئی رقص کر رہا تھا۔ کوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ عجیب طرح کی کیفیت تھی۔ عجیب طرح کا سماں تھا کہ اتنے میں ذوالفقار علی بھٹو گاڑی کے دروازے میں نمودار ہو گئے۔ اُن کا دروازے میں آنا تھا کہ لوگوں پر اُن کی شخصیت کا سحر طاری ہو گیا۔

میں نے لوگوں کو دیوانوں کی طرح نعرے لگاتے دیکھا۔ کسی کو اپنا ہوش نہ تھا۔ بھٹو کی جھلک لوگوں نے کیا دیکھی کہ آسمان اور زمین بھٹو کے نعروں سے ایک ہو کر رہ گیا۔ اِس مقام پر فارسی شاعر خواجہ حافظ شیرازی کا کیا خوب شعر یاد آیا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

در مقا میکہ بیادِ لبِ اوے نوشند
سفلہ آں مست کہ باشد خبراز خویشتنش

ترجمہ: ایسے مقام پر کہ جہاں اُس کے لبوں کی یاد میں شراب پی جا رہی ہو۔ وہ مست کس قدر کمینہ ہوگا جس کو اپنے تن بدن کی ہوش ہوگی۔ یا وہ کتنا گھٹیا ہوگا جس کو اپنی ہوش ہوگی۔

حالانکہ دونوں جانب کے سامنے والے لوگ ہی بھٹو صاحب کو دیکھ سکتے تھے مگر یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سب لوگ بھٹو صاحب کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنے بڑے ہجوم میں ایک بات معجزہ نما تھی کہ بھٹو صاحب کے سیلون کے دروازے کے آگے تو لوگ دونوں جانب ایک جم غفیر کی صورت میں کھڑے تھے۔ مگر اِن کے دروازے پر کوئی بھی نہیں چڑھتا تھا۔ شاید اُن کو اِس بات کا احساس تھا کہ اُن کے دروازے کے اوپر چڑھ جانے سے لوگ بھٹو کو نہیں دیکھ پائیں گے۔

یہ ایک حیرت ناک بات تھی کہ دونوں دروازوں کے آگے کھڑے لوگ کسی کو دروازے پر

چڑھنے نہیں دیتے تو بھٹو صاحب کبھی دائیں جانب دروازے پر ہو کر لوگوں کے طرف ہاتھ ہلاتے، کبھی بائیں جانب جا کر لوگوں کو خوش آمدید کہتے۔ بھٹو صاحب کے ہاتھ ہلانے کا اسٹائل ہی نیا تھا۔ اُن کی آنکھوں کی چمک کچھ اور طرح کی تھی۔ عوام کو اِس طرح کے لیڈر کو دیکھنے کا پہلی مرتبہ موقع ملا تھا۔ ایک مدت سے پاکستان کی بنجر دھرتی کسی محرمِ راز، کسی ہمدرد انسان کی محبت کی پیاسی تھی۔ ایک عرصہ سے لوگ بے قیادت چلے آرہے تھے۔ اُن کے شوق، اُن کی لگن، اُن کی محبت، اُن کی چاہت، اُن کی عقیدت کا کوئی کتھارسس نہیں تھا۔ لوگوں کے سینوں میں رُکے ہوئے جذبے تھے۔ جمے ہوئے ولولے تھے جس کو ذوالفقار علی بھٹو کی آمد کی حرارت اور آتشِ شوق نے پگھلا دیا تھا۔ بس ایک انسانی جذبوں کا آتش فشاں تھا، ہجوم کیا تھا۔ خود ذوالفقار علی بھٹو کا یہ عالم تھا کہ اُن کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو مرزا غالب کے مصرع کی طرح شمع فروزاں کا کام کر رہے تھے۔ لوگوں کے چہرے بھی آنسوؤں سے تر تھے۔ جو لوگوں کا حال تھا، وہی بھٹو کا حال تھا۔ ایک غیبی تار تھی جو بھٹو اور لوگوں کے درمیان کام دکھا رہی تھی۔

جب لوگوں کا جوش، نعروں کی گونج اور تالیوں کا شور کچھ مدھم ہوا تو بھٹو صاحب نے بلند آواز میں لفظ ''شکریہ'' کہا اور یہ لفظ اُنہوں نے ڈبے کے دونوں جانب کے لوگوں کو کئی بار دہرا دہرا کر کہا۔ بھٹو صاحب نے بہت جلد خود پر قابو پالیا۔ اُنہوں نے اپنے رومال سے اُپنے آنسو پونچھ کر رومال دروازے کے باہر کھڑے ہجوم کے سروں پر پھینک دیا۔ لوگوں نے رومال اُٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے خود میں تقسیم کر لیا۔ اِس کے بعد اُنہوں نے ایک جملہ کہا کہ میرے بھائیوں۔ مجھے حکم دیا گیا تھا، ساتھ ہی اسلام آباد کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا۔ حکم دیا گیا تھا کہ میں سیدھا لاڑکانے جا کر دم لوں مگر میں لاہور آ گیا ہوں۔ اُن کے اتنا کہنے پر ہجوم ایک بار پھر شعلہ فشاں بن گیا۔ ایوب کتا، ایوب کتا، مردہ باد وغیرہ۔ اِس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب کے سیلون کو گاڑی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ گاڑی جس کو کراچی جانا تھا، اسٹیشن سے آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئی۔ جو لوگ تو سیلون کے قریب جمع تھے، صرف اُن لوگوں کو علم تھا کہ بھٹو صاحب سیلون میں ہیں۔ جو دُور تھے، اُن کو یہی لگا کہ بھٹو صاحب گاڑی میں کراچی چلے گئے ہیں۔ گاڑی کے اسٹیشن سے باہر نکل جانے کے بعد لوگوں نے اسٹیشن سے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ ہم لوگ جو ہار اُٹھائے کھڑے تھے۔ لوگوں نے اِن ہاروں کو سیلون کے اندر پھینک دیا۔ اِسی اثناء میں ریلوے اسٹیشن

www.bhutto.org

لاہور کی پچھلی طرف سے ایک کار پلیٹ فارم سے اندر آتی دکھائی دی جس کے آگے پولیس والے دوڑ رہے تھے جو لوگوں کو کہہ رہے تھے کہ مہربانی کر کے راستہ بنائیں۔ مسٹر بھٹو کو اِس گاڑی میں بیٹھنا ہے۔ لوگوں نے آہستہ آہستہ راستہ بنانا شروع کر دیا۔ بالآخر وہ گاڑی سیلون کے آگے پہنچ گئی۔ پولیس نے سیلون کے دروازے کا احاطہ کر لیا۔ بھٹو صاحب دروازے سے نیچے اُتر کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی ریلوے اسٹیشن کی پچھلی جانب سے دوبارہ اسٹیشن سے باہر نکل گئی۔ جب گاڑی چلی گئی تو شیخ صفدر نے ہم کو بتایا کہ اُن کو ایک پولیس آفیسر نے بتایا ہے کہ بھٹو صاحب کو نواب آف کالاباغ نے گورنر ہاؤس میں بلایا ہے اور یہ کار گورنر نواب آف کالاباغ نے بھیجی تھی۔ بیگم نصرت بھٹو اور بچے سیلون کے اندر ہی بیٹھے تھے۔ گورنر کالاباغ کا ایوب خان سے علیحدہ ہو جانا صاف عیاں ہو گیا تھا۔ بھٹو صاحب کے اِس استقبال کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد کالاباغ کو گورنری سے علیحدہ کر دیا گیا اور جنرل موسیٰ کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔

میں اور شیخ صفدر اور شیخ سرور اقبال، اسٹیشن سے شیخ صفدر صاحب کے دفتر ریگل سینما آ گئے۔ وہاں شیخ صفدر صاحب کو کسی نے فون کیا کہ مسٹر بھٹو فلیٹی ہوٹل پہنچ رہے ہیں۔ آپ لوگ بھی فلیٹی ہوٹل آ جائیں۔ ہم شیخ صفدر صاحب کے ساتھ فلیٹی ہوٹل آ گئے۔ بھٹو صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یوں لگا کہ جس طرح ہم ایک دوسرے کو خوب جانتے پہچانتے ہوں۔ کوئی اجنبیت کا احساس نہ تھا۔ ہم لوگوں نے اُن کے شاندار استقبال کی اُن کو مبارکباد دی۔ آسمان کی طرف ہاتھ کر کے کہنے لگے۔ یہ خدا کا کرم ہے۔ میں تو بہت کمزور آدمی ہوں۔ میں نے دُعا سلام کے بعد اُن کو اپنی تازہ نظم ''ذوالفقار'' سنائی جو خاص طور پر اس موقع کیلئے لکھی گئی تھی جس کا ایک ہی بند مجھے اِس وقت یاد آ رہا ہے۔

ظلم سے تو نے ناطہ توڑا ہے
ملک وقوم سے رشتہ جوڑا
تیرے آگے زیر زبر ہے......دشمن کی یلغار
ذوالفقار......ذوالفقار

میری یہ نظم سُن کر بھٹو صاحب بہت جذباتی ہو گئے۔ جب میں نے نظم ختم کی تو اُنہوں نے مجھے بہت محبت کے ساتھ اپنے ساتھ بٹھالیا اور کہا کہ اب ہم اکٹھے چلیں گے۔ میں کچھ ضروری کام

www.bhutto.org

کے لئے کچھ دنوں کے لئے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔آپ میرے آنے تک خوب ہوم ورک کریں۔خدا نے چاہا تو واپس آ کر میں اپنی اور اِس قوم کی نئی زندگی کے سفر کا آغاز کروں گا۔آج میں سوچتا ہوں کہ یہ بات اُنہوں نے جس اعتماد کے ساتھ اُس وقت کہی تھی، بعد میں اِسی طرح یہ سچ ثابت ہوئی۔

اِس مختصر سی ملاقات میں اُنہوں نے ہم لوگوں کو بتایا کہ جنرل ایوب خان نے مجھے اپنے صدر دفتر بلا کر دھمکی دی ہے۔ مجھے کہا ہے کہ تم نوجوان ہو۔تم نے ابھی دیکھا ہی کچھ نہیں ہے۔ تمہیں میرا مشورہ ہے کہ آرام سے ملک چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔اپنی زندگی کی خیر مناؤ۔اگر تم نے زبان کھولی تو میں تمہارا بہت بُرا حشر کروں گا۔تم لاڑکانے کے رہنے والے ہو۔تمہیں ایوب کھوڑو کا حشر تو یاد ہوگا۔کھوڑو سے میری سیاسی دشمنی نہیں تھی۔تمہارے ساتھ میری ذاتی دشمنی ہوگی اور اِس دشمنی کی کوئی حد نہیں ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

یہ باتیں کہتے ہوئے بھٹو صاحب بے حد متفکر سے ہو گئے۔ہم لوگوں نے بیک زبان ہو کر کہا کہ بھٹو صاحب! جب لوگ آپ کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے تو ایوب آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔دوبارہ کہنے لگے۔آپ لوگ میری آمد کا انتظار کریں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

جب ہم وہاں سے سے چلنے لگے تو بھٹو صاحب نے میرے گال پر محبت سے چونڈی کاٹی جیسے کوئی باپ اپنے بچے سے پیار کرتا ہے اور شیخ صفدر کو کہا کہ اِس کا خیال رکھنا۔بھٹو صاحب کی اِس ملاقات کے بعد ہم لوگوں نے عام لوگوں کے ساتھ سیاسی میل جول بڑھانا شروع کر دیا۔ میں مستقل طور پر شیخ صفدر صاحب کے ساتھ اِس کام میں جُت گیا۔شیخ صاحب نے حزبِ اختلاف کے سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کے ساتھ رابطہ کرنے کا یہ منصوبہ بھٹو صاحب کی ہدایات پر بنایا تھا۔اِس طریقے سے ہم لوگوں نے ہر روز ایک نہ ایک سیاست دان کے ساتھ ملنا شروع کیا۔

ایک دن ہم میاں ممتاز دولتانہ صاحب کو ملنے گئے۔بڑی دیر انتظار کرنے کے بعد اُن کے ساتھ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔وہ ایک میز پر بیٹھے ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اِس کتاب کا نام ''اراؤنڈ دی ورلڈ اِن 80 ڈیز'' تھا۔شیخ صفدر صاحب نے میاں صاحب کو کہا کہ بھٹو صاحب اگر سیاست میں حصہ لیں تو کیا آپ اُن کا ساتھ دیں گے۔اُن کی مدد کریں گے۔میاں

www.bhutto.org

صاحب شیخ صفدر علی صاحب کا منہ دیکھنے لگ گئے۔ کہنے لگ کہ سیاست اِس قدر آسان ہے کہ بھٹو صاحب یہاں سیاست کرنے لگ جائیں گے۔ بھٹو صاحب نے حکمرانی دیکھی ہے۔ اختلاف کی سیاست نہیں دیکھی۔ وہ ایک خوبصورت نوجوان ہے۔ وہ اِس خون خرابے میں کیوں پڑے گا۔ اُس کا کیا دماغ خراب ہے کہ وہ دھکے کھانے والا کام شروع کرے۔ اُس کو عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے دو۔ آپ لوگوں کو کس نے میرے پاس بھیجا ہے۔ صاف صاف بتاؤ۔ میں نے تو تم دونوں کو آج سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔ تم ہو کون۔ میاں صاحب کو شاید شک گذرا کہ ہم کو سی۔ آئی۔ ڈی نے اُن کے پاس بھیجا ہے تاکہ پتہ لگا سکیں کہ دولتانہ صاحب بھٹو کے بارے میں کیا خیال رکھتا ہے۔

شیخ صفدر نے کہا کہ میاں صاحب! آپ غلط نہ سوچیں۔ ہم ایمان داری کے ساتھ آپ کے پاس آئے ہیں۔ اُس وقت شیخ صاحب نے بیان کیا کہ مجھے بھٹو صاحب کہہ کر گئے تھے کہ میں آپ لوگوں سے ملاقات کروں مگر دولتانہ صاحب بے حد خوف زدہ تھے۔ وہ کوئی بات ماننے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اُن کا موڈ تقریباً آف تھا۔ ہم نے جب اُن کو بہت پریشان دیکھا تو اُن سے چلنے کی اجازت چاہی جو اُنہوں نے بڑی عجلت کے ساتھ ہی جانے کی اجازت ہم کو دے دی اور ہم حیران و پریشان اُن کے کئی ایکڑ پر محیط محل سے باہر آ گئے جس میں وہ شخص اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ ہماری سیاسی ملاقاتوں کا دائرہ کار روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ خاص طور پر نوجوان لوگوں میں مسٹر بھٹو صاحب کے لئے بہت کشش تھی۔ مگر جو لوگ پہلے سے پاکستان میں حزب اختلاف کے اراکین یا قائد یا ورکر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وہ بہت متردد تھے۔ اُن کو بھٹو صاحب کے بارے میں کچھ شبہات تھے۔ وہ کہا کرتے تھے بھٹو شہزادہ ہے، جاگیردار ہے، وہ کہاں سیاست کرے گا۔ تم لوگ خوامخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ وہ تو واپس پاکستان آئے گا ہی نہیں۔ خاص طور پر نیشنل عوامی پارٹی کے لوگ اس طرح کی باتیں کرنے میں پیش پیش تھے۔ ہم لوگ اِس کوچہ سیاست میں نئے تھے، ہم اُن کی باتیں سن کر خاموش ہو جاتے تھے۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب کے لاہور ریلوے اسٹیشن کے استقبال نے حکومتی پارٹی کنونشن لیگ کا سیاسی جنازہ نکال دیا تھا۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ کوئی شخص خود کو پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹھ کر یہ کہنے سے شرماتا تھا کہ اُس کا لیگ کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو میں کچھ زیادہ ہی گلٹی کانشین تھا۔ خود کو مجرم سا تصور کرتا تھا۔ اِس لئے کہ میں نے تو کنونشن لیگ کی کامیابی کے

www.bhutto.org

لئے انتخاب میں بڑی نظمیں پڑھی تھیں۔ میں نے ملک خدا بخش بچہ کے پاس جانا ختم کر دیا۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے فوڈ کے دفتر سے تنخواہ لینے جانا بھی بند کر دیا۔

ایک دن میں شیخ صفدر کے ساتھ میاں منظر بشیر کے گھر لارنس روڈ گیا۔ اُن کو شیخ صفدر نے مسٹر بھٹو کا پیغام دیا۔ وہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا کہ یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ آئندہ پاکستان کی سیاست کیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ مگر مسٹر بھٹو اگر سیاست میں آئیں گے تو اُن کو ہمارے ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ ہم بہت سفر طے کر چکے ہیں۔ جہاں تک میں اُس وقت اُن کی باتوں کو سمجھا۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ بھٹو صاحب کو ہماری قیادت میں آنا ہوگا۔

باغبان پورہ کا پہلا جلسہ

اُن دنوں وہ چھ ستمبر کی یاد میں اپنے آبائی محلے باغبان پورہ میں ایک جلسہ کرنے والے تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ شاعر صاحب آپ ہمارے جلسے میں تشریف لائیں۔ ذرا لوگوں کے خون کو گرمائیں۔ وہ جلسہ میاں منظر بشیر کی صدارت میں باغبان پورہ کے چوک میں ہوا۔ بظاہر اِس جلسے کا یہ اعلان تھا کہ اِس جلسے میں شہدا چھ ستمبر کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا۔ میں نے اِس جلسے کے لئے بہت پُر جوش قسم کی تازہ نظم کہی۔ اِس نظم میں ایوب خان کی حکومت کی بزدلی کی طرف اشارے تھے اور تاشقند کے معاہدے پر تنقید تھی۔ جس طرح کا اُس وقت ہر کسی کے دماغ پر جنگ کا جنوں چھایا ہوا تھا۔ اُس جنوں کے تحت وہ نظم تحریر کی گئی تھی جس کا ایک ہی بند مجھے یاد رہ گیا ہے۔

یہ صلح اُن کے لئے ہے جو عیش کرتے ہیں
یا جن کو فکر ہے دولت کی کارخانوں کی
اُنہی کے واسطے میثاقِ تاشقند ہوا
کہ جن کے گھنتی تھی رونق نگار خانوں کی
ہمارا صبر ہمارا سکون بیچ دیا
ایوب خاں نے شہیدوں کا خون بیچ دیا

اس جلسے کے بعد میاں منظر بشیر کے ساتھ میری دوستی ہوگئی۔ اُن کی خواہش ہی یہ رہتی تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ اُن کے پاس آتا جاتا رہوں۔ وہ مجھے خوبصورت شاعر کہا کرتے تھے۔ میرا

www.bhutto.org

اچھے کپڑے پہننا اُن کو بہت پسند تھا۔ وہ مجھ کو جب بھی کبھی کوئی چیک وغیرہ دیتے تو یہی کہتے کہ لو یار کوئی اچھا سا سوٹ سلواؤ اور جلد مجھے پہن کر دکھاؤ۔ میاں منظر بشیر بہت اعلیٰ ظرف کا انسان تھا۔ اُس شخص کی زندگی میں جو زوال آیا، وہ بے حد افسوس ناک تھا۔ میرا اُن کے ساتھ بڑا مختصر سا دوستی کا سفر رہا۔ اس لئے جب میں بھٹو صاحب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگ گیا تو میاں منظر بشیر سے ملنا جلنا بالکل ہی ختم ہو گیا تھا۔ اُنہوں نے اُن دنوں اپنی ایک علیحدہ پارٹی بنا رکھی تھی۔ اُنہوں نے مجھ پر بے حد زور ڈالا تھا کہ میں اُن کی پارٹی میں شامل ہو جاؤں۔ میں نے ایک دن اُن کو صاف صاف کہہ دیا کہ میاں صاحب! میں ذوالفقار علی بھٹو کے علاوہ کسی شخص کو اپنا لیڈر نہیں بنا سکتا۔ میاں منظر بشیر کو میری یہ بات بہت بُری لگی۔ اِس کے بعد ہمارا ملنا جلنا تقریباً بند ہو گیا۔

مال روڈ کے لارڈ ہوٹل میں سردار صادق کا بیٹھنا ایک مستقل فیچر تھا۔ سردار صادق، ایوب خان کی کنونشن لیگ کا ایک قسم کا بانی رکن تھا۔ ایوب خان کے صدارتی انتخابات کے دوران سردار صادق سے میری اچھی خاصی جان پہچان پیدا ہو چکی تھی۔ بھٹو صاحب کے حکومت سے باہر آنے کے بعد میری تمام سرگرمیوں پر سردار صادق کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ وہ ایک روایتی قسم کا سیاسی لیگی کارکن تھا۔ وہ مجھے اپنی کنونشن لیگ کا حامی اور ساتھی خیال کیا کرتا تھا۔ اب جب اُس نے میری ہر دن کنونشن لیگ کے مخالف لوگوں کے ساتھ ملاقاتیں دیکھنا شروع کیں تو اُس کو بہت تکلیف پہنچی۔ اُس نے جا کر خدا بخش بچہ کو کہا کہ وہ حکومت کے خلاف شعر و شاعری کر رہا ہے۔ حزب اختلاف کے لیڈروں اور کارکنوں کے ساتھ بیٹھتا اُٹھتا ہے۔ ہر وقت ذوالفقار علی بھٹو کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ آپ اُس کو بلا کر سمجھائیں۔

ایک دن صبح ملک خدا بخش بچہ کا ڈرائیور آیا اور مجھے کہنے لگا کہ ملک صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ میں اُس کے ساتھ ملک صاحب کے پاس گیا۔ ملک صاحب نے کہا کہ تم عجیب قسم کے بے وقوف آدمی ہو۔ بس شاعر ہی ہو۔ ذرا عقل کی کمی ہے۔ میں نے تم کو فوڈ انسپکٹر کی نوکری دی۔ تم نے آج تک نوکری جائن کرنے کے دستخط تک نہیں کئے۔ تمہارے دو ماہ کی تنخواہ پڑی ہے۔ وہ بھی تم لینے نہیں آئے۔ آخر تم کو ہم سے شکایت کیا ہوگئی ہے۔ میں تو تمہیں اپنا بیٹا خیال کرتا ہوں۔ میرے ساتھ اِس قدر محبت ڈال کر اب تم بے وفائی کر رہے ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہارا خیال رکھا ہے۔ میں بہت جلد تم کو ایک مربعہ زمین ''خوش خرید'' لاہور کے قریب دینے والا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ تم ایک اچھی خوشحال زندگی گذارو مگر سردار صادق کہہ رہا ہے کہ تم تو کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے ہاتھ

چڑھ گئے ہو۔ بڑی انقلابی باتیں کرنے لگ گئے ہو۔صدر ایوب خان کے دشمنوں کے ساتھ ہر وقت بیٹھتے اُٹھتے ہو۔اگر تمہیں بھٹو سے محبت ہے تو پہلے بھٹو صاحب کو فیصلہ تو کرنے دو کہ وہ کرنا کیا چاہتا ہے۔اگر وہ دوبارہ لیگ میں واپس آ گیا تو پھر تمہارا کیا بنے گا۔اتنی جلدی تمہیں کیا ہوا ہے۔ہم بھی تمہاری طرح سیاست ہی کرتے ہیں مگر عقل کی سیاست کرتے ہیں۔ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔ابھی جو فائدہ اُٹھا سکتے ہو،اُٹھاؤ۔وقت کا انتظار کرو۔جب بھی وقت بدلا تو ہم بابا تم سے بھی آگے ہوں گے۔مگر ہم کبھی حزب اختلاف کی سیاست نہیں کریں گے۔ہم تو اقتدار کی سیاست کریں گے۔جب بھٹو صاحب کبھی بھی برسر اقتدار آئے تو خدا بخش بچہ بھٹو صاحب کے ساتھ ہوگا۔ہم وفادار لوگ ہیں۔ہم حکمرانوں کی مخالفت نہیں کرتے۔ہم حکمرانوں کے ساتھی ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ باتیں مجھے ملک خدا بخش بچہ 1966ء میں کہہ رہا ہے اور کس قدر سچ تھا اُس کی باتوں میں کہ 1971ء میں وہ شخص بھٹو صاحب کی کیبنٹ میں زرعی شعبے کا مشیر تھا۔واقعی لوگ ملک خدا بخش بچہ کی طرح حکمرانی کی سیاست کرتے تھے۔اُن کا نہ کوئی نظریہ تھا نہ کوئی اُصول تھا۔ اُن کی سیاست اقتدار کی سیاست تھی۔

میں نے ملک خدا بخش بچہ کو کہا کہ آپ عام لوگوں میں جا کر دیکھیں کہ عام لوگ کس قدر حکومت سے نفرت کرتے ہیں۔وہ ایوب خان کا نام بھی سننا نہیں چاہتے۔ایسے عالم میں میں کس طرح آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔ملک صاحب نے کہا۔انگریز سے سارا ہندوستان نفرت کرتا تھا۔وہ کیا حکومت کرنا چھوڑ گیا تھا۔ملک صاحب نے کہا۔ہمارے مخالف لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو۔میں نے جان چھڑانے کے لئے کہا کہ میں کوشش کروں گا۔اُنہوں نے مجھے کہا کہ آتے جاتے رہا کرو۔اِس طرح ملک خدا بخش بچہ کے ساتھ اُن کی حکومت کے وقت یہ میری آخری ملاقات تھی۔اب جن لوگوں کے ساتھ میرا اُٹھنا بیٹھنا تھا،اُن لوگوں کی فکر پوری انسانیت کی بھلائی پر مبنی تھی۔اِن باتوں کے سامنے ملک خدا بخش بچہ کی دنیاداری کی باتوں کا مجھ پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ بقول بابا بلھے شاہ ؎

مُلّاں سانکو سبق پڑھیندے
بڑے سیانے راہ ڈسیندے
پر عشق کی لگے راہ دے مال

www.bhutto.org

ہر چند آج میں سوچتا ہوں کہ ہماری تمام فکر ایک خواب تھا جو حقیقت نہ بن سکا۔ مگر میں اپنی آرزوؤں اور کوششوں پر شرمندہ نہیں ہوں۔ میں اپنی جدوجہد پر ہرگز پشیمان نہیں ہوں۔ اس لئے کہ اس جدوجہد نے اس ملک میں ایک اعلیٰ ترین انسانی معاشرے کا تصور انسانوں کے ذہن میں راسخ کیا اور خود میں نے اس جدوجہد سے ایک اچھا اور اعلیٰ انسان بننے کی کوشش کی۔ ہر چند میرے اردگرد کے کچھ لوگ زر پرستی اور زر اندوزی اور اپنی دنیا داری کی جدوجہد کو اپنی زندگی کی کامیابی خیال کرتے ہیں مگر اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اسلم گورداسپوری کی طرح کی زندگی گذار کر زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اگر زندگی کی کامیابی محض دولت کمانا ہے تو دولت تو مجھے ملک خدا بخش بچہ اُس وقت دے رہا تھا جب میری عمر صرف 22 سال تھی۔ میں نے وہ دولت کیوں نہ حاصل کی۔ پاکستان کی طرح کے معاشروں میں تو دولت اس طریقے کے ساتھ ہی حاصل ہو سکتی تھی جو بیان کر دیا گیا ہے۔ آخر وہ کونسی قوت تھی میرے اندر، جس قوت کے لئے یہ تمام چیزیں بے کار تھیں، ہیچ تھیں، قابل نفرت تھیں۔ یونانی فلسفی سقراط نے کہا تھا کہ ''میرے اندر ایک غیبی قوت ہے جو مجھے غلط کام کرنے اور غلط نظریات تسلیم کرنے سے روک دیتی ہے۔ یہ قوت بچپن میں بھی میرے اندر تھی اور آج بڑھاپے میں بھی میرے اندر ہے اور آج وہی قوت عدالت میں مجھے سچ کہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ خواہ اس کے لئے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ قربان کرنی پڑے''۔

یہ معاملہ صرف سقراط ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہر انسان کے اندر یہ قوت ہوتی ہے۔ ہاں کسی انسان میں یہ قوت بہت زیادہ ہوتی ہے، کسی انسان میں کچھ کم ہوتی ہے مگر دنیا میں بہت کم انسان اپنے اندر کی اس قوت کی آواز پر دھیان دیا کرتے ہیں۔ بہت بھاری اکثریت انسانوں کی دائیں بائیں دیکھ کر کہ کوئی دیکھتا نہ ہو، موقع پا کر انسانی اخلاق اقدار کے اشارے توڑ کر آگے نکل جایا کرتی ہے۔ اُن کے اس مستقل ناجائز انسانی رویئے سے یہ آواز خاموش ہو جایا کرتی ہے۔ میں آج 63 سال کی عمر میں یہ باتیں تحریر کر رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ کسی بات کا ملال نہیں ہے۔ یہ آواز اُس وقت بھی میرے اندر تھی جب مجھ میں اس آواز کی حقانیت کو سمجھنے کی پوری صلاحیت بھی نہیں تھی۔ یہ آواز آج بھی میرے اندر اور میری ساتھی ہے۔ خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے اس آواز کو اپنے اندر زندہ رکھا ہے، خاموش نہیں ہونے دیا۔ بقول شاعر گورداسپوری ؎

www.bhutto.org

اس دل کے زندہ رہنے کا تجھ پر ہے انحصار
اے لذت ستم کبھی تجھ میں کمی نہ ہو

ملک خدا بخش بچہ کے ساتھ ملاقات کے بعد میں عجیب قسم کی ذہنی سوچ میں مبتلا ہو گیا۔ میں ایک ذہنی کشمکش اور تذبذب کی حالت سے دوچار ہو گیا۔ میں لاشعوری طور پر زندگی کے ایک ایسے دوراہے اور ایسے موڑ پر آ کر کھڑا تھا جہاں سے مجھے زندگی کا اگلا قدم اُٹھانا تھا۔ ابھی تک میں نے اپنی اِس چھوٹی سی معصوم زندگی میں جو کچھ کیا تھا، اُس میں زندگی کی کسی منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ جو کچھ بھی کیا تھا، وہ حالات اور ماحول کے مطابق کیا تھا۔ مگر اب میں حالات اور ماحول کے برعکس سوچ رہا تھا۔ اِس لئے کہ حالات اور ماحول کا راستہ تو زندگی کے معمول کا راستہ تھا۔ یہ وہی راستہ تھا جس راستے پر مجھے ملک خدا بخش بچہ چلانا چاہتا تھا کہ انسان وقت سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ کسی سرکاری محکمے کی ملازمت اختیار کرتا ہے۔ ہر ماہ تنخواہ پاتا ہے۔ سرکاری رہائش حاصل کرتا ہے۔ حکومت خواہ کسی کی بھی ہو، کیسی بھی ہو، اُس کی حمایت کرتا ہے۔ اُس سے مفادات اُٹھاتا ہے۔ زندگی کا دوسرا راستہ وہ تھا جس کے بارے میں، میں نے ابھی تک دانشوروں کی باتوں سے ہی سنا تھا۔ یا کچھ کتابوں رسالوں میں پڑھا تھا جس کا بس ایک احساس رکھتا تھا۔ اس کا تجربہ ہرگز نہیں رکھتا تھا مگر ایک بات مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں اُس وقت اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باوجود اِن حالات سے سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا۔ میں بے حد بے چین تھا۔ مجھے اُس وقت کا معاشرہ اور حکومتی سیٹ اپ سخت بُرا لگتا تھا۔ ہرچند اپنی اُس وقت کی بے کلی اور بے چینی کو سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ استاد شیفتہ کے قول کے مطابق:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

بس اِسی طرح کی حالت تھی۔ میں نے بابا ظہیر کاشمیری کے ساتھ اپنے اِس تمام تذبذب کا ذکر کیا۔ اپنی تمام بے کلی اور بے چینی کا اُن سے اظہار کیا۔ بابا ظہیر بھی میرے وارث شاہ کی ہیر کی طرح طبیب تھے۔ جس طرح ہیر کہتی تھی کہ ''رانجھن یار طبیب سی دا'' تو میرا طبیب بابا جی تھے۔ میں نے اُن کے ساتھ اپنے اِس درپیش مسئلے پر بڑی کھل کر بات کی۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ

www.bhutto.org

برخودار! اگر تم عام لوگوں کی طرح زندگی گذارنا چاہتے ہوتو جاکر فوڈ انسپکٹر کی نوکری کرو۔ بچے کا کہا مان لو اور مزے کرو، شادی کرو، چار پانچ بچے پیدا کرو اور انسانی زندگی کے سمندر میں ایک لہر بن کر گم ہو جاؤ۔ مگر جو لوگ اِس قسم کی زندگی گذارا کرتے ہیں، وہ تمہاری طرح لوگوں کے ساتھ مشورہ نہیں کیا کرتے۔ تم پیدائشی طور پر ایک فنکار ہو، شاعر ہو۔ یہ روزمرہ کی عام زندگی، یہ انسانوں کی ٹکسالی زندگی تمہاری فطرت کا خاصا نہیں ہے۔

انسان کو زندگی میں وہ کام کرنا چاہیے جو اُس کی فطرت کے خلاف نہ ہو۔ اب یہ فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے کہ تم ایک فطری زندگی گذارنا چاہتے ہو یا غیر فطری زندگی گذارنا چاہتے ہو جیسا کہ میں تمہیں پاتا ہوں۔ تمہارا رجحان دانشورانہ طرزِ فکر کا ہے۔ لہٰذا ایک نوآموز دانشور و فکر کے انسان کو عام انسانوں کی زندگی سے بالاتر رہ کر زندگی کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگرچہ اِس میں کچھ مشکلات اور دشواریوں کا سامنا ضرور رہتا ہے مگر یہ راستہ تمہارا اپنا بنایا ہوا راستہ ہوگا۔ تمہاری ایک اپنی شناخت ہوگی۔ تم خود زندگی کے لئے ایک اچھی علامت بن جاؤ گے۔ یاد رکھو کہ زندگی کے منتخب راستوں پر بہت کم لوگ چلا کرتے ہیں۔ مگر جو لوگ بھی اِن راستوں پر چلتے ہیں، وہ راہ نورد نہیں کہلاتے، رہنما کہلاتے ہیں۔

یہاں پر میں ایک خوبصورت اتفاق آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں کل ڈاکٹر مبارک علی کی کتاب ''گمشدہ تاریخ'' کا صفحہ نمبر 54 پڑھ رہا تھا جس پر اُنہوں نے ریاست کے مروجہ رسم و رواج سے اختلاف کرنے والے باشعور انسانوں اور دانشوروں کے بارے میں عین اُنہی باتوں کا اظہار کیا ہے جن باتوں کا بابا ظہیر کاشمیری نے اوپر ذکر کیا تھا۔ میں بے حد حیران ہوا کہ بڑے دانشوروں کے قول و اقوال ایک دوسرے کے ساتھ کس قدر مشابہت رکھتے ہیں۔ حالانکہ اُن میں وقت اور عہد کا بہت زیادہ فاصلہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی صاحب اپنی اس مختصر سی کتاب میں کہتے ہیں کہ ہر دانشور کو حکومتوں کی سیاست کی سرپرستی سے بالاتر ہو کر اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اگرچہ اس میں دشواریاں اور خطرات ہیں مگر اِس کے علاوہ اِس کیلئے کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک طرف اپنی تخلیق کی آگ میں جلتا ہے تو دوسری طرف معاشرے کی نفرت کا بھی شکار ہوتا ہے اور اسی اذیت میں اُس کی زندگی گذرتی ہے۔ ایک دانشور کو کسی صلہ انعام، تحفہ اور شہرت کی تمنا نہیں ہوتی۔ وہ بغاوت اس لئے کرتا ہے کہ اِس سے اُس کے اندر کی تخلیقی قوتوں اور توانائیوں کو جلا ملتی ہے۔ وہ

www.bhutto.org

انحراف اِس لیے کرتا ہے کہ اِس سے اُس کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ معاشرے کا ذہنی جمود ٹوٹے اور ایک ہلچل ہو کہ معاشرہ آگے بڑھ سکے۔ بابا ظہیر کاشمیری کی اور ڈاکٹر مبارک علی کی باتوں کی مماثلت کو شاعری میں ''توارُد'' کہا جاتا ہے۔ ہر چند بابا ظہیر صاحب کی آخری بات کچھ اِس طرح کی تھی کہ اِس راستے پر چلنے والے ہمیشہ بے سروسامان لوگ ہی ہوا کرتے ہیں۔ اِس سفر کا زادِ راہ دیوانگی ہوتی ہے۔ سربازی اور سرفروشی ہوتی ہے۔ حافظ شیرازی کا اِس مضمون میں کیا خوب شعر یاد آیا ہے۔ آپ ملاحظہ کریں اور اِس سے حظ اُٹھائیں۔

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطر است بہ جان
شرطِ اوّل قدم آں است کہ مجنوں باشی

شعر کے معنی یہ ہیں کہ منزلِ لیلیٰ کو تلاش کرنے میں ہر چند جان کا خطرہ ہے۔ یہ بہت کٹھن راستہ ہے مگر اِس سے بھی بڑھ کر اِس راستے پر چلنے کی جو پہلی شرط ہے، وہ سب سے کڑی شرط ہے بلکہ پہلا قدم رکھنے کی کی پہلی شرط ہی یہ ہے کہ انسان پہلے مجنوں بن جائے۔ سب کچھ تیاگ کر اور چاک گریباں ہو جائے۔

لہٰذا قارئین کتاب! بس یہی ایک اُس وقت مجھے دستیاب مشورہ تھا جس کے بعد میں ایک ایسے سفر پر چل نکلا جو آج تک ختم ہی نہیں ہو پایا۔ حضرات اِس موقع پر ایک پنجابی شاعر کا لاجواب شعر یاد آیا ہے۔ میں خود اِس وقت اِس شعر کی یادآوری پر وجد کے عالم میں ہوں۔ شعر تو ملاحظہ کیجیے۔

میں مُکی پینڈے ناں مُکے واٹ تیری دے
ٹٹ پین پنّواں تیری ڈاچی دیاں ٹلیاں

ترجمہ سسّی کہتی ہے کہ میں ختم ہوگئی ہوں مگر تری منزل کے فاصلے ختم نہیں ہوتے۔ خدا کرے پنّوں ترے اونٹنی کے گلے کی گھنٹیاں ٹوٹ جائیں تا کہ نہ اُن کی آواز آئے اور نہ میں ترے پیچھے بھاگتی رہوں۔

پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور پاکستان کے سیاستدان

میراجی چاہتا تھا کہ پاکستان میں کوئی ایسی سیاسی قیادت اور سیاسی جماعت ہونی چاہیے۔

www.bhutto.org

جو فیض صاحب اور ظہیر صاحب کے فکر و فلسفے کی حامل ہو۔ تاکہ پاکستان جیسے پسماندہ ملک کے عوام کے بنیادی سیاسی اور معاشی حقوق کے لئے جدوجہد کی جائے۔ اور پاکستان کے عوام کو ذہنی آزادی کے شعور سے ہمکنار کیا جائے۔ ان دنوں بابا ظہیر کے ادبی ذخیرے سے مجھے بے شمار ایسے پمفلٹ پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ جن میں ترقی پسند انقلابی شخصیتوں کی داستانِ حیات پڑھنے میں آتی تھی۔ سویت انقلاب اور چین کے انقلاب سے آگاہی حاصل ہوتی تھی۔ لاطینی امریکہ کے انقلابیوں کی جدوجہد کا علم حاصل ہوتا تھا۔ لہٰذا اس انقلابی لٹریچر کے مطالعے نے مجھے ایک فلم اداکار کی بجائے چے گیویرا بنادیا تھا۔

اب مجھے فلم انڈسٹری اور اسٹوڈیو ایک بے مقصد سی جگہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی فلم ڈائریکٹر اور فلم ساز کے پاس جانے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے بابا ظہیر صاحب مجھے فلم ڈائریکٹر شباب کیرانوی جو شاعر بھی تھا اس کے پاس لے کر گئے تھے کہ اس لڑکے کو اپنی کسی فلم میں کوئی اچھا کردار دے کر اس کے شوق کو پورا کردو۔ شباب کیرانوی نے میرے بڑے کیمرے ٹیسٹ لئے بڑی ریہرسلیں مجھ سے کروائیں تھیں۔ اپنی فلم میں ایک سٹوڈنٹ لیڈر کا بڑا اچھا کردار میرے لئے تجویز کیا تھا۔ مگر اچانک ان کے اور میرے درمیان چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو حائل ہوگئے۔ شباب کیرانوی کے بار بار بلانے کے باوجود میں دوبارہ واپس فلم اسٹوڈیو میں نہ جاسکا۔

پاکستان کی روز اول سے سیاست کی ابتداء ہی جاگیردارانہ نظام کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ اس لئے کہ مسلم لیگ کے وڈیروں اور نوابوں نے یہ جاگیرداری نظام انگریزوں سے ورثے میں پایا تھا۔ یہ نظام ان لیڈروں کے رگ و ریشے میں رچا بسا تھا۔ وہ پاکستان کی سیاست میں کسی عوامی اور انقلابی نظام لانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔

جہاں تک پاکستان میں ان ترقی پسند سیاسی راہنماؤں اور انقلابی دانشوروں کا تعلق تھا، اُن کے سرخیل میاں افتخار الدین نے پاکستان کی قومی سیاست میں حصہ لینے کیلئے نہایت دانش مندی کے ساتھ ایک ترقی پسند سیاسی جماعت ''آزاد پاکستان پارٹی'' کے نام سے قائم کی تھی۔ جس میں ہندوستان اور موجودہ پاکستان کے تمام نامی گرامی دانشوروں اور انقلابی شامل تھے۔

یہ جماعت ہمارے ہوش سے بہت پہلے بنائی گئی تھی۔ جماعت آزاد پاکستان پارٹی کے بارے میں، میں نے ظہیر کاشمیری یا اُن کی طرح کے دوسرے اصحاب سے معلومات حاصل کی

www.bhutto.org

تھیں۔ اِن تمام معلومات کی روشنی میں وہ جماعت سیاسی جماعت کم تھی۔ اِس میں دانشوری بہت زیادہ تھی۔ اس جماعت کی قیادت پاکستان کے انتہائی بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے انقلابی مزاج کے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگوں پر مشتمل تھی۔ اُن کے بعد آزاد پاکستان پارٹی میں باقی تعداد بلکہ اکثریت پاکستان کے اُن تمام بڑے بڑے صاحب علم اور دانشوروں کی تھی جو پاکستان کے درمیانے یا معاشی لحاظ سے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ جن میں شاعر، ادیب، وکلاء، صحافی، مقرر اور مزدور وکسان رہنما سب شامل تھے۔

اِس آزاد پاکستان پارٹی کے قیام کے اغراض و مقاصد و فلسفے کے مطالعے سے مکمل طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً یہ جماعت پاکستان میں ایک سوشلسٹ انقلاب لانے کیلئے بنائی گئی تھی۔ اِس جماعت کے بنانے والے اپنے عہد کی دنیا کی تمام ترقی پسند انقلابی تحریکیوں کا بھرپور مطالعہ رکھتے تھے۔ اِس عہد کے دو عظیم کائناتی انقلاب جو سوویت یونین اور جمہوریہ چین میں برپا ہوئے تھے، اِن دو انقلابوں کے تو گویا وہ چشم دید گواہ تھے۔

ان دانشمندوں کو علم تھا کہ انقلابیوں کے اُس عہد جدید میں کسی انقلابی سیاسی جماعت کے لئے نشر و اشاعت اور ابلاغ عامہ کا ایک مضبوط سلسلہ یا ادارہ قائم کرنا اُس کی پہلی اور سب سے بڑی ضرورت ہوتا ہے۔ لہٰذا اِس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے اِس پارٹی کے لیڈر میاں افتخار الدین نے بیک وقت دو زبانوں میں یعنی اُردو اور انگریزی میں ''پاکستان ٹائمز'' اور روزنامہ ''امروز'' نکال کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اِن دو تاریخی اخبارات کے اجراء سے ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان میں آزاد صحافت کی ابتداء کا سہرا بھی ترقی پسند بائیں بازو کے لیڈروں کے سر جاتا ہے۔ اِن تمام باتوں کے علاوہ پاکستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بڑی تعداد بھی اِس پارٹی کی پشت پر تھی، یا یوں سمجھ لیں کہ اِن انقلابی لوگوں کی ایک ذیلی تنظیم تھی۔

پاکستان کی امریکہ نواز فوجی اسٹیبلشمنٹ نے پنڈی سازش کیس کا بہانہ بنا کر اس پارٹی کا قلع قمع کر دیا تھا اور پاکستان کے پہلے ملٹری ڈکٹیٹر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے میاں افتخار الدین کے ترقی پسند اخبار پاکستان ٹائم اور روزنامہ امروز پر فوجی قبضہ جما لیا تھا۔ اور ان عوامی اخباروں کو ٹرسٹ کے اخبار بنا دیا تھا۔ یعنی سرکاری اخبار بنا دیا تھا۔ اس طریقے کے ساتھ فوجی اقتدار نے پاکستان کے قیام کے ابتدائی ایام میں ہی پاکستان میں تحریر اور تقریر کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ جس

www.bhutto.org

کی وجہ سے پاکستانی قوم کی جدید فکری اور سیاسی جمہوری نظریات کی تعلیم و تربیت نہ ہو سکی، اور پاکستان کی قوم ایک غیر منظم سیاسی ہجوم بن کر رہ گئی۔

پاکستان میں ترقی پسند جماعتوں یا مختلف حوالوں کی وجہ سے بنائی گئی انقلابی جماعتوں یا گروپوں کے علاوہ پاکستان میں باقی تمام جماعتیں دائیں باوز کی جماعتیں تھیں، جن کی سیاست کا تمام دارومدار مذہب کے نام پر اور شخصیتوں کے ناموں سے منسوب تھا۔ اِن میں کٹر مذہبی جماعتیں تو مولانا ابو اعلیٰ مودودی مرحوم، مولانا مفتی محمود مرحوم، مولانا شاہ احمد نورانی مرحوم کے ناموں سے جانی جاتی تھیں۔

اِن مذہبی جماعتوں کے علاوہ دائیں باوز کی سیاسی جماعتوں میں کئی ناموں کے ساتھ منسوب کی گئیں لیگوں پر مبنی سیاسی جماعتیں تھیں اور اِن تمام لیگوں کے ملغوبے سے تیار کی گئی ایوب خان کی کنونشن لیگ تھی جو اُس دور میں تمام لیگوں پر بھاری لیگ تھی۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا، پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد اقتدار کی لڑائیوں نے مسلم لیگ کا کردار تو ایک طوائف کا کردار بنا دیا تھا۔ جو سب سے پہلے تو یونینسٹوں کی رکھیل بن گئی۔ اِس کے بعد پاک فوج کے ڈکیٹٹروں اور مارشل لاء ایڈمنسٹریروں نے تو اِس جماعت کو اپنی مستقل طور پر داشتہ بنالیا۔ یونینسٹوں اور فوجی مارشل لاؤں کی چنگلی ہوئی بوڑھی داشتہ اور طوائف مسلم لیگ آج کل جنرل پرویز مشرف کی جوانی کے مزے لوٹ رہی ہے۔

لہٰذا میرے لئے اُس دور کی سیاسی جماعتوں کا عمومی جائزہ کچھ اِس طرح کا ہی بنتا ہے جس کو میں نے انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اُن کے علاوہ پاکستان میں اگر کوئی دوسری سیاسی جماعتیں تھیں تو اُن کا وجود صرف اپنے اپنے صوبوں تک ہی محدود تھا۔ مثال کے طور پر مشرقی پاکستان میں اگر شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ تھی تو اُس کا وجود مغربی پاکستان میں مفقود تھا۔ اس کے علاوہ مغربی پاکستان میں کچھ ایسی جماعتیں بھی تھیں جو پوری کی پوری ایک تانگے پر آ جاتی تھیں۔

پاکستان کی سیاست میں اس وقت بائیں بازو کے نام پر ایک ہی سیاسی جماعت کو شہرت حاصل تھی۔ اس کا نام نیشنل عوامی پارٹی تھا۔ جس کی قیادت سرحد کے خان عبدالغفار خان جن کو ہندوستان کی سیاسی جماعت کانگرس کا حامی ہونے کی بنا پر سرحدی گاندھی کہا جاتا تھا کے فرزند رشید خان عبدالولی خان کے ہاتھ میں تھی۔

www.bhutto.org

ان دنوں پاکستان کے تمام ترقی پسند دانشوروں اور سیاسی کارکنوں نے نیشنل عوامی پارٹی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ اس پارٹی کے قائدین خان برادران چونکہ قیامِ پاکستان سے پہلے کانگرس میں شامل تھے وہ اپنی جماعت کانگرس کے فکری نقطہء نظر کی بنا پر تقسیم ہندوستان کے خلاف تھے۔ اور یہ نقطہء نظر ایک جمہوری اور سیاسی نقطہء نظر تھا۔ مگر پاکستان بن جانے کے بعد ان لوگوں کو غدارِ وطن اور غدارِ پاکستان قرار دے دیا گیا۔ اور پاکستان میں نیشنل عوامی پارٹی کو ہندوؤں کی ایجنٹ قرار دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس جماعت کے انقلابی خیالات کی بنا پر اس کو روس کی ایجنٹ بھی قرار دے دیا گیا۔ پاکستان کے عوام کو قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ایک خاص سامراجی نظریے کے مطابق ہندوستان اور روس دشمنی کے فوبیے میں مبتلا کیا گیا تھا۔ خاص طور پر پنجاب کے عوام میں ہندوستان دشمنی کا پارہ اور درجہ حرارت بہت بلند سطح پر پایا جاتا تھا۔ پنجاب کے عوام پاگل پن کی حد تک ہندوستان دشمنی کا شکار تھے۔ نیشنل عوامی پارٹی پر چونکہ پاکستان کے قیام کی مخالفت کرنے کا ٹھپہ لگا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ پارٹی پنجاب میں عوامی سطح پر قطعی طور پر مقبول نہ ہو سکی۔ پنجاب کے عوام میں اس پارٹی کو غیر مقبول بنانے میں پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کے جاگیردار سیاست دانوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ مسلم لیگ کے تمام جاگیردار حکمران اس پارٹی کے منشور کو جاگیرداری نظام کے خلاف تصور کرتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے جاگیردارانہ مفادات کے تحفظ کی خاطر اس پارٹی کو غداروں کی پارٹی مشہور کر دیا۔ پاکستان کے دشمنوں کی پارٹی بنا دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کو غدار بنانے میں نوائے وقت کے اخبار کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ پنجاب مغربی پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے چونکہ سب سے بڑا صوبہ تھا۔ اور مسلم لیگ کی سیاست کا گڑھ تھا۔ پنجاب میں قیامِ پاکستان سے ہی نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈروں کے خلاف لوگوں کے دلوں میں بڑی نفرت پائی جاتی تھی۔ جس نفرت کو وقت کے ساتھ ساتھ ایک پراپیگنڈہ مہم کے ذریعے پنجاب کے عوام کے ذہنوں میں راسخ کر دیا گیا۔ جس کی وجہ سے نیشنل عوامی پارٹی پنجاب کے عوام میں مقبول نہ ہو سکی۔ اور یہ پارٹی ایک قومی پارٹی کی شکل نہ اختیار کر سکی۔ اس پارٹی کی حیثیت علاقائی پارٹی کی ہی رہی۔

ان دنوں نیشنل عوامی پارٹی کے علاوہ جناب سی آر اسلم کی سوشلسٹ پارٹی تھی۔ یہ پارٹی بھی نیشنل عوامی پارٹی کی طرح کچھ وکیلوں اور چند مزدور رہنماؤں پر ہی مشتمل تھی۔ عوام کی سطح پر اس پارٹی کی بھی کوئی تنظیم نہیں تھی۔

www.bhutto.org

اسی طرح مولانا بھاشانی کی سیاست کا بھی زیادہ زور مشرقی پاکستان میں ہی تھا۔ مغربی پاکستان میں ان کی بھی تمام تر قوت کا مدار چند نامور وکلاء اور چند نامور ٹریڈ یونین کے لیڈروں پر ہی تھا۔

اسی طرح کی صورت حال میجر اسحاق کی مزدور کسان پارٹی کی تھی۔ ان کی پارٹی کا انحصار بھی چند دانش وروں اور چند مزدور کسان سیاسی کارکنوں پر ہی تھا۔ پاکستان میں حزب اختلاف کی تمام سیاسی جماعتوں کا یہی ناک نقشہ تھا جس کو میں نے بیان کر دیا ہے۔ میں چونکہ سیاسی میدان کا ابھی طفلِ مکتب تھا میں نے ترقی پسندی کی نظریاتی شہرت رکھنے والے تمام انقلابی لیڈروں دانشوروں اور سیاسی کارکنوں کے ساتھ ایک شعوری سیاسی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے رابطے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

دانشوروں اور سیاسی لیڈروں کے ساتھ ملاقاتیں

مرحوم شیخ صفدر علی کے مشورے کے مطابق میری کوشش رہتی تھی کہ میں اُس وقت کے نمایاں ترین سیاسی لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کی صحبت میں بیٹھوں۔ اُن کی باتیں سنوں۔ اُن دنوں میں شیخ سرور اقبال مرحوم کے ساتھ زیادہ چلا پھرا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا اور پاکستان کے میدانِ سیاست خصوصاً پنجاب اور لاہور کے میدانِ سیاست سے خوب واقف تھا۔ میری ملاقات سے پہلے وہ پاکستان کی ہر قابل ذکر سیاسی جماعت کا تقریباً رکن رہ چکا تھا۔ میرے لئے یہ حیرت کی بات تھی کہ لاہور کا ہر سیاسی انسان شیخ سرور اقبال کو جانتا تھا۔ لاہور کی سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگوں کے ساتھ جس قدر شیخ سرور اقبال کی واقفیت تھی، اتنی کسی اور کی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اِس معاملے میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ لاہور کے جتنے دو نمبر سیاسی کارکن تھے، اُن کے ساتھ شیخ صاحب کے بڑے خصوصی تعلقات ہوتے تھے۔ ہر دو نمبر مزدور لیڈر شیخ کا یارِ غار ہوا کرتا تھا۔ لاہور کے تمام سیاسی حلقوں میں شیخ صاحب کی بڑی واقفیت تھی۔ ہر لیڈر کی سیاسی تاریخ شیخ صاحب کو ازبر تھی۔

اُن میں کون رابرٹ کلب کا ہے۔ کون چونا منڈی پولیس کا آدمی ہے۔ شیخ سب کو جانتا تھا۔ شیخ سرور کوئی پڑھا لکھا انسان نہیں تھا مگر بلا کا ذہین آدمی تھا۔ بے حد بذلہ سنج تھا۔ شیخ کی معمول کی

www.bhutto.org

گفتگو اِس قدر دلچسپ ہوتی تھی کہ آپ اُس سے بور نہیں ہو سکتے تھے۔ مزاح اُس کی زبان و بیان کا وافر حصہ ہوتا تھا۔ انتہائی سنجیدہ بات کو بھی مزاح کے انداز میں بیان کرنا اُس کا اندازِ گفتگو تھا۔ سنجیدگی اور متانت اُس شخص کے قریب سے بھی نہیں گذرتی تھی۔

بے حد لطیفہ گوئی اور پھکڑ بازی کا ماہر تھا۔ اُس کی تمام قابلیت، تمام ہنرمندی، زبانی کلام ہوا کرتی تھی۔ وہ باتوں کا پہلوان تھا۔ باتوں کا سیاست دان تھا۔ باتوں کا دھنی تھا۔ ہر بات کو افواہ بنانا اُس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ ہر وقت سنسنی پھیلانا، حیران کن باتیں کرنا اُس کا خاص فن تھا۔ اُس کی باتوں میں جھوٹ سچ کی کوئی تمیز نہیں کی جاسکتی تھی۔ اپنی اِس غیر مستقل مزاجی میں وہ اِس قدر بدنام تھا کہ اُس کی سچی باتوں کو بھی لوگ جھوٹ خیال کیا کرتے تھے۔ میں نے اُن کا جو مشاہدہ کیا، اُس کے اعتبار سے وہ کوئی عمل کا انسان نہیں تھا۔ بس زبانی کلامی ہر کام پورا کر دیتا تھا۔ ہر طرح کے سیاسی عمل سے بے بہرہ تھا اور سیاسی کام کرنے سے ناکارہ تھا۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ کسی سیاسی جماعت کے ساتھ مل ہی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی وہ کوئی نظریاتی کارکن تھا بلکہ وہ آخری حد تک توہم پرست ریکشنری، رجعت پسند، جاہل قسم کا آدمی تھا۔ ہر وقت پیری فقیری کے قصے سناتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ لاہور پر چند زندہ فقیروں کی حکومت ہے اور وہ اُن کا نائب ہے۔ لاہور میں ہر کام شیخ صاحب سے پوچھ کر کیا جاتا ہے۔ شیخ کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ لاہور کے تمام سنجیدہ سیاسی کارکن اور لیڈر شیخ صاحب کو سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آغا شورش کشمیری جیسا شخص بھی اُس پر شک کیا کرتا تھا۔ حالانکہ لوگ آغا صاحب پر بھی اِسی طرح شک کیا کرتے تھے۔ البتہ آغا صاحب کا اِس معاملہ میں کچھ مرتبہ اور مقام بلند تھا۔

ایک روز میں نے شیخ سرور اقبال کو کہا شیخ صاحب آج چائنیز لنچ ہوم میں چل کر آغا شورش کشمیری کے ساتھ بات چیت کی جائے۔ ہم چائنیز ہوم پہنچے تو آغا شورش کشمیری اپنا مجمع جمائے بیٹھا تھا۔ اُس کے ساتھ حبیب جالب، فاروق قریشی، ابو یوسف قاسمی، ڈاکٹر جمیل، چاچا شریف، مکڑا لیبر لیڈر فضل الرحمٰن ٹیپو اور خواجہ رفیق اور کچھ دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ شیخ سرور اقبال نے آغا شورش کشمیری کے ساتھ میرا تعارف کرایا۔ اپنے انداز میں کہا کہ آغا صاحب! یہ نوجوان شاعر آپ کے ساتھ ملنے کا بڑا اشتیاق رکھتا ہے۔ آغا نے کہا۔ کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے اپنا نام بتایا۔ باپ کا نام میں نے اشرف خان بتاتے ہوئے کہا کہ میرا باپ اور میرے ماموں عارف خان تھانیدار کو

www.bhutto.org

آپ جانتے ہیں۔آغا نے کہا تمہارا ابا تو بہت شریف انسان تھا۔صوفی صاحب کی وفات کا مجھے شیخ حسام الدین نے بتایا تھا۔یادر ہے کہ میرا والد اور شیخ حسام الدین امرتسری آپس میں دوست تھے اور ایک دوسرکے ساتھ بھائیوں کی طرح محبت کرتے تھے۔آغا صاحب کے ساتھ میرے والد کی شیخ صاحب کے گھر ملاقات ہوا کرتی تھی۔مگر میرے ماموں عارف صاحب کیلئے آغا صاحب کی یادیں کچھ تلخ تھیں کہ وہ سیاسی کارکنوں کو گرفتار کیا کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔اِس کے ساتھ ہی کہنے لگے کہ گکے زئیوں کی ذات ہی ایسی ہے کہ اِس میں ہر طرح کا آدمی موجود ہے۔اِس میں عبدالمجید سالک بھی ہے،لطیف انور گورداسپوری بھی ہے، ملک برکت علی بھی ہے اور ملک غلام محمد جیسا بدکلام اور بدمعاش بھی ہوتا ہے۔اِس کے ساتھ ہی آغا صاحب نے مجھے اپنے قریب کھینچ کر بٹھا لیا۔ کہنے لگا۔ یار! تم تو بہت خوبصورت نوجوان ہو۔کہو شاعری میں تمہارا کوئی استاد بھی ہے یا بے استادے ہو۔حبیب جالب نے آغا صاحب سے کہا کہ یہ ظہیر کاشمیری کا شاگرد ہے۔آغا میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔اوئے خانہ خراب اُو تینوں پکا کافر بنا دے گا۔وہ تو تمہیں پکا کافر بنا ڈالے گا۔میرا تو وہ چاچا ہے۔ میں اُس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔وہ مذہب شذہب خدا کو بالکل ہی نہیں مانتا۔وہ دہریا ہے،کیمونسٹ ہے۔وہ تیرا خانہ خراب کردے گا۔چلو چھوڑو اِن باتوں کو،کہو کوئی عشق وعشق بھی کرتے ہو۔کوئی کڑی شڑی وی کدی پھسائی یو۔کبھی کسی لڑکی کو بھی پھنسایا ہے یا کسی منڈے شنڈے کا بھی شوق ہے۔میں نے کہا آغا صاحب! میں آپ کے پاس آپ کو ایک صاحب علم شاعر،ادیب،صحافی اور لیڈر سمجھ کر آیا ہوں۔آپ کو بڑا انسان خیال کرتا ہوں۔میرا اتنا کہنے پر آغا صاحب نے گفتگو کا رُخ تبدیل کر دیا۔اچھا یار اپنا کلام سناؤ۔میں نے ایک غزل سنا دی۔اِس غزل کے ختم ہونے پر شیخ سرور اقبال نے آغا صاحب کو بتایا کہ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا بہت عاشق ہے۔اِس کے ساتھ ہی آغا شورش کشمیری نے ذوالفقار علی بھٹو کی تعریف کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔اُس نے اپنے مخصوص قدیم خطیبانہ انداز میں کہنا شروع کیا کہ قائداعظم کے بعد اگر کوئی سیاسی قائد پاکستان کے مطلع سیاست پر نمودار ہوا ہے تو بھٹو ہی ہے۔چلو تمہاری اور ہماری یہ شاعری کی قدر مشترک نکل آئی۔لو بھئی آج سے ہم پکے دوست ہو جاتے ہیں۔اِس طرح آغا شورش کشمیری سے میری پہلی ملاقات ختم ہوئی۔

جب ہم سب لوگ ہوٹل سے اُٹھ کر باہر آ گئے تو حبیب جالب مجھے ایک طرف لے گئے اور

www.bhutto.org

کہنے لگے کہ اِس کے اندر بہت بڑی داڑھی ہے۔ یہ اندر سے مودودی ہے۔ اِس سے پرہیز کرنا، فاصلہ رکھنا، یہ پکا غنڈہ ہے۔ یہ کوئی قابل اعتبار آدمی نہیں ہے۔ اِس کے ساتھ مجھے حبیب جالب نے اپنا واقعہ سنایا۔ جو واقعہ کچھ ہی عرصہ پہلے کافی ہاؤس میں آغا شورش کشمیری کے ساتھ حبیب جالب کو پیش آیا تھا۔ میں حبیب جالب کی زبانی وہ واقعہ سن کر سکتے میں آ گیا کہ یہ شخص جو ابھی خود کو اتنا مہذب ظاہر کر رہا تھا، اِس قدر عام سطح کا انسان بھی ہو سکتا ہے۔ حبیب جالب نے بتایا کہ کافی ہاؤس میں عبداللہ بٹ، عبداللہ ملک، ظہورالحسن ڈار، غلام محمد بٹ، پشاور کا سیاسی لیڈر لنڈ خور، فاروق قریشی، اِس طرح کے کئی پرانے لوگ بیٹھا کرتے تھے۔ اُن دنوں ظہورالحسن ڈار کے ساتھ آغا شورش کشمیری کی بڑی چپقلش چل رہی تھی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے خلاف پوسٹر بازی کیا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی ماؤں بہنوں تک کا پوسٹروں میں ذکر کیا کرتے تھے اور اُن کی یہ لڑائی انتہائی نچلی سطح کے گنوار لوگوں کی طرح کی تھی۔ جس میں کسی کو بھی اپنی عزت و آبرو کا کچھ خیال نہ تھا۔ کافی ہاؤس میں کچھ شرارتی لوگ بھی بیٹھا کرتے تھے۔ اُن کا کام یہ تھا کہ کاغذ کے ٹکڑے پر شورش کشمیری کے خلاف دو ایک غلط قسم کے فقرے لکھ کر کاغذ کو میز پر تہہ کر کے رکھ دیتے تھے۔ ایک روز اتفاق سے میں کافی ہاؤس آیا اور ایک خالی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ ساتھ والی میز پر آغا شورش کشمیری اور کچھ دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اِس میز پر بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ لہٰذا میں ساتھ والی میز پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی میں میز پر سے خط نما کاغذ کو اُٹھا کر پڑھنے لگ گیا اور میں نے خط کی عبارت دیکھتے ہی خط کو تہہ کر کے دوبارہ میز پر رکھ دیا۔ مجھے وہ تحریری سلسلہ یاد آ گیا جو اُن دنوں کافی ہاؤس میں حریفین کی جانب سے جاری تھا۔ حبیب جالب نے کہا، ایک دم آغا شورش کشمیری نے مجھے مخاطب ہو کر بے حد توہین آمیز جملوں کی بھرمار کرتے ہوئے کہا کہ کل تم کچھ حرام زادوں کے ساتھ میرا مذاق اُڑا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میں تو اُن کو اپنا کلام سنا رہا تھا۔ وہ مجھے داد دے رہے تھے۔ آپ کا تو کوئی ذکر ہی نہیں تھا۔ مگر آغا شورش کشمیری تو اپنے پورے جلال غنڈہ گردی میں تھا۔ کہنے لگا کہ اِن لوگوں سے تو میں بعد میں نپٹوں گا، پہلے میں آج تمہیں تو بندے کا پتر بنا دوں۔ اِس کے ساتھ ہی آغا نے میرا گریبان پکڑ لیا۔ میرے ساتھ انتہائی بدتمیزی کی۔ لوگوں نے بڑی مشکل کے ساتھ اِس ہاتھی نما انسان سے میری جان چھڑائی۔ برخوردار! یہ بہت خطرناک لوگ ہیں جو یہاں بیٹھتے ہیں۔ اب تم نے آنا جانا شروع کر دیا ہے۔ تم خود ہی اِن سب کو جان جاؤ گے۔ یہ تمام

قصہ اور یہ تمام باتیں حبیب جالب صاحب مجھے نہایت اعتماد کے ساتھ بتا رہے تھے۔ جس طرح میں اُن کا کوئی پرانا ملنے والا ہوں۔ آج میں سوچتا ہوں کہ وہ اعتماد ایک فنکار کا ایک اچھے انسان کا ایک دوسرے اچھے انسان کے ساتھ ملنے کا تھا جو ہم شاعروں اور ادیبوں میں ایک ہی ملاقات میں قائم ہو جایا کرتا ہے اور وہ اعتماد تمام عمر قائم رہا کرتا ہے۔ جبکہ عام انسانوں میں اِس طرح کبھی نہیں ہوا کرتا۔ حبیب جالب کے اِس قصے سے میرے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ گئی۔ میں جب تک آغا شورش کشمیری سے ملتا رہا، بے حد محتاط رہا۔ ہر چند آغا صاحب نے اپنے ہفت روزہ چٹان کے پہلے صفحے پر میری بڑی قد آور تصویر شائع کی۔ نیچے یہ عبارت تحریر کی: ''اُردو زبان کا اُبھرتا ہوا شاعر جس کے کلام میں انقلاب اور لہجے میں شباب ہے۔''

بس میرا معاملہ آغا صاحب سے ادب و آداب کی حد تک ہی رہا مگر بہت تھوڑے وقت کے بعد وہ حسب معمول ذوالفقار علی بھٹو کی جان کا دشمن بن گیا تو وہ ادب و آداب کا سلسلہ بھی اختتام پذیر ہو گیا۔

قارئین کتاب میرا اپنے سے سینئر لوگوں کو ملنے کا منصوبہ یہ تھا کہ میں اِس میدانِ سیاست میں نووارد تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اِن لوگوں کے قریب بیٹھ کر، اُن سے باتیں کر کے، اُن کے تجربات سے سیاست کا سبق حاصل کر سکوں۔ اِس معاملے میں میں ترقی پسند ادیبوں، شاعروں اور انقلاب پسند سیاسی کارکنوں کو ملنے کا بھی زیادہ شائق رہتا تھا۔

اِس معاملے میں پاکستان کی سیاست میں سوشلسٹ شہرت رکھنے والے لوگوں سے ملاقات کرنا میری اوّلین ترجیح ہوتی تھی۔ میں نے کتاب کے آغاز میں اپنے دوست آتش لدھیانوی کا ذکر کیا تھا۔ اُن کا گھر کرشن نگر میں ہوا کرتا تھا۔ ایک زمانے میں میاں بشیر ظفر ایڈووکیٹ اُن کے کرائے دار ہوا کرتے تھے۔ نام کے کرائے دار تھے بلکہ اُن کے گھر کے ایک فرد ہوا کرتے تھے۔ میں جب کبھی آتش لدھیانوی کی طرف جاتا تو اُن کو دیکھا ضرور کرتا تھا۔ اُن کے ساتھ زیادہ واقفیت نہ ہو سکی تھی۔ میاں بشیر ظفر کی سوشلزم خیالات کے معاملے میں بڑی شہرت تھی۔ ایک زمانے میں وہ اے۔ این۔ پی (ANP) ولی خان گروپ کے لیڈر اور سیاسی کارکن تھے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، اُن دنوں ANP دو دھڑوں میں بٹ چکی تھی۔ اے۔ این۔ پی کا یہ بٹوارہ بھی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے ہی کروایا تھا۔ [illegible] تا بھاشانی کا تھا جو ولی خان

کی نیپ سے علیحدہ ہو چکا تھا اور اِس دھڑے کی نیپ کو بھاشانی نیپ کہا کرتے تھے۔ مولانا بھاشانی صاحب مادرِ ملت کے انتخابات سے بہت تھوڑا عرصہ پہلے ہی چین گئے تھے۔ وہاں اُن کی ملاقات ماؤزے تنگ سے ہوئی تھی۔ اِس دھڑے کے لوگوں کے مطابق ماؤزے تنگ نے مولانا بھاشانی سے کہا کہ اِس خطے میں چین کو بڑی مشکل کے بعد ایک دوست حکمران جنرل ایوب خان میسر آیا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ جنرل ایوب خان کے اقتدار کو دوام حاصل ہو۔ آپ اِس سلسلے میں ہماری مدد کریں۔ حالیہ انتخابات میں جنرل ایوب خان کی مدد کریں۔ لہٰذا یہی وجہ تھی کہ بھاشانی گروپ نے مادرِ ملت کے مقابلے میں جنرل ایوب خان کی انتخابات میں حمایت کی تھی۔

میں آتش لدھیانوی کو ساتھ لے کر لاہور ہائی کورٹ میں میاں بشیر ظفر صاحب کو ملنے گیا۔ پہلے تو جب اُن کو میرے شاعر ہونے کا بتایا گیا۔ وہ حبیب جالب صاحب کی تعریف کرنے لگ گیا کہ وہ بہت بڑا شاعر ہے۔ اِس کے مقابلے میں وہ کسی دوسرے کو شاعر ہی تسلیم نہیں کرتا۔ حالانکہ یہ فضول بات تھی۔ میرا حبیب جالب کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ وہ مجھ سے پہلے حزبِ اختلاف کے میدان میں گرج رہے تھے۔ میں اُن کے بعد آنے والوں میں سے تھا۔ بڑی مشکل کے بعد میں اُن سے ملاقات کرنے کا مقصد بیان کرنے میں کامیاب ہوا۔ میں نے اُن سے کہا کہ زندگی کا ہر میدان نئے لوگوں کی شرکت کا محتاج ہوتا ہے۔ سیاست کے میدان میں بھی نئے لوگوں کی ضرورت ہے۔ میں اِس وادی خارزار میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ آ چکا ہوں۔ میری کچھ رہنمائی فرمائیں۔ اُنہوں نے مجھ سے پہلا سوال کیا کہ تمہیں پاکستان میں کونسا لیڈر پسند ہے۔ میں نے نہایت سادگی کے ساتھ کہا۔ ذوالفقار علی بھٹو۔ میں نے ذوالفقار علی بھٹو کا نام کیا لیا کہ اُن کے منہ سے تھوک جاری ہو گیا۔ اُن کے ہونٹوں پر جھاگ جم گئی۔ وہ کہنے لگے کہ وہ کل کا چھوکرا۔ ابھی تو اُس کے دودھ کے دانت ہیں۔ وہ اپنے منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے۔ ٹائی سوٹ پہنتا ہے۔ راتوں کو عیش کرتا ہے۔ وہ کبھی لیڈر نہیں بن سکتا۔ کچھ دیر انتظار کرو۔ وہ دوبارہ ایوب خان کا وزیر بن کر ایوب خان کی نوکری کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ اُنہوں نے تو اِس سے بھی زیادہ کچھ کہا مگر میں اِنہی الفاظ پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں۔ نہ تو اُنہوں نے میرے ساتھ پاکستان کے عوام کے بارے میں کوئی بات کی، نہ سیاسی جماعتوں کے کردار و عمل پر کچھ کہا۔ نہ ایک سیاسی کارکن کے کردار پر کچھ روشنی ڈالی۔ میں اُن سے اِس پہلی ملاقات میں ہی بڑا بیزار ہوا اور اُن کے پاس سے اُٹھ کر

www.bhutto.org

چل دیا۔ وہ بڑی زبردستی سے مجھے بٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر میں نے باقاعدہ بھاگ کر اُن سے جان چھڑائی۔

امین مغل کے ساتھ ملاقات

اُن کے بعد حبیب جالب صاحب نے مجھے کہا کہ امین مغل بہت دانشور اور انقلابی سیاسی انسان ہے۔ اُس سے ملاقات کرو۔ یہ ملاقات بھی میرے اِسی تجسس کا حصہ تھی جو میں دوستوں سے کہتا رہتا تھا کہ مجھے ایسے لوگ بتاؤ جن سے میں کچھ سیکھ سکوں۔ وہ ایک مہین اور باریک انسان تھے۔ پتلی سی عینک لگاتے تھے۔ پاؤں میں چپل پہنتے تھے اور پاجامہ کُرتا پہنتے تھے۔ اُن سے میں نے سوال کیا کہ ایک انقلابی نظریاتی سیاسی کارکن بننے کے لئے کن باتوں کی ضرورت ہے۔ اُن کا جواب تھا۔ ایک سیاسی کارکن پہلے نمبر پر کارل مارکس کی ''داس کیپٹل'' کو پڑھے۔ انٹرنیشنل کیمونزم کی تاریخ پڑھے۔ لینن کے ورکس پڑھے۔ سوویت روس کے انقلاب کی تاریخ پڑھے۔ میں نے اُن سے کہا حضرت صاحب! اِس کیلئے تو بہت وقت کی ضرورت ہے۔ یہ تمام چیزیں پڑھتے پڑھتے تو میں بوڑھا ہو جاؤں گا۔ پارٹی کا کام کب کروں گا۔ وہ فرمانے لگے کہ تم سب سے پہلے لیبر میں جا کر کام کرو۔ لیبر لیڈر بن جاؤ۔ یہ کام بہت آسان ہے۔ اِس کیلئے زیادہ پڑھا لکھا ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں نے کہا لیبر میں تو میں تب کام کروں کہ میں خود لیبر کا کام کروں۔ عملی طور پر مزدوری کروں، کسی مل میں ملازمت کروں تا کہ میرا لیبر میں کام کرنے کا جواز پیدا ہوا اور مزدور لوگ مجھے اپنے جیسا خیال کریں اور مجھ پر اعتماد کریں۔ میں مزدوروں کا ایک ہمدرد تو ہو سکتا ہوں، عملی طور پر لیڈر کیسے بن سکتا ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ میری طرف دیکھو۔ میں ایک لیبر لیڈر بھی ہوں۔ میں نے کہا آپ کس مِل میں کام کرتے ہیں۔ کہنے لگے ہرگز نہیں میں تو تعلیم دان ہوں۔ میں نے کہا پھر آپ فیکٹری کے مزدوروں کے لیڈر کس طرح بن سکتے ہیں۔ کہنے لگے۔ جو لیڈر ہوتا ہے، اُس کے لئے کام کرنا ضروری نہیں ہوتا۔

میں نے اُن سے کہا کہ میرے استاد ظہیر کاشمیری صاحب کا کہنا ہے کہ پاکستان میں مزدور کسان قیادت اِس لئے کمزور ہے کہ کوئی مزدور رہنما مزدوری کا کام خود کرتا ہے نہ کوئی کسان رہنما کسان ہے۔ یہ دونوں غیر حاضر لیڈر ہیں۔ نہ کوئی لیبر لیڈر لیبر کے درمیان رہتا ہے اور نہ کوئی

www.bhutto.org

کسان لیڈر کسانوں کے درمیان کھیتوں میں رہتا ہے۔ یہ تمام لیڈر اپنے اچھے گھروں میں بیٹھ کر مزدوروں، کسانوں کی لیڈری چمکاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک پاکستان میں نہ تو مزدوروں کی کوئی منظم تنظیم بن سکی ہے اور نہ ہی کسانوں کی بن سکی ہے۔ یہ تمام تنظیمیں شخصی تنظیمیں ہیں۔ چند شخصیتوں کے نام سے جانی جاتی ہیں اور مختلف سیاسی پارٹیوں کی حمایت کرتی ہیں اور آپس میں سخت اختلاف رکھتی ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ بھوک اور ننگ میں کیا اختلاف ہو سکتا ہے۔ بابا جی کہتے ہیں کہ یہ چیزیں دکانداری بن چکی ہیں۔ تمام تو نہیں مگر اکثریت ان لیڈروں کی حکومت کے ہاتھوں بک چکی ہے اور اپنی سیاسی طاقت اور اہمیت کھو چکی ہیں۔

میری ان باتوں پر امین مغل صاحب کو بہت غصہ آ گیا۔ کہنے لگے جو ہم کو سی۔ آئی۔ ڈی کا کہے، اُس کی ہم ایسی کی تیسی کر دیں گے۔ میں نے کہا۔ بابا ظہیر کاشمیری نے آپ کو سی۔ آئی۔ ڈی کا ہرگز نہیں کہا۔ آپ کا تو کبھی اُن کے ساتھ ذکر بھی نہیں ہوا۔ وہ کہنے لگے۔ یہ پرانے ناکام لوگ آج کی صورتحال تو سمجھ ہی نہیں سکتے۔

شام کا وقت تھا امین مغل صاحب میجر اسحاق کے بھائی چوہدری انور ایڈووکیٹ کے دفتر بیٹھے ہوئے تھے ان کے ساتھ ان کے عشرہ مبشرہ میاں منت اللہ بھی تھے۔ جالب صاحب تو مجھے وہاں لے کر جانے والوں میں سے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے بابا جی کی وہ باتیں نہیں کہنی چاہئیں تھیں جو میں نے ان کے حوالے سے امین مغل کو کہہ دیں تھیں۔ میں نے گفتگو کا سلسلہ تبدیل کرنے کے لئے کہا کہ آپ تو تجربہ کار لوگ ہیں آپ ہی مجھ جیسے نئی نسل کے نوجوانوں کو پاکستان کی سیاست کے سلسلہ میں حصہ لینے کے لئے صحیح راستہ بتا سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ نئی نسل کو پہلے تو یہ یقین کر لینا چاہئے کہ یہ پاکستان غلط بنا ہوا ہے، یہ غلط تقسیم ہے، سامراجی تقسیم ہے، جب تک ہم اس تقسیم کو ختم نہیں کریں گے ہم صحیح انقلابی سیاست نہیں کر سکتے۔ پاکستان کو دوبارہ ہندوستان کا حصہ بنانا ہوگا۔ میں نے ان کو کہا کہ آپ لوگوں کی ان باتوں کی وجہ سے لوگ آپ کو ہندوستان کا حامی کہتے ہیں۔ آپ کو پاکستان کا مخالف کہتے ہیں۔ میں نے ان کو کہا کہ پاکستان کے اندر رہ کر پاکستان کے خلاف سیاست نہیں کی جا سکتی۔ لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ امین مغل نے کہا کہ صرف پنجابی، پنجابی کے ساتھ بہت بڑی گالی دی جو میں تحریر نہیں کرنا چاہتا۔ وہ پاکستان پاکستان کرتے ہیں۔ باقی تمام ہندوستان کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ پاکستان کی

www.bhutto.org

سیاست پنجاب کے عوام کے بغیر تو نہیں کی جا سکتی۔ قصہ مختصر ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ عوام کچھ نہیں ہوتے چند دانش وروں کو فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ عوام بچے ہوتے ہیں بچے کڑوی دوائی نہیں پیا کرتے ان کو گردن سے پکڑ کر دوائی پلانی پڑتی ہے۔ ہم کو طاقت حاصل کر کے یہاں انقلاب برپا کرنا ہے۔ وہ طاقت ہم کو بھارت اور روس سے ملے گی۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا کہ تم پاکستان میں کس سیاست دان کو پسند کرتے ہو۔ میری شامت ملاحظہ کریں کہ میں نے یہاں بھی ذوالفقار علی بھٹو کا نام لے دیا۔ بھٹو صاحب کا نام لینا تھا کہ وہ باریک سا آدمی مشتعل ہو گیا۔ امین مغل نے مجھے بہت سنائیں۔ کہنے لگا کہ تم نے خوامخواہ میرا وقت ضائع کیا ہے۔ تم لوگ کسی آدمی کے جاہل عوام میں مقبول ہو جانے سے اس کو لیڈر خیال کرتے ہو۔ امین مغل کا سوال تھا تم بھٹو کو کیوں پسند کرتے ہو۔ میں نے جواب میں کہا کہ اس لئے کہ پاکستان کے لوگ اس کو پسند کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جاہل لوگ تو قائداعظم کو بھی لیڈر سمجھتے تھے۔ انقلاب جاہل عوام برپا نہیں کیا کرتے۔ انقلابی لیڈر انقلاب برپا کیا کرتے ہیں۔ انقلابی لیڈروں کے ساتھ چند پڑھے لکھے لوگ ہوا کرتے ہیں لوگوں کے ہجوم ان کے ساتھ نہیں ہوا کرتے۔

امین مغل کے ساتھ میری ملاقات اِنہی الفاظ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ جب تک وہ پاکستان میں رہے، پاکستان پیپلز پارٹی کے پرلے درجے کے دشمنوں میں شمار رہے۔ آجکل وہ انگلستان میں سیاسی پناہ لئے ہوئے ہیں اور مختار رانا کی طرح پاکستان واپس آنے کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لاتے۔ گویا انگلینڈ میں مزدور کسان انقلاب برپا کر رہے ہیں۔ ہر چند یہ مخلص لوگ تھے مگر اپنی انتہا پسندی سے ضائع ہو گئے۔

خواجہ رفیق کے ساتھ ملاقات

اپنے اِس تجسس میں، میں نے خواجہ رفیق (مرحوم) کے ساتھ ملاقات کی۔ خواجہ رفیق صاحب کو میں نے اِن تمام لوگوں سے مختلف انسان پایا۔ نہ تو اِس انسان میں اپنی علمیت کا کوئی زعم تھا اور نہ اپنی لیڈری کا کوئی گھمنڈ تھا۔ بہت سادہ طبیعت آدمی تھا۔ سیدھی سادی باتیں کرتا تھا۔ وہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے جب تک تمہارا بھٹو سیاست میں نہیں آتا تم میرے ساتھ کام کرو۔ اِس طرح خواجہ صاحب کے ساتھ میرا کافی اُٹھنا بیٹھنا ہو گیا۔ اُن کے ساتھ میں کئی

جلسوں میں جا کر نظمیں پڑھتا تھا۔ مادرِ ملت کی وفات پر خواجہ صاحب کی قیادت میں ہم لوگوں نے ایک اچھا خاصا جلوس نکالا اور انار کلی بازار تک جلوس لے کر گئے۔ جس کی وجہ سے انار کلی بازار اور مال روڈ کی تمام دکانیں بند کر وا دی گئیں۔ خواجہ صاحب کے ساتھ شرکت کا یہ میرا آخری جلسہ یا جلوس تھا۔ اِس کے بعد بھٹو صاحب واپس پاکستان تشریف لے آئے اور میں اُن کی قیادت کی پیروی کیلئے وقف ہو کر رہ گیا۔ مگر خواجہ صاحب کے ساتھ ایک خصوصی تعلق بن گیا تھا، وہ ہمیشہ قائم ہی رہا۔ خواجہ محمد رفیق ہر چند بہت حلیم انسان تھے مگر امرتسری کشمیری تھے۔ ذرا سی بات پر وہ بھی بھڑک جایا کرتے تھے۔ میں اُن کے ساتھ جیسا کہ پیچھے لکھا ہے، دو چار جلوسوں میں شریک ہوا تھا۔ اُن کے جلوس میں ایک بات بار بار دیکھنے کو ملتی تھی۔ اُن کا ایک جیالا ورکر نذیر ہوا کرتا تھا۔ لوگ اُس کو نذیر ڈرائیور کہا کرتے تھے۔ وہ شخص ہر جلوس میں پولیس کو دیکھ کر زیادہ شور کرنے لگ جایا کرتا تھا۔ اُن دنوں ہمارے جلوس کی تعداد کم ہوتی تھی۔ پولیس کی نفری زیادہ ہوتی تھی۔ اپنی تعداد کی زیادتی کی وجہ سے پولیس جلوس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ انار کلی بازار کے جلوس میں پہلے تو پرانی انار کلی کے آغاز میں ہی پولیس کے آفیسروں سے خواجہ صاحب کے مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ پولیس اور خواجہ صاحب کے درمیان گفتگو میں نذیر نے پولیس والوں سے خود باتیں کرنا شروع کر دیں۔ خواجہ صاحب نے نذیر کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ نذیر بڑی خوشدلی کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کے لئے جلوس رُک گیا تھا۔ دوبارہ آگے بڑھنا شروع ہو گیا۔ جب انار کلی کے درمیان پہنچے تو ایک دوسرے پولیس کے جیش کا سامنا ہو گیا۔ وہاں بھی خواجہ صاحب کے مذاکرات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مذاکرات کے دوران نذیر نے دوبارہ دخل در معقولات کا عمل دہرایا۔ دوبارہ خواجہ صاحب نے اِس کو تھپڑ مارا۔ کچھ دیر بعد جلوس آگے چلنے لگ گیا۔ جب لاہوری چوک پہنچ گئے تو پولیس کا ایک اور آفیسر خواجہ صاحب کے سامنے آیا اور جلوس منتشر کرنے کا کہنے لگا۔ لاہوری چوک میں ویسے بھی جلوس کو ختم کرنے کا پروگرام تھا۔ جس کا خواجہ صاحب پہلے ہی اعلان کر چکے تھے۔

مگر جب خواجہ صاحب اِس پولیس آفیسر کے ساتھ گفتگو کرنے میں مصروف ہی ہوئے تھے کہ نذیر تیسری بار بھی اُن کی گفتگو میں مخل ہوا جس طرح پہلے دو بار ہو چکا تھا تو خواجہ صاحب نے تیسری بار نذیر کو تھپڑ رسید کیا۔ پولیس والے سے گفتگو کا معاملہ ختم ہوتے ہی جلوس کو ختم کرنے

کا اعلان کر دیا گیا۔ جب ہم واپس چائنز لنچ ہوم کی طرف انار کلی سے پیدل آ رہے تھے تو میرے ذہن میں بار بار نذیر کے تھپڑ کھانے کا خیال آ جاتا تھا۔ آخر میں نے خواجہ صاحب سے پوچھ ہی لیا۔ میں نے کہا۔ خواجہ صاحب! یہ نذیر کو تھپڑ کیوں آپ مارتے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب کہنے لگے۔ اِن تھپڑوں نے ہی تو جلوس کو کامیاب بنایا ہے۔ جب میں نذیر کو تھپڑ مارتا تھا تو پولیس ڈر جاتی تھی لہٰذا ہمارا جلوس آگے بڑھتا رہتا تھا۔ اِس جلوس کے بعد بھی ایک آدھ بار میں خواجہ صاحب کے جلسے میں شریک ہوا تھا۔ میں خواجہ صاحب سے کچھ دور ہو جایا کرتا تھا کہ کسی جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے نذیر کی طرح خواجہ صاحب مجھے بھی تھپڑ نہ مار دیں، بہرصورت وہ نذیر تھپڑ کھانے کا بادشاہ تھا۔

مجھے ایسا کوئی مظاہرہ یاد نہیں ہے جس میں نذیر کو خواجہ صاحب نے تھپڑ نہ مارا ہو۔ جنرل ایوب خان کی مارشل لاء حکومت کے خلاف خواجہ رفیق کی جدوجہد بے مثال تھی۔ وہ شخص دل و جان کے ساتھ ایوب آمریت کے خلاف تھا جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اُن کی شہادت کی بات کتاب میں کچھ آگے جا کر بیان ہوگی۔

دو بزرگوں کی ایک دلچسپ ملاقات

یہ 1967ء کا ہی سال تھا۔ میں بابا ظہیر کاشمیری کے گھر حسب معمول صبح پہنچا تو بابا جی اپنی ٹیگور نما سنہری زلفیں سنوار رہے تھے۔ اِس قسم کی حالت میں اُن کو کہیں جانا ہوتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ آج تو لگتا ہے کہ آپ کسی معشوق سے ملنے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے خوامخواہ سولہ فٹ کا معشوق البتہ محبوب کہہ لو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یوں تو بابا ظہیر اپنے ملنے والوں کے ساتھ ہر ملاقات میں جذباتی دکھائی دیا کرتے تھے۔ وہ دوسروں کے ساتھ ملنے میں خوشی محسوس کیا کرتے تھے مگر آج کی ملاقات کی تیاری میں وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آ رہے تھے۔ ہم دونوں استاد شاگرد پیدل ہائی کورٹ کی طرف چلنے لگے۔ مال روڈ پر جا کر میں نے پوچھا کہ آخر وہ کون ہے جس کے لئے آج آپ اِس قدر خوش ہو رہے ہیں۔ گانے گا رہے ہیں۔ گانا گانے کا احوال یوں ہے کہ جب وہ گھر سے نکل کر میرے ساتھ چل رہے تھے تو پیلوں کی ٹھمری کے بول گنگناتے چلے جا رہے تھے۔

www.bhutto.org

سیاں جی اُتریں گے پار
ندیا دھیرے بہو ناں

اُن کی خوشی کے بارے میں میرے پوچھنے پر اُنہوں نے گانا بند کر دیا۔ کہنے لگے آج میں تم کو ایک دیو کے ساتھ ملانے لے جا رہا ہوں۔ تم دیکھو گے تو ڈر جاؤ گے۔ آج میں تم کو پنجاب کے ایک لٹھ مار جاٹ کو دکھاؤں گا۔ ایک مکمل وجیہہ انسان سے ملواؤں گا۔ ایک اصلی اور خالص انسان سے ملاؤں گا۔ اُس کا نام میجر اسحاق ہے۔ ایک بہت بڑا کامریڈ اور انقلابی ہے۔ اُن کے نام سے مجھے یاد آ گیا کہ یہ شخص فیض صاحب کے ساتھ پنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوا تھا۔ بہت مشہور آدمی تھا۔ ہم باتیں کرتے کرتے ہائی کورٹ کے پیچھے ایک پرانی سی عمارت میں پہنچ گئے۔ جہاں پر میجر اسحاق صاحب اپنے بھائی چوہدری انور علی ایڈووکیٹ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ جب اوپر اُن کے کمرے میں گئے تو بابا جی اور میجر صاحب کافی دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر رہے۔ اُن کے آپس میں بڑے چول ہوئے۔ کچھ ساعتوں کے بعد وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوئے۔ میں نے بھی سلام عرض کیا۔ میری شاگردی کا سُن کر ہنس پڑے۔ جو کچھ اسی سکھیا اے اوتویں سکھ لے۔ اِس کے ساتھ ہی بھاری بھر کم آواز کا قہقہہ بلند کرتے ہوئے بابا جی کا ہاتھ تھام کر خوش ہونے لگے۔ میجر صاحب ایک لمبے تڑنگے ڈیل ڈول کے انسان تھے۔ اتنی بڑی جسامت کے باوجود ایک عجیب قسم کی مردانہ خوبصورتی اُس شخص کی شخصیت کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔ اُن کے اَنگ اَنگ سے انسانی محبت اور وقار پھوٹتا تھا۔ وہ بہت مضبوط قوی ہیکل آدمی تھے۔ سراپا محبت ہی محبت تھے۔ وہ ایک دلکش انسان تھے۔ میری اُن کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔

میں بہت حیرانی کے ساتھ اِن دونوں بزرگوں کی ملاقات کا نظارہ کر رہا تھا۔ کہاں وہ قہقہے لگا رہے تو ایک دم گفتگو کا انداز بے حد سنجیدہ بن گیا۔ اِن دونوں صاحبان میں میجر صاحب کے دو افسانوں کا ذکر شروع ہو گیا۔ ایک افسانہ "مصلّی" تھا اور دوسرا "قفس" تھا۔ وہ دونوں محوِ گفتگو تھے۔ میں خاموش سننے والا تھا۔ اُن دنوں مارکسزم کی جدلیاتی بحث سے میں کچھ زیادہ واقف نہیں تھا۔ دونوں حضرات اپنے اپنے دلائل و براہان میں اِس قدر مستغرق تھے کہ اُن کو میری موجودگی کا کچھ احساس تک نہ تھا۔ خود میں بھی دم سادھ کر اُن کی بحث کا ہر حرف ذہن نشیں کر رہا تھا۔ جو بات اُن کی بحث سے میری سمجھ میں آئی۔ وہ یہ تھی کہ ثقافتوں کی تعلیم انقلاب میں کامیابی کے بعد ہی

www.bhutto.org

لوگوں میں ممکن ہو سکتی ہے۔ اِس سے پہلے اُس کے نقش نقوش تو لوگوں کو سمجھائے جا سکتے ہیں، اس سے زیادہ اِس معاملے کو لوگوں تک لے جانے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اِس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انقلابی جماعت تو ایک مسلسل جنگ کی شکل میں ہوتی ہے۔ مقابل قوت ہر جگہ اِس جماعت سے بہت طاقتور ہوتی ہے۔ وہ قوت ہر جگہ ایک منظم مسلح فوج ہوتی ہے، پولیس ہوتی ہے، منظم ریاستی ادارے ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی سامراج کی ہر طرح کی مدد اِس قوت کو حاصل ہوتی ہے۔ ملک کے اندر اشرفیہ طبقے، سرمایہ دار، جاگیردار بھی اِس کے خلاف ہوتے ہیں۔ ایک انقلابی جماعت کی تو وار آف ایگزسٹنس ہوتی ہے۔ اُس کے لئے اپنے وجود کو قائم رکھنا ہی اُس کی سب سے بڑی جدوجہد ہوتی ہے۔ اِس صورت میں عوام کی انقلابی تعلیم کیلئے ڈرامے وغیرہ دکھانے کی مہلت ہی نہیں مل سکتی۔ یہ تمام آرگومنٹ بابا ظہیر کاشمیری میجر صاحب کو کہہ رہے تھے۔ ہم بہت بڑی بنیادی غلطی کر چکے ہیں کہ عوام کی قوت پر انحصار نہیں کرتے تھے۔ جبکہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے صحیح اقدام کیا تھا۔ اُس نے ایک سیاسی پارٹی کانگریس کے ساتھ اپنی جدوجہد کو مخلوط رکھا اور وہ ہندوستان کے عوام کیلئے ایک بہت بڑی قوت بن گئی۔ جبکہ ایک تو ہم لوگوں کو پاکستان میں کوئی عوام میں مقبول پارٹی کا سہارا ہی نہیں مل سکا۔ ہم ایک ایسی انقلابی جدوجہد کی طرف چل نکلے جو بزور قوت ایک طرح کی فتح پا کر اقتدار حاصل کر سکتی ہے۔ جبکہ ہم کسی اعتبار سے بھی اِس قابل نہیں تھے کہ ہم پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی طاقت کا سامنا کر سکتے اور اُن سے اقتدار چھین سکتے۔ ہمارا خیال تھا کہ انقلاب باہر سے کوئی طاقت آ کر برپا کر دے گی، جو ممکن نہیں ہو سکا۔

اِس طرح کی بہت لمبی بحث چلتی رہی مگر میجر صاحب بابا صاحب کے ساتھ مکمل طور پر متفق نہیں ہو رہے تھے۔ اُن کا کچھ اپنا نقطہ نظر تھا۔ وہ نقطہ نظر وہ میری موجودگی کی وجہ سے کھل کر بیان نہیں کر پا رہے تھے۔ کچھ مبہم قسم کے حوالوں اور اشاروں کنایوں کے ساتھ وہ باتیں کرتے جاتے تھے جن کو ظہیر کاشمیری مکمل طور پر سمجھتے تھے اور اُن کا جواب بھی دیئے جا رہے تھے۔ اُن کی باتیں کرنے کی ٹرمنالوجی کچھ اپنی ہی تھی۔ میجر صاحب اپنی گفتگو کے دوران کچھ ایسے لوگوں کے نام لے رہے تھے جن کا تعلق پاکستان سے باہر کے لوگوں سے تھا۔ جن میں سے میں کسی ایک کو بھی نہیں جانتا تھا۔ اِن لوگوں ک حوالوں کو صرف بابا ظہیر کاشمیری ہی جانتے تھے۔ میرے لئے اُن کی گفتگو ایک مشکل قسم کی بحث کی صورت میں تھی جس کو میرے پاس خاموشی سے سننے کے علاوہ کوئی

www.bhutto.org

چارہ نہ تھا۔ البتہ اُن کی بات چیت مین روس اور ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کا ذکر بار بار کیا جا رہا تھا۔ اُن کی اِس عارفانہ جدلیات کی بحث وتکرار میں آخر کچھ آسان باتیں بھی ہوئیں جن کو میرے لئے سمجھنا مشکل نہیں تھا۔

اِس آسان گفتگو میں بابا جی کا ایک معنی خیز جملہ مجھے آج تک یاد ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا: ''میجر صاحب! ہم کئی ایک وجوہات کی بنا پر فوجی آمریت کے ساتھ کمپرومائز کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہم تمام کیمونسٹوں کی تعلیم وتربیت کا تمام زور ثقافت پر آ گیا ہے۔ اب ہماری زندگی کا مقصد ثقافتی سرگرمیاں ہی رہ گیا ہے۔ مگر یہاں پر بھی ہم مشکل سے دوچار ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے ہمارے ذہن میں ثقافت کا تمام ناک نقشہ پنجاب کی ثقافت کی شکل میں پھل پھول رہا ہے۔ ہم نے آج تک بلوچ ثقافت، پٹھانوں کی ثقافت، سندھ کی ثقافت پر نہ تو کچھ کام کیا ہے اور نہ ہی اُن ثقافتوں کی ترجمانی کی ہے۔ ہم لوگ سکھ پنجاب اور مسلمان پنجاب کی ثقافت کے شیدا دکھائی دیتے ہیں مگر دوسری ثقافتوں سے کٹے ہوئے ہیں۔ اگر ہم ثقافتی قوت کے ساتھ کوئی سوشلسٹ انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں تو کیا ہمارا انقلاب صرف ایک ہی ثقافتی رقبے پر برپا ہوگا۔ یہ تو وہی بنیادی تضاد آ جائے گا جو بالشیولکوں اور منشویکوں میں تھا۔ ہر چند یہ تقاد ہو بہو تو اُس طرح کا نہ ہوگا مگر اِس تقاد کی ایک شاخ ضرور ظاہر ہوگا''۔ ظہیر صاحب نے کہا کہ میرے نقطہ نظر کے مطابق انقلابی سرگرمیوں کو اگر ایک محدود رقبے میں جاری کیا جائے تو وہ جلد ہی مشکلات کا شکار ہو جائیں گی۔ اِس کے برعکس اگر اِس کے دائرے کو وسیع کر دیا جائے تو کام کرنے میں کارکنوں اور لیڈروں کو آسانی ہوگی۔'' قصہ مختصر یہ ملاقات اِنہی باتوں پر ختم ہوگئی۔ یہ میری میجر صاحب سے ایک مختصری ملاقات تھی مگر میجر اسحاق میرے دل ودماغ پر نقش ہو گئے۔ میں اُس شخص کو کبھی بھلا نہیں پایا۔

لندن میں بھٹو صاحب کی تقریر

اُن دنوں میں اور میری طرح کے نہ جانے کتنے لوگ ذوالفقار علی بھٹو کی پاکستان واپسی کے منتظر تھے۔ اُن کے بارے میں جس طرح کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کوئی اُن کے حق میں بات کرتا تھا، کوئی اُن کے خلاف بات کرتا تھا۔ مگر خدا گواہ

www.bhutto.org

ہے کہ میرا اُس شخص پر پہلے دن سے ایمان بہت پختہ تھا۔ میرے دل میں اُن کے بارے میں شک شبہ نہیں تھا۔ مگر کبھی کبھی حالات اور واقعات کی بنا پر مایوسی ضرور ہو جایا کرتی تھی۔

اُن دنوں جب میں بھٹو صاحب کی حمایت میں ہر جگہ جُتا ہوا تھا۔ بھٹو صاحب نے 31 اکتوبر 1966ء کو لندن میں مقیم پاکستانیوں سے کاؤن وے ہال (Conway Hall) میں خطاب کیا۔ اِس خطاب میں بھٹو صاحب نے پاکستان کے متفکر لوگوں کو مستقبل کی نوید دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کے لوگو! میں تمہارے ماضی کے نقصانات کا ازالہ کروں گا۔ لندن کا یہ جلسہ وہاں کی تمام ترقی پسند پاکستانی تنظیموں نے کرایا تھا۔ اِس جلسے میں بھٹو صاحب پر زور دیا گیا کہ وہ ایک بائیں بازو کی پارٹی قائم کریں جو نعروں کی بجائے منشور پر عمل درآمد کرنے والی پارٹی ہو۔ بھٹو صاحب نے اُن کو یقین دلایا کہ وہ اُن کو کبھی مایوس نہیں کریں گے۔ بھٹو صاحب کی یہ تقریر ہم لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا پیغام تھی۔

بھٹو صاحب اکتوبر 1966ء کو لندن سے واپس آ گئے اور حکومت چھوڑنے کے بعد وہ پہلی مرتبہ لاہور تشریف لائے۔ اُن کا قیام فلیٹز ہوٹل میں تھا۔ جس صبح میں اُن کو ملنے ہوٹل میں گیا، وہاں ایم۔ ایس۔ ایف کے کچھ عہدے دار اچھی خاصی تعداد میں طالب علموں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ وہی مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن تھی جس نے وزیر خارجہ پاکستان ہوتے ہوئے بھٹو صاحب کو اُن کی اعلیٰ قومی خدمات کے اعزاز میں اپنا پیٹرن ان چیف بنایا تھا۔ اُن کے علاوہ نوائے وقت اخبار کے شیخ حامد محمود، مجید نظامی، عبداللہ ملک، آغا شورش کشمیری، شیخ صفدر علی، ڈاکٹر مبشر حسن، میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ، حسین نقی، میاں محمود علی قصوری، آئی۔ اے۔ رحمٰن اور دوسرے بہت سے وکلاء حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس وقت وہاں پر ''حمید نظامی ڈے'' منانے کا اعلان کیا گیا۔

حمید نظامی ڈے منانے کا اعلان

میری یادداشت کے مطابق اُس وقت حمید نظامی ڈے کے جلسے کے بندوبست کے لئے کچھ لوگوں کی انتظامی کمیٹی بھی بنا دی گئی۔ کمیٹی کا تو اعلان نہ کیا گیا مگر منتظمین جلسہ کیلئے کچھ نام طے پا گئے۔ اِن ناموں میں آغا شورش کشمیری، مجید نظامی، شیخ حامد محمود، عبداللہ ملک، ڈاکٹر بشر حسن، میاں محمود علی قصوری، مہناج برنا کے نام شامل تھے۔ وہاں پر موجود طالب علم لیڈروں کو کہا گیا کہ وہ

اپنے اپنے کالجوں میں جا کر اِس جلسے کا اعلان کریں۔لہٰذا23 نومبر 1966 جلسے کی تاریخ طے پاگئی اور یہ جلسہ وائے۔ایم۔سی ہال مال روڈ میں منعقد ہونا طے پا گیا۔

جلسہ کے دن ہر چند حکومت نے تمام مال روڈ کو بند کردیا تھا مگر لوگ تھے کہ صبح 9 بجے سے پہلے ہی ہال میں پہنچ چکے تھے۔10 بجے کے بعد ہال کے اندر کوئی شخص داخل نہیں ہوسکتا تھا۔اِس قدر ہجوم تھا کہ مال روڈ نیلا گنبد کمرشل بلڈنگ انسانوں کے ہجوم سے اٹ چکے تھے۔وائی۔ایم۔سی کے باہر ہرطرف انسان ہی انسان تھے۔بقول آغا شورش کشمیری:"مال روڈ کی تاریخ میں اتنا بڑا انسانوں کا اکٹھ اِس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا"۔جلسے میں بھٹو صاحب کے علاوہ دوتین لوگوں کی تقریروں کا اعلان کیا گیا۔دوتین لاؤڈ اسپیکر وائی۔ایم۔سی ہال کے باہر سڑک کی طرف لگا دیئے گئے۔ہال کے اندر خلقت اِس قدر زیادہ تھی کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔سب سے پہلے حبیب جالب کی نظم پڑھائی گئی۔اِس کے بعد آغا شورش کشمیری نے اپنی تقریر شروع کی مگر لوگ بھٹو زندہ باد،بھٹو زندہ باد کے نعرے مارے جارہے تھے۔اِس قدر شوروغل کے پیش نظر آغا شورش کشمیری نے اپنی تقریری ختم کردی اور باقی مقررین نے بھی اپنی تقریریں موقوف کردیں اور بھٹو صاحب کوتقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔

بھٹو صاحب نے تقریر میں ایک گھنٹے تک خطاب کیا۔اُن کے خطاب کے دوران لوگوں نے بڑی تالیاں بجائیں۔بڑی نعرے بازی ہوئی۔جلسے کے اختتام پر بھٹو صاحب کو وائی۔ایم۔سی بلڈنگ کی بیک سائیڈ سے بانس کی لمبی سیڑھی لگا کر نیلے گنبد کی طرف اُتارا گیا اور وہ وہاں سے واپس ہوٹل چلے گئے۔عوام اور طالب علم جلوسوں کی شکل میں ہرطرف پھیل گئے۔تمام لاہور شہر میں بھٹو بھٹو ہوگئی۔

بھٹو صاحب کا حوصلہ شکن بیان

ہم لوگ جو اُس وقت صرف بھٹو صاحب کو اپنا آئیڈیل اور لیڈر خیال کرتے تھے،ہمارے حوصلے بہت بلند ہوگئے۔ہمیں اپنے لیڈر کے علاوہ پاکستان میں اُسکے مقابلے کا کوئی دوسرا لیڈر دکھائی نہیں دیتا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی۔

جنرل محمد ایوب خان کی حکومت سے علیحدگی کے بعد بھٹو صاحب کا عوام کے سامنے آنے کا

یہ پہلا موقع تھا جو بہت کامیاب رہا تھا۔ میں بڑے فخر کے ساتھ ہر جگہ جا کر بھٹو صاحب کی تقریر کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ابھی بھٹو صاحب کے جلسے کا ہم پر نشہ طاری تھا کہ بھٹو صاحب کا ایک بیان آ گیا۔ بھٹو صاحب کا بیان تھا کہ میں کنونشن لیگ نہیں چھوڑوں گا بلکہ میں ایوب لیگ کے اندر رہ کر ایک ترقی پسند فارورڈ بلاک بناؤں گا۔

بھٹو صاحب کے اِس بیان سے لوگوں نے ہماری کلاسیں لینا شروع کر دیں۔ خاص طور پر عوامی نیشنل پارٹی کے کارکنوں اور ایوب خان کے حامی لوگوں نے ہمارا ناطقہ بند کر دیا۔ میری طبیعت میں ابتدائی زندگی سے ہی یہ نقص تھا کہ میں اپنی پسند اور ناپسند کے معاملے میں انتہا پسند تھا۔ بھٹو صاحب کے ساتھ محبت کے معاملے میں بھی میری یہی حالت تھی۔ جس کی وجہ سے لوگ مجھ پر کچھ زیادہ ہی جھپٹتے تھے۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ کہو شاعر صاحب! کیا ہوا؟ آپ کے لیڈر کو، وہ تو واپس لیگ میں بھاگ گیا ہے۔ وہ ایک پیدائشی جاگیردار کا بیٹا ہے۔ ناز و نعم میں پلا ہے۔ وہ ایوب خان کا سامنا نہیں کر سکتا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

میرے لئے اُن دنوں کافی ہاؤس، چائنز لنچ ہوم، پاک ٹی ہاؤس اور لارڈ ہوٹل میں بیٹھنا محال ہو گیا۔ ہر شخص مجھے دیکھتے ہی جملہ بازی کرنے لگ جاتا۔ اِس پر حکومتی وزیر ملک خدا بخش بچہ کے بیان نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ حکومتی وزیر نے بیان دیا کہ ایوب لیگ میں کوئی فارورڈ بلاک اور بیک ڈور بلاک نہیں بننے دیا جائے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا وزارت سے نکلنے کے ساتھ ہی لیگ سے اخراج ہو چکا ہے۔ البتہ اگر وہ لیگ میں شامل رہنا چاہتا تو لیگ کے ایک کارکن کی حیثیت سے ان کو دوبارہ قبول کیا جا سکتا ہے۔

میں چونکہ اُس وقت انتہائی جذباتی نوجوان تھا۔ زیادہ دور کی نہیں سوچ سکتا تھا۔ مجھ پر اِس صورتحال سے خاصا ڈپریشن طاری ہوا۔ میں نے شیخ صفدر علی کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ شیخ صفدر علی نے بھٹو صاحب کو کراچی فون کر کے میری حالت سے آگاہ کیا اور بھٹو صاحب سے میری فون پر بات کرائی۔ بھٹو صاحب نے مجھے کہا۔ اٹ از اے سٹریجی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جلد لاہور آ رہا ہوں۔ اس فون کے بعد شیخ صفدر علی نے مجھے سٹریجی کے بارے میں بتایا کہ بھٹو صاحب کے لاتعداد ہم خیال لوگ ابھی تک ایوب لیگ میں ہیں۔ وہ ایک مناسب وقت کی تلاش میں ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک دم ایوب حکومت کے ساتھ ٹکر لینے سے نقصان ہو سکتا

www.bhutto.org

ہے۔ بھٹو ہر آنے والے دن ایوب خان کو کمزور کرتا جا رہا ہے۔ اُس کا خوف لوگوں کے دلوں سے ہٹتا جا رہا ہے۔ ہم لوگوں کو صبر اور برداشت کے ساتھ لوگوں کی باتوں کو سننا ہوگا۔ اِس طرح بات آئی گئی ہوگئی۔

کچھ دنوں کے بعد بھٹو صاحب لاہور تشریف لائے تو مجھے دیکھتے ہی بازو پکڑ کر ایک طرف لے گئے۔ کہنے لگے۔ کیا پریشانی ہے۔ میں نے لوگوں کی باتوں کا اُن سے ذکر کیا۔ کہنے لگے۔ اسلم ہم جنگ میں ہیں اور جنگ میں دشمن کو دھوکہ دینے کیلئے تمام حربے آزمائے جاتے ہیں۔ تم مجھ پر اعتماد کرو۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاؤ۔ مت لڑو لوگوں کے ساتھ، ''او کے'' (OK)۔ حضرات آج میں سوچتا ہوں کہ میں اُس وقت ایک معمولی کارکن تھا۔ کوئی مشہور کارکن بھی نہیں تھا مگر بھٹو صاحب میرے لئے کس قدر فکر مند تھے۔ کس طرح اُنہوں نے مجھے تسلی دی۔ اُن کا مجھے اِس طرح اعتماد میں لینا کوئی عام بات نہیں تھی۔ یہ بات ایک بہت بڑا انسان ہی کر سکتا تھا۔

طالب علم لیڈر راشد بٹ کی اسلامیہ کالج کی دعوت

اُسی روز فلیٹیز ہوٹل کے کمرے میں طالب علموں کا ہجوم دیکھنے میں آ رہا تھا۔ اُن طالب علموں میں سب سے سرکردہ لیڈر راشد بٹ تھا جو اُس وقت ایک منتخب طالب علم لیڈر تھا۔ اُس نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کا نیا نیا الیکشن جیتا تھا۔ بھٹو صاحب راشد بٹ اور اُن کے ساتھی منتخب طالب علموں کو چائے پلا رہے تھے۔ طالب علموں میں بھی بھٹو صاحب کے بارے میں بے حد جوش و جذبہ تھا۔ اُن کا جوش بھٹو صاحب کی قربت سے اُمڈ اُمڈ پڑتا تھا۔ بہت جذباتی ماحول تھا۔ بھٹو صاحب کی 1965ء میں سلامتی کونسل کی تقریروں اور حال ہی میں کی جانے والی لندن کان وے ہال کی تقریر اور لاہور وائے۔ ایم۔ سی ہال کی تقریر سے لوگ بھٹو صاحب کے بارے میں بہت جذباتی ہو چکے تھے۔ جہاں تک طالب علموں کا تعلق تھا، میرے مشاہدے کے مطابق ذوالفقار علی بھٹو کی سب سے بڑی طاقت پاکستان کے طالب علم تھے۔ دنیا کی تاریخ اِس بات کی گواہ ہے کہ دنیا کے تمام بڑے انقلابات اور بڑی قیادتیں جن میں پیغمبروں کی قیادتیں بھی شامل ہیں، اُن کا ہراوّل دستہ ہمیشہ نوجوان نسل ہی رہی ہے۔ جن کو آج کی تہذیب و تمدن کی تاریخ میں طالب علم ہی کہا جا سکتا ہے۔ سب طالب علم بھٹو صاحب کے معاملے میں صرف جذباتی ہی نہیں تھے، وہ اُن کی

www.bhutto.org

محبت میں بے حد مشتعل تھے اور اِسی جوش و جذبے کا مظاہرہ اُس وقت کمرے میں دیکھنے میں آرہا تھا۔ بھٹو صاحب نے راشد بٹ کو ایک طرف لے جا کر اُن کے ساتھ تھوڑی سی باتیں کیں۔ اِس کے ساتھ ہی یہ ملاقات ختم ہوگئی۔

بھٹو صاحب کو اسلام آباد جانا تھا۔ وہ اسلام آباد چلے گئے۔ ٹھیک تین دن بعد بھٹو صاحب لاہور آ گئے۔ بھٹو صاحب کے کمرے میں ہی مجھے علم ہوا کہ بھٹو صاحب راشد بٹ کی دعوت پر کل اسلامیہ کالج جا رہے ہیں۔ راشد بٹ چونکہ ہر شام لارڈ ہوٹل میں بیٹھا کرتا تھا لہٰذا میں شام کو لارڈ ہوٹل چلا گیا۔ اُس وقت وہ لارڈ ہوٹل میں بیٹھا لوگوں کو اپنے کالج کی اِس دعوت کے بارے میں ایک دلچسپ سٹوری سنا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بلانا تو مجھے مسٹر بھٹو کو ہی تھا مگر کالج کا پرنسپل خواجہ اسلم گورنر محمد موسیٰ کو بلانا چاہتا تھا۔ بھٹو صاحب کا تو اُس کو علم ہی نہیں تھا۔ راشد بٹ کے بقول اُس نے گورنر جنرل محمد موسیٰ کو نہایت اُوٹ پٹانگ قسم کا دعوت نامہ ارسال کر دیا کہ ہمارے کالج کے طالب علم آپ کی حکومت کے بارے میں کچھ سوالات پوچھنے کے خواہش مند ہیں۔ میں چونکہ اُن کا ایک منتخب نمائندہ ہوں۔ میری خواہش ہے کہ حکومت کا کوئی ذمہ دار عہدے دار آ کر طالب علموں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُن کے سوالات کے جواب دے۔ اِس کے لئے میں آپ کو تشریف لانے کی دعوت دیتا ہوں۔ راشد بٹ نے جس وقت گورنر محمد موسیٰ کو اِس مضمون کا خط تحریر کیا تھا، اُس وقت ایوب خان کی حکومت اپنی غیر مقبولیت کی آخری حد کو چُھو رہی تھی۔ حکومت کے کسی گورنر یا وزیر سفیر کی لوگوں کی نگاہوں میں عزت نہیں تھی۔ لہٰذا گورنر محمد موسیٰ کا دماغ خراب تھا کہ اِس قسم کی مشتعل صورتحال میں اور خراب سیاسی موسم میں وہ اِس طرح کی دعوت قبول کرتا، جس طرح کی راشد بٹ نے اُس کو دی تھی۔ جس میں صاف صاف لکھا گیا تھا کہ آپ آ کر طالب علموں کے سوالات کا جواب دیں۔

گورنر محمد موسیٰ نے فوری طور پر اِس دعوت کو نامنظور کر کے راشد بٹ اور کالج کے پرنسپل کو اطلاع کر دی۔ کالج کا پرنسپل خواجہ محمد اسلم بہت پریشان ہوگیا کہ تاریخ سر پر آ چکی ہے اور مہمان خصوصی نے آنے سے انکار کر دیا، اب کیا ہوگا۔ تب راشد بٹ نے کالج کے پرنسپل کو کہا کہ ذوالفقار علی بھٹو بھی تو ابھی تک حکومت کے ساتھ ہیں۔ وہ ابھی تک خود کو حکومتی جماعت کا رکن قرار دے رہے ہیں۔ آپ اگر اجازت دیں تو ہم اُن کو بلوا لیتے ہیں۔ راشد بٹ کے کہنے کے مطابق پرنسپل خواجہ محمد

اسلم ڈر گیا۔ کہنے لگا برخوردار! کہیں مروانہ دینا۔ حکومت اُس کے بہت خلاف ہو چکی ہے۔ راشد بٹ نے کہا کہ وہ ابھی تک حکومتی لیگ کے عہدے دار ہیں۔ اِس طریقے سے خواجہ محمد اسلم کا ڈر دُور کر کے خواجہ صاحب سے بھٹو صاحب کو کالج میں بلانے کی اجازت حاصل کر لی گئی ہے۔ کل بھٹو صاحب ہمارے کالج آ رہے ہیں یعنی 24 فروری 1967ء کو وہ ہم سے خطاب کریں گے۔

دوسرے دن صبح تقریباً گیارہ بجے کے قریب بھٹو صاحب راشد بٹ اور کچھ دوسرے طالب علموں کے ساتھ اُن کے کالج جانے کیلئے ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ میں اور شیخ صفدر علی بھٹو کی گاڑی کے پیچھے ایک دوسری گاڑی میں کالج تک پہنچ گئے۔ کالج میں عجیب قسم کی بدنظمی کا عالم تھا۔ جگہ بہت کم تھی۔ طالب علم بہت زیادہ تھے۔ بھٹو صاحب کو تو راشد بٹ وغیرہ اندر لے گئے مگر ہم لوگ انتہائی بدنظمی کی وجہ سے ہال کے اندر نہ جا سکے۔ بھٹو صاحب تقریباً 2 گھنٹے تک کالج کے اندر رہے۔ بھٹو صاحب نے اپنے انداز میں بڑی جوشیلی تقریر کی۔ اُنہوں نے اپنے دلکش انداز سے طالب علموں کے دل جیت لئے۔ بھٹو صاحب کو کالج میں بلانے کی وجہ سے ہر طالب علم کے چہرے پر فتح کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔ اِس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس وقت بھٹو صاحب کو اسلامیہ کالج میں طالب علموں کا بلانا ایوب آمریت کے لئے کھلا چیلنج تھا۔

اس تقریب کے خاتمے کے بعد جب ہم ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا کہ جب ہجوم میں بھٹو صاحب کو ہال کے اندر لے جایا گیا تو کسی جیب کترے نے بھٹو صاحب کا بٹوا اُن کی جیب سے نکال لیا تھا۔ لوگ بار بار بھٹو صاحب کے بٹوے کی بات کرتے تو وہ ایک ہی بات کہے جاتے تھے کہ اِس بات کو مت کریں۔ مت کہیں کہ میرا بٹوا نکالا گیا ہے۔ اِس سے طالب علموں کے ذہن پر غلط تاثر پیدا ہوگا۔ اُن کا دل بُرا ہوگا۔ اُن کی خوشی میں کمی واقع ہو جائے گی۔ اِس طرح بٹوے کی بات کو مکمل طور پر دبا دیا گیا۔

میں نے بھٹو صاحب کو طالب علموں پر ہمیشہ خصوصی توجہ دیتے دیکھا تھا۔ طالب علم خواہ دو چار ہوتے یا دس بیس ہوتے، بھٹو صاحب اُن کو نہایت شفقت کے ساتھ ملتے تھے۔ اُن کے ساتھ ملک کی سیاسی، معاشی صورتحال کے بارے میں بات کرتے تھے۔ اُن کے حوصلے بڑھاتے تھے۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ طالب علموں کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔ اسلامیہ کالج کی تقریب کے دوسرے دن شام کو 25 فروری 1967ء کو

www.bhutto.org

(ایم۔ایس۔ایف) مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کی طرف سے بھٹو صاحب کو فلیٹیز ہوٹل کے ہال میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔

ایم۔ایس۔ایف کی طرف سے فلیٹیز ہوٹل میں بھٹو صاحب کی چائے پارٹی

جیسا کہ بعد میں انکشاف ہوتا گیا۔اُس وقت حکومت نے اپنے وہ تمام سیاسی ایجنٹ جو طالب علموں کی صفوں میں کام کر رہے تھے اور اپنے وہ تمام سیاسی ایجنٹ جو سیاسی کارکن بن کر مختلف سیاسی جماعتوں اور سیاسی تنظیموں میں کام کر رہے تھے، وہ تمام کے تمام بھٹو صاحب کے گرد جمع کر دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ کچھ کم تعداد میں نہیں تھے، سینکڑوں کی تعداد میں تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ رفتہ رفتہ جلد ہی چھٹتے چلے گئے۔اُن کے اِس قدر جلد چھٹ جانے کی وجہ ذوالفقار علی بھٹو کی صاف شفاف قومی سیاست تھی اور بھٹو صاحب حکومت کے خلاف پورے ایمانی جذبے کے ساتھ میدان عمل میں آئے تھے۔اُن کا ہر قدم حکومت کے خلاف اُٹھتا تھا۔اُن کا ہر لفظ حکومت کی مذمت کرتا تھا۔وہ ایک عملی سیاست دان تھے بلکہ وقت کی آواز تھے۔ وہ صدق دل سے ملک وقوم کی خدمت کے لئے باہر نکلے تھے۔وہ حکومت سے پاکستان کے دوسرے لیڈروں کی طرح کچھ مراعات یا پرمٹ وغیرہ لینے کے لئے سیاست میں نہیں آئے تھے۔وہ شخص ایک تبدیلی لانے کے لئے میدان میں آیا تھا۔وہ فطری طور پر انقلابی انسان تھے۔ اُن کا جذبہ سمندر کی طرح صاف شفاف تھا۔کوئی آلائش اور کوئی آلودگی اُن کے قریب زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ تمام گندی مچھلیاں جو حکومت نے بھٹو صاحب کے اردگرد ابتدا میں اکٹھی کر دی تھیں، اُن سب کو بھٹو صاحب کی پاک صاف سیاست اور قیادت نے ایک ایک کر کے اپنی صف سے باہر پھینک دیا تھا۔یہ دونمبر کے سیاسی کارکن ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کے قیام کے فوراً بعد ہی خود بخود پارٹی سے باہر ہوتے گئے۔ غالباً ان تمام کی ڈیوٹی یہ تھی کہ بھٹو صاحب کوئی سیاسی جماعت تشکیل نہ کر پائیں۔

مگر جب وہ تمام اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے میں ناکام ہو گئے تو اُن کا کام خود بخود ختم ہو گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے آگے کا سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔یہ تمام ایجنٹ بیچارے پرانی سیاسی جماعتوں کی

www.bhutto.org

سیاست کے کھلاڑی تھے۔ ایسی سیاسی جماعتیں جن کے ساتھ عوام نہیں ہوتے تھے، محض چند سیاسی شخصیتیں ہوتی تھیں اور کچھ اُن کے پیروکار ہوتے۔ اِس کا نام سیاسی جماعت ہوتا تھا لہٰذا اِس قسم کی سیاسی جماعت کو وہ تہس نہس کر دیا کرتے تھے۔ اُن میں وہ خلفشار پیدا کر دیا کرتے تھے۔ لیڈروں کو ڈرا دھمکا کر گھروں میں بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ مگر اللہ تو بہ ذوالفقار علی بھٹو جیسی جناتی شخصیت اُن کے دامِ فریب میں کیسے آ سکتی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو سیاست کا ایک سائیکلون بن کر نکلے تھے۔ وہ ایک سیاسی طوفانِ بلا تھے، بہت بڑا تلاطم تھے۔ وہ ایک سیاسی زلزلہ تھے۔ یہ بیچارے رابرٹ کلب کے مخبر اور ناؤٹ سیاسی کارکن اُن کی رفتار کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ خود ہی یکے بعد دیگرے ہماری صفوں سے علیحدہ ہوتے گئے۔ وہ ہمارے ساتھ چل ہی نہیں سکتے تھے۔ خیر یہ صورتحال تو بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ ابھی تو مجھ کو صرف اُس وقت کی ایم۔ ایس۔ ایف کی بات کرنی ہے جس کا لیڈر ایک لڑکا کنور دلشاد تھا۔ اُس کنور دلشاد کے ساتھ پانچ چھ تیز طرار قسم کے لڑکوں کا ٹولا تھا۔ جن میں کچھ لڑکے سی۔ آئی۔ ڈی کے بنائے ہوئے لیڈر تھے۔ کنور دلشاد تو باقاعدہ ہاتھ میں سٹک لے کر چلا کرتا تھا اور بہت سونڈ بونڈ ہوتا تھا۔ وہ بھٹو صاحب کو اُن کے اقتدار کے زمانے میں بھی ملا تھا۔

کنور دلشاد فلیٹیز آیا اور اُس نے اسلامیہ کالج کے فنکشن کے دوسرے دن بھٹو صاحب سے چائے پارٹی دینے کی اجازت حاصل کر لی۔ بھٹو صاحب کی عادت ہر روز مصروف رہنے کی تھی۔ اُن کے پاس 25 فروری 1967ء کی تاریخ خالی تھی لہٰذا اُن کی دعوت کو قبول کر لیا گیا۔ اِس دعوت کے اعلان کے بعد کنور دلشاد اور اُس کے ساتھیوں نے پیسوں کا مطالبہ کر دیا۔ یہ مطالبہ اُنہوں نے اُس وقت کیا جب فلیٹیز کا ہال بک ہو چکا تھا۔ لوگوں کو اطلاع کی جا چکی تھی۔

میں نے اور شیخ صفدر نے اُن کے اس فیصلے سے سخت اختلاف کیا۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ آپ لوگ اگر چائے پارٹی دینے کے قابل نہیں تو آپ نے بھٹو صاحب کو دعوت کیوں دی تھی۔ اس بات کا جب بھٹو صاحب کو علم ہوا تو اُنہوں نے کنور دلشاد کو ہوٹل کے اندر والے کمرے میں بلا لیا اور اُس کو اپنے پاس سے جتنے پیسے وہ مانگ رہا تھا، اُس کو دے دیئے۔ وہ جب چلا گیا تو بھٹو صاحب نے ہم لوگوں کو کہا کہ کل کی ہوٹل کی میٹنگ کا تمام انتظام تم لوگ خود کرو۔ اس کام کو اِس پر چھوڑنا غلط ہو سکتا ہے۔

www.bhutto.org

بھٹو صاحب کے کہنے کے مطابق ہم تمام لوگوں نے جو وہاں اُس وقت موجود تھے، خود لوگوں کو جا کر چائے پارٹی میں آنے کی دعوت دی اور اس چائے پارٹی کو بہت کامیاب تقریب بنا دیا۔ اُن دنوں حکومت نے بھٹو صاحب کے خلاف اُن کی کردار کشی کی باقاعدہ مہم چلا رکھی تھی اور ہر روز خبریں نشر ہو رہی تھیں کہ ایک جاگیردار جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہے، وہ غریبوں کے دکھ کیسے جان سکتا ہے۔ اُس کو عوام کی حالت زار کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ اُس کو کیا خبر ہے کہ غربت، بھوک اور افلاس کیا چیز ہوتی ہے۔ ایک تو ان باتوں کا میرے دماغ پر کچھ اثر تھا۔ دوسرا میں خود بھی چاہتا تھا کہ بھٹو صاحب کے ساتھ سیاست کا آغاز ہی ان باتوں کو بنیاد بنا کر کیا جائے۔ میں تمام رات اِس مضمون کے مطابق نظم لکھتا رہا۔ صبح تک میں نے نظم مکمل کر لی۔ اس نظم کا عنوان ''فریاد'' تھا۔

''رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ''

اس نظم کے عنوان سے آپ کو اس بات کی باخوبی سمجھ آ جائے گی کہ وہ جو حکومت کا مستقل پروپیگنڈہ تھا کہ بھٹو عوامی سیاست نہیں کر سکتا۔ وہ بہت جلد ملک سے باہر بھاگ جائے گا وغیرہ۔ آج مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں نے آنکھیں بند کر کے محض جذباتی انداز میں مسٹر بھٹو صاحب کو جائن نہیں کیا تھا۔ میں باقاعدہ ایک سوچ اور ایک نظریے کے ساتھ بھٹو کے ساتھ چلا تھا۔ سیاسی کارکنوں کا کام تو آسان ہوتا ہے کہ وہ نعرے وغیرہ لگا کر اپنا کام چلا لیتے ہیں مگر ایک شاعر کا کام کچھ مشکل کام ہوتا ہے۔ اُس کو باقاعدہ لوگوں کو ایک پیغام دینا ہوتا ہے۔ لہٰذا میرا کام تو انتہائی مشکل تھا۔

مجھے بھٹو صاحب کے سامنے اُس وقت کے معروضی حالات کو پیش کرنا مقصود تھا اور بھٹو صاحب کی سیاست کی ابتدا ہی سوشلسٹ بنیادوں پر استوار کرنے کیلئے اپنی شاعری کو مکمل طور پر نظریاتی بنانا پڑتا تھا۔ معروضی حالات پر شاعری کرنا اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ اس شاعری میں مضمون تو آ جاتا ہے مگر شاعری کی صنعت کاری ختم ہو جاتی ہے۔ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ شاعری بھی کی جائے اور مضمون نگاری میں بھی فرق نہ آنے دیا جائے۔ یہ نظریاتی شاعری بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ پہلی صورت تو نظریاتی شاعر کی وہ ہے کہ شاعر اپنی نظم یا غزل لکھ کر کسی رسالے یا اخبار میں چھپا دیتا ہے تاکہ لوگ خود ہی اس مضمون سے واقف ہو جائیں مگر میری مشکل یہ ہوتی تھی کہ

www.bhutto.org

مجھے نظم جلسے میں لوگوں کو پڑھ کر سنانی بھی پڑتی تھی اور اس بات کا خیال بھی رکھنا پڑتا تھا کہ نظم کی زبان عام فہم ہو جو فوری طور پر لوگوں کی سمجھ میں آ جائے۔

میری تیسری مشکل یہ تھی کہ مجھے لوگوں کو ایک سچے انقلاب کے لئے تیار کرنا مقصود تھا۔ ایسا انقلاب جو لوگوں کی زندگی کا مکمل نگہبان انقلاب ہو۔ جس طرح سوویت روس اور عوامی جمہوریہ چین کا انقلاب تھا۔ میں یہ باتیں صرف اس لئے تحریر کر رہا ہوں تاکہ پڑھنے والوں کو اس بات کا علم ہو سکے کہ میری سیاسی زندگی کا آغاز محض کوئی حادثہ یا اتفاق سے نہیں ہوا تھا۔ اس سیاسی زندگی کا آغاز ایک باقاعدہ شعوری طریقے سے ہوا تھا جس میں مجھے علم تھا کہ مجھے کیا کردار سرانجام دینا ہے۔

بات ''رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ'' والی نظم سے شروع ہوئی تھی۔ جب میں یہ نظم تخلیق کر رہا تھا تو اُس وقت میرے ذہن میں بابا ظہیر کاشمیری کی ایک بات بار بار آتی چلی جا رہی تھی۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ سیاسی کارکن کا وظیفہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی قیادت کو اپنے نصب العین کی طرف چلنے کے لئے آمادہ کرتا رہے اور یہ وظیفہ یا یہ کوشش ایک لگاتار عمل کی شکل میں جاری رہنا چاہیے۔ مجھے اُن کا کہنا تھا کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیا سے نیا انقلاب کا پیغام دو۔ لوگوں کو انقلاب کے لئے تیار کرو۔ لوگ خود ہی قیادت کو انقلابی بنا دیں گے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ تمہارے لیڈر کو لوگوں کے ساتھ عشق ہے اور عاشق ہر کام کر گزرا کرتے ہیں۔ ہمیشہ نظم کہتے وقت میرے ذہن میں یہی نظریہ کارفرما رہتا تھا۔ ہر چند اُس وقت جس وقت کی میں بات کر رہا ہوں، میری شاعری کی ابتدا تھی۔ مگر وہ ابتدا کیا تھی اِس کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

فلیٹیز ہوٹل کی اِس تقریب میں یہ طالب علم میاں ممتاز دولتانہ کو بلا کر لے آئے۔ طالب علم لیڈر کنور دلشاد نے چند جملوں کے بعد مجھے نظم پڑھنے کی دعوت دی۔ میں نے اپنی نظم شروع کر دی۔ اُن دنوں لاؤڈ اسپیکر کی سہولت نہیں ہوا کرتی تھی مگر چھوٹے موٹے ہال میں مجھے لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ میری آواز ہی کافی ہوتی تھی۔ میرے نظم پڑھنے کا انداز بے حد جوشیلہ ہوتا تھا۔ انسان تو کیا میں پتھروں میں جنبش پیدا کر دیا کرتا تھا۔ ''مگر یہ سب کچھ تب تھا جب آتش جوان تھا''۔ میں نے بھٹو صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ بھٹو صاحب! یہ پوری نظم میں نے آپ کو مخاطب کر کے تحریر کی ہے۔

www.bhutto.org

نظم "فریاد"

(ذوالفقار علی بھٹو کو 24- اکتوبر 1966ء لاہور کے سیاسی کارکنوں اور مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کی جانب سے پہلی دعوتِ استقبالیہ پر)

دیکھ اِن بھوک کے مارے ہوئے لوگوں کی طرف
جن کی آنکھوں میں حمیت کے سوا کچھ بھی نہیں
زرد چہروں پہ شکایت کے فسُردہ منظر
سُوکھے جسموں پہ اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

○

خون کے لوتھڑے، جسموں کے شکستہ اعضاء
دے رہے ہیں کسی انسان کی غیرت کو صدا
کانپتے ہونٹ اٹکتے ہوئے الفاظوں میں
رُک بھی جاتے ہیں مگر کرتے ہیں حق بات ادا

○

ظلم اور جبر و تشدد کے بھیانک سائے
آدمیت کے لئے سوگ کی زنجیریں ہیں
راستے بند ہیں سناٹا ہی سناٹا ہے
جابجا بکھری ہوئی قوم کی تقدیریں ہیں

○

دیکھ اِس وادیِ ظلمت کی کٹھن منزل ہے
تجھ کو اِس بحر کی ہر موج سے لڑنا ہوگا
آندھیاں لاکھ اُٹھیں، قہر و غضب کی لیکن
تجھ کو منزل کی طرف بڑھنا ہے، بڑھنا ہوگا

www.bhutto.org

○

کتنی آہیں ہیں ترے نام کی آواز کے ساتھ
کتنے آنسو ہیں رواں قوم کے اس ساز کے ساتھ
تو ذرا چھیڑ تو دے نغمۂ ہستی بھٹو
سب کی آواز ہے شامل تری آواز کے ساتھ

○

بول کچھ بول کے سب اس کے تمنائی ہیں
تیری آواز کے طالب تیرے شیدائی ہیں
آنکھ بے چین ہے جلووں کو پرکھنے کے لئے
اب تماشا بھی ہے ممکن ہے کہ تماشائی ہیں

○

اُٹھ کہ ہم عزمِ وفادار تجھے دیتے ہیں
ملک اور قوم کی دستار تجھے دیتے ہیں
وقت اور وقت کی رفتار تجھے دیتے ہیں
نوجواں قوم کی یلغار تجھے دیتے ہیں

○

ملک اور قوم کی شہرت کا فسانہ بن جا
جنگ کے دور کا پُرجوش ترانہ بن جا
اپنے کردار میں غم خوارِ زمانہ بن جا
قوم کی رفعت و عظمت کا خزانہ بن جا

○

وقت کو وقت سمجھ وقت کی تصویر نہ دیکھ
خواب دیکھا ہے تو پھر خواب کی تعبیر نہ دیکھ
کوئی موقعہ کوئی لمحہ کوئی تاخیر نہ دیکھ
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

○

www.bhutto.org

جب میں نظم کے پانچویں بند پر پہنچا تو طالب علموں کا جوش و خروش ایک طوفان بن چکا تھا۔ وہ تمام نوجوان اپنی کرسیوں پر کھڑے ہو کر ایک ایک مصرع پر نعروں کی شکل میں داد دے رہے تھے۔ جب میں نے یہ بند پڑھا۔

وقت کو وقت سمجھ وقت کی تصویر نہ دیکھ
خواب دیکھا ہے تو پھر خواب کی تعبیر نہ دیکھ
کوئی موقعہ کوئی لمحہ کوئی تاخیر نہ دیکھ
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

جب میں نے اس بند کو مکمل کیا تو طالب علموں نے بار بار پڑھنے کا تقاضا کیا تو میں نے کئی بار اس بند کو پڑھا۔ ہال میں نعروں کی گونج سے بڑا انقلابی سماں پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے میاں ممتاز دولتانہ گھبرا گیا۔ اُس نے بھٹو صاحب سے فوری طور پر اجازت لی اور اُٹھ کر ہال سے باہر چل دیا۔ کچھ لوگوں نے اُس کو روکنا چاہا مگر وہ معذرت کرتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ میں نے اُس کے جانے کے بعد اپنی نظم پوری کی اور میری نظم کے بعد بھٹو صاحب نے لوگوں سے خطاب کیا۔ اُنہوں نے بار بار اپنی تقریر میں میری نظم کا حوالہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ مسٹر بھٹو کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

مسٹر بھٹو نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ پاکستان کو جب تک ایک سوشلسٹ فلاحی ریاست نہیں بنایا جاتا، ہم آج کی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ آج نہ کسی بیمار کیلئے دوائی ہے، نہ بھوکے کیلئے روٹی ہے، نہ کسی کے تن ڈھانپنے کے لئے کپڑا ہے۔ ہم کو آج دنیا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے۔ میں بے حد خوش ہوں کہ ہمارے نوجوانوں میں جذبہ ہے۔ نوجوان ہی ہر قوم کی اصل قوت ہوتے ہیں۔ ہم سب مل کر اس ملک کو جدید ملک بنائیں گے۔ ہم نے اپنی جدوجہد کی ابتداء کر دی ہے۔ اب ہم اپنی منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔

جب مسٹر بھٹو نے تقریر ختم کی تو ایک شخص لطیف بٹ خاکسار نے شور مچانا شروع کر دیا۔ آپ نے تاشقند کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ تاشقند پر بات کرو۔ لطیف بٹ کے ساتھ کچھ اور سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ بھی تھے جنہوں نے شور کرنا شروع کر دیا مگر ہم لوگ بھٹو صاحب کو وہاں سے باہر لے آئے اور وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

www.bhutto.org

لوگوں کا رش ختم ہونے کے بعد میں اور شیخ صفدر اور شیخ سرور اقبال ہم لوگ بھٹو صاحب کے کمرے میں چلے گئے۔ بھٹو صاحب نے بڑی شفقت کے ساتھ میرے گال پر چٹکی کاٹتے ہوئے کہا کہ ''تمہاری نظم کے بعد ہنگامہ ہونا تو بہت ضروری تھا۔''

میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ

میاں فقیر محمد کا وکالت میں بڑا نام تھا۔ یہ میاں دلاور محمود کے بڑے بھائی تھے۔ وہی میاں دلاور محمود جو اُن کی وفات کے بعد لاہور ہائی کورٹ کا جج بن گئے تھے۔ میاں فقیر محمد سپریم کورٹ کے ایڈووکیٹ کے ساتھ ساتھ پاک چائنا کلچرل ایسوسی ایشن کے صدر تھے۔ بھٹو صاحب اپنی وزارت خارجہ کے زمانے میں اس تنظیم کے سرپرست تھے۔ اُن کی اِس پاک چین فرینڈشپ تنظیم کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور حکومت کی منظوری کے ساتھ ہی میاں فقیر محمد نے اس تنظیم کی بنیاد رکھی تھی۔ ہر چند میاں فقیر محمد کی یہ تنظیم ایوب خان حکومت کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے باوجود میاں فقیر محمد کو میں نے فلیٹیز ہوٹل میں بھٹو صاحب کے ساتھ دو ایک بار ملاقات کرتے دیکھا تھا۔ دوسرے دن 26 فروری 1967ء کو میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ ہائی کورٹ کے گھر پر بھٹو صاحب کو پاک چائنا کلچرل ایسوسی ایشن کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا جس کیلئے کوئی کارڈ وغیرہ نہیں چھپوائے گئے تھے۔ محض زبانی کلامی لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔

بھٹو صاحب کی لاہور میں پہلی کارنر میٹنگ اور لطیف بٹ کی ہنگامہ آرائی

میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ کا گھر کوئی بہت بڑا گھر نہیں تھا۔ یہ دعوت استقبالیہ اُن کے تقریباً پورچ میں ہی منعقد کی گئی تھی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد مجھے نظم پڑھنے کو کہا گیا۔ میری نظم کا عنوان ''جشنِ خوشحالی پاکستان'' تھا۔ یہ نظم ایوب خان کے جشنِ خوشحالی کی مذمت میں تھی جس کا ایک شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

شاخیں پھول نگل جاتی ہیں یہ کیسی خوشحالی ہے
مالی سارا پھل کھائے یہ کیسی رکھوالی ہے

میری نظم کے بعد میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ نے مسٹر بھٹو کا گھر تشریف لانے پر شکریہ ادا کیا اور

www.bhutto.org

اِس کے بعد اُنہوں نے بھٹو صاحب کو دعوتِ خطاب دی۔ بھٹو صاحب نے اپنی تقریر میں لاہور شہر اور لاہور کے شہریوں کی بہت تعریف کی۔ اُنہوں نے کہا کہ لاہور میرا سب سے پسندیدہ شہر ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان کے تمام مسائل اُس وقت تک حل نہیں ہو سکتے جب تک کہ پاکستان کو ایک حقیقی اسلامک سوشلسٹ اسٹیٹ نہیں بنایا جاتا۔ وہ اپنی تقریر کی پوری روانی میں تھے کہ لطیف بٹ نے اُٹھ کر شور کرنا شروع کر دیا۔ یہ شخص کافی ہاؤس میں آغا شورش کشمیری کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ تقریباً وکلاء حضرات اِس شخص کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اُنہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کا آدمی ہے۔ یہ شخص خاکساروں والے کپڑے پہنتا تھا۔ کمر کے ساتھ پستول باندھے رکھتا تھا۔ یہ شخص انتہائی جاہل قسم کا انسان تھا۔ بعد میں، میں نے اس شخص کو سیاسی غنڈہ گردی ہی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ حکومت نے اس شخص کو بھٹو صاحب کو خوفزدہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایم۔ ایس۔ ایف کی دعوت میں بھی شور شرابا کر چکا تھا۔

اس شخص نے زبردستی کے انداز میں باقاعدہ تقریر شروع کر دی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ہمیں آپ اِدھر اُدھر کی تقریر نہ سنائیں۔ ہم کو تاشقند کی بات بتائیں۔ آپ تاشقند پر کیوں بات نہیں کرتے۔ میں آپ کو اپنا لیڈر نہیں سمجھتا۔ میں علامہ مشرقی کا سپاہی ہوں۔ یہ شخص اِس قسم کی باتیں کر رہا تھا اور بہت زور زور سے چیخ رہا تھا، شور کر رہا تھا۔ آپ کو لیڈری کا شوق ہے تو سندھ میں جا کر لیڈری کریں۔ ہم آپ کو پنجاب میں لیڈری نہیں کرنے دیں گے۔ مجھے اس شخص کی حرکت پر بے حد غصہ آیا۔ میرے ساتھ طالب علم لیڈر ادریس کھٹانہ بیٹھا تھا۔ ہم دونوں نے لطیف بٹ کو پنڈال سے اُٹھالیا اور اُس کو باہر لے جا کر گلی میں پھینک دیا۔ وہ بہت چالاک آدمی تھا۔ میں نے جب اُس کو اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہوا تھا تو وہ باہر گلی میں جا کر مجھ سے کہنے لگا۔ اب مجھے چھوڑ دو۔ میں نے اتنی ہی بات کرنی تھی۔ میرا کام ہو گیا ہے۔ میں نے جب اُس کو نیچے پھینکا تو وہ اُٹھ کر بڑی گالیاں دیتا ہوا اپنا اسکوٹر چلا کر وہاں سے چلا گیا۔ جاتے وقت وہ مجھے دھمکیاں دیتا گیا۔ اوشاعر میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ ہم کچھ دیر گلی میں کھڑے رہے اور پھر دوبارہ تقریب میں واپس آ گئے اور بھٹو صاحب کی تقریر سننے لگ گئے۔

بھٹو صاحب کی حالانکہ بہ حیثیت ایک اپوزیشن لیڈر کے ابھی یہ پہلی کارنر میٹنگ تھی جس میں لطیف بٹ جو ایک پلانٹنڈ حکومتی آدمی تھا۔ اُس نے یہ ہنگامہ کیا تھا۔ مگر بھٹو صاحب انتہائی

www.bhutto.org

نارمل انداز میں تقریر کرتے رہے جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔

بھٹو صاحب نے کہا کہ تاشقند کے معاملے میں دنیا کی تمام بڑی طاقتیں ملوث ہیں۔ یہ معاہدہ ہندوستان اور پاکستان کی ایک قسم کی صلح کا معاہدہ ہے۔ اِس معاہدے پر سفارتی آداب کو ملحوظ رکھ کر بات کرنی چاہیے۔ ورنہ ہندوستان الزام تراشی کر سکتا ہے۔ مجھے اپنی شہرت سے اور اپنی سیاست سے پاکستان کا مفاد زیادہ عزیز ہے۔ اس معاہدے پر تقریر کی نہیں تدبیر کی ضرورت ہے۔ یہ بات اُنہوں نے اخبار نویسوں کی طرف دیکھ کر بار بار کہی۔ اُس وقت وہاں ظہور عالم شہید بیٹھے تھے۔ پھر اُنہوں نے تیسری بار اُن کو مخاطب ہو کر کہا۔ شہید صاحب تدبیر کی ضرورت ہے۔ میں آپ تمام لوگوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت جلد اس معاہدے کے بُرے اثرات سے پاکستان کو باہر نکال دوں گا۔ عالمی سیاست کا رُخ تبدیل ہو رہا ہے۔ یہ معاہدہ خود بخود بے اثر ہو جائے گا۔

اب میں میدان عمل میں آ چکا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ یہ تقریر بہت دور اندیش سیاست کی تقریر تھی۔ اُنہوں نے پہلی مرتبہ اعلان کیا کہ پاکستان اب مزید فوجی آمریت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ موجودہ حکومت پوری دنیا میں ایسے ہی آمرانہ اقتدار کی وجہ سے بدنام ہو چکی ہے۔ لوگ نفرت اور حقارت سے اس کا نام لیتے ہیں۔ ہم کو پاکستان کو ایک آزاد پاکستان بنانا ہے۔ قوم کو ایک باوقار قوم بنانا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ جنگیں قوموں کے مسائل کا حل نہیں ہوتیں مگر بڑی طاقتوں کے قوموں پر مسلط کیے گئے فیصلے بھی قوموں کے مسائل کا حل نہیں ہوتے۔ اُن کی یہ تقریر تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔ میں نے بھٹو صاحب کو شروع دن سے نہایت قریب سے دیکھا تھا۔ میں دیکھتا تھا کہ وہ ہر لحہ مصروف رہنا چاہتے تھے۔ وہ زندگی کے ہر لمحے کوئی نہ کوئی کام کرتے رہتے تھے۔ جب تک مجھے اُن کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا، اُن کو ہر وقت مصروف ہی دیکھتا تھا۔ وہ دوسروں کو اُکتا دینے والی حد تک مصروف رہا کرتے تھے۔ لوگ تھک جاتے تھے مگر وہ تھکا نہیں کرتے تھے۔

بھٹو صاحب کا لائل پور جانا

اِس تقریب کے بعد اُنہوں نے 27 فروری 1967ء کو اُس وقت کے لائل پور اور آج کے

www.bhutto.org

فیصل آباد جانا تھا۔ فیصل آباد میں ایک سیاسی بزرگ رہنما میر صاحب تھا۔ اُن کا پورا نام مجھے اُس وقت یاد نہیں آ رہا۔ اُن کے گھر بھٹو صاحب کو اپنے ذاتی مراسم کی وجہ سے جانا تھا۔ قارئین کتاب! یہ وہ وقت ہے جب بھٹو صاحب کا کوئی دوست جن کو بعد میں اُنہوں نے اپنے اقتدار میں شریک کیا۔ وہ منظر عام پر نہیں ہوا کرتا تھا۔ اُس وقت نہ تو مصطفےٰ کو بھٹو صاحب کے ساتھ دیکھا جاتا تھا، نہ ڈاکٹر مبشر حسن کبھی دیکھنے میں آیا تھا نہ حنیف رامے صاحب دیکھنے میں آیا کرتے تھے۔ نہ ہی ممتاز بھٹو سامنے آیا کرتا تھا۔ یہ تمام لوگ گویا پس منظر میں تھے، پس پردہ ہوتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ رات کو جب فلیٹیز ہوٹل میں لائل پور جانے کا پروگرام طے پا رہا تھا تو صبح کیلئے گاڑی کی بات کی جا رہی تھی کہ کس گاڑی پر لے جایا جائے گا۔ فلیٹیز ہوٹل میں بھٹو صاحب کے ایک ذاتی اور سیاسی دوست علی حسن منگی کی کاریں ہوتی تھیں۔ مگر وہ وقت بہت کٹھن تھا۔ بھٹو صاحب کے تمام دوست ایوب خان کے خوف کی وجہ سے بھاگ گئے تھے۔ اِن بھاگ جانے والوں میں علی حسن منگی سرفہرست تھا۔ وہ شخص اِس قدر حکومت سے خوف زدہ تھا کہ اُس کے ڈرائیور (ہوٹل) سے گاڑیاں لے کر بھاگ گئے کہ کہیں بھٹو صاحب اُن کی گاڑیاں استعمال نہ کر لیں۔ اُس کا خیال تھا کہ بھٹو صاحب کو گاڑی دینے سے ایوب خان ناراض ہو جائے گا۔ بہت تلاش کیا گیا مگر منگی کا ڈرائیور شوکت پورے ہوٹل میں نہ مل سکا۔ اُس وقت معاملے کی سنگینی کا کسی کو بھی احساس نہیں تھا۔ طے پایا کہ وہ ڈرائیور صبح تک آ جائے گا اور اُس کی گاڑی میں جو شیورلیٹ ہوتی تھی، لائل پور جایا جائے گا۔

مگر جب ہم سب لوگ صبح آٹھ بجے ہوٹل پہنچے تو وہ ڈرائیور رات کی طرح بدستور غائب تھا۔ ہوٹل کے ایک ملازم نے شیخ صفدر علی کو رازداری سے خبر دی کہ وہ حکومت کے ڈر سے بھاگ گیا ہے۔ اُس کو منگی صاحب کا حکم تھا کہ وہ بھٹو صاحب کی ڈیوٹی پر نہ جائے۔ آپ اندازہ کریں کہ وہ بھی کیا وقت تھا کہ بھٹو صاحب کو لائل پور جانے کیلئے کوئی گاڑی دینے کو تیار نہ تھا۔ یہاں تک کہ بھٹو صاحب نے ہوٹل سے کرائے کی گاڑی لانے کا کہا۔ کرائے کیلئے بھی کوئی گاڑی ملنا مشکل تھی۔ آخر کار شیخ صفدر علی مرحوم نے بھٹو صاحب کو کہا کہ میری پرانی اوپل ریکارڈ حاضر ہے۔ آہستہ آہستہ اِس پر ہی چلے جاتے ہیں۔ وہ گاڑی آسمانی رنگ کی تھی۔ بھٹو صاحب کے کمرے کے باہر ہی کھڑی تھی۔ بھٹو صاحب نے ایک نظر اُس گاڑی کی طرف دیکھا اور کہا۔ ٹھیک ہے اِس گاڑی میں چلتے ہیں۔ کہنے

www.bhutto.org

لگے کہ وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہمیں کسی صورت اُن کو مایوس نہیں کرنا چاہیے۔

بلاشبہ ذوالفقار علی بھٹو ایک سپُر نیچرل قسم کے انسان تھے۔ اُن کو وقت اور حالات کے مطابق خود کو ڈھالنے میں ذرا بھی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ حالات جس طرح کے ہوتے، وہ خود کو اُن کا سامنا کرنے کے لئے تیار کر لیتے تھے۔ گاڑی میں وہ ہمیشہ پیچھے کی سیٹ پر بائیں جانب بیٹھا کرتے تھے۔ شیخ صفدر علی صاحب کے ساتھ آگے شیخ سرور اقبال بیٹھ گیا۔ بھٹو صاحب کے ساتھ دائیں جانب میں بیٹھ گیا اور گاڑی لائل پور کی طرف روانہ ہوگئی۔ باقی کچھ لوگ تھے جن کو کسی اور ذریعے سے لائل پور جانے کا کہہ دیا گیا تھا جو ہم سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ شیخ صفدر صاحب کی گاڑی پرانی گاڑی تھی مگر چلنے میں ٹھیک تھی۔ راستے میں بھٹو صاحب کو میں نوائے وقت اخبار کی خبریں پڑھ کر سناتا گیا جو کل کی تقریب کے بارے میں شائع کی گئی تھیں۔ خبروں کے بعد بھٹو صاحب نے مجھے نوائے وقت کا ایڈیٹوریل پڑھ کر سنانے کیلئے کہا۔ میں نے اُن کو پڑھ کر سنا دیا۔ نوائے وقت کا ایڈیٹوریل کچھ ملا جلا قسم کا تھا۔ کہیں بھٹو صاحب کی تعریف تھی، کہیں تنقید تھی۔ بھٹو صاحب ایڈیٹوریل سُن کر کہنے لگے۔ کچھ کھٹا میٹھا ایڈیٹوریل ہے۔ اُن کے اِس جملے پر ہم خوب ہنستے رہے۔ بھٹو صاحب جب بھی لاہور تشریف لاتے، اُن کو اُردو اخبار کی خبریں پڑھ کر سنانا میرے ذمہ ہوتا تھا۔

ہم تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کے قریب لائل پور پہنچ گئے۔ شہر سے کچھ دور کچھ لوگوں نے ہماری گاڑی کو ہاتھ دے کر رُکنے کو کہا۔ بھٹو صاحب کو وہ لوگ دیکھ کر بہت جذباتی ہوگئے۔ اِن لوگوں نے ہمیں بتایا کہ اخبارات میں بھٹو صاحب کی آمد کا پڑھ کر لوگ بہت بڑی تعداد میں آگے جمع ہیں اور بھٹو صاحب کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے آگے آگے اپنی گاڑی میں چلنے لگے۔ ہم اُن کے پیچھے شہر تک پہنچ گئے۔ ہم لوگ ایک بہت بڑے ہجوم کے درمیان گھر گئے۔ ہر شخص بھٹو صاحب کی جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ لوگ شیخ صفدر مرحوم کی گاڑی کی چھت پر چڑھ گئے۔ گاڑی کی چھت ایک طرف سے بیٹھنا شروع ہوگئی۔ میں اور شیخ سرور اقبال گاڑی سے باہر نکل کر لوگوں سے گزارش کرنے لگے کہ مہربانی کر کے آپ گاڑی سے نیچے اُتر آئیں۔ لوگ گاڑی سے نیچے اُتر گئے۔ پھر یوں لگا جیسے لوگوں نے گاڑی کو اُٹھا لیا ہے۔ شیخ صفدر نے گاڑی بند کر دی۔ لوگ گاڑی کو خود ہی دھکا لگا کر آگے لئے جا رہے تھے۔ لوگ دیوانہ وار اُن کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اعلان کرایا گیا کہ آپ سب لوگ میر صاحب کے گھر آ جائیں۔

www.bhutto.org

مسٹر بھٹو وہاں آپ لوگوں سے خطاب کریں گے۔ بھٹو صاحب نے لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے راستہ دینے کو کہا۔ لوگ راستہ بناتے گئے۔ اِس طرح یہ جلوس تقریباً ایک گھنٹے کے بعد میر صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ میر صاحب کا گھر بہت پرانی طرز کا تھا جس کی کوئی چار دیواری ہی نہیں تھی۔ تمام ہجوم اُن کی کوٹھی کے اندر آ گیا۔ اُن کے گملے ٹوٹ پھوٹ گئے۔ بھٹو صاحب میر صاحب کے گھر کے اندر چلے گئے۔ مجھے حکم ہوا کہ ہجوم کی توجہ ہٹانے کیلئے چھت پر کھڑا ہو کر اُن کو کچھ نظمیں سناؤں۔ میں چھت پر چلا گیا اور وہاں کھڑے ہو کر لوگوں کو اپنی نظمیں سنانے لگ گیا۔ جب میں دو نظمیں سنا چکا تو بھٹو صاحب چھت پر تشریف لے لائے۔ اُنکی تقریر شروع ہو گئی۔ لوگ اُن کا ایک ایک لفظ غور سے سن رہے تھے۔ مجمع میں بے انتہا جوش و خروش تھا۔ بھٹو صاحب بغیر لاؤڈ اسپیکر کے تقریر کر رہے تھے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بھٹو صاحب نے تقریر کی جس سے ہجوم میں شامل لوگوں کے جذبات آسودہ ہو گئے۔ بھٹو صاحب نے لوگوں سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد دوبارہ آپ کے شہر میں آؤں گا اور صرف آپ لوگوں کو ملنے آؤں گا۔ جلسہ کروں گا۔ لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں نے میرا استقبال کیا۔ میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اِس طرح بھٹو صاحب چھت سے نیچے اُتر آئے۔ میر صاحب کے گھر کے اندر کافی وکیل حضرات جمع تھے۔ کچھ دیر بھٹو صاحب اُن لوگوں سے باتیں کرتے رہے۔ شیخ صفدر صاحب مجھے اپنے کسی دوست کے پاس لے گئے۔ اُس سے گاڑی کا کہا۔ اِس طرح وہ اپنے دوست کی گاڑی اور ڈرائیور لائے۔ وہ گاڑی اچھی باڈی کی تھی۔ شیخ صاحب نے اپنی گاڑی ڈرائیور کو چلانے کے لئے دے دی اور ہم لوگ اُن کے دوست کی گاڑی میں بھٹو صاحب کو بٹھا کر واپس لاہور چل پڑے۔ بھٹو صاحب نے لوگوں کے جوش و جذبے کی بہت تعریف کی۔ کہنے لگے اگر مجھے موقع مل گیا تو میں اِن لوگوں کی قیادت کا حق ادا کر دوں گا۔

یہ جرمنی کی غلطی ہے

شروع شروع میں بھٹو صاحب جب تک لاہور میں رہتے، شیخ صفدر اور شیخ سرور اقبال کی اور میری یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ ہم بھٹو صاحب کے کمرے میں موجود رہیں اور آنے والے لوگوں کا خیال رکھیں۔ میں بے حد جوش و جذبے کے ساتھ نظمیں پڑھا کرتا تھا۔ میں اپنے جوش و جذبے سے

www.bhutto.org

لوگوں کے دلوں سے ایوب حکومت کا خوف دور کیا کرتا تھا۔ میر انظم پڑھنے کا اسٹائل بے حد جارحانہ ہوا کرتا تھا۔ بھٹو صاحب میرے اسٹائل کو بہت پسند کرتے تھے۔ شیخ سرور اقبال کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا مگر بڑا دلچسپ آدمی تھا۔ اُس کی تعریف وتوصیف کی کچھ اپنی ٹرمنالوجی تھی۔ وہ مجھے کہا کرتا تھا۔ تم بہادر نوجوان ہو۔ جرمنی ہو۔ شیخ سرور اقبال کے نزدیک جرمن بہت بہادر لوگ تھے۔ وہ جب بھی میری نظم کی تعریف کرتا۔ کہتا تم جرمنی ہو۔ ایک شام بھٹو صاحب مجھے اور شیخ سرور اقبال کو ہوٹل کے کمرے میں بٹھا کر جاوید اقبال کے گھر گئے۔ جاتے جاتے یہ کہہ گئے کہ کسی کو یہ مت بتانا کہ میں جاوید اقبال کے گھر ہوں۔ البتہ اُنہوں نے کہا کہ عبداللہ ملک اگر آ جائے تو اُس کو وہاں بھیج دیں۔ بھٹو صاحب کے جانے کے بعد آغا شورش کشمیری ہوٹل آیا اور وہ بھٹو صاحب کا پوچھنے لگ گیا۔ میں نے تو کوئی جواب نہ دیا مگر شیخ سرور اقبال جو آغا شورش کشمیری سے بہت مرعوب تھا، وہ آغا کو ایک طرف لے گیا اور آغا کو بتا دیا کہ بھٹو صاحب جاوید اقبال کے گھر گئے ہیں۔ آغا شورش کشمیری جاوید اقبال کے گھر پہنچ گیا۔ اُن کے جانے سے جاوید اقبال اور بھٹو صاحب کی باہم بات چیت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ وہ ضروری باتیں جو بھٹو صاحب جاوید اقبال سے کرنا چاہتے تھے، وہ نہ کر سکے۔ آغا شورش کشمیری کے ساتھ گپ شپ کے سلسلے کے بعد یہ محفل ختم ہو گئی۔

بھٹو صاحب کو افسوس ہوا کہ میرے ساتھیوں نے منع کرنے کے باوجود آغا شورش کشمیری کو بتا دیا کہ وہ جاوید اقبال کے گھر گئے ہیں۔ اُنہوں نے دوسرے دن شیخ سرور اقبال کے ساتھ گلہ کیا کہ مسٹر شیخ تم نے آغا کو میرے پیچھے کیوں بھیج دیا جبکہ میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ شیخ سرور اقبال کو اُس وقت اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اب وہ اپنی جان چھڑانے کے لئے میرا بہانہ بنانے لگ گیا۔ بھٹو صاحب کو کہنے لگا۔ جناب یہ غلطی جرمنی سے ہوئی ہے۔ بھٹو صاحب اِس لفظ سے بہت حیران ہوئے۔ بڑی حیرانی کے عالم میں شیخ صفدر سے کہنے لگے۔ شیخ صاحب! یہ جرمنی والے یہاں کیسے آ گئے۔ شیخ صفدر صاحب نے قہقہہ لگا کر بھٹو صاحب کو بتایا کہ شیخ سرور اقبال اسلم گورداسپوری کو جرمنی کا خطاب دیتا ہے۔ اِس کو بہادر کہتا ہے اور اِس کا نام اِس نے جرمنی رکھا ہوا ہے۔ بھٹو صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں وہاں پہنچ گیا۔ میں نے بھٹو صاحب کو سلام کیا تو خلاف توقع بھٹو صاحب مجھے کہنے لگے۔ مسٹر جرمنی! تمہیں کہا تھا کہ میرے پیچھے کسی کو نہ بھیجنا مگر تم نے آغا کو میرے پیچھے بھیج دیا۔ میں بھٹو صاحب کے جرمنی کہنے سے سمجھ گیا کہ یہ حماقت شیخ سرور

www.bhutto.org

اقبال کی ہے۔ میں نے کہا! سر مہربانی فرما کر شیخ سرور اقبال کو کہہ دیں کہ میرا نام نہ بگاڑیں۔ مجھے جرمنی نہ کہیں۔ جہاں تک آغا کی بات ہے تو آغا کو شیخ صاحب نے بتایا تھا۔ میں نے شیخ سرور اقبال سے احتجاج کیا تھا کہ یہ تم نے غلط کیا ہے۔ بھٹو صاحب نے شیخ سرور اقبال سے پوچھنا شروع کر دیا کہ مسٹر شیخ! آپ پہلے کس سیاسی جماعت میں کام کر چکے ہیں۔ شیخ صاحب نے پاکستان کی تقریباً تمام پارٹیوں کا نام لیا جو پہلے موجود تھیں۔ آخر میں کہنے لگا کہ میں خاکسار بھی رہا ہوں۔ بھٹو صاحب کہنے لگے۔ وہ فقیر محمد کے گھر آپ کا ساتھی ہی شور کر رہا تھا۔ شیخ گھبرا کر کہنے لگا۔ سر وہ تو پاگل ہے۔

اس واقعہ کے بعد میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب شیخ سرور اقبال کو کبھی کوئی ذمہ داری نہیں دیتے تھے۔ یہ بات میرے لئے ابھی تک ایک راز ہی ہے کہ جیسے ہی پارٹی (پاکستان پیپلز پارٹی) وجود میں آئی تو شیخ سرور اقبال پارٹی چھوڑ کر جانے والوں کی پہلی کھیپ میں شامل تھا۔ حالانکہ اُس وقت اُس کا پارٹی چھوڑ کر جانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اُن دنوں بھٹو صاحب تمام حزب اختلاف کے لیڈروں سے ملاقات کیا کرتے تھے۔ میاں ممتاز محمد دولتانہ کے ساتھ اُن کی بہت ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اِس کے علاوہ محمود علی قصوری کے ساتھ بھٹو صاحب کی تقریباً روزانہ ملاقات ہوا کرتی تھی۔ بھٹو صاحب جب بھی لاہور آتے، میاں محمود علی قصوری کے گھر ضرور جاتے تھے۔ اُن دنوں طرح طرح کی افواہیں پھیلا کرتی تھیں۔ کبھی یہ افواہ اُڑائی جاتی کہ بھٹو صاحب دولتانہ مسلم لیگ میں شامل ہو رہے ہیں۔ کبھی یہ افواہ سننے میں آتی کہ بھٹو صاحب عوامی نیشنل پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ میں بھاشانی گروپ کے وکلاء کہا کرتے تھے کہ بھٹو عوامی نیشنل پارٹی بھاشانی گروپ میں شامل ہو رہے ہیں۔

ایک مرتبہ فلیٹیز ہوٹل میں فلم ڈائریکٹر ریاض شاہد کچھ لوگوں کے ساتھ آیا۔ اس نے بھٹو صاحب کو نظام اسلام پارٹی میں شامل ہونے کا کہا۔ میں نے ریاض شاہد صاحب کو کہا کہ آپ تو بہت ترقی پسند بلکہ کمیونسٹ مشہور ہیں اور آپ اِس قدر رجعت پسند پارٹی میں بھٹو صاحب کو شامل ہونے کا کہہ رہے ہیں۔ اُس وقت وہاں بہت سارے اخبار نویس موجود تھے۔ وہ تمام ریاض شاہد کے پیچھے پڑ گئے۔ آپ لوگ اندر سے کچھ ہیں، باہر سے کچھ ہیں۔ بیچارہ ریاض شاہد اپنی وضاحت کرنے لگ گیا کہ میں نے تو ویسے ہی مشورہ دیا ہے۔ اِس کے بعد بھٹو صاحب نے اخبار نویسوں کے ساتھ خود بات کرنا شروع کی اور کہا کہ میری بہت ساری حزب اختلاف کی پارٹیوں سے بات

چل رہی ہے۔ اُن کے ساتھ عام بحث جاری ہے لیکن ابھی تک میں نے اپنی کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ میں تمام رہنماؤں، سیاست دانوں کے ساتھ مل رہا ہوں تا کہ مجھے پتہ چلے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ اُن کے خیالات کیا ہیں۔ اِن تمام پارٹیوں کی یہ کوشش ہے کہ میں اُن میں شامل ہو جاؤں۔ ممتاز دولتانہ صاحب نے مجھے شامل ہونے کی دعوت دی ہے۔ نواب زادہ نصر اللہ خاں نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کا کہا ہے۔ عوامی نیشنل پارٹی کے میاں محمود علی قصوری جو میرے دوست ہیں، اُنہوں نے مشورہ دیا ہے کہ نیپ میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے اِن میں سے کسی کو بھی دوٹوک جواب نہیں دیا مگر شامل ہونے کا بھی نہیں کہا۔ ابھی اِس سلسلے میں میرا کسی جماعت میں شامل ہونے کا ارادہ نہیں ہے۔ ابھی میں خود کو آزاد رکھنا چاہتا ہوں۔ کچھ وقت کے بعد اِس بات کا فیصلہ کیا جائے گا۔ بھٹو صاحب کے اِس واضح بیان کے بعد وہ تمام افواہیں ختم ہو گئیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔

ہمارا سیاسی سرکل یا ہم خیال لوگوں کا دائرہ روز بروز بڑھنے لگ گیا۔ لاہور کا یا پنجاب کا ہر وہ باشعور انسان جو پرانی سیاسی جماعتوں کی سیاست سے غیر مطمئن تھا، وہ بھٹو صاحب کی طرف کھچا چلا آتا تھا۔ اُس وقت نہ تو کوئی کسی کو پیغام بھیجتا تھا، نہ کوئی ایک دوسرے کو جانتا تھا۔ بھٹو صاحب جب تک لاہور رہتے، اِس وقت تک بھٹو صاحب کا کمرہ ہی ہمارا سیاسی دفتر بنا رہتا۔ ہر انسان کے ساتھ اُن کے کمرے میں آسانی کے ساتھ ملاقات ہو جاتی تھی۔ ہماری جان پہچان میں بہت اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ بھٹو صاحب کے جانے کے بعد شیخ صفدر علی مرحوم کا دفتر ہمارا سیاسی دفتر ہوتا تھا۔ اِس کے علاوہ میں اور میری طرح کے بے شمار لوگ چلتے پھرتے بھٹو صاحب کے ورکر اور سفیر ہوتے تھے۔ جہاں بھی ہم لوگ جاتے، کچھ مخالف بھی ملتے۔ ہمارے مخالفین کے پاس سوائے یہ بات کہنے کہ بھٹو صاحب کل تک حکومت کے ساتھ تھے اور کوئی پڑھی لکھی دلیل نہیں ہوتی تھی۔ اُن کے پاس ہم لوگوں کی مخالفت کا بس یہ ایک ہتھیار ہوتا تھا۔

میں آج پورے وثوق کے ساتھ یہ بات تحریر کر رہا ہوں کہ اُس وقت مجھے کسی بھی سیاسی جماعت کا ایسا کوئی کارکن نہیں ملتا تھا جو کارکن کبھی کسی سیاسی منشور کی بات کرتا ہو یا ملک کو درپیش سیاسی صورتحال حالات پر تبصرہ کرتا ہو۔ کسی ایک سیاسی کارکن کی زبانی بھی کبھی یہ بات سننے میں نہ آیا کرتی تھی کہ اِس ملک کو کس طرح اچھا بنایا جا سکے گا۔ اُس کی سیاست کو جمہوری سیاست میں کس طرح تبدیل کیا جائے گا۔ بس چند شخصیتوں کے متوالے سیاسی کارکن ہوٹلوں میں بیٹھ کر اپنے

www.bhutto.org

ممدوحین کی تعریف کرتے رہتے تھے یا ایک دوسرے کے لیڈر کو بُرا بھلا کہتے رہتے تھے۔ اِس کے علاوہ اِن بیچارے سیاسی کارکنوں کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مگر اِن تمام خوبیوں کے باوجود اِن تمام کارکنوں میں ایک بات کی قدر مشترک تھی کہ یہ تمام کے تمام اپنی اپنی پارٹی کی پہچان ہوتے تھے۔ ریگل چوک مال روڈ پر اُن دنوں ایک موڑا ریسٹورنٹ ہوتا تھا۔ وہاں لاہور کے تمام جید قسم کے سیاسی کارکن، صحافی، دانشور، وکیل وغیرہ شام کو بیٹھا کرتے تھے۔

موڑا ریسٹورنٹ ریگل چوک لاہور

یہ موڑا ریسٹورنٹ ایک سستا ترین چائے خانہ ہوتا تھا۔ یہاں پر سیاسی کارکن اور شاعر حضرات رات گئے تک بیٹھے رہا کرتے تھے۔ اُن دنوں کے سیاسی کارکنوں میں اور آج کے سیاسی کارکنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُن دنوں کے سیاسی کارکن جیسے بھی تھے، وہ ہمہ وقت سیاسی کارکن تھے۔ پڑھے لکھے تھے یا غیر پڑھے لکھے، وہ اپنی اپنی جماعت کی پہچان ہوا کرتے تھے۔ یہ تمام سیاسی کارکن تقریباً بیکار ہوتے تھے۔ نہ کوئی کاروبار کرتے تھے نہ ملازمت کرتے تھے۔ اُن کی زندگی کا مشن اپنی پارٹی کی ترجمانی کرنا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بلاتمیز نظریات وخیالات معاشی اعتبار سے یکساں ہوا کرتے تھے۔ بڑے صابر وشاکر لوگ ہوتے تھے۔ ہمارے سامنے اُن دنوں عوامی نیشنل پارٹی کے کارکنوں اور دوسری سوشلسٹ پارٹی کے کارکنوں کی مثالیں ہوتی تھیں۔ اُن میں سے جو کارکن تو وکیل تھے اُن کی گذر اوقات تو ٹھیک ہو جاتی تھی مگر جو میری طرح کے صرف اور صرف سیاسی کارکن تھے، اُن کے حالات کچھ اچھے نہیں ہوتے تھے۔ مگر اِن تمام چیزوں کے باوجود نہ تو اُن کے جذبوں میں کوئی کمی ہوتی تھی اور نہ ہی وہ کبھی اپنے حالات کی شکایت کیا کرتے تھے۔ دراصل اُس وقت ابھی تک وہ دیش بھگتی کا سلسلہ قائم چلا آرہا تھا جو متحدہ ہندوستان میں سیاسی کارکنوں کا ہوتا تھا۔ جن کو اُس دور میں دیش بھگت کہا جاتا تھا۔ قومی درویش کہا جاتا تھا اور یہ لفظ کوئی باعث تحقیر نہیں تھا سیاسی کارکنوں کیلئے بلکہ باعثِ عزت اور احترام ہوا کرتا تھا۔ کم از کم میری سیاسی زندگی کا آغاز اِسی دیش بھگتی کے ہی پیرائے میں ہوا تھا۔ دیش بھگت بننے میں میری کوئی کوشش شامل نہیں تھی اور نہ ہی اِس کے لئے میں کہیں سے کچھ سیکھا پڑھا تھا۔ نہ ہی کسی منصوبہ بندی کا اِس میں کوئی دخل تھا۔ یہ دیش بھگتی میری سرشت میں شامل تھی۔ میرے اندر دیش بھگتی کے

www.bhutto.org

جراثیم کچھ زیادہ ہی تھے۔ یہ قوت میری باقی تمام صلاحیتوں کی قوتوں کو ڈومنیٹ کرتی تھی۔ اُن کو دبا دیا کرتی تھی۔ میرے اندر دیش بھگتی کے جذبے میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اِس میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ ایک ہی وحشت دل میں سمائی ہوئی تھی کہ اِس معاشرے کو تبدیل کر دیا جائے۔ مجھے اپنی تمام کم عمری اور کم علمی کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو ہی ایک ایسا انسان دکھائی دیتا تھا جو میری اُمنگوں پر پورا اُتر سکتا تھا۔ میرا بھٹو صاحب پر کچھ ایمان بیٹھ گیا تھا۔ آگے چل کر جو کچھ ہوا، اُس کا مجھے قطعی طور پر کوئی ادراک نہیں تھا۔ میں جو کچھ بھی کر رہا تھا، میں اِس کو ایک مہان کام سمجھ کر، ایک عظیم کام سمجھ کر کر رہا تھا۔ مجھے اپنے سیاسی کنوکشن سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز حسین نہیں لگتی تھی۔ لہٰذا میں اپنی دیش بھگتی کی کیفیت میں مست الست تھا۔

سوجھا نہ پھر کچھ آنکھ کو محمل یار دیکھ کر
کانٹوں کو روندتا آبلہ نکل گیا

دیش بھگتی کے معنی کیا ہیں

یہاں پر ضروری ہے کہ آج کے سیاسی کارکنوں کو یا آج سیاست میں دلچسپی لینے والے لوگوں کیلئے دیش بھگتی کی ترکیب کی کچھ وضاحت کردی جائے۔ اس ترکیب نے عہد غلامی میں متحدہ ہندوستان کی آزادی کی سیاسی جنگ میں جنم لیا تھا۔ ہندوستان میں جب آل انڈیا کانگرس پارٹی نے انگریز سامراج سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی سیاسی تحریک کا آغاز کیا تو انگریزوں نے کانگرس پارٹی کے تمام لیڈروں اور کارکنوں کو حکومتی اداروں سے باہر نکال دیا۔ اُن کی ملازمتیں ختم کر دیں۔ حکومت کے اِس ایکشن کے بعد ہندوستان کے تمام سیاسی کارکنوں پر زرق کے یا آمدنی کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ انگریزوں نے یہ چال اِس لئے چلی تھی کہ سیاسی کارکن جب بھوکے مرنے لگیں گے تو وہ انگریز کی مخالفت کرنا چھوڑ دیں گے۔ سیاسی کارکن توبہ تائب ہو جائیں گے۔ مگر سیاسی کارکن جو وطن کی آزادی کا جذبہ لے کر میدان میں آ نکلے تھے، اُنہوں نے بھوکا ننگا رہنا قبول کر لیا مگر اُنہوں نے آزادی کا پرچم خم نہ ہونے دیا۔ معمولی جوتا پہننا سروع کر دیا۔ بہت سادہ کھانا کھانے کی عادت پکی کر لی۔ اپنی بھوک، اپنی پیاس، اپنی خوش پوشی کو قوم کی آزادی پر قربان کر دیا۔ عیش ونشاط کی زندگی، آرام کی زندگی تیاگ کر سخت کوشی کی زندگی کو اختیار کر لیا۔ اس

www.bhutto.org

دیش بھگتی میں ہندوستان کے سیاسی کارکنوں کیلئے رول ماڈل آئیڈیل کی سب سے بڑی مثال کرم چند مہاتما گاندھی تھا جو اُس عہد کا سب سے بڑا دیش بھگت تھا۔ ہر چند ہندوستان کے سیاست دان بے حد امیر کبیر خاندانوں کے ہوتے تھے۔ مثلاً پنڈت نہرو بہت کھاتے پیتے گھرانے کے انسان تھے مگر گاندھی کی تقلید میں وہ بھی سادہ کُرتا یا پاجامہ پہنا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد بہت سادہ لباس رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی پیروی میں ہندوستان کے تمام سیاسی کارکن، سیاست دان اور تعلیم یافتہ لوگ سادہ لباس پہننا شروع ہو گئے۔ جب ہندوستان کے عوام نے اپنے قائدین کو سادگی اختیار کرتے دیکھا تو پورے ہندوستان کی قوم نے اُن کی پیروی میں سادگی اختیار کر لی۔ قومیں ایکٹروں کی نہیں رہنماؤں کی پیروی کیا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے رہنماؤں کی یہ سادگی ہی ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوری ریاست بنا گئی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے سیاست دانوں کے آئیڈیل جاگیردار، کارخانے دار یا بڑے بڑے بنگلے یا لمبی لمبی کاریں نہیں تھیں، اُن کے آئیڈیل زندگی کے اعلیٰ اُصول بن گئے تھے۔ جمہوریت اور آزادی اُن کے آئیڈیل تھے۔ قوم پرستی اُن کا آئیڈیل تھی جس کو دیش بھگتی کہا جاتا تھا۔ دیش بھگتی کا یہ نظریہ ہندوستان نے سوویت روس کی کیمونسٹ پارٹی کے عظیم انسانوں سے اخذ کیا تھا۔ سوویت روس کی کیمونسٹ پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کو کامریڈ کہا جاتا تھا۔ کامریڈ کی پہچان ہی یہ تھی کہ وہ اپنا سب کچھ انقلاب پر قربان کر دیتا تھا۔ یہ کامریڈ لمبی لمبی جیلیں کاٹا کرتے تھے۔ جلاوطنی کاٹا کرتے تھے۔ انتہائی برے اور بدترین حالات کا سامنا کر کے زندہ رہتے تھے۔ یہی تصور اور یہی نظریہ ہندوستان کے قوم پرست رہنماؤں اور سیاسی کارکنوں نے اپنی قوم کی آزادی کیلئے اختیار کیا تھا اور اُنہوں نے کامریڈ کی شکل میں لفظ دیش بھگت اختیار کر لیا جو اُن کی اپنی زبان کا لفظ تھا۔ مگر اِس کے معنی اور اُس کا تمام کردار و عمل وہی تھا جو سوویت روس کی کیمونسٹ پارٹی کے کامریڈوں کا ہوتا تھا۔ آپ اگر متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اُس دور کے ایسے تمام مسلمان سیاسی و مذہبی رہنما جنہوں نے اُس دور میں عوامی سیاست میں حصہ لیا تھا، یا وہ سیاسی تنظیمیں بنائی تھیں۔ وہ بھی گاندھی ہی کی طرح سادہ لباس ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر سیّد عطا اللہ شاہ بخاری کی جماعت الاحرار یا مجلس احرار کے تمام عہدے دار، لیڈر، خطیب بے حد سادہ لباس پہنتے تھے۔ اِس کے علاوہ جمعیت الاعلمائے السلام ہند جو مفتی محمود کی جماعت تھی، اُن

www.bhutto.org

کے تمام رہنما بھی نہایت سادہ قومی لباس پہنتے تھے۔یہاں تک کہ علامہ مشرقی کی خاکسار جماعت کی وردی بھی قومی لباس شلوار کرتا تھی۔صرف پہچان کے لئے اُس کا رنگ گہرا سرخ ہوتا تھا یا گیروا رنگ ہوتا تھا۔

وہ مسلمان رہنما جو کانگرس کے اتحادی ہوتے تھے۔وہ کانگرس کے رہنماؤں کی طرح ہی سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور دیش بھگت کہلاتے تھے۔یہی وجہ تھی کہ سرحد کے خان عبدالغفار خان جو کانگرس کے لیڈر تھے،اُن کو اپنی سادگی کی بناء پر ہی صوبہ سرحد میں "سرحدی گاندھی" کہا جاتا تھا۔ان تمام لوگوں کے مقابلے میں مسلمان مسلم لیگی سیاست دان جو تمام کے تمام نواب اور خان بہادر تھے،وہ انگریزوں کے پروردہ تھے اور انگریز پرست تھے۔یہ جاگیردار،خان بہادر،نواب انگریزوں کے ٹوڈی ہوتے تھے۔انگریزوں نے اپنی "تقسیم کرو" کی پالیسی کے مطابق ہندو لیڈروں پر دباؤ ڈالنے کیلئے مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ مسلمان جاگیرداروں سے بنوائی تھی جس کا بانی بنگال کا نواب زادہ خان بہادر سلیم احمد خان تھا۔یہ مسلم لیگ انڈیا کانگرس کے مقابلے میں بنوائی گئی تھی۔انڈیا کانگرس پورے ہندوستان کی سیاسی جماعت تھی۔وہ ہندوستان میں رہنے والی تمام قوموں کی نمائندہ سیاسی جماعت تھی۔وہ انگریزوں سے صرف ہندوؤں کی آزادی نہیں مانگتی تھی،وہ تو پورے ہندوستان کی آزادی مانگتی تھی۔انڈیا کانگرس چونکہ ایک قومی جماعت تھی لہٰذا بلاتخصیص مذہب اس جماعت میں مسلمان بھی شامل تھے۔جو اُنہی کی طرح دیش بھگت تھے،جس طرح ہندو تھے۔انگریزوں نے جب انڈیا کانگرس کی قوت کو زور بروز بڑھتے دیکھا تو اُس نے مذہب اور قوم کے نام پر کانگرس کو کمزور کرنے کے لئے کانگرس کے مقابلے میں مسلمان نوابوں، خان بہادروں اور اپنے درباری لوگوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم بنانے کا اشارہ کر دیا۔یہی وجہ تھی کہ مسلم لیگ میں سوائے خان بہادروں اور نواب زادوں اور کوئی عام مسلمان عہدے دار ہی نہیں تھا۔متحدہ ہندوستان میں پاکستان بننے تک مسلم لیگ کے لیڈروں کا صرف سیاسی کردار یہ تھا کہ وہ ہر معاملے میں ہندوؤں سے حصہ مانگا کرتے تھے۔لہٰذا ان مسلم لیگی لیڈروں کا کام سیاست میں صرف اسمبلی کی سیٹیں حاصل کرنا ہوتا تھا یا مسلمانوں کے نام پر ایک آدھ وزارت مانگنا ہوتا تھا۔گویا مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت نہ تھی۔ایک مراعات مانگنے والی تنظیم تھی۔جس کا عام مسلمان کے ساتھ صرف نام کا تعلق تھا۔باقی تمام مراعات جو وہ

www.bhutto.org

ہندوؤں سے حاصل کرتے تھے، وہ خود آپس میں تقسیم کر لیتے تھے۔ عام مسلمان کو اِس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔

یہ تمام جاگیردار مسلم لیگی لیڈر ہندو دیش بھگتوں کے مقابلے میں بڑی ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے اور اپنی امارت کے اظہار میں ذرا شرم محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہماری بدنصیبی یہ ہوئی کہ جب انگریزوں نے پاکستان بنانے کا فیصلہ کر لیا تو یہی خان بہادر، نواب اور جاگیردار پاکستانی قوم کے قائدین کی شکل میں حکمران بن گئے اور ایک منصوبے کے تحت ہندوستان چھوڑ کر پاکستان میں آ گئے۔ پاکستان میں اِن کے آنے کی وجہ کانگرس کی انقلابی سیاست اور قوم پرستی تھی۔ کانگرس نے حکومت حاصل کرتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ہندوستان سے جاگیردارانہ نظام کو ختم کر دیا۔ تمام زمینوں کو ہندوستان کے عام لوگوں میں، کسانوں، مزدوروں میں تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ جاگیروں کی تقسیم کانگرس کے منشور کا حصہ تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کے تمام مسلمان جاگیردار پاکستان بھاگ کر آ گئے اور یہاں آ کر اپنی تمام جاگیریں پاکستان میں حاصل کر لیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے جاگیرداروں نے پاکستان صرف اپنی جاگیریں حاصل کرنے کے لئے حاصل کیا تھا۔ وگرنہ عام مسلمانوں کو پاکستان کے وجود میں آنے سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اِن تمام جاگیردار سیاست دانوں میں سوائے قائداعظمؒ کے اُن کا کوئی نام آج تک نہیں جانتا۔ جبکہ اُن کے مقابلے میں ہندوستان کے رہنماؤں کے نام پر یونیورسٹیاں، سٹیڈیم اور ہسپتال بنائے جا چکے ہیں۔ اِس صورتحال پر مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آ رہا ہے۔

اہلِ خرد میں کون تھا ایسا جن کو زمانہ جانتا ہو
اہلِ جنوں تو اِس دنیا میں قیس ہوئے فرہاد ہوئے

اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ مشرقی پاکستان کے سیاست دان ہندو لیڈروں کے برابر کی چوٹ تھے۔ اُنہیں کی طرح سادہ تھے۔ سچے دیش بھگت تھے مگر پاکستان کے جاگیردار اور پاکستان کے فوجی حکمران اِن قوم پرستوں کو بھوکے ننگے بنگالی کہا کرتے تھے اور پاکستان کے اقتدار میں اُن کا کوئی حق خیال نہیں کرتے تھے۔ یہ بات یاد رہے کہ جب تک کسی قوم کو اُس کی قومی سیاست میں دیش بھگت نصیب نہیں ہوتے، کامریڈ نصیب نہیں ہوتے، جیالے نصیب نہیں ہوتے، وہ قوم عظیم بن ہی نہیں سکتی۔ جب تک کسی قوم کو ایک قومی سیاسی پارٹی اور قومی قیادت نصیب نہیں ہوتی، وہ قوم

www.bhutto.org

مکمل قوم نہیں بن سکتی۔

میرا دیش بھگتی کا فیصلہ

لاہور میں اُن دنوں دن بدن ہمارا ہم خیال سیاسی حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اُس وقت لاہور میں نمایاں لوگوں میں ہم گنتی کے لوگ تھے جن کو لوگ بھٹو صاحب کے قریبی لوگ خیال کرتے تھے جن میں شیخ صفدر علی، مرحوم شیخ سرور اقبال، ملک آفتاب ربانی، ملک غلام جیلانی ایڈووکیٹ، میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ، ملک حامد سرفراز، امان اللہ خان، ملک نوید، ملک پرویز اختر ایڈووکیٹ، راجہ منور احمد، ڈاکٹر مبشر حسن، راشد بٹ، میاں محمد اسلم آف بیڈن روڈ، خالد چوہدری، ادریس کھٹانہ، عباس بلوچ، ملک غلام کبریا خان، ملک اسلم حیات، احسان وائیں، فاروق بیدار۔ واضح رہے کہ اُس وقت آغا شورش کشمیری بھی ہمارا حامی تھا۔ بھٹو صاحب کی مخالفت کی وبا تو پارٹی کے وجود میں آنے کے بعد پھوٹی تھی۔ جس وبا کے اِن میں سے بہت سے لوگ شکار ہو گئے تھے جن کے میں نے نام تحریر کیۓ ہیں۔ بلکہ شکار نہیں ہوئے تھے، اُن میں سے کچھ لوگوں نے بھٹو صاحب کی مخالفت کی تحریک چلانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اِن لوگوں میں ملک غلام جیلانی، آغا شورش کشمیری اور ملک حامد سرفراز کے نام سرفہرست ہیں۔

جہاں تک میری ذات کا معاملہ تھا، میں تو اپنی کشتیاں جلا کر بھٹو صاحب کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ میرے پاس تو کسی جمع تفریق کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میرے ذمے اپنی شاعری کے حوالے سے بھٹو صاحب کی ترقی پسند سوشلسٹ عوامی سیاست کی ترجمانی کا محاذ تھا جس کیلئے میں نے صرف شاعری ہی نہیں کی تھی بلکہ اُس کیلئے اپنی زندگی ہی وقف کر دی تھی۔ میں روزِ اول سے ہی ایک (ہول ٹائم) ہمہ وقت سیاسی کارکن تھا۔ میرا اُوڑھنا بچھونا ہی پارٹی کی سیاست ہوتی تھی۔ ایک سرخ انقلاب کی لگن تھی جو میرے دل کو بے چین رکھتی تھی۔ میرے سامنے سوویت روس کی اور عوامی جمہوریہ چین کی کیمونسٹ پارٹی کے انقلابی کامریڈوں کی مثالیں تو موجود نہیں تھیں مگر ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی اور کانگرس کے عوامی دیش بھگتوں اور کارکنوں کی مثالیں موجود تھیں اور اُن کی جدوجہد کی تاریخ میرے سامنے تھی۔ اُن کی جدوجہد کی کامیابی کا ایک ہی راز سمجھ میں آتا تھا کہ وہ لوگ بے لوث کام کرتے تھے۔ وہ کسی نام ونمود کا کمپلیکس نہیں رکھتے تھے۔ وہ پہلے تعلیم

www.bhutto.org

حاصل کرتے تھے۔ اس کے بعد خود کو انقلاب کیلئے وقف کر دیتے تھے۔ اُن کی دیش بھگتی کی شرط اوّل ہی یہ تھی کہ سیاسی کارکن کو دنیاوی لالچ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ ہر طرح کے لالچ، ہر طرح کی حرص سے پاک صاف ہونا چاہیے۔ یہ دولت، یہ عہدے، یہ سرکاری ملازمت، یہ عام لوگوں کے شوق اور شغل ہوتے ہیں، کسی قوم پرست عوامی رہنما اور کارکن کو اِن چیزوں کی اشتہا نہیں ہونی چاہیے۔ ایک قوم پرست کو اپنی بھوک، پیاس، اپنی خواہش، اپنی اُمنگیں، اپنی قوم پر قربان کر دینی چاہئیں۔ خود کو صرف انقلاب اور انقلاب کے لئے وقف کر دینا چاہیے۔ گویا ایک سچے سیاسی کارکن یا کامریڈ یا دیش بھگت کا زمانہ جدوجہد ایک روزے کی طرح کا ہوتا ہے اور ایک انقلابی کامریڈ کا روزہ انقلاب آنے پر ہی کھلتا ہے۔ ایک ایسا سماجی اور معاشی انقلاب جس میں سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ ہر انسان کو آئینی طور پر ہر وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے جس کی انسانی زندگی کو ضرورت ہوتی۔ لہٰذا ایک کامریڈ یا ایک کارکن یا ایک رہنما کو اپنی تمام تر توانائیاں اِس عظیم مقصد کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔ اپنی تمام صلاحیتوں کو قوم کیلئے وقف کر دینا چاہیے۔

میری شعوری کوشش تھی کہ پارٹی کے کارکنوں کے سامنے خود کو ایک مثال بنا کر پیش کیا جائے۔ اُن کو عوام کی بے لوث خدمت کے لئے تیار کیا جائے۔ اُن میں قربانی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی مثالی عوامی جدوجہد کی زندگی سے تاریخ کے اُن مثالی دیش بھگتوں کی زندگیوں کی یاد تازہ کر دی جائے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ بقول ''سعدائے سرمد''

عمر لیست کہ افسانہ منصور کہن شد
من از سرِ نو تازہ کنم دار و رسن را

حضرات یہ سعدائے سرمد وہی سرمد ہیں جن کو اورنگ زیب عالمگیر نے مصلوب دار کیا تھا۔ سرمد ایک صاحب حال سرمست فقیر تھا جس کو اپنے وجود کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ اُس کو اِس بات کا احساس ہی نہیں تھا کہ اُس نے کچھ پہن رکھا ہے یا وہ برہنہ تن ہے۔ ایسے مجذوب پر بنیاد پرست، مذہبی جنونی بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا الزام تھا کہ یہ شخص خلافِ شرع زندگی کا حامل ہے لہٰذا گردن زدنی ہے۔ سرمد اورنگ زیب کی نسبت بلا کا عالم فاضل انسان تھا۔ فارسی زبان کا بے بدل استاد شاعر تھا۔ اوپر تحریر کئے گئے شعر میں کہتا ہے۔ ''ایک زمانہ گذر چکا ہے کہ لوگ منصور انا الحق کے قصّے کو بھول چکے ہیں۔ منصور کے حق کا نعرہ پُرانا ہو چکا ہے۔ میں سولی پر چڑھ کر اُس افسانے کو،

www.bhutto.org

اُس نعرے کو پھر سے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔"

خدا کا شکر ہے کہ مجھے اپنی اِس جدوجہد میں میری توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے گلی گلی عوامی کارکن پیدا کردیئے۔ پاکستان کا ہر ڈاؤن ٹراڈن ہر وہ انسان جس کو پاکستان کے استحصالی نظام کے چوہدری، جاگیردار، وڈیرے کمی کہا کرتے تھے، ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت نے اور ہماری جدوجہد نے اُن کو کامریڈ اور دیش بھگت اور عوامی کارکنوں بنادیا تھا۔ پاکستان کی سماجی زندگی میں یہ تبدیلی کسی انقلاب سے کم تبدیلی نہیں تھی۔ یہ تو برا ہو پاکستان میں فوجی جرنیلوں کے غیر سیاسی اقتدار کا جن کے اقتدار نے پاکستان کی سیاست میں اپنی اپنی کنگ پارٹی بنا کر پاکستان کے سیاست دانوں اور سیاسی کارکنوں کو کرپٹ کردیا۔ اُن کو کمرشل کارکن بنادیا۔ سیاست کو دولت حاصل کرنے کا ذریعہ بنادیا۔ جس کی وجہ سے ہماری تمام محنت اور ریاضت پر پانی پھر گیا۔ ہماری تمام جدوجہد غارت چلی گئی۔

پاکستان کی سیاست میں یہ ٹنڈنسی اور اِس قسم کے سوچنے کا انداز دراصل پرانا جاگیردارانہ سیاست کا انداز تھا۔ جب پاکستان میں صرف جاگیرداروں، وڈیروں، خان بہادروں اور نواب زادوں کو ہی سیاست دان تصور کیا جاتا تھا یا اُن کی اولادوں کو سیاست دان کہا جاتا تھا۔ کسی عام انسان کو سیاست دان تصور ہی نہیں کیا جاتا تھا۔

اس وقت کی پاکستان کی قومی سیاست کا منظر نامہ

پاکستان کی قومی سیاست کا اُس وقت یہ عالم تھا کہ پاکستان کے تمام جاگیردار سیاست دان جن میں میاں ممتاز دولتانہ، سندھ کا کھوڑو، سرحد کا عبدالقیوم خان وغیرہ ایوب خان کی حکومت کے ساتھ ایک قسم کا سمجھوتہ کیئے بیٹھے تھے۔ یہ تمام لیڈر ایوب خان کے ایبڈو کے قانون کو تسلیم کر چکے تھے۔ یہ لوگ نہ تو کوئی حیلہ کرتے تھے اور نہ کسی بھی قومی معاملے پر بیان جاری کرتے تھے۔ یہ ڈرے ہوئے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ عوامی نیشنل پارٹی کو ویسے ہی ہندوستان کی ایجنٹ قرار دے رکھا تھا اور حکومت کی باقاعدہ سازش سے نیپ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا یعنی مغربی پاکستان کی نیپ اور مشرقی پاکستان کی نیپ کو علیحدہ کردیا گیا تھا۔ مغربی پاکستان کی نیپ ولی خان اور غوث بخش بزنجو کی نیپ کہلاتی تھی۔ مشرقی پاکستان کی نیپ مولانا بھاشانی کی نیپ کہلاتی تھی۔

www.bhutto.org

ولی خان کی نیپ بھاشانی کی نیپ پر حکومت کی ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا کرتی تھی۔ ولی خان گروپ کے اِس الزام کا کچھ ثبوت مغربی پاکستان میں ریلوے کی ہڑتال کے وقت دیکھنے میں آیا تھا۔ جب مرزا ابراہیم صاحب جو اپنے دور کے بہت بڑے ٹریڈ یونینسٹ تھے، اور جن کا تعلق بھاشانی کی نیپ سے تھا، اُن کے ہڑتال ختم کرنے کے اعلان سے ملا تھا۔ اُنہوں نے ریلوے کی ہڑتال ختم کرنے کے لئے اپنے اعلان کے بارے میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ یہ ہڑتال امریکہ کی سیکرٹ سروس ایجنسی سی۔ آئی۔ اے نے پاکستان میں کرائی ہے۔ لہٰذا کوئی سوشلسٹ اِس ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لئے اِس میں شریک نہیں ہوسکتا۔ مرزا ابراہیم کے اِس موقف کی وجہ سے نیشنل عوامی پارٹی کو عوامی سطح پر بڑی سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ خاص طور پر مزدوروں میں اِس پارٹی کی سیاست کو بہت بڑا دھچکا پہنچا تھا۔ اُس وقت کی ریلوے کی ہڑتال ایشیاء میں ریلوے کی سب سے بڑی ہڑتال تھی۔ تقریباً تین دن تک پاکستان کی مرکزی لائن پر ہر طرح کی گاڑی کی آمدورفت معطل رہی تھی۔ تین مزدور شہید ہو چکے تھے۔ اِس قسم کی آتش فشاں صورتحال میں مرزا ابراہیم کا فیصلہ بے حد مایوسی کا باعث بن گیا تھا۔ یاد رہے کہ مرزا ابراہیم چین نواز سوشلسٹ لیڈر تھا اور خود بھاشانی صاحب بھی چین نواز سوشلسٹ رہنما تھے اور بقول اُن کے چو۔ این۔ لائی اور ماؤزے تنگ کے کہنے پر ہی اُنہوں نے جنرل ایوب خان کا 1964ء کے بلدیاتی انتخابات میں مشرقی پاکستان میں ساتھ دیا تھا۔ پاکستان کی تمام رجعت پسند جماعتیں تو ویسے ہی ایوب خان کے ساتھ خاموش قسم کا اتحاد کئے بیٹھی تھیں۔ ترقی پسند بائیں بازو کی جماعتیں تھیں، وہ اپنے اندرونی خلفشار کا شکار ہوکر بے بس ہو چکی تھیں، بے اثر ہو چکی تھیں۔ اُن کا اثر ورسوخ اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہوکر رہ گیا تھا۔ عوامی سطح پر کسی بھی سوشلسٹ پارٹی کی کوئی تنظیم موجود نہیں تھی اور نہ ہی کوئی مقبولیت تھی۔

اِس طریقے سے پاکستان کی قومی سیاست میں قیادت اور سیاست کا ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو چکا تھا۔ جس سیاسی خلا کو ذوالفقار علی بھٹو نے سیاست میں اپنی آمد سے بڑی جرات اور بہادری کے ساتھ انتہائی سائنٹفک طریقے سے پُر کیا تھا۔

لارڈ ہوٹل کا تاریخی استقبالیہ

اُن دنوں ایوب خان کے مرکزی وزیر خزانہ شعیب نے ایوب خان کی حمایت میں بھٹو

www.bhutto.org

صاحب کے خلاف بڑا تھرڈ کلاس قسم کا بیان دیا تھا۔شعیب کے اِس بیان کے ساتھ ہی ایوب خان کے پولیٹیکل سیکریٹری الطاف گوہر نے بھی بھٹو صاحب کے خلاف بیان داغ دیا۔بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ اِن دونوں کا جواب عوامی فورم پر دیا جائے۔اُنہوں نے شیخ صفدر علی کو راشد بٹ کو لانے کو کہا۔شیخ صفدر علی صاحب راشد بٹ کے ہمسائے ہوا کرتے تھے۔سمن آباد لاہور میں چھوٹی مارکیٹ میں اِن دونوں کے گھر ایک دوسرے کے بہت قریب ہوا کرتے تھے۔راشد بٹ فلیٹیز میں آگیا۔بھٹو صاحب راشد بٹ کو اپنے ساتھ باہر لان میں لے کر چلے گئے۔کچھ دیر بعد واپس کمرے میں آگئے۔راشد بٹ کے ساتھ طے پا گیا کہ لارڈ ہوٹل میں شہریوں اور طالب علموں کا ایک ملا جلا استقبالیہ بھٹو صاحب کو دیا جائے گا۔لارڈ کے استقبالیے کے فیصلے کے طے پا جانے کے بعد ہم لوگ اِس استقبالیے کو کامیاب بنانے کی کوشش میں لگ گئے۔میری ڈیوٹی لگادی گئی کہ میں راشد بٹ صاحب کے ساتھ مستقل رابطہ رکھوں بلکہ راشد بٹ صاحب کے ساتھ ہی لگا رہوں۔ بھٹو صاحب نے خاص طور پر مجھے اور شیخ صفدر صاحب کو کہا کہ لاہور کے دانشوروں، وکیلوں اور سیاسی رہنماؤں، کارکنوں اور صحافیوں کو ذاتی طور پر جا کر دعوت دیں کہ وہ اِس دعوت میں ضرور تشریف لائیں۔اِس استقبالیے میں جب تین دن رہ گئے تو میں شیخ صفدر علی صاحب کے کہنے کے مطابق شام کو لارڈ ہوٹل میں استقبالیہ کی تیاریوں کے بارے میں معلوم کرنے گیا۔وہاں ادریس کھٹانہ ملا۔اُس نے مجھے بتایا کہ استقبالیہ پر تقریباً 2 ہزار روپے کا خرچا آرہا ہے مگر ہمارے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔250 روپے راشد بٹ کے پاس تھے۔اب وہ گوگو کے اوپر جہاں آجکل گوگو ہے، فلاش کا جوا کھیل کر پیسے جیتنے گیا ہے۔میرے لئے کھٹانہ کی یہ بات اِس قدر غیر سنجیدہ تھی کہ مجھے جھوٹ لگی۔لارڈ میں اُس وقت خالد چوہدری، سید انور قدوائی اور ظہور بھائی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اُن کو راشد بٹ کی صورتحال سے آگاہ کیا۔خالد چوہدری اور ظہور بھائی بھی اِس استقبالیے کیلئے انتظامات میں شریک تھے۔وہ کہنے لگے۔فکر کی کوئی بات نہیں، جو بھی ہوگا ہم خود سنبھال لیں گے۔آپ لوگ،لوگوں کو استقبالیے کی دعوت دیتے جائیں۔اِس کے بعد میں نے شیخ صفدر علی صاحب کو راشد بٹ کے جوئے کا بتایا۔وہ کہنے لگے کہ میں نے پہلے دن ہی راشد بٹ کو کہا تھا کہ یہ پیسے ہم دینے کو تیار ہیں بلکہ بھٹو صاحب خود دینے کو تیار تھے مگر راشد بٹ نے کچھ بھی لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔اب جو معاملہ تم بتا رہے ہو، یہ کوئی تسلی بخش معاملہ نہیں ہے۔

www.bhutto.org

دوسرے دن صبح گیارہ بجے میں لارڈ ہوٹل پہنچ گیا۔ لارڈ میں راشد بٹ اور اُس کے ساتھ ایک دوسرے طالب علم لیڈر نما لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے جاتے ہی جوئے کی جیت کا پوچھا۔ وہ بولا۔ وہ تو سب پیسے ہار گئے۔ جیتنے کی کوشش کی تھی نہیں جیت سکا۔ میں نے پوچھا۔ اب کیا ہوگا۔ وہ جو ساتھ لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ راشد بٹ سے بھی کئی ہاتھ آگے تھا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے کارڈ چھپنے دے رکھے ہیں۔ آج دوپہر کو کارڈ مل جائیں گے۔ بس ہم کارڈ فروخت کریں گے۔ پیسے ہی پیسے ہو جائیں گے۔ واضح رہے کہ وہ تیز طرار لڑکا جہانگیر بدر تھا۔ میں اُس لڑکے کی بات سُن کر ششدر رہ گیا۔ وہاں سے اُٹھ کر میں دوبارہ شیخ صفدر علی کی طرف چل پڑا۔ میں تمام راستہ راشد بٹ اور اُس لڑکے کے بارے میں سوچتا جا رہا تھا۔ میں سوچتا جاتا تھا کہ کس قدر غیر سنجیدہ لڑکوں پر بھٹو صاحب اعتماد کر بیٹھے ہیں۔ اخباروں میں اِس استقبالیے کی خبر آ چکی ہے اور جن کو اہتمام کرنا ہے، اُن کی حالت عجیب و غریب ہے۔ میں چونکہ راشد بٹ کو زیادہ نہیں جانتا تھا۔ مجھے وہ بے حد حیرت ناک سا لڑکا لگا۔ میں نے شیخ صفدر صاحب سے کہا کہ شیخ صاحب! یہ لڑکے تو بالکل پاگلوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ اب اِس معاملے کو آپ سختی سے خود حل کریں۔ یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میں نے لاہور کی تقریباً تمام قابل ذکر شخصیتوں کو استقبالیے میں آنے کی دعوت دے رکھی ہے، کہیں مذاق نہ بن جائے۔ میں نے اپنی فکرمندی کا کھل کر اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ 500 روپے میں دے دیتا ہوں، باقی آپ دیں اور اِس مسئلے کو پوری طرح حل کر دیں۔ اُنہوں نے کہا کہ شام کو راشد بٹ کے ساتھ اُن کی ملاقات ہوگی، وہاں پر سب کچھ طے پا جائے گا۔ تم لوگوں کو آنے کی دعوت دیتے جاؤ، پیسوں کی فکر نہ کرو۔

دوسرے دن میں لارڈ ہوٹل گیا تو راشد بٹ اور وہ لڑکا اور اُن کے ساتھ 10 لڑکے بیٹھے ہوئے تھے جو تمام رات کارڈ فروخت کرتے رہے تھے۔ وہ رات بھر میں تقریباً 300 کارڈ فروخت کر چکے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ راشد بٹ جس کو کل میں ملا تھا، وہ کوئی اور تھا۔ یہ راشد بٹ ہی نیا تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ ایک ہزار آدمیوں کو دعوت دے دو۔ ایک ہزار کو چائے پیسٹری پیش کی جائے گی۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ ہمارے کارڈ بلیک میں بک رہے ہیں۔ میں نے اُس وقت اپنی زندگی میں یا تو فلم ''دیدار'' کی ٹکٹیں اِس سے پہلے کبھی بلیک ہوتی دیکھی تھیں یا اب یہ بھٹو صاحب کے استقبالیے کے کارڈز بلیک ہوتے دیکھے تھے۔ راشد بٹ بے پروا ہو چکا تھا۔ مجھے کہنے لگا۔ شاعر

صاحب! کل نظم پڑھواور آگ لگا دو۔ اِن باتوں کے بعد کچھ لڑکے بتانے لگے کہ کل 10 کالجوں کی پوری حاضری ہمارے اجلاس میں آئے گی۔ اب میرے دل کو تسلی ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں رات گئے تک وکیلوں، صحافیوں کو دعوت دینے میں مصروف رہا۔ تقریباً ایک سو آدمیوں کو میں نے خود اپنے ہاتھ سے کارڈ دیئے تھے۔ لارڈ ہوٹل کے ہال کی کل حاضری 250 انسانوں کی تھی۔

دوسرے دن یعنی استقبالیے کے دن میں 12 بجے کے قریب ہوٹل پہنچ گیا۔ استقبالیے کا وقت تین بجے دیا گیا تھا۔ ہوٹل ایک بجے دن کو ہی بھر چکا تھا۔ 2 بجے ہوٹل کے اندر اِس قدر لوگوں کی حاضری ہو چکی تھی کہ کوئی شخص اندر آ سکتا تھا نہ باہر جا سکتا تھا۔ باہر مال روڈ پر آدمی ہی آدمی نظر آرہے تھے اور بھٹو صاحب کے آنے تک یہ استقبالیہ ایک جلسے اور جلوس کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ بھٹو صاحب کو راشد بٹ وغیرہ ہوٹل کے کچن کی طرف سے لائے تھے۔ بھٹو صاحب کی آمد کے ساتھ ہی لوگوں کا ایسا ریلہ پڑا کہ لارڈ ہوٹل کے باہر کے تمام بڑے شیشے ٹوٹ گئے جس کی وجہ سے مال روڈ اور لارڈ ہوٹل کا ہال ایک ہو گیا۔ بڑی مشکل کے ساتھ بھٹو صاحب سٹیج تک پہنچ سکے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد میری نظم ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' پڑھی گئی۔ اِس نظم کا پہلا بند ملاحظہ فرمائیں۔ یہ نظم ایوب خان کی کتاب کے خلاف لکھی گئی تھی۔

تخریب کا ساماں ہے سلطان کی گمراہی
غارت گرِ انساں ہے اسلوبِ شہنشاہی
سمجھے گا جسے ہوگی تاریخ سے آگاہی
چنگیز و ہلاکو کیا خاک خبر ہوگیا
کس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی
اس رزق سے موت اچھی

مجھے راشد بٹ نے جلسے میں آگ بھڑکانے کا کہا تھا۔ میں نے آگ بھڑکا دی۔ اُن دنوں بھٹو صاحب ابھی اُردو میں دل کھول کر تقریر نہیں کر سکتے تھے۔ ابھی اُردو کے تسلسل میں اُنہیں کچھ ہچکچاہٹ محسوس ہوا کرتی تھی۔ جلسے کے جوش و جذبے کو دیکھ کر اور میری نظم کی شعلہ بیانی کو دیکھ کر اُنہوں نے اپنی تقریر کے آغاز میں ہی کہہ دیا کہ مجھے اجازت دیں کہ میں انگریزی میں تقریر کروں۔ اُنہوں نے تقریر شروع کر دی۔ اُنہوں نے آغاز ہی میری نظم کے پیرائے سے کیا۔ جس

طرح یہ قوم قابل رحم ہے۔ اِسی طرح علامہ اقبال بھی قابل رحم ہے۔ اب چیلیں اور کوے اقبال کے شاہین بنے بیٹھے ہیں۔ بھٹو صاحب کی اِس بات پر کافی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ نعرے لگتے رہے۔ اِس طریقے کے ساتھ بھٹو صاحب نے مجمع کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں کرلیا۔ یہ ایک فیشن بن چکا ہے کہا جاتا ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ مشرقی پاکستان جو ایک اکثریتی صوبہ ہے، اُس میں علیحدگی کے آثار نمایاں ہورہے ہیں۔ میں یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ اکثریتی صوبہ خود علیحدہ ہوجانا چاہتا ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا۔ مشرقی پاکستان کے لوگ ویسا ہی چاہتے ہیں جس کا ذکر اسلم گورداسپوری نے اپنی نظم میں کیا ہے۔ وہ ہم کو اپنا دوست چاہتے ہیں، ہم کو اپنا آقا تسلیم نہیں کرتے۔ بھٹو صاحب کا اشارہ ایوب خان کی کتاب کی طرف تھا۔

اُن دنوں بھٹو صاحب کے خلاف جنرل ایوب خان کے تمام وزیر باجماعت بیان دیا کرتے تھے۔ اُن سب میں سے وزیرِ خزانہ شعیب کی آواز سب سے اونچی ہوتی تھی۔ وزیرِ خزانہ شعیب امریکہ کا خاص آدمی تھا۔ جب بطور خارجہ منسٹر بھٹو صاحب نے پاکستان کا روس کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کرنا چاہا تھا تو اِس شخص نے ایوب خان کی کیبنٹ میں سب سے زیادہ بھٹو صاحب کی اِس کوشش کی مخالفت کی تھی اور ایوب خان کو خوفزدہ کردیا تھا کہ امریکہ تم سے ناراض ہوجائے گا۔ امریکہ کا اعتماد ایوب خان سے اُٹھ جائے گا۔ اِس کے علاوہ پاکستان کی مذہبی قوتیں حکومت کے خلاف ہوجائیں گی۔ اِس لئے کہ روس ایک لادین ملک ہے اور پاکستان ایک دین دار ملک ہے۔ اِس طرح ایک دین دار ملک کی ایک لادین ملک کے ساتھ دوستی نہیں ہوسکتی۔

(نوٹ) حضرات واضح رہے کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے پاکستان کو امریکہ کا بدترین فوجی اڈا بنادیا تھا۔ جنہوں نے پاکستان کو ایک جمہوری ملک بننے ہی نہیں دیا تھا۔ جنہوں نے پاکستان کو آغاز میں ہی عالمی سازش کا شکار بنادیا۔

بھٹو صاحب نے وزیرِ خزانہ شعیب کے تمام الزامات کا جواب دیا۔ سب سے خوبصورت بات اُنہوں نے الطاف گوہر کو مخاطب ہوکر کہی۔ الطاف گوہر خود کو ایک فلسفی کہا کرتا تھا۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی یعنی نوبت یہ آں جارسید کہ الطاف گوہر نے بھی بھٹو صاحب کے خلاف نہایت گری ہوئی زبان میں بیان دیا تھا جو کل تک بھٹو صاحب کو کہا کرتا تھا کہ ہم انٹیلیکچول فرینڈ ہیں۔ ہم دونوں دانشور دوست ہیں۔ بھٹو صاحب کو قدرت نے کمال کا حافظہ دے رکھا تھا۔ وہ تاریخی

www.bhutto.org

کرداروں کے ریفرنس کوٹ کرنے میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اِس مضمون پر کھل کر بات کتاب کے اصل مقام پر ہوگی۔ وہ ایک فقرے سے اپنے مخالف کو چاروں شانے چت کر دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے الطاف گوہر کے بیان کا ذکر کرتے ہوئے شیکسپیئر کے لافانی ڈرامے ''جولیس سیزر'' کا حوالہ دیا اور الطاف گوہر کو کہا۔ اَٹ۔ٹو۔ بروٹ۔ اُس کے مکمل الفاظ یوں تھے۔ ''یو۔ٹو۔ بروٹس۔ بروٹس، تم بھی''۔ اِس عالم گیر محاورے کا پس منظر یہ ہے کہ جب سیزر کے خلاف اُس کے جرنیلوں نے سازش تیار کی کہ اِس شخص کو قتل کر کے اقتدار حاصل کر لیا جائے تو اُن سازشیوں میں سیزر کا ایک دوست بروٹس بھی شامل تھا جو خود کو دانشور ظاہر کیا کرتا تھا۔ اب جب سیزر پر قتل کا حملہ کیا گیا تو تمام قاتلوں نے اپنے اپنے ڈیگر (خنجر) سیزر کے سینے میں اُتار دیئے۔ قاتلوں نے اپنے خنجر گھونپنے کے بعد بروٹس کی طرف دیکھا کہ تم بھی اپنا خنجر سیزر کے کلیجے کے آر پار کرو۔ لہٰذا جب بروٹس نے اپنے خنجر سے سیزر پر وار کیا تو وہ سیزر جو باقی قاتلوں کے وار پر خاموش رہا تھا، اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس کو اپنی موت سے زیادہ بروٹس کی بدعہدی، محسن کشی اور غداری پر زیادہ افسوس ہوا۔ قاتلوں کے مہلک واروں سے وہ بولنے کے قابل نہ رہ گیا تھا مگر اِس کے باوجود اُس نے اپنے ایک دوست کو خنجر مارتے دیکھا تو بولا بلکہ بمشکل بولا کہ ''بروٹس تم بھی''۔ اُس کی زبان سے پورے الفاظ تو نکل نہ سکے۔ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ یو۔ٹو۔ بروٹ۔ یہی الفاظ بھٹو صاحب نے الطاف گوہر کے لئے کہے۔

اِس استقبالیے میں صفدر میر، بابا ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، صفدر میر، شیخ حامد محمود، مجید نظامی، آغا شورش کشمیری، میاں محمود علی قصوری، آئی۔اے۔ رحمٰن، حسین نقی، سید انور قدائی، ظہیر بابر، برکی صاحب، میاں محمد اسلم، خالد چوہدری، سی۔آر۔ اسلم، میجر اسحاق، ظہوری عالم شہید، عزیز مظہر، ملک اسلم حیات، مظہر علی خان، امان اللہ خان، جہانگیر بدر، نثار عثمانی، ملک حامد سرفراز، نوید ملک، میاں سلیم جہانگیر اور شیخ ریاض احمد (جو بعد میں پاکستان کے چیف جسٹس بن گئے) موجود تھے۔ اِن کے علاوہ بہت سے معروف صحافیوں اور سیاست دانوں نے بھی شرکت کی جن کے نام مجھے یاد نہیں آ رہے۔ یہ استقبالیہ لاہور کے شہریوں کی مکمل حاضری کا استقبالیہ تھا۔ اِس میں شرکت کرنے والے تمام لوگ ایک طرح کے نمائندہ لوگ تھے۔ صاحب الرائے لوگ تھے۔ اِس استقبالیے میں خطاب کے بعد بھٹو صاحب کا سیاسی تشخص بہت بلند ہو گیا تھا۔ وہ لوگ جو حکومت کے پروپیگنڈے کی وجہ سے کسی تذبذب کا شکار تھے کہ بھٹو سیاست میں نہیں آئے گا۔ ملک سے

باہر بھاگ جائے گا۔ وہ لوگ مطمئن ہو گئے۔ اُن کو بھٹو صاحب کے عزم و ارادے کا علم ہو گیا۔ لہٰذا میری نظر میں لارڈ ہوٹل کا یہ استقبالیہ ایک اہم ترین استقبالیہ تھا۔

بابا ظہیر کاشمیری کے ساتھ بھٹو صاحب کی ملاقات

میں بابا ظہیر کاشمیری کے ساتھ مال روڈ پر چہل قدمی کرنے لگ گیا۔ شام کا یہ وقت اُن کی چہل قدمی کا وقت ہوتا تھا۔ میں نے بابا جی سے بھٹو صاحب کی تقریر کے بارے میں پوچھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ شخص ایوب خان کی حکومت کے رازوں سے واقف ہے۔ ایوب خان اِس شخص کو کسی قیمت پر سیاست میں آنے نہیں دے گا۔ یہ معاملہ بے حد سنجیدہ ہوتا جائے گا۔ حکومت دن بہ دن اِس کے پیچھے پڑتی جائے گی۔ اِس شخص کو چاہیے کہ فوری طور پر اپنی سیاسی جماعت بنا کر خود کو مضبوط بنائے۔ اگر بھٹو صاحب نے کسی پرانی بنی بنائی پارٹی کا سہارا لینا چاہا تو وہ ایک کمزور سہارا ہوگا۔ اُن کو اپنی سیاسی قوت پیدا کرنی چاہیے۔

میں نے بابا ظہیر کاشمیری سے کہا کہ مہربانی کر کے میرے ساتھ فلیٹیز چلیں اور بھٹو صاحب کو یہ مشورہ خود اپنی زبانی دیں۔ وہ کہنے لگے کہ وہ مصروف آدمی ہے۔ کیا خبر مل سکے گا یا نہیں۔ بغیر اُن سے وقت لئے میرا جانا کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ میں چونکہ بابا جی سے اپنی بات منوالیا کرتا تھا۔ میں نے کہا بابا جی! ہم نے ٹہلنا تو ہے، وہاں تک ٹہلتے چلے جاتے ہیں۔ بھٹو صاحب مل گئے تو بات ہو جائے گی نہیں تو ہم چہل قدمی کرتے ہوئے واپس آ جائیں گے۔ میری اِس بے ضرر رائے پر وہ فلیٹیز کی طرف چلنے پر راضی ہو گئے۔ بابا جی بھٹو صاحب کے کمرے سے کچھ دور کھڑے ہو گئے۔ میں کمرے کے اندر چلا گیا۔ اُس وقت طالب علموں اور کچھ اخبار نویسوں نے بھٹو صاحب کو گھیر رکھا تھا۔ بھٹو صاحب اپنے بیڈ پر نیم دراز تھے۔ میں نے اُن کے کان میں کہا کہ میرے استاد ظہیر کاشمیری آپ کے ساتھ کوئی خاص بات کرنے کے لئے باہر تشریف لائے ہیں۔ آپ اگر اُن سے ملنا مناسب خیال کریں تو میں اُن کو اندر لے آتا ہوں۔

بھٹو صاحب کمرے میں موجود بے معنی قسم کے رش سے جیسے اُکتائے ہوئے تھے، فوراً اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے۔ دیکھو دوستو! ظہیر کاشمیری صاحب مجھے ملنے تشریف لائے ہیں۔ آپ اگر مہربانی فرما دیں تو میں اُن کے ساتھ ملاقات کر لوں۔ کمرے میں موجود تمام لوگ بھٹو صاحب کے

www.bhutto.org

ساتھ ہاتھ ملا کر باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ میں تیزی کے ساتھ بابا جی کے پاس پہنچا۔ اُنہیں بتایا کہ بھٹو صاحب نے آپ کی آمد کا خود اعلان کر دیا ہے۔ اس طرح میں بابا جی کو کمرے کے اندر بھٹو صاحب کے پاس لے کر آ گیا۔ بھٹو صاحب نے بڑی گرم جوشی سے بابا جی کا استقبال کیا اور کہا کہ لاڑکانے کے مشاعرے کے بعد آپ کے ساتھ آج ایک مدت کے بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے ایک شعر پڑھ دیا تھا کہ آسمانوں پر خدا وغیرہ کچھ نہیں ہوتا، بڑا شور مچ گیا تھا۔

میں وہ شعر قارئین کی اطلاع کے لئے تحریر کرتا ہوں۔ شعر یوں تھا۔

آسمانوں سے اُترتی ہے نبوت نہ کتاب
آسمانوں پہ اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

اس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب نے شیخ صفدر علی صاحب کو کہا کہ ظہیر صاحب کے لئے کچھ منگوایا جائے۔ اُنہوں نے یہاں آ کر مجھے بہت خوشی دی ہے۔ مجھے بھٹو صاحب کا انگریزی کا فقرہ ہمیشہ یاد رہا ہے جو ظہیر صاحب کے لئے اُنہوں نے کہا تھا۔ ''مسٹر ظہیر! یو۔ آر۔ فریش بریز فارمی''۔ ظہیر صاحب آپ میرے لئے تازہ ہوا ہیں۔ ملاقات کے بعد بابا جی نے کہا کہ یہ جملہ کسی طرح بھی عام سطح کا انسان نہیں کہہ سکتا۔ یہ شخص ایک ایکسٹرا آرڈنری انسان ہے۔

بھٹو صاحب کا اور بابا جی کی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بھٹو صاحب نے کہا۔ آپ آج کے سناریوں کو کس انداز سے دیکھتے ہیں۔ بابا جی نے کہا کہ ایوب خان کے اقتدار کا اب اینڈ ہو چکا ہے۔ اُس کا اقتدار اب اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والا ہے۔ اب اِس سے آگے اُس کا زوال ہی زوال ہے۔ آپ کا سیاست میں آنے کا فیصلہ بر وقت ہے۔ ڈکٹیٹر ہمیشہ اپنی سیاسی مخالفت کو ذاتی دشمنی بناتے ہیں۔ ایوب خان یوں تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ آپ پر کچھ مقدمے وغیرہ بنا دے یا آپ کو اریسٹ (گرفتار) کر لے گا مگر یہ تمام باتیں اب عارضی ہوں گی۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ جلد از جلد اپنا سیاسی تشخص بھرپور انداز میں قوم کے سامنے لائیں۔ اِس میں ڈھیل نہیں ہونی چاہیے۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ آپ میرے لئے کیا تجویز کرتے ہیں۔ بابا جی نے کہا کہ آپ اپنی ایک نئی پروگریسو ترقی پسند انقلابی پارٹی بنائیں۔ ایک مکمل سوشلسٹ پارٹی بنائیں اور اپنے منشور کو لوگوں پر واضح کر دیں۔ اپنی ذات کے گرد سیاسی نظریات کی ڈھال کھڑی کریں۔ لوگوں کی قوت کو آگے لائیں۔ یہ حکومت آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گی۔

www.bhutto.org

بھٹو صاحب نے کہا کہ سیاسی پارٹی اتنی جلدی تو نہیں بنائی جا سکتی۔ سیاسی پارٹی بنانے کے لئے لندن میں میرے کچھ دوستوں کے ساتھ مشورے جاری ہیں۔ اس میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔ میرا اپنا بھی یہی خیال ہے کہ ایک نئی پارٹی بنانا چاہیے۔ مگر ظہیر صاحب کچھ لوگ موجودہ پارٹیوں میں شامل ہونے کا بھی مشورہ دے رہے ہیں۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

میں نے پہلی بار یہ بابا ظہیر کے منہ سے سنا۔ انہوں نے کہا کہ بھٹو صاحب! جس طرح انسانوں کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اسی طرح جماعتوں اور نظریوں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ ایک وقت آ جاتا ہے کہ سیاسی پارٹیوں یا مذہبی تنظیموں کے سیاسی نظریات ماند پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی نشو ونما کی قوت کھو جاتے ہیں۔ اُن کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے، وہ کر چکے ہوتے ہیں۔ مزید اُن میں کچھ اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

اُنہوں نے کہا کہ مثال کے طور پر پاکستان کی خالق پارٹی جس کا دعویٰ ہے کہ پاکستان اُس نے بنایا تھا تو گویا اُس کا گول صرف پاکستان بنانا تھا۔ وہ بن گیا۔ اس کے آگے اِس پارٹی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اب وہ صرف اپنے دعویٰ پر زندگی گذار رہی ہے۔ اُس کے تمام لیڈر آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بھی اِس قابل نہیں جو قوم کی قیادت کر سکے۔ اس کے علاوہ یہ جماعت کئی حصوں میں بٹ چکی ہے۔ یہاں تک کہ ایوب خان کی فوجی پارٹی کا نام بھی کنونشن مسلم لیگ ہے۔ اِس جماعت کی شکل ایک بوڑھی داشتہ کی سی ہو گئی ہے۔ اب اِس بوڑھی داشتہ میں لوگوں کی کچھ کشش باقی نہیں رہ گئی۔ مسلم لیگ کے جس دھڑے پر دولتانہ صاحب اور دوسرے جاگیرداروں کا قبضہ ہے۔ وہ تمام اندر سے فوجی حکومت کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ آپ اقتدار میں رہے ہیں، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ یہ ڈرائنگ روم کے بوڑھے ڈرپوک مسلم لیگی رہنما آپ کو کبھی لیڈر نہیں بننے دیں گے۔ آپ کے ساتھ دھوکہ کریں گے۔ اس کے بعد بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں رہ جاتی ہیں۔ اُن پر کئی ایک الزام عائد ہو چکے ہیں۔ کسی پر پاکستان دشمنی کا الزام ہے تو کسی پر روس کے ایجنٹ ہونے کا الزام ہے۔ آپ کو خوامخواہ اِس طرح کی دلدل میں پاؤں نہیں رکھنا چاہیے۔ میرا تو آپ کو دیانت دارانہ مشورہ یہی ہوگا کہ آپ اپنی نئی پارٹی اور نئی پہچان کے ساتھ میدان میں آئیں۔ اِس طرح کی اور بہت سی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ بھٹو صاحب ظہیر صاحب کی ملاقات سے بہت خوش ہوئے اور یہ ملاقات اچھے انداز میں ختم ہوئی۔

www.bhutto.org

آغا شورش کی آمد

بابا ظہیر کاشمیری کی بھٹو صاحب کے ساتھ بات چیت اختتام کو پہنچ چکی تھی کہ آغا شورش کاشمیری ہوٹل کے کمرے میں آ گیا۔ شورش نے آتے ہی شور کرنا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب کس بلا کے ساتھ آپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس سے دور رہیں۔ یہ آپ کو بھی کافر بنا دے گا۔ بھٹو صاحب نے مسکرا کر کہا۔ آغا صاحب میں ان کے کفر سے کچھ سیکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے انگریزی میں کہا۔ ''He is a brain of my country'' یہ میرے ملک کے دماغ ہیں۔

بابا ظہیر کاشمیری کی باتوں کی روشنی میں آج اگر میں پاکستان پیپلز پارٹی کے بارے میں سوچتا ہوں جیسا کہ اُنہوں نے کہا تھا کہ ہر سیاسی جماعت کی ایک عمر ہوتی ہے۔ شاید پاکستان پیپلز پارٹی اس عمر کو پہنچ چکی ہے۔ اب یہ ہماری پارٹی ایک طرح کے انحطاط کا شکار ہو چکی ہے۔ اس پارٹی کے مقاصد میں کسی نئی سوچ کا اضافہ نہیں ہو رہا۔ ہم آج بھی پارٹی کے اُن بنیادی نعروں کا سہارا لئے ہوئے ہیں جن نعروں کی تشکیل 1968ء میں ہوئی تھی یا جو نعرے یا سلوگن پارٹی کے قیام کے وقت عوام کو دیئے گئے تھے۔ اِس کے علاوہ کئی ایک وجوہات کی بناء پر پارٹی کی قیادت بھی عوام سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ خیر اس موضوع پر کتاب کے اصل مقام پر جا کر تفصیل سے بات کی جائے گی۔

نوید ملک بھٹو صاحب کا بریف کیس لے کر غائب ہو گیا

دوسرے دن میں اپنی روٹین کے مطابق ہوٹل گیا تو مجھ سے پہلے وہاں پر شیخ صفدر علی، ملک نوید، شیخ سرور اقبال صاحب بھٹو صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ مسئلہ زیر بحث راولپنڈی جانے کا تھا۔ محترم میر خورشید حسن مرحوم نے بھٹو صاحب کو راولپنڈی آنے کیلئے پیغام بھیجا تھا۔ لہٰذا یہ طے یوں پایا کہ ہم لوگ شام کو راولپنڈی چلے جائیں گے اور بھٹو صاحب دوسرے دن صبح راولپنڈی بائی ائیر آئیں گے۔ ہم لوگ اُن کا ہوائی اڈے پر استقبال کریں گے۔ اِس کے بعد ہم بھٹو صاحب کے ساتھ ہوٹل فلش میں آ جائیں گے۔

لہٰذا میں اور شیخ سرور اقبال، شیخ صفدر صاحب کی گاڑی میں راولپنڈی روانہ ہو گئے۔ شیخ سرور اقبال تمام راستے حسب معمول پیروں فقیروں کی باتیں کرتے رہے۔ جہاں اور جس جگہ بھی

کوئی راستے میں مست ملنگ دکھائی دیتا۔ اُس کو گاڑی میں بیٹھے بیٹھے سلام کر دیتے تھے۔ میں نے کہا کہ شیخ صاحب! اُن کو تو پتہ ہی نہیں چل رہا کہ آپ اُن کو سلام کر رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ اگر تم لوگ میرے سلام کا عملی مظاہرہ دیکھنا چاہتے ہو تو آگے کسی اڈے پر گاڑی کھڑی کر دیں۔ آپ کی تسلی ہو جائے گی۔ شیخ صفدر علی مرحوم بے حد زندہ دل انسان تھے۔ کہنے لگا۔ شیخ صاحب جہلم چائے وغیرہ پی جائے گی اور اِس کے ساتھ ہی آپ کے شعبہ فقرا کی کرامت بھی دیکھ لیں گے۔ جہلم جا کر گاڑی روک دی گئی۔ ہم لوگ ایک ہوٹل کے اندر بیٹھ گئے۔ چائے پینا شروع کی کہ ایک ننگ دھڑنگ مست ملنگ لڈیاں ڈالتا ہوا ہوٹل کے باہر آ کھڑا ہوا۔ شیخ صاحب تو گویا بازی جیت گئے۔ وہ اپنی کھلی کھلی آنکھوں کے ساتھ مجھے اور شیخ صفدر کو دیکھتے جاتے اور ساتھ ہی منہ میں کچھ پڑھتے جاتے۔ ملنگ کے ہاتھ میں سرخ ڈنڈا تھا۔ شیخ سرور صاحب نے ہم کو کہا کہ اب اُس کی اور اس ملنگ کی آپس میں باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک دم شیخ صاحب ہوٹل سے باہر گئے اور جا کر ملنگ کو با قاعدہ فوجی انداز میں سیلوٹ مار کر سلامی پیش کی۔ وہ ملنگ نیم پاگل تھا۔ وہ ڈر گیا۔ وہ شیخ کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گیا۔ پہلا ڈنڈا شیخ صاحب کے ایک ہاتھ پر پڑا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا۔ اس طرح اُس پاگل فقیر نے شیخ صاحب پر ڈنڈوں کی بارش کر دی۔ ہم نے اُٹھ کر شور کرنا شروع کر دیا۔ بچاؤ بچاؤ کہنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل کے ساتھ ملنگ کا ڈنڈا چھین لیا۔ شیخ صاحب کو ہم نے گاڑی میں بٹھایا اور وہاں سے آگے چلنے شروع ہو گئے۔ صورتحال اِس قدر مضحکہ خیز تھی اور ساتھ ساتھ افسوس ناک بھی تھی کہ ہم لوگ پہلے کچھ لمحے تو بالکل خاموش رہے۔ اِس کے بعد شیخ صفدر علی بڑے زور سے قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ اُن کے ساتھ اِس ہنسی میں، میں بھی شریک ہو گیا۔ مگر شیخ سرور اقبال بے حد سنجیدہ رہا اور کہنے لگا۔ غلطی کی سزا ملنا ضروری ہوتی ہے۔ ہم ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ شیخ صاحب یہی کہے جا رہے تھے۔ میری توبہ، میری توبہ۔ ہم نے کہا۔ شیخ صاحب یہ توبہ توبہ کس بات کی ہے۔ کہنے لگے۔ راز فاش کرنے کی۔ ہم نے کہا۔ کونسا راز۔ کہنے لگے کہ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ راستے میں جس طرف سے بھی گذروں گا، درویش پہرہ دے رہے ہوں گے۔ بس یہ راز تھا جو مجھے بتانا نہیں چاہیے تھا۔ جس کی مجھے سزا دی گئی ہے۔ ہم نے کہا۔ شیخ صاحب! آئندہ ہم کبھی آپ کو اِس قسم کا مظاہرہ کرنے کا نہیں کہیں گے۔ مگر آپ بھی آئندہ کسی دیوانے فقیر کو سیلوٹ نہیں کریں گے۔ اِس طرح ہمارا شیخ صاحب کے ساتھ معاہدہ ہو گیا۔ اِس کے بعد شیخ

www.bhutto.org

صاحب کے ساتھ فقیروں پر ہم نے کبھی بات نہیں کی۔ شیخ صاحب اکثر خود ہی کوئی بات شروع کرتے تو ہم اُن کو کہتے کہ شیخ صاحب! آپ پھر راز فاش کر رہے ہیں۔ شیخ صاحب بہت بھولا آدمی تھا۔ فوراً توبہ توبہ کر کے خاموش ہو جاتا۔

اِس طریقے سے ہم شیخ سرور اقبال کی باتوں پر ہنستے کھیلتے راولپنڈی پہنچ گئے۔ راولپنڈی سے ہم سیدھے خورشید حسن میر صاحب کے گھر گئے۔ وہ درمیانے قد کے بڑے حلیم قسم کے انسان تھے۔ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اُنہوں نے ہمیں بتایا کہ اُنہوں نے بھٹو صاحب کے لئے راولپنڈی کے وکلاء کی طرف سے استقبالیہ دعوت کا بندوبست کیا ہے۔ کل تین بجے کا وقت مقرر ہو چکا ہے۔ صبح مقامی لوگ خورشید حسن میر کی قیادت میں بھٹو صاحب کا ہوائی اڈے پر استقبال کریں گے۔ آپ بھی صبح ہوائی اڈے پر آ جائیں۔ اِس طرح ہم نے رات ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ صبح ہم ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ بھٹو صاحب تشریف لے آئے۔ لوگوں نے اُن کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ بھٹو صاحب جب ہوائی اڈے کے لاؤنج کی طرف آ رہے تھے تو نوید ملک بھاگ کر آگے چلا گیا اور آگے جا کر بھٹو صاحب کا بریف کیس احترام کے انداز میں اُن سے لے لیا۔ بھٹو صاحب تو لوگوں کے رش میں گھر گئے۔ نوید ملک وہاں سے غائب ہو گیا۔ بھٹو صاحب ہوائی اڈے سے فلش مین ہوٹل آ گئے۔ ہم بھی اُن کے پیچھے ہوٹل پہنچ گئے۔

بھٹو صاحب نے بریف کیس کے بارے میں پوچھا۔ ہم نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ بھٹو صاحب کہنے لگے۔ وہ نوید ملک میرے ہاتھ سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ ہم نے کہا کہ اتنا تو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ بھٹو صاحب کہنے لگے اور تو اِس میں کچھ خاص کاغذات نہیں تھے البتہ کل میر صاحب کے وکلاء میں مجھے تقریر کرنی ہے، اُس کے نوٹس اُس میں تھے۔ پھر بھٹو صاحب خود ہی کہنے لگے۔ چھوڑیں اس قصے کو۔ اس کے بعد بھٹو صاحب کو میر خورشید حسن صاحب ہوٹل کے کمرے میں ساتھ لے گئے۔

بھٹو صاحب کافی دیر تک میر خورشید حسن کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ بھٹو صاحب کی طرف سے ہم لوگ ہی کمرے میں آئے ہوئے مہمانوں کی میزبانی کرنے لگ گئے۔ ہم نے تمام لوگوں کو چائے پلائی۔ اِن لوگوں میں سے ایک نوجوان سا آدمی سفید پتلون اور نیلی بوشرٹ پہنے بیٹھا تھا۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ میں بھٹو صاحب کو پشاور بلانا چاہتا ہوں۔ یہ شخص حیات محمد خان

شیر پاؤ تھا۔وہ شخص شخصیت کے لحاظ سے کچھ زیادہ متاثر کن آدمی نہیں تھا۔ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ بہت سادہ سے کپڑوں میں تھا مگر ایک معقول آدمی دکھائی دیتا تھا۔اس طرح حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ ہماری دوستی کا آغاز ہوگیا۔ہم بھی حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ اِس طرح باتیں کر رہے تھے کہ نوید ملک بریف کیس لے کر آ گیا۔اُس نے بڑی بیزار قسم کی شکل بنا رکھی تھی۔ کہنے لگا کہ میری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا جس میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ایک آدمی بہت شدید زخمی ہوگیا۔اُس کو ہسپتال چھوڑنا پڑا جس کی وجہ سے آنے میں دیر ہوگئی۔شیخ صفدر علی وہ بریف کیس لے کر بھٹو صاحب کے پاس چلے گئے۔بھٹو صاحب میر خورشید حسن کے ساتھ باہر لوگوں میں تشریف لائے۔ حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ اُن کی ملاقات کرائی گئی۔اُنہوں نے حیات محمد خان شیر پاؤ کو شام کو ملنے کا وقت دے دیا۔نوید ملک کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔تمہارا کام مکمل ہوگیا۔ نوید ملک کے پسینے چھوٹ گئے۔وہ جواب میں کچھ بھی نہ کہہ پایا۔اِس طرح نوید ملک پر سے بھٹو صاحب کا بہت ہی ابتدائی ایام میں ہی اعتماد اُٹھ گیا تھا۔

خورشید حسن میر کا راولپنڈی کا پہلا استقبالیہ

دوپہر کے بعد ہم لوگ بھٹو صاحب کے ساتھ میر خورشید حسن کے فنکشن میں پہنچ گئے۔ خورشید حسن میر صاحب کا یہ استقبالیہ شہریوں اور وکیلوں کا ملا جلا استقبالیہ تھا اور راولپنڈی میں یہ بھٹو صاحب کا پاکستان کی سیاست میں آمد کے بعد پہلا سیاسی فنکشن یا استقبالیہ تھا۔اُس وقت راولپنڈی شہر کا علاقہ بھٹو صاحب کیلئے انتہائی حساس علاقہ تھا۔ایوب خان کی بھٹو دشمنی پاکستان کی سیاست کے اُفق پر بے حد نمایاں تھی۔تاشقند کا معاہدہ لوگوں کے دلوں پر غبار بن کر اُتر رہا تھا۔ ایسے عالم میں بھٹو صاحب نے جس طرح اپنی تقریر کا راستہ نکالا،وہ اُن کی وزڈم کا کمال تھا۔ اُنہوں نے صرف تاشقند کا نام ہی نہیں لیا،باقی تمام کچھ وہی تھا جس کی پاداش میں تاشقند جیسے معاہدہ کی پاکستان کو خفت اُٹھانا پڑی تھی۔

تلاوت کلام پاک کے بعد میری نظم ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' پڑھی گئی جو ایوب خان کی کتاب پر لکھی گئی تھی۔اِسکے بعد خورشید میر صاحب نے اور دو تین ممتاز مقامی لوگوں نے خطاب کیا۔آخر میں بھٹو صاحب نے خطاب کیا۔اِس تقریر میں بھٹو صاحب نے پاکستان کی

www.bhutto.org

اقتصادی صورتحال اور حالات پر بہت تفصیل سے بات کی اور کہا کہ پاکستان کی تمام دولت صرف 20 خاندانوں کی تجوریوں میں جمع ہو چکی ہے۔ یہ 20 یا 22 گھرانے ہی پاکستان کی صنعت کے مالک ہیں۔ یہ 22 گھرانے ہی پاکستان کے بینکوں کے مالک ہیں۔ تمام انشورنس کمپنیوں کے مالک ہیں۔ پاکستان کے تمام صنعت کار اور سرمایہ دار ورلڈ بینک اور آئی۔ایم۔ایف کے ساتھ مشترکہ حصے دار ہیں۔ پاکستان کی تمام صنعت بیرونی قوتوں کے مفادات کی پیداوار ہے۔ اِس کا قوم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو چیز باہر کی قوتوں کو درکار ہوتی ہے، وہی چیز فوجی ضروریات کو درکار ہے۔ قوم کے لئے ان صنعتوں میں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ پاکستان کے تمام قرضے غیر ضروری پیداواری قرضے ہیں۔ یہ فوجی قرضے ہیں۔ یہ دفاعی قرضے ہیں۔ اِن قرضوں کو صرف فوجی ضروریات پر استعمال کیا جاتا ہے یا حکمران اِن قرضوں سے اپنی تجوریاں بھر چکے ہیں۔ اِن قرضوں کو قوم پر خرچ نہیں کیا جاتا۔ قومی پیداوار کیلئے استعمال میں نہیں لایا جاتا اور یہ تمام سازش عالمی امپیریلزم کی سازش ہے، سامراج کی سازش ہے اور یہ سازش تمام تیسری دنیا کے غریب ممالک کے خلاف کی گئی ہے۔ ہم غریبوں کے خلاف کی گئی ہے۔ ہمارے ملک کے غریب عوام کے خلاف کی گئی ہے۔

آج میں پاکستان میں پہلا انسان ہوں جو سامراج کی اِس سازش کو بے نقاب کر رہا ہوں۔ لیکن اِس میں سب سے بڑی غلطی ہمارے حکمرانوں کی ہے۔ ہمارے حکمران غیر پیداواری قرضے کیوں حاصل کرتے ہیں۔ اگر پاکستان میں جمہوریت ہوتی، پارلیمنٹ ہوتی، تو پاکستان کے عوام کے نمائندے اِن قرضوں کو چیلنج کرتے۔ حکومت کو غیر پیداواری قرضوں کے نظام سے باز کرتے۔ مگر ہمارے ہاں ''ون مین شو'' ہے۔ آمریت ہے۔ فوجی راج ہے۔ عوام بے اختیار ہیں۔ عوام کو تشدد کے ساتھ دبا دیا گیا ہے اور عالمی قوتوں کی یہی سازش ہے کہ اُن کے مفادات کے راستے میں کوئی قوت حائل نہ ہو پائے۔ اُن کو آمرانہ نظام اور اقتدار کی ضرورت ہے۔ سامراج کو ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے۔ اگر پاکستان میں جمہوریت کی حکومت ہوتی تو امریکہ کو سوویت روس کے خلاف پاکستان میں فوجی اڈے نہیں دیئے جاسکتے تھے۔ پاکستان کو امریکہ کی کالونی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ سامراج اپنے مفادات کو پورا کرنے کیلئے غیر قانونی حکمرانوں کو ہر طرح سے مضبوط کرتا ہے۔ اُن کو ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس کرتا ہے۔ اُن کو بے حد عیش ونشاط کے سامان قرضوں کی صورت میں مہیا کرتا ہے۔ یہ قرضے ڈکٹیٹروں، فوجی جرنیلوں، بیوروکریٹوں کے لئے مافیا کا کام

www.bhutto.org

کرتے ہیں۔ یہ نشے کے ٹیکے کا کام کرتے ہیں۔ یہ تمام قوتیں نشے میں دھت ہو جاتی ہیں۔ اُن کو نہ ملک کی ہوش رہتی ہے نہ قوم کی ہوش رہتی ہے۔ اُن کو اِس حالت میں مبتلا کر کے وہ اُن سے ایسے ایسے کام نکالتے ہیں جو ملکوں اور قوموں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ میں اُن کا رازدان ہوں۔ میں بھی اِس نشے میں کچھ دیر مبتلا رہا ہوں۔ مجھے بھی سامراج نے اپنے اِس زہر کا عادی بنا لینا چاہا تھا مگر میرا ضمیر زندہ تھا۔ میں اُن کے حلقہ اثر فیہ سے باہر آ گیا ہوں۔ میں ایک انسان ہوں، فرشتہ نہیں ہوں۔ میں اگر اُن کے حلقہ اثر میں نہ گیا ہوتا تو میں اُن کے بھیانک کھیل سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ قدرت نے میری تعلیم کرنی تھی۔ مجھے تیار کرنا تھا۔ میری تکمیل کرنی تھی۔ مجھے اُن کا واقف بنانا تھا۔ اُن کی سازشوں سے واقف کرنا تھا۔ قوم کی بربادی سے واقف کرنا تھا۔ مجھے مشرق اور مغرب کو سمجھنے کا موقع دینا تھا۔ مجھے دوست اور دشمن میں تمیز کرنے کا موقع دینا تھا۔ سرمایہ داروں کو اور سرمایہ داری نظام کو قریب سے دیکھنے کا موقع دینا تھا۔ آمریت کو اور آمروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع دینا تھا اور جب میری تعلیم مکمل ہو گئی تو قدرت نے میرے اندر وہ قوت پیدا کر دی کہ میں نے اس نظام کو چیلنج کر دیا ہے۔ میرا موجودہ حکومت کے ساتھ اختلاف نہیں ہوا۔ میں نے موجودہ حکومت کے نظام کو چیلنج کیا ہے، مسترد کر دیا ہے۔

دوستو! میری بات غور سے سنو۔ میرا اگر ایوب خان کے ساتھ کوئی سیاسی اختلاف ہوتا یا ذاتی اختلاف ہوتا تو اختلاف ختم ہو سکتا تھا۔ اختلاف ختم کیا جا سکتا تھا۔ اختلاف صرف کچھ لینے اور دینے پر پیدا ہوتا ہے۔ کسی کو کم پر اعتراض ہوتا ہے اور کسی کو زیادہ پر اختلاف اور اعتراض ہوتا ہے۔ اگر میرا وزارت پر اختلاف ہوتا تو حکومت مجھے خارجہ وزارت کے بدلے داخلہ وزارت دے سکتی تھی۔ اگر میرا اختلاف کسی بڑی وزارت کو حاصل کرنے کا ہوتا تو حکومت مجھے اختلاف ختم کرنے کے لئے کوئی بڑی وزارت دے سکتی تھی یا اگر میرا اختلاف صرف حکومت میں رہنے کا ہوتا تو کوئی بھی وزارت حاصل کی جا سکتی تھی۔

مگر میرا اختلاف اِن میں سے کسی بھی ایک قسم کا نہیں ہوا۔ میرا حکومت کے ساتھ اختلاف اِس طرح کا ہو ہی نہیں سکا۔ میرا اختلاف تو یہ ہوا کہ میں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ حکومت میں شامل نہیں رہ سکتا۔ میں آپ کی وزارت کو قبول نہیں کر سکتا۔ آپ لوگوں کو میرا موقف سمجھنا ہوگا۔ اب میں تھوڑی سی فلسفے کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اِس حکومت کے ساتھ اختلاف نہیں کیا۔

www.bhutto.org

میں نے ایک فیصلہ کیا ہے فیصلہ۔ اب آپ کو مجھے اختلاف اور فیصلے کا فرق بتانا ہوگا۔ میں نے اختلاف نہیں کیا۔ اگر کوئی چھوٹی موٹی خرابی ہوتی تو میرا اختلاف اِس کو دور کرنے سے ختم ہو جاتا۔ حکومت کے ساتھ میرا چلنا ناممکن ہو گیا تھا۔

مجھے ایک فیصلہ کرنا تھا۔ مجھے قدرت نے اتنی طاقت بخش دی کہ میں کوئی فیصلہ کر سکتا۔ میں کمزور انسان ہوں۔ مجھے قدرت نے قوت دی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں حکومت میں رہنے کی بجائے قوم کے ساتھ چلوں گا۔ یہ میرا اختلاف نہیں تھا، یہ میرا فیصلہ تھا۔ مجھے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ مجھے جو اچھا لگا، میں نے اپنا فیصلہ اُس کے حق میں کر دیا۔ یہ میرے ایمان کا فیصلہ تھا۔ مجھے آپ لوگوں میں آنا تھا۔ میں آپ لوگوں میں آج موجود ہوں۔ مجھے قوم میں آنا تھا۔ میں آج قوم کے ساتھ موجود ہوں۔ کوئی انسان دو راستوں پر نہیں چل سکتا۔ ایک ہی راستے پر چلنا ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ حضرات میں راہِ راست پر آ گیا ہوں۔ بھٹو صاحب نے اپنے اِس انتہائی معنی خیز فقرے کے ساتھ اپنی تقریر ختم کر دی۔ اُن کے اِس فقرے پر لوگوں نے تقریباً 5 منٹ کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ لوگ تالیاں بجانا بند ہی نہیں کرتے تھے۔ لوگوں میں اِس قدر جوش تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ کیا نوجوان اور کیا بڑی عمر کے لوگ، اُن کا ایک ہی ردِعمل تھا۔ میں ابتداء میں لوگوں کے ردِعمل پر غور کیا کرتا تھا۔ میں خدا کی قسم اِس بات کی ٹوہ لگایا کرتا تھا کہ وہ کونسی ایسی غیبی قوت ہے جو ذوالفقار علی بھٹو کی ذات میں مخفی ہے کہ جب لوگ اُن کو دیکھتے ہیں اور بھٹو لوگوں کو دیکھتا ہے تو دونوں طرف ایک ہی منظر ہوتا ہے۔ لوگ دیوانے ہو جاتے ہیں اور بھٹو صاحب کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک آ جاتی تھی۔ اُن کا چہرہ کھِل اُٹھتا تھا۔ اُن کے نفیس قسم کے ہاتھ تالی کیلئے بلند ہو جاتے تھے۔ وہ تالی سے لوگوں کو عزت اور احترام عطا کرتے تھے اور یہ تالی کافی وقت تک وہ بجاتے رہتے تھے۔ گویا وہ جلسہ گاہ کے ہر انسان کی آمد کو خوش آمدید کہتے تھے اور جب اُن کا یہ پیغام ہر انسان تک پہنچ جاتا تو تب وہ تالی بجانا چھوڑتے تھے۔ اِسی طرح عوام اُن کو اپنے ثقافتی ردھم، روایتی محبت کے ڈانس سے اُن کو اُنکی آمد پر اپنا خلوص پیش کیا کرتے تھے۔ وہ پنجاب میں جب جلسہ گاہ جاتے تھے تو لوگ اُن کو لڈی اور بھنگڑے کی شکل میں اپنا خلوص پیش کرتے۔ وہ سندھ جاتے تو لوگ جمالو کی دھمال سے اُن کو خوش کرتے۔ وہ سرحد اور بلوچستان جاتے تو لوگ خٹک ڈانس اور بلوچی ڈانس کے ساتھ اُن کا سواگت کرتے۔ عمل

www.bhutto.org

دونوں طرف ایک ہی انداز کا ہوتا تھا، انگریزی کے لفظ سپان ٹینس (Spontanius) ہوتا تھا۔ یعنی یہ عمل سپان ٹینس ہوتا تھا۔ کوئی ایک نہ نظر آنے والا کنکشن تھا جو بھٹو صاحب اور عوام کے درمیان قائم ہو جاتا تھا۔

حیات محمد خان شیر پاؤ

شام کو ہوٹل میں حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ صوبہ سرحد کے بارے میں بڑی تفصیل سے بات ہوئی۔ بھٹو صاحب کی ابھی شیر پاؤں سے بات چیت کا آغاز ہی ہوا تھا کہ حکومت کا ٹوڈی صحافی زیڈ۔اے۔سلہری جو اُن دنوں شاید پاکستان ٹائمز کا ایڈیٹر تھا، وہ وہاں آ گیا۔ زیڈ۔اے سلہری پاکستان میں امریکہ نواز صحافیوں میں ایک اہم صحافی تھا جو ایوب خان کا اپنے وقت کا میکاولی تھا۔ زیڈ۔اے۔سلہری الطاف گوہر کی طرح باہر سے خود کو بہت ترقی پسند ظاہر کیا کرتا تھا مگر اندر سے وہ بھی الطاف گوہر کی طرح جماعت اسلامی کا پکا رکن تھا۔ زیڈ۔اے۔سلہری بھی الطاف گوہر کی طرح بھٹو صاحب کی دوستی کا دعویٰ رکھتا تھا مگر اِن لوگوں کی دوستیوں کے بارے میں شاعر نے کہا تھا۔

ہوئے تم دوست جس کے
دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

بھٹو صاحب نے مجھے کہا کہ تم حیات محمد خان شیر پاؤ سے بات چیت جاری رکھو، میں سلہری صاحب سے بات کرلوں۔ سلہری ایک موٹا چٹا آدمی تھا۔ بھٹو صاحب نے پوچھا۔''سلہری صاحب کیا لوگے؟'' بیٹھتے ہی کہنے لگا کہ بیئر منگوالی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شخص پانی کی طرح بیئر پیتا تھا۔ میں چونکہ خود بھی اُس وقت حیات محمد خان شیر پاؤ کی طرح کا تازہ واردانِ سیاست تھا اور حیات محمد خان شیر پاؤ کا ہم عمر بھی تھا لہٰذا بہت کم وقت میں حیات خان کے ساتھ ایک طرح کی دوستی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ خورشید حسن صاحب والے استقبالیے میں وہ خود شریک تھا۔ میری نظم سے متاثر ہو چکا تھا۔ وہ شیخ صاحب یا شیخ سرور اقبال جو اُس وقت وہاں موجود تھے، اُن دونوں میں سے شاید مجھے زیادہ اہم خیال کرنے لگ گیا تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ آپ ایک طرف بیٹھ کر میری بات سُن لیں۔ اِس طرح ہم ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اُس نے

www.bhutto.org

پشاور کی سیاست پر بات کرنا شروع کردی۔اُس نے کہا کہ ایک تو وہاں ولی خان کی پارٹی اے۔این۔پی ہے۔اے۔این۔پی کے لیڈر خود کو مہاتما گاندھی کے پائے کے لیڈر قرار دیتے ہیں۔وہ بھٹو صاحب کی قیادت کو تسلیم نہیں کریں گے۔دوسرا لیڈر وہاں قیوم خان ہے جس کی سرحد کے عوام کے دلوں میں کوئی عزت نہیں۔وہ حکومت کا پٹھو ہے۔بھٹو صاحب کو نئی سیاسی جماعت بنانی چاہیے۔سرحد میں بھٹو صاحب کے ساتھ حیات محمد خان شیر پاؤ چلے گا۔میں بھٹو صاحب کو پشاور آنے کی دعوت آج ہی دینے آیا ہوں۔آج جب کے سرحد سے بھٹو صاحب کو ابھی اور کوئی ملنے نہیں آیا ہے، میں حیات خان کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ جیسے ہی بھٹو صاحب فارغ ہوئے۔ میں نے اُن کو حیات خان شیر پاؤ کی یاد دلائی۔اُنہوں نے حیات محمد خان کو اپنے پاس بلا کر اُن سے بات چیت شروع کردی۔اُنہوں نے شیخ صفدر علی کو کہا کہ وہ حیات محمد خان کا پتہ وغیرہ اور فون نمبرز محفوظ کرلیں۔حیات محمد خان کے ساتھ وعدہ کرلیا کہ پشاور جب بھی آؤں گا، پہلے تمہارے گھر ہی آؤں گا۔حیات محمد خان شیر پاؤ کی بات کو اس قدر اہمیت کے ساتھ میرا تحریر کرنا اِس لئے ضروری تھا کہ آپ لوگوں کو اِس بات کا اندازہ ہوسکے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کس طرح وجود میں آئی تھی۔جس وقت حیات محمد خان شیر پاؤ راولپنڈی میں بھٹو صاحب کے ساتھ ملنے آیا تھا، اُس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کا ابھی نام ونشان تک نہیں تھا۔

پاکستان کی سیاسی صورتحال اِس قدر اپنی نفرت کی انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ لوگ موجودہ حکومت اور موجودہ نظام کے خلاف اپنا سیاسی کردار ادا کرنے کیلئے ایک نئی قیادت کو خود تلاش کررہے تھے جو ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں اُن کی نظر میں تھی۔حیات محمد خان اُن لوگوں میں سے تھا۔میرے خیال میں صوبہ سرحد میں پاکستان پیپلز پارٹی اُس دن ہی قائم ہوگئی تھی جس دن حیات خان محمد شیر پاؤ راولپنڈی کے فلش مین ہوٹل میں بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات کرکے واپس گیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کوئی اشتہار دے کر نہیں بنائی گئی تھی۔اِس طرح حیات محمد خان شیر پاؤ کی طرح لوگ خود بخود چلے آرہے تھے اور بھٹو صاجب کے ساتھ اپنی دوستی اور وفا کا عہد باندھتے چلے جاتے تھے۔

جو بھٹو صاحب تک نہیں پہنچ پاتے تھے یا نہیں آسکتے تھے، وہ عوام کی شکل میں کروڑوں کی تعداد میں تھے، وہ غائبانہ طور پر بھٹو صاحب کے ساتھ عہد وفا باندھ کر خود کو بھٹو صاحب کی سیاست

www.bhutto.org

کیلئے وقف کر چکے تھے۔عوام کے یا لوگوں کے قول وقرار کوئی بھٹو صاحب کے ساتھ لکھت پڑھت کے ساتھ نہیں باندھے گئے تھے۔ یہ دلوں کے عہد تھے اور دلوں کے عہد سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دستاویز عظیم، مقدس اور سچی نہیں ہوا کرتی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان میں یہ ایک عاشقوں کا ہجوم تھا جو ذوالفقار علی بھٹو کے گرد جمع ہو گیا تھا جس کا نام بعد میں "پاکستان پیپلز پارٹی" رکھا گیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور عوام کے عشق میں حافظ شیرازی کے شکوے والی بات نہیں تھی جو اُنہوں نے برق طور سینا اور وادی ایمن کے تقاضوں اور شکووں کے بارے میں کہی تھی۔

برقِ سینا شکوہ سنج از بے زبانی ہائے شوق
ہیچ کس در وادی ایمن تقاضائی نہ داشت

حافظ کہتا ہے کہ برقِ سینا کو وہ طور کی تجلّی کو موسیٰ کے بعد لوگوں پر شکوہ سنج تھی کہ موسیٰ کے بعد اہلِ شوق کی زبانیں ہی گنگ ہو گئیں۔ وادیء ایمن میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا جو تجلّی دیکھنے کا تقاضا کرتا۔ مگر یہاں ایسا نہیں تھا۔ یہاں تو عاشقوں کے لشکر تھے جن کی زبان پر ذوالفقار علی بھٹو کو سیاست کے طور سینا پر جلوہ فگن ہونے کے نعرے اور تقاضے تھے۔ اس کے ثبوت کے لئے میری پہلی نظم کا یہ ایک بند ہی بہت کافی ہے۔

بول کچھ بول کے سب اس کے تمنائی ہیں
تیری آواز کے طالب تیرے سودائی ہیں
آنکھ بے چین ہے جلووں کو پرکھنے کیلئے
اب تماشا بھی ہے ممکن کہ تماشائی ہیں

راولپنڈی کے اِس استقبالیے کے بعد بھٹو صاحب کچھ وقت کے لئے لندن چلے گئے جہاں مسٹر جے۔اے۔رحیم کے ساتھ اور کچھ دوسرے انقلابی دانش وروں کے ساتھ باہمی مشوروں سے پاکستان پیپلز پارٹی بنانے کی تیاری کی گئی۔

مسٹر جے۔اے۔رحیم

یہی وہ سنہری وقت تھا جب بھٹو صاحب نے مسٹر جے۔اے۔رحیم کے ساتھ پاکستان پیپلز پارٹی کا کاغذی ڈھانچہ تیار کیا تھا اور پاکستان پیپلز پارٹی کا اُس وقت کے تمام قومی، سیاسی، معاشی

www.bhutto.org

اور ثقافتی تقاضوں کے مطابق منشور تخلیق کیا تھا۔

میری اِس بات کے ساتھ کسی طرح کا اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو عملی شکل میں تخلیق کرنے میں، وجود میں لانے میں اور اِس کا منشور بنانے میں جے۔اے۔رحیم کا نہ صرف کلیدی کردار تھا بلکہ ایک مثالی کردار تھا۔اِس لئے کہ بھٹو صاحب کو اتنی فرصت ہی نہیں مل سکتی تھی کہ وہ یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر یہ تمام کام تحریری طور پر سرانجام دے سکتے۔یہ کام محترم جے۔اے۔رحیم کی طرح کا دانشور ہی سرانجام دے سکتا تھا جس کے پاس وقت بھی تھا اور عزم و استقلال بھی تھا اور ایک مکمل سوشلسٹ دل و دماغ بھی تھا جس کے بارے میں بھٹو صاحب یوں لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک سکالر تھا اور ایک سیکولر ذہن کا مالک تھا۔وہ سوشل ازم اور ماڈرن ازم پر یقین رکھتا تھا۔جدیدیت کا حامل تھا۔وہ کسی کمزور عقیدے کا انسان نہیں تھا۔مہمل اور ڈھل مل یقین کی باتوں کے لئے اُس کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔جے۔اے۔رحیم سب سے پہلا وہ انسان تھا جس نے مجھے نئی پارٹی بنانے کا مشورہ دیا تھا یا جس کے ساتھ میں نے پارٹی بنانے کے لئے مشورہ کیا تھا۔حقیقت میں پاکستان پیپلز پارٹی کو ہم دونوں نے 1966ء میں ہی پیرس میں بنا لیا تھا۔پارٹی کی بنیادی دستاویز اُس کی ہی محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔''

اس طریقے سے جے۔اے۔رحیم کا شمار پارٹی کے بانیوں میں ہوتا ہے۔میں جے۔اے۔رحیم کے بارے میں اُس وقت تو قطعی طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔بعد میں اُس کے بارے میں بہت معلومات حاصل ہوئیں۔اُن کے ساتھ ملاقاتیں بھی ہوئیں۔بنیادی طور پر جے۔اے۔رحیم ایک بیوروکریٹ انسان تھے جن کی تمام زندگی پاکستان کی سفارت کاری میں گذری تھی۔وہ ایک عمر رسیدہ ریٹائرڈ آدمی تھے۔اُن کی زندگی کا زیادہ حصہ بطور ایمبیسڈر گزرا تھا اور وہ دنیا کے اہم ترین ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے تھے جن میں فرانس اور برطانیہ جیسے ممالک سرفہرست تھے۔اُن کی تمام زندگی انگریزوں کے ساتھ ملازمت میں گزری تھی۔جس کی وجہ سے وہ انگریزی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں بہت کم بات کیا کرتے تھے۔وہ اپنی جنم بھومی کے لحاظ سے بنگالی

www.bhutto.org

نژاد تھے۔ اُن کے والد انگریزوں کے زمانے میں ہائی کورٹ کا جج تھا۔ پیدائشی طور پر اچھی زندگی کے خُوگر تھے۔ باقاعدہ صاحب آدمی تھے۔ بے حد مردم بیزار انسان تھے۔ ذرا سا رش اپنے اردگرد برداشت نہیں کرتے تھے۔ اِس کے باوجود وہ ایک مارکسٹ فکر رکھتے تھے۔ وہ برطانوی انداز کے سوشلسٹ تھے۔ وہ لارڈ برٹرنڈرسل کو دنیا کا بہت بڑا فلسفی تصور کرتے تھے۔ واضح رہے کہ برٹرنڈرسل ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ بے حد محبت رکھتا تھا اور بھٹو صاحب کو اپنے عہد کا جینئس تصور کرتا تھا۔ وہ مارکسزم میں بڑا وسیع مطالعہ رکھتا تھا۔ ملک سے باہر اور ملک کے اندر اُن کی ملاقاتوں کا تمام سلسلہ انقلابی لوگوں کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ اُس شخص کا یقین تھا کہ ایک نئی سوشلسٹ سیاسی جماعت ہی پاکستان کے تمام مسائل کو حل کرسکتی ہے۔

اُن کا یہ نظریہ بے حد جدید اور قابل ستائش تھا۔ اُن کی نگاہ میں ذوالفقار علی بھٹو ہی ایک ایسا انسان تھا جو اُن کے معیار پر پورا اُتر سکتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ میں نے بھٹو کو اُس وقت پسند کرنا شروع کردیا تھا جب بھٹو نے ایوب خان کی حکومت کو سوویت روس کے ساتھ ٹریڈ کرنے کا مشورہ دیا تھا اور جب بھٹو نے چین کے ساتھ پاکستان کی دوستی کی بنیاد رکھی تھی۔ اِس کے علاوہ وہ بھٹو صاحب کی چین کے وزیر خارجہ چو۔این۔لائی، ماؤزے تنگ، انڈونیشیا کے فادر آف نیشن سوئیکارنو اور الجزائر کے فادر آف نیشن بن بیلا اور مصر کے صدر جمال عبدالناصر کی دوستی کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ بھٹو کو ایک مکمل جدید انسان تصور کرتے تھے۔ لندن میں جے۔اے۔رحیم کی ملاقاتیں دنیا بھر کے انقلابی جدوجہد کرنے والے لوگوں کے ساتھ رہا کرتی تھیں۔ نارتھ ویت نام کے آزادی پسند اور لندن کی لیبر پارٹی کے سوشلسٹ ہم خیال لوگوں کے ساتھ اُن کا زیادہ میل جول رہتا تھا۔ پاکستان کے لندن میں مقیم ترقی پسند بھی اُن کی حلقہ بحث و تمحیص میں شامل ہوتے تھے۔ اُن لوگوں کے ساتھ تبادلہ خیال کے بعد جے۔ایم۔رحیم اِس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ پاکستان کے تمام مسائل کا حل سوشلسٹ نظام معیشت میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ اِس معاملے میں ذوالفقار علی بھٹو اور جے۔اے۔رحیم کے خیال و فکر میں یکسانیت اور مماثلت تھی اور یہی ایک ذہنی اشتراک فکر و عمل ہی اِن دو نابغوں کی دوستی کا واحد جواز تھا۔ لہٰذا بھٹو صاحب کے لندن کے اِس دورے کے دوران پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور تیار کیا گیا۔ اِس منشور کے چار بنیادی اصول مرتب کئے گئے۔ (1) اسلام ہمارا دین ہے (2) جمہوریت ہماری سیاست ہے (3) سوشلزم ہماری معیشت

www.bhutto.org

ہے (4) طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان پیپلز پارٹی کا جھنڈا تجویز کیا گیا۔ جھنڈے کے تین رنگ تجویز کیئے گئے۔ پہلا رنگ سرخ رنگ تھا جو قربانی اور جدوجہد کی علامت تھا۔ دوسرا رنگ سیاہ تھا جو تاریکی کے خلاف جہاد تھا۔ جہالت کے خلاف، ظلم کے خلاف، ہر طرح کی ناانصافی اور عدم مساوات کے خلاف جنگ اور جہاد کا غماز تھا۔ تیسرا رنگ سبز تھا جو اہل پاکستان کیلئے ایک مقدس رنگ ہے، امن ومحبت کا رنگ ہے، کامیابی کا رنگ ہے۔ اس طریقے سے پارٹی کا یہ مجوزہ فلیگ پارٹی کی تمام پالیسی، تمام سیاست، تمام فکر ونظریات کا ایک مکمل ثبوت اور ایک مکمل دستاویز اور مکمل علامت تھا اور پاکستان پیپلز پارٹی کا جھنڈا اپنے تین رنگوں کی دلکشی کی ایک تصویر تھا۔ ان رنگوں کی تمثیل کی معنویت میں بے مثال تھا۔ جس طریقے سے پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کے محنت کش عوام کی زندگی کی ترجمان تھی۔ اسی طرح پاکستان پیپلز پارٹی کا جھنڈا بھی پاکستان کے عوام کے دل کی دھڑکن بن گیا تھا۔ یہ جھنڈا پارٹی کے منشور کے نظریات وفکر کی مکمل علامت تھا۔ [illegible] نظامِ فکر کے پیغام اور اعلان کا درجہ رکھتا تھا۔ جس کو محنت کشوں کے تمام طبقوں نے بے حد پسند کیا تھا۔ یہ جھنڈا اپنے عہد کی انقلابی جدوجہد کا عظیم شاہکار تھا۔ لہٰذا پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور اور اس کے جھنڈے کی تکمیل اور تشکیل کے لئے بھٹو صاحب کے بعد مسٹر جے۔ اے۔ رحیم ہی ایک ایسے انسان تھے جن کی ذات قابلِ احترام تھی۔ افسوس کہ جے۔ اے۔ رحیم اور بھٹو صاحب اپنے اپنے مزاج کے اعتبار سے زیادہ دیر تک ایک ساتھ نہ رہ سکے۔ جس کی علیحدگی کی کہانی اپنے مقام پر آگے آئے گی۔

گول باغ لاہور کا جلسہ عام

لندن سے بھٹو صاحب واپس آگئے۔ لندن کے اِس دورے میں وہ پاکستان پیپلز پارٹی کا تمام ناک نقشہ طے کر کے آئے تھے۔ یہاں تک کہ پارٹی کے نام کی باتیں بھی لوگوں تک پہنچ چکی تھیں مگر ابھی تک پارٹی کے نام کا مصدقہ طور پر کوئی اعلان نہیں ہوا تھا۔ بھٹو صاحب 19 جون 1967ء کو لاہور فلیٹی ہوٹل میں حسب معمول آکر لنگر انداز ہوئے۔ اِس مرتبہ لوگوں کی اُن کے پاس گہما گہمی بہت زیادہ تھی۔ اِس دفعہ کچھ اور نئے لوگ بھی دیکھنے میں آئے۔ اُن میں راجہ منور بھی تھا۔ اُن دنوں عرب اور اسرائیل کے درمیان جنگ بندی ہو چکی تھی۔ اسرائیل نے عربوں کی

www.bhutto.org

سرزمین پر فوجی جارحیت کے ساتھ قبضہ کرلیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اسرائیل کی جارحیت کا بے حد قلق تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُس وقت عربوں کی حمایت کا پاکستانی قوم کی طرف سے اعلان کرنا بے حد ضروری ہے۔ بھٹو صاحب محض اخباری بیان سے پاکستانی قوم کی حمایت کا اعلان ناکافی خیال کررہے تھے۔ اُن کے ذہن میں منصوبہ یہ تھا کہ کسی بھرے جلسے میں پاکستانی قوم کی طرف سے اسرائیل کی جارحیت کی مذمت کی جائے اور اسرائیل کو للکارا جائے اور عالم اسلام کی قوت سے اسرائیل کو ڈرایا جائے تاکہ وہ عربوں کے خلاف مزید کسی جنگی پیش قدمی سے باز رہے۔ اِس کے ساتھ ہی وہ جلسہ عام میں عربوں کیلئے پاکستان کے تعاون کا اعلان کر کے عربوں کی خصوصاً فلسطینی حریت پسندوں اور قوم پرستوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے تھے۔ خاص طور پر صدر جمال عبدالناصر کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتے تھے۔ ہر چند یہ تمام کام حکومت پاکستان کی جانب سے ہونا چاہیے تھا مگر جنرل محمد ایوب خان کی حکومت امریکہ اور اسرائیل کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا وہ اِس معاملے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھی۔ حکومت پاکستان کی یہ خاموشی عالم عرب کے لئے پاکستان اور پاکستانی قوم کی طرف سے مایوسی کا پیغام بنتی چلی جارہی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو واقعتاً ایک عالمی مدبر او[illegible] ساز سیاسی دانشور اور رہنما تھے۔ وہ عالمی سیاست پر بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ اُن کے سوچنے کا یہ انداز عالم عرب کیلئے کس قدر معنی خیز اور ناگزیر تھا۔ آج جب میں اِس بات پر غور کرتا ہوں تو مجھے بھٹو صاحب کی عظمت کے ساتھ ساتھ اُن کی فہم و فراست کی گہرائی کا احساس ہوتا ہے کہ وہ کس قسم کے سیاست دان تھے اور اُن کے خیالات کس قدر بلند تھے۔ وہ اگر عرب اسرائیل جنگ کے بارے میں کوئی جلسہ نہ بھی کرتے، گو اُن پر کوئی ایسی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی یا اُن کی ذات پر کوئی حرف نہیں آسکتا تھا مگر وہ بطل حریت اِس معاملے میں خاموش رہنا جرم خیال کرتا تھا۔ گناہ تصور کرتا تھا۔ اُنہوں نے لاہور میں جلسہ عام میں تقریر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ جلسہ کس طریقے کے ساتھ کیا جائے۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ کوئی تنظیم جلسے کا اعلان کرے اور بھٹو صاحب کو اِس جلسے سے خطاب کرنے کی دعوت دی جائے۔ اُس وقت کوئی دوسری تنظیم دستیاب تھی ہی نہیں، وہی مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن ہی موجود تھی۔ وہ جس حالت میں بھی تھی اور جس طرح کی بھی تھی، اُس کو کہا گیا کہ وہ جلسے کا اعلان کرے۔ اِس کے تمام اخراجات بھٹو صاحب نے خود برداشت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ البتہ راجہ منور احمد صاحب نے

www.bhutto.org

رضا کارانہ طور پر یہ اعلان کیا کہ جلسے کی پبلسٹی یا اعلانات کے لئے دو کرائے کی ٹیکسی، گاڑیوں کے اخراجات اور جلسے کے لاؤڈ اسپیکر کے اخراجات وہ خود ادا کریں گے۔ باقی تمام اخراجات بھٹو صاحب کو خود ادا کرنے تھے۔ 19 جون کی شام کو جلسے کا اعلان کر دیا گیا اور اخبار میں جلسے کی خبر دے دی گئی۔ 20 جون کی صبح کو جلسے کی خبر لاہور کے ہر شہری تک پہنچ چکی تھی۔ جس طرف بھی گیا، وہاں بھٹو صاحب کے جلسے کی لوگوں باتیں کر رہے تھے۔

جلسے کے اعلانات کے لئے ایک گاڑی طالب علموں کو دے دی گئی۔ دوسری گاڑی پر ہر روز میں اور شیخ سرور اقبال اور ادریس کھٹانہ جلسے کا اعلان کرنے کیلئے شہر میں چکر لگانے لگ گئے۔ ہم جب جلسے کا اعلان کرتے اور بھٹو صاحب کا نام لیتے تو لوگوں کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھتے۔ نوجوان گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ میں اعلان کے دوران اپنی نظم ''مسجد اقصیٰ'' جو اسرائیل کی مذمت میں تازہ کہی گئی تھی، لوگوں کو سناتا جاتا تھا۔ میں نے لوگوں کو جلسے کے اعلان کے پیغام پر تالیاں بجاتے دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں میں مسٹر بھٹو کو سننے کا بے حد اشتیاق تھا۔ بھٹو صاحب بے حد محتاط انسان تھے۔ اُنہوں نے ہم کو تاکید کی تھی کہ عرب اسرائیل جنگ کے حوالے سے جلسے کی مشہوری کی جائے۔ اِس میں اُن کی مصلحت یہ تھی کہ حکومت عربوں کی حمایت میں کئے جانے والے جلسے کی اجازت نہ دینے کی حماقت نہیں کر سکے گی۔ بھٹو صاحب چونکہ حکومت وقت کی نزاکتوں کا علم رکھتے تھے کہ حکومت کو ہر صورت اِس جلسے کی منظوری دیتے ہی بنے گی۔ 20 جون کی شام تک حکومت جلسے کی منظوری کے بارے میں خاموش رہی مگر ہمارے جلسے کے اعلانات نے حکومت کو جلسے کی منظوری دینے پر مجبور کر دیا۔ یاد رہے کہ اُس وقت جلسے جلوس پر سخت پابندی ہوتی تھی۔ یہ تو بھٹو صاحب کی عقل و دانش کا کمال تھا کہ اُنہوں نے ایسے مقصد اور معروضی حالات پر جلسہ کرنے کا اعلان کیا تھا جس کو حکومت کسی طرح بھی نامنظور نہیں کر سکتی تھی۔ اُس وقت پاکستان کے عوام کے دلوں میں اسرائیل کے خلاف آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ بھاٹی چوک میں ہم کو اعلان کرتے ہوئے طالب علموں کی گاڑی کا سامنا ہوا۔ اُن میں ایک طالب علم ایک ہی اعلان بار بار کئے جا رہا تھا کہ بھٹو صاحب اعلان تاشقند کا جلسے میں راز فاش کریں گے۔ یہ حکومت کو ڈرانے والی بات تھی اور جلسہ پر پابندی لگانے والی بات ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے اِس گاڑی کو روک کر اُس لڑکے کو کہا کہ تم اِس کا اعلان ہرگز نہ کرو۔ یہ بہت خطرناک ثابت

www.bhutto.org

ہوسکتا ہے۔ صرف اسرائیل کے خلاف جلسہ کرنے کا پیغام دو اور عربوں کی حمایت کرنے کے اعلانات کرو۔ ہم دوپہر کو اپنے اعلانات کی رپورٹ دینے جب ہوٹل پہنچے تو بھٹو صاحب اِن لڑکوں کو سمجھا رہے تھے کہ تم کو کس نے کہا تھا کہ اِس جلسے میں تاشقند کی بات کرو۔ تم یہ جلسہ بند کروانا چاہتے ہو۔ میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ میں نے اِن لڑکوں کو تاشقند کا اعلان کرنے سے بھاٹی چوک میں منع کر دیا تھا۔ بھٹو صاحب کو کسی دوسرے آدمی نے اِن لڑکوں کی اناؤنسمنٹ کے بارے میں خبر دی تھی۔ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کی ایک چال تھی جو جلسے کی فضا کو خراب کرنا چاہتی تھی۔

بھٹو صاحب نے مجھے سب کے سامنے تھپکی دیتے ہوئے کہا کہ اِن لڑکوں کے ساتھ رہ کر جلسے کا اعلان کرو۔ 20 جون کی دوپہر سے شیخ صفدر علی مرحوم نے کچھ مزدوروں کو ساتھ لگا کر گول باغ لاہور جو آجکل ''ناصر باغ'' ہے۔ یاد رہے کہ گول باغ کا نام ''ناصر باغ'' بھی بھٹو نے ہی رکھا تھا مگر اِس جلسے کے بہت بعد میں رکھا تھا۔ گول باغ میں ایک سٹیج بنوا کر ہر طرف لاؤڈ اسپیکر لگوا دیئے۔ یہ سٹیج پنجاب یونیورسٹی کی طرف لگائی گئی تھی اور سٹیج کی بیک سائیڈ پر وہ سڑک تھی جو سیدھی گورنمنٹ کالج کی طرف جاتی تھی۔ یہاں پر اُن دنوں ٹیوب ویل نصب تھا۔ ٹیوب ویل کے چبوترے کو سٹیج کے ساتھ ملا دیا گیا تھا۔ میں تقریباً چھ بجے تک دوستوں کے ساتھ جلسہ کا اعلان کرتا رہا۔ اِس دوران کئی بار جلسہ گاہ کی طرف سے گزرا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ لوگ تقریباً چار بجے ہی جلسہ گاہ میں آنا شروع ہو گئے تھے۔ ہم نے جلسے کا وقت شام چھ بجے دے رکھا تھا۔ جلسہ گاہ میں تمام تیاری مکمل ہو چکی تھی۔

سات بجے کے قریب میں اور شیخ سرور اقبال فلیٹی ہوٹل گئے۔ جا کر جلسہ کی تیاری کی خبر دی۔ کمرے میں اُس وقت ملک غلام مصطفیٰ کھر، ملک حامد سرفراز، ملک نوید اور کچھ دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ فیصلہ کیا گیا کہ ملک حامد سرفراز آٹھ بجے جلسہ شروع کرائے گا۔ میری نظم ہوگی، تقریریں ہوں گی۔ ساڑھے آٹھ بجے ملک غلام مصطفیٰ کھر بھٹو صاحب کو جلسہ گاہ میں لے کر آ جائیں گے اور بھٹو صاحب آتے ہی تقریر شروع کر دیں گے۔ اِس فیصلے کے ساتھ ہی ہم لوگ جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ ہم نے اپنی ٹیکسی گاڑی جلسہ گاہ میں چھوڑ دی اور ڈرائیور کو کہا کہ کل صبح ہوٹل آ کر اپنا کرایہ وصول کرے۔ اُس وقت شام ہو چکی تھی۔ سٹیج پر روشنی ہو چکی تھی اور سٹیج کی جس جگہ پر بھٹو صاحب کو بٹھانے کیلئے کرسی رکھی گئی تھی، اُس کرسی کے اردگرد لوگوں کا ہجوم ہو چکا تھا اور کرسی کی

www.bhutto.org

طرف جانے یا کرسی تک پہنچنے کا تمام راستہ بند ہو چکا تھا۔ سٹیج کی ایک جانب دائیں طرف تھوڑی سی جگہ تھی جہاں پر مائیک رکھے ہوئے تھے۔ سٹیج پر کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں نے شیخ صفدر علی کو اُٹھا کر سٹیج پر ایک طرف دھکیل دیا۔ شیخ صفدر علی صاحب لوگوں کو بھٹو صاحب کی کرسی سے دور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب میں دیکھ رہا تھا کہ انتہائی مشتعل قسم کے ایک جتھے کا کرسی کے اردگرد سٹیج پر مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ اِس ہڑبونگ کے عالم میں بڑی مشکل کے ساتھ تلاوت کلام پاک کروائی گئی۔ مجھے نظم پڑھنے کا کہا گیا۔ ہر چند مجھے نظم زبانی یاد تھی مگر کسی نے میرے کرتے کی جیب سے میری نظم اُڑا لی تھی۔ میں نے انتہائی شور و غوغے کے ماحول میں گرتے پڑتے نظم پڑھنا شروع کر دی۔ کبھی مجھے دھکا لگتا تو میں آگے کی طرف لڑھک جاتا، پھر میں کھڑا ہو کر نظم پڑھنا شروع کر دیتا۔

اِس طوفانِ بدتمیزی میں، میں نے اپنی نظم مکمل کر دی۔ میرے بعد ملک حامد سرفراز نے اپنی تقریر شروع کر دی۔ اُن کی تقریر ابھی جاری تھی کہ بھٹو صاحب جلسہ گاہ میں تشریف لے آئے۔ اُن کو بڑی مشکل کے ساتھ سٹیج پر پہنچایا گیا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ جب سٹیج پر کوئی آرڈر ہی قائم نہیں تھا، کوئی نظم و ضبط ہی نہیں تھا، اُن کو سٹیج پر لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ضروری تھا کہ سٹیج کو پہلے خالی کرایا جاتا۔ پہلے جگہ بنائی جاتی، پھر بھٹو صاحب کو سٹیج پر لایا جاتا مگر ایسا ہرگز نہیں کیا گیا۔ خدا معلوم کہ ایسا کیوں نہ کیا گیا۔ اِس کے بعد دوسری غلطی یہ کی گئی کہ بھٹو صاحب کو اِس کرسی تک کندھوں پر اُٹھا کر پہنچایا گیا۔ جو کرسی حکومت کے بلوائیوں کے قبضے میں تھی۔ اِن بلوائیوں میں شہر بھر کے بدمعاش اور لفنگے شامل تھے۔ کارپوریشن کے بھنگی بھی شامل تھے۔ اُن میں سے اکثریت شراب کے نشے میں دھت لوگوں کی تھی جس کی وجہ سے ہر طرف بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ بھٹو صاحب کے کرسی پر بیٹھتے ہی سٹیج کی بجلی بند کر دی گئی۔ تمام لائٹیں گل ہو گئیں۔ سٹیج پر اندھیرا چھا گیا۔ اُس وقت کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ کون کہاں ہے۔ لوگ حکومت کو گالیاں دے رہے تھے۔ صدر ایوب کو کتا کہہ رہے تھے۔ لوگوں کی ہڑبونگ، لاؤڈ اسپیکر کی تمام تاریں ٹوٹ چکی تھیں۔ یہ سلسلہ تقریباً آدھے گھنٹے تک جاری رہا۔

اِس دوران میں کبھی بجلی آ جاتی تھی اور کبھی بند ہو جاتی تھی۔ سٹیج کے آگے کے حصے میں جو باغ کی گراسی گراؤنڈ تھی، وہاں شام کو ہی کارپوریشن کے عملے نے پانی چھوڑ کر گراؤنڈ کو تالاب بنا دیا

www.bhutto.org

تھا۔لوگوں کا ہجوم جب گول باغ کی وسعت سے بڑھ گیا تو لوگ اپنے لیڈر کی محبت میں پانی میں کھڑے ہو گئے تھے۔حکومت کے کسی حرامی پلے نے بجلی کی تاروں کو توڑ کر پانی میں پھینک کر اوپر سے بجلی کا سوئچ آن کر دیا۔چند ہی سیکنڈ میں بجلی کی لہر گراؤنڈ میں کھڑے تمام پانی میں سرایت کر گئی۔جو شخص بھی گراؤنڈ میں اِس پانی میں کھڑا تھا،چیخیں مارنا شروع ہو گیا۔لوگ اچھل اچھل کر ایک دوسرے کے اوپر گرنے لگے۔دیکھتے ہی دیکھتے گراؤنڈ خالی ہونے لگا۔لوگ بھاگ بھاگ کر پانی سے باہر نکلنا شروع ہو گئے۔اِس چیخ و پکار سے وہ لوگ جو سٹیج پر بھٹو صاحب کو اپنے قبضے میں کئے بیٹھے تھے،وہ گھبرا کر سٹیج سے بھاگنا شروع ہو گئے۔اِس طرح سٹیج پر بھٹو صاحب تک جانے کا راستہ بن گیا۔میں سٹیج کے ساتھ ٹیوب ویل کی دیوار پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا۔وہاں مجھے بھٹو صاحب کرسی کے اوپر پاؤں رکھ کر بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے۔میں دیوار سے نیچے اُتر کر اُن کے پاس پہنچ گیا اور میں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ میں آپ کے پاس ہی کھڑا ہوں۔کافی دیر تک میں اُن کی کرسی کا بازو پکڑے کھڑا رہا۔بھٹو صاحب کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔لوگ سٹیج سے اِس طرح چھلانگیں لگا کر بھاگ رہے تھے کہ جیسے اُن کے پاؤں میں سانپ چھوڑ دیئے گئے ہوں۔

خدا کی قسم!میں نے ذوالفقار علی بھٹو کو تنہا بڑی استقامت کے ساتھ کھڑے دیکھا۔وہ شخص یہ تمام نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔اتنے میں ہمارا ایک دوست ماسٹر سردار محمد جو بجلی وغیرہ کا کام جانتا تھا،مجھے سٹیج کے قریب نظر آیا۔میں نے اُس کو آواز دے کر کہا کہ ماسٹر ہم یہاں ہیں۔اُس نے جب بھٹو صاحب کو دیکھا تو اُس نے لاؤڈ اسپیکر کی ٹوٹی تاروں کو تلاش کر کے جوڑ دیا۔اتفاق سے ایک طرف کی بجلی بحال تھی،اُس طرف کا لاؤڈ اسپیکر بولنے لگ گیا۔بھٹو صاحب نے مائیک ماسٹر سردار کے ہاتھ سے لے کر مجھے نعرے مارنے کا کہا۔میں نے بھٹو صاحب کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ایک چھوٹی سی میز اُلٹی پڑی تھی۔بھٹو صاحب اِس میز کو فوراً سیدھا کر کے اُس کے اوپر چڑھ گئے اور اُنہوں نے لوگوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔اُنہوں نے اسرائیل کے بارے میں چند منٹ ہی بات کی تھی کہ بجلی مکمل طور پر بند ہو گئی۔کچھ لوگ دوبارہ سٹیج پر چڑھ گئے۔اُنہوں نے بھٹو صاحب کی میز کو اُلٹا دیا۔بھٹو صاحب تیزی کے ساتھ میز سے نیچے کود گئے۔

ماسٹر سردار محمد اور میں نے اور لاؤڈ اسپیکر کے مالک دوکان دار کے لڑکوں نے لوگوں کو دھکے دے دے کر سٹیج سے نیچے گرانا شروع کر دیا۔اس طرح سٹیج پر صرف بھٹو صاحب،میں اور ماسٹر

سردار محمد اور اسپیکروں والے ہی رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی بجلی کے ٹرانس فارمر پر دھماکہ ہوگیا اور پورے باغ میں مکمل طور پر بلیک آؤٹ ہوگیا۔ اندھیرا چھا گیا۔

مجھے بھٹو صاحب نے پوچھا کہ ہمارا کوئی اور آدمی یہاں موجود نہیں۔ میں نے جواب دیا کہ سر اس وقت تو یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اب بھٹو صاحب کو یقین ہوگیا کہ اب جلسہ نہیں ہو سکے گا۔ مجھے کہنے لگے کہ او کے۔ اب یہاں سے چلا جائے۔ میں ٹیوب ویل والا راستہ دیکھ چکا تھا۔ میں نے بھٹو صاحب کو دیوار پر چڑھنے کو کہا۔ وہ اوپر دیوار پر ہاتھ ڈال کر دیوار پر چڑھ گئے۔ یہ دیوار ٹیوب ویل کی چھوٹی سی چھت کے ساتھ ملحقہ تھی۔ چھت سے چھوٹی سی سیڑھی کے ذریعے میں بھٹو صاحب کو لے کر باغ سے باہر سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر اُس وقت اتفاق سے ایک رکشا کھڑا تھا۔ میں نے بھٹو صاحب کو کہا۔ سر آپ اِس رکشا میں بیٹھ جائیں۔ بھٹو صاحب بہت کڑیل جوان تھے۔ بڑی مشکل کے ساتھ رکشا میں داخل ہو گئے۔ میں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے رکشے والے کو کہا کہ سیدھے چلو۔ رکشا سیدھا چلانا شروع ہوا ہی تھا کہ نوید ملک رکشے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا نظر آیا۔ بھٹو صاحب کو میں نے کہا۔ سر گورنمنٹ کالج کے اندر جا کر رکشا چھوڑ دیں گے۔ اس طرح میں نے رکشے والے کو گورنمنٹ کالج کے اندر جانے کا کہا کہ سیدھا گیٹ کے اندر چلے چلو۔ رکشا گورنمنٹ کالج کے پرنسپل کے گھر کے آگے جا کر روک دیا گیا۔ بھٹو صاحب رکشے سے باہر آ گئے۔ اتنے میں نوید ملک بھی بھاگتا ہوا پہنچ گیا۔ میں نے پرنسپل صاحب کے دروازے پر لگی گھنٹی بجا دی۔ پرنسپل صاحب کی بیگم صاحبہ باہر آ گئیں۔ میں نے اُن کو کہا کہ بھٹو صاحب کا جلسہ خراب کر دیا گیا ہے۔ اِن کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ مہربانی کر کے مجھے فلیٹیز ہوٹل فون کرنے دیجیے تاکہ گاڑی منگوائی جا سکے۔ وہ بیگم صاحبہ بھٹو صاحب کو اپنے روبرو کھڑے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ اُنہوں نے بھٹو صاحب کو اندر آنے کو کہا۔ بھٹو صاحب، اور میں پرنسپل صاحب کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب کے جوتے گارے سے اَٹے ہوئے تھے۔ اُن کی جرابوں کا بُرا حال تھا۔ اُن کے سوٹ کی پتلون کے پائنچے مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔ میں نے پرنسپل صاحب کے ملازم سے کہا کہ بھٹو صاحب کے پاؤں صاف کرنے کے لئے کسی برتن میں تھوڑا سا پانی دے دیں۔ وہ ایک جگ میں پانی لے آیا۔ وہاں قریب ہی ایک پرات نما رکابی پڑی تھی۔ میں نے بھٹو صاحب کے جوتے اُتار کر اُن کے پاؤں صاف کر دیئے۔ اُن کی نیلے رنگ کی

www.bhutto.org

جرابوں کو دھو کر نچوڑ دیا۔ بھٹو صاحب نے فون پر فلیٹیز ہوٹل خود بات کی اور اُن کو گورنمنٹ کالج میں گاڑی بھیجنے کے لئے کہا۔ اُن دنوں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل میاں عبدالرشید تھے۔ وہ خود اُس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔ پرنسپل صاحب کی بیگم صاحبہ اور اُن کی ایک بیٹی اور ایک ملازم ہی اُس وقت گھر پر موجود تھا۔ بیگم صاحبہ نے بھٹو صاحب کے ساتھ جلسے کی ابتری پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ میں نے کالج کے چبوترے پر کھڑے ہو کر یہ تمام تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ آپ جیسے انسان کے ساتھ ایسا سلوک کرنا شرم کی بات ہے۔

بھٹو صاحب نے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے جیسے ملک میں اِس طرح کے تماشے عام کئے جاتے ہیں۔ لیکن میں ان تمام باتوں سے گھبرانے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے بھٹو صاحب کو جرابیں پہنانا چاہیں مگر اُنہوں نے جرابیں ہاتھ میں لے کر خود پہن لیں اور مجھے کہا۔ ''تھینک یو اسلم۔'' بھٹو صاحب نے پرنسپل صاحب کی بیگم صاحبہ کی میزبانی کا بہت شکریہ ادا کیا اور باہر نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئے اور مجھے اپنے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کو کہا۔ نوید ملک نے ڈرائیور کو گورنمنٹ کالج کے پیچھے والے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اُس کو اُس طرف جانے کو کہا اور خود گاڑی کے آگے تیز تیز چلنے لگ گیا۔ وہ دروازہ ہمیشہ بند ہوتا ہے لہٰذا بند دروازہ دیکھ کر گاڑی کو دوبارہ واپس کرنا پڑا اور گاڑی مال روڈ کی طرف جانے والے دروازے سے باہر سڑک پر آ گئی اور نوید ملک گورنمنٹ کالج میں ہی رہ گیا۔

بھٹو صاحب نے دائیں جانب دیکھ کر کہا کہ ''This was the meeting place'' یہی جلسہ گاہ تھی۔ اِس طرح گاڑی مال روڈ سے سیدھی فلیٹیز ہوٹل کی طرف چل پڑی۔ راستے میں بھٹو صاحب کہنے لگے کہ یہ ہمارے دوستوں کو کیا ہوا۔ یہ تمام کیوں بھاگ گئے؟ جو بھی ہونا تھا، وہ تو میرے ساتھ ہونا تھا۔ بھٹو صاحب محبت سے میری گال پر چٹکی کاٹا کرتے تھے۔ جس طرح چھوٹے بچوں کے ساتھ پیار کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے چٹکی کاٹ کر کہا۔ ''تم بہادر پنجابی ہو۔'' آج میں سوچتا ہوں کہ وہ معاملات کو کتنی گہرائی سے پرکھا کرتے تھے۔ مجھے بہادر پنجابی کہنے سے شاید وہ لوگوں کے بھاگ جانے سے پنجاب کی بہادری اور بزدلی کا ذہنی طور پر تجزیہ کر رہے ہوں گے۔ گاڑی فلیٹیز ہوٹل پہنچ گئی۔

فلیٹیز ہوٹل میں اُس وقت دائیں جانب سیدھ میں کمرہ تھا۔ گاڑی سے اُتر کر بھٹو صاحب

www.bhutto.org

اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو کمرہ بہت سے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے میں اُس وقت ملک غلام مصطفےٰ کھر، ملک حامد سرفراز اور بہت سارے دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ بھٹو صاحب اِن لوگوں کو بے حد شرمندہ کریں گے مگر اُنہوں نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ کمرے میں بہت سارے اخبار نویس جمع تھے۔ اُنہوں نے بھٹو صاحب سے سوال کرنے شروع کردیئے۔ بھٹو صاحب نے اُن کو اپنے کیچڑ آلودہ کپڑے دکھاتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ تشریف رکھیں۔ میں کپڑے تبدیل کرکے آتا ہوں۔ بھٹو صاحب سیدھے واش روم چلے گئے۔ کمرے میں بیٹھے لوگوں کے چہرے شرمندگی سے فق نظر آرہے تھے۔ مجھے کہنے لگے۔ یار! ہم بھٹو صاحب کو بہت تلاش کرتے رہے۔ وہ ہمیں کہیں دکھائی ہی نہ دیئے۔ ہم کمرے میں آکر اُن کا انتظار کرنے لگ گئے۔ حکومت نے بڑی بدمعاشی کی ہے۔ بھٹو صاحب کو تم کہاں سے لائے ہو۔ میں نے اُن کو تمام صورتحال بتائی۔ اتنے میں بھٹو صاحب کپڑے تبدیل کرکے آگئے۔ اُنہوں نے اپنی کمر پر سے کُرتا اُٹھا کر اُن لوگوں سے نہیں صرف مجھے کہا۔ دیکھو اسلم یہاں! کیا لگا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اُن کی کمر کے اوپر کندھوں کے نیچے ایک بڑا سا چوٹ کا نشان تھا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ یہ چوٹ کا نشان ہے۔ بھٹو صاحب بستر پر لیٹ کر کہنے لگے۔ کم بختوں نے مجھے بہت مارا ہے۔ میرا تمام جسم درد کر رہا ہے۔ خیر کہنے لگے۔ چھوڑو اِن باتوں کو۔

اخبار نویسوں نے بھٹو صاحب کا انٹرویو شروع کردیا۔ بھٹو صاحب نے کہا کہ میں ایک عظیم مقصد کے لئے جلسہ میں گیا تھا۔ میں اسرائیل کی عربوں پر کھلی جارحیت کی مذمت کرنا چاہتا تھا مگر افسوس کہ یہ حکومت اسرائیل سے ڈرتی ہے۔ اُس کے خلاف نہ تو خود کوئی بات کرتی ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کو اِس کی مذمت کرنے دیتی ہے۔ حکومت کی اِس جہالت اور غنڈہ گردی سے پورا عالم اسلام پاکستان سے مایوس ہوجائے گا۔ آج کا دور میڈیا کا دور ہے۔ آج آپ اِن باتوں کو چھپا نہیں سکتے۔ اُنہوں نے بہت لمبا انٹرویو دیا۔ انٹرویو کے بعد اخبار نویسوں نے بڑے عجیب و غریب سوال کرنا شروع کردیئے۔ ایک نے سوال کیا کہ جلسے سے آپ کے تمام ساتھی آپ کو اکیلا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گئے۔ اِس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ بھٹو صاحب مسکرا کر کہنے لگے۔ کیوں اسلم تم کیوں نہیں بھاگے تھے۔ بھٹو صاحب نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ یہ سوال تو آپ میرے اِن بھاگنے والے ساتھیوں سے کریں۔ ساتھ ہی کہنے لگے کہ خدا کا شکر ہے کہ ہم

سب صحیح سلامت ہیں۔ اس معاملے کو ایک برا خواب سمجھ کر نظر انداز کر دیں۔

بھٹو صاحب نے شیخ صفدر علی کو کہا کہ ان تمام لوگوں کی خاطر تواضع کی جائے۔ بھٹو صاحب نے شیخ صفدر کو خاص طور پر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسلم کا خیال رکھیں آج اس نے وفاداری کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ملک غلام جیلانی، عبداللہ ملک اور ملک حامد محمود کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ بھٹو صاحب کو ڈاکٹر جاوید اقبال کے گھر اپنے ساتھ لے گئے۔

تاریخ کی مسخیات(Distortion of the History)

نوٹ. ہر چند یہاں جو بات میں تاریخ میں غلط بیانی کے حوالے سے اور تاریخ کو مسخ کرنے کے حوالے سے تحریر کر رہا ہوں۔ یہ بات اس وقت کی گئی تھی جب بھٹو صاحب اقتدار میں آ گئے تھے۔ مگر میرے خیال میں اگر اس بات کو یہاں پر ہی تحریر کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ تاریخ میں اکثر واقعات جھوٹے تحریر کیے جاتے ہیں۔ کئی واقعات نقلی بنائے جاتے ہیں اور کئی کردار جعلی بنائے جاتے ہیں۔ گول باغ کے جلسے کے واقعے کے ساتھ بالکل ایسا ہی کیا گیا تھا۔

ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب جب پنجاب کے گورنر بن گئے اور شیرِ پنجاب کہلانے لگ گئے۔ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ پاکستان پیپلز پارٹی کی تاریخ قسط وار پارٹی کے اخبار ''مساوات'' میں چھپوانا شروع کر دی۔ ان کے نام سے تاریخ لکھنے والے میاں اسلم تھے۔ جو اس وقت مساوات کے انچارج تھے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب کی طرف سے تحریر کیا گیا کہ ملک مصطفیٰ کھر کمال بہادری کے ساتھ بھٹو صاحب کو گول باغ جو آج کل ناصر باغ ہے وہاں سے نکال کر ایک رکشے میں بیٹھا کر گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کے گھر لے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ملک صاحب کے ایک منظورِ نظر ایم۔ پی۔ اے یعقوب مان نے جن کا تعلق قصور شہر سے تھا اس نے ایک جعلی رکشے والا پیدا کر دیا۔ جس کا نام روشن علی تھا۔ اور اخباروں میں مشہور کر دیا کہ روشن علی ہی وہ رکشے والا تھا جو بھٹو صاحب کو کھر صاحب کو گورنمنٹ کالج لے کر گیا تھا۔ جب یہ واقعہ مساوات میں پارٹی کی تاریخ کے حوالے سے شائع ہوا۔ تو اس وقت میں رکشے والے کے بارے

www.bhutto.org

میں تو کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر میں نے آزاد اخبار میں اس بات کی کھل کر تردید کر دی۔ میری وضاحت یہ تھی کہ مصطفیٰ کھر صاحب اور ان کے ساتھی تو بھٹو صاحب کو وہاں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ پیپلز پارٹی کی اس غلط تحریر نویسی کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ بھٹو صاحب کو میں پرنسپل کے گھر لے کر گیا تھا۔ میری اس توضیح کا ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب نے اور ان کے ساتھیوں نے بہت بُرا منایا تھا۔ میاں اسلم صاحب جو کہ ملک صاحب کی طرف سے تاریخ نویسی کا کام سرانجام دے رہے تھے۔ انہوں نے مساوات اخبار کے دفتر میں میرے ساتھ بڑے سخت الفاظ میں گلہ کیا تھا۔ کیا تم لیڈر بن گئے ہو۔ اس بات کی وضاحت کر کے تمہیں کیا مل گیا ہے کہ ''مصطفیٰ کھر نے جھوٹ بولا ہے۔'' یاد رکھو اب تم ہمارے دوست نہیں ہو دشمن ہو۔ میں نے میاں اسلم کو کہا کہ کیا پارٹی کی تاریخ کو مسخ کرنا اچھی بات ہے۔ یہ میری جدوجہد کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ جس کے خود بھٹو صاحب گواہ ہیں۔ میاں اسلم چونکہ ملک صاحب بوزم تھے۔ ان کے نزدیک تاریخ کی کوئی وقعت نہیں تھی۔

میاں اسلم نے مجھے جو کچھ کہا تھا، بعد میں کھر صاحب کی حکومت نے میرے ساتھ وہی کچھ کیا تھا بلکہ یہاں تک ہوا کہ کھر صاحب کے وزیر تاری کے غنڈوں نے مجھ پر مزنگ چونگی کی ٹکہ شاپ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ جس میں میں بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔

وہ رکشے والا جعلی تھا

مجھے رکشے والے روشن کے بارے میں پہلے دن سے ہی شبہ تھا کہ یہ ایک نقلی کردار پیدا کیا گیا ہے۔ کھر صاحب کی حکومت میں اُس کو نیا رکشا لے کر دیا گیا اور بہت انعام دیئے گئے۔ بات پرانی ہو گئی۔ ایک مدت کے بعد جب بھٹو صاحب کو اِس دنیا سے رخصت ہوئے کافی عرصہ گذر چکا تھا، راؤ سکندر اقبال پنجاب پیپلز پارٹی کے صدر تھے۔ اُن کی صدارت میں اُن کے گھر پر پارٹی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میری تقریر کرنے کی باری آئی تو میں نے وہاں پر روشن رکشے والے کو سامنے بیٹھا دیکھا۔ میں نے بھرے اجلاس میں روشن کو مائیک کے سامنے بلایا اور کہا کہ دوستو! یہ وہ رکشہ والا ہے جو کہتا ہے کہ بھٹو صاحب کو میں اپنے رکشے میں بٹھا کر فلیٹیز ہوٹل لے کر گیا تھا۔ میں نے روشن کو کہا کہ ہاں روشن! تم نے بھٹو صاحب کو کہاں سے رکشے میں بٹھایا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے بھٹو

صاحب کو ریگل چوک سے اپنے رکشے میں بٹھایا تھا۔ میں نے کہا کہ بھٹو صاحب وہاں کیا کر رہے تھے؟ کہنے لگا وہ پیدل چل رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ تم اُن کو کہاں لے گئے تھے۔ کہنے لگا کہ ایک کوٹھی میں۔ روشن علی ایک انتہائی بے ایمان آدمی تھا۔ وہ مکاری میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔ بالآخر پارٹی چھوڑ کر نواز شریف کے لوگوں کے ساتھ مل گیا تھا۔ وہ ایک بِکاؤ قسم کا انسان تھا۔

راؤ سکندر اقبال کے گھر اجلاس میں، میں نے کہا کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم وہ رکشے والے نہیں ہو۔ وہ کچھ سہم سا گیا۔ کہنے لگا ٹھیک ہے۔ میں وہ رکشے والا نہیں ہوں مگر میں نے یہ جھوٹ خود نہیں بولا تھا، مجھ سے یہ جھوٹ بلوایا گیا تھا۔

میرے ذہن میں اصل رکشے والے کا ایک ہیولہ سا ضرور موجود تھا کہ وہ کچھ بڑی عمر کا موٹا سا آدمی تھا۔ مگر نجانے وہ شخص کہاں چلا گیا۔ شاید وہ کوئی اَن پڑھ دیہاتی انسان تھا جس کو خبر ہی نہ ہو سکی کہ اُس کے رکشے میں ذوالفقار علی بھٹو کو بٹھایا گیا تھا۔

(نوٹ: میری اِن باتوں کی تصدیق میاں محمد اسلم اور ملک نوید صاحب کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں حضرات بفضل خدا زندہ و جاوید ہیں)

تاریخ کو اور اس واقع کو مسخ کرنے کی ایک بار پھر 2008ء میں کوشش کی گئی۔ ایک کالم نویس نے جنگ اخبار میں تحریر کر دیا کہ میاں نواز شریف بھٹو صاحب کو کندھوں پر اٹھا کر گورنمنٹ کالج لے گئے تھے۔ یہ بات بی بی کی شہادت کے بعد تحریر کی گئی تھی۔ خدا جانے ایسی خلاف واقعہ بات تحریر کرنے میں کیا مصلحت درپیش تھی۔ میرا خیال ہے کہ میاں نواز شریف کو پیپلز پارٹی میں مقبول بنانے کے لئے یہ بات تحریر کی گئی تھی۔ مگر میں نے بروقت اس کی تردید جنگ میں شائع کروادی تھی۔

گول باغ کے جلسے کے دوسرے دن میں جب حسب پروگرام ہوٹل گیا تو وہاں پر اعلانات کرنے والی ٹیکسی گاڑیوں کے دونوں ڈرائیور بھٹو صاحب کے کمرے کے باہر دھرنا دیئے بیٹھے تھے کہ ہمیں گاڑیوں کا کرایہ دو۔ میں نے کہا کہ اِن گاڑیوں کا کرایہ دینے کا وعدہ تو راجہ منور نے کیا تھا مگر راجہ منور احمد صاحب جلسے والے دن ہی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ وہ رات کو جلسہ گاہ میں بھی کہیں نظر نہ آئے اور نہ ہی دوسرے دن ہوٹل تشریف لائے۔ ڈرائیوروں کا مطالبہ بالکل جائز تھا۔ وہ بہت ہنگامہ کر رہے تھے۔ میں نے شیخ صفدر علی کو باہر بلا کر تمام معاملے سے آگاہ کیا۔ اُنہوں نے

کہا کہ پیسے تو ان کو دینا ہی پڑیں گے مگر تم بھٹو صاحب کے نوٹس میں اِس بات کو لاؤ۔ میں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ راجہ منور احمد نے گاڑیوں کے کرائے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اب نظر ہی نہیں آرہے۔ ڈرائیور کرایہ مانگ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب کہنے لگے کہ وہ اب نہیں آئے گا۔ اُنہوں نے شیخ صفدر علی کو کہا کہ گاڑیوں کے کرائے ادا کردیں۔ گاڑیوں کے ڈرائیور کرائے لے کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انارکلی بازار کا لاؤڈ اسپیکر والا دوکان دار آگیا۔ وہ سیدھا بھٹو صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ اُس کا کرایہ دینے کا وعدہ بھی راجہ منور کا تھا۔ اب دوکان دار کو بھی بھٹو صاحب نے اپنے پاس سے پیسے دے کر معاملہ نپٹا دیا۔

راجہ منور احمد کی بھٹو صاحب کے ساتھ تعارف کی ابتداء ہی کچھ اِس انداز میں ہوئی جس کی وجہ سے بھٹو صاحب راجہ منور احمد کو پسند نہیں کرتے تھے۔ خود کارکنوں کا امپریشن بھی راجہ منور احمد کے بارے میں کچھ اچھا نہ تھا۔ اُس وقت کے سیاسی کارکن راجہ صاحب کی ذات پر شک کیا کرتے تھے۔ وہ اُن کو دو نمبر آدمی تصور کیا کرتے تھے۔

گول باغ کے جلسے کے بعد بھٹو صاحب کراچی واپس چلے گئے۔ اب بھٹو صاحب اِس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ بجائے کسی پہلے سے بنی بنائی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایک نئی سیاسی پارٹی بنائی جائے جو وقت کا تقاضا بھی تھا اور لوگوں کی ضرورت بھی تھی۔ خود بھٹو صاحب کی شخصیت بھی ایسی نہیں تھی کہ جو پاکستان ڈیموکریٹک فرنٹ میں شامل سیاسی پارٹیوں میں سے کسی میں بھی سما سکتی۔ ایسی جاندار اور فعال شخصیت ایک نئی سیاسی پارٹی میں سما سکتی تھی جبکہ پاکستان کی تمام پرانی سیاسی جماعتیں اپنے اپنے تضادات کا شکار ہو چکی تھیں۔ ہر پارٹی میں موجود شخصیتوں کے آپس میں اختلافات بہت نمایاں تھے۔ سیاسی جماعتوں کی لمبی عمر ہو جانے پر یہ ایک قدرتی امر ہو جاتا ہے کہ اِس میں کئی قسم کے اختلافات پیدا ہو جایا کرتے ہیں، کئی دھڑے بن جایا کرتے ہیں۔ ہر دھڑا دوسرے دھڑے پر مختلف قسم کے الزامات لگا دیا کرتا ہے۔ پارٹی کے کارکن بھی دھڑوں میں تقسیم ہو جایا کرتے ہیں۔ لمبی عمر کی پارٹیوں کے لیڈر بھی کچھ بوسیدہ ہو جایا کرتے ہیں۔ عوام میں اُن کے لئے کچھ جوش و جذبہ باقی نہیں رہتا۔

پاکستان جیسے پسماندہ ملک پر جس پر روزِ اوّل سے ہی فوجی جرنیلوں اور بیوروکریسی کی حکمرانی مسلط ہو گئی تھی، اِس میں یہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ سیاسی پارٹیوں کی حکومت کے ساتھ

www.bhutto.org

کئی ایک طریقے سے سمجھوتہ بازی نہ ہوئی ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اُس وقت کی تمام حزب اختلاف کی جماعتیں ایوب حکومت کے خلاف اپنے اختلافات میں اشتراک نہیں رکھتی تھیں۔ ایک پارٹی ایوب حکومت کے اقدام پر مذمت کر رہی ہوتی تھی تو دوسری پارٹی اِس مذمت میں شریک نہیں ہوتی تھی، خاموش رہتی تھی۔ دوسرا سب سے بڑا تضاد اِن حزب اختلاف کی پارٹیوں میں یہ تھا کہ اِن پارٹیوں میں دائیں اور بائیں کی بڑی سخت تفریق موجود تھی۔ بائیں بازو کی جماعتیں اور تنظیمیں سوویت روس کے ساتھ دوستی چاہتی تھیں۔ ہندوستان کے ساتھ دوستی چاہتی تھیں۔ اِس کے مقابلے میں دائیں بازو کی تمام سیاسی جماعتیں اور اُن کے لیڈر سوویت روس کو کافر قرار دیتے تھے۔ ہندوستان کو اپنا ازلی دشمن قرار دیتے تھے۔ اِن سیاسی جماعتوں پر یہ بنیادی تضاد اِس قدر حاوی تھا کہ یہ جماعتیں کبھی بھی ایوب حکومت کے خلاف کوئی خطرہ پیدا نہیں کر سکتی تھیں۔ کوئی بڑی تحریک نہیں پیدا کر سکتی تھیں۔ ایوب خان کی حکومت اِن پارٹیوں اور لیڈروں کے اِس تضاد سے خوب فائدہ اُٹھایا کرتی تھی۔ لہٰذا اس قسم کی صورتحال میں بھٹو صاحب کا کسی بھی پہلے سے قائم سیاسی پارٹی میں شریک ہونا سیاسی مصلحت اور عقل و دانش کے خلاف تھا۔ یہ تمام پرانی سیاسی پارٹیاں ذوالفقار علی بھٹو جیسے دیوانے کے جنون کی تاب نہیں لا سکتیں تھیں۔ نہ اُس کی رفتار کے ساتھ چل سکتی تھیں اور نہ ہی اِن کے پرانے لیڈر بھٹو صاحب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ہمت رکھتے تھے۔

ملک غلام جیلانی اور میاں ممتاز دولتانہ جیسے سامراجی ایجنٹوں کی یہ کوشش تھی کہ بھٹو صاحب کو مسلم لیگ وغیرہ جیسی کسی پارٹی میں شامل کرا دیا جائے اور پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ بھی یہی چاہتی تھی تاکہ ذوالفقار علی بھٹو کی قوت کو محدود کر دیا جائے۔ وہ اِس اُٹھتے اور اُڑتے ہوئے پنچھی کے پَر کترنا چاہتی تھی۔ وہ بہت کم فہم لوگ تھے۔ وہ ذوالفقار علی بھٹو کی قوتِ عمل سے واقف نہیں تھے۔ وہ ایک جن کو بوتل میں بند کرنا چاہتے تھے جو ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ لوگ ذوالفقار علی بھٹو کے مزاج کو ہی نہیں جانتے تھے۔ بقول علامہ اقبال۔

سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں سودا
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازہ صحرا

بلکہ ذوالفقار علی بھٹو کا مزاج علامہ اقبال کے اِس فارسی شعر کے عین مطابق تھا۔

www.bhutto.org

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ می خواہم ازو
تا جنوں فرمائی می گوید دگر ویرانہ نیست

ذوالفقار علی بھٹو جیسے برق رفتار انسان کو تو ہر گھڑی ایک نئے میدان کی ضرورت رہتی تھی۔ اُن کے جنوں کو ویرانوں کی وسعت کی کم دامنی کا احساس رہتا تھا۔

سی۔آر۔اسلم سے ملاقات

میں نے لاہور ہائی کورٹ جا کر سی۔آر۔اسلم صاحب سے ملاقات کی۔وہ ہائی کورٹ کے بوڑھ کے درخت کے نیچے سیاسی کارکنوں کے جھرمٹ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔میں نے اُن کو کہا کہ مجھے ظہیر کاشمیری صاحب نے آپ سے ملنے کا مشورہ دیا ہے۔بنیادی طور پر میں بھی شاعر ہوں۔میرا شاعر ہونا اُن کیلئے بہت ہی اہم بات تھی۔میری زندگی میں وہ پہلے انسان تھے جو شاعر ہونا بہت اچھی بات تصور کرتے تھے۔وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔پھر تو تمہارے ساتھ ہر طرح کی بات ہو سکتی ہے۔وہ پنجابی میں بات کرتے تھے۔فرمانے لگے۔ظہیر صاحب نے مجھ سے ملنے کا مشورہ کیوں دیا ہے۔میں نے کہا کہ سیاست سیکھنے کیلئے۔کہنے لگے۔ظہیر صاحب بڑے انسان ہیں۔سیاست میں تم کس لئے آئے ہو؟ میں نے کہا۔انقلاب کے لئے۔وہ میری اِس بات سے بہت خوش ہوئے۔بہت خوبصورت انسان تھے۔

فرمانے لگے۔کس سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہو۔میں نے کہا کہ ابھی تک میں ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ہی سیاسی طور پر متفق ہوں۔وہ پارٹی بنائیں گے تو اُس پارٹی میں شریک ہو جاؤں گا۔وہ پہلے سیاست دان تھے جنہوں نے بھٹو کا نام بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ سنا۔کہنے لگے۔وہ وقت کی آواز بن چکا ہے۔لوگ خوامخواہ اُس کی مخالفت کر رہے ہیں۔یہی ہوگا کہ وہ سو فیصد انقلابی نہیں ہوگا مگر وہ کچھ فیصد انقلابی ضرور ثابت ہوگا۔ہمارے انقلاب کو اُس سے فائدہ پہنچے گا،نقصان نہیں ہوگا۔وہ باتیں جو ہم لوگ پاکستان میں بند کمروں میں کہا اور کیا کرتے تھے،وہ کھلے عام اُن باتوں کا اعلان کر رہا ہے۔پاکستان میں سوشلزم کا نام لینا کفر تھا۔بھٹو کہہ رہا ہے کہ پاکستان کا علاج ہی سوشلزم ہے۔ہر دور کے اپنے انقلابی ہوتے ہیں۔ہم کو اُس سے کوئی خطرہ نہیں۔دنیا میں کئی ایسے لوگ گزرے ہیں جو سرمایہ دار اور جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے مگر انہوں نے

www.bhutto.org

انقلابیوں کے لیئے تاریخی کردار سرانجام دیئے ہیں۔ بھٹو ایک نوجوان انسان ہے۔ نوجوانوں کو متاثر کرتا ہے۔ اچھی بات ہے اگر تم اگر بھٹو کے ساتھ ہو۔ اپنی انقلابی شاعری جاری رکھو۔ اچھی انقلابی کتابیں پڑھو اور اپنے استاد ظہیر کاشمیری کی طرح کی عوامی زندگی گزارو۔

سی۔آر۔اسلم صاحب کی شخصیت کا کئی دن تک مجھ پر سحر رہا۔ وہ مجھے بہت اچھے انسان لگے تھے اور آج تک لگتے چلے آرہے ہیں۔ اُن دنوں مجھے بہت شک رہتا تھا کہ بھٹو صاحب کہیں عوامی نیشنل پارٹی میں شامل نہ ہو جائیں۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب میاں محمود علی قصوری کو بہت پسند کرتے تھے۔ جب بھی وہ لاہور تشریف لاتے تھے، سب سے زیادہ وقت میاں محمود علی قصوری کے گھر پر اُن کا گزرتا تھا۔ میاں محمود علی قصوری کے ساتھ وہ ہر بات پر مشورہ کیا کرتے تھے۔

نئی سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان

پاکستان کے تمام دانشوروں، مزدوروں، کسانوں اور سیاسی کارکنوں کی نگاہیں بھٹو صاحب کے سیاسی فیصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ بالآخر بھٹو صاحب نے حیدرآباد سندھ میں میر رسول بخش تالپور کے گھر ایک پریس کانفرنس میں ایک نئی سیاسی پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا اور اِس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا کہ اِس پارٹی کا نام ''پاکستان پیپلز پارٹی'' ہوگا۔ اُن کے اِس اعلان پر پاکستان کی سیاسی فضا پر بہت خوشگوار اثر ہوا۔ پاکستان کے عوام کو نئی پارٹی بنانے کا خیال بہت پسند آیا۔ خصوصاً نوجوان نسل کے لوگوں میں اِس نئی پارٹی کے لئے بہت جوش و خروش دیکھنے میں آیا تھا۔

بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید کے ساتھ میری پہلی ملاقات

لوگ اِس نئی سیاسی پارٹی کو عملی اعتبار سے دیکھنے کے مشتاق تھے۔ بھٹو صاحب نے 16 ستمبر 1967ء کو حیدرآباد میں تالپور ہاؤس میں یہ اعلان کیا تھا کہ نئی پارٹی ایک ترقی پسند قومی سیاسی جماعت ہوگی جس کی جڑیں اور جس کا تعلق مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے عوام کے ساتھ ہوگا۔ حیدرآباد کے اِس اعلان کے بعد بھٹو صاحب لاہور تشریف لے آئے۔ لاہور میں اُنہوں نے نئی پارٹی کے انعقاد کے پہلے کنونشن کا اعلان کر دیا۔ اُن کا اعلان تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا تاسیسی اجلاس 30 نومبر 1967ء کو ہوگا۔ یہ اعلان اُنہوں نے 11 نومبر 1967ء کو کیا

www.bhutto.org

تھا۔ 11 نومبر سے لے کر 30 نومبر تک پارٹی کے بنیادی اجلاس کے انعقاد کی تیاری کی گئی۔ اِس تیاری میں سب سے زیادہ فعال پانچ آدمی دیکھنے میں آئے تھے۔ پہلے نمبر پر شیخ محمد رشید، دوسرے نمبر پر ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ، تیسرے نمبر پر ملک حامد سرفراز تھے، چوتھے نمبر پر خورشید حسن میر اور پانچویں نمبر پر ڈاکٹر مبشر حسن صاحب تھے۔

ملک حامد سرفراز اور ملک اسلم حیات کے ساتھ تو میری پہلے ہی روزانہ ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ البتہ شیخ محمد رشید صاحب کے ساتھ میری ملاقاتوں کا سلسلہ ابھی نیا نیا تھا مگر بہت ہی کم وقت میں شیخ محمد رشید صاحب کے ساتھ میری دوستی اور محبت کا رشتہ قائم ہو گیا۔ شیخ صاحب بہت سادہ اور بہت ہی پیاری شخصیت کے انسان تھے۔ سیاست میں اُن کی پہچان ایک کسان رہنما کی حیثیت سے زیادہ تھی۔ وہ خود بھی ایک کسان رہنما کہلانے میں فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ وہ کوئی بہت بڑے عالم فاضل انسان ہرگز نہیں تھے مگر اُن کا سیاسی کردار و عمل اور اُن کی سیاسی جدوجہد کے تسلسل نے اُن کی ذات کو ایک قابل فخر سیاسی شخصیت بنا دیا تھا جو علم فلسفہ اُن کے انقلابی نظریات و خیالات کے لئے ضروری تھا، اُس کے وہ نہ صرف عالم تھے بلکہ اُس کے ایک جید عامل تھے۔ وہ ایک غیر جاگیردارانہ نظام زندگی کے معلم تھے۔ جاگیرداری نظام سے جس قدر نفرت کرتے ہوئے میں نے شیخ محمد رشید کو دیکھا تھا، اِس قدر کسی دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔ اُن کی سوچ بہت سادہ اور سیدھی ہوتی تھی۔ اُن کی طبیعت میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔ سیاسی، تنظیمی اُمور کو طے پانے میں وہ بہت مشاق انسان تھے۔ محنتی اور دیانت دار رہنما تھے۔ سخت سے سخت تنظیمی کام میں جُتے رہنا اُن کا من پسند مشغلہ تھا۔ اُن کی آدھی سے زیادہ عمر کسان کمیٹیاں بنانے میں گذر چکی تھی۔ اِن کسان کمیٹیوں کے صدر اور اُن کے سیکریٹری اور اُن کے ممبران بہت پسے ہوئے طبقات کے لوگ تھے۔ ڈاؤن ٹراڈن تھے۔ ایسے لوگ جو واقعتاً کسان یا مزدور ہوتے تھے، بے حد غریب لوگ تھے۔ باقاعدہ کھیت مزدور تھے۔ اُن کے نام بھی عوامی تھے۔ مثال کے طور پر شریف نکودری، چوہدری اللہ دتا، بابا کرامت شاہ، منشی مختار، میر حامد حسن وغیرہ تھے۔ یہ کسان کمیٹی چند شہروں اور دیہاتوں تک ہی محدود تھیں۔ شیخ صاحب نے اپنی اِس کسان تنظیم کا باقاعدہ منشور اور لٹریچر بنا رکھا تھا جو جاگیرداری نظام کو جڑ سے اُکھاڑنے کا منشور تھا۔ ہر چند اِن کی کسان تنظیم ملک میں کوئی بڑا انقلاب برپا نہیں کر سکی تھی۔ اِس کے باوجود شیخ محمد رشید صاحب کی اپنے اِس منشور کے ساتھ وابستگی کا یہ عالم تھا اور

www.bhutto.org

اپنی کسان کمیٹی کو وہ اِس قدر اہم خیال کرتے تھے کہ اُن کا ایمان تھا کہ پاکستان میں صرف اور صرف اُن کی کسان کمیٹی اور شیخ محمد رشید ہی انقلاب برپا کر سکتا ہے۔

اِس بات میں تو کوئی شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا کہ شیخ صاحب اپنے عزم میں غیر متزلزل انسان تھے اور اپنے مقصد کے ساتھ انتہائی مخلص آدمی تھے۔ اُن کی سیاست کسانوں، مزدوروں کی ضرورت تھی مگر اُن کے اندر ایک عاشق آدمی کا دل تھا۔ اُن کی طبیعت رومانس پرست اور اُن کا دل جوان تھا۔ وہ بے حد حسن پرست تھے۔ ایک حیونات (Havenot) کی تمام فرسٹیشن اُن میں موجود تھی جس کا اظہار گاہے بگاہے اُن کی زندگی میں دیکھنے میں آتا رہتا تھا۔ اُن کا دوسرا رُخ یا اُن کی شخصیت کا دوسرا پہلو بہت عجیب وغریب تھا۔ پرلے درجے کے خوشامد پسند تھے وہ اپنی موجودگی میں خدا کی تعریف بھی مشکل سے سنتے تھے۔ اُن کی شخصیت کی یہ کمزوری بہت خطرناک تھی۔ اپنی خوشامد کے معاملے میں وہ خوشامدی کے کسی معیار وقار کے قائل نہیں تھے۔ دنیا کا کوئی بدترین انسان بھی اگر اُن کی خوشامد کرنے لگ جاتا تھا تو وہ اُن کے لئے بڑا انقلابی ہوتا تھا۔ لوگ اُن کی اِس کمزوری کو اچھی طرح جانتے تھے اور اِس کمزوری سے بہت فائدہ اُٹھایا کرتے تھے۔

اُن کی اِس کمزوری کی وجہ سے پارٹی کو اور اچھے انسانوں کو اکثر نقصان پہنچ جایا کرتا تھا۔ کوئی انسان خواہ اپنے دل میں اُن کیلئے کتنا بھی احترام رکھتا ہو۔ اُن کے ساتھ کتنی بھی محبت کرتا ہو۔ کتنا بھی با اُصول ہو، وہ ہرگز اِس آدمی کے برابر نہیں ہوسکتا تھا جو اُن کی تعریف اور خوشامد کیا کرتا تھا۔ مگر اِن تمام کمزوریوں کے باوجود شیخ صاحب اپنے دور کے اعلیٰ ترین انسانوں میں سے تھے۔ اُن کی طرح کا اپنے مشن کا دیش بھگت شاید ہی دنیا میں دوبارہ پیدا ہو۔ میں بات کر رہا تھا شیخ محمد رشید صاحب کے ساتھ اپنی پہلی ملاقات کی۔ اُن دنوں 4/A، مزنگ روڈ میں ایک تازہ ترین عمارت بنی تھی جس کے پہلے کرائے دار شیخ صاحب اور اُن کے جونیئر میاں عبدالستار نجم بنے تھے اور بعد میں یہی بلڈنگ پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا دفتر بن گئی تھی۔ بلڈنگ کے نیچے والے حصے میں شیخ صاحب کا اور نجم کا وکالت کا دفتر تھا۔ میں جب پہلے پہل شیخ صاحب کو ملنے گیا تو شیخ صاحب اپنے وکالت کے دفتر میں نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ اُس وقت اُن کی تمام کسان کمیٹی کے عہدے داران بیٹھے تھے۔ شیخ صاحب میرے بارے میں صرف اتنا جانتے تھے کہ میں شاعر ہوں۔ اُنہوں نے پہلی ہی بات میرے ساتھ یوں کی کہ ہم تو شاعر اُس کو مانتے ہیں جو کسانوں کی

www.bhutto.org

بات کرے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے اپنی کسان کمیٹی کی تعریف کرنا شروع کردی۔ وہ بولتے رہے اور میں سنتا گیا۔ اُنہوں نے نہایت مختصر وقت میں اپنی اِس کسان کمیٹی کی تمام جدو جہد کو بیان کر دیا۔ واضح رہے کہ اُن کی اِس انقلابی جماعت جس کا نام ''کسان کمیٹی'' تھا، اُس کے پنجاب میں جتنے عہدے دار بھی تھے، وہ اُس وقت وہاں موجود تھے جن کی تعداد تقریباً چھ سات آدمیوں تک محدود تھی۔ یہ تمام لوگ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ اُن میں سے کوئی بھی تعلیم یافتہ انسان نہیں تھا۔

شیخ صاحب کی کسان کمیٹی کی تمام داستان میرے لئے انتہائی غیر ضروری تھی۔ میں تو شیخ صاحب کے پاس نئی بننے والی پاکستان پیپلز پارٹی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے گیا تھا کہ اِس نئی سیاسی جماعت کا منشور کیا ہوگا۔ ہم کو اِس پارٹی کے اجلاس میں کیا کرنا ہے۔ نئی سیاسی پارٹی کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ اُس کے عہدے کس طرح کے ہوں گے۔ ایک شاعر کا اِس پارٹی میں کیا مقام ہوگا۔ میں جب بھی شیخ صاحب سے بھٹو صاحب اور پیپلز پارٹی کی بات پوچھنے کی کوشش کرتا، شیخ صاحب اپنی کسان کمیٹی کا کوئی واقعہ سنانا شروع کر دیتے۔ اُن کی کسان کمیٹی کے کسی بھی قصے سے مجھے کچھ دلچسپی نہیں تھی۔ مین اِس پہلی ملاقات میں ہی شیخ صاحب سے بے حد مایوس ہوا۔ میرے مقصد کے ساتھ اُن کی کسی بات کا کچھ تعلق نہ تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ اُن کا جونیئر میاں عبدالستار نجم اپنے وکالت کے دفتر میں آ گیا۔ مگر اُن کے ساتھ میرا تعارف نہیں تھا مگر وہ مجھے شاعر کی حیثیت سے جانتا تھا۔ اِس ملاقات میں نجم کے ساتھ مکمل تعارف ہو گیا۔

شیخ صاحب کی اور میری جاری گفتگو کے دوران وہ میری حالت زار کو ایک دم بھانپ گیا۔ نجم نے شیخ صاحب کو کہا کہ شیخ صاحب! آپ شاعر کی مشکل کو سمجھ ہی نہیں رہے۔ وہ آپ سے نئی سیاسی پارٹی کے بارے میں پوچھ رہا ہے کہ اِس نئی پارٹی کے لئے ہم نئے کارکنوں کو کیا کرنا چاہیے۔ تب کہیں جا کر شیخ صاحب نے کسان کمیٹی کا ذکر بند کیا۔ شیخ صاحب نے کہا کہ اِس نئی پارٹی میں ہر شخص کسی وفد کے ساتھ داخل ہوگا، یا گروپ کی شکل میں داخل ہوگا۔ ایک گروپ وکلاء کا ہوگا۔ ایک طالب علموں کا ہوگا۔ ایک گروپ کسانوں کا ہوگا۔ ایک گروپ مزدوروں کا ہوگا۔ ایک گروپ سیاسی کارکنوں کا ہوگا۔

شیخ صاحب نے مجھے کہا کہ تم ہماری کسان کمیٹی کے ساتھ پنڈال میں داخل ہونا۔ ہر چند شیخ

www.bhutto.org

صاحب اور میاں عبدالستار نجم کے ساتھ یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر شیخ صاحب اور نجم کی کامریڈ شپ کے انداز سے میں بے حد متاثر ہوا۔ اِس طرح شیخ صاحب اور نجم کے ساتھ میرا دوستی اور محبت کا جنم جنم کا رشتہ قائم ہو گیا۔ شیخ صاحب کی باتوں سے مجھے علم ہو گیا کہ پارٹی کے تاسیسی اجلاس میں ہر طبقے کا نمائندہ انسان ہی تقریر کرے گا۔ پارٹی کے منشور کو پیش کیا جائے گا اور اِس منشور پر کھلی بحث ہوگی اور اِس کھلی بحث کے بعد پارٹی کے منشور کو پاس کیا جائے گا۔ اِس ملاقات میں شیخ صاحب نے اپنی کسان کمیٹی کا ایک منشور نما پمفلٹ مجھے دیا جس میں اُن کی اِس تنظیم کے تمام اغراض و مقاصد کو بیان کیا گیا تھا اور جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا۔ میں چونکہ خود بھی سوشلزم کے نظام کا انتہائی دلدادہ تھا۔ اِس لئے کہ میری بنیادی تعلیم ہی ایک غیر طبقاتی نظام زندگی کے نظریات و خیال سے ہوئی تھی جس کے معلم محترم ظہیر کاشمیری جیسے سرخ پوش انسان تھے۔ لہٰذا مجھے شیخ صاحب کا منشور بے حد پسند آیا۔

میری نظم ''منشور'' اور بابا ظہیر کاشمیری

میں نے بابا ظہیر کاشمیری کے ساتھ پارٹی کے اجلاس میں شرکت کے بارے میں مشورہ کیا کہ اِس تاسیسی اجلاس میں میرا کیا کردار ہونا چاہیے۔ اُنہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ سب سے پہلے تم ایک منشور نظم کہو جس کا عنوان ہی منشور ہو۔ اِس نظم میں کھل کر کہو کہ اِس ملک میں محنت کشوں کا اور عوام کا راج ہونا چاہیے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کو مکمل طور پر ختم کیا جانا چاہیے۔ ظہیر صاحب نے کہا کہ یہ پہلا اجلاس ہی تمہاری شخصیت کی پہچان بن جائے گا۔ یہ پہلا اجلاس ہی تمہاری قیادت اور تمہاری پارٹی کی پہچان بنے گا۔ اِس اجلاس میں تمہاری قیادت کی اور تمہاری سامراج دشمنی ہی تم کو لوگوں میں مقبول بنائے گی۔ اِس پہلے اجلاس میں اپنی قیادت پر ثابت کرو کہ سوائے سوشلسٹ انقلاب کے دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اِس ملک کی تعمیر و ترقی صرف معاشی انقلاب اور زرعی انقلاب سے ہی ہو سکتی ہے۔ اِس طریقے کے ساتھ تم اپنی قیادت کو روزِ اوّل سے ہی عوامی سیاست کا پابند بناؤ۔ پاکستان کے عوام پر اور بیرونی دنیا پر جو رنگ پہلے دن تمہاری قیادت اور تمہاری جماعت کا ظاہر ہوگا، وہی رنگ تمہاری جماعت کی پہچان بن جائے گا۔ اب یہ تمہارا امتحان ہے کہ تم اپنے شاعری کے محاذ پر اِس مقصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کرتے ہو۔ بابا جی

www.bhutto.org

کے الفاظ نے میری نیندیں اُڑا دیں۔ میں ہر وقت نظم ''منشور'' کے مضمون کے خیالات ہی ذہن میں لاتا رہتا تھا۔ اس معاملے میں میری حالت کسی بچہ جننے والی عورت کی سی تھی یا کسی دیوانے کی سی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اِس اجلاس میں شرکت کرنے والے تمام لوگوں کی حالت میرے جیسی ہی ہو۔ مگر میرا گمان ہے کہ میری حالت بے حد غیر والی بات تھی۔ میرے استاد کا وہ لفظ میرے لئے ایک تازیانہ بن گیا تھا کہ یہ تمہارا امتحان ہوگا۔ ایک طرح کا میری زندگی کا یہ پہلا امتحان تھا۔ اِس پہلے امتحان پر ہی میری زندگی کا دارومدار تھا۔ اِس لئے کہ میں آج جو کچھ ہوں، اِس پہلے امتحان کی بدولت ہوں۔ میں نے اپنی نظم کی تیاری کے لئے دنیا بھر کے انقلابی شاعروں کے دیوان کھنگال مارے۔ مگر یہ مضمون اس قدر وسیع اور سپاٹ اور براہ راست تھا کہ جس کو نظم میں بیان کرنا بے حد مشکل کام تھا مگر خدا کا شکر کہ میں نے نظم منشور مکمل کر لی۔

میں نے اپنی نظم منشور سب سے پہلے ظہیر صاحب کو سنائی۔ ظہیر صاحب نے نظم سماعت فرمانے کے بعد شاباش دی اور کہنے لگے۔ جاؤ تم اپنے امتحان میں پاس ہوگئے ہو۔ ایک سیاسی جماعت کے منشور پر اِس سے زیادہ بھرپور نظم تحریر ہی نہیں کی جاسکتی۔ تمہاری یہ نظم پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا پیغام بن جائے گی۔ بابا جی کی اِس حوصلہ افزائی سے مجھ میں بے پناہ اعتماد آگیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اس نظم کو تاسیسی اجلاس سے پہلے میں کسی کو نہیں سناؤں گا۔

شیخ رشید کے بارے میں غلط افواہ

پارٹی کے کنونشن سے دو روز پہلے کی بات ہے۔ میں شیخ صفدر صاحب کے دفتر گیا۔ وہاں پر باتیں ہو رہی تھیں کہ شیخ رشید صاحب بھٹو صاحب کے خلاف بیان جاری کر رہے ہیں کہ بھٹو ایک جاگیردار ہے۔ وہ پہلے اپنی جاگیر کو کسانوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کرے۔ میں نے شیخ صفدر اور وہاں پر بیٹھے لوگوں سے کہا کہ میں نے کل ہی شیخ صاحب سے ملاقات کی تھی۔ شیخ صاحب نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ تو پارٹی کنونشن میں شریک ہونے کے لئے بڑی تیاری کر رہے ہیں۔ مجھے شیخ صفدر صاحب نے کہا کہ آفتاب ربانی اور تم شیخ رشید صاحب کے پاس جاؤ اور اُن سے اس بات کے بارے میں تصدیق کرو۔ لہٰذا میں اور آفتاب ربانی شیخ رشید صاحب کے پاس گئے۔ اتفاق سے مجھے شیخ صاحب سے پہلے عبدالستار نجم مل گیا۔ میں نے نجم کے ساتھ اِس بات کا

www.bhutto.org

ذکر کیا۔ نجم نے بتایا کہ کچھ دن پہلے جب میں شیخ رشید صاحب کو پیپلز پارٹی میں شامل ہونے پر آمادہ کر رہا تھا تو شیخ صاحب نے جاگیرداری کے خلاف بات ضرور کی تھی اور جاگیرداری کے خلاف بات کرنا اُن کا معمول ہے۔ شیخ صاحب بھٹو صاحب کے خلاف کوئی بیان دیں گے، یہ جھوٹ ہے۔ آؤ شیخ صاحب سے اس معاملے پر بات کر لیتے ہیں۔ اِس طرح شیخ صاحب سے اِس معاملے پر بات کی گئی۔ اُنہوں نے کہا کہ بات تو ٹھیک ہے کہ میں جاگیرداری کے خلاف ہوں مگر اب جب میں نے بھٹو صاحب کے ساتھ ایک نئی پارٹی بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں اِس قسم کا کوئی بیان کیسے دے سکتا ہوں۔

شیخ صاحب کی اِس وضاحت کے بعد میں اور آفتاب ربانی شیخ صفدر صاحب کے پاس گئے اور اُن کو شیخ صاحب کے خیالات سے آگاہ کیا۔ شیخ صفدر صاحب نے بھٹو صاحب کو فون پر ہی بتا دیا کہ یہ غلط خبر ہے۔ اصل میں حکومت شیخ محمد رشید کے حوالے سے غلط افواہیں پھیلا رہی تھی۔ حکومت شیخ صاحب کے پاس اپنے ایسے ایجنٹ بھیج رہی تھی جو اوپر سے سیاسی لیڈر بنے ہوئے تھے مگر اندر سے خفیہ ایجنٹ تھے۔ وہ شیخ صاحب کی جاگیرداری دشمنی کو ایکسپلائٹ کر کے کنونشن سے پہلے ہی ہنگامہ کھڑا کرنا چاہتی تھی جس میں حکومت کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

بھٹو صاحب کے ہوٹل کے کمرے میں پارٹی کی تشکیل و تکمیل کی تیاریاں بہت زوروں پر جاری تھیں۔ بہت سارے لوگ پس پردہ اِسی تیاری میں شریک تھے جن میں حنیف رامے، ڈاکٹر مبشر حسن اور ایک سرکاری ملازم چوہدری لطیف ایس۔ ای بہت پیش پیش تھے۔ میں بہت حیران ہوتا تھا کہ ایک سرکاری ملازم کس طرح حکومت وقت کے خلاف وجود میں آنے والی ایک ایسی پارٹی کے منشور کی دستاویزات کو ٹائپ کرنے یا کرانے میں مصروف ہے جو اُس حکومت کو ختم کرنے کے لئے وجود میں آ رہی ہے۔ اس شخص کی بھاگ دوڑ میرے لئے آج بھی معمہ ہے۔

بھٹو صاحب کے کمرے میں وفود کے نام تحریر کئے جا رہے تھے۔ جن وفود نے اجلاس میں شرکت کرنا تھی۔ وہاں آفتاب ربانی اپنا نام مزدوروں کی ایک یونین کے لیڈر کے طور پر تحریر کروا رہا تھا۔ اُس کے بعد طالب علموں کے وفد میں شامل طالب علموں کے نام تحریر کیے گئے۔ ان ناموں میں امان اللہ خان، ادریس کھٹانہ، راشد بٹ، افتخار فتنہ، ظفر یاب، جہانگیر بدر، احمد رضا اور بہت سارے دوسرے طالب علم تھے۔ میرا نام پارٹی کے شاعر کی حیثیت سے تحریر کیا گیا تھا اور مجھے شرکت

www.bhutto.org

کے لئے باقاعدہ تحریری دعوت نامہ دیا گیا۔ جس دعوت نامے میں تحریر تھا کہ آپ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی رکن کی حیثیت سے پارٹی کے تاسیسی اجلاس میں ایک شاعر کی حیثیت سے شرکت کریں۔

خواتین و حضرات! دعوت نامے کے اِس کاغذ کے ٹکڑے اور اُس پر لکھے گئے چند الفاظ پر ہی میں نے اپنی زندگی کی بھینٹ چڑھا دی۔ میں نے اپنی زندگی اِس پارٹی کے لئے وقف کردی۔ آج میں سوچتا ہوں کہ میں نے اپنے نظریات و تصورات اور اپنے آدرش کے مقابلے میں زندگی کو کس قدر کم تر جانا تھا۔ بقول حافظ شیرازی۔

ولم زحلقہ زلفش بجاں خرید آشوب

چہ سود دید نہ دانم کہ ایں تجارت کرد

ترجمہ: ''اُس کی سیاہ زلفوں کے حلقے سے دل نے تمام دردوں کا سودا کرلیا۔ تمام دکھ خرید لئے۔ نجانے دل نے کیا نفع دیکھا تھا جو یہ کاروبار کیا تھا۔''

پاکستان پیپلز پارٹی کا یوم تاسیس

بالآخر 30 نومبر 1967ء کا دن آ گیا۔ اس تصور کو غلط نہیں کہا جا سکتا کہ قوموں کی زندگی میں کچھ ایسے دن اور ایسی تاریخیں آتی ہیں جو اُن کی زندگی کی تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جن سے قوموں کی تاریخ تبدیل ہو جاتی ہے۔ اُن کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ 30 نومبر 1967ء کا دن بھی ایسا ہی ایک دن تھا جس نے پاکستان کی سیاست اور قیادت کا انداز ہی بدل ڈالا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔ ایک نئی سوچ نے جنم لیا تھا۔ ایک نئے نظریے کی ابتدا ہوئی تھی۔ خصوصاً مغربی پاکستان میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار عوامی سیاست کی بنیاد ڈالی گئی تھی اور ایک نئی سیاسی تنظیم نے سائنٹفک بنیادوں پر اپنے اغراض و مقاصد کا اعلان کیا تھا اور اِس نئی سیاسی تنظیم کا نام ''پاکستان پیپلز پارٹی'' رکھا گیا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں ایک نئی قومی ہنگامہ خیز قیادت اُبھر کر سامنے آئی تھی اور اِس قیادت کے پیروکاروں کی شکل میں سیاسی کارکنوں اور عوامی دانشوروں کی ایک نئی کھیپ پاکستان کی سیاست میں نمودار ہوئی تھی۔ جن کے نعروں اور جن کے قوم کے ساتھ سچے عشق نے پاکستانی قوم میں پہلی مرتبہ عزت اور عظمت کا احساس پیدا کیا تھا۔ قوم کو پہلی مرتبہ اپنے تشخص کا ادراک ملا تھا۔

اس نئی پارٹی کی شکل وصورت مسلم لیگ کی طرح نہ تھی۔ جس کا نعرہ تھا کہ " لے کے رہیں گے پاکستان "۔ وہ پارٹی یا اُس کے کارکن اتنا جانتے ہی نہیں تھے کہ پاکستان لے کر بعد میں کیا کرنا ہے۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی ایک ایسی سیاسی جماعت تھی جس کے ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن اور ایک جاہل کارکن کا بھی اِس بات پر ایمان تھا کہ یہ پارٹی غریبوں کی پارٹی ہے اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف پارٹی بنائی گئی ہے اور ذوالفقار علی بھٹو غریب عوام کا قائد ہے اور پاکستان کے تمام ظالموں اور قاتلوں کے خلاف میدان عمل میں آیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لوگوں کو سوشلزم سے واقفیت نہ ہو۔ وہ اپنے اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے انقلابی فلسفے سے واقف نہ ہوں۔ مگر یہ بات عوام کا ایمان بن گئی کہ بھٹو غریبوں کا لیڈر ہے۔ لوگ بھٹو صاحب کے ساتھ اپنی اِس پہچان کو ہی زندگی کے تمام مسائل کا حل تصور کرتے تھے۔ نبوت ہو یا قیادت، اِس کا ثبوت ہی یہ ہوتا ہے یہ عوام الناس کے لئے وجود میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کے خلاف ہمیشہ بڑے لوگوں، سرداروں، سرمایہ داروں، وڈیروں، بادشاہوں، فوجی سپہ سالاروں نے ہی محاذ آرائی کی تھی۔ ہر رسول کی جنگ برسر اقتدار ظالموں، سرداروں کے ساتھ ہی ہوئی تھی اور ہر نبی کو ماننے والے ہمیشہ غریب اور نادار، فاقہ کش لوگ ہی ہوا کرتے تھے۔ ڈاؤن ٹراڈن ہی ہوا کرتے تھے جن کو اُن کے وقت کے حکمران کم تر درجے کی مخلوق خیال کیا کرتے تھے۔ جن کو اپنے غلام تصور کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب مکے کے سرداروں نے بلال حبشیؓ کو رسول پاکؐ کے نعرے مارتے دیکھا تو اُن کے غیظ وغضب کی انتہا نہ رہی تھی۔ یہ دنیاوی قیادتیں ہر چند نبوت کا درجہ نہیں رکھتیں مگر یہ قیادتیں نبوت کی سنت کی پیروکار ہوتی ہیں۔ اِن قیادتوں کا وظیفہ نبوت کی سنت کی پیروی ہوتا ہے۔ جو دنیاوی لیڈر اِس سنت کی سچے دل سے پیروی کرتا ہے، وہ اتنا ہی زیادہ مقبول ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رہے کہ اِس طرح کی قیادتوں کے راستے مشکلات سے پُر ہوتے ہیں۔ خطرات سے پُر ہوتے ہیں۔ اور جو قیادت اپنے امتحانات میں کامیاب ہو جائے، وہ امر ہو جاتی ہے۔

مجھے آج بھی یاد آرہا ہے کہ کنونشن کے دن اُس کنونشن میں شرکت کرنے والا ہر انسان اپنی قیادت کے نشے سے مست الست تھا۔ ہر انسان کی ذہنی کیفیت ایک تھی۔ دل ایک تھے۔ وہ سب ایک ہی طرح کی سوچ رکھتے تھے۔ اُن سب کے دل ودماغ اور خیالات وتصورات کا ایک ہی رنگ تھا۔ گویا اُس دن پاکستان پیپلز پارٹی کی شکل میں ایک نئی قوم نے جنم لیا تھا اور ذوالفقار علی بھٹو کی

www.bhutto.org

شکل میں ایک نئی سیاسی قیادت پیدا ہوئی تھی۔

کنونشن کے دن میں شیخ سرور اقبال کے ساتھ صبح سویرے ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر واقع مین بلیوارڈ گلبرگ پہنچ گیا۔ میں نے اور کچھ دوسرے لوگوں نے پنڈال کے دروازے یعنی داخل ہونے والے ہر دروازے پر کھڑے ہوکر ہر آنے والے کا استقبال شروع کرنا شروع کر دیا۔ اُن کو خوش آمدید کہنا شروع کیا۔ میرا یہ عمل کسی کے کہنے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ ایک رضا کارانہ قسم کا عمل تھا۔ یقین کیجیے مجھے ہر آنے والے انسان کی آنکھوں میں ایک چمک دکھائی دیتی تھی جس کو ایک عزم کہا جا سکتا ہے۔ لوگوں کی حالت نارمل نہ تھی۔ اُن کے چلنے کا انداز مختلف تھا۔ سوائے چند سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگوں کے باقی ہر شخص اس کنونشن میں کوئی کردار ادا کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کنونشن میں تمام وہ لوگ آئے تھے جو کچھ وقت گزرنے کے بعد بڑے دانشور سیاست دان، اعلیٰ پائے کے سیاسی کارکن، سماجی ادیب اور نامور قانون دان ثابت ہوئے۔

یہ کنونشن اُن کی سیاسی زندگی کی ابتدا تھی۔ کچھ پرانے سیاسی کارکن بھی اس کنونشن میں شریک ہوئے تھے جن کے نام و چہرے لوگ جانتے تھے۔ افسوس صد افسوس کہ وہ اِس انسانوں کے شفاف سمندر میں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے اور بہت جلد اپنے پرانے سیاسی تالابوں میں اور جوہڑوں میں واپس چلے گئے تھے۔

اِس عظیم تاریخی کنونشن میں شریک تمام مندوبین یا خواتین وحضرات کو میں پاکستان کے عظیم ترین لوگ تصور کرتا ہوں۔ اُن کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ خواتین میں بیگم آباد احمد خان، بیگم راجہ غالب احمد کو میں سلام پیش کرتا ہوں۔ مردوں میں مجھے آج صرف چند نام یاد آرہے ہیں جو اس محفل میں شریک ہوئے تھے۔ (1) جے۔ اے۔ رحیم، (2) شیخ محمد رشید، (3) خورشید حسن میر، (4) ملک حامد سرفراز، (5) شیخ صفدر علی، (6) معراج محمد خان، (7) میاں عبدالستار نجم، (8) احسان وائیں، (9) فاروق بیدار، (10) شیخ سرور اقبال، (11) ملک آفتاب ربانی، (12) ڈاکٹر حلیم رضا، (13) ادریس کھٹانہ، (14) خالد چوہدری، (15) میاں محمد اسلم، (16) امان اللہ خان، (17) جہانگیر بدر، (18) احمد رضا قصوری، (19) ملک پرویز اختر، (20) رسول بخش تالپور، (21) ملک اسلم حیات، (22) میر حامد حسن، (23) ممتاز کاہلوں، (24) حیات محمد خان شیر پاؤ، (25) پیر بخش بھٹو، (26) عبدالرزاق سومرو وغیرہ شامل تھے۔

www.bhutto.org

یہاں پر میں خصوصی طور پر تحریر کرنا چاہتا ہوں کہ طالب علم لیڈر افتخار فتنہ اور ظفریاب (مرحوم) دونوں کی ڈیوٹی مندوبین سے باقاعدہ داخلہ فیس حاصل کرکے ان کو پنڈال میں بھیجنے کی تھی۔ مصطفےٰ کھر جو اس وقت کنونشن لیگ کے ایم۔این۔اے تھے وہ پنڈال سے باہر پنڈال میں داخل ہونے والے گیٹ تک جب آئے تو افتخار فتنہ نے ان سے داخلہ فیس کا مطالبہ کر دیا۔ ملک مصطفےٰ کھر نے کہا کہ میں تو شرکت کرنے نہیں آیا میں تو انتظامات وغیرہ دیکھنے آیا ہوں۔

میں ایک بات یہاں واضح کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اِس تاسیسی اجلاس میں جو ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر منعقد ہو رہا تھا، خود ڈاکٹر مبشر حسن، محترم حنیف رامے، محترم غلام مصطفےٰ کھر، محترم ممتاز بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، غلام مصطفےٰ جتوئی، ملک معراج خالد، اِن میں سے کوئی بھی اِس کنونشن میں شریک نہیں ہوا تھا۔ یہ تمام شیرِ سندھ اور شیرِ پنجاب پس پردہ تھے۔ پردہ راز میں تھے۔ اِس عظیم اور مقدس کنونشن میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکے تھے۔ اِس حوالے سے اِن محترمین کو پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی اراکین میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ پاکستان پیپلز پارٹی میں مقتدی کی حیثیت تو ضرور رکھتے ہیں، متبدی ہرگز نہیں تھے۔ بانی اراکین اُن کو ہی کہا جائے گا جو کھلے بندوں اِس کنونشن میں شریک ہوئے تھے۔ زندگی اور وقت کی کوئی مصلحت جن کو کنونشن میں شرکت سے نہیں روک سکی تھی۔

کنونشن میں شرکت نہ کرنے والے مقتدیوں کے ذہن میں یہ خوف تھا کہ اِس کنونشن میں شرکت کرنے والوں پر ایوب خان کی حکومت کا قہر نازل ہو جائے گا۔ کوئی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایوب حکومت نے بے حد خوف و ہراس پھیلا رکھا تھا مگر اس تاسیسی اجلاس میں شرکت کرنے والے تمام لوگ اپنی روحانی قوت کے ساتھ مجذوب ہو چکے تھے۔ وہ ہر طرح کے خوف و خطرے سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہ کنونشن کامیاب ہو گیا اور کوئی قیامت برپا نہ ہو سکی۔ کسی کے سر پر آسمان نہ گر سکا۔ بقول شاعر سیف الدین سیف:

حشر کے بعد بھی دیوانے ترے پوچھتے ہیں
وہ قیامت جو گزرنی تھی کہاں گزری ہے

www.bhutto.org

تمام مندوبین اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھتے گئے۔ پنڈال کا ماحول کوئی شاہانہ ہرگز نہ تھا۔ بے حد سادہ تھا۔ سر پر ایک تنبو اور چار کناتیں تھیں۔ سادہ سی کرسیاں تھیں۔ ایک نمایاں سٹیج بنائی گئی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام بہت اچھا کیا گیا تھا۔ مندوبین کو پانی پلانے کا کام ورکروں کے سپرد تھا۔ یہ تمام کام رضا کارانہ تھا۔ اِس کے لئے کسی قسم کی ہدایات وغیرہ کسی کو نہ دی گئی تھیں۔ اِس لئے کہ اس پنڈال کا تو منتظم ہی کوئی نہیں تھا۔ بس ڈاکٹر صاحب نے جگہ دے دی تھی باقی تمام پنڈال اس کنونشن کا منتظم تھا۔ میں دو دن ایک رضا کار کی طرح پنڈال میں ڈیوٹی دیتا رہا تھا۔

خورشید حسن میر بطور سٹیج سیکرٹری

تقریباً 10 بجے کے قریب جناب خورشید حسن میر مرحوم نے چند لوگوں کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ اُن میں پہلا نام اُنہوں نے شیخ محمد رشید کا لیا، دوسرا نام ملک حامد سرفراز کا لیا۔ تیسرا نام ملک اسلم حیات کا لیا۔ یاد رہے کہ اِس کنونشن کا کنوینر ملک اسلم حیات کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ تینوں حضرات سٹیج پر جا کر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اِس کے ساتھ ہی ذوالفقار علی بھٹو صاحب جے۔ اے۔ رحیم اور رسول بخش تالپور کے ساتھ پنڈال میں تشریف لے آئے۔ پورا پنڈال نعروں اور تالیوں سے گونج اُٹھا۔ ہر کوئی دیوانہ وار ایک ہی نعرہ لگا رہا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد۔ بھٹو صاحب نے سٹیج پر کھڑے ہو کر تالیوں کے ساتھ مندوبین کیلئے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ پنڈال میں موجود جب تمام لوگ بھٹو صاحب کو قریب سے دیکھ کر مطمئن ہو گئے تو بھٹو صاحب اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔ اِس کے ساتھ ہی تلاوت قرآن مجید کرائی گئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد خورشید حسن میر نے پروگرام کے مطابق میرے نام کا اعلان کیا کہ اب ہماری پارٹی کے شاعر اسلم گورداسپوری آپ کو اپنا تازہ کلام سنائیں گے۔ میں نے مائیک پر جا کر تمام حاضرین کو اِس نئی سیاسی پارٹی اور اِس کی بنیاد رکھنے پر مبارک باد پیش کی۔ بھٹو صاحب کو مبارکباد دی کہ اُنہوں نے پاکستان کی تاریخ میں ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھ کر ایک نئے دور اور ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ میں بھٹو صاحب کی اور آپ سب کی کامیابی کی دُعا کرتا ہوں۔ اِس مختصری تقریر کے بعد میں نے بھٹو صاحب کو مخاطب ہو کر کہا بھٹو صاحب! میری نظم کا عنوان ہے ''منشور''۔

www.bhutto.org

میری یہ نظم ایک ترقی پسند سوشلسٹ جماعت کے آئین، دستور اور منشور کا کلاسیکل شاہکار تھی۔ جس میں ایک سوشلسٹ اور مارکسٹ پارٹی کے پروگرام کا اعلان تھا۔ نظم کی زبان بے حد عام فہم رکھی گئی تھی تا کہ عام آدمی اِس کو سمجھ سکے۔ نظم کے ہر شعر پر مندوبین نے اپنی تالیوں سے اپنی تائید کا اظہار کیا۔ پنڈال میں ایک اَنقلابی فضا کا سماں پیدا ہو گیا۔ جب میں اِس نظم کے اُس بند کو پڑھنے لگا جس میں، میں نے جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کا اعلان کرنا تھا تو میں نے بہت انقلابی انداز میں بھٹو صاحب کو مخاطب ہو کر کہا۔

''بھٹو صاحب سے معذرت کے ساتھ''

میرا بھٹو صاحب کو اتنا کہنا تھا کہ پنڈال میں بے پناہ جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ جب میں نے نظم کے بند کا پہلا مصرع پڑھا۔

زمینداروں وڈیروں تمہاری جاگیریں
غریب و محنتی دہقان کو بانٹی جائیں گی

چونکہ بھٹو صاحب خود جاگیردار تھے، جس کی وجہ سے میں نے اُن سے کہا تھا کہ سر آپ سے معذرت کے ساتھ۔ اُدھر جب میں نے یہ بند پڑھا تو پورا پنڈال اپنی نشستوں سے اُٹھ کر تالیاں بجانے لگ گیا۔ پنڈال کے اِس جوش و خروش کا مقصد جاگیرداری نظام کو مسترد کرنے کا اعلان تھا۔

بھٹو صاحب اِس ساری صورتحال کو ایک خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ انجوائے کرتے رہے۔ بعد میں اُنہوں نے اپنی تقریری میں میرے معذرت لفظ کا جواب تفصیل کے ساتھ دیا۔ جاگیرداری کے خلاف شعر پڑھنے پر شیخ محمد رشید صاحب نے سٹیج پر کھڑے ہو کر تالی بجا کر مجھے داد دی۔ بھٹو صاحب شیخ محمد رشید کو تالی بجاتے دیکھ کر مسکراتے رہے۔ اِس طرح نظم ''منشور'' کو میری توقعات سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ پنڈال نے نعرے لگائے۔

''اسلم گورداسپوری زندہ باد!''

اس نظم کی وجہ سے پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہونے والے تمام لوگ مجھے ایک انقلابی اور ترقی پسند سوشلسٹ انسان تصور کرنے لگ گئے۔ پارٹی میں پہلے دن سے لے کر آج تک پارٹی کے لوگوں میں میرا یہی تشخص قائم ہے۔

''اسی ہی فقیری میں میں ہوں امیر''

www.bhutto.org

نظم ''منشور''

مِلوں کے مالکو، محلوں کے وارثو سُن لو
زمینِ پاک کے خونی سوداگرو سُن لو
وزیرو، شاہو، رئیسو، ستمگرو سُن لو
سیاسی لیڈرو ملّت کے تاجرو سُن لو

○

تمہارے عہدِ سیاست کے زخم خوردہ عوام
تمہاری سطوت و ہیبت کا سر اتاریں گے
تمہارا نشہء دولت اڑا کے دم لیں گے
تمہارا قوم کی تقدیر کو سنواریں گے

○

تمہارے محل بھی غربت سے آشنا ہوں گے
تمہارے پاؤں بھی کھیتوں میں چلنا سیکھیں گے
تمہارے ہاتھ بھی محنت کے بیج بوئیں گے
تمام لوگ برابر حقوق رکھیں گے

○

وہ کوہ نور ہو، بیکو ہو یا گندھارا ہو
یہ دس کروڑ کا حصہ ہے ایک دو کا نہیں
ٹرانسپورٹ ہو ریلیں ہوں، یا ہوائی جہاز
یہ ساری قوم کا حصہ ہے چار سو کا نہیں

○

یہ سینما ہال، یہ بنگلے، یہ خوشنما ہوٹل
بتاؤ کن کی بدولت یہ جگمگاتے ہیں
زمین کن کی بدولت اناج دیتی ہے
یہ کھیت کن کی تمنا پہ لہلہاتے ہیں

www.bhutto.org

○

تم ان کے خُون کو ارزاں خیال کرتے ہو
کہ جن کے خُوں سے تمہاری حیات روشن ہے
کہ جن کے ہاتھ سے دن بھر مشینیں چلتی ہیں
کہ جن کے دم سے سیاہ فام رات روشن ہے

○

زمیندارو، وڈیرو، تمہاری جاگیریں
غریب و محنتی دہقاں کو بانٹی جائیں گی
بلند و پست کے جھگڑے کو ختم کر دیں گے
خدا نے چاہا تو وہ ساعتیں بھی آئیں گی

○

بہار سارے چمن کو، گُلوں سے بھر دیگی
ہر ایک گھر میں چراغوں کی روشنی ہوگی
ہر ایک شخص کو روٹی ملے گی عزت کی
ہر ایک فرد کی خوش حال زندگی ہوگی

○

ابھی تو بحرِ ستم ہم کو پار کرنا ہے
ابھی خزاں کو بدل کر بہار کرنا ہے
ابھی تو ہم پہ ستم کے ہزار پہرے ہیں
ابھی تو دامنِ شب تار تار کرنا ہے

○

ہمارے عہدِ مساوات کے تصور میں
جلالِ افسرِ شاہی کا کچھ وقار نہیں
ہمارے دورِ اخوت میں سب برابر ہیں
کوئی غلام نہیں، کوئی تاجدار نہیں

○

www.bhutto.org

خورشید حسن میر صاحب نے سب سے پہلے مجھے شاعرِ عوام کا خطاب دیتے ہوئے بہت اچھے الفاظ سے میری تعریف کی۔ اِس کے بعد اُنہوں نے مندوبین میں ایک کتابچہ تقسیم کرنے کا کہا۔ یہ کتابچہ بھٹو صاحب کا تحریر کردہ تھا۔ جس کا عنوان تھا۔

''ایک نئی سیاسی پارٹی کیوں بنائی جارہی ہے''

جب یہ دستاویز کی شکل کا کتابچہ مندوبین میں تقسیم کر دیا گیا تو میر خورشید حسن نے مائیک پر آ کر مندوبین کو کتابچہ پڑھ کر سنانا شروع کر دیا۔ یہ کتابچہ پاکستان پیپلز پارٹی کا گویا حرفِ آغاز تھا یا اِس کو اِس نئی سیاسی پارٹی کی ابتدائی دستاویز کہا جاسکتا تھا۔ اِس کتابچے میں انتہائی مہارت کے ساتھ ایک نئی سیاسی پارٹی کی ضرورت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہ کتابچہ ایک طرح کا پارٹی منشور ہی تھا۔ یہ کتابچہ اُس وقت کی پاکستان کی سیاسی اور معاشی صورتحال کا مکمل طور پر احاطہ کئے ہوئے تھا۔ اِس کتابچے کو خورشید حسن میر نے بڑی عمدگی کے ساتھ اور بڑے جذبے کے ساتھ سامعین کو پڑھ کر سنایا۔ کتابچے کی عبارت پر لوگوں نے بار بار تالی بجا کر اِس کتابچے کی تائید اور قبولیت کا اظہار کیا تھا۔ کتابچہ پڑھنے کے بعد ابتدائی تقریر کیلئے ملک حامد سرفراز کا نام پکارا گیا۔ ملک حامد سرفراز نے پاکستان کی ماضی کی سیاسی تاریخ پر روشنی ڈالی اور ایک نئی سیاسی پارٹی ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کے وجود میں آنے کی ضرورت کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا اور بھٹو صاحب کو اِس پارٹی کی بنیاد رکھنے پر مبارکباد دی اور خراجِ تحسین پیش کیا۔ ملک حامد سرفراز کے بعد پنجاب بھر کے آئے ہوئے مندوبین کے نمائندوں کو تقریریں کرانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

بھٹو صاحب کو پارٹی کا چیئرمین منتخب کر لیا گیا

تقریروں کا سلسلہ تمام دن چلتا رہا۔ اِس کنونشن کے دو سیشن تھے۔ پہلے سیشن اور دوسرے سیشن کے درمیان کھانے کا وقفہ تھا۔ دوسرے سیشن کے آخر میں بھٹو صاحب کی صدارتی تقریر تھی۔ پہلے سیشن میں چند تقریروں کے بعد سب سے پہلا ریزولوشن سب سے پہلی قرارداد مندوبین کی منظوری کیلئے ایک جمہوری قاعدے کے ساتھ یہ پیش کی گئی۔ جس کا متن یہ تھا۔ آج ہم سب لوگ مل کر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ رہے ہیں اور اِس پارٹی کا متفقہ طور پر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو چیئرمین منتخب کرتے ہیں۔ کیا یہ قرارداد آپ سب خواتین و حضرات کو منظور ہے۔ اِس قرارداد کی

تائید کے لئے تمام مندوبین اپنی نشستوں پر کھڑے ہوگئے اور سب نے ایک ہی آواز اور ایک ہی جذبے کے ساتھ بلند آواز میں اعلان کیا کہ ہم منظور کرتے ہیں۔ اِس منظوری کے ساتھ ہی پنڈال میں نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ چیئرمین بھٹو زندہ باد، پاکستان پیپلز پارٹی زندہ باد۔ اِس طریقے کے ساتھ ایک مکمل جمہوری اُصولوں کے مطابق بھٹو صاحب کو پارٹی کا چیئرمین تسلیم کرلیا گیا۔ چیئرمین بھٹو کے انتخاب کے بعد تمام مندوبین نے متفقہ رائے کے ساتھ مسٹر جے۔ اے۔ رحیم کو پارٹی کا سیکرٹری جنرل منتخب کرلیا اور خورشید حسن میر کو ڈپٹی سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔

پارٹی کے پہلے کنونشن میں دو طالب علم لیڈروں نے بھی تقریریں کی تھیں۔ ایک طالب علم لیڈر امان اللہ خان اور دوسرا طالب علم لیڈر احمد رضا تھا۔ پارٹی کے اِس تاسیسی اجلاس میں سب سے مضحکہ خیز اور انتہائی واہیات تقریر احمد رضا کی تھی۔ اُس نے اپنی تقریر میں لینن کی کوٹیشن کے مقابلے میں اپنی کوٹیشن گھڑنے کی کوشش کی تھی۔ لینن کی کوٹیشن یہ تھی کہ ''لوگو! تم انقلاب کی تحریک میں عملی طور پر شریک ہو جاؤ۔ اِس تحریک میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تم اِس انقلابی تحریک میں سوائے اپنے پاؤں میں پڑی ہوئی غلامی کی زنجیروں کے اور کچھ ضائع نہیں کرو گے۔ تمہارے پاس سوائے غلامی کے کھونے کو کچھ نہیں ہے۔

احمد رضا نے کوٹیشن گھڑی۔ اُس نے طالب علموں کو پاکستان میں حصہ لینے کے لئے کہا کہ ''طالب علم سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اُن کا سوائے اُن کی تعلیم کے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اُن کی کتابیں کھونے کے علاوہ اور اُن کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

یہ کوٹیشن کہاں تھی۔ یہ تو ایک قسم کی بکواس تھی۔ بہت بڑا اُس وقت کا مذاق تھا۔ پورے پنڈال نے ہوٹنگ کے انداز میں تالیاں بجانا شروع کردیں۔ ہر طرف لوگ قہقہے لگانے لگ گئے۔ بڑی دلچسپ صورتحال پیدا ہوگئی۔ اِس طرح اُس شخص کے پہلے دن کا امپریشن ہی لوگوں میں ایک پاگل آدمی کا ظاہر ہوا۔ ایک شیلو آدمی دکھائی دیا۔ ایسا آدمی جو اپنی سستی شہرت کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہو۔

پاکستان پیپلز پارٹی میں اِس شخص کے اِس پہلے روز کے تعارف کی وجہ سے پارٹی میں اِس شخص کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا تھا۔ یہ ایک لافنگ قسم کی چیز تھا۔ آج بھی میرے ذہن میں اِس کا یہی خاکہ موجود ہے جس کا میں نے اظہار کیا ہے۔ اِس کے بعد مزدور راہنما میر حامد حسن کی تقریر کرائی گئی تھی۔

www.bhutto.org

شیخ سرور اقبال کے منہ پر آفتاب ربانی کا تھپڑ

پہلے سیشن کے ختم ہونے کے بعد کھانے کا وقفہ کیا گیا تھا۔ پنڈال کے باہر کوٹھی کے پچھلے حصے میں مندوبین کے لئے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جس کا انچارج شیخ صفدر علی اور شیخ سرور اقبال تھا۔ لوگوں کو اعلان کر کے کہا گیا کہ اُن کے لئے پنڈال سے باہر کھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ مہربانی فرما کر آپ سب لوگ کھانا کھانے کے لئے پنڈال سے باہر تشریف لے جائیں۔ میں اُس قنات کے اندر گیا جہاں کھانا رکھا ہوا تھا۔ وہاں پر آفتاب ربانی کے کارکن سب سے پہلے کھانا حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شیخ سرور اقبال نے اُن کو روکا اور کہا کہ تم لوگ بھی باہر میزوں پر جا کر دوسرے لوگوں کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ ربانی کا ایک ورکر بھاگ کر ربانی کے پاس گیا۔ اُس کو کہا کہ سرور اقبال ہم کو کھانا نہیں دیتا۔ ربانی نے آتے ہی شیخ سرور اقبال کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے اپنے لڑکوں کو کہا۔ لو جتنا کھانا تم لینا چاہتے ہو، کون تم کو روک سکتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ شیخ سرور اقبال ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور اِن لوگوں نے اپنی مرضی کے مطابق سب سے پہلے کھانا حاصل کر لیا۔ شیخ سرور اقبال کے منہ پر تھپڑ کوئی اتفاقی بات نہ تھی۔ دراصل حکومت کسی نہ کسی طریقہ سے کنونشن میں کوئی ہنگامہ کرنا چاہتی تھی۔ کنونشن کے اندر چونکہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہاں پر کسی قسم کا ہنگامہ کھڑا کرنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا پنڈال کے باہر ہنگامہ کرانے کی کوشش کی گئی۔ شیخ سرور اقبال اِس صورتحال کو تاڑ گیا تھا۔ اُس نے ربانی کو بڑی محبت کے ساتھ اپنے ساتھ کھانے میں مصروف کر لیا۔ اِس طرح یہ بدمزگی مزید طول نہ پکڑ سکی۔ اُس کو میں نے کہا کہ آپ نے اچھا کیا۔ اِس کو آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ کہنے لگا کہ یہ سی۔ آئی۔ ڈی کا کام ہے۔ یہ ہنگامہ کرانا چاہتی ہے۔ لڑائی کرنا چاہتی ہے۔ چند لوگوں کا کسی بہانے سے کنونشن سے بائیکاٹ کرانا چاہتی ہے۔ مجھے تھپڑ اسی لئے مارا گیا ہے کہ میں یا میرے ساتھی کسی ردِعمل کا اظہار کریں تا کہ لڑائی اور ہنگامہ آرائی کی صورت حال پیدا ہو جائے۔ تا کہ کل سرکاری اخباروں میں خبریں شائع کرائی جا سکیں کہ کنونشن ہنگامہ آرائی کی نظر ہو گیا۔

شیخ سرور اقبال کے تحمل کی وجہ سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ کھانے کے وقفے کے بعد معراج محمد خان کی تقریر کرائی گئی۔ معراج محمد خان کے بعد ملک اسلم حیات نے تقریر کی۔ اُن کے بعد شیخ

محمد رشید نے تقریر کی۔ شیخ صاحب کی تقریر کے بعد کنونشن کے پہلے اجلاس کی آخری صدارتی تقریر بھٹو صاحب نے کی۔ چیئرمین بھٹو نے تمام مندوبین کا شکریہ ادا کیا کہ اُنہوں نے ایک جمہوری اُصول کے مطابق متفقہ رائے کے ساتھ آج ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھی ہے اور اُن کو اس پارٹی کا چیئرمین منتخب کیا ہے۔

چیئرمین بھٹو نے اِس تاسیسی اجلاس میں ایک تاریخی تقریر کی۔ اُنہوں نے کہا کہ پاکستان برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے خوابوں کا گہوارہ تھا۔ پورے عالم اسلام نے اِس ملک کو اپنی قوت اور طاقت کا مرکز قرار دیا تھا۔ اس کو اسلام کا قلعہ قرار دیا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے پاکستان کے تصور کو اپنی آرزوؤں اور اپنی خواہشوں اور اُمنگوں سے پروان چڑھایا تھا۔ تب جاکر پاکستان وجود میں آیا تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ پاکستان میں لوگ ایک آزادی کی زندگی بسر کریں گے۔ پاکستانی قوم ایک ترقی یافتہ قوم ہوگی۔ ایک پائیدار قوم ہوگی۔

یہ نیا ملک انسانیت کے اعلیٰ معیار کا اور روایات کا ملک ہوگا۔ افسوس کہ پاکستان اپنی ابتدا میں ہی اپنی اندرونی کمزوریوں کا شکار بنا دیا گیا۔ اقتدار کی جنگ کا اکھاڑہ بنا دیا گیا جس کی وجہ سے پاکستان ایک فلاحی مملکت نہ بنا۔ پاکستان ایک غربت گاہ بن گیا۔ مظالم کا اڈہ بن گیا۔ معاشی اور سماجی ناانصافی کا شاہکار ملک بنا دیا گیا جس کا دستور کرپشن بن گیا۔ آج پاکستان کی محکوم قوم اقوامِ عالم میں سب سے غریب قوم ہے۔ سب سے کم تعلیم یافتہ قوم ہے۔ ایک بیمار قوم ہے۔ ہر حالت میں ایک غیر تندرست قوم ہے۔ صحت کے اعتبار سے، سیاست کے اعتبار سے، معیشت کے اعتبار سے، علم کے اعتبار سے، تعلیم کے اعتبار سے، ہر طرح سے ایک بیمار قوم ہے۔ ہم کو اِس کا علاج کرنا ہے۔ نئی پارٹی بنانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم کو اصل پاکستان بنانا ہے۔

حکمرانوں کے ظلم کا علاج کرنا ہے۔ استحصالی طبقوں کی بددیانتی کا علاج کرنا ہے۔ سرمایہ داروں، جاگیرداروں، منافع خوروں، ملاوٹ کرنے والوں، مہنگائی کرنے والوں کا علاج کرنا ہے۔ جرائم کا علاج کرنا ہے۔ غربت کے لگائے ہوئے زخموں کا علاج کرنا ہے۔ ناانصافی کا علاج کرنا ہے۔ عدالتوں کے بیمار نظام کا علاج کرنا ہے۔ غیر آئینی حکومتی نظام کی بیماری اور لعنت کا علاج کرنا ہے۔ ملک کی بیمار معیشت کا علاج کرنا ہے۔ انسانی بیماریوں کا علاج کرنا ہے۔ جہالت کی بیماری کا علاج کرنا ہے۔ کرپشن کا علاج کرنا ہے۔ توہم پرست کا علاج کرنا ہے۔

www.bhutto.org

بے لگام حکمرانوں کی حکمرانی کا علاج کرنا ہے۔اُن کے خوف ودہشت کا علاج کرنا ہے۔
آج تک پاکستان کی ہر حکومت مراعات یافتہ طبقوں کے حقوق کا تحفظ کرتی چلی آرہی ہے۔ یہاں جو حکومت بھی آتی ہے، امیروں کے تحفظ کو آتی ہے۔ اِس طبقے کے مفادات کے تحفظ کیلئے آتی ہے۔جس کے پاس سب کچھ موجود ہے۔اُس کو تبدیل کر کے اب ایسا نظام لانا ہے جو سب کو تحفظ دے۔ یہاں پر اب یہ فیشن عام ہوگیا ہے کہ جو شخص اِن غیر آئینی حکمرانوں کے اقتدار کو چیلنج کرے، اُس کو غدار قرار دے دیا جاتا ہے اور جو شخص اِن مراعات یافتہ طبقوں کے استحصال کے خلاف آواز اُٹھائے ، اُس کو غیر مسلم کافر، دہریہ یا کیمونسٹ قرار دے دیا جاتا ہے۔مگر میرا دعویٰ ہے کہ ہم اِن تمام بیماریوں کا علاج صرف اور صرف سوشلزم کے اُصولوں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ہم اُس تمام ناانصافی کو سوشلزم کے اُصولوں سے ختم کر سکتے ہیں۔ ہم سماجی اور سیاسی اور معاشی ناہمواری کو سوشلزم کے اُصولوں سے مٹا سکتے ہیں۔ برابری کے اُصولوں سے مٹا سکتے ہیں۔سوشلزم اسلام کی ہی مساوات کے اُصولوں کا مخفف ہے۔مساوات کے اُصولوں کا دوسرا نام سوشلزم ہے۔
آج رجعت پسند متقدر طبقوں کے نزدیک روٹی، کپڑا اور مکان کی بات کرنا غیر اسلامی ہے۔اِن چیزوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اِن لوگوں نے اسلام کا نام غربت، بیماری، ناداری، جہالت اور ظلم رکھا ہوا ہے۔اِن کے نزدیک اسلام صرف غیر آئینی جمہوری حکمرانوں کا مذہب ہے۔ سرمایہ داروں، جاگیرداروں، سرداروں، ڈاکوؤں، چوروں، قاتلوں کا مذہب ہے۔ اِس کا غریب عوام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔
پاکستان کے عوام کا اِس نوع کا معاشی استحصال سماجی ناانصافی کا دور دورہ، اِس ملک کی سرزمین کے لئے بے حد خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ غیر جمہوری ناانصافی کا معاشرہ کبھی قائم نہیں رہ سکے گا۔اِس قدر عوام کا کھلا استحصال ملک کیلئے بہت خطرناک ثابت ہوگا۔اب وہ جذبہ ختم ہو چکا ہے کہ لوگ ہر بات پر کہہ دیا کرتے تھے کہ چلو ہم نے پاکستان حاصل کرلیا۔اب لوگ سوچنے لگ گئے ہیں کہ پاکستان بنا کر ہم نے کیا حاصل کیا ہے۔
میں مشرقی پاکستان میں اِس سوچ کو وسیع پیمانے پر محسوس کر رہا ہوں۔ یہ احساس اگر جلد ختم نہ کیا گیا تو ملک کے دونوں حصوں کے لئے انتہائی خطرناک ہوگا (نوٹ) چیئرمین بھٹو یہ باتیں اُس وقت کہہ رہے ہیں جب مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کا حصہ تھا۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو نے کہا کہ میں نے تحریری طور پر لکھا ہوا منشور آپ میں تقسیم کر دیا ہے کہ ایک نئی پارٹی کی کیوں ضرورت ہے اور اِس پارٹی کے کیا اصول ہوں گے۔ میں نے اِس پارٹی کی بنیاد چار بڑے اصولوں پر رکھ دی ہے۔

(1) اسلام ہمارا دین ہے (2) جمہوریت ہماری سیاست ہے (3) سوشلزم ہماری معیشت ہے (4) طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

میرے دوستو! میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں ایک امیر آدمی ہوں۔ ایک جاگیردار ہوں۔ آج جب اس عظیم کنونشن کا آغاز کیا گیا تو میرے دوست، پارٹی کے شاعر شاعرِ عوام اسلم گورداسپوری نے مجھے مخاطب کر کے کہا کہ ''آپ سے معذرت کے ساتھ''

''There is no need of any Mazrat''

''کسی معذرت کی ضرورت نہیں''

میرا کردار بتائے گا کہ میں ایک اچھا انسان ہوں یا بُرا انسان ہوں۔ میرا کردار بتائے گا کہ میں ایک جاگیردار ہوں یا ایک انقلابی انسان ہوں۔ میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب تک میں اپنی تمام دولت، زمینیں لوگوں میں تقسیم نہ کر دوں، تب تک مجھے یہ حق ہی نہیں پہنچتا کہ میں سوشلزم کی جدوجہد کروں۔ اگر تو سوشلزم صرف میری زمینوں کے تقسیم کر دینے سے آتا ہے تو میں تیار ہوں اِن کو تقسیم کرنے کو مگر سوشلزم صرف ایک جاگیردار کی جاگیرداری ختم کر کے نہیں آ سکتا۔

سوشلزم میرے دوستو! اُس وقت آتا ہے جب تمام ذرائع پیداوار قومی حکومت کی تحویل میں لے لئے جائیں۔ جب ہر پیداواری یونٹ حکومت کے قبضے میں لے لیا جائے۔ میرے سوشلزم پر وہ اعتراض کر رہے ہیں جو خود سوشلزم کے دشمن ہیں۔ جو جاگیردار ہیں، سرمایہ دار ہیں، حکمران ہیں، اُن کے محافظ ملاں ہیں۔ میں اِن کو چیلنج کرتا ہوں کہ آؤ میں بھی اپنی تمام جاگیر لوگوں میں تقسیم کرنے کو تیار ہوں، تم لوگ بھی اپنی زمینیں، جائیدادیں لوگوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کرو۔ اگر میں امیر اور دولت مند ہوں تو میں اپنی دولت غریبوں کے حقوق کی جدوجہد پر خرچ کرتا ہوں۔ میں استحصالی نظام کو ختم کرنے کی جدوجہد میں خرچ کر رہا ہوں۔ میں اپنی دولت کو غریبوں کے حقوق کی جنگ کی راہ میں خرچ کر رہا ہوں۔

آج حکومت اِس ملک میں سوشلزم کا اعلان کرے۔ تمام ذرائع پیداوار قومی تحویل میں لینے

www.bhutto.org

کا اعلان کرے۔ میں سب سے پہلے اپنی جائیداد قوم کے تصرف میں دینے کو تیار ہوں مگر یہ حکومت ایسا نہیں کر سکتی۔ چیئرمین بھٹو نے ایک بار پھر میرا نام لے کر کہا۔ اسلم گورداسپوری، سوشلزم خواہشوں اور خیالات کا نام نہیں، یہ ایک عمل کا نظام ہے اور ہمارے جیسے ملک میں سوشلزم لانا بڑا مشکل کام ہے۔ ہمارا ملک سرمایہ داری نظام کے گماشتوں کا ملک ہے۔ سرمایہ داری نظام کا قلعہ ہے۔ خونخوار بھیڑیوں کی شکارگاہ ہے۔ یہاں پر ہم کو بڑے عقل و ہوش سے کام لے کر سوشلزم کی طرف قدم بڑھانے ہوں گے۔ یہاں پر ہم کو ماؤ کے اُصولوں پر عمل کرنا ہوگا۔ ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے جانا ہوگا۔ سنبھل سنبھل کر اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ میں لوگوں کی طرح سوشلزم کے خالی نعرے مارنے کے لئے سیاست میں نہیں آیا ہوں۔ میں سوشلزم لانے کے لئے آیا ہوں۔ اس لئے کہ سوشلزم کا پہلا پتھر نبی پاکؐ نے رکھا تھا۔

ان حکمرانوں نے اور ان کے اتحادی حلیفوں نے پورے ملک کی دولت لوٹ کر اپنی تجوریوں میں بند کر رکھی ہے۔ ہم کو اِن چوروں سے قومی دولت کو واپس حاصل کرنا ہے۔

چیئرمین بھٹو نے اپنی تقریر کے آخر میں کہا کہ یہ چونکہ نئی پارٹی ہے۔ ہم پہلے سے موجود تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ اپنے رابطے پیدا کریں گے۔ خواہ وہ دائیں بازو کی پارٹیاں ہوں، خواہ وہ بائیں بازو کی پارٹیاں ہوں۔ اس لئے کہ ہماری کسی سیاسی جماعت کے ساتھ کوئی سابقہ پرخاش نہیں ہے۔ اِس معاملے میں ہم کلین سلیٹ ہیں۔ ہماری کسی سیاسی جماعت کے ساتھ پرانی رقابت نہیں ہے اور نہ کسی کے ساتھ کوئی تعصب ہے۔ ہم تو اِس میدان میں نئے آنے والوں میں سے ہیں۔ ہماری کسی سیاست دان کے ساتھ شخصیت کی جنگ نہیں ہے۔ میرا کسی کے ساتھ پرسنیلٹی کلاش نہیں ہے۔ نہ تو ہم نے کبھی کسی کو نیچا دکھایا ہے اور نہ ہی کبھی کسی دوسرے نے ہمارا کوئی نقصان کیا ہے۔ ہمارے تمام لوگوں کے ساتھ کچھ اُصولوں کے رشتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ اسلام ہمارا دین ہے۔ اِس کے لئے ہم اپنی جانیں قربان کر سکتے ہیں۔ اسلام پاکستان کی بنیاد ہے۔ اِس میں کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ اِس کے ساتھ ہی میں یہ کہوں گا کہ اسلام اور سوشلزم دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اِس ملک کی معیشت، اقتصادیات سوشلزم کی بنیاد پر ہونی چاہئیں۔ اِس لئے کہ پچھلے 20 سال ہم نے اسلام کے نام پر اِس ملک میں صرف لوٹ مار اور ڈاکے ہی دیکھے ہیں۔ چیئرمین بھٹو کی کنونشن کی تقریر بہت لمبی تھی مگر میں نے اُن کی تقریر کے کچھ ضروری

www.bhutto.org

نکات یہاں تحریر کر دیئے ہیں تا کہ آج کے سیاسی کارکنوں کو پارٹی کے بنیادی اُصولوں سے آگاہ کیا جا سکے اور اُن کو علم حاصل ہو سکے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو کن حالات میں اُن کے شہید چیئرمین نے جنم دیا تھا اور پاکستان پیپلز پارٹی بنانے کا مقصد کیا تھا۔

سوشلزم کا پہلا پتھر نبی پاکؐ نے رکھا تھا

چیئرمین بھٹو کی تقریر کے بعد پارٹی کے پہلے روز کا تاسیسی اجلاس اختتام پذیر ہو گیا۔ چیئرمین بھٹو کی تقریر پاکستان کے استحصالی طبقوں کے لئے ایک بم بلاسٹ کی حیثیت رکھتی تھی۔ دوسرے دن اخبارات میں پاکستان کے امریکی سامراج کے ایجنٹ فوجی حکمران اور اُن کے گماشتوں مُلاؤں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ یوں تو ایوب حکومت اور اُس کے اتحادی ملاؤں کو چیئرمین بھٹو کی پوری تقریر پر ہی اعتراض تھا مگر چیئرمین کی کھلی تقریر کا یہ جملہ کہ سوشلزم کا پہلا پتھر ہمارے نبی پاکؐ نے انسانوں میں مساوات کے لئے رکھا تھا، یہ جملہ اُن کے سیاہ سینوں میں میزائل کی طرح جا کر لگا۔ یوں تو اِن سرکاری بھانڈوں اور سانڈوں نے ایک جیسی آواز میں چیئرمین بھٹو کے خلاف کفر کے فتوؤں کی تانیں لگائیں مگر اِن سب آوازوں میں مولانا مودودیؒ اور مولانا کوثر نیازی کی آوازیں بہت بلند تھیں جس کا تفصیل سے تذکرہ تاسیسی اجلاس کے اختتام کے بعد کیا جائے گا۔

دوسرے دن کے اجلاس کا آغاز دوبارہ تلاوت کلام پاک کے ساتھ کیا گیا۔ میر خورشید حسن نے میرا نام ایک بار پھر نظم کے لئے پکارا اور ساتھ ہی فرمائش کی کہ شاعر عوام سے درخواست ہے کہ وہ اپنی نظم جس کا عنوان ''خوشحالی'' ہے وہ پیش کریں۔ نظم سنائی گئی۔

چیئرمین بھٹو نے اِس نظم کو بہت پسند کیا۔ اِس کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور پر درجہ بدرجہ بحث شروع ہوئی۔ پارٹی کے منشور کے کچھ حصوں کو ملک حامد سرفراز نے پیش کیا اور مندوبین کی منظوری حاصل کی۔ اِس طرح منشور کے باقی حصے کو خورشید حسن میر نے باری باری ہاؤس میں پڑھ کر اِن کی منظوری کی تائید حاصل کی۔ اس کے بعد پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے پر کھلی بحث ہوئی۔ پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے کی پہلی شکل میں ہر عہدے دار کو کنوینئر کہا جانا منظور کیا گیا۔ اِس طرح اجلاس میں ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ کو لاہور شہر کا کنوینئر باقاعدہ رائے عامہ کی تائید سے مقرر کیا گیا اور شیخ محمد رشید ایڈووکیٹ کو پنجاب کا کنوینئر مقرر کیا گیا۔ اِس کے علاوہ اجلاس میں پارٹی کی

www.bhutto.org

ایک سب سے بڑی کمیٹی کا اعلان کیا گیا جس کو آپ اُس وقت کی سینٹر کمیٹی کہہ سکتے ہیں۔ اِس کا نام پرنسپل کمیٹی رکھا گیا تھا۔ اِس کمیٹی میں تقریباً اُس وقت کے تمام لوگوں کے نام شامل تھے جو لوگ نمایاں طور پر پارٹی کو بنانے میں مددگار تھے۔ اُس وقت اِس کمیٹی کے اراکین میں پنجاب میں شیخ محمد رشید، ملک اسلم حیات، ملک حامد سرفراز اور خورشید حسن میر کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔ اِن کے علاوہ مسٹر جے۔ اے۔ رحیم، معراج محمد خان، حیات محمد خان شیر پاؤ اور شیر سندھ میر رسول بخش تالپور کے ناموں کا اعلان کیا گیا۔

اِس کمیٹی میں کچھ ایسے نام بھی شامل تھے جن کا اُس وقت اعلان نہیں کیا گیا تھا۔ اِن ناموں کا کچھ عرصہ بعد اعلان کیا گیا تھا۔ اِن ناموں میں ڈاکٹر مبشر حسن اور حنیف رامے کے نام شامل تھے۔ شیر پنجاب ملک غلام مصطفےٰ کھر اور شیر سندھ ممتاز علی خان بھٹو کے نام یوں تو خفیہ رکھے گئے تھے مگر چیئر مین کے ساتھ ایک کی دوستی اور دوسرے کے چچازاد بھائی ہونے کی وجہ سے اِن دونوں کو پارٹی کی تمام کمیٹیوں کے رکن ہونے کا استحقاق حاصل تھا۔ اِن دونوں حضرات کے معاملے میں پارٹی کے قواعد وضوابط ساکت تھے۔ جس کی وجہ سے پارٹی کا اقتدار، پارٹی کے اقتدار میں آتے ہی ذاتی دوستی اور رشتہ داری کی بھینٹ چڑھ گیا جو بالآخر ایک شخصی اقتدار کی شکل اختیار کر گیا۔

پنجاب میں غلام مصطفےٰ کھر اور سندھ میں ممتاز بھٹو کی اقتدار کی چپقلش نے چیئر مین بھٹو کی ذات کو بہت نقصان پہنچایا۔ پنجاب میں ملک غلام مصطفےٰ کھر کی اقتدار کی جنگ نے فوجی جرنیلوں کی سازش اور بھٹو صاحب کے سیاسی دشمنوں کیلئے بھٹو کے خلاف محاذ آرائی کرنے کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ میرے ذاتی خیال میں ان دونوں حضرات کا یہ خصوصی استحقاق جمہوری اُصولوں کے منافی تھا جس کی وجہ سے بعد میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اور خود چیئر مین بھٹو کی ذات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا جس کی تفصیل کتاب کے اصل مقام پر آپ کے پڑھنے میں آئے گی۔

پارٹی کا بنیادی مسودہ

اجلاس کی کارروائی کے دوران پارٹی کے بانی اراکین کے پارٹی کے بنیادی مسودے پر دستخط کرائے گئے۔ ان تمام خواتین وحضرات کو بانی اراکین قرار دیا گیا جنہوں نے پارٹی

کے تاسیسی اجلاس میں خطاب کیا تھا یعنی بانی رکن وہ تھے جنہوں نے پارٹی کو خدوخال پیش کیئے تھے یا خطاب کیا تھا اور بنیادی رکن وہ تھے جنہوں نے اِس تاسیسی اجلاس میں شرکت کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

دوسرے دن کے اجلاس کے وقفے کے بعد شیخ محمد رشید کو پارٹی کی زرعی اصلاحات کا منشور پیش کرنا تھا۔ جس کے مطابق پارٹی کو اعلان کرنا تھا کہ وہ اقتدار میں آکر بڑے پیمانے پر لینڈ ریفارمز ایکٹ لاگو کرے گی۔

جاگیرداروں پر حدِ ملکیت نافذ کرے گی اور اُن سے حاصل کی گئی زمینیں کسانوں میں مفت تقسیم کرے گی۔ اجلاس میں کھانے کے وقفے سے پہلے چند لوگ کچھ اِس قسم کی باتیں کرتے پائے گئے کہ شیخ محمد رشید زرعی اصلاحات کے معاملے میں بھٹو صاحب سے کوئی بہت بڑا اختلاف کھڑا کرنے والا ہے۔ شیخ محمد رشید اعلان کرنا چاہتا ہے کہ تمام جاگیرداروں کی زمینوں کو بحق سرکار ضبط کرلیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ افواہ چیئرمین بھٹو کے لئے بے حد تشویش کا باعث ہوئی۔ چیئرمین بھٹو نے خورشید حسن میر سے کہا کہ شیخ صاحب سے اِس افواہ کی تصدیق کریں۔ اُن کو سمجھائیں جو زرعی اصلاحات ہمارے درمیان پارٹی کے ابتدائی منشور میں طے پائیں تھیں، اجلاس میں اُنہی کا اعلان ہونا چاہیے۔ اِن میں کسی قسم کا اضافہ یا کمی یا تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔

لہٰذا میر خورشید حسن نے شیخ صاحب کو چیئرمین بھٹو صاحب کی تشویش سے آگاہ کیا۔ اصل میں یہ تمام شرارت حکومت کی طرف سے کی جارہی تھی۔ حکومت کے چند ایجنٹ جو اُس وقت اجلاس میں شریک تھے، وہ شیخ صاحب کو اُن کے انقلابی ہونے کا حوالہ دے کر اُن کو کہہ رہے تھے کہ آپ ایک انقلابی کسان لیڈر ہیں، بھٹو ایک جاگیردار ہے۔ آج موقع ہے کہ آپ جاگیرداری کے خاتمے کا اعلان کریں تو پاکستان کے سب سے بڑے انقلابی سیاست دان بن جائیں گے۔ آج آپ چیئرمین ماؤزے تنگ بن جائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

شیخ صاحب کی خوشامد پسند اور ذاتی تعریف پسند طبیعت کے لحاظ سے اس قسم کی باتیں شیخ صاحب کو بے حد مرغوب اور پسند تھیں۔ اُن کی مجاہدانہ سادگی کے اعتبار سے اُن کا اُن کا ایجنٹوں کی سازش کا شکار ہوجانا قطعی طور پر یقینی تھا اور عین ممکن تھا۔ مگر خورشید حسن میر اور میاں عبدالستار نجم

www.bhutto.org

نے اس کو ناممکن بنا دیا۔ شیخ صاحب کو لوگوں کی شرارت سے آگاہ کر دیا۔

کھانے کے وقفے کے بعد شیخ صاحب نے پارٹی کی زرعی اصلاحات کا پروگرام پیش کیا جو تمام مندوبین نے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ منظور کیا۔ اِن سے پہلے اجلاس پاکستان کی بڑی کلیدی صنعتوں کو قومیانے کا منشور پاس کر چکا تھا۔ شیخ صاحب کے زرعی اصلاحات کے پروگرام کی منظوری کے بعد پارٹی کا ایک سوشلسٹ نظریات کا حامل منشور اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور اِس میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ پارٹی کا یہ منشور ہی پارٹی کی اصل پہچان بن گیا تھا۔

مسٹر جے۔اے۔رحیم نے پارٹی کا جھنڈا پیش کیا

پارٹی کے منشور کی منظوری کے بعد پارٹی کے جھنڈے کے رنگوں پر کھلی بحث شروع کی گئی جو شام ڈھلنے تک جاری رہی۔ گڑھی شاہو کا رہائشی ایک نوجوان وکیل جس کا اِس وقت مجھے نام یاد نہیں آرہا، اُس کو حکومت نے جھنڈے کے خلاف شور شرابا کرنے کے لئے بھیجا ہوا تھا۔ اُس نے سٹیج کے قریب جا کر شور کرنا شروع کر دیا۔ یہ جھنڈا غیر اسلامی ہے۔ اِس میں سے سرخ رنگ اور کالا رنگ نکالا جائے۔ ہم صرف سبز جھنڈا چاہتے ہیں۔ اِس نوجوان وکیل کو میں، ادریس کھٹانہ اور کچھ لوگ اُٹھا کر پنڈال سے باہر لے گئے۔ اِس کو میں نے محبت سے کہا کہ بھائی کیا کر رہے ہو۔ یہ مزدوروں کسانوں کا جھنڈا ہے، غریبوں محنت کشوں کا جھنڈا ہے۔ اِس کے خلاف کیوں شور کر رہے ہو۔ مگر وہ ایک ہی رٹ لگائے جا رہا تھا کہ یہ جھنڈا غیر اسلامی ہے، کافروں کا جھنڈا ہے، کیمونسٹوں کا جھنڈا ہے۔ میں نے اور ادریس کھٹانہ نے اُس کو دوبارہ پنڈال میں جانے ہی نہ دیا۔ اُس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر ہم نے اُس کو قابو میں رکھا۔ تنگ آ کر ڈیوٹی پر موجود پنڈال سے دوری۔ آئی۔ ڈی کے لوگوں کو وہ آواز دے کر کہنے لگا کہ آؤ میری مدد کرو۔ یہ مجھے پنڈال میں اندر جانے ہی نہیں دے رہے۔ وہ دور سے مسکرا کر اِدھر اُدھر چلے گئے۔ اِس عرصے میں تمام شرکاء اجلاس کی متفقہ رائے کے ساتھ جھنڈا منظور کر لیا گیا اور اِس کے ساتھ ہی پارٹی کا یہ پہلا بنیادی تاسیسی اجلاس اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ اِس طریقے سے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں چیئرمین بھٹو کی شکل میں ایک قومی انقلابی قیادت کا اضافہ ہوا اور پاکستان پیپلز پارٹی کی شکل میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک پہلی اینٹی اسٹیبلمشٹ سیاسی

www.bhutto.org

جماعت قائم کی گئی۔ جس کا وجود پاکستان کے غریب محنت کش عوام کے ساتھ وابستہ تھا۔ جس کی جڑیں عوام کی خواہشوں اور اُمنگوں سے پیدا کی ہوئی تھیں۔ جس کا تمام فلسفہ استحصالی قوتوں کے خلاف تھا۔ جو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی سامراج کے خلاف ایک علامت کی شکل اختیار کر گئی تھی اور اِس جماعت کا قائد چیئرمین بھٹو پاکستان کے عوام کی آزادی کی جدوجہد کا استعارہ بن کر سامنے آیا تھا۔

عرش منارے تے بانگاں ملیاں مکّے پے گیا شور، میری بُکّل دے وچ چور

پاکستان پیپلز پارٹی کے وجود میں آنے کے بعد دوسرے دن پاکستان کی قومی سیاست میں بھونچال آگیا۔ پاکستان کے تمام استحصالی طبقوں نے چیئرمین بھٹو کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اُن کی صفوں میں طوفان برپا ہو گیا۔ بالکل ویسا ہی سماں تھا جس طرح کے سے کا بابا بلھے شاہ نے رسول پاکؐ کے بنوت کے اعلان پر مکے کا نقشہ کھینچا تھا۔ بلھے شاہ کہتا ہے کہ نبوت کا فیصلہ تو آسمانوں پر ہوا تھا مگر مکے کے سرداروں، چوروں، ڈاکوؤں کی صفوں میں تلاطم برپا ہو گیا۔ اُن کی تلواریں نیام سے باہر آگئیں اور وہ اپنی سرداری تمکنت اور جہالت اور دولت کے غرور میں کسی دُرِیتیم کو اتنا بڑا انسان تسلیم کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اُن کی سرداری نسل در نسل اور عہد در عہد چلی آرہی تھیں۔

جن کی زندگی کا طرہ امتیاز ہی انسانوں کو غلام بنانا تھا۔ وہ انسانوں کی آزادی کے اعلان کو اپنی موت تصور کرتے تھے لہٰذا بابا بلھے شاہ کہتا ہے کہ مکے کے قریش سرداروں اور کعبے کے متولیوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ ایسا کہرام برپا ہوا کہ خود رسالت مآبؐ کا سگا چچا ابولہب اور ان کے ہی قبیلے کا سردار جس کو لوگ ابوالاحکم کہا کرتے تھے، اپنے غیض و تکبر میں ابوجہل بن گیا۔ اُس نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بلال حبشیؓ اور ابوجہل برابر کے انسان بن جائیں۔ ایسا ہونے سے موت بہتر ہے۔ ابوجہل ایسا نظام نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مفہوم اِس شعر کا یہ ہے کہ رسول اللہؐ کی صداقت کی قوت کا اظہار مکے کے سرداروں کے غیظ و غضب سے ظاہر ہوا تھا۔ جو آپ کے اعلانِ حق کو اپنی زندگی اور اپنے کفر کے نظام کے لئے پیغامِ موت خیال کر رہے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی جس کا بنیادی فلسفہ سرمایہ داری کے خلاف تھا۔ جاگیرداری کے خلاف تھا۔ وڈیروں، نوابوں اور سرداروں

www.bhutto.org

کے خلاف تھا۔آمروں کے خلاف تھا۔فوجی جرنیلوں کے خلاف تھا۔لوٹ مار کرنے والوں کے خلاف تھا۔چوروں کے خلاف تھا۔ ملاوٹ کرنے والوں کے خلاف تھا۔محنت کشوں کا خون نچوڑنے والوں کے خلاف تھا۔لوگوں پر غربت مسلط کرنے والے ملاؤں کے خلاف تھا۔ عالمی سامراج اور اُس کے ایجنٹوں کے خلاف تھا۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کیا بنی کہ ایک ہی رات میں یہ تمام ایک ہو گئے، اکٹھے ہو گئے ۔ایک ہی رات میں پاکستانی قوم دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ظالم ایک طرف ہو گئے ،مظلوم دوسری طرف ہو گئے ۔ظلم کی اِن تمام غیر انسانی، غیر جمہوری قوتوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ اِن طبقوں کی حالت ویسی ہی تھی جیسے ابوجہل اور اُس کے اتحادیوں کی تھی ۔اُنہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو کیوں کمینوں کی پارٹی قرار دے کر اِس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور چیئرمین بھٹو کو اپنے طبقے کا غدار اور کافر قرار دے دیا۔

پاکستان کے فوجی ڈکٹیٹروں پاکستان کی سیاست کے سرداروں، اُن کے حواری سیاسی لیڈروں، مذہبی کاہنوں، پرہتوں اور سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے محافظوں کا رِدِّعمل خود اُن کی زبانی بیان کیا گیا۔ملاحظہ کیجیے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا بنیادی منشور

پاکستان پیپلز پارٹی کا بنیادی منشور باقی پارٹیوں کی طرح فرسودہ نہیں ہے۔ یہ عوام سے کیا گیا عہد و پیمان ہے کہ پارٹی، انتخابی یا غیر انتخابی ہر طریقے سے،اس میں دیئے گئے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد کرے گی۔

براہِ راست نوآبادیاتی اقتدار نے پاکستان میں ایک ایسا سیاسی اور سماجی نظام وراثت میں چھوڑا جسے جاگیردارانہ،فوجی، بیوروکریٹک کہا جا سکتا ہے۔تب سے آج تک ہونے والی تمام ترقی اس نظام کی ایک اپاہج سرمایہ دارانہ نظام میں تبدیلی کی ہے جو کہ سامراجی نوآبادیاتی حلقہ اثر میں موجود غیر ترقی یافتہ ممالک کا خاصہ ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر مغربی نوآبادیاتی طاقتوں نے امریکی رہنمائی میں استحصال کے طریقوں کو نئے حالات کے مطابق ڈھالا۔محکوم عوام پر براہِ راست حکومت ختم کر دی گئی مگر سابقہ نوآبادیاں معاشی، سیاسی اور فوجی مجبوریوں کی زنجیروں سے سابقہ حکمرانوں کے چنگل میں گرفتار رہیں۔

نئی سامراجی طاقتوں کے زیر اثر ہمارے حکمرانوں کے غلط اقدامات، ایک ایسے معاشی نظام کے اپنانے جس میں عوام کو بلا روک ٹوک لوٹنے کی اجازت ہو، چند افراد کے ہاتھوں میں دولت کا ارتکاز، طاقت، روزگار اور دولت کے ذرائع کی بیوپاریوں، جاگیرداروں اور حکومت کی فوجی اور سول افسران کے طبقے کے درمیان بندر بانٹ، ان سب کی وجہ سے ملک بحران میں مبتلا ہو چکا ہے، جو کہ بڑے پیانے کی تباہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ یاد رہے کہ سرکاری اہلکاروں کی بدعنوانی بیماری کی وجہ نہیں بلکہ صرف ایک علامت ہے، بدعنوانی جو سماج کی پرتوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔

بینکاری کی صنعت اور کاروباری شعبے کے مفادات کا تحفظ کرتے حکمران ٹولے کے پاس بجٹ فارمولوں اور ترقیاتی منصوبوں کا وہی پرانا جادوئی منتر پڑھنے کے سوا اس بحران سے نکلنے کا کوئی حل موجود نہیں۔ بڑھتی قیمتوں کے ساتھ محنت کش طبقہ، نچلا درمیانہ طبقہ اور لگی بندھی تنخواہوں والے تمام ملازمین تیزی سے بدحالی کا شکار ہو رہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کو بچانے کی آخری کوشش میں حکومت نے پاکستان کے غیر مراعات یافتہ عوام کو بڑے پیانے پر لوٹنے کی اجازت دے دی ہے۔

یہ بحران ہمارے بوسیدہ نظام کی ہڈیوں میں سرایت کر چکا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا پروگرام اس نظام کو ہی ختم کر ڈالے گا اور ذرائع پیداوار کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا جو کہ چند افراد کے ہاتھوں میں آ کر ذرائع استحصال بن چکے ہیں۔

پاکستان کا آئین

آئین جو کہ صرف ساخت میں جمہوری ہو اس ملک کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوگا جب تک کہ اس کو اس طرح سے نہ بنایا گیا ہو کہ وہ معاشی اور سیاسی نظام میں تبدیلی کو نہ صرف ممکن بنائے بلکہ ضروری طور پر اس کا آغاز بھی کرے۔ سرمایہ دار اور مالکان طبقات کے مفادات جب تک بے لگام ہیں تب تک آئین ایسا ہی ہوگا جو ان کی ضروریات کے عین مطابق بنایا جاتا رہے گا۔

حقیقی حل ایک سوشلسٹ پروگرام کے اپنانے ہی سے ممکن ہے، جیسا کہ اس منشور میں دیا گیا ہے کہ سارے پاکستان کی معیشت میں بنیادی تبدیلی لائی جائے جس سے استحصال کا خاتمہ ہو اور

www.bhutto.org

دستیاب وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے سرمایہ دارانہ مداخلت کے بغیر ملک کو ترقی دی جائے۔

دسمبر 1967ء میں لاہور کنونشن کے موقع پر پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے قیام کے مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اصولوں کا اعلان کیا۔ پارٹی کی پالیسی کا حتمی مقصد طبقات سے پاک معاشرے کا قیام ہے جو کہ ہمارے دور میں صرف سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

چونکہ پارٹی کے بنیادی مقاصد کا حصول چھوٹی چھوٹی مفاہمتوں کے ذریعے ناممکن ہے اور اس وقت تک بھی جب تک سماج میں غیر منصفانہ نظام موجود ہے، پارٹی سمجھتی ہے کہ اصلاح پسند نعرے لگانا لوگوں کو جھوٹی امید دلا کر دھوکہ دینا ہے جبکہ ملک موجودہ اور مزید بربادیوں کی گہرائیوں میں گرتا جارہا ہے اور آخر کار یاس کے عالم میں دھماکہ خیز تشدد سامنے آتا ہے۔

خارجہ پالیسی

پہلا قدم لازمی طور پر سامراج اور نئی نوآبادیاتی طاقتوں کے چنگل سے رہائی پانا ہے۔ پاکستان سامراج اور نئی سامراجی طاقتوں کے خلاف جدوجہد میں تمام محکوم لوگوں کی حمایت کرے گا، خاص طور پر ویتنام کے بہادر لوگوں کی جدوجہد کو جو کئی سال سے کامیابی کے ساتھ سامراج کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ ہم دوسری اقوام کے ساتھ مل کر ایشیاء کی سرزمین کو امریکہ اور دوسری مغربی سامراجی طاقتوں کی افواج کے قبضے سے چھڑانے کی جدوجہد کریں گے۔

صنعت کو قومی تحویل میں لینا

سرکاری شعبے میں تمام بنیادی اور اہم صنعتیں ہوں گی۔

تمام بڑی صنعتیں قومی تحویل میں لی جائیں گی۔ اس کا مطلب ہوگا کہ ایک خاص پیداواری صلاحیت سے اوپر کی تمام کپڑے اور پٹ سن کے تمام کارخانوں کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ نجی ملکیت میں یہ بے پناہ منافعوں، پیداوار کی نااہلی، وسائل کے ضیاع اور محنت کشوں کے نہ رکنے والا استحصال کا سرچشمہ بن چکی ہیں۔

سرکاری شعبے میں نہ صرف بجلی بلکہ توانائی کے باقی تمام ذرائع جیسے ایٹمی، گیس، تیل اور کوئلے کی بڑے پیمانے پر پیداوار ہوگی۔

www.bhutto.org

سرکاری شعبہ مکمل طور پر پبلک ٹرانسپورٹ کے بڑے ذرائع کا مالک ہوگا جیسے ریلوے، بحری اور ہوائی جہاز۔ جہاں پر بھی اسے بڑے پیمانے پر چلانے کی ضرورت محسوس کی جائے گی سڑک کے ذریعے پبلک ٹرانسپورٹ خواہ مال یا مسافر بردار کو بھی قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ محنت کشوں اور ملازمین کے لئے ان کے گھروں سے کام کرنے کی جگہ تک آمدورفت پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

اقتصادی اقدامات

مالیاتی اداروں کی نجی تحویل استحصال کا ماخذ ہے جو قومی دولت اور نجی کھاتوں کو استعمال کرتے ہوئے سرمایہ دارانہ اجارہ داروں کو سرمایہ فراہم کرنے کے وسائل پیدا کرتا ہے۔ تمام بڑی صنعتیں کلی طور پر بینکوں سے قرضے لے کر کھڑی کی گئی ہیں جو کہ کھاتہ داروں کا پیسہ ہے۔ جب تک ریاست تمام بینکوں کو اپنی تحویل میں لے کر انہیں قومی ملکیت نہیں بناتی وہ افراطِ زر پر قابو نہیں پا سکتی۔

تمام بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کو فوری طور پر قومی تحویل میں لے لیا جائے گا۔ ایک سوشلسٹ نظام کا قیام قدرتی طور پر ٹیکسوں کے نظام کی بنیاد تبدیل کردے گا جو کہ سرمایہ دارانہ سماج کے لئے بنایا گیا ہے اور دولت کے مراعات یافتہ طبقات کے ہاتھوں میں ارتکاز کا باعث ہے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ٹیکس صرف سرکار کو پیسہ فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے، لیکن یہ پیسہ صنعت، زراعت اور دوسرے شعبوں میں پیدا ہونے والی قدر زائد سے آنا چاہئے جن میں انسانی محنت اور کاوش صرف کی جاتی ہے۔

زرعی اصلاحات

زمین کی حدِ ملکیت بارانی 300 ایکڑ اور نہری 150 ایکڑ فی خاندان مقرر کردی گئی۔ خشک سالی اور سیلاب جیسی قدرتی اور طبعی مشکلات کے علاوہ جاگیرداری، مزارعت، زمین کی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم اور انتہائی مختصر پیمانے کی کاشت کاری جیسے ملکیتی رشتوں کے مسائل سے بھی نمٹنا پڑے گا۔

جاگیرداروں کی طاقت کے خاتمے کے لئے جاگیروں کی تقسیم ایک قومی ضرورت ہے جس کو

www.bhutto.org

سیاسی اقدامات سے عملی جامہ پہنانا پڑے گا، ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کرنا اس کا صرف ایک حصہ ہے۔

زرعی مسائل سے نمٹنے کے لئے پارٹی کی پالیسی کو 1967ء میں منظور کردہ بنیادی اصولوں کے پروگرام میں وضع کیا گیا ہے۔ بنیادی اصولوں کے پروگرام کے آرٹیکل 6 میں لکھا ہے:

''پارٹی جاگیرداری کے خاتمے کے حق میں ہے اور سوشلزم کے وضع کردہ اصولوں کی روشنی میں کسانوں کے مفادات کا تحفظ اور ان کی ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات کرے گی۔''

عوام کے حقوق

چونکہ بڑے پیمانے کی تمام صنعت کو قومی تحویل میں لے لیا جائے گا اس لئے محنت کشوں کا صنعتی پیداوار کی حاصلات سے مستفید ہونا حقیقی طور پر ممکن ہو سکے گا۔ کارخانوں کے نظم ونسق کو چلانے میں مزدوروں اور تکنیکی ماہرین کی شمولیت کو بتدریج متعارف کروایا جائے گا۔

کارخانوں میں ملازمت کے لازمی حصے کے طور پر محنت کشوں کو رہائش سے کام کرنے کی جگہ تک کے مناسب ذرائع آمدورفت مہیا کئے جائیں گے۔ ان کو تنخواہ کے ساتھ چھٹیوں کی سہولت دی جائے گی اور تفریحی کیمپ قائم کئے جائیں گے جہاں وہ اپنی چھٹیاں صحت افزا مقامات پر گزار سکیں۔ انہیں اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لئے تکنیکی تربیت کا حق حاصل ہوگا۔ ہسپتال اور مفت طبی سہولیات کو محنت کشوں کے لئے فلاحی نظام کا حصہ بنایا جائے گا۔ تکنیکی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے وظائف کو محنت کشوں کے بچوں کے لئے تعلیمی سہولیات میں شامل کیا جائے گا۔ عمر رسیدہ افراد کے لئے پنشن کا نظام وضع کیا جائے گا اور معذور اور پنشن یافتہ محنت کشوں کے لئے رہائش گاہیں تعمیر کی جائیں گی۔

سوشلسٹ نظام کے تحت مقامی حکومتیں مناسب حجم کی شہری میونسپل کمیٹیوں اور شہری علاقوں پر مشتمل ہوں گی۔ دیہی علاقوں میں یہ ضلع کونسل سے ملتی جلتی ہوں گی۔

سوشلسٹ حکومت کو انتظامیہ کا ایک مختلف ڈھانچہ درکار ہوگا اور سوشلسٹ سماج اپنے قیام کے ساتھ ان ضروری ڈھانچوں کو خود ہی پیدا کر لے گا۔

پاکستان کے ہر شہری کو، بلاتفریق رنگ، نسل اور مذہبی عقیدہ، مساوی سیاسی حقوق، قانون کا

www.bhutto.org

تحفظ، حکومتی عہدوں تک رسائی حاصل ہوگی اور روزگار کے لئے کسی بھی قسم کا تعصب نہیں ہوگا۔

تعلیم اور ثقافت

تعلیم کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ نئی نسل کو نہ صرف اپنے گرد و پیش میں موجود کائنات کا ادراک حاصل ہو بلکہ انہیں اسے بدلنے کے لئے تیار کیا جائے۔ انہیں سماجی تبدیلی اور تاریخ کے ناگزیر عمل کے کردار کو گہرائی میں سمجھنا پڑے گا۔

حقیقی غیر طبقاتی سماج کے قیام کے لئے لازمی ہے کہ علم کے متلاشی سماج کو کلی طور پر دائرہ نظر میں لائیں۔ ہمیں سرمایہ دارانہ نظام کے اس نظریے کو رد کرنا ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم کو شعبوں کے اندر محدود کیا جائے۔ تعلیم کی تقسیم کے اس عمل سے سرمایہ دارانہ نظام کا مفاد وابستہ ہے کیونکہ یہ اہل علم کو سیاسی اور معاشی اقتدار کے موجودہ نظام کی افادیت پر سوال اٹھانے سے روکتا ہے۔

یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب پر بھرپور طریقے سے نظر ثانی کرنا ہوگی اور یونیورسٹیوں کی سماجی زندگی سے علیحدگی کو ختم کرنا ہوگا۔ لازمی فوجی تربیت کے علاوہ جو کہ ثانوی سکولوں سے ہی شروع کردی جائے گی، طلباء کو ایک مخصوص وقت فیکٹریوں، قصبوں اور کھیتوں میں قومی خدمت میں صرف کرنا پڑے گا۔

میٹرک تک تعلیم مفت ہوگی اور بنیادی تعلیم لازمی اور مفت ہوگی۔ ایک پانچ سالہ منصوبہ شروع کیا جائے گا جس کے اختتام تک تمام ضروری سکول تعمیر کئے جائیں گے اور پرائمری اساتذہ کو تربیت دی جائے گی۔

تعلیمی اداروں سے سامراجی، نو آبادیاتی اور نو سامراجی اثرات کا خاتمہ کیا جانا لازمی ہے۔

ان طبقاتی مفادات کی طرف سے قوم کی آنکھوں پر علمی پٹی باندھی گئی ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے لوگ خود اپنے لئے سوچنے لگ پڑیں۔

قومی صحت

درج ذیل اہداف کا حصول ممکن بنایا جائے گا۔

1۔ پاکستان میں اوسط عمر کو 33 سال سے بڑھا کر ایک نسل کے اندر 60 سال کیا جانا۔

-2 دس سال کے اندر 1 سے 5 سال تک کی عمر کے بچوں کی شرح اموات کو 35% سے کم کر کے 7.5% تک لانا۔

-3 دس سال کے اندر ٹی بی، ہیضہ، چیچک، ٹائیفائڈ، ٹائفس، ملیریا، باؤلا پن اور جذام جیسی بیماریوں کا مکمل خاتمہ۔

صحت کے پروگرام میں ہسپالوں کا قیام اور ان کی بہتری، شہروں اور دیہات میں صفائی کے نظام کو بہتر بنانے کے اقدامات، زیادہ سے زیادہ ضروری ادویات کی اندرون ملک تیاری، سکول کے بچوں کو صحت کی سہولیات کی فراہمی اور جہاں غذائی کمی ہو وہاں سکولوں میں متوازن خوراک کی فراہمی شامل ہوں گی۔

پارٹی کا مجموعی موقف

پارٹی سماجی، معاشی اور سیاسی ڈھانچوں میں ایک انقلابی تبدیلی کا منصوبہ پیش کر رہی ہے۔ پاکستان کے عوام اور صرف پاکستان کے عوام ہی اس انقلاب کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اس لئے پارٹی کا نعرہ ہے ''طاقت کا سرچشمہ عوام''۔

صرف چیئرمین بھٹو کی ذات ہی لیڈر تھی

اس بات کی پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی جب وجود میں آئی اس وقت سوائے چیئرمین بھٹو کے اور کوئی دوسرا ایسا نام نہیں تھا جس نام سے پورے پاکستان کے عوام آشنا تھے۔ صرف میر رسول بخش تالپور ایک ایسا نام جس نام کو سیاسی شہرت حاصل تھی مگر اس کی شہرت بھی صرف سندھ تک محدود تھی۔ اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی میں ملک کے پرانے سیاست دان جن کو عرف عام میں بڑے سیاست دان کہا جاتا تھا وہ پیپلز پارٹی میں شریک ہونا اپنی کسرِ شان خیال کرتے تھے۔ یہ جفادری لیڈر بھٹو صاحب کو اپنا لیڈر تسلیم کرنا اپنی توہین خیال کرتے تھے۔ تمام سرمایہ دار لیڈر اور جاگیردار لیڈر پاکستان پیپلز پارٹی کو بھوکوں ننگوں کی پارٹی کہتے تھے۔ پیپلز پارٹی کو چھوروں کی پارٹی کہا جاتا تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ فوجی حکمرانوں کے خوف سے یہ پرانے لیڈر پیپلز پارٹی میں آنے سے ڈرتے تھے۔ مگر سب سے اصل بات یہ تھی کہ

www.bhutto.org

پاکستان کے اس وقت کے تمام چوٹی کے لیڈر خود کو اپنی لیڈری کا گھنٹہ گھر بنائے ہوئے تھے۔ وہ چیئرمین بھٹو کی قیادت کو تسلیم کرنا اور ان کی قیادت میں آ کر کام کرنا اپنی شخصیت کی نفی تصور کرتے تھے۔ وہ چیئرمین بھٹو کی قیادت کے جلو کو سمجھنے سے ہی قاصر تھے۔ اس دنیا میں ہر نئی انقلابی تحریک کی یہی تاریخی شکل ہوا کرتی ہے جو پاکستان پیپلز پارٹی کی شکل وصورت تھی۔ تاریخ میں ہمیشہ پرانا نظام سیاست پرانا نظام قیادت نئے نظام سیاست اور نئے نظام قیادت کو بھی قبول نہیں کیا کرتا۔ جس طرح مکے کے پرانے سرداری نظام کے اقتدار کا مقتدر سرداروں کا ٹولہ نوجوان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو تسلیم کرنا اپنے خاندان کے نام وناموس کی ذلت خیال کرتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنے وقار اور اپنے اقتدار کی بے عزتی خیال کرتا تھا وہ رسالت مآبؐ کی قیادت اور اس کی وجود میں آنے والی نئی نوجوان نسل کی تنظیم کو اپنے لئے ایک چیلنج خیال کرتا تھا۔ عین اسی طرح پاکستان میں ایک تاریخی حقیقت کے تسلسل کی طرح چیئرمین بھٹو کی قیادت کو اور ان کی تخلیق کی گئی پاکستان پیپلز پارٹی کو برسرِ اقتدار پاکستان کے تمام طبقے اپنے اقتدار اور اپنے جھوٹے وقار کے لئے چیلنج خیال کرتے تھے۔ پاکستان کا ہر مراعات یافتہ خاندان جاگیردار اور سرمایہ دار پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنے مفادات کے خلاف خیال کرتا تھا۔

یہی وجہ تھی 30 نومبر 1967ء کے پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے کنونشن میں سوائے بھٹو صاحب کی ذات کے کوئی ایک شخص بھی ملک گیر شخصیت کا حامل نہیں تھا۔ تمام مندوبین تمام شرکاء اجلاس غیر معروف لوگ تھے۔ جن کی کوئی شہرت نہیں تھی جن کا کوئی نام نہیں تھا۔ مگر ایک تاریخی فنامنے کی طرح جیسا کہ تاریخ میں ہمیشہ عوامی تحریکوں میں ہوا کرتا ہے۔ جو بے نام شخص بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا۔ جو غیر معروف انسان بھٹو صاحب کے ساتھ شامل ہوا وہ نام والا بن گیا۔ اس کی ایک پہچان بن گئی۔ وہ پہچان بھٹو صاحب کی ذات تھی اور پیپلز پارٹی تھی۔

اور یہی وہ چھوروں کی پارٹی تھی بھوکے ننگوں کی پارٹی تھی جس پارٹی نے 1970ء کے انتخابات میں آقاؤں کے خیموں کی طنابیں توڑ دیں تھیں۔ تمام رجعت پسندوں کے برج الٹا دیئے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ قیادتوں کو اپنی فتح کے بعد اپنے اپنے عہد کے ابوسفیانوں کے گھروں کو جائے امان ظاہر کر کے ہی خوش ملتی ہے۔ قیادتوں کی اناؤں کی تسکین کا یہ مخمصہ انسانی تاریخ کے لئے بڑا خطرناک ثابت ہوا ہے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے نئی پارٹی کیوں بنائی۔ اخبار کا عکس

مسٹر بھٹو نے نئی پارٹی کیوں بنائی؟

نظر بندی سے پہلے ایک خصوصی انٹرویو

لاہور ۵ جنوری [illegible] مسٹر حنیف رامے نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ ایک خصوصی انٹرویو شائع کیا ہے جو مسٹر بھٹو کی نظر بندی سے پہلے لیا گیا تھا۔ مسٹر رامے کے مطابق مسٹر بھٹو نے ان کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ "جب میں نے تمام پارٹیوں کے اندرونی اور باہمی خلفشار کو اچھی طرح دیکھ لیا تو مجھے یقین ہو گیا کہ ان کی موجودہ حالت میں ان کی [illegible] کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جس میں سوشلسٹ [illegible] لئے دائیں بازو کی جماعتوں میں میری شمولیت بے معنی تھی۔ سوشلسٹ جماعت نیشنل عوامی پارٹی پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ دائیں بازو کی جماعتیں پی ڈی ایم کی صورت میں متحد ہو چکی تھیں لیکن بائیں بازو کی [illegible] منتشر تھی۔ بائیں بازو اور تمام ترقی پسند عناصر کو یکجا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کو قیادت فراہم کی جائے۔ ضروری تھا کہ ایسی ایک جماعت قائم کی جائے۔ جو عوامی جدوجہد کا آغاز کرے۔ تمام عوامی طاقتوں کو یکجا کرے جب تک بائیں بازو اور تمام ترقی پسند عناصر متحد نہیں ہوتے۔

وقت تک دائیں بازو سے ان کا با عزت اتحاد نہیں ہو سکتا اور یہ بے حد ضروری ہے کہ ملک میں جمہوری حقوق کی بحالی کے لئے تمام اپوزیشن پارٹیاں مل کر کام کریں۔ اگر اس معاملے میں بائیں بازو کی جماعتیں بے عمل رہتی ہیں تو سوشلسٹ معاشرے کا قیام مزید اور دور ہو جاتا ہے۔ بلکہ جمہوری حقوق کی بحالی کا مسئلہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ مسٹر بھٹو نے مزید کہا۔ کسی ایسے تنظیم کے لئے جس کے لیڈر کی قوم میں عزت تھی۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ اور وہ ایک نئی پارٹی بنا کر اپنی شہرت کو خطرہ میں ڈال [illegible] اور وہ بھی ایسے حالات میں کہ آمرانہ حکومت اسے کچلنے پر تلی ہوئی ہو اور اپوزیشن جماعتیں بھی اسے ہمدردی اور تعاون سے نوازنے پر تیار نہ ہوں۔ [illegible] میرے پاس نہ فنڈ تھا نہ ہی دفاتر تھے نہ کارکن نہ روزنامہ۔ [illegible] مجھے الف سے شروع کرنا تھا۔ ہمارے [illegible] مشکلات اور تکلیفات تھیں۔ کہیں سے حوصلہ افزائی کی امید نہ تھی۔

(باقی آخری صفحہ پر)

www.bhutto.org

کہیں سے حوصلہ افزا امید نہ تھی

میرے لئے سب سے مشکل مرحلہ ایک تو نئی پارٹی بنانا تھا۔ دوسرا مرحلہ پارٹی میں آنے والے نئے لوگوں کی پہچان بنانا تھا۔ پاکستان کی سیاست پر ہر چند بڑے سیاست دانوں کے نام چھائے ہوئے تھے۔ جو اپنا ایک بھاری بھرکم خاندانی پس منظر رکھتے تھے۔ لوگ ان کے سوا کسی عام انسان کو سیاست دان تصور ہی نہیں کرتے تھے۔ میری مشکل یہ تھی کہ میں ایک خالصتاً عوامی جماعت میں ان وڈیروں کو شامل نہیں کر سکتا تھا، اور نہ ہی وہ بھاری بھرکم بے کار پرانے لیڈر میری پارٹی میں شامل ہو سکتے تھے۔ میرے ساتھ آنے والے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے والے تمام لوگ نوجوان لوگ تھے اور نو آموز سیاست تھے۔ لوگ ان کا نام تک نہیں جانتے تھے۔ ان کی اپنی کوئی پہچان ہی نہیں تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ پارٹی کے منشور کی عوامی مقبولیت نے ان لوگوں کو پارٹی کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی سیاسی تشخص دے دیا ہے۔ اب لوگ ان نو واردانِ سیاست کو جو پیپلز پارٹی میں آئے ہیں ان کو پیپلز پارٹی کے رہنما تصور کرتے ہیں۔ میری قیادت نے ان لوگوں کے نئے چہرے ہونے کا یا غیر معروف ہونے کا خلا پُر کر دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مثال کے طور پر پیپلز پارٹی کے قیام سے پہلے کوئی انسان ڈاکٹر مبشر حسن، حنیف رامے، شیخ رشید، مصطفیٰ کھر، ممتاز بھٹو، میر رسول بخش تالپور، حیات محمد شیر پاؤ، خورشید حسن میر کے کوئی نام تک نہیں جانتا تھا۔ مگر اب تمام لوگ ان کو اپنا رہنما کہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پیپلز پارٹی کو سب سے بڑی کامیابی اس کے عوامی منشور سے اس کو حاصل ہوئی ہے۔ پاکستان میں غریب محنت کش عوام کے حقوق اور ان کے دکھوں کا پاکستان کی سیاست میں مداوا ہی نہیں تھا۔ زمین خالی پڑی تھی میں نے اس میں سوشلزم کا بیج عوامی منشور کی شکل میں ڈال کر زمین کی آبیاری کر دی ہے۔ زمین زرخیز تھی۔ جس کی فصل عوام کی قبولیت کی شکل میں ہر طرف لہلہا اٹھی ہے۔ تمام کھیتوں اور کھلیانوں میں پارٹی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ اس طریقے سے میں نئی پارٹی بنانے کے اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہوں۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کے سیاسی معرکوں کا آغاز

مجھے اپنی اس کتاب میں پاکستان پیپلز پارٹی کے بارے میں اِس لئے کچھ تفصیل سے تحریر کرنا ہے تاکہ آج کے لوگوں کو، آج کے سیاسی کارکنوں کو اِس بات کا علم ہو سکے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کن حالات میں بنائی گئی تھی۔ اِس پارٹی کا بنیادی مقصد کیا تھا۔ اِس کا بنیادی فلسفہ اور نظریہ کیا تھا اور وہ کونسا طبقہ تھا جس نے اس پارٹی کو جنم دیا تھا۔ اس پارٹی کے وجود میں آنے سے پاکستان کی سیاست پر کیا اثرات مرتب ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ چیئرمین بھٹو کی غیر معمولی قیادت کے بارے میں تحریر کرنا ضروری تھا کہ اُن کی قیادت کن حالات میں منظر عام پر آئی تھی اور روزِ اوّل سے اُن کی قیادت کے حریف کون تھے اور حلیف کون تھے۔ کونسا طبقہ اُن کا دوست تھا اور کونسا طبقہ اُن کا دشمن تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ہمارے جیسے ممالک میں ایک حقیقی قیادت کے ساتھ کیا کچھ گذرتی ہے۔ اس معاملے میں حتمی بات یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے وجود میں آنے کا تمام تر سہرا بھٹو صاحب کی جرأت اور مردانگی کے سر ہے جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ اگر چیئرمین بھٹو ایک ثابت قدم انسان نہ ہوتے تو پاکستان پیپلز پارٹی ہرگز وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ یہ پارٹی عوام کی قوت اور چیئرمین بھٹو کی جرات کے بل پر ہی قائم ہوئی تھی۔

آج کے سیاسی کارکنوں کو اور پاکستان کے عوام کو ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نہ تو چیئرمین بھٹو کی طرح کے لیڈر بار بار پیدا ہوتے ہیں اور نہ ہی پاکستان پیپلز پارٹی کی طرح کی قومی، عوامی اور نظریاتی سیاسی جماعتیں روز روز پیدا ہو سکتی ہیں یا بنائی جا سکتی ہیں۔ پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں ایک اصلی سیاسی قیادت اور ایک حقیقی سیاسی جماعت کی راہ میں کیا کیا رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ ایک عوامی سیاسی قائد کو کس طرح ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُس کی ذات پر کس طرح کے قاتلانہ حملے کرائے جاتے ہیں۔ کس طرح اُس کا راستہ روکا جاتا ہے۔ کس طریقے سے اُس کی کردار کشی کی جاتی ہے۔ اُس کے کارکنوں کو کس طرح خوف زدہ کیا جاتا ہے۔ عوام کو کس طرح اُس سے دور رکھنے کی سازش کی جاتی ہے۔ اِن تمام حملوں، سازشوں اور ظلم و جبر کا مشاہداتی اور واقعاتی تجزیہ پیش کرنا بے حد ضروری ہے۔

www.bhutto.org

میں اس تجزیے کو صحافیانہ انداز میں یا افسانوی انداز میں پیش کرنا نہیں چاہتا۔ میں اِس ظلم و جبر کی داستان کو، چیئرمین بھٹو کی سیاسی جدوجہد کو عملی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ ملک وقوم کی سیاسی تاریخ کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ اِس بات کا آغاز میں اِس طرح سے کروں گا کہ جیسا کہ آپ آجکل دیکھ رہے ہیں کہ جو شخص آجکل فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف کی (ق) لیگ میں چلا جائے، وہ لیڈر اور سیاست دان کہلانے لگ جاتا ہے۔ چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی میں ایسا ممکن نہیں تھا۔ چیئرمین بھٹو کا ساتھ دینے میں اور پیپلز پارٹی کی سیاست میں حصہ لینے میں بڑا کشت کاٹنا پڑتا تھا۔ بقول علامہ اقبال۔

یہ شہادت گہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

برصغیر پاک وہند کی پرانی سیاسی روایات کے مطابق ہر نئی سیاسی جماعت کے وجود میں آنے کے بعد اِس جماعت کے قائد کیلئے اُصولی طور پر ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی مرکزی شہر میں جلسہ عام کر کے عوام کو جلسے میں آنے کی دعوت دے اور جلسے میں موجود عوام کے سامنے اپنے سیاسی منشور اور پروگرام کو وضاحت کے ساتھ پیش کر کے عوام سے براہ راست اپنے منشور کی منظوری حاصل کرے۔ اِس پہلے جلسے میں نئی پارٹی بنانے والے عوام کو اِس بات سے آگاہ کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اِس پارٹی کو کن مقاصد کے لئے بنایا ہے۔ لہٰذا اِس روایت پر عمل کرتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی نے لاہور موچی دروازے میں جلسہ کرنے کی حکومت سے قانونی طور پر منظوری حاصل کرنے کی درخواست دی جس کو ڈی سی لاہور نے نامنظور کر دیا۔ حکومت کی اِس بوکھلاہٹ سے اخبارات میں حکومت کے خلاف بہت تنقید کی گئی۔ حکومت نے خفت مٹانے کے لئے پیپلز پارٹی کو ہیرامنڈی کی بیک سائیڈ پر لیلا پارک میں ایک سازش کے تحت جلسہ کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ لیلا پارک شاہی قلعے کے ساتھ واقع ہے جو کسی بھی سیاسی جلسہ کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوئی تھی۔ حکومت کی سازش یہ تھی کہ ہیرامنڈی کے تمام اوباشوں کو، غنڈوں کو، منشیات فروشوں کو جلسہ میں بھیج کر جلسہ کو تباہ و برباد کرا دیا جائے۔ مگر قدرت کو حکومت کی سازش کو کامیاب کرنا منظور نہ تھا۔ جلسہ کے اعلان کے بعد تمام رات اور تمام دن بارش ہوتی رہی۔ لیلا پارک میں پانی کھڑا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنا جلسہ منسوخ کر دیا۔ اِس طرح پیپلز پارٹی ایوب

www.bhutto.org

حکومت کی سازش کا شکار ہونے سے بچ گئی۔

اِس جلسے کے التوا کے بعد بھٹو صاحب نے ملتان ڈویژن کے دورے کا پروگرام بنایا۔ اُن دنوں ملک غلام مصطفےٰ کھر کا کام پس پردہ رہ کر ملتان کے جاگیرداروں کو پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دینا ہوتا تھا۔

ملتان کے نمایاں نظر آنے والے لوگوں میں صاحبزادہ فاروق علی، ملک مختار اعوان، عبدالحمید بابر اور چند دوسرے مزدور یونین کے عہدے دار بابو فیروز الدین انصاری، حلیم بابر، میاں ساجد پرویز اور چند وکیل حضرات تھے۔ افسوس کہ آج مجھے اُن بہادر لوگوں کے نام یاد نہیں آرہے ہیں۔ ہمارے اِس دورے کا آغاز مظفر گڑھ بار ایسوسی ایشن میں بھٹو صاحب کی تقریر سے ہوا۔ مظفر گڑھ بار اُس وقت بہت سادہ عمارت میں تھی۔ کمرہ بہت تنگ تھا۔ کافی لوگوں کا ہجوم کمرے سے باہر بھٹو صاحب کی تقریر سنتا رہا۔ باہر برآمدے میں میں اور کچھ ورکرز ایک کھلی جیپ پر کھڑے ہو کر بھٹو صاحب کی تقریر سن رہے تھے کہ ملک غلام مصطفےٰ کھر کا ایک بھائی جو اُس سے بڑا تھا۔ وہ وہاں اپنے چند حواریوں کے ساتھ آ گیا اور اُس نے آ کر بھٹو صاحب، کھر اور پیپلز پارٹی کو گالیاں بکنا شروع کر دیں۔

وہ تقریباً آدھ گھنٹے تک گالیاں بکتا رہا۔ چیئرمین بھٹو کی تقریر ختم ہوگئی۔ ہم ملتان واپس آ گئے۔ میں نے بھٹو صاحب کے سامنے کھر کو کہا کہ معذرت کے ساتھ، آپ کا بھائی مجھے پاگل لگتا تھا۔ بھٹو صاحب کہنے لگے۔ تم معذرت بہت استعمال کرتے ہو۔ وہ گالیاں بکتا تھا، اِس میں اُس کے پاگل ہونے میں کیا شک تھا۔ بھٹو صاحب کے ڈانٹ کے انداز میں لفظ معذرت کہنے سے مجھے یاد آ گیا کہ پارٹی کنونشن میں جاگیرداری کے خلاف نظم پڑھتے ہوئے میں نے اُن سے کہا تھا: ''آپ سے معذرت کے ساتھ'' گویا یہ لفظ کس قدر سنگین تھا جو بھٹو صاحب کو مدت بعد تک یاد رہا تھا۔

بھائی بھائی کے سامنے آ گئے تھے

خواتین و حضرات مظفر گڑھ کے اِس واقعے سے آپ دیکھیں کہ چیئرمین بھٹو کی جدوجہد اور پاکستان پیپلز پارٹی کی شکل میں اُن کا برپا کردہ انقلاب کس قدر تاریخ ساز نوعیت کا حامل تھا کہ بھائی بھائی کے سامنے آ گئے تھے۔ جس طرح مصطفےٰ کھر کا بھائی

www.bhutto.org

مصطفیٰ کھر کے سامنے آ گیا تھا۔

چیئرمین بھٹو کا پہلا معرکہ

ملتان کے اِس دورے سے چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ہمت، جرأت اور اُن کی نظریاتی شناخت کے امتحان کا آغاز ہو گیا جس کا پہلا معرکہ ملتان شیزان ہوٹل میں پیش آیا۔

ملتان کے دانشوروں اور معززین شہر جن میں وکلا حضرات اور سیاسی کارکن اور پڑھے لکھے لوگ شامل تھے جن میں طالب علموں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ اُن کی طرف سے چیئرمین بھٹو کو شیزان ہوٹل میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ یہ 18 جنوری 1968ء کا تاریخی دن تھا۔ بھٹو صاحب تقریباً اڑھائی بجے کے قریب شیزان ہوٹل پہنچ گئے۔ اُس وقت بھٹو صاحب کے ساتھ استقبالیے میں جانے والوں میں شیر سندھ میر رسول بخش تالپو بھی تھے۔ تقریب میں تلاوت قرآن پاک کے بعد میں نے نظم پڑھی۔ نظم کے ساتھ ہی حاضرین میں بہت جوش و جذبہ پیدا ہوا۔ میری نظم کے بعد شہریوں کی جانب سے بھٹو صاحب کو خطبہ استقبالیہ پیش کیا جا رہا تھا کہ ملتان کے جاگیردار صادق قریشی اور اُس کے کچھ کنونشن لیگ کے دوسرے اتحادی جاگیرداروں کے غنڈوں نے شیزان ہوٹل پر حملہ کر دیا۔ حملے کی قیادت ملتان کا ایک سب سے بڑا جانا پہچانا غنڈہ کر رہا تھا۔ گو یا وہ شخص ملتان کا اچھا شو کروالا تھا۔

غنڈوں نے جب شیزان ہوٹل کے اندر آنے کی کوشش کی تو ہوٹل کے ملازموں اور پارٹی کے کارکنوں نے ہوٹل کا دروازہ بند کر دیا مگر غنڈوں نے اینٹوں اور پتھروں سے دروازے کو توڑنا شروع کر دیا۔ ملتان کے ورکروں نے اور لاہور کے ورکروں نے جو اُس وقت بھٹو صاحب کے ساتھ اِس دورے میں شامل تھے۔ ہوٹل کی چھت پر چڑھ کر چھت پر پڑے بھاری پتھر نیچے غنڈوں پر پھینکنے شروع کر دیے۔ چھت پر پڑی اینٹوں کو اُٹھا کر غنڈوں کے سروں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ ہمارا مورچہ بلندی پر تھا۔ حکومت اور صادق قریشی کے غنڈے پسپا ہو کر ہوٹل سے کچھ دور ایک احاطے میں جمع ہو گئے تو وہاں ایک دلچسپ منظر دیکھنے میں آیا۔ وہ دلچسپ منظر یہ تھا کہ جہاں غنڈے جمع تھے وہاں اوپر کی عمارت ملتان کے طالب علموں کے ہوسٹل کی تھی۔ طالب علم

www.bhutto.org

غنڈوں کے حملے کو اپنے ہوسٹل کی چھت پر جمع ہو کر دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے جب غنڈوں کو اپنے ہوسٹل کی عمارت کے نیچے جمع ہوتے دیکھا تو اُنہوں نے ہوسٹل کی چھت سے غنڈوں پر اینٹیں اور پتھر پھینکنا شروع کر دیئے۔ طالب علموں کے پتھراؤ سے بہت سارے غنڈے زخمی ہو گئے۔ وہ اِس طرح کے اچانک حملے کی توقع ہی نہیں رکھتے تھے۔ طالب علموں کے اچانک حملے سے وہ تمام غنڈے جان بچا کر وہاں سے بھاگ گئے۔ سڑک پر کھڑے لوگوں نے تالیاں بجا کر طالب علموں کی حوصلہ افزائی کی۔ اِس طرح سے ملتان کے عوام بھی غنڈوں پر خشت باری کرنے میں مصروف ہو گئے۔

عوام اور غنڈوں کے درمیان یہ جنگ تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ ملتان کی پولیس دور کھڑی ہو کر یہ تمام تماشہ دیکھتی رہی مگر اُس نے غنڈوں کو وہاں سے بھگانے یا گرفتار کرنے کی کوئی کاروائی نہیں کی۔ میں نے چھت پر میر رسول بخش تالپور کو دیکھا۔ وہ اپنے حفاظتی پستول سے ہوائی فائر کر رہے تھے۔ مجھے رسول بخش تالپور کی بہادری کا یہ انداز بے حد پسند آیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی اِس کتاب میں جہاں بھی میر صاحب کا نام تحریر کیا ہے، اُن کے نام کے ساتھ شیر سندھ ضرور تحریر کیا ہے۔ اِس لئے کہ میں نے کسی دوسرے شیر کو ایوب حکومت کے خلاف چلائی گئی چیئرمین بھٹو کی تحریک میں ان کی طرح سینہ سپر نہیں پایا تھا۔ ویسے بھی سندھ میں لفظ شیر اُن کے نام کا لاحقہ تصور کیا جاتا تھا۔

غنڈوں سے فارغ ہو کر میں بے حد تیزی کے ساتھ نیچے بھٹو صاحب کے پاس پہنچا۔ خدا گواہ ہے کہ وہ شخص تنہا اپنی کرسی پر انتہائی اطمینان کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے ماحول میں گرم جوشی پیدا کرنے کے لئے بھٹو صاحب کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ بھٹو زندہ باد، بھٹو زندہ باد کے نعروں کے بعد لوگوں نے اپنی نشستوں پر دوبارہ بیٹھنا شروع کر دیا۔ اور اِس طرح چیئرمین بھٹو نے بغیر کسی جھجک کے اُٹھ کر اپنی تقریر کا آغاز کر دیا۔ اُن کا پہلا جملہ مجھے یاد ہے۔ دوستو! غنڈے، بدمعاش کبھی عوام کا سامنا نہیں کر سکتے۔ یہ حکومت غنڈوں کی حکومت ہے۔ جس طرح یہ غنڈے آج آپ کی قوت سے بھاگ گئے ہیں۔ اِسی طرح ان کے آقا بھی عوام کی قوت کے آگے زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکیں گے۔ میں عوام کی مدد سے ان کے حکمران آقا کو بھگا کر دم لوں گا۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کا دوسرا معرکہ

دوسرے دن خانیوال کے پارٹی کے بنیادی رکن چوہدری مجید انور ایڈووکیٹ نے خانیوال میں دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک پروگرام کے مطابق خانیوال بار میں چیئرمین بھٹو کو خطاب کے لئے خانیوال آنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ چیئرمین بھٹو نے اپنی تحریک کی یہ حکمت عملی بنائی تھی کہ ایوب حکومت کی گیارہ سالہ مسلط کی گئی دفعہ 144 کو ہر جگہ توڑا جائے تا کہ لوگوں کے دلوں سے ایوب خان حکومت کا خوف ختم کیا جائے۔ میرے مشاہدے کے مطابق چیئرمین بھٹو کی یہی وہ کامیاب حکمت عملی تھی جس نے چیئرمین بھٹو کو پاکستان کے باقی تمام سیاست دانوں اور سیاسی لیڈروں پر فوقیت عطا کر دی تھی۔ پاکستان کے دوسرے تمام بوڑھے لیڈر دفعہ 144 کے خوف سے دبک کر زندگی گزارتے چلے آ رہے تھے۔ وہ کسی جگہ جلسہ جلوس کرنے کی ہمت سے عاری ہو چکے تھے۔ اُن کی نسبت چیئرمین بھٹو ایک شعلہ جوالا بن کر لوگوں کے درمیان چلے گئے۔

چیئرمین بھٹو کی اِس حکمت عملی کا راستہ حکومت غنڈوں کی مدد سے روکنا چاہتی تھی۔ حکومت چیئرمین بھٹو کو خوف زدہ کرنا چاہتی تھی۔ کھر ہاؤس سے ہمارا مختصر سا چھ سات کاروں کا قافلہ صبح 10 بجے خانیوال کے لئے روانہ ہوا۔ بھٹو صاحب کی گاڑی کو مصطفیٰ کھر ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب ہمارا یہ چھوٹا سا قافلہ قادر پورراں پہنچا جو ملتان سے تقریباً 40 کلومیٹر دور تھا تو سڑک پر صادق قریشی کے غنڈے راستہ روکے کھڑے تھے۔ ہم لوگوں کو تو یوں لگا کہ یہ لوگ بھٹو صاحب کی جھلک دیکھنے کیلئے کھڑے ہیں۔ جس طرح کہ عام طور پر ہر جگہ راستے میں ہوتا تھا۔ مگر جب ہماری گاڑیاں اُن کے قریب پہنچیں تو وہ پیپلز پارٹی کو گالیاں دیتے سنائی دیئے۔ اُن کی بدزبانی سن کر مصطفیٰ کھر کے آگے جانے والی گاڑی نے کھر کو اشارہ کیا کہ گاڑی واپس موڑ لی جائے۔ اِس گاڑی میں سے کسی نے زور زور سے کہنا شروع کر دیا۔ گاڑی واپس لے جاؤ، واپس لے جاؤ۔ مصطفیٰ کھر نے ایک ہی لمحے میں گاڑی واپس موڑ لی۔ اتنے میں غنڈوں نے پہلی گاڑی کے چاروں ٹائر کسی تیز دھار آلے کے ساتھ کاٹ ڈالے۔

مصطفیٰ کھر کی گاڑی واپس ہو جانے سے باقی گاڑیاں بھی واپس موڑ لی گئیں۔ مصطفیٰ کھر چونکہ اِس علاقے سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے سڑک کا راستہ چھوڑ کر ایک کچا راستہ اختیار

www.bhutto.org

کرلیا۔ وہ راستہ ایک نہر پر جا کر ختم ہو گیا۔ اِس طرح چیئرمین بھٹو کی گاڑی براستہ نہر خانیوال پہنچ گئی۔ اُن کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہوئے ہم لوگ بھی خانیوال کی جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ خانیوال کا یہ جلسہ بظاہر تو وکلاء کی جانب سے پہلا استقبالیہ ہی کی شکل میں تھا مگر یہ جلسہ عوام کے بڑھ جانے کی وجہ سے ایک جلسہ عام کی شکل اختیار کر گیا۔ لوگوں میں یہ افواہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی کہ بھٹو صاحب پر راستے میں قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔ لوگوں نے جب بھٹو صاحب کو اپنے درمیان زندہ سلامت دیکھا تو اُن کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ لوگوں میں بے حد جوش و جذبہ تھا۔ لوگ ایوب کتا کا نعرہ لگائے جا رہے تھے۔ طالب علم ایوب خان کا ماتم کئے جاتے تھے۔ اِس طریقے سے لوگ گالیوں اور ماتم کے ساتھ ایوب حکومت کی غنڈہ گری کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے تقریباً 2 گھنٹے تک لوگوں سے خطاب کیا۔ اِس طرح بھٹو صاحب اور پارٹی ورکروں اور عوام نے ایوب حکومت کے غنڈوں کا دوسرا حملہ ناکام بنا کر ایوب حکومت کی دفعہ 144 کے خوف کے پرخچے اُڑا دیئے۔ واضح رہے کہ خانیوال کا یہ اجتماع بھٹو صاحب کا پہلا عوامی جلسہ تھا جو ایوب حکومت کے گیارہ سالہ دور میں پہلی مرتبہ مغربی پاکستان میں دیکھنے میں آیا تھا۔

(نوٹ) یہاں ہر ایک بات سیاسی کارکنوں اور عوام کی آگہی کیلئے لکھنا ضروری ہے کہ اِس کامیابی کا تمام تر سہرا چیئرمین بھٹو کی ڈیسپریٹ قسم کی بہادری کے سر تھا۔ اگر وہ خود یہ رسک نہ لیتے تو حکومت کے خوف کا جمود ہرگز نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ایک لیڈر کا عوام کیلئے بے خوف ہونا لازمی ہے اور جب تک کوئی لیڈر اپنی جان کا رسک نہیں لیتا، اپنی جان کو داؤ پر نہیں لگاتا، وہ اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

چیئرمین بھٹو کی سیاسی تحریک اور اُن کے جلسے جلوس ایک سیاسی تحریک کم لگتے ہیں، سیاسی معرکے زیادہ لگتے ہیں۔ اِس لئے میں نے اُن کی جدوجہد کے آغاز کے باب کا عنوان ''چیئرمین بھٹو کے سیاسی معرکے'' تحریر کیا ہے جو چیئرمین بھٹو کی جدوجہد کے انداز کے لئے بے حد برحق اور موزوں عنوان دکھائی دیتا ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کے سیاسی معرکوں کا حال بھی آنحضرتؐ کے ابتدائی دور کا سا تھا جن میں رسالت مآبؐ کے ساتھ بمقابلہ قریش مکہ کے لشکروں کے بے حد محدود تعداد میں لوگ ہوتے تھے۔ جن کے پاس نہ تو گھوڑے ہوتے تھے اور نہ ہی سامانِ جنگ ہوتا تھا۔ اُن کا

سامانِ جنگ اُن کا ایمان ہوتا تھا۔ چیئرمین بھٹو کے سیاسی معرکوں میں اُن کے ساتھ گنتی کے چند سیاسی کارکن ہوتے تھے جن کی جدوجہد کا مدار اُن کے عزم اور اُن کی سیاسی نظریاتی کنوکشن پر ہوتا تھا۔ اُن کے مقابلے میں فوجی حکمرانوں کے جدید اسلحے سے لیس لشکر ہوتے تھے اور فوجی حکمرانوں کے اتحادی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے تمام وسائل اور اُن کے غنڈے ہوتے تھے۔ اِس کے باوجود فتح چیئرمین بھٹو کی اور عوام کی جدوجہد کی ہوا کرتی تھی۔

تاریخ کے ان دونوں حوالوں سے ایک ہی بات ثابت ہوتی ہے کہ انسانوں کے سچے جذبوں اور نظریات کے سامنے دنیا کے تمام وسائل ہیچ ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر سیاسی کارکن کو اپنے نظریات کی صداقت پر اعتماد اور یقین ہونا چاہیے۔

ملتان کے جلسے کی حکمتِ عملی

خانیوال کے معرکے کے بعد رات کو کھر ہاؤس میں چیئرمین بھٹو کی صدارت میں ایک غیر رسمی قسم کی مجلس ہوئی جس میں میر رسول بخش تالپور، غلام مصطفےٰ کھر، ملک مختار اعوان، ملک آفتاب ربانی، ملک حامد سرفراز، خالد چوہدری، میاں ساجد پرویز، نوید ملک، امان اللہ خان، صاحبزادہ فاروق علی، فاروق بیدار، ملک پرویز اختر، حلیم بابر، میاں اسلم، احمد رضا، رفیع منیر اور میں شریک تھا۔ اِن ناموں کے علاوہ بھی کچھ لوگ تھے جن کے نام مجھ یاد نہیں آرہے ہیں۔ ملتان کے کارکنوں میں ایک لڑکا لنگڑا کر چلا کرتا تھا۔ وہ خاصا بہادر لڑکا تھا۔ بعد میں وہ وکیل بن گیا تھا۔ وہ بھی اِس مجلس میں شریک تھا۔ اِس مجلس میں دوسرے دن ملتان کے قاسم باغ میں ہونے والے جلسہ عام کے بارے غور وخوص کرتا تھا اور جلسے کو کامیاب بنانے کی تیاری اور منصوبہ بندی کرنا تھی۔ چیئرمین بھٹو نے اپنے مخصوص انداز میں تمام دوستوں کو قادر پورراں کے حملے میں محفوظ رہنے پر مبارکباد دی اور خانیوال کے جلسے کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ چیئرمین کے الفاظ تھے۔ جیسے جیسے تم لوگ آگے بڑھتے جاؤ گے۔ ویسے ویسے حکومت کی انتظامیہ پیچھے ہٹتی جائے گی۔ اُنہوں نے کہا۔ میں نے خانیوال کے جلسے میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ پولیس جو لوگوں کو جلسہ گاہ کی طرف آنے سے روکنے پر متعین تھی، وہ لوگوں کو آنے سے روکنے میں ناکام ہو کر ایک طرف ہٹتی جاتی تھی اور جب میں سٹیج پر پہنچا تو پولیس راستے سے مکمل طور پر ہٹ چکی تھی۔ ہم کو لوگوں کا خوف

www.bhutto.org

دور کرنا ہے۔ کل ملتان شہر میں تمام دن رات گئے تک تم لوگ چھ سات گاڑیوں پر شہر میں پھیل جاؤ اور ڈٹ کر جلسے کا اعلان کرو۔ حکومت اگر ایک اعلان کرنے والی گاڑی کو پکڑ لے تو اِس کی پروانہ کی جائے۔ اُس کی جگہ دوسری گاڑی اعلان کیلئے بھیج دی جائے۔ اِس طریقے کے ساتھ حکومت کی انتظامیہ کو تھکا دیا جائے۔ وہ ایک آدھ اعلان کرنے والی گاڑی پکڑنے کے بعد خود بخود تھک جائیں گے۔ پیچھے ہٹ جائیں گے۔ ہمارے پاس جلسے کے اعلان یا جلسے کی مشہوری کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ماسوائے کے اعلانات کرنے کے۔ لاہور کے دوستوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اعلان کرنے والی گاڑیوں کے ساتھ شہر میں جائیں اور ہر بات کی خبر خود رکھیں۔ چیئر مین بھٹو نے میر رسول بخش تالپور کو کہا کہ تالپور صاحب! ملتان کا جلسہ میری زندگی کا اہم ترین جلسہ ثابت ہوگا۔ اِس جلسے کی کامیابی سے پنجاب میں ایوب خان کی شکست کا اعلان ہو جائے گا۔ میں قاسم باغ میں ہر صورت تقریر کروں گا۔ یہ جلسہ میری سیاست کا اور میری پارٹی کا پہلا امتحان ثابت ہوگا۔ چیئر مین بھٹو کی اِن باتوں کے بعد مجلس میں شریک تمام دوستوں نے اُن کے ساتھ عہد کیا کہ ہم آپ کے اِس امتحان میں ہر صورت پورے اُتریں گے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا بے حد ضروری ہے کہ لاہور ہی کی طرح ملتان میں بھی کوئی قابل ذکر سیاست دان پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ ہمارے ساتھ صرف غلام مصطفیٰ کھر کی ذات تھی جو ملتان کی سیاست میں ایک جونیئر آدمی تھا۔ مصطفیٰ کھر کے علاوہ ملتان میں کوئی اہم سیاست دان یا جاگیردار پارٹی میں شامل نہیں ہوا۔ البتہ غلام مصطفیٰ کھر کی کوشش تھی کہ ملتان کے تمام جاگیردار پیپلز پارٹی میں شامل ہو جائیں۔ مگر وہ تمام جاگیردار ضلع ملتان میں پیپلز پارٹی کو ناکام بنانے کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کئے ہوئے تھے۔

ایک درمیانے درجے کا جاگیردار واہلا تھا۔ مصطفیٰ کھر کی کوشش تھی کہ وہ پارٹی میں شامل ہو جائے مگر وہ ہماری رات کی محفلوں میں بھٹو صاحب کے سامنے بیٹھ کر پیپلز پارٹی کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔ اس کے باوجود مصطفیٰ کھر اور بھٹو صاحب بدمزہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ یہ کمیوں کمینوں کی پارٹی ہے۔ لہٰذا یہ بات تاریخی اعتبار سے یاد رہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو چیئر مین بھٹو اور پاکستان کے غریب عوام اور کارکنوں نے جنم دیا تھا، جاگیردار بعد میں شامل ہوئے تھے۔

مگر تاریخ کا یہ بے رحم مذاق ہر تحریک کی کامیابی کے بعد ایک سا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

جب ابوسفیان کا گھر جائے امان بن جایا کرتا ہے۔آپ دیکھیں گے کہ وہ صادق قریشی جس کے غنڈے دو بار پہلے حملہ کر چکے تھے، تیسری بار جلسہ گاہ پر اُن کا حملہ ہونا باقی تھا۔ وہی صادق قریشی پیپلز پارٹی کی تحریک کی کامیابی کے بعد نہ صرف پیپلز پارٹی میں لیڈر بنا دیا گیا بلکہ پنجاب کا حاکم اعلیٰ بنایا گیا۔ پیپلز پارٹی کی جدوجہد کا اور چیئرمین بھٹو کی جدوجہد کا اِس سے زیادہ مذاق نہیں اُڑایا جا سکتا تھا۔ افسوس کہ بعد میں اِن تمام جاگیرداروں نے چیئرمین بھٹو کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ابوسفیان کی اولاد نے رسول پاکؐ کی آل اولاد کے ساتھ کیا تھا۔

دوسرے دن صبح سے لے کر رات تقریباً بارہ بجے تک پارٹی کے جیالے کارکن گاڑیوں اور تانگوں میں باقاعدہ لاؤڈ اسپیکر لگا کر جلسے کا اعلان کرتے رہے۔ بھٹو صاحب کی بات سچ ثابت ہوئی۔ دن بارہ بجے تک تو پولیس ورکروں کو اعلان کرنے سے روکتی رہی۔ مگر بعد دوپہر ہمارے ورکرز بہادری کے ساتھ جلسہ کا اعلان کرتے رہے۔ جلسے کے اعلانات رات گئے تک جاری رہے۔ ہم لاہور کے کارکن تمام دن اعلان کرنے والی گاڑیوں کے ساتھ رہے۔ اکثر مقامات پر میں نے خود جلسے کی اہمیت کے بارے میں اعلان کیا۔ ہم لاہور کے کارکن تمام دن اعلان کرنے والی گاڑیوں کے ساتھ گھومتے رہے تھے، ہم بھی شام کو قاسم باغ پہنچ گئے۔ جلسہ گاہ میں ایک عارضی سٹیج بنائی گئی تھی جس کی اونچائی تقریباً تین فٹ کے برابر تھی۔ سٹیج کے چاروں جانب کرسیوں کی باڑیں لگا دی گئی تھیں تاکہ لوگوں سے سٹیج محفوظ رہ سکے۔ رات کو ملتان کے کارکنوں نے سٹیج کے نیچے چھوٹے ڈنڈے لا کر چھپا دیئے۔ یہ ڈنڈے اِس لئے لائے گئے تھے کہ اگر غنڈے سٹیج پر حملہ کریں تو اُن کو آگے سے روکا جا سکے۔ کچھ اینٹ روڑے بھی سٹیج کے نیچے ڈھیر کر دیئے گئے تھے۔ اس جلسے کی تیاری میں ملتان کے بابو فیروز دین کا کردار بے حد نمایاں تھا۔ بابو فیروز دین ہندوستان کے علاقے روہتک حصار سے آ کر ملتان آباد ہوا تھا۔ ملتان میں یہ شخص اُردو بولنے والے مہاجروں کا لیڈر تھا۔ ملتان کے اس جلسے کو کامیاب بنانے میں بابو فیروز دین اور اُس کے آدمیوں کی بڑی مدد شامل تھی۔

چیئرمین بھٹو کا ملتان کو فتح کرنے کا معرکہ

رات کو چیئرمین بھٹو کی موجودگی میں ہم نے جلسے کی کاروائی کا خاکہ طے کیا۔ طے یہ پایا کہ

www.bhutto.org

سب سے پہلے میری نظم ہوگی۔ اس کے بعد باقی کارکنوں اور موجود لیڈروں کی تقریریں ہوں گی۔ تقریروں کے درمیان وقفے وقفے سے مجھ سے نظمیں پڑھوائی جائیں گی۔ اس دوران جلسہ گاہ میں ہر طرف لوگوں پر نظر رکھی جائے گی اور اس بات کا پتہ لگایا جائے گا کہ غنڈے کس طرف بیٹھے ہیں۔ جب غنڈوں کا پتہ چل جائے گا تو پھر تمام کارکن اُن کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو جائیں گے یا اُن کو جلسہ گاہ سے بھگا دیا جائے گا یا اُن کو دبک کر بیٹھ کر جلسہ کی کاروائی سننے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ لہٰذا اس حکمت عملی کے تحت جب ہم جلسہ گاہ پر مکمل قابو پالیں گے تو بھٹو صاحب کو جلسہ گاہ میں لایا جائے گا۔ ہم تمام کارکن میر رسول بخش تالپور کی قیادت میں دن کے ایک بجے کے قریب جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ جاتے ہی ہم نے تلاوت کلام پاک سے جلسہ شروع کرایا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد میں نے نظم پڑھنا شروع کر دی۔ نظم کے بعد ملک حامد سرفراز کی تقریر شروع ہوگئی۔ اب تقریر کے دوران ہم کو علم ہوگیا کہ جلسے کی دائیں جانب ایک ہی جگہ پر غنڈے جمع ہیں۔ وہ تقریروں کے دوران پیپلز پارٹی کے خلاف نعرے مارنا شروع کر دیتے تھے۔

ہم نے سٹیج سے اُن کو خاموش رہنے کا کہنا شروع کیا۔ میر رسول بخش تالپور کی تقریر سے پہلے مجھے ایک بار پھر نظم پڑھنے کا کہا گیا۔ میں نے نظم پڑھنے سے پہلے لوگوں سے اپیل کی کہ آج ملتان میں یہ جلسہ تاریخی جلسہ ہے۔ آج آپ کے محبوب قائد، قائد عوام چیئرمین بھٹو آپ سے یہاں آکر خطاب کریں گے۔ آج عوام سے درخواست ہے کہ وہ اس جلسہ کو خود کامیاب بنائیں۔ یہ دائیں جانب آپ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ ڈنڈے اُٹھائے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ جلسہ کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ آپ لوگ ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ یہ چند مٹھی بھر لوگ ہیں۔ آپ سے گذارش ہے کہ آپ اِن لوگوں پر کڑی نظر رکھیں۔ اگر یہ جلسہ میں کوئی غنڈہ گردی کرنے کی کوشش کریں تو اِن کو ایسا سبق سکھائیں کہ دوبارہ یہ غنڈے کبھی کسی عوامی جلسہ میں آنے کی جرات نہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے انتظامیہ کو مخاطب کر کے کہا کہ پولیس اور انتظامیہ یہ دیکھ رہی ہے کہ کچھ لوگ ڈنڈے اُٹھائے ہوئے جلسہ گاہ میں آئے ہیں اور وہ اُن کو گرفتار کر کے جلسہ سے باہر نہیں لے جا رہی۔ اگر آج یہاں یہ غنڈے عوام کے ہاتھوں قتل ہو گئے تو اس کی تمام تر ذمہ داری انتظامیہ پر ہوگی۔ انہوں نے کارکنوں کو کہا کہ آج یہاں زندگی کا امتحان ہے۔ آج یا ہم رہیں گے یا غنڈے رہیں گے۔ اِن جذباتی الفاظ کے بعد مجھے ایک بار پھر نظم پڑھنے کا کہا گیا۔ ہماری کوشش تھی کہ

www.bhutto.org

غنڈوں کو بھٹو صاحب کے آنے سے پہلے جلسے سے نکال دیں۔ مگر غنڈوں کو کنونشن لیگ کے جاگیرداروں اور انتظامیہ نے کہہ رکھا تھا کہ وہ سٹیج پر اُس وقت حملہ کریں جب بھٹو صاحب سٹیج پر آجائیں۔ ٹھیک اڑھائی بجے کے قریب چیئرمین بھٹو جلسہ گاہ میں تشریف لائے۔ اُن کی جلسہ گاہ میں آمد کیا ہوئی تھی، ایک زلزلہ سا جلسہ گاہ میں محسوس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے بھونچال آگیا ہو۔ قاسم باغ میں بس ایسا ہی ہوا۔ چیئرمین بھٹو اپنے مخصوص جلال و جمال کے ساتھ سٹیج پر متحرک ہو گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ عوام کو اپنی تالیوں کے ساتھ خوش آمدید کہا کرتے تھے۔ اُن کی تالیوں کا جواب برابر تالیوں سے دیتے تھے۔ یہ سلسلہ وہ اُس وقت تک جاری رکھتے تھے جب تک اُن کو جلسہ گاہ میں آنے والا ہر انسان دیکھ نہیں لیتا تھا۔ وہ سٹیج کے دائیں بائیں تیزی سے گھوم کر لوگوں کو اپنی شکل دکھایا کرتے تھے۔ چیئرمین بھٹو کی مثال شہد کی کوئن مکھی کی سی تھی۔ جس سمت وہ رُخ کرتے، تمام لوگوں کے رُخ اُس طرف کو ہو جاتے تھے۔ خدا جانے وہ کون سا مس مرزم تھا یا مقناطیسیت تھی جو لوگوں اور چیئرمین بھٹو کے درمیان قائم ہو جاتی تھی۔ عوام کی اور بھٹو کی آنکھوں آنکھوں میں تار بندھ جاتی تھی۔ کوئی شے اُن کے درمیان حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ اُن کی جھلک دیکھ کر لوگ دیوانے ہو جایا کرتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اِس طرح کا عالم کسی دوسرے سیاسی لیڈر میں بہت کم پایا ہے۔

چیئرمین بھٹو جب جلسہ گاہ کے لوگوں کے جوش و جذبہ پر قابو پا چکے تو اُنہوں نے اپنے خطاب کا آغاز کیا۔ اُن کی تقریر کا پہلا جملہ تھا کہ میں ملتان کے بہادر عوام کو سلام پیش کرتا ہوں۔ آج آپ نے پاکستان سے آمریت ختم کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ بھٹو صاحب ابھی اپنی تقریر کے آغاز میں ہی تھے کہ جلسہ گاہ کی دائیں جانب سے غنڈوں کے گروہ نے سٹیج کی سمت بڑھنا شروع کر دیا۔ وہ سب پارٹی کے کارکن جو اُس گروہ کے آگے باڑ کئے کھڑے تھے، اُن سے گتھم گتھا ہو گئے۔ بھٹو صاحب نے لوگوں کو غنڈوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آج اِن کا علاج کر دیا جائے۔ آج اِن میں سے کوئی بچ کر نہ جا سکے گا۔ اِس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب نے لوگوں کو جوش دلانے کے لئے اپنا کوٹ اُتار کر مجھے دے دیا۔ اُنہوں نے اپنا ایک مکا غنڈوں کی طرف لہرایا۔ جلسے میں موجود لوگوں نے غنڈوں پر ہلہ بول دیا۔ کارکنوں اور لوگوں نے غنڈوں کو پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ غنڈوں میں سب سے بڑے غنڈے نے ایک خاصا لمبا تلوار نما چھرا لہرانا شروع کر

دیا۔ چھرے کے خوف سے لوگ اِدھر اُدھر بھاگنے لگ گئے۔ وہ غنڈا ڈیگر یا چھرا لہراتا ہوا آگے بڑھتا آیا اور سٹیج کے قریب کرسیوں کی باڑ تک پہنچ گیا۔ ایک کارکن نے لوہے کی کرسی اُٹھا کر اُس غنڈے کے سر پر دے ماری۔ کرسی کی ٹانگ غنڈے کی آنکھ پر لگی جس سے اُس کی آنکھ اُبل کر باہر نکل آئی۔ یہ غنڈہ حملہ آوروں کا سردار تھا۔ اُس نے چھرا نیچے پھینک دیا۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑنے لگ گیا۔ خدا کے لئے مجھے معاف کردو۔ وہ بھٹو صاحب کے نعرے مارنے لگ گیا۔ پیپلز پارٹی کے نعرے مارنے لگ گیا۔ بھٹو زندہ باد، پیپل پارٹی زندہ باد۔ وہ اَن پڑھ تھا۔ پیپلز پارٹی نہیں کہہ سکتا تھا۔ پیپل پارٹی کہتا جا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ آنے والے تمام غنڈے بھاگ گئے۔ وہ اور اُس کا ایک دوسرا ساتھی زخمی ہو کر سٹیج کے قریب گر گئے۔ تب کہیں جا کر پولیس آگے آئی اور اِن دونوں کو ہجوم سے چھڑا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ جلسے میں امن وامان ہو گیا۔ اِس موقع پر بھی میں نے دیکھا کہ میر رسول بخش تالپور پستول تان کر بھٹو صاحب کے پیچھے کھڑا تھا۔ بھٹو صاحب نے اپنی تقریر کو دوبارہ شروع کیا۔ وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر کرتے رہے۔ جلسہ گاہ میں ہر طرف پیپلز پارٹی کے پرچم لہراتے رہے۔ اِس طرح چیئرمین بھٹو نے ایوب خان کی آمریت کو ملتان کے قاسم باغ میں پہلی شکست دے کر ملتان فتح کر لیا۔ واضح رہے کہ مصطفےٰ کھر نے اپنے شہر کے اس پہلے جلسے میں بھی تقریر نہیں کی تھی۔

ملتان میں ایوبی آمریت کے غنڈوں اور انتظامیہ کی شکست سے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی لوگوں کے دلوں پر دھاک بیٹھ گئی۔ جلسہ گاہ سے جب ہم واپس کھر ہاؤس جا رہے تھے تو کھر گاڑی چلا رہا تھا۔ میں اُس کے ساتھ آگے بیٹھا تھا۔ بھٹو صاحب اور رسول بخش تالپور گاڑی میں پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب نے اپنا کوٹ مجھے دے دیا تھا۔ میں نے کوٹ کو محفوظ رکھنے کے لئے خود پہن لیا تھا جو مجھے بہت کھلا تھا۔ میں وہ کوٹ فوری طور پر بھٹو صاحب کو واپس دینا بھول گیا۔ بھٹو صاحب نے گاڑی ہی میں مجھے کہا۔ یہ کوٹ تمہیں بہت کھلا ہے۔ میں نے فوراً کوٹ اُتار کر بھٹو صاحب کو دے دیا اور کہا کہ جوش و جذبے میں اِس کو واپس کرنا یاد ہی نہیں رہا۔ ہم نے بھٹو صاحب کو اُن کے جلسے کی کامیابی پر مبارکباد دی اور کھر ہاؤس پہنچ گئے۔

کچھ ہی وقت کے بعد تمام کارکن کھر ہاؤس پہنچ گئے۔ کھر ہاؤس میں میلے کا سماں بن گیا۔ ہر شخص کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ ہم نے جلسے کی کامیابی کا خوب جشن منایا۔ اِس دوران

www.bhutto.org

میاں افتخار الدین کا بیٹا عارف افتخار کھر ہاؤس آ گیا۔ اُس کو میر رسول بخش تالپور کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ میر رسول بخش تالپور نے بھٹو صاحب سے عارف افتخار کی آمد کا ذکر کیا۔ بھٹو صاحب نے سندھی زبان میں تالپور صاحب کو کہا کہ میر سائیں، مجھے مردِ میدان لوگوں کی ضرورت ہے۔ یہ خواتین نما آدمی میرے ساتھ کیسے چل سکتا ہے۔ ویسے آپ اِس کو بلائیں۔ اِس کا باپ میرے والد کا بہت گہرا دوست تھا۔ سندھ میں میاں افتخار الدین ہمارے گھر پر ہی ٹھہرا کرتا تھا۔ عارف افتخار نے جلسے کی کامیابی کی مبارکباد دی۔ بھٹو صاحب کی بہادری کی تعریف کی مگر اندر سے وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ حکومت سے ڈرتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں اجازت لے کر چلتا بنا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ملتان کا ایک پیدائشی بڑا جاگیردار حامد رضا گیلانی جو ایوب خان کی کنونشن لیگ کا بہت بڑا عہدے دار تھا۔ مصطفےٰ کھر کا ملتان کی سیاست میں حامد رضا گیلانی کے دھڑے سے تعلق تھا۔ جلسہ سے ایک رات پہلے وہ کھر ہاؤس آیا اور اُس نے بھٹو صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے۔ جلسے میں آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ جلسے کی کامیابی کے بعد رات کو وہ آیا۔ اُس نے آ کر سیدھے بھٹو صاحب کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر کہا۔ سائیں! ہم ہار گئے ہیں، آپ جیت گئے ہیں۔ حامد رضا گیلانی کا ہم ہار گئے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ایوب خان کی حکومت ہار گئی ہے۔

چیئرمین بھٹو کا چوتھا معرکہ

ملتان کے جلسے کے بعد ہمارا دوسرا عوامی جلسہ ساہیوال میں تھا جس کا پرانا نام منٹگمری تھا۔ انگریزوں کے زمانے میں انگریز جنرل منٹگمری کے نام پر اِس شہر کا نام منٹگمری رکھا گیا تھا۔ اِس شہر میں ہمارے ساتھ مصیبت یہ ہوئی کہ حکومت نے مقامی پیپلز پارٹی کو کسی بھی کھلی جگہ پر جلسہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ رات کو جب ہمارا قافلہ چیئرمین بھٹو کی قیادت میں منٹگمری پہنچا تو مقامی پارٹی کے لوگ جن میں کچھ وکیل حضرات پیش پیش تھے، وہ بہت پریشان تھے۔ اُنہوں نے حکومت کی زیادتی کے بارے میں بھٹو صاحب کو آگاہ کیا۔ اِن وکلاء میں راؤ عبدالستار، سردار علیم ایڈووکیٹ، چوہدری محمد حنیف، چوہدری فضل کریم زیادہ معتبر لوگ تھے۔ بھٹو صاحب نے شیخ صفدر ایڈووکیٹ کو کہا کہ تم ڈپٹی کمشنر سے جا کر بات کرو۔ شیخ صفدر مرحوم شہر

www.bhutto.org

کے اِن معتبر وکلاء کے ہمراہ ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا اور اُس کو جا کر بھٹو صاحب کا فیصلہ سنایا کہ وہ ہر صورت کل یہاں جلسہ عام سے خطاب کریں گے۔ ڈپٹی کمشنر نے ایک گھنٹے کی مہلت چاہی۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈپٹی کمشنر نے چاردیواری کے اندر جلسہ کرنے کی اجازت دے دی۔

تمام رات یہ فیصلہ ہوتا رہا کہ جلسہ کس جگہ کیا جائے۔ کافی رات گئے فیصلہ کیا گیا کہ راؤ عبدالستار ایڈووکیٹ کی کوٹھی میں جلسہ کیا جائے گا۔ راؤ عبدالستار ایڈووکیٹ کا بنگلہ ایک کھلے علاقے میں تھا۔ بنگلے کی عمارت بہت بوسیدہ اور پرانی تھی۔ بنگلے کا لان کافی بڑا تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ صبح آٹھ بجے شہر میں جلسے کا اعلان کر دیا جائے اور جلسے کا وقت دوپہر 2 بجے بتایا جائے۔ بنگلہ شہر کے مشہور علاقے میں تھا جہاں لوگوں کو پہنچنے میں مشکل پیش نہیں آسکتی تھی۔ خالد چوہدری، شیخ صفدر علی اور میں صبح سویرے اعلان کرنے والوں کے ساتھ شہر میں نکل گئے۔ ہم نے تمام شہر میں اپنی تسلی کے مطابق جلسے کا اعلان کیا۔ تقریباً ایک بجے کے قریب ہم لوگ اعلانات سے فارغ ہو کر جلسہ گاہ کے بنگلہ میں پہنچ گئے۔ ہم نے اعلان کرنے والے لڑکوں کو واپس شہر میں اعلان کیلئے بھیج دیا۔ جب ہم جلسہ گاہ پہنچے تو وہاں معلوم ہوا کہ شہر کا کوئی دوکان دار لاؤڈ اسپیکر دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ ڈرتے ہیں کہ حکومت اُن کو گرفتار کر لے گی۔ یہ مسئلہ ہمارے لئے بے حد سنگین بن گیا۔

شیخ صفدر علی چونکہ پرانا منٹگمری کا رہنے والا تھا۔ اُس نے ایک وکیل کو ساتھ لیا اور اپنے چاچا کے ہوٹل گیا۔ اُس کا چاچا شہر کا مشہور آدمی تھا جس کا نام بابو لال دین تھا۔ اُس شخص نے فوری طور پر لاؤڈ اسپیکر لے کر دیئے۔ لاؤڈ اسپیکرز حاصل ہو جانے پر ہمارے تمام مسئلے حل ہو گئے۔ ہم تمام کارکنوں نے لاؤڈ اسپیکروں کے کاریگر کے ساتھ مل کر بنگلہ میں موجود درختوں پر لاؤڈ اسپیکر فٹ کرنے شروع کر دیئے۔ جب یہ اسپیکر لگائے جا رہے تھے، اُس وقت لوگ بنگلہ میں آچکے تھے۔ بنگلے کا لان لوگوں سے بھر چکا تھا۔ اب لوگ بنگلے کے باہر اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے۔ دوپہر کے دو بجے چکے تھے۔ ہجوم کافی زیادہ ہو چکا تھا۔ جلسہ کی سٹیج بنگلہ کی بالکونی کو بنایا گیا تھا۔ میر رسول بخش تالپور اور ملک حامد سرفراز اور ہم تمام لوگوں نے فیصلہ کیا کہ فوری طور پر جلسہ شروع کر دیا جائے۔ یہاں پر یہ بات تحریر کرنے کے قابل ہے کہ مقامی لوگوں میں کوئی وکیل بھی جلسے کی سٹیج یعنی بالکونی پر چڑھنے کو تیار نہ ہوا۔ خالد چوہدری کو سٹیج سیکرٹری بنا دیا گیا۔ تلاوت قرآن پاک کا اعلان کیا گیا۔ تلاوت کلام پاک کے بعد ملک حامد سرفراز نے لوگوں سے خطاب کرنا شروع کیا۔ اِس دوران

www.bhutto.org

ایک اسپیکر جو بالکونی کے ساتھ ملحقہ درخت پر باندھا گیا تھا، اُس کا رُخ رسی کے ڈھیلہ ہونے کی وجہ سے نیچے کی طرف لڑھک گیا۔ جس کی وجہ سے لوگوں نے آواز نہ آنے کے اشارے شروع کر دیئے۔ میں چونکہ بالکونی پر درخت کے قریب کھڑا تھا۔ میں لپک کر لاؤڈ اسپیکر کا رُخ ٹھیک کرنے کیلئے درخت پر چڑھ گیا۔ رسی کو دوبارہ مضبوطی سے باندھنے میں اور اسپیکر کا رُخ درست کرنے میں مجھے کافی وقت لگ گیا۔ خالد چوہدری نے بغیر مجھے دیکھے اعلان کر دیا کہ اب شاعرِ عوام اسلم گورداسپوری آپ کو اپنا تازہ کلام سنائیں گے۔ میں چونکہ درخت پر چڑھا ہوا تھا۔ میں نے درخت پر سے خالد چوہدری کو آواز دی کہ میں آ رہا ہوں۔ خالد چوہدری نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ حضرات۔ شاعر صاحب درخت پر لاؤڈ اسپیکر درست کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ لوگوں نے مجھے درخت سے نیچے بالکونی پر اُترتے دیکھا تو جلسہ گاہ میں موجود تمام لوگوں نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اب نعرے ہی نعرے تھے اور تالیاں ہی تالیاں تھیں۔

یہ بالکل لکی ایرانی سرکس کی طرح کا سین تھا۔ لوگوں کو میرا یہ کارکنی کا انداز انتہائی اچھا لگا۔ جب میں نے نظم پڑھنا شروع کی تو لوگوں نے مجھے بہت داد دی۔ یہ صرف داد نہ تھی بلکہ ہماری حوصلہ افزائی تھی۔ آج کے کارکنوں اور پارٹی کے عہدداران کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم نے پاکستان پیپلز پارٹی کو کن حالات میں بنایا تھا اور اِسکی پرورش کیلئے کیا کردار ادا کیا تھا۔

ابھی میں نے نظم ختم کی تھی کہ جلسہ گاہ میں بھٹو صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کو بنگلے کی چھت پر بانس کی سیڑھی لگا کر چڑھایا گیا تھا۔ جس طرف سے بھٹو صاحب چھت پر بالکونی کی طرف آ رہے تھے، راستے میں بجلی کی بوسیدہ تار ڈھیلی ہو کر لٹک رہی تھی۔ ملک پرویز اختر ایڈووکیٹ جن کو اُن کے دوست محبت سے ''چمٹا'' کہا کرتے تھے۔ اُس نے بھٹو صاحب کو سہولت سے گزرنے کیلئے بجلی کی تار کو ہاتھ سے پکڑ کر اوپر کر دیا۔ بھٹو صاحب تو نیچے سے گزر گئے مگر پرویز اختر تار کے ساتھ ہی لٹک گیا۔ بھٹو صاحب نے اُس کی چیخ سن کر واپس پلٹ کر اُس کو بچانے کا کہا۔ کسی کارکن نے اُس کے ہاتھ میں لکڑی تھما دی جس سے وہ تار سے جدا ہو کر نیچے گر پڑا۔ اِس طرح ملک پرویز اختر کی جان بچ گئی۔ چیئرمین بھٹو نے تقریباً دو گھنٹے لوگوں سے خطاب کیا۔ اِس طرح پاکستان پیپلز پارٹی نے منٹگمری کو بھی سیاسی طور پر فتح کر لیا۔ لاہور کے کارکنوں نے ملتان

www.bhutto.org

میں اور منٹگمری کے معرکوں میں بڑی بہادری کا کردار ادا کیا تھا۔ ان کارکن لیڈروں میں ملک حامد سرفراز، خالد چوہدری، میاں اسلم، میاں ساجد پرویز، امان اللہ خان، ملک پرویز، فاروق بیدار، شیخ صفدر احمد مرحوم، ملک آفتاب ربانی، ملک نوید، احمد رضا۔ (نوٹ) ملتان میں ایک بات مشہور ہو گئی تھی کہ بھٹو لاہور سے اپنے ساتھ ایسے گوریلے لایا ہے ان میں ایک ایک سو آدمیوں پر بھاری ہے۔

منٹگمری کے جلسے کے بعد لائل پور کے جلسے کا اعلان کر دیا گیا۔ ہمارا قافلہ شام کو جلسے سے ایک رات پہلے لائل پور پہنچ گیا۔ لائل پور جس کو آج کل فیصل آباد کہا جاتا ہے۔ لائل پور میں بھی کوئی خاص سیاست دان پیپلز پارٹی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ تمام لوگ نئے تھے جن میں شمیم احمد خان، ڈاکٹر حلیم رضا، ملک یعقوب اعوان ایڈووکیٹ ہی زیادہ نمایاں تھے۔ ان کے علاوہ کچھ مزدور یونین کے عہدے دارے تھے۔ اُن میں سے ایک خاتون مزدور یونین کی عہدے دار تھی جن کا نام مجھے آج یاد نہیں آ رہا اور کچھ مقامی طالب علم تھے۔ لائل پور کے عوام جن کی اکثریت مزدور پیشہ لوگوں کی تھی۔ یہ محنت کشوں کا شہر تھا۔ دانشوروں اور شاعروں کا شہر تھا۔ اس شہر میں چیئر مین بھٹو کی مقبولیت بے حد زیادہ تھی۔ ڈاکٹر حلیم رضا جو متوسط درجے کے لوگوں سے تعلق رکھتا تھا، اُس کا ایک چھوٹا سا گھر تھا جو ابھی زیر تعمیر تھا۔ اُس گھر میں بھٹو صاحب کے ساتھ ہم لوگوں کے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔ حلیم رضا چونکہ ہم ورکروں کی کلاس کا آدمی تھا۔ اُس کے گھر میں ہمیں کچھ بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی بلکہ سکون میسر آیا تھا۔ یہ سکون پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد ہم کو دوبارہ کبھی میسر نہ آ سکا۔

بھٹو صاحب چونکہ ایک لمبے عرصے سے سیاسی دورے پر تھے جس میں آرام کرنا ہی کم ملتا تھا۔ اُن کو کچھ حرارت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی حرارت کے بارے میں ظاہر ہی نہ کرتے مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ وہ ایک ڈاکٹر کے گھر پر ہیں تو اُنہوں نے ڈاکٹر حلیم رضا سے کہا کہ میں کچھ بخار محسوس کر رہا ہوں۔ شمیم احمد خان پاس ہی بیٹھا تھا۔ فوراً بولا۔ بھٹو صاحب حلیم رضا ایم۔ بی۔ ایس ڈاکٹر نہیں ہے۔ یہ تو ایک کمپوڈر ہے جس کو عام غریب لوگ ڈاکٹر کہا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اب سب اِس کو ڈاکٹر کہتے ہیں۔ یہ بات سُن کر بھٹو صاحب نے مسکرا کر اپنی کف کا بٹن دوبارہ بند کر لیا۔ وگرنہ وہ حلیم رضا کو اپنی نبض دکھانا چاہتے تھے۔ اِس کے بعد ایک اور دلچسپ معاملہ پیش آیا۔ ایک شخص کو کاسترد کہہ کر بھٹو صاحب سے ملوایا گیا۔ جب وہ بھٹو صاحب سے مل کر چلا گیا تو بھٹو صاحب نے کہا کہ اس شہر میں کوئی اصلی چیز بھی ہے یا سب نقلی

www.bhutto.org

ہیں۔ اِس پر بہت قہقہہ لگا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ رات کو بارش شروع ہوگئی جو صبح 10 بجے تک جاری رہی۔ 10 بجے کے قریب بارش کچھ تھم گئی۔ ہلکی ہلکی بونداباندی جاری تھی۔ دھوبی گھاٹ میں پانی بھی تھا۔ مگر اس کے باوجود لوگ دھوبی گھاٹ میں کھڑے تھے۔ لوگ بھٹو صاحب کو مشورے دے رہے تھے کہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے مگر جب بھٹو صاحب کو ورکروں نے اطلاع دی کہ جلسہ گاہ میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں تو اُنہوں نے 11 بجے کے قریب جلسہ گاہ میں جانے کا اعلان کر دیا۔ اُنہوں نے مجھے حکم دیا کہ شاعرِ عوام جا کر لوگوں کو اپنا کلام سناؤ اور میرے آنے کی خبر کرو۔ اُس وقت میں نے پہلی مرتبہ چیئرمین بھٹو کے ہاتھ میں سلیٹی رنگ کی جناح کیپ دیکھی جو بعد میں وہ ہلکی بارش کے درمیان پہن کر جلسہ گاہ میں آئے تھے۔ میں ابھی نظم پڑھ ہی رہا تھا کہ بھٹو صاحب تشریف لے آئے۔ اُنہوں نے آتے ہی مجھے ایک طرف کر دیا اور خود عوام کے ساتھ اپنے معمول کے مطابق مخاطب ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ جناح کیپ اُن کو بہت پھب رہی تھی۔ اُنہوں نے 2 گھنٹے تک بارش میں لوگوں سے خطاب کیا۔ اس طریقے سے چیئرمین بھٹو کے جلسے کے ساتھ لائل پور شہر بھی پاکستان پیپلز پارٹی کا گڑھ بن گیا۔

لائل پور کے بعد جھنگ میں جلسہ کیا گیا۔ جھنگ کے بعد سرگودھا میں جلسہ عام کیا گیا۔ چیئرمین بھٹو کے پے در پے جلسوں کی وجہ سے اب انتظامیہ کسی جگہ بھی جلسہ روکنے کی جرأت نہ کرتی تھی۔ جھنگ اور سرگودھا کے کامیاب جلسوں کے بعد ہمارا قافلہ واپس لاہور پہنچ گیا۔

شہرِ سومنات (لاہور) کی فتح کا اعلان

شہر لاہور ایوبی آمریت کا سومنات تھا۔ اِس شہر میں پاکستان پیپلز پارٹی کے راستے میں بڑے بڑے پرانی پاپی بت حائل تھے جن کو پاش پاش کرنا انتہائی ضروری تھا۔ چیئرمین بھٹو اپنے پنجاب میں جلسوں کی کامیابی کے بعد 24 جنوری کو لاہور آئے تھے۔ 25 جنوری کو اُنہوں نے ایک بہت بھرپور پریس کانفرنس میں 28 جنوری 1968ء کو لاہور موچی دروازے میں جلسہ عام کرنے کا اعلان کر دیا۔ چیئرمین بھٹو کا انتظامیہ پر یہ حملہ بہت کارگر ثابت ہوا تھا۔ چیئرمین بھٹو نے پنجاب میں اپنی جدوجہد کا درجہ حرارت انتہائی ڈگری تک پہنچا دیا تھا۔ لوگوں کا خوف اُتر چکا تھا۔ حکومت اِس قابل نہ رہی تھی کہ موچی دروازے کا جلسہ روک سکتی۔ دوسرے دن لاہور کی انتظامیہ

www.bhutto.org

نے جلسے کی منظوری دے دی۔

لاہور موچی دروازے کے جلسے کی منظوری کا تمام تر سہرا چیئرمین بھٹو کی سیاسی برق رفتاری کی وجہ سے تھا۔ میں نے اس قدر متحرک اور اِن تھک انسان اپنی زندگی میں اور کوئی دوسرا آج تک نہیں دیکھا ہے۔ وہ اپنے انسانی پیکر میں ایک طوفان اور ایک زلزلہ تھے۔ آرام کرنا، ٹھہر جانا اُن کی فطرت میں شامل ہی نہیں تھا۔ وہ نہ تو خود لو بھی فرصتِ کشمکش دیتے تھے اور نہ کسی دوسرے کو اس کشمکش سے فرصت دیا کرتے تھے۔ اُن کو اپنی زندگی میں بہت جلدی تھی۔ وہ ہر صبح ایک نئے میدان اور ایک نئی جنگ کے قائل تھے۔ اُن کی کوشش ہی یہ ہوتی تھی کہ ہر میدان فتح کرلیا جائے اور ہر چیز پر قابو پالیا جائے۔ بقول علامہ اقبال:

ہر زماں یک تازہ جولاں گاہ می خواہم ازو
تا جنوں فرمائی من گوید دگر ویرانہ نیست

ہر وقت اُن کو ایک نیا تازہ میدان مارنے کی خواہش ہوتی تھی۔ وہ اپنے جنوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کرنا چاہتے تھے کہ افسوس اب آگے اور کوئی ویرانہ باقی ہی نہیں رہا جہاں جاکر جنوں خیزی کی جائے۔

موچی دروازے کے جلسے کی خوب پبلسٹی کی گئی۔ ہم نے دو دن تک جلسے کے خوب اعلانات کئے۔ لاہور کے جلسے کی گھن گرج پورے پاکستان میں سنی گئی۔ لوگ دوسرے شہروں سے لاہور کا جلسہ سننے اور دیکھنے کیلئے لاہور میں جمع ہوگئے۔ ہم پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی بھی حسرت تھی کہ لاہور میں بھٹو صاحب کا جلسہ ہو اور زندہ دلان لاہور کو بھی چیئرمین بھٹو کو قریب سے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ خود بھٹو صاحب کو بھی پاکستان کی سیاست کے اس قلعے کو فتح کرنے کا بہت شوق تھا۔ لہٰذا اِن تمام خواہشوں، حسرتوں، اشتیاق اور شوق کا نام موچی دروازے کا جلسہ تھا۔ موچی دروازے کے جلسے کی اہمیت اور اُس کی حساس صورتحال کا آپ اس بات سے اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس جلسے کو دیکھنے اور سننے کیلئے مغربی پاکستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور سیاسی کارکن جلسہ گاہ میں تشریف لائے تھے۔ تمام معروف دانشور جن میں ظہیر کاشمیری، صفدر میر، نثار عثمانی، آئی۔ اے۔ رحمٰن، حسین نقی، راجہ غالب احمد، عبداللہ ملک، ملک حامد محمود، ملک غلام جیلانی، مجید نظامی، ظہور عالم شہید، خواجہ رفیق، سی۔ آر۔ اسلم اور میجر اسحاق کے نام شامل تھے، جلسہ گاہ میں

www.bhutto.org

موجود تھے۔ یہاں تک کہ اُس دور کا سب سے بڑا متنازع قسم کی شہرت رکھنے والا خطیب آغا شورش کشمیری بھی جلسہ گاہ میں کھڑا بھیگتا پایا گیا تھا۔ لاہور کے پیپلز پارٹی کے پہلے ملتوی شدہ جلسے کی طرح اِس جلسے کے وقت بھی ایک رات پہلے بارش شروع ہوگئی جو صبح سے لے کر تمام دن جاری رہی۔ البتہ تقریباً بارہ بجے کے قریب بارش کچھ تھم سی گئی مگر ہلکی ہلکی بوندا باندی پھر بھی ہو رہی تھی۔ جلسے کے وقت کا اعلان صبح دس بجے کا کیا گیا تھا۔ رات کو سٹیج مکمل طور پر تیار کر لی گئی تھی۔ فیصلہ کیا گیا کہ سٹیج سیکرٹری خورشید حسن میر ہوگا۔ ہم تمام ورکرز نے صبح آٹھ بجے ہی لاؤڈ اسپیکرز پر نعرے لگانے کا کام شروع کر دیا۔ دس بجے تک موچی دروازہ عوام کے ہجوم سے بھر چکا تھا۔ دس بجے جلسے کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز کر دیا گیا۔ تلاوت قرآن پاک کرائی گئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد میری نظم ہوئی۔ میرے بعد ملک حامد سرفراز، ملک محمد اسلم حیات، شیخ محمد رشید وغیرہ نے جلسے سے خطاب کیا۔ ہر چند بوندا باندی جاری تھی مگر لوگوں کا ہجوم دیکھ کر فیصلہ کیا گیا کہ بھٹو صاحب کو جلسہ گاہ میں فوری طور پر بلا لیا جائے۔ یہ فیصلہ بے حد درست تھا۔ اس لئے کہ تیز بارش شروع ہونے کے امکانات موجود تھے۔

ڈاکٹر مبشر حسن بھٹو صاحب کو لینے چلے گئے۔ تقریباً بارہ بجے کے قریب بھٹو صاحب جلسہ گاہ میں آ گئے۔ اُن کی آمد کے ساتھ تقریروں اور نظموں کا سلسلہ خود بخود موقوف ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چیئرمین بھٹو کی موجودگی میں عوام کسی دوسرے کو دیکھنا یا تقریر کرنا صرف ناپسند ہی نہیں بلکہ برداشت ہی نہیں کیا کرتے تھے۔ اب چیئرمین بھٹو تھے اور عوام تھے۔ موچی دروازے کے جلسے کا عالم ناقابل بیان ہے۔ وہ کیا سماں تھا اور کیسا نظارہ تھا۔ غالبؔ کے شعر سے صورتحال ملاحظہ فرمائیں۔

وا کر دیئے تھے شوق نے بندِ نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

چیئرمین بھٹو کا جذبہ شوق بے نقاب تھا۔ زندہ دلانِ لاہور کا اشتیاق واشگاف تھا اور والہانہ تھا۔ موسم ابر آلود تھا۔ یوں تو ہر عوامی جلسے کی سٹیج پر پہنچ کر چیئرمین بھٹو عام زندگی کے اپنے معمول سے مختلف ہو جایا کرتے تھے۔ یہ ایک عجیب قسم کا طلسم تھا جو چیئرمین کی ذات میں دیکھنے میں آیا کرتا تھا۔ مگر موچی دروازے کے اِس لاہور کے پہلے جلسے میں چیئرمین بھٹو کی فرزانگی کچھ اور ہی طرح کی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ جلسے میں آئے ہوئے ہر انسان کے ساتھ تنہا تنہا باتیں

www.bhutto.org

کرر ہے ہیں۔وہ کبھی سٹیج کے دائیں طرف جا کر لوگوں کو خوش آمدید کہتے، کبھی درمیان میں کھڑے ہو کر لوگوں سے مخاطب ہوتے۔ کبھی بائیں طرف گھوم کر لوگوں کی تالیوں کا جواب دیتے تھے۔

چیئرمین بھٹو بے حد ذومعنی باتیں کیا کرتے تھے۔تقریر میں اپنے اشاروں اور الفاظ کے ساتھ ایسی علامتیں بنایا کرتے تھے جن سے لوگ اُن کا مطلب آسانی کے ساتھ سمجھ لیا کرتے تھے۔

یہ خوبی اور یہ ملکہ دنیا میں بہت کم لوگوں کو حاصل ہوا ہے۔اُنہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ہی کچھ یوں علامتی انداز میں کیا کہ لوگ موسم کی خرابی سے بے نیاز ہو گئے۔اُنہوں نے کہا کہ زندہ دلانِ لاہور میں آپ کو سلام پیش کرتا ہے کہ آپ اتنی شدید بارش میں جلسہ گاہ میں موجود ہیں۔ اُنہوں نے آسمان پر بادلوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔میرے دوستو! یہ بہت برس چکے۔اب میں برسوں گا۔اب آپ برسیں گے۔اب پاکستان کے غریب عوام برسیں گے۔محنت کش برسیں گے۔ مزدور برسیں گے۔ طالب علم برسیں گے۔یہ جملے بے حد شاعرانہ تمثیل کے جملے تھے جن کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔یہ لوگ اپنے مکے دکھا کر کہنے لگ گئے کہ ہاں اب ہم برسیں گے۔اب ہم برسیں گے۔بھٹو نے آگے جملہ چست کیا۔میرے بھائیو! وہ بھائی لفظ کو بھائیرو تلفظ کرتے تھے جو سندھی کا تلفظ تھا۔ میرے بھائیرو! ہم اتنا برسیں گے کہ اِن ظالم حکمرانوں کے اقتدار کو بہا کر لے جائیں گے۔آج میں پاکستان کے دل میں پہنچ گیا ہوں۔آج میں سیاست کے اصل میدان میں پہنچ گیا ہوں۔ آج میں لاہور کے موچی دروازے میں پہنچ گیا ہوں۔ آج میں پاکستان کے تاریخی مقام پر پہنچ گیا ہوں۔آج زندہ دلانِ لاہور، آج قوم اور بھٹو موچی دروازے پہنچ گئے ہیں۔اب کوئی طاقت ہمارا راستہ نہیں روک سکتی۔ ہر چند موسم خراب تھا مگر بھٹو صاحب نے لوگوں سے 2 گھنٹے خطاب کیا۔

بھٹو صاحب نے کہا کہ میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں تاشقند پر بات نہیں کرتا۔ تاشقند کا راز نہیں کھولتا۔میں نے اگر ایک دم تمام باتیں کہہ دیں تو ملک وقوم کا نقصان ہو جائے گا۔ کچھ دوست ممالک کے ساتھ ہمارے تعلقات خراب ہونے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔میں پاکستانی قوم کا دوست ہوں، دشمن نہیں۔میں ہمدرد دواخانہ ہوں۔مریض کو پڑی پڑی کر کے دوائی دوں گا۔ میں ہمدرد شفاخانہ ہوں۔اِس تقریر میں اُنہوں نے گورنر محمد موسیٰ خان کے اُن کی ذات پر لگائے گئے الزامات کا جواب دیا۔پہلی مرتبہ ایوب خان کو کھلے عام للکارا۔میں کوئی بزدل آدمی نہیں ہوں۔

www.bhutto.org

میں نے اپنی زبان صرف اِس لئے بند رکھی کہ پاکستان کے دشمن موقعے کی تلاش میں ہیں۔ میرے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ ملک میں آگ لگا سکتا ہے۔

گورنر موسیٰ خان مجھ پر سرکاری مفادات اُٹھانے کا الزام لگا رہا ہے کہ میں نے اپنی حکومتی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا۔ بتایا جائے کہ میں نے کیا فائدہ اُٹھایا تھا۔ آج میں صدر ایوب خان کو موچی دروازے میں چیلنج کرتا ہوں۔ آؤ ہم دونوں اپنے اثاثوں کا اعلان کرتے ہیں۔ میں بھی اعلان کرتا ہوں کہ وزیر خارجہ بننے سے پہلے میری کتنی جائیداد تھی۔ میرا بینک بیلنس کیا تھا۔ ایوب خان بھی اعلان کرے کہ صدر پاکستان بننے سے پہلے اُس کی کتنی جائیداد تھی۔ کیا بینک بیلنس تھا۔ کتنی فیکٹریاں تھیں۔ آؤ ہم دونوں اس بات کی ابتداء کرتے ہیں۔ آؤ ہم دونوں قوم کو بتائیں کہ ہم حکمرانی سے پہلے کیا تھے اور حکومت کے بعد کیا ہیں۔ یہ میرا زندہ دلانِ لاہور کے سامنے ایوب خان کو کھلا چیلنج ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو ایک اُصول کے دو نام ہیں۔ میں اُصولوں کی بات کرتا ہوں۔ حکومت میرے خلاف ٹریکٹروں کے کیس بنا دیتی ہے۔ میں سوشلزم کی بات کرتا ہوں۔ حکومت ہم کو ڈیفنس (D.D.R) آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کرنے کی دھمکی دیتی ہے۔ میں بلوچستان کی آزادی کی بات کرتا ہوں۔ حکومت اکبر بگٹی کو گرفتار کر لیتی ہے۔ میں جمہوریت کی بات کرتا ہوں۔ حکومت بی۔ ڈی۔ نظام کی بات کرتی ہے۔ میں روٹی، کپڑا اور مکان کی بات کرتا ہوں۔ حکومت گولی اور لاٹھی کی بات کرتی ہے۔ بتاؤ ایوب خان صاحب جمہوریت سے کون کانپتا ہے۔ تم یا میں۔ اگر یہ صورتحال زیادہ دیر تک قائم رہی تو لوگ بغاوت کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ خون خرابہ ہو جائے گا۔ سول وار ہو جائے گی۔ میں یہ باتیں کسی پیش گوئی کے تحت نہیں کر رہا بلکہ یہ اِس حکومت کا منطقی انجام مجھے نظر آ رہا ہے۔ مجھ پر بغاوت پھیلانے کا الزام لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے قید کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت پڑی تو میں بغاوت بھی کروں گا۔ میں ڈرتا نہیں ہوں۔ آؤ مجھے گرفتار کرو۔ میں ظلم اور جبر کو ختم کرنے نکلا ہوں۔ دنیا میں سچ سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔

بھٹو صاحب نے اپنی تقریر ختم کر دی۔ بارش بہت تیز ہو چکی تھی۔ اُن کو سٹیج سے نیچے اُتارا گیا۔ وہ پیدل چل کر موچی دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ نوجوانوں کا ہجوم اُن کے ساتھ تھا۔ نیچے زمین بارش کی وجہ سے پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتی تھی۔ ایک جگہ بہت کیچڑ آ گیا۔ بھٹو صاحب

www.bhutto.org

کا پاؤں کیچڑ میں دھنس گیا۔ اُنہوں نے اپنا پاؤں کھوبے سے زور دے کر اوپر اُٹھانا چاہا تو اُن کا جوتا اُتر گیا۔ میں نے ہجوم میں بڑی مشکل کے ساتھ نیچے بیٹھ کر اُن کا پاؤں دوبارہ جوتے کے اندر ڈالا اور اُن کے جوتے کو ہاتھ ڈال کر کیچڑ سے اوپر اُٹھایا۔ جس کی وجہ سے اُن کیلئے چلنا ممکن ہو سکا۔ اِس جگہ کیچڑ بے حد زیادہ تھا۔ لوگوں کا ہجوم بھی زیادہ تھا۔ اُن کیلئے چلنا مشکل تھا۔ میں نے ہمت کر کے بھٹو صاحب کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ ہجوم میں لوگوں نے مجھے اچھی طرح پکڑ لیا اور میں بھٹو صاحب کو موچی دروازے سے باہر سیڑھیوں تک لے آیا۔ میں نے بھٹو صاحب کو نیچے اُتارا۔ اُنہوں نے اتنے ہجوم میں بھی شکریے کے طور پر میرے گال پر چونڈی کاٹ کر تیزی سے موچی دروازے سے باہر نکل گئے۔ آگے کار کھڑی تھی جو اُن کو پرل کانٹیننٹل ہوٹل لے گئی۔

چیئر مین بھٹو نے موچی دروازے کے جلسہ میں ایک لمبی تقریر کی۔ جلسوں میں لمبی تقریر کرنا اُن کا معمول تھا۔ وہ لوگوں کے ساتھ ایک قسم کا تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے۔ زندگی کے ہر پہلو پر بات کیا کرتے تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ بھٹو صاحب نے جلسے کے بعد کبھی کہا ہو کہ اُن کو کوئی بات بھول گئی تھی اور نہ ہی میں نے اُن کو کبھی کسی جلسے میں کاغذ کے کسی تراشے پر تقریر کے پوائنٹ پکڑے ہوئے دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی وہ اپنی یادداشت کیلئے کچھ لکھ کر ساتھ لایا کرتے تھے۔ وہ جلسے میں سیدھے آتے اور بولنا شروع کر دیتے تھے۔ موچی دروازے کے جلسے کی کامیابی پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ ہمارے ہاں پاکستان میں ایک روایت مشہور تھی کہ جس لیڈر نے لاہور کے موچی دروازے میں تقریر نہ کی ہو، اُس کو لیڈر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ لہٰذا بھٹو صاحب نے لاہور کا موچی دروازہ بھی فتح کر لیا۔

چیئر مین بھٹو کے موچی دروازے کے جلسے نے زندگی کے ہر شعبے سے متعلق لوگوں کے دلوں پر ایک سکہ بند لیڈر کی دھاک بٹھا دی۔ شام کو ہوٹل میں مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ کئی ایک سیاسی لیڈر مبارکباد دینے کیلئے آئے۔ بہت سے وکلا اِس کامیابی پر بھٹو صاحب کی حوصلہ افزائی کرنے آئے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اور آغا شورش کشمیری بھی تشریف لائے۔ رات کو بھٹو نے چند لوگوں کو خاص طور پر ہوٹل بلایا۔ وہ ایک قسم کی جلسے کی کامیابی کی خوشی کی دعوت تھی۔ اِس دعوت میں مجھے خاص طور پر شیخ صفدر علی کے ذریعے آنے کا کہا گیا۔

گنتی کے چند لوگ تھے۔ میں نے بھٹو صاحب کو کامیابی کی مبارکباد پیش کی۔ بھٹو صاحب

www.bhutto.org

بہت خوش تھے۔ مجھے تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگے۔ بتاؤ تم نے مجھے کیسے اُٹھا لیا تھا۔ اگر میں کیچڑ میں گر جاتا تو کیا ہوتا۔ میں نے کہا کہ سر میں اور عوام آپ کو کبھی گرنے نہیں دیں گے۔ بہت خوش ہوئے۔ انگریزی میں کہنے لگے ''ویل سیڈ (Well Said) خوب کہا۔ اِس محفل میں عبداللہ ملک صاحب بھی موجود تھے۔ بھٹو صاحب نے ملک صاحب کو کہا کہ ہر جلسے میں پارٹی کے لوگ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ اکیلا سائے کی طرح میرے ساتھ ہوتا ہے۔ عبداللہ ملک صاحب کہنے لگے کہ اے ساڈا پتر اے بھٹو صاحب! یہ کبھی غائب نہیں ہوگا۔ عبداللہ ملک صاحب کا تعلق میری برادری سے تھا۔ اِس نسبت سے وہ فخر کے ساتھ مجھے اپنا بیٹا کہا کرتے تھے۔

چیئرمین بھٹو نے تمام حاضرین کے سامنے کہا کہ اسلم انعام کا حق دار ہے اور اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے ایک لفافہ نکال کر مجھے دے دیا۔ لفافہ دینے سے یہ ثابت ہوا کہ وہ مجھے انعام دینے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔

گورنر مغربی پاکستان جنرل موسیٰ خان کی بھٹو صاحب کو دھمکی

موچی دروازے کے اِس جلسے سے حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایوب حکومت اِس قدر بوکھلا گئی کہ مغربی پاکستان کے فوجی گورنر جنرل موسیٰ خان نے گورنر ہاؤس میں ایک پریس کانفرنس بلا کر بھٹو صاحب کے خلاف اخباری بیان بازی کی مہم کا آغاز کر دیا۔ گورنر موسیٰ خان ملتان کے جلسے تک تو پردے کے پیچھے بیٹھ کر کنونشن لیگ کے صادق قریشیوں اور ملتان کے پشتنی جاگیردار حکومتی ٹاؤٹوں کے ذریعے بھٹو صاحب کو ڈرانا دھمکانا چاہتا تھا مگر لاہور کے جلسے کے جوش و خروش اور چیئرمین بھٹو کے جوش و جذبے نے جنرل موسیٰ خان کو عوام کے سامنے ننگا کر دیا۔ اب وہ اپنے پورے فوجی قہر و غضب سے پردہ اسکرین پر آ گیا۔ اُس نے پریس کانفرنس میں انتہائی بے ہودہ قسم کی تقریر کی یعنی ایک فوجی تقریر کی۔ اُس نے بھٹو صاحب کے بارے میں کہا کہ بھٹو کوئی بڑا آدمی نہیں ہے۔ وہ ایک چھوٹا آدمی ہے۔ کون لوگ اِس ملک میں اُس کے ساتھ ہیں۔ کون لوگ ہیں جو اُس کے جلسے میں آتے ہیں۔ تمام چھوٹے لوگ اُس کے جلسے میں آتے ہیں۔ ریڑھی والے، چھابڑی والے، رکشا والے لوگ اُس کے جلسے میں آتے ہیں۔ تمام کمی کمین لوگ اُس کے جلسے میں آتے ہیں۔ غریب لوگ اُس کے جلسے میں آتے ہیں۔ وہ لوگ اِس کے جلسے میں آتے ہیں

www.bhutto.org

جن کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ کچھ آوارہ طالب علم اُس کے ساتھ ہیں۔ کچھ بھوکے ننگے مزدور اُس کے جلسے میں آتے ہیں۔ کوئی عزت دار آدمی اُس کے جلسے میں نہیں جاتا۔ کوئی عزت دار بڑا آدمی اُس کی پارٹی میں شامل نہیں ہوا۔ بھٹو ایک انتہا پسند ہے۔ ملک کے قانون اور امن کو خراب کرنا چاہتا ہے۔ بھٹو قومی راز ظاہر کررہا ہے۔ اب قانون خاموش نہیں رہے گا۔ یہ تانگوں والوں اور رکشا والوں کا لیڈر حکومت کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ بھٹو پاکستان کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات خراب کرنا چاہتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اِس طرح کے بہت سے دوسرے بے معنی قسم کے الزامات تھے جو گورنر موسیٰ خان نے بھٹو صاحب کی ذات پر لگائے تھے۔

چیئرمین بھٹو کراچی جانے کے لئے تیار ہورہے تھے۔ بہت سارے لوگ اُن کے کمرے میں موجود تھے۔ ہر آدمی کی زبان پر جنرل موسیٰ خان کا نام تھا۔ میرے ہاتھ میں نوائے وقت اخبار تھا۔ بھٹو صاحب نے مجھے جنرل موسیٰ خان کے بیان کو پڑھ کر سنانے کو کہا۔ میں نے جنرل موسیٰ خان کا پورا بیان بھٹو صاحب کو پڑھ کر سنایا۔ بھٹو صاحب نے انگریزی میں کہا کہ "Now It is end of this Government" اب اِس حکومت کے دن گنے جاچکے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ گورنر موسیٰ خان کے بیان کا جواب وہ کراچی جاکر دیں گے اور وہ کراچی چلے گئے۔ گورنر کے اِس بیان کے بارے میں میں نے لوگوں کے تاثرات حاصل کرنا شروع کر دیئے جن کا ذکر اُس نے اپنے بیان میں کیا تھا۔ میں جس رکشے میں بیٹھتا، جس تانگے میں بیٹھتا، یا جس دوکان سے کچھ خریدتا، اُن کے ساتھ جنرل موسیٰ خان کے بیان کا ذکر کرتا۔ لوگ گورنر کو گالیاں دینا شروع کردیتے۔ پارٹی کے کارکن جگہ جگہ لوگوں کے تاثرات حاصل کرتے تھے۔ ہر گلی محلے میں لوگ گورنر کے بیان کی مذمت کرتے تھے۔ پارٹی کارکنوں نے از خود لوگوں کے تاثرات معلوم کرنے کی ایک قسم کی مہم چلادی۔ اِسی دوران بھٹو صاحب کا جواب اخبارات میں شائع ہو گیا۔ چیئرمین بھٹو کا بیان بے حد موثر اور ٹو دی پوائنٹ تھا۔ اُن کا بیان ایک مکمل عوامی سیاست دان کا بیان تھا۔ اُن کا بیان شروع ہی اِن الفاظ سے ہوا۔ میں ذوالفقار علی بھٹو اِس بات پر فخر کرتا ہوں کہ میرے ساتھ اِس ملک کے غریب کسان، مزدور، تانگوں والے، ریڑھی والے، نائی، دھوبی، کمی کمین ہیں۔ وہ لوگ ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے ساتھ فوجی جنرل نہیں ہیں۔ بیوروکریسی نہیں ہے۔ پولیس نہیں ہے۔ ڈاکو میرے ساتھ نہیں ہیں۔ سرمایہ دار میرے ساتھ

www.bhutto.org

نہیں ہیں۔ جاگیردار میرے ساتھ نہیں ہیں۔قوم کے قاتل میرے ساتھ نہیں ہیں۔لٹیرے میرے ساتھ نہیں ہیں۔اِس قوم کا خون چوسنے والے بھیڑیئے میرے ساتھ نہیں ہیں۔ بینک لوٹنے والے میرے ساتھ نہیں ہیں۔قوم کا مال کھانے والے میرے ساتھ نہیں ہیں۔ ملک کی دولت لوٹنے والے 22 خاندان میرے ساتھ نہیں ہیں۔گورنر موسیٰ خان نے اچھا کیا ہے کہ میرے لوگوں میں یا مجھے جاننے والوں میں اور ایوب خان کے ماننے والے لوگوں میں خود ہی تفریق کر دی ہے۔

اُن کے بیان کے مطابق تمام قومی قاتل،ڈاکو،لٹیرے جن کو وہ عزت دار باحیثیت کہتا ہے، اُن کے ساتھ ہیں اور تمام محنت کش، مزدور میرے ساتھ ہیں۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تمام رزق حلال کھانے والے میرے ساتھ ہیں۔تمام حرام خور حرام کھانے والے اُن کے ساتھ ہیں۔بھٹو صاحب نے کہا کہ ہمیشہ قوم ہی بڑی ہوتی ہے۔پاکستان کی قوم چند باحیثیت سرمایہ دار نہیں ہیں۔ پاکستان کی قوم مزدور، کسان، تانگوں، ریڑھوں، رکشوں والے ہیں۔ چند دلال قوم نہیں ہوتے۔ چند ڈاکوؤں چوروں کو قوم نہیں کہا جاتا۔ میں پاکستان کے غریبوں کو اسلام پیش کرتا ہوں کہ مجھے اُن کی محبت نصیب ہوئی ہے۔وہ میرے ساتھ ہیں۔رہی یہ بات کہ گورنر صاحب نے مجھے چھوٹا آدمی کہا ہے۔یہ ایک گورنر ایک ذمہ دار انسان کا شیوہ نہیں ہے کہ وہ کسی انسان کو چھوٹا کہے۔اگر اُنہوں نے مجھے چھوٹا آدمی جائیداد کے نقطہ نظر سے کہا ہے تو میری جائیداد گورنر موسیٰ خان اور ایوب خان سے اُس وقت بھی زیادہ تھی جب میں پیدا ہوا تھا اور اب بھی میری جائیداد اُن دونوں سے زیادہ ہے۔ مالی حیثیت کے نقطہ نظر سے بھی میں اُن سے چھوٹا ثابت نہیں ہوتا اور اگر گورنر نے میرے قد کی وجہ سے چھوٹا کہا ہے تو گورنر سے میرا قد بڑا ہے اور ایوب خان کا اور میرا قد برابر ہے اور اگر یہ طاقت کے نشے میں خود کو جنات تصور کرتے ہیں اور لوگ اِن کو چھوٹے بونے نظر آتے ہیں تو میں اِس سابق آرمی چیف کو کہوں گا کہ ویت نام کے لوگوں سے سبق حاصل کرے کہ ویت نام کے چھوٹے قد کے لوگوں نے عالمی سامراج کے لمبے قد کے فوجیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ویت نام کے چھوٹے قد ننگے پاؤں لوگوں نے، بھوکے ننگے لوگوں نے، بے حیثیت لوگوں نے دنیا کی سب سے بڑی سپر طاقت کو شکست فاش سے دوچار کر دیا ہے۔خالی ہاتھ لڑنے والوں نے جدید اسلحہ سے لیس فوج کو تہس نہس کر دیا ہے۔لڑائی اقتدار کی نہیں ہوتی۔ بڑے عہدوں کی نہیں ہوتی۔ دولت کی نہیں ہوتی۔فوجوں کی نہیں ہوتی۔لڑائی انسانوں کے اعلیٰ مقاصد کی ہوتی ہے۔

اُصولوں کی ہوتی ہے۔حق اور سچ کی لڑائی ہوتی ہے۔آج ویت نام کے چھوٹے قد کے لوگوں کو تمام دنیا عظیم انسان کہہ رہی ہے۔آج کے لمبے قد کے امریکنوں کو لوگ ذلیل اور قاتل تصور کر رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہی ہوگا۔گورنر موسیٰ! یہاں بھی چھوٹے لوگوں کی فتح ہوگی۔ یہاں بھی لمبے قد کے قاتلوں ڈاکوؤں کو شکست ہوگی۔

کوئلوں کے ساتھ دیواروں پر لکھنے کی مہم

اُن دنوں ہم پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے پاس نہ تو اشتہار وغیرہ چھپوانے کی سہولت تھی اور نہ ہی اِس قدر فنڈز میسر تھے کہ حکومت کی اخباری مہم کا نشر واشاعت کے ذریعے مقابلہ کیا جائے۔ ہم کارکنوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے ہاتھوں سے کوئلوں کے ساتھ دیواروں پر لکھنے کی مہم کا آغاز کیا جائے۔شروع شروع میں کوئلہ تحریر کا سلسلہ چند ورکروں نے شروع کیا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے لاہور شہر کی ہر دیوار پر گورنر موسیٰ خان مردہ باد لکھا ہوا ملتا تھا۔ ہمارے دیواروں پر لکھنے سے خود لوگ بھی اِس مہم میں شریک ہو گئے۔خود میں نے مال روڈ پر جہاں بھی کوئلوں سے لکھا جانا ممکن تھا، لکھنا شروع کیا تھا۔کچھ دنوں تک تو میں رات کو اکیلا ہی لکھتا رہا تھا۔کچھ دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ ہر طرف مال روڈ کی دوکانوں اور فٹ پاتھ پر گورنر موسیٰ خان مردہ باد تحریر ہو چکا تھا۔تحریک کی کامیابی سے یہ ثابت ہوا کہ سیاسی کارکنوں کو لوگوں کو راستہ بتانا چاہیے۔لوگوں کو اُن کے جذبات کے اظہار کا راستہ بتانا اور دکھانا چاہیے۔باقی کام لوگ خود مکمل کر لیتے ہیں۔ مال روڈ پر باقاعدہ برُش اور کالی سیاہی سے بھی یہ عبارت لکھی ہوئی پائی گئی جو کسی پینٹر کے سوا تحریر ہونا ناممکن تھی۔آج کے سیاسی کارکن عوام کو اُن کے جذبات کا راستہ بتانے سے قاصر ہو چکے ہیں۔آج مہنگائی کا جو عالم ہو چکا ہے، اُس کے خلاف اِس قسم کی مذمتی مہم کا آغاز کیا جانا چاہیے تھا۔مگر افسوس کہ سیاسی جماعتوں کا اور سیاسی کارکنوں کا جو عوام کے تحفظ کا کردار تھا۔وہ ناپید ہو چکا ہے۔آج پاکستان کے عوام مکمل طور پر لاوارث ہو چکے ہیں۔

پشاور کا پہلا کنونشن اور میری نظم

چیئرمین بھٹو کو جب اِس مہم کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔کراچی سے بھٹو صاحب نے

www.bhutto.org

شیخ صفدر علی کو فون پر کہا کہ اسلم گورداسپوری کو 16 فروری کو پشاور روانہ کر دیا جائے۔ بھٹو صاحب کا بطور چیئرمین پیپلز پارٹی پشاور کا یہ پہلا دورہ تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام عہدے دار اور کارکن جن کا تعلق کسی بھی شہر سے ہوتا تھا، وہ چیئرمین کے اُن کے شہر سے چلے جانے کے بعد فارغ ہو جایا کرتے تھے۔ اپنے ذاتی کاموں میں مصروف ہو جایا کرتے تھے مگر مجھے یہ سہولت حاصل نہ تھی۔ مجھے ہر اُس شہر میں حکماً پہنچنا ہوتا تھا جس شہر میں چیئرمین بھٹو کو جانا ہوتا تھا اور یہ تمام سفر مجھے بسوں میں کرنا ہوتا تھا۔ پارٹی کی طرف سے اِس معاملے میں کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ چیئرمین کا حکم ملتے ہی میں پشاور پہنچ گیا۔ پشاور میں ملک اشرف کے گھر ہم لوگوں کو ٹھہرایا گیا اور ملک اشرف کے گھر کے لان میں ہی پیپلز پارٹی کا پہلا اجلاس ہوا جس کو آپ صوبہ سرحد کا کنونشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِس اجلاس میں زیادہ تر حاضری پشاور کے طالب علموں کی تھی۔ اُن دنوں پشاور میں قاضی انور کے نام کی طوطی بولتی تھی۔ قاضی انور ایک خوبصورت لمبے قد کا نوجوان طالب علم لیڈر تھا۔ اِس کنونشن میں قاضی انور نے بھی خطاب کیا تھا۔ اجلاس میں مجھے نظم پڑھنے کا کہا گیا۔ میں نے گورنر موسیٰ خان کے بیان سے غصے میں آ کر ایک بہت سخت نظم لکھی تھی اور یہ نظم پشاور کے کنونشن میں پہلی بار پڑھی گئی تھی۔ نظم کا عنوان (میں نے کلیم آمر رکھا تھا) موسیٰ خان کے نام کی نسبت سے میں نے اُس کو کلیم آمر کہا تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ''کلیم اللہ'' کہا جاتا ہے۔

کلیم آمر کے نام

چیئرمین بھٹو پر موسیٰ کے الزامات کے جواب میں

عہدِ کم ظرف کی تحریر کے رُخ کتنے ہیں
دورِ ظلمات کی تقریر کے رُخ کتنے ہیں
ایک موسیٰ کی صداقت سے تو واقف تھے مگر
میرے موسیٰ تری تصویر کے رُخ کتنے ہیں

○

www.bhutto.org

تو نے اس دور سیاہ کار میں منصف بن کر
نامِ موسیٰ کی ہی عظمت کو نبھایا ہوتا
اپنے انصاف کے منصب کا ہی پردہ رکھتے
کوئی قصہ تو ہمیں ٹھیک بتایا ہوتا

○

دیکھ پنڈی کے پہاڑوں سے تجلی لے کر
ایک آمر کی کلیسی کا خطاکار نہ بن
تو سپاہی تھا، ترا کام تھا حق پہ چلنا
دولت و کرسی و شہرت کا پرستار نہ بن

○

کل اسے نقرئی تمغوں سے نوازا تم نے
آج بھٹو تمہیں غدار نظر آتا ہے
کل تو تم کہتے تھے وہ پھول ہے اس گلشن کا
آج وہ پھول تمہیں خار نظر آتا ہے

○

اے گورنر اسی تابوت پہ تجھ سے پہلے
ایک فرعون کو بھی ہم نے اکڑتے دیکھا
اس کی مونچھوں کے بل ہم نے نکلتے دیکھے
اس کو بھی موت کے پنجے میں پھڑکتے دیکھا

○

میرے موسیٰ مجھے انسان کی عظمت کی قسم
اس حکومت کی تگ و تاز کے دن تھوڑے ہیں
وقت کے سامنے فانی ہیں یہ سب جاہ و جلال
تیری آواز تو کیا ساز کے دن تھوڑے ہیں

www.bhutto.org

○

چاند پر تھوکنے والوں کی حقیقت کیا ہے
تھوک خود اُن کے ہی چہروں پر گرا کرتا ہے
جو حقیقت کو فراموش کیا کرتے ہیں
وقت خود ان کو فراموش کیا کرتا ہے

○

آپ کی آنکھ میں اس دیس کے تانگے والے
گویا انسان نہیں حیوان ہیں اس دھرتی پر
جن کی محنت سے ہی قائم ہے تیرا رعب و جمال
تیری دانست میں بے جان ہیں اس دھرتی پر

○

ہاں ہمیں فخر ہے بھٹو کی قیادت پا کر
جس نے مزدور کو اس دیس کا حاکم سمجھا
تانگے والوں کو ہی تقریر سنائی اُس نے
وہ انہیں لوگوں کو انصاف کا محرم سمجھا

○

اور یہ لوگ ہی بھٹو کی صداقت بن کر
آمریت کے در و بام سے ٹکرائیں گے
آپ کچھ اور بھی نفرت کا کریں گے اظہار
آپ اس آگ کو کچھ اور بھی بھڑکائیں گے

○

اور یہ آگ ہی نفرت کے شرارے بن کر
سونے چاندی کے محلات جلا ڈالے گی

www.bhutto.org

اور تم آگ بجھانے کی کرو گے کوشش
آگ ہر کوششِ ناکام بُجھا ڈالے گی

O

آپ نے بُھٹو پہ الزام تراشی کر کے
قوم ساری پہ ہی الزام تراشی کی ہے
قوم کے دِل میں ہے بُھٹو کی صداقت روشن
آپ نے مفت میں بس سمع خراشی کی ہے

O

جھوٹ کا پول بہت جلد ہی کھل جاتا ہے
اور کھل جائے گا یہ پول خرافاتوں میں
کھینچ لایا ہے تجھے وقت بیاں بازی پر
اور کُھل جاؤ گے دوچار ملاقاتوں میں

O

دیکھ پنڈی کے پہاڑوں سے تجلّی لے کر
ایک آمر کی کلیسی کا خطاکار نہ بن

O

میں نے اے گورنر کا لفظ بہت انقلابی انداز میں کہا تھا۔ چیئرمین بھٹو نے پیچھے سے اونچی آواز میں مجھے داد دینے کی شکل میں کہا۔ "او۔یو۔آر۔اے ریولوشنری پویٹ"۔ تم ایک انقلابی شاعر ہو۔ پشاور کے اجلاس کی فضا انقلاب کے نعروں سے گونج اُٹھی اور پشاور کا یہ پہلا کنونشن ایک انقلابی اور باغی جلسے میں تبدیل ہوگیا۔ میرے بعد قاضی انور، ملک اشرف اور حیات محمد خان شیرپاؤ اور نثار خان کھیچی کے مختصر خطابات کے بعد بھٹو صاحب نے خطاب کیا۔ جب اِس کنونشن کا آغاز ہوا تھا تو اجلاس پر ایک قسم کا خوف طاری تھا۔ ہر کوئی دہشت زدہ تھا۔ اجلاس کا ماحول بہت اُداس اُداس تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت چیئرمین بھٹو کے کسی بھی شہر میں جانے سے پیشتر اُس شہر کے لوگوں کو پولیس کے ذریعے ڈرایا کرتی تھی۔ لوگ خاموشی سے آکر اجلاس میں بیٹھ جایا

www.bhutto.org

کرتے تھے مگر میری نظم نے اجلاس کے لوگوں کے دلوں سے وہ تمام خوف و دہشت دور کردیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے تو سیدھا گورنر پر اٹیک کیا تھا۔ یوں بھی وہی بات ثابت ہوئی کہ عوام بہادر ہوتے ہیں۔ بس اُن کی بہادری کو جگانا مقصود ہوتا ہے۔ میں نے چیئرمین بھٹو کی یہی سٹریجی دیکھی تھی۔ اُن کی یہی حکمت عملی تھی۔ اُن کی یہ حکمت عملی شعوری تھی۔ وہ عوام کے سامنے آکر کھل کر حکومت پر حملہ کرتے تھے۔ اِس کے بعد حکومت لوگوں کے جوش و جذبے پر قابو نہیں پاسکتی تھی۔ یہی میرا تجربہ بھی ہے اور مشاہدہ بھی ہے۔

یہ اُن دنوں کی باتیں ہیں جب ایک سیاسی لیڈر کو نہ تو اخبارات کی مدد حاصل ہوتی تھی۔ اِس لئے کہ اُن دنوں اتنے اخبار ہوتے ہی نہیں تھے۔ نہ اتنی تعداد میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل ہوا کرتے تھے۔ اُن دنوں کی آمریت بہت خوفناک ہوا کرتی تھی۔ آج کی آمریت تو کچھ معنی ہی نہیں رکھتی۔ آج تو ایک لیڈر کی کہی ہوئی بات پوری دنیا سن رہی ہوتی ہے۔ آج کے عوامی لیڈروں کو سیاست کرنے میں بے حد آسانیاں میسر آچکی ہیں۔

پشاور کے کنونشن کا ماحول بہت جوشیلہ ہو چکا تھا۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو کے خطاب کا درجہ حرارت بھی بہت زیادہ اُونچا رہا۔ اُن کے خطاب سے سرحد کے برف کی طرح ٹھنڈے شہر پشاور میں گرم جوشی پیدا ہوگئی۔ اُن کا خطاب آتش فشاں کے لاوے کی طرح حکومت کے رعب و دبدبے کو بہا کر لے گیا۔ اِس کنونشن میں، میں نے حنیف رامے صاحب کو بھی موجود پایا مگر اُن دنوں وہ ابھی پردہ اخفا میں مستور تھے، ابھی سامنے نہیں آتے تھے مگر پس پردہ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں ہی شامل تھے۔ پشاور کے اِس کنونشن کے تھوڑے ہی دنوں بعد رامے صاحب ہفت روزہ رسالہ نصرت کے ساتھ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت میں سامنے آگئے تھے۔ پشاور کے کنونشن میں شرکت کے چند دنوں بعد ایوب حکومت نے اُن کو اُردو ترقیاتی بورڈ کی ڈائریکٹرشپ سے فارغ کردیا تھا۔ شاید یہی پورٹ فولیو ہی اُن کے منظر عام پر آنے کی راہ میں حائل تھا۔ میری حنیف رامے صاحب کے ساتھ پہلے ہی سے جان پہچان تھی۔ پشاور ملک اشرف کے گھر میں، میں اور رامے صاحب ایک ہی کمرے میں ٹھہرائے گئے تھے۔ میری نظم کے بارے میں تعریف کی شکل میں اُنہوں نے کہا کہ آپ بھٹو کے حسان ہیں۔ حسان بن ثابت عرب کا مشہور شاعر تھا جس کو رسول پاکؐ کا شاعر ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آنحضرتؐ کے خلاف کفار کی ہر طرح کی ہرزہ سرائی

کا جواب حسان بن ثابت ہی دیا کرتا تھا۔ میں نے چونکہ گورنر موسیٰ خان اور بعد میں اصغر خان کی بھٹو صاحب کے خلاف کی گئی باتوں کا جواب دیا تھا۔ اِس مناسبت کے لحاظ سے راے صاحب مجھے بھٹو کا حسان کہا کرتے تھے۔ کنونشن کے دوسرے دن پشاور کے اُس وقت کے سب سے بڑے ہوٹل میں قاضی انور نے طالب علموں اور پشاور کے وکلاء کی طرف سے بھٹو صاحب کو استقبالیہ دیا۔ اس استقبالیے کا حجم ملک اشرف کے گھر کے اجلاس سے بڑا تھا۔ اِس میں مجھ سے تین نظمیں یکے بعد دیگرے سنانے کی فرمائش کی گئی۔ بھٹو صاحب کے خطاب کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا جس طرح پشاور شہر بھی پاکستان پیپلز پارٹی نے فتح کرلیا ہے۔

حیات محمد خان شیر پاؤ اور صوبہ سرحد کی سیاست

پشاور سے بھٹو صاحب روانہ ہونے سے پہلے مجھے حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ ایک ہفتہ کام کرنے کیلئے پشاور میں ٹھہر جانے کا کہہ گئے۔ پشاور شہر میں حیات محمد خان کے ساتھ میں چارسدہ چلا گیا۔ حیات محمد خان پشاور شہر اور اُس کے اردگرد دو تین دن تک مجھے اپنے ساتھ لے کر گھومتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی ورکرز میٹنگ میں ہم دونوں ورکروں سے خطاب نما باتیں کرتے رہے۔ ہمارا تمام گھومنا پھرنا پشاور میں ہی تھا۔ میری خواہش تھی کہ حیات محمد خان اس علاقے سے باہر بھی کہیں لوگوں کے پاس جائیں۔ کسانوں میں جائیں۔ مزدوروں میں جائیں۔ مگر وہ اپنے چارسدہ اور پشاور کے علاقے تک ہی رہتا تھا۔ پشاور کے علاقے میں لوگوں میں پیپلز پارٹی کے لئے وہ گرم جوشی دیکھنے میں نہیں آئی تھی جو گرم جوشی ہم پنجاب میں دیکھا کرتے تھے۔

ایک دن میں حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ پشاور شہر کے ایک علاقے سے گزر رہا تھا۔ وہاں اے۔ این۔ پی کا ایک عام لیڈر ایک ٹرکوں کے اڈے پر کھڑا تھا اور وہاں ایک بھاری ہجوم جمع تھا۔ مجھے وہ ہجوم اِسی طرح نظر آیا جس طرح پنجاب میں ہمارے جانے پر لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ اس ہجوم سے مجھے اے۔ این۔ پی کی پشاور یعنی سرحد میں مقبولیت دکھائی دی۔ اس سے پہلے حیات محمد خان شیر پاؤ مجھ سے بار بار اِن خدشات کا اظہار کر چکا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ بھٹو صاحب کچھ وقت کے بعد ولی خان کے ساتھ سیاسی سمجھوتہ کرلیں اور میری آج کی تمام محنت پر پانی پھر جائے۔ اُس وقت تک میں بھی شیر پاؤ کو یہی کہتا تھا کہ بھٹو صاحب ایسا ہرگز نہیں کریں گے مگر میں چونکہ

www.bhutto.org

بنیادی طور پر ایک نیک نیت سیاسی کارکن تھا بلکہ شاعر تھا۔ میں نے جب اے۔این۔پی کی مقبولیت کو سرحد میں دیکھا تو پارٹی کے مفاد کی خاطر جس طرح ایک کامریڈ دوسرے کامریڈ کے ساتھ تبادلہ خیالات کرتا ہے، اِس انداز میں حیات محمد خان شیر پاؤ سے کہا کہ یار سرحد میں اگر ولی خان کی جماعت کا پیپلز پارٹی کے ساتھ کوئی سیاسی سمجھوتہ ہو جائے تو بہت اچھا ہوگا۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ حیات محمد خان شیر پاؤ چمک اُٹھا۔ اُس نے کہا کہ مجھے تو پہلے ہی یہ خطرہ ہے کہ کل تم لوگ مجھے چھوڑ کر ولی خان کے گھر چلے جاؤ گے۔ میں نے اُس کو کہا کہ سیاست میں دوسری پارٹیوں کے ساتھ ضرورت کے مطابق سمجھوتے ہوا کرتے ہیں۔ یہاں اگر ضرورت ہوگی تو یہ سمجھوتہ آپ بھی کریں گے۔ اِس لئے کہ آپ اِس صوبہ کی پارٹی کے لیڈر ہیں۔ میں نے تو یونہی محض سیاسی مشورے کے لئے بات کی تھی۔ مگر وہ اُس وقت قطعی غیر سیاسی انداز میں بات کر رہا تھا۔ کہنے لگا کہ شاعر صاحب! آپ یہ بات مشورے کے لئے بھی نہ کریں۔ میں اُس دن پارٹی چھوڑ دوں گا جس دن یہاں کسی کے ساتھ سمجھوتہ کیا گیا۔ حیات محمد خان شیر پاؤ کے گھر پر رہتے ہوئے مجھے تین چار دن ہو چکے تھے۔ چارسدہ میں نثار محمد جب بھی آتا، وہ مجھے اپنے ساتھ پشاور سے کچھ دور جانے کے لئے کہتا۔ مگر مجھے چونکہ حیات محمد خان شیر پاؤ کے ساتھ جانا ہوتا تھا۔ میں اُن سے معذرت کر لیتا تھا۔ مجھے نثار محمد اور حیات محمد خان شیر پاؤ کے درمیان کسی سیاسی چپقلش کا کچھ علم نہ تھا۔ اِس لئے کہ وہ دیکھنے میں ایک دوسرے کے ساتھ اچھے طریقے سے ملتے جلتے تھے۔ مگر اگر اُن کے درمیان کوئی سیاسی اختلاف تھا تو وہ کوئی خطرناک بات نہیں تھی۔ پارٹی میں تنظیموں کے معاملے میں ہمیشہ ایک عہدے دار کے دوسرے عہدے دار کے ساتھ اختلافات ہو جایا کرتے ہیں۔ مگر مجھے اُن کے اس قسم کے حالات کا کچھ علم نہیں تھا۔ لہٰذا جب میں شیر پاؤ ہاؤس میں فارغ بیٹھا تھا تو نثار محمد آ گیا اور اُس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ میں نے حیات محمد خان سے اجازت چاہی تو اُس نے نثار کی موجودگی کی وجہ سے مجھے جانے کے لئے کہہ دیا۔ ہو سکتا تھا کہ نثار محمد سامنے نہ ہوتا تو وہ مجھے روک لیتا۔ نثار محمد مجھے پشاور سے باہر پیپلز پارٹی کے لوگوں کے پاس لے گیا۔ تمام دن ہم دور قصبوں اور پشاور کے مضافات میں دیہاتوں میں گھومتے رہے۔

پشاور کے مضافات میں بھی اے۔این۔پی کا وجود بہت نمایاں نظر آ رہا تھا۔ میں نے وہی بات شیر پاؤ کو کہی تھی۔ وہ نثار محمد کو بھی کہی کہ اگر سرحد میں ولی خان کی پارٹی میں اور پیپلز پارٹی

www.bhutto.org

میں ایوب خان کے خلاف تحریک چلانے میں کوئی اتحاد ہو جائے تو آپ کی نظر میں کیسا ہوگا۔ وہ کہنے لگا۔ بہت اچھا ہوگا مگر تمہارا حیات محمد شیر پاؤ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گا۔ وہ پارٹی کو صرف چارسدہ تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ وہ پارٹی پر اپنا قبضہ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے، اُس کو عہدہ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے اُس کو پارٹی کا عہدہ نہیں دیتا ہے۔ سرحد میں پارٹی کی ایک قسم کی ابھی ابتدا ہی تھی۔ ابتدا ہی میں حیات محمد شیر پاؤ اور نثار محمد کے درمیان بہت بڑا اختلاف دیکھنے میں آیا تھا۔ نثار محمد مجھے پشاور سے دور ایک دیہات نما چھوٹے سے قصبے میں ایک پارٹی کے عہدے دار کے گھر لے گئے۔ اُس کے گھر ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ کارکنوں نے دوسرے لوگوں کو ہماری آمد کا بتانا شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے۔ میں اس عہدے دار کے گھر لوگوں کی اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو جانے سے بڑا متاثر ہوا۔ وہاں تمام لوگوں نے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ اس علاقے میں اس شخص کو جس کے گھر ہم بیٹھے تھے، اس علاقے کا پارٹی کا عہدے دار بنایا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ شیر پاؤ ایک ایسے آدمی کو یہاں کا عہدے دار بنانا چاہتا ہے جو پشاور رہائش رکھتا ہے۔ یہاں پر کبھی کبھی آ جاتا ہے اور اس لئے کہ اُس کا گھر اور زمین یہاں ہے مگر وہ رہتا نہیں ہے۔ میں نے اُن کو کہا کہ میں شیر پاؤ سے سفارش کروں گا کہ وہ آپ کی خواہش کے مطابق یہاں تنظیم سازی کرے۔ وہاں پر چائے وغیرہ پینے کے بعد نثار محمد کے ساتھ رات بھر سرحد کی سیاست پر بات ہوتی رہی۔ میں نے سوال کیا کہ پنجاب اور سندھ کی طرح سرحد میں پیپلز پارٹی کی مقبولیت کیوں دکھائی نہیں دیتی۔ نثار چونکہ ایک پرانا سیاسی کارکن تھا۔ اُس نے مختصر سا تجزیہ کر کے مجھے وہاں کی صورتحال سمجھائی۔ اُس نے کہا کہ پنجاب اور سندھ میں تمام سیاست دان مسلم لیگ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ باری باری اقتدار میں آتے رہے۔ لوگوں کی اُمیدیں پوری نہیں کر سکے۔ بدنام ہوتے گئے۔ دوسرے فوجی حکومتوں نے ان سیاست دانوں کو یا تو اپنے ساتھ ملا لیا یا اُن کو ڈرا کر خاموش گھروں میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ سرحد میں بھی معاملہ اسی طرح کا ہوا۔ سرحد میں خان عبدالقیوم خان مسلم لیگ کا لیڈر تھا۔ اُس کو چند دن ایوب خان نے جیل میں ڈالا تھا اور وہ معافی مانگ کر جیل سے باہر آ گیا تھا اور اب تک خاموش گھر میں بیٹھا ہے۔ اس کے مقابلے میں سرحد میں ولی خان کی جماعت نیشنل عوامی پارٹی پاکستان کے قیام سے ہی حکومت کے خلاف لڑتی چلی آ رہی ہے۔ ایوب خان نے ایک مدت تک غفار

www.bhutto.org

خان کو، ولی خان کو اور اے ۔ این ۔ پی کے دوسرے لیڈروں کو جیلوں میں ڈالے رکھا۔ مگر ان لوگوں نے کبھی معافی نہ مانگی اور نہ ہی حکومت کے خوف سے اپنی سیاست ختم کی۔ لہٰذا ایک لمبے عرصے سے ایک واحد پارٹی سرحد میں لوگوں کے درمیان حزب اختلاف کی جماعت کی شکل میں میدان میں کھڑی چلی آرہی ہے۔ اُس کی اور حکومت کی دشمنی بہت کھلی اور نمایاں دشمنی ہے۔ سرحد کے عوام اس پارٹی کی قیادت کو واحد ترجمان خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ صوبہ قبائلی صوبہ ہے۔ ہر قبیلے کا خان جس پارٹی میں شامل ہو جاتا ہے، وہ تمام قبیلہ اُس پارٹی میں خود کو شامل تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ سرحد کے تمام بڑے قبیلوں کے خان نیشنل عوامی پارٹی میں پاکستان بننے سے پہلے شامل تھے۔ اے۔ این۔ پی کی قیادت اُس وقت کانگرس میں شامل تھی۔ اور یہ تمام خان کانگرس کی سیاست کے موقف کی وجہ سے پاکستان بننے کے خلاف تھے۔ اب جب پاکستان بن گیا تو پاکستان مسلم لیگ بجائے اس کے کہ ان لوگوں کو پاکستان کے شہری خیال کرتی، اس کا ماضی بھول کر اس کو اپنے ساتھ ملاتی۔ اس مسلم لیگ نے اس صوبے میں اپنی تنہا حکمرانی کے لئے ان تمام لوگوں کو پاکستان کا غدار قرار دے رکھا ہے۔ مسلم لیگ کا عبدالقیوم خان انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ جبکہ اے۔ این۔ پی کے لیڈر انگریز دشمن تھے اور قوم پرست تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے رہنما تھے۔ قیوم خان سے بڑے لیڈر تھے۔ وہ اُن کے درمیان کھڑا ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا مسلم لیگ کے لیڈروں کی سطحی سوچ نے اُن کو سرحد کا اصلی رہنما بنا دیا۔ مسلم لیگی حکومتوں کے مزے لوٹتے رہے اور ولی خان وغیرہ جیلوں میں رہے اور لیڈر بن گئے۔

اے۔ این۔ پی کے ساتھ اس وقت سرحد کے عوام کی تیسری نسل چل رہی ہے۔ اس پارٹی کے علاوہ سرحد میں اور کوئی پارٹی ہی نہیں تھی اور یہی حالت صوبہ بلوچستان کی تھی۔ یہ سرحد کی تاریخ میں پہلی بار دیکھنے میں آرہا ہے کہ سرحد سے باہر کا ایک سیاست دان بھٹو کی شکل میں سرحد میں مقبول ہو رہا ہے۔ وہ سرحد کے عوام کے مزاج کے مطابق سیاست کر رہا ہے۔ بس اس کیلئے ضروری ہے کہ یہاں پر جو لوگ نیشنل عوامی پارٹی سے ناراض ہیں یا جن کو ولی خان کا خاندان سیاست میں آنے نہیں دیتا، اُن لوگوں کو پارٹی میں شامل کیا جائے۔ اُن کو بڑے عہدے دیئے جائیں۔ چند ہی دنوں میں پاکستان پیپلز پارٹی اے۔ این۔ پی کے برابر ہو جائے گی۔ اے۔ این۔ پی کے علاوہ دوسری یہاں پارٹی مفتی محمود کی پارٹی ہے جو مذہبی حلقوں میں مقبول ہے۔ اُس کے مقابلے میں

www.bhutto.org

تمام روشن خیال جدید سوچ کے حامل لوگ بھٹو صاحب کے ساتھ آئیں گے۔ وہ بھٹو صاحب کو ولی خان سے زیادہ انقلابی اور ترقی پسند خیال کرتے ہیں۔ یہ وہ حقیقت افروز تجزیہ تھا جو نثار محمد خان کھیچی نے سرحد کی سیاست کے بارے میں کیا تھا۔ جس کی صداقت اُس وقت کھلی، جب میں پشاور یونیورسٹی کے طالب علموں کو ملا تو بھٹو صاحب کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ میں نے اُن کو پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کیلئے کہا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمارے باپ دادا نیشنل عوامی پارٹی میں تھے جس کی وجہ سے ہم کو بھی اس پارٹی کے ساتھ رہنا ہے۔ میں نے دیکھا کہ شہروں کے لوگ جو قبائلی نظام سے آزاد تھے، وہ تمام پیپلز پارٹی کے ساتھ تھے۔ اس تمام صورتحال کے پیش نظر سرحد میں پارٹی کی تنظیم سازی کیلئے بڑی محنت کی ضرورت تھی۔ اس کیلئے ضروری تھا کہ سرحد سے کوئی ولی خان کی ٹکر کا سیاست دان پارٹی میں شامل کیا جاتا۔ مگر جو رویہ حیات محمد خان شیر پاؤ کا تھا جس کو چیئرمین بھٹو نے روزِ اوّل سے ہی سرحد کے تمام سیاہ وسفید کا انچارج بنا دیا تھا، وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سیاسی طور پر اُن مصلحتوں سے اُلٹ خیالات رکھتا تھا۔

میں نثار محمد خان کے ساتھ واپس چارسدہ چلا گیا۔ نثار محمد خان مجھے حیات محمد خان کے گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ حیات محمد خان نے مجھ سے گلہ کیا کہ آپ میرے مہمان تھے۔ آپ کو اس کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں نے کہا کہ میں تو آپ سے پوچھ کر گیا تھا۔ ویسے بھی وہ پارٹی کا دوست ہے، ساتھی ہے۔ اُس کے ساتھ جانے پر آپ کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ واضح رہے کہ پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد جب حیات محمد خان شیر پاؤ سرحد کا گورنر بنایا گیا تھا اور جب تخریب کاری کے ذریعے حیات محمد خان شیر پاؤ کو کالج کی تقریب میں بم دھماکے سے شہید کر دیا گیا تھا تو اسی نثار محمد خان پر شیر پاؤ کے قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا۔

چیئرمین بھٹو مجھ سے ناراض ہو گئے

میں شیر پاؤ سے اجازت لے کر لاہور واپس آ گیا۔ واپس آ کر میں نے ایک تحریری رپورٹ بنا کر چیئرمین بھٹو صاحب کو کراچی ارسال کر دی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد چیئرمین بھٹو اسلام آباد گئے۔ وہاں چیئرمین صاحب کے ساتھ حیات محمد خان شیر پاؤ نے ملاقات کی۔ شیر پاؤ نے میرے متعلق ناراضگی کا اظہار کیا۔ چیئرمین بھٹو میں ایک بات کی بے حد کمزوری تھی۔ وہ کمزوری یہ تھی کہ

www.bhutto.org

وہ ہراُس شخص کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے جس کے وہ گھر جا کر ٹھہرا کرتے تھے۔ یہی کمزوری اُن کی مصطفےٰ کھر کے بارے میں ظاہر ہوا کرتی تھی یا ہر شہر میں وہ جس کے گھر ٹھہرتے تھے، اُس کو بہت اہمیت دیا کرتے تھے۔ مصطفےٰ کھر اور حیات محمد خان شیر پاؤ کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ یہ دونوں میرے نوجوان فالور ہیں۔ پیروکار ہیں۔ وہ خود کو اُن کا استاد خیال کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ نوجوان قیادت کو پسند کرتے تھے مگر ہر باوسائل انسان کو وہ بڑی اہمیت دیا کرتے تھے۔ اُن کی یہ اہمیت اُس وقت کی ضرورت بھی تھی بلکہ سیاست میں ہر وقت کی ضرورت رہی ہے۔ لہٰذا اُن دنوں وہ حیات محمد شیر پاؤ کی وجہ سے میرے ساتھ خفا ہو گئے۔

وہ لاہور تشریف لائے تو میں خوشی خوشی اُن کو ملنے گیا کہ میں نے اُن کو سرحد کی بے حد خالص سیاسی صورتحال سے آگاہ کیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔ مگر معاملہ اُلٹ ثابت ہوا۔ چیئرمین بھٹو مجھے دیکھتے ہی لال پیلے ہو گئے۔ وہاں کافی لوگ موجود تھے۔ اُنہوں نے اُن سب کی موجودگی میں مجھے کہا کہ تم کو کسی کی مہمان نوازی کا کوئی ادب نہیں۔ تم شیر پاؤ کے گھر سے کسی دوسرے کے گھر بغیر اُس کو بتائے چلے گئے۔ وہ قبائلی روایات کے لوگ ہیں۔ اُن کا مہمان کسی دوسرے کے پاس جائے، اِس کو وہ اپنی توہین خیال کرتے ہیں۔ تم حیات محمد خان شیر پاؤ کو خط لکھ کر اُس کی دل جوئی کرواور اپنی غلطی کی معذرت کرو۔

چھ ماہ کے لئے میری لاہور بدری اور زبان بندی کا حکم

جہاں اہلِ وفا کا جینا ازل سے مشکل رہا ہے اسلم
انہی کی قسمت میں امتحاں ہیں انہی کے سر ہیں حساب سارے

یکم مارچ 1968ء کو چائنیز لنچ ہوم ہوٹل میں جہاں اُن دنوں ہم تمام سیاسی کارکن بیٹھا کرتے تھے۔ وہاں کچھ سرکاری اہل کار معہ پولیس آئے اور اُنہوں نے مجھے گھیرا ڈال کر اپنے حصار میں لے لیا۔ چائنیز لنچ ہوم کافی ہاؤس کے ساتھ والی بلڈنگ میں واقع تھا۔ اُس وقت آغا شورش کشمیری اور حبیب جالب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے یوں گمان گذرا کہ یہ مجھے گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں۔ میں جب پشاور سے واپس آیا تھا تو خفیہ پولیس کا ایک سپاہی میرے پیچھے لگا رہتا تھا۔ اُس کو بار بار دیکھنے سے مجھے بھی کچھ دنوں سے اس بات کا شک رہتا تھا کہ حکومت مجھے

گرفتار کرنے والی ہے۔ پولیس کے اس خفیہ سپاہی کا نام سعید تھا وہ میرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔

گورنر موسیٰ خان کے خلاف میری نظم جو پیچھے آپ پڑھ چکے ہیں۔ اِس نظم سے ہر جگہ بڑی گونج پیدا ہو چکی تھی۔ اِس نظم کو کارکنوں نے چھپوا کر لاہور میں اشتہاروں کی شکل میں تقسیم کرنا شروع کر رکھا تھا۔ گورنر موسیٰ خان کو غصہ تو اپنے خلاف لکھی گئی نظم کا تھا۔ مگر اُس نے میری ایک دوسری پہلے سے پڑھی گئی نظم ''بغاوت'' پر مقدمہ قائم کر کے مجھے لاہور شہر بدر کر کے میرے گاؤں ماڑی ٹھاکراں کی ریونیولیمٹ میں مجھے نظر بند رہنے کا حکم جاری کر دیا اور اِس کے ساتھ ہی میری چھ ماہ کے لئے زبان بندی کا حکم بھی نافذ کر دیا۔ اِس حکم کے آخر میں لکھا گیا کہ اِس باغی شخص کو شاعر ہونے کی وجہ سے جیل نہیں بھیجا گیا۔ اگر اِس نے حکومت کے احکامات کی پابندی نہ کی تو اِس کو چھ ماہ کے لئے جیل میں ڈال دیا جائے گا۔

ہوٹل میں بیٹھے تمام لوگوں نے مجھے حکومت کا حکم وصول کرنے کا مشورہ دیا اور میں نے گورنر کا وہ حکم نامہ وصول کر لیا اور وصولی کے دستخط کر دیئے۔ مجھے لاہور چھوڑنے کے لئے صرف چوبیس گھنٹے کا وقت دیا گیا تھا۔ میں نے لاہور میں موجود اُس وقت کے پارٹی لیڈروں کے ساتھ مشورہ کیا۔ میری ذاتی رائے یہ تھی کہ میں اِس حکم کی تعمیل کرنے سے انکار کر دوں اور جیل چلا جاؤں مگر شیخ محمد رشید، شیخ صفدر علی اور ملک اسلم حیات نے میرا موقف تسلیم نہ کیا۔ شیخ صفدر نے کہا کہ اِس معاملے میں وہ بھٹو صاحب سے فون پر بات کر کے ہم سب کو اُن کی رائے سے آگاہ کریں گے اور جو بھی وہ مشورہ دیں گے، اُس پر عمل کیا جائے۔

شیخ صفدر علی کراچی میں کسی دوسرے آدمی کے ذریعے بھٹو صاحب کو اپنا پیغام وغیرہ پہنچایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے کراچی بات کی اور شام کو ہم کو بتایا کہ بھٹو صاحب کہتے ہیں کہ جیل جانے کی ضرورت نہیں۔ اسلم کو کہو کہ وہ گاؤں جانا قبول کر لے۔ اِس طرح یکم مارچ کی رات کو یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ صبح 10 بجے مجھے ہمارے کچھ دوست چائنز لنچ ہوم ہوٹل سے بڑی دھوم دھام کے ساتھ روانہ کریں گے۔ دوسرے دن صبح چائنز لنچ ہوم ہوٹل میں بیٹھنے والے تمام لوگ ہوٹل پہنچ گئے۔ اُن کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن، کچھ وکیل حضرات جن میں امان اللہ خان، ادریس کھٹانہ، ملک آفتاب ربانی، احسان وائیں، فاروق بیدار، فاروق قریشی، ملک اسلم حیات، ملک حامد سرفراز، خواجہ رفیق، میاں عبدالستار نجم، شیخ سرور اقبال، ماسٹر سردار، کبریا خان، سید سجاد شاہ، بیگم عباد

www.bhutto.org

احمد خان۔ اِن تمام مہربان دوستوں نے میرے گلے میں ہار ڈال کر مجھے وہاں سے رخصت کیا۔

ان تمام دوستوں نے طے کیا کہ ہوٹل سے پیدل چل کر کمرشل بلڈنگ مال روڈ کے چوک تک پیدل چلا جائے گا تا کہ لوگوں کو حکومت کے اِس جبر کی خبر ہو سکے اور وہاں سے میں گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گاؤں چلا جاؤں گا۔ جب میں اِن دوستوں کے جلو میں چوک کی طرف جا رہا تھا تو لوگ پوچھنا شروع ہو گئے کہ کیا ماجرا ہے۔ ہمارے ورکرز اُن کو بتاتے کہ ایک شاعر کو لاہور شہر سے نکل جانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اُن کے بتانے سے لوگوں کے چہروں پر نفرت کا اظہار نمایاں ہو جاتا تھا۔ عین اُس وقت مجھے بھٹو صاحب کی برہمی یاد آ گئی جو شیرپاؤ کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مجھے اُس وقت قرۃ العین طاہرہ بابی جو ایران کی بابی تحریک کی باغی شاعرہ تھی اس کا یہ بلا کا شعر یاد آیا۔

بہ جرم عشق توام می کشند و غوغا ایست

تو نیز برسرِ بام آ کہ خوش تماشا ایست

اُس کا دوسرا نام زرین تاج طاہرہ تھا۔ قرۃ العین طاہرہ نے یہ شعر اُس وقت کہا تھا جب اُس پر بغاوت کا مقدمہ بنا کر اُس کو پابہ زنجیر شہر میں گھمایا جا رہا تھا۔ طاہرہ بابی تحریک کے رہنما مرزا محمد علی باب کی پیروکار تھی۔ مرزا باب نے ایران کے شہنشاہ قاچار کے خلاف بغاوت کی تحریک چلا رکھی تھی۔ طاہرہ کی شاعری نے شہر میں بادشاہ کے خلاف آگ لگا دی تھی۔ بادشاہ کو درباریوں نے مشورہ دیا کہ باب کی تحریک کو اگر کچلنا ہے تو اِس تحریک کی روح رواں شاعرہ طاہرہ کو گرفتار کر لیا جائے اور اُس کو شہر میں گھما پھرا کر ذلیل کیا جائے۔ طاہرہ جب گرفتار کر لی گئی تو اُس کو پابہ زنجیر مرزا باب کے گھر کے آگے سے گذارا گیا۔ وہاں طاہرہ نے بلند آواز سے یہ شعر پڑھا تھا۔ شعر کا ترجمہ یہ ہے:

''تمہارے عشق کے جرم میں، میں اپنے ساتھ اپنی رسوائی کا ہجوم لئے پھر رہی ہوں۔ تم ذرا اپنے گھر کی چھت پر آ کر یہ نظارا تو دیکھو کہ یہ تماشا کس قدر دلچسپ ہے۔ کس قدر قابل دید ہنگامہ ہے۔''

دوستوں نے مجھے گاڑی میں بیٹھا دیا اور میں طاہرہ بابی کے اِس شعر کے نشے میں اپنے گاؤں ماڑی ٹھاکراں پہنچ گیا جہاں گاؤں کے سکول میں پولیس میرے پہنچنے کا پہلے ہی سے انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے میرے گاؤں کی حاضری کے کاغذات پر مجھ سے دستخط کروائے اور ایک سپاہی کو میری نگرانی کے لئے سکول میں چھوڑ کر واپس کامونکی تھانہ چلی گئی۔ واضح رہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی جو 28 نومبر 1967ء کو معرض وجود میں آئی تھی، اُس کے وجود میں آنے کے بعد میں وہ

www.bhutto.org

پہلا پارٹی کا ممبر تھا جس کو ایوب خان کی حکومت نے گرفتار کیا تھا اور گاؤں میں پابند کیا تھا اور اُس کی زبان بندی کی گئی تھی۔ اس لحاظ سے میں پارٹی کا پہلا سیاسی قیدی تھا۔

چھ ماہ کی زبان بندی پر

میری زباں تو منہ سے نکال لی تم نے
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
متاعِ عظمتِ آدم سے کھیلنے والو!
یہ ابتدا مرے مقصد کی انتہا سمجھو

○

ہر اِک زباں پہ مرا حرفِ مدعا ہوگا
ہر اِک دماغ مرے فکر و فن میں سوچے گا
ہر ایک دل میں مرے دل کی دھڑکنیں ہوں گی
ہر اِک بشر میری طرزِ سخن میں سوچے گا

○

عجیب شور اُٹھے گا سکوتِ دوراں سے
وہ شور جس کو ترا ظلم بھی مٹا نہ سکے
چراغ شام جلا دے گا شب کی تاریکی
کہ جس کی آگ سے دامن بھی تو بچایا ہوتا

○

ابھی تو رازِ محبت ہی ہم نے کھولا ہے
فسانۂ غمِ دل مختصر بھی بات نہیں
سحر قریب ہے شب کی حیات ختم ہوئی
تمہارے حکم کی پابند کائنات نہیں

○

مری زبان کی میعاد ختم ہونے تک
تمہاری اپنی زباں گنگ ہو گئی ہوگی

www.bhutto.org

تمہارے قلب و جگر ماند پڑ گئے ہوں گے
تمہاری نگہہ ستم تھک کے سو گئی ہوگی

○

بشر کی قوتِ گویا کو چھیننے والو
خدا تمہاری بھی گویائی چھین سکتا ہے
جو چھن گئی تو کبھی پھر نہ مل سکے گی تمہیں

○

ایک بھولی بھالی ماں کی دعا ''ایوب خان تیرے بچے جیتے رہیں''

ہم ہندوستان سے مارڑی ٹھاکراں گاؤں میں آ کر مقیم ہوئے تھے ہمارے تمام رشتے دار اِسی گاؤں میں ہی رہتے تھے۔ خاص طور پر ہمارے ننھیال کے تمام رشتے دار اِس گاؤں میں مقیم تھے۔ جس کی وجہ سے بے بے جی کو یعنی میری والدہ کو یہ گاؤں بڑا عزیز تھا۔ وہ ایک رات کے لئے بھی اِس گاؤں سے باہر نہیں جایا کرتی تھیں۔ ہر چند گاؤں سے ہم لوگ لاہور منتقل ہو چکے تھے۔ گاؤں میں تو میرے بڑے بھائی محمد اکرم خان ہی رہائش رکھتے تھے۔ اِس کے باوجود ہماری والدہ لاہور رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ لاہور شہر کے شور سے بہت گھبرایا کرتی تھیں۔ لاہور آ کر اُن کو نیند نہیں آیا کرتی تھی۔ اُن کے مستقل گاؤں رہنے کی وجہ سے میری اُن کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ منقطع رہا کرتا تھا۔ وہ اکثر میری جدائی کو محسوس کیا کرتی تھیں۔ اب جب اُن کو اِس بات کا علم ہوا اور اُن کو بتایا گیا کہ ایوب خان نے مجھے چھ ماہ کے لئے گاؤں میں رہنے کا پابند کر دیا ہے تو میری والدہ نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ ''ایوب خان تیرے بچے جیتے رہیں'' تو نے میرے بیٹے کو میرے پاس بھیج دیا ہے۔ میں نے بے بے جی سے بہت کہا کہ وہ شخص ظالم انسان ہے۔ اُس نے میری آزادی چھین لی ہے۔ مگر میری ماں اِس معاملے میں مجھ سے اتفاق کرنے کو ہرگز تیار نہ ہوئیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ کام تو اُس نے بہت اچھا کیا ہے۔ اگر تمہیں ایوب خان نہ بھیجتا تو تم نے کب میرے پاس آنا تھا۔ میں اور میرے دوست، رشتہ دار اور پارٹی کے کارکن میری ماں کے اِس جملے سے بہت محظوظ ہوا کرتے تھے۔ میری ماں کو مرتے دم تک مجھ سے یہ گلہ رہا کہ تم نے اپنا ماں باپ سب کچھ بھٹو کو بنا

www.bhutto.org

رکھا ہے۔تم کو ہمارا کچھ خیال نہیں ہے۔میری والدہ کے یہ احساسات درست تھے۔پاکستان پیپلز پارٹی کے بننے سے پہلے میں اکثر گاؤں جا کر اپنی والدہ کو مل آیا کرتا تھا۔سردیوں میں شکار کے لئے گاؤں جایا کرتا تھا مگر پارٹی کے وجود میں آنے کے بعد مجھے بھٹو صاحب کے ساتھ ہر شہر ہر صوبے میں جانا ہوتا تھا۔اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ میں گاؤں آسکوں۔چیئرمین بھٹو نے مجھے ایک بار کہا کہ یہ بات خوشی کی ہے کہ تم کوئی ملازمت وغیرہ نہیں کرتے ہو۔تمہارے پاس وقت ہے اور یہ وقت تم کو پارٹی کو دینا ہوگا۔مسکرا کر کہنے لگے کہ شاعرِ عوام کو قائدِ عوام کے ساتھ رہنا ہوگا۔میں نے اُن کی بات کو حقیقت ثابت کر دیا۔میں نے تمام وقت اور تمام زندگی ہی پارٹی کے لئے وقف کر دی مگر افسوس کہ بعد میں ''چیئرمین بھٹو اور پارٹی میرے ساتھ انصاف نہ کر سکی۔''

گاؤں میں میں تھا اور میری والدہ تھی۔میرے گاؤں میں نظر بند رہنے کی خبر ہمارے تمام عزیزوں کو ہو گئی۔ہر روز شہر سے مہمان آنا شروع ہو گئے جس کی وجہ سے گھر میں بڑی رونق پیدا ہو گئی۔میری والدہ کو پہلے دن سے ہی فکر تھی کہ چھ ماہ بعد تم پھر غائب ہو جاؤ گے۔کچھ دن کے بعد پارٹی کے ساتھیوں اور سیاسی لیڈروں نے بھی گاؤں آنا شروع کر دیا۔اُن دنوں سردیوں کے موسم میں ہمارے گاؤں کے اردگرد مرغابی، تلیئر اور جنگلی فاختہ کا بہت شکار ہوا کرتا تھا۔اِس کے علاوہ ہمارے گاؤں کی جھیل میں مچھلی بہت ہوا کرتی تھی۔اُن دنوں ہمارا گاؤں سیم کے پانی کا گڑھ تھا۔ہمارا یہ گاؤں اپر چناب نہر کے کنارے واقع ہے۔یہ گاؤں آس پاس کی سطح زمین سے کچھ بلندی پر واقع تھا جس کی وجہ سے اِس کو ماڑی کہا جاتا تھا۔لفظ ماڑی کے معنی اونچا ہونے کے ہیں۔یہ ہندو ٹھاکروں کا گاؤں تھا۔گاؤں کے ساتھ ایک بہت بڑی جھیل تھی جو تقریباً 2 میل لمبی تھی۔اِس جھیل کے اردگرد بہت سبزہ اور کائی ہوتی تھی۔مجھے اپنے گاؤں کا لینڈ اسکیپ بے حد پسند تھا۔اب تو وہ گاؤں بالکل بدل چکا ہے۔جھیل ختم ہو چکی ہے۔نہ وہ پہلے سا سبزہ ہے، نہ پہلی سی خوبصورتی ہے۔میں نے گاؤں میں صبح سویرے اُٹھ کر شکار کھیلنا شروع کر دیا اور جو لیڈر یا دوست لاہور سے گاؤں آتا، اُس کی تواضع شکار کے گوشت سے کی جاتی اور جاتے وقت کچھ شکار کا گوشت تحفہ کے طور پر دیا جاتا تھا۔سب سے پہلے شکار کا گوشت آغا شورش کشمیری، ملک اسلم حیات اور حبیب جالب کو دیا گیا۔شکار کے گوشت اور تازہ مچھلی کی بات کافی ہاؤس، چائنیز لنچ ہوم اور پارٹی کے دوستوں تک پہنچ گئی۔اُس کے بعد دوستوں کے تاتے بندھ گئے۔میں صبح سویرے اُٹھ کر شکار کو نکل جاتا۔ہمارے گاؤں کے داتا محمد دین مراثی کا بیٹا جیمو

میرے ساتھ ہوتا تھا 10 بجے تک میں فاختاؤں اور تلیئروں کا ڈھیر لگا دیتا تھا۔ اُس شکار کو علیحدہ علیحدہ لفافوں میں ڈال کر اُس کے اوپر دوستوں کے نام تحریر کر دیئے جاتے۔ جو بھی گاؤں آتا، اُس کو وہ دیئے جاتے تھے۔ اس طرح گاؤں سے دوستوں کو شکار پہنچ جاتا تھا۔ حبیب جالب جب بھی آتے تو کئی دن تک میرے گاؤں ٹھہرتے تھے۔ ایک دن میں نے گنا، وہ تقریباً بیس تلیئر اکیلے ہی کھا گئے۔ حبیب جالب صاحب کہتے تھے کہ تمہارے گاؤں میں ایک دن گذارنے سے میری صحت اچھی ہو جاتی ہے۔

مرغابی کا شکار اور داتا جیمو کی پھبتی

گاؤں میں تلیر اور فاختاؤں کا شکار کرنا آسان تھا۔ مرغابی کا شکار کرنا کچھ مشکل تھا۔ میری کوشش یہ رہتی تھی کہ جھیل میں بیٹھی مرغابی کو شکار کیا جائے۔ اُڑتی ہوئی مرغابی کو شکار کرنے میں خرابی یہ تھی کہ مرغابی نہر میں گر جاتی تھی۔ ہمارے گاؤں کی اپر چناب نہر پنجاب کی سب سے بڑی نہر ہے۔ ہمارے گاؤں کے قریب اس نہر کا پاٹ بہت زیادہ ہے۔ یہ دریا معلوم ہوتی ہے۔ اس کا پانی بہت گہرا اور تیز ہوتا ہے۔ شکار کی گئی مرغابی اگر نہر میں گر جائے تو اس کو نکالنا بے حد مشکل ہوتا تھا۔ اکثر شکار ضائع ہو جاتا تھا۔ میرے ساتھ داتا محمد دین کا بیٹا داتا جیمو میرا مددگار ہوتا تھا۔ ''داتا'' ہمارے گاؤں میں مراثی کو کہا جاتا تھا۔ لفظ داتا ان مراثیوں کے لئے ایک اعزازی لفظ ہے۔ داتا جیمو مجھے روز دیکھتا تھا کہ میں ڈھاب میں بیٹھی ہوئی مرغابی کو تو فوراً شکار کر لیتا تھا۔ مگر نہر کے اوپر اڑتی ہوئی مرغابیوں کو شکار کرنے سے گریز کرتا تھا۔ ایک دو بار مجھے اس نے اڑتی ہوئی مرغابیوں کو شوٹ کرنے کا کہا مگر میں نے ان کے نہر میں گرنے کے خوف کی وجہ سے اس کے کہنے پہ عمل نہ کیا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں کو خصوصاً میرے عزیزوں کو کہنا شروع کر دیا۔ وہ پنجابی میں بات کرتا تھا۔ وہ ان لوگوں کو کہتا تھا۔ ''جدی باؤ دے ہتھوں لکھی ہندی اے۔ اُو ٹاب وچ آ کے بیٹھ جاندی اے۔ اُڈدی مرغابی ترلے دی لوے تے باؤ انہوں نہیں ماردا۔''

ترجمہ۔ جس مرغابی کی تقدیر میں مرنا ہوتا ہے وہ ڈھاب میں آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ ''باؤ دا بطخاں تے نشانہ پڑا پکا اے۔'' بطخوں پر باوا اسلم کا نشانہ بڑا پکا ہے۔

بطخوں کا لطیفہ

مجھے مرغابی کا شکار کھیلے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ میں چھٹی جماعت تک گاؤں میں رہا تھا۔ اس

www.bhutto.org

وقت بندوق چلایا کرتا تھا۔اس کے بعد شکار کھیلنے کا بہت کم موقعہ ملتا تھا۔ابھی گاؤں میں شکار کھیلنے کا دوسرا ہی دن تھا کہ داتا جیمو مجھے جھیل یعنی ڈھاب کے اس جانب لے گیا جہاں کمہاروں کے گھر تھے۔ڈھاب کا یہ کنارا گاؤں کے قریب تھا۔داتا جیمو بڑا ہڈ حرام تھا جس طرح کے مراثی ہوا کرتے ہیں۔وہ مجھے زیادہ دور شکار کھیلنے کے لئے لے کر جانے سے کتراتا تھا۔کمہاروں کے گھروں کے متصل ڈھاب کا پانی بہت کم تھا۔وہاں مختلف رنگوں کی بطخیں تیر رہی تھیں۔بڑی صحت مند بطخیں تھیں بڑی اچھل کود کر رہی تھیں۔ابھی صبح کا جھٹ پٹا تھا چیزیں صاف دیکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ مجھے داتا جیمو کہنے لگا کہ یہ مرغابیاں ہیں۔ مجھے چونکہ شکار کا تجربہ نہیں تھا۔میں مرغابیوں میں اور بطخوں میں کچھ فرق محسوس نہ کر سکا۔میں نے فائر داغ دیا۔پانچ بطخیں ڈھیر ہو گئیں۔حیرانی کی بات یہ ہوئی کہ باقی بچنے والی مرغابیاں اڑنے ہی نہ پائیں۔وہ تیزی سے تیرتی ہوئی کمہاروں کے گھروں کی طرف چلی گئیں۔داتا جیمو پانی سے بطخوں کو اٹھا کر لایا۔جب میں نے ان کو ذبح کیا تو مجھے ان کے بطخیں ہونے کا یقین ہو گیا۔اتنے میں کمہاروں کی عورتوں نے شور کر دیا۔ہماری بطخیں مار دیں۔ہماری بطخیں مار دیں۔میں اُن کے پاس گیا۔میں اُن کو جانتا تھا۔وہ مجھے جانتی تھیں۔ میں نے کہا کہ مرغابیوں کی غلط فہمی میں بطخیں مرگئی ہیں۔آپ اِن کے پیسے لے لیں۔اُنہوں نے 10 روپے فی بطخ کہے۔میں نے 10 روپے فی بطخ اُن کو پیسے ادا کر دیئے۔مگر وہ مراثی بجائے اِس کے کہ میرا پردہ رکھتا، وہ سارے گاؤں کو بتاتا پھرا،اور بتاتا بھی کچھ اِس طرح تھا کہ باو کا نشانہ ہی بڑا ہے۔بس بیٹھی مرغابی کو تو چھوڑتا ہی نہیں ہے۔میں بھونکتا رہتا ہوں کہ سر پر سے گزرنے والی مرغابیوں کو مارو مگر وہ کمہاروں کی بطخوں کو مار ڈالتا ہے۔بطخوں پر باو کا نشانہ بڑا پکا ہے۔بطخوں کے شکار کا مذاق سارے گاؤں میں پھیل گیا۔گاؤں میں جو بھی مجھے ملتا، شکار کی بات شروع کر دیتا۔ میں لوگوں کو اپنی صفائی دے دے کر تنگ آ گیا۔بطخوں کے خوف سے میں نے گاؤں کے ساتھ جھیل کے کنارے شکار کھیلنا ہی چھوڑ دیا۔اب میں جھیل کے اوپر سے نہر کے کنارے چل کر ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جا کر شکار کھیلتا تھا۔ہر صبح جیمو مراثی کو میرے ساتھ پیدل چلنا پڑتا تھا۔اوپر سے مرغابیاں اُڑتی ہوئی آتیں تو میں نیچے بیٹھ کر اُن کے جھیل میں بیٹھنے کا انتظار کرنے لگ جاتا۔جب وہ بیٹھ جاتیں تو میں اُن کو شوٹ کر دیتا۔اِس طرح ہر روز کی اِس مسافت سے مراثی کی جان پر بن گئی۔وہ تمام دن لوگوں کو شکار کے قصے سناتا رہتا۔اب اُس کے ساتھ لوگ مذاق کرنے لگ گئے۔

www.bhutto.org

وہ اُس کو کہتے کہ یہ تمہارا باؤ اُڑتی مرغابی کیوں نہیں مارتا۔ وہ کہتا کہ باؤ بطخوں پر مرغابیوں کا غصہ نکالتا ہے۔ وہ پنجابی میں کہتا۔ بیٹھی مرغابی تے باؤ چھڈ دا ای نئیں تے اڈی دی ول تکدا وی نئیں۔ بیٹھی کو چھوڑتا نہیں اور اُڑتی کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ میں مراثی کی باتوں سے بہت تنگ آ گیا۔ میں صبح سویرے جھٹ پٹے کے وقت نہر کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ ارادہ کر لیا کہ آج اڑتی گرائی جائیں گی۔ جیمو مراثی نے مجھے کہا کہ آگے نہیں چلنا۔ میں نے کہا کہ آج یہیں پہ شکار ہو گا۔ میں نے کہا کہ جیمو مرغابی اگر نہر میں گر گئی تو تم نکال لاؤ گے۔ کہنے لگا۔ آپ ماریں تو سہی نکالنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ دراصل اُس کو یقین ہی نہیں تھا کہ میں اُڑتی مرغابی شکار کر لوں گا۔ میں نے احتیاطاً کارتوس پر تکبیر پڑھ کر اُس کو بندوق میں ڈالا تھا۔ اِس طرح کے شکار میں تکبیر پہلے پڑھ لی جاتی ہے۔ دن کی جب تھوڑی سی روشنی ہوئی تو مرغابیاں اوپر سے گزرنا شروع ہو گئیں۔ پہلے جو گذریں وہ کافی بلندی پر تھیں۔ اُن کو فائر نہیں لگ سکتا تھا۔ جیمو مراثی اِن باتوں سے بے نیاز تھا۔ کہنے لگا باؤ جی! جس طرح سیدھی بندوق چلاتے ہو۔ اِسی طرح اوپر کر کے چلا دو۔ میں نے کہا خاموش رہو۔ کچھ دیر بعد کچھ مرغابیاں نیچی پرواز کرتی ہوئی آ گئیں۔ میں نے فائر کیا۔ تین مرغابیاں نہر میں گر گئیں۔ میں نے دور سے شور کر کے داتا جیمو کو کہنا شروع کر دیا۔ اب اِن کو نکالو ورنہ یہ گہرے پانی میں چلی جائیں گی۔ وہ زمین پر لیٹ گیا۔ میں اُس کو اوپر اُٹھاؤں، وہ اُٹھتا ہی نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ تم ہر روز کہتے تھے کہ اُڑتی کو مارو، میں نہر سے نکالوں گا اب نکالتے کیوں نہیں؟ کہنے لگا۔ باؤ جی مراثی کاغذ ہوتا ہے۔ مجھے نہر میں اُتار کر آپ واپس گاؤں میری جگہ کیا لے کر جائیں گے۔ اُس کی حالت دیکھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ میں کافی دور تک کنارے کنارے چلتا گیا۔ تب کہیں جا کر مرغابیاں کنارے کے قریب آ گئیں اور اِس طرح مرغابیوں کو نہر سے نکالا گیا۔ اُس کے بعد وہ خاموشی کے ساتھ میرے ساتھ پیدل اُس مقام تک جاتا تھا جہاں بیٹھی مرغابیوں کا شکار کیا جا سکتا تھا۔

گاؤں میں میری دوسری مصروفیت دوستوں کو خط تحریر کرنا ہوتی تھی۔ گاؤں سے میں نے پہلا خط حیات محمد خان شیر پاؤ کو تحریر کیا۔ اِس خط کو تحریر کرنے کا مجھے چیئرمین بھٹو کی طرف سے حکم بھی تھا۔

''مجھے رہا کر دیا گیا'' بلکہ آزاد کر دیا گیا

میری نظر بندی اور زبان بندی کا یہ سلسلہ تقریباً 4 ماہ اور 17 دن چلتا رہا۔ نظر بندی کی کل

www.bhutto.org

میعاد چھ ماہ تھی۔ اِسی دوران بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید اور اُن کے شاگرد میاں عبدالستار نجم نے میری رہائی کے لئے اور زبان بندی کے احکامات ختم کرنے کے لئے لاہور ہائیکورٹ میں رِٹ داخل کر دی۔ پنجاب میں یہ اپنی نوعیت کا واحد مقدمہ تھا، جس مقدمے میں ایک شاعر اور سیاسی کارکن کو ایک گاؤں کے پٹوار کھاتے کی حدود میں قید کر دیا گیا تھا۔

اس قسم کے مقدمات میں قانونی طور پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ حکومت نظر بند یا قید انسان کو 15 دن کے اندر اندر اُس کے خلاف بنائے گئے مقدمے کی نہ صرف وجہ بتائے بلکہ اُس کو تحریری طور پر اُس کے جرم سے آگاہ کرے۔ اِس طرح حکومت قانونی طور پر پابند تھی کہ وہ مجھے میری نظر بندی کی تحریری طور پر وجہ بتاتی اور میری زبان بندی کی وجہ تسمیہ بتاتی۔ مجھے بتانا ضروری تھا کہ مجھے کس قانون اور کن دفعات کے تحت قید یا نظر بند یا شہر بدر کیا گیا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ حکومت یہ کام کرنا بھول گئی۔ لہٰذا مقدمے کی سماعت ہوئی اور 4 ماہ 17 دن کے بعد ہائی کورٹ نے اِس قانونی سقم کی بناء پر میری نظر بندی اور زبان بندی اور شہر بدری کے احکامات کو غیر قانونی قرار دے کر میری رہائی کا حکم جاری کر دیا۔ ویسے بھی میں اپنی آدھی سے زیادہ سزا کاٹ چکا تھا۔ ہائی کورٹ کے بدنام زمانہ جج جسٹس انوارالحق نے حکومت کو بھی خوش کر دیا اور قانون کا گھر بھی پورا کر دیا۔ حالانکہ اِس مقدمے کا فیصلہ پہلے دن ہی میرے حق میں ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے چار ماہ 17 دن نظر بند رکھنا قطعی طور پر غیر قانونی تھا۔ ہر چند اِس معاملے کو بیتے ایک زمانہ گزر چکا ہے مگر میں آج ایک بار پھر بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید اور میاں عبدالستار نجم کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے قانون کا ایسا نقطہ نکالا تھا کہ جس نقطے کو ایوب خان کی حکومت کی لاقانونیت بھی جھٹلا نہ سکی تھی۔ واضح رہے کہ یہ لاہور ہائی کورٹ کا رپورٹڈ کیس ہے۔ اِس واقعہ سے پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف ایوب خان حکومت کے پہلے مقدمے کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا۔ شیخ محمد رشید صاحب نے چونکہ میری وکالت کی تھی۔ اُن کی اِس محبت کی بنا پر اب اُن سے میرے تعلقات بہت خصوصی نوعیت کے ہو گئے تھے۔ اُن کے دفتر آنا جانا معمول بن گیا۔ جس کی وجہ سے میاں عبدالستار نجم کے ساتھ بھی دوستی کا ایک ایسا رشتہ قائم ہو گیا جو آج تک قائم ہے۔ ''بابا بلھے شاہ کی طرح مجھے بھی لوگوں نے آرائیں کی دوستی سے بہت روکا مگر نہ تو بابا بلھے شاہ نے لوگوں کی باتوں کو پلے باندھا تھا اور نہ میں نے کسی بات پر دھیان دیا۔''

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو لاہور تشریف لائے تو اُن کے ساتھ پرل کانٹیننٹل ہوٹل میں میری ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات کافی عرصے کے بعد ہوئی تھی۔ میں نے بھٹو صاحب کو گاؤں میں اُن کے نام کراچی کے پتے پر خط لکھا تھا۔ ساتھ ہی اُن کو زبان بندی والی نظم بھی ارسال کی تھی۔ اُنہوں نے مجھے خط کے موصول ہونے کا بتایا۔ اُنہوں نے کہا کہ میں نے تمہیں جواب اس لئے نہیں دیا کہ میرے خط کی وجہ سے تمہاری نگرانی سخت ہو جاتی۔

رہائی کے بعد چیئرمین بھٹو سے ملاقات

جب میں بھٹو صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہاں شیخ محمد رشید پہلے سے تشریف فرما تھے۔ اُنہوں نے بھٹو صاحب کو میرے مقدمے کی تمام کاروائی کا تفصیل سے بتایا۔ بھٹو صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ کہنے لگے کہ کچھ دنوں بعد حیدرآباد سندھ میں پارٹی کا کنونشن کیا جارہا ہے۔ اِس میں تمہارا ہونا بہت ضروری ہوگا۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ بھٹو صاحب نے روم ویٹر کو کیک لانے کو کہا۔ ویٹر کیک لے آیا۔ جو بھی بھٹو صاحب کو ملنے آتا، بھٹو صاحب اُس کو کیک کھانے کا کہتے اور ساتھ ہی بتاتے جاتے کہ یہ ہمارے شاعر کی رہائی کی خوشی کا کیک ہے۔ بھٹو صاحب کی اِس محبت سے میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بہت اچھا ماحول تھا۔ ملک حامد سرفراز اور کافی دوست کمرے میں جمع تھے۔ شیخ صفدر صاحب میرے گاؤں کے شکار کے بارے میں بھٹو صاحب کو بتا رہے تھے۔ بھٹو صاحب کہنے لگے کہ وہاں تو مجھے ضرور جانا چاہیے تھا۔

شیخ رشید کی کسان ریلی

بات بھٹو صاحب کے کمرے میں میری رہائی کا کیک کھانے کی ہو رہی تھی۔ گاؤں کے شکار کی ہو رہی تھی۔ کمرے کی فضا خوشگوار تھی۔ جس خوشگوار فضا کو شیخ محمد رشید صاحب کی کسان ریلی کے جلسے کی بات نے پہلے تو سنجیدگی میں بدل ڈالا۔ پھر بھٹو صاحب کے موڈ کی خرابی نے ماحول کو بالکل ہی بدل ڈالا۔ شیخ محمد رشید صاحب نے ظلم یہ کیا کہ بغیر بھٹو صاحب کے مشورے کے کسان ریلی موچی دروازے لاہور میں رکھ لی۔ پہلے تو کسان ریلی کیلئے موچی دروازہ لاہور ویسے ہی ایک غیر موزوں جگہ تھی۔ اس لئے کہ غریب کسانوں کے پاس اِس قدر وسائل ہی نہیں ہوتے کہ وہ

www.bhutto.org

لاہور آ کر جلسہ میں شرکت کرتے اور اگر آتے بھی تو اُن کی تعداد بہت کم ہوتی۔ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے موچی دروازے میں بھٹو صاحب بہت بڑا جلسہ کر چکے تھے۔ اب اگر کسان ریلی کا جلسہ اس جلسے سے اگر چھوٹا ہوتا جو کہ چھوٹا ہونا تھا، تو حکومت اخبارات میں یہ مشہور کرنا شروع کر دیتی کہ بھٹو اپنی مقبولیت کھو چکا ہے۔ اب اس کے جلسے میں صرف سینکڑوں کی تعداد میں لوگ آتے ہیں۔ بھٹو صاحب اپنی سیاست کے بارے میں بے حد حساس انسان تھے۔ وہ بہت دور کی بات سوچ رہے تھے۔ مگر شیخ صاحب محض اپنے نظریات کے شکار تھے۔ اُن کا نظریہ یہ تھا کہ چند نظریاتی کسان عام ہجوم کے ایک لاکھ انسانوں پر بھاری ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات نظریاتی حد تک تو درست کہی جا سکتی ہے مگر عوامی شو آف فورس کے نقطہ نظر سے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ چیئرمین بھٹو نے بہت مغموم انداز میں شیخ محمد رشید صاحب کو کہا کہ شیخ صاحب پہلے تو آپ کسان کمیٹی اور پیپلز پارٹی میں فرق محسوس کریں۔ اس کے بعد میری سیاست کا کچھ ادراک کریں۔ آپ مجھے بھی میاں افتخار الدین اور میاں ممتاز دولتانہ بنانا چاہتے ہیں۔ ''فار گاڈ سیک'' خدا کیلئے میرا غلط استعمال نہ کریں۔ آپ اپنی سیاست کو مجھ پر مسلط نہ کریں۔ ایک طرف آپ ایکسپلا ٹیٹنشن کے خلاف بات کرتے ہیں مگر میرے معاملے میں آپ اس کو جائز خیال کر رہے ہیں۔ کیا یہ ایکسپلا ٹیٹنشن نہ ہو گی کہ ایک انسان دریاؤں کو عبور کرتا ہے۔ آپ اُس کو ندی نالے میں کودنے پر مجبور کریں۔ یہ استحصال ہے۔ میرا جلسہ حالات و واقعات کی روشنی میں با قاعدہ مشورے سے رکھا جانا چاہیے تھا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس جلسے میں خود خطاب کریں۔ ملک حامد سرفراز کو ساتھ لے جائیں۔ اسلم گورداسپوری کو بھی ساتھ لے جائیں۔ اگر جلسے کی حاضری زیادہ ہو تو مجھے بلا لیں۔ میں فوراً چلا آؤں گا۔ دوپہر کے بعد 2 بجے کے قریب ہم لوگ موچی دروازے پہنچ گئے۔ چار بجے تک لوگوں کا انتظار کیا گیا۔ جلسے کی حاضری دو ہزار لوگوں سے زیادہ نہ ہو سکی۔ ان ہزار دو ہزار انسانوں کو کسان کہہ لیں یا سیاسی کارکن کہہ لیں یا لورز کہہ لیں۔ اس کو کسان کمیٹی سمجھ لیا جائے یا عوام لوگ بس اتنے ہی تھے جتنے میں نے عرض کئے ہیں۔ ہم نے شیخ صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ اس احتجاجی ریلی سے مکمل تفصیل کے ساتھ خطاب کریں اور اس کے بعد اس جلسے کو ختم کرنے کا اعلان کر دیں، یہی مناسب رہے گا۔ شیخ صاحب نے ہماری بات کو تسلیم کر لیا۔ اُن کے طویل خطاب کے بعد اس جلسے کو ختم کر دیا گیا۔ شیخ صاحب کسی دوسرے کے ساتھ اپنی ناراضگی کا اظہار نہ کر سکے مگر میرے

ساتھ اُنہوں نے سخت احتجاج کیا کہ تم نے بھٹو کو جلسے میں آنے کیلئے ایک حرف بھی نہ کہا۔ میں نے کہا۔ شیخ صاحب یہ جلسہ چیئرمین کی شان کا جلسہ نہیں تھا۔ آئندہ جب بھی آپ کسان ریلی رکھیں، کسی دیہاتی علاقے میں رکھیں تاکہ کسان باآسانی وہاں چلے آئیں۔

میری رہائی کی خوشی میں استقبالیہ

میری رہائی کی خوشی میں پارٹی کے دوستوں اور دوسری پارٹیوں کے کچھ سیاسی کارکنوں نے جن کے ساتھ میں چائنز لنچ ہوم، پاک ٹی ہاؤس، کافی ہاؤس اور لارڈ ہوٹل میں بیٹھا کرتا تھا، ان تمام دوستوں نے مشترکہ طور پر چائنز لنچ ہوم ہوٹل میں میرے اعزاز میں استقبالیے کا انتظام کیا۔ اس استقبالیے میں میاں محمود علی قصوری، آغا شورش کشمیری کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا۔ باقی شرکاء میں خواجہ رفیق، حبیب جالب، روف طاہر مرحوم، ملک حامد سرفراز، ملک نوید، فاروق بیدار، شیخ سرور اقبال، ملک آفتاب ربانی، شیخ صفدر علی، بابا ظہیر کاشمیری، صفدر میر، میاں سلیم جہانگیر، عاطر ہاشمی، فضل الرحمٰن ٹیپو، چوہدری محمد حسین، سید سجاد حیدر، سلیم شاہد، چاچا شریف، کبریا خان، ماسٹر سردار محمد، پرویز اختر ایڈووکیٹ، احسان وائیں، ملک اسلم حیات، فاروق قریشی، شیخ محمد رشید، راشد بٹ، ادریس کھٹانہ، خالد چوہدری اور جہانگیر بدر شامل تھے۔ اس استقبالیے میں تمام بزرگ دانشوروں اور سیاست دانوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ دوستوں نے میری تعریف کی۔ اس استقبالیے سے پاکستان کی حزب اختلاف کی سیاسی برادری میں مجھے بحیثیت ایک شاعر اور ایک سیاسی کارکن تسلیم کرلیا گیا۔ اُن دنوں اس طرح کی عزت افزائی اور کسی سیاسی کارکن کی پذیرائی ایک بہت بڑا اعزاز خیال کی جاتی تھی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آیا کرتی تھی۔ اس لئے کہ آج کی سیاست نے تو اس کلچر کو ہی ختم کردیا ہے۔ آج کسی سیاسی کارکن کے لئے اعلیٰ وصف کا ہونا ضروری نہیں ہے، اُس کا مخبر ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے یا سازشی ہونا ضروری ہے یا اُس کا دولت مند ہونا ضروری ہے۔

سندھ کنونشن

ایوب خان کی حکومت کے خلاف چیئرمین بھٹو کی جنگ اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ایوب

www.bhutto.org

آمریت کے تمام اتحادی چیئرمین بھٹو کے خلاف اپنی توپوں کے منہ کھولے ہوئے تھے۔

مغربی پاکستان کا گورنر جنرل محمد موسیٰ خان کھل کر چیئرمین بھٹو کی دشمنی میں سامنے آچکا تھا جس کے غصے کا پہلا شکار لاہور بدری کی شکل میں، میں خود ہوا تھا۔ گورنر موسیٰ خان نے چیئرمین بھٹو کا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ بھٹو صاحب کی کردار کشی جاری تھی۔ لاڑکانے میں انتظامیہ اُن کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی۔ سندھ کے لوگوں کو خوف زدہ کیا جارہا تھا کہ وہ پیپلز پارٹی میں شامل نہ ہوں۔ ایوب خان کی حکومت اپنی تمام تر حکومتی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر صرف چیئرمین بھٹو کی مخالفت کو ہی اپنی حکومت کی مرکزی پالیسی بنائے ہوئے تھی اور اپنی اِس قابل مذمت روش میں شرمناک حد تک اخلاق باختہ ہو چکی تھی۔ سندھ میں اُس وقت ہر طرف خوف و دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ بڑا خطرناک سیاسی ماحول تھا۔ اِس ماحول میں اور اِس طرح کی خوف و دہشت کی فضا میں حیدرآباد شہر میں پیپلز پارٹی کی تشکیل کے لئے کنونشن کا انعقاد کیا گیا۔ جس کنونشن میں پنجاب کی طرف سے صرف مجھے ہی شرکت کرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ یہ کنونشن شیر سندھ میر رسول بخش تالپور کے گھر منعقد ہوا تھا۔ واضح رہے کہ جس طرح لاہور کے کنونشن کیلئے کوئی کمرشل جگہ یا کسی ہال میں جگہ نہ مل سکی تھی، اِسی طرح حیدرآباد میں بھی جگہ کے بارے میں وہی مسئلہ درپیش تھا۔ جس مسئلے کو میر رسول بخش تالپور نے اپنا گھر پیش کر کے حل کر دیا تھا۔ اجلاس سے ایک رات پہلے ہم لوگ میر رسول بخش تالپور صاحب کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ بھٹو صاحب بہت متفکر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اجلاس میں تقریر کرنے والے لوگوں کے بارے میں بار بار دریافت کر رہے تھے۔ یہ بھی پوچھتے جاتے تھے کہ فلاں آیا یا نہیں آیا۔ بڑی بے چینی سی دیکھنے میں آرہی تھی۔

رات کافی ہو چکی تھی مگر میں دیکھ رہا تھا کہ بھٹو صاحب بار بار اپنے کمرے سے باہر نکل کر کچھ دور تک ٹہلتے چلے جاتے تھے اور پھر واپس اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ یہ عمل بار بار دیکھنے میں آرہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بھٹو صاحب اپنی صبح کی تقریر کیلئے خود کو تیار کر رہے تھے۔ میں نے بھٹو صاحب کے قریب جا کر کہا۔ سر! صبح کی تقریر کی تیاری ہو رہی ہے۔ کہنے لگے۔ صبح کی تقریر صرف تقریر نہیں ہو گی، صبح میری اور ایوب خان کی تقدیر کا فیصلہ ہو گا۔ بھٹو صاحب کے یہ الفاظ بہت الہامی قسم کے ثابت ہوئے۔ اِس لئے کہ سندھ کنونشن کے بعد ایوب خان کا زوال شروع ہو گیا تھا۔

www.bhutto.org

حیدر آباد کنونشن

21 ستمبر 1968ء کو صبح 10 بجے کے قریب سندھ کنونشن کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا گیا۔ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد مجھے نظم کیلئے کہا گیا۔ میں ابھی اپنی نظم کا آغاز کرنے ہی والا تھا کہ میر رسول بخش تالپور مائیک پر تشریف لے آئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ بابا شاعرِ عوام کا استقبال زبردست طریقے کے ساتھ کرو۔ پورے پنڈال نے تالیوں سے میرا دوبارہ استقبال کیا۔ میں نے پہلی مرتبہ اپنی تازہ ترین نظم حیدرآباد کنونشن میں ''اسلام کسی خطرے میں نہیں'' پڑھی۔ میں نے حاضرین سے کہا کہ حضرات میری نظم کا عنوان ہے ''اسلام کسی خطرے میں نہیں'' میں نے نظم کا پہلا بند ہی پڑھا تھا کہ تمام مجمع پھڑک اُٹھا۔ خاموش اور خوفزدہ ماحول میں گرم جوشی پیدا ہوگئی۔ مجمع میں گرم جوشی پیدا ہونے کی سب سے بڑی وجہ چیئرمین بھٹو کی بے ساختہ داد تھی۔ درباری ملاں کوثر نیازی، مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا مودودیؒ وغیرہ ایک ہی بات کہے جارہے تھے کہ بھٹو کے سوشلزم سے اسلام کو خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ میری نظم کی ابتداء یوں ہوئی تھی۔

جس نام سے قائم ہے دنیا
اس نام کو خطرہ کیا ہوگا
جب تک کہ خدا خطرے میں نہ ہو
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا
اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

یہ بند سنتے ہی بھٹو صاحب نے میز پر زور سے ہاتھ مار کر انگریزی میں کہا ''Here is the point'' یہ ہوئی ناں بات۔ شکریہ شاعر تم نے میرا مسئلہ حل کر دیا۔ بس بھٹو صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ پنڈال میں غوغا برپا ہوگیا۔ پنڈال نعروں سے گونج اُٹھا۔ مجمع میں سے خوف کی فضا چھٹ گئی، بے باکی آگئی۔ اس طرح تمام نظم ہی داد و تعریف کے ہنگامے میں مکمل کی گئی۔

www.bhutto.org

اسلام کسی خطرے میں نہیں

''اسلام کسی خطرے میں نہیں'' اس نظم کو تحریر کرنے سے پہلے اس نظم کو تخلیق کرنے کا پس منظر بتانا یہاں ضروری ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے پہلے دن ہی پاکستان میں تمام سرکاری اور غیر سرکاری ملاؤں نے چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کو کافر قرار دے دیا تھا۔

ان کا فر قرار دینے والوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالستار نیازی، مولانا کوثر نیازی وغیرہ کی آواز سب سے بلند تھی۔ مولانا کوثر نیازی نے چیئرمین بھٹو پر توہینِ رسالت کا الزام لگا دیا تھا۔ مجید نظامی کے فوجی اخبار بلکہ مسلمان اخبار نوائے وقت نے بھٹو کی سیاست اور پیپلز پارٹی کی سیاست سے اسلام کو خطرہ قرار دے دیا تھا۔ گویا چیئرمین بھٹو کی ذات پر یہ ایک طرح کا الٹی میٹ اٹیک تھا۔ انتہائی قسم کا حملہ تھا۔ لہٰذا میں نے آمریت کے اور سرمایہ داری کے ان دلالوں کے اس پروپیگنڈے کے جواب میں یہ نظم کہی تھی جس کا عنوان ہی یہ رکھا تھا کہ ''اسلام کسی خطرے میں نہیں''۔ اب آپ یہ نظم ملاحظہ کریں۔

جس نام سے قائم ہے دنیا　　اس نام کو خطرہ کیا ہوگا
جب تک کہ خدا خطرے میں نہ ہو　　اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

اسلام کوئی جاگیر نہیں　　جس کے چھن جانے کا ڈر ہو
اسلام کوئی مِل ہے جس میں　　مزدور کی حالت ابتر ہو

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

اسلام تو ہے مزدوروں کا　　بے چاروں کا مجبوروں کا
تنگ دستوں کا معذوروں کا　　اسلام نہیں تیموروں کا

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

www.bhutto.org

ہاں خطرہ ہے جاگیروں کو — اسلام کے رہنہ گیروں کو
کچھ مُلّاؤں کو پیروں کو — اور ٹمکسن کے کفگیروں کو

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

خطرے میں ملوں کے مالک ہیں — امریکہ کے لے پالک ہیں
کچھ پنڈت ہیں کچھ سالک ہیں — کچھ ان کے آگے بالک ہیں

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

خطرہ ہے بیس گھرانوں کو — انسان نما شیطانوں کو
غنڈوں کو پالنے خانوں کو — کوٹھی بنگلہ اور لانوں کو

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

اس پاک وطن کے ہر گھر میں — اسلام کی شمع روشن ہے
سب لوگ یہاں پر مسلم ہیں — اسلام ہی سب کا محسن ہے

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

رہتے ہوئے اگر کفار یہاں — پھر تو یہ سوچ بھی سکتے تھے
گدّی سے زباں ہر کافر کی — تکبیر سے نوچ بھی سکتے تھے

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

منہ زورو! پاگل دیوانو! — اسلام کو تم رُسوا نہ کرو
دولت کے لئے، کرسی کے لئے — اسلام کا تم سودا نہ کرو

اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

www.bhutto.org

اسلام کسی خطرے میں نہیں　　خطرے میں لال بجھکو ہیں
کچھ اَن پڑھ جاہل پھکڑ ہیں　　کچھ لیڈر بوڑھے چھکڑ ہیں
اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا
ان بیس لٹیروں کو لوگو　　اسلام سے خطرہ ہے سُن لو
سردار، وڈیروں کو لوگو　　اسلام سے خطرہ ہے سُن لو
اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا
جب تک کہ خدا خطرے میں نہ ہو
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

○

اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم　　اسلام علی حیدر حیدر
اسلام ہمارا قرآں ہے　　اسلام ہے اللہ اکبر
اسلام کسی خطرے میں نہیں
اسلام کو خطرہ کیا ہوگا

○

اس نظم کے بعد میر رسول بخش تالپور نے ایوب خان کی کتاب والی نظم کی فرمائش کی۔ اس نظم کو بھی اجلاس میں پڑھ دیا گیا۔ خوب داد پائی۔ اس طرح میرے بعد مندوبین کی تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سندھ کے تمام مقررین کی تقریروں کا سیاسی معیار بہت بلند تھا۔ مگر لاڑکانے کے عبدالوحید کٹپر اور عبدالرزاق سمر وایڈووکیٹ کی تقریر کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ کنونشن کے پہلے سیشن میں تمام مندوبین کی تقریریں مکمل ہوگئیں۔ اجلاس میں شرکت کرنے والے نمایاں لوگوں میں مسٹر جے۔اے۔رحیم، پیر بخش بھٹو، میر علی احمد تالپور، حق نواز گنڈا پور، ممتاز علی بھٹو، عاشق علی بھٹو، عبدالوحید کٹپر، چاکر علی جونیجو، رفع منیر، قاسم پٹیل، عبدالستار گبول، سید قائم علی شاہ، معراج محمد خان اور پیر مظہر الحق تھے۔

www.bhutto.org

اجلاس کے دوسرے حصے میں پارٹی کے منشور کو پیش کیا گیا اور اُس کو تمام مندوبین کی تائید اور مشترکہ حمایت کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ اس کے بعد پارٹی کے سیکریٹری جنرل مسٹر جے۔اے۔رحیم کی تقریر ہوئی۔ جے۔اے۔رحیم ایک بیوروکریٹ دانشور تھا۔ مقرر اچھا نہیں تھا۔ اُس کی روانی نہ تھی کچھ لکنت سی ہوتی تھی۔ دوسرے خرابی یہ تھی کہ وہ اُردو بولنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اُس نے انگریزی میں تقریر کی بہت کم لوگوں کی سمجھ میں اُن کی باتیں آئیں۔ اُن کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی سندھ کے نامزد کردہ اور اجلاس میں متفقہ رائے سے منتخب شدہ کنوینئیر میر رسول بخش تالپور نے اجلاس سے خطاب کیا۔ واضح رہے کہ سندھ کنونشن میں سوائے معراج محمد خان کے باقی تمام مقررین نے سندھی زبان میں تقریریں کیں۔ میر رسول بخش تالپور نے بھی سندھی میں تقریر کی مگر وہ تقریر اُردو اور سندھی میں ملی جلی تقریر تھی۔ میر رسول بخش تالپور کی بڑی باغی تقریر تھی۔ اُنہوں نے اپنی تقریر میں جنرل محمد ایوب خان کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کا قاتل قرار دیا تھا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان پر پہلی مرتبہ جلسہ عام میں مادرِ ملت کے قتل کا الزام لگایا گیا تھا۔ میر رسول بخش تالپور کا ایوب خان کی ذات پر یہ حملہ اُن کی جرات کی بہت بڑی دلیل تھا۔ اُس وقت سندھ کے باقی تمام لوگ بہت بچ بچ کر تقریریں کر رہے تھے یہاں تک کہ محترم ممتاز علی بھٹو صاحب بھی اس کنونشن میں منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ میری سوچ کے مطابق بھٹو صاحب نہیں چاہتے تھے کہ ایوب حکومت ایک ہی وقت میں ان کے پورے خاندان کو ایک ساتھ گرفتار کر لے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ممتاز علی بھٹو کو بچا بچا کر رکھا کرتے تھے۔ تمام سندھ فیلڈ مارشل ایوب خان سے ڈرتا تھا مگر میر رسول بخش تالپور کا واحد خاندان تھا جو کھل کر چیئرمین بھٹو کے ساتھ پیپلز پارٹی میں آیا تھا۔ سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کی تمام تنظیم سازی کا کام میر رسول بخش تالپور نے ہی کیا تھا۔ سندھ میں میر رسول بخش تالپور کا خاندان ایک عرصے سے پاکستان کی حزبِ اختلاف کی سیاست کر رہا تھا۔ ایوب خان کے تمام عہدِ حکومت میں تالپور خاندان نے سندھ میں ایوب خان کے خلاف اپنی جمہوری سیاست کو قائم رکھا تھا۔ سندھ میں مادرِ ملت کے انتخابات کی تمام تر ذمہ داری میر رسول بخش تالپور اور اُن کے بڑے بھائی میر علی احمد تالپور کے سر ہی تھی۔ یہاں تک کہ مادرِ ملت کا ذاتی خدمت گار نورا جو بعد میں بھٹو صاحب کی خدمت پر مامور ہوا تھا۔ مادرِ ملت کو بھٹو صاحب کی طرح اِن میروں کا ہی دیا ہوا تھا۔ مادرِ ملت اِن دونوں بھائیوں کا بہت احترام کیا کرتی تھی۔ یہ دونوں بھائی ایک منجھے ہوئے سیاست دان اور بہت خوش اخلاق اور اعلیٰ

www.bhutto.org

حیثیت کے مالک تھے۔ شعر و ادب میں سخن وری کی حد تک سخن فہم تھے۔ ہر شاعر کا اچھا شعر ان دونوں بھائیوں کو ضرور یاد رہتا تھا۔

دونوں بھائی بہت سادہ اور با اخلاق انسان تھے اور دونوں کی طبیعت میں خاکساری تھی بلکہ ان میں سے میر علی احمد تالپور تو باقاعدہ خاکسار تھے اور علامہ مشرقی کے پیروکار تھے۔ یہ دونوں بھائی پرانی وضع کے سیاست دان تھے جن کو دیش بھگت کہا جا سکتا تھا۔ میر رسول بخش تالپور کی تقریر کے بعد میر احمد علی تالپور نے تقریر کی۔ اُن کی تقریر بھی اُن کی جرات اور ہمت کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق اُس وقت چیئرمین بھٹو کو ان دونوں بھائیوں کی تقریروں سے بڑا حوصلہ ملا تھا۔ میری اِس بات کا ثبوت سندھ کنونشن میں خود بھٹو صاحب کی تقریر تھی۔ اِس کنونشن سے پہلے بھٹو صاحب نے ایوب خان کی ذات پر اِس طرح براہ راست کبھی حملے نہیں کئے تھے اور نہ ہی ایوب حکومت کو اس طرح چیلنج کیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی سندھ کنونشن کی تقریر ہی ایوب حکومت کے خلاف چلائی ہوئی تحریک کے لئے بارود ثابت ہوئی تھی۔

چیئرمین بھٹو کی تقریر

چیئرمین بھٹو نے اپنی تقریر کا آغاز ہی کچھ اِس طرح کیا۔

میرے بھائیو! میں پاکستان کے دشمنوں کے سامنے مزاحمت کرنا چاہتا تھا۔ میں اُن کے سامنے کھڑا ہونا چاہتا تھا لیکن میرے مخالفین نے یعنی ایوب خان نے اور اُس کے حواریوں نے میرے تمام محب وطنی کے جذبے کو جذباتیت کے ساتھ منسوب کر دیا۔ تاشقند کے بعد میں جس شہر میں بھی لوگوں کے پاس گیا، الفاظ کی جگہ میری آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے۔ میں لوگوں کو بتا نہیں سکتا تھا کہ پاکستان کے ساتھ کیا تباہی کی گئی ہے۔ میں بہت ساری مصلحتوں کے تحت اِن بربادیوں کو اپنی زبان پر نہ لاتا تھا لیکن میری دور اندیشی کو میری بزدلی کہا گیا۔

میں نہ تو بزدل تھا نہ جذباتی تھا۔ میں تو صرف اِس وجہ سے خاموش تھا کہ پاکستان کے دشمن موقع کی تلاش میں تھے۔ پاکستان کی حالت بہت نازک تھی۔ مجھے علم تھا کہ میرے منہ سے نکلا ہوا ایک جملہ پاکستان کے اندر خانہ جنگی پیدا کر سکتا تھا۔ مگر اب اِس بات کا خطرہ ٹل چکا ہے۔ اب میں مزید خاموش نہیں رہوں گا۔ مجھے دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں نے اپنے اقتدار سے کبھی کوئی

www.bhutto.org

فائدہ نہیں اُٹھایا تھا۔ یہ میرا ہی خاندان تھا جس نے ایوب خان کی حکومت کے لینڈ رفارمز کے قانون کے تحت ہزاروں ایکڑ اراضی کسانوں میں تقسیم کرنے کیلئے حکومت کے سپرد کر دی تھی۔ چیئرمین بھٹو نے ایوب خان کو اور اُس کے تمام وزیروں کو کنونشن میں چیلنج کیا کہ آؤ ہم تمام اپنے اپنے اثاثوں کو لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ بھٹو صاحب نے ایوب خان کو چیلنج کیا کہ مسٹر صدر پاکستان! تم بھی اپنی جائیداد کا اعلان کرو۔ تم اعلان کرو کہ جس روز تم صدر پاکستان بنے تھے، اُس وقت تمہاری کیا جائیداد تھی، تمہارے کتنے کارخانے تھے۔ تمہارے بیٹوں کی اور تمہارے دامادوں کی کتنی فیکٹریاں تھیں اور میں بھی اعلان کرتا ہوں کہ تمہاری کیبنٹ میں وزیر بننے سے پہلے میری کیا جائیداد تھی اور آج میری کیا جائیداد ہے۔ میں بھی چاہتا تو ایوب خان کی طرح دولت کما سکتا تھا۔ ایوب خان تم کو یاد ہے کہ ایک بڑی طاقت کے ملک کے ایک نمائندے نے میرا بازو پکڑ کر مجھے کہا تھا کہ مسٹر بھٹو! تم جو چاہو، تم کو مل سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ تم ہمارے ساتھ کچھ سمجھوتہ بازی کرو۔ میں نے جھٹکے کے ساتھ اپنا بازو چھڑا کر اُس کو کہا تھا کہ مسٹر امریکن! اگر تم نے پاکستان کے چند لوگوں کو خرید لیا ہے تو یہ مت سمجھو کہ پاکستان کا ہر شہری میر جعفر اور میر صادق ہے۔ اِن میں ذوالفقار علی بھٹو بھی ہیں۔ آئندہ پھر کبھی ایسی حرکت مت کرنا۔ جب صدر پاکستان تم کو اِس بات کی خبر ہوئی تھی تو تم نے میری تعریفوں کے پل باندھ دیئے تھے۔ آج مجھ پر ٹریکٹروں کا جھوٹا مقدمہ بنا کر مجھ کو اس بات کا انعام دیا جا رہا ہے۔ بھٹو اس لئے برا ہے کہ وہ ہندوستان کی بالادستی تسلیم نہیں کرتا وہ اسرائیل کی بالادستی تسلیم نہیں کرتا۔ بھٹو صرف اپنے خدا سے ڈرتا ہے بھٹو اپنے عوام کی بالادستی تسلیم کرتا ہے۔

بھٹو صاحب نے ایوب خان کو للکار کر کہا۔ ایوب خان! میں تمہاری توپوں بندوقوں سے نہیں ڈرتا۔ میرے ساتھ پاکستان کے لوگوں کی طاقت ہے جو ایٹم بم سے بڑی قوت ہے۔ اب میری اور تمہاری کھلی جنگ ہوگی۔ میں نے پاکستان کے عوام کے لئے جمہوریت، سوشلزم کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ میں اپنی کشتیاں جلا کر نکلا ہوں۔ بھٹو صاحب نے جوش میں آکر اپنا کوٹ اُتار دیا۔ اپنی آستینیں چڑھا کر حکومت کو مکا دکھاتے ہوئے کہا۔ آؤ مجھے گرفتار کرو۔ آؤ مجھے جیل میں ڈالو۔ ایوب خان کو مخاطب کر کے کہا تم نے بنگال کے سیاست دانوں کو سیاست سے باہر کیا۔ تم نے سرحد کے بلوچستان کے سیاست دانوں کو سیاست سے باہر کر دیا۔ تم نے سندھ کے کھوڑو کو قاضی عیسیٰ کو سیاست سے باہر کیا۔ تم نے سہروردی کو ولی خان کو دولتانہ کو سیاست سے باہر

www.bhutto.org

کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو تمہیں حکومت سے باہر کرے گا۔

تم سمجھتے تھے کہ پاکستان کے عوام کو میدان میں لانے والا کوئی نہیں ہے۔ میں آ گیا ہوں پاکستان کے عوام کی قیادت کیلئے۔ یہ حکومت چند خاندانوں کے ساتھ مل کر پوری قوم کا خون چوس چکی ہے۔ چند خاندان قوم کی دولت لوٹ چکے ہیں۔ پیپلز پارٹی اِس خونی نظام کو تبدیل کرنے کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ میری پارٹی کا پروگرام جاگیرداری نظام کو مٹانا ہے۔ غریبوں کا تحفظ کرنا ہے۔ تمام بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینا ہے۔ تمام ٹرانسپورٹ کو قومی تحویل میں لینا ہے اور تعلیم کے نظام کو قومی تحویل میں لینا ہے۔ چیئرمین بھٹو کی بہت طویل تقریر تھی۔ تقریباً تین گھنٹے تک وہ اجلاس سے خطاب کرتے رہے۔ یہ تقریر اُن کی فیصلہ کن تقریر تھی۔ اِس تقریر کے آخر میں اُنہوں نے کہا کہ میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں پاکستان کے ہر شہر میں جاؤں گا۔ میں ہر صوبے میں تمہارا پیچھا کروں گا۔ اُنہوں نے اجلاس میں موجود لوگوں سے کہا کہ عوام کی آزادی کی جنگ میں آپ میرا ساتھ دیں گے۔ میرے ساتھ جیل جائیں گے۔ تمام لوگوں نے اپنی نشستوں پر کھڑے ہو کر کہا کہ ہم ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیں گے۔ اِس کنونشن کے آخر میں بھٹو صاحب نے ایوب خان سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں بہت جلد صوبہ سرحد میں آ رہا ہوں۔ میں تمہارے علاقے میں آ رہا ہوں۔ اِن الفاظ پر بھٹو صاحب کی تقریر اپنے اختتام کو پہنچ گئی۔

پاکستان کی سیاست میں اُن دنوں معاملہ کچھ یوں تھا کہ پرانے سیاست دان بوڑھے ہو چکے تھے۔ دوسرے اِن کا مزاج سیاست کے مطابق نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کے سیاست دان فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ پاکستان کی سیاست کی بجائے بنگالی سیاست کریں گے۔ اُن کو ایسا کرنے پر مغربی پاکستان کے فوجی حکمران نے مجبور کر دیا تھا۔ مغربی پاکستان میں صرف ذوالفقار علی بھٹو ایک ایسا تازہ دم لیڈر اُٹھا تھا جس نے ایوب حکومت کے دانت کھٹے کئے تھے۔ جیسا کہ میں نے بھٹو صاحب کی سیاسی حکمت عملی کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ ایوب حکومت کو ایک دن کے لئے بھی آرام کا سانس لینے نہیں دیتے تھے۔ وہ ایک شہر سے فارغ ہوتے تو دوسرے شہر جا نکلتے تھے۔ اِس قدر متحرک انسان آج تک میں نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔ حیدر آباد کنونشن فتح ہونے کے بعد بھٹو صاحب لاڑکانہ جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اُنہوں نے بڑی محبت کے ساتھ مجھے کہا۔ اسلم! چلو تمہیں لاڑکانہ دکھائیں۔ ایک آدھ دن وہاں آرام کرنا، پھر لاہور جانا۔ ہم رات کو لاڑکانہ پہنچ گئے۔ میرا یہ لاڑکانہ جانے کا پہلا موقع

www.bhutto.org

تھا۔ لاڑکانہ میں ہماری بڑی مہمان نوازی کی گئی۔ لاڑکانے میں بھی صبح وہی سلسلہ شروع ہوگیا جو ہر جگہ ہوجایا کرتا تھا۔ دن کو گیارہ بجے لاڑکانہ کے طالب علموں کا جلسہ المرتضیٰ شروع ہوگیا۔

بھٹو صاحب کا لاڑکانہ

بھٹو صاحب طالب علموں کو سیاست میں بڑی اہمیت دیا کرتے تھے۔ وہ طالب علموں کو اپنی اصل قوت خیال کرتے تھے۔ اُن کے اجلاس میں مجھ سے تقریباً چار پانچ مرتبہ نظمیں پڑھوائی گئیں۔ اِس اجلاس کے بعد لاڑکانہ کے شہریوں کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ رات کو بھٹو صاحب نے لاڑکانہ کے معززین کو المرتضےٰ میں کھانا دیا۔ اِس کھانے کے اکٹھ میں مجھے نظم سنانے کو کہا گیا۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب ہم فارغ ہوئے۔ میں المرتضیٰ میں لیٹا ہوا تھا کہ بھٹو صاحب شلوار قمیص پہنے پاؤں میں باٹا کے سلیپر پہنے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اُس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے۔ المرتضیٰ کی یہ اینکسی المرتضیٰ میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب آخر میں تھی جو بھٹو صاحب کی رہائش گاہ سے فاصلے پر تھی۔ بھٹو صاحب پوچھتے رہے کچھ تکلیف وغیرہ تو نہیں ہے۔ بھٹو صاحب نے مجھے کہا کہ وہ صبح سویرے کراچی چلے جائیں گے اور اُن کا ملازم بابو مجھے لاہور والی ٹرین پر بٹھا دے گا۔ میں نے اُن کو بتایا کہ روہڑی میرے بہنوئی اور بڑے بھائی رہتے ہیں۔ میں ایک دن اُن کے پاس ٹھہر کر لاہور جاؤں گا۔ اِن باتوں کے بعد بھٹو صاحب نے ایک لفافہ مجھے دیا۔ یہ رکھ لو اسلم! سفر میں یہ تمہارے کام آئے گا۔

بھٹو صاحب نے کہا آؤ باہر کچھ ٹہلتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے المرتضیٰ کے لان میں ٹہلنا شروع کردیا۔ بھٹو صاحب نے پوچھا۔ تم شاعری کیسے کرتے ہو؟ اِس طرح بھٹو صاحب نے ایک طرح سے میرا امتحان کرنا شروع کردیا۔ فرمانے لگے۔ شاعری کیسے ہوتی ہے؟ انگریزی میں کہنے لگے ہاؤ۔ اٹ۔ از۔ کم۔ آؤٹ۔ میں نے اُن کو کہا کہ شاعری دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک شاعری آمد کی ہوتی ہے جس کو انگریزی میں ORAcle کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ کچھ وحی سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ دوسرا سلسلہ آورد کا ہوتا ہے۔ آورد میں شاعر اپنی ضرورت یا وقت اور حالات کے مطابق شاعری کرتا ہے۔ فرمانے لگے۔ اِن دونوں طریقوں کی شاعری میں سے بہتر شاعری کونسی ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ پہلی والی، آمد والی۔ کہنے لگے کہ تم کونسی شاعری کرتے ہو۔ میں نے کہا کہ اِن

دنوں آورد کی شاعری کرتا ہوں۔Subjectivity کی شاعری کرتا ہوں۔ مجھے سیاسی شاعری کرنی پڑتی ہے۔لوگوں کے حالات کی شاعری کرنی پڑتی ہے۔آپ کی جدوجہد کی بات کرنی ہوتی ہے۔آمد کی شاعری تو تمام شاعر کررہے ہیں۔قوم کے حالات کی شاعری بہت کم شاعر کرتے ہیں۔میں نے اپنی آورد کی شاعری پر آمد کی شاعری کو قربان کررکھا ہے۔وہ میرے جواب سے مطمئن ہوگئے۔کہنے لگے۔خوب،تم نے خوب بات کی ہے۔اِس قوم کوانقلابی شاعری کی بہت ضرورت ہے۔اِن باتوں کے بعد بھٹوصاحب نے میرا امتحان لیناختم نہ کیا۔فرمانے لگے کہ فریز کیا شے ہے۔میں نے کہامصرع کوفریز کہتے ہیں۔دولائنیں ہوں تو شعربن جاتا ہے۔ایک لائن ہوتو مصرع کہا جاتا ہے۔میں نے اُن کومثال دے کر سمجھانے کیلئے کہا کہ وہ ہمارے سامنے کیا ہے۔میں نے المرتضیٰ کے گیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔فرمانے لگے کہ المرتضیٰ کا گیٹ ہے۔میں نے کہا۔دروازہ ہے۔اب جب ہم اِس کوشاعری کی فریز بنائیں گے تو یوں کہیں گے''سامنے مرتضیٰ کا دروازہ''یایوں کہیں گے تو تب بھی فریز بن جائے گی۔وہ رہا مرتضیٰ کا دروازہ۔بھٹوصاحب نے دو تین بار اِس مصرعے کوخوددہرایا۔وہ رہا مرتضیٰ کا دروازہ۔آخر میں کہنے لگے۔لیس۔اٹ۔از۔ان۔ویٹ۔اب اس میں جنبش نہیں ہے۔جنبش سے اُن کی مرادوزن تھا کہ یہ وزن میں ہے۔مجھے علم نہیں کہ یہ تمام باتیں اُنہوں نے اپنی معلومات کے لئے کیں یا میرا امتحان لیا تھا۔مجھ کو یوں لگا کہ جس طرح وہ میرا امتحان لے رہے ہوں۔

ان باتوں کے بعد اُنہوں نے بڑی محبت سے میرے ساتھ ہاتھ ملایا اور وہ المرتضیٰ کے برآمدے کی طرف چلے گئے۔صبح میرے اُٹھنے سے پہلے ہی وہ جاچکے تھے۔میں ایک دن رو بڑی رہ کرلاہورواپس آگیا۔

محترم حنیف رامے اور ہفت روزہ نصرت کی اشاعت

لاہور میں پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاست میں کئی اضافے ہو چکے تھے۔پیپلز پارٹی کی سیاست میں سب سے اہم اضافہ محترم حنیف رامے صاحب کا پارٹی کی سیاست میں کھل کر سامنے آنے کا تھا۔وہ ہفت روزہ نصرت کواپنے ساتھ لے کر منظر عام پر آئے تھے۔اُس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کوکسی رسالے یا مجلے کی سخت ضرورت تھی۔دنیا کی کوئی بھی سیاسی جماعت یا سیاسی تحریک

www.bhutto.org

یا قیادت بغیر کسی نشر و اشاعت کے ادارے کے ہرگز مکمل نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لئے کسی اخبار، کسی رسالے کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ ہفت روزہ نصرت اِس فکری اور نظریاتی ضرورت کی ایک ابتدا تھی۔ میرے خیال میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نشر و اشاعت کے معاملے میں اور اِس کے نظریات کی تکمیل و تشکیل میں حنیف رامے صاحب کا کردار بہت تعریف کا حامل تھا۔ رامے صاحب نے پارٹی کی نظریاتی ساکھ کو نمایاں کرنے کے لئے پہلے تو ابتدا ہفت روزہ نصرت سے کی تھی اور بہت جلد اُنہوں نے پارٹی کی اِس ضرورت کو روزنامہ مساوات نکال کر مکمل کر دیا تھا۔ مساوات کی اشاعت سے پاکستان کے عوام کو پاکستان کی سیاست میں پہلی مرتبہ ایک ایسی فعال قیادت اور فعال پارٹی ملی تھی جس کے خیال و فکر کو لوگ ہر روز باقاعدہ خبروں اور مضمونوں کی شکل میں پڑھنے لگے تھے۔ پیپلز پارٹی کا یہ طریقہ کار مکمل طور پر ایک سوشلسٹ اور کیمونسٹ پارٹی کی طرح کا تھا جس میں پارٹی کے خیالات و فکر اور فلسفے کی کھلی بحث کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ قیادت کا ہر عمل زیرِ بحث رہتا ہے۔ پارٹی ہر لمحہ زندہ دکھائی دیتی ہے۔ پارٹی کا عمل ٹھہرا ہوا اور رکتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ سیاسی پارٹی کا یہ جدلیاتی عمل ہی پارٹی کی اصل روح ہوتا ہے۔ جب یہ عمل روک دیا جائے یا ختم ہو جائے تو پارٹی جامد و ساکت ہو کر رہ جایا کرتی ہے۔ جس طرح آج کل پارٹی جامد و ساکت ہو چکی ہے۔

روزنامہ مساوات کی اشاعت کا بعد میں ذکر ہوگا۔ ابھی سر دست تو ہم کو ہفت روزہ نصرت کی بات کرنی ہے۔ رامے صاحب ایک شام پاک ٹی ہاؤس میں تشریف لائے۔ اُنہوں نے وہاں بیٹھے پیپلز پارٹی کو پسند کرنے والے شاعروں، ادیبوں کو اِس بات کی دعوت دی کہ وہ اپنا ترقی پسندانہ کلام نصرت کو دیا کریں۔ اُن کے خیالات نصرت میں شائع کئے جائیں گے۔ اُنہوں نے مجھے خاص طور پر نصرت کے دفتر جو لاہوری دروازے کی کونے کی بڑی سی مسجد کے نیچے دائیں جانب واقع تھا، آنے کا کہا۔ میں دوسرے دن وہاں پہنچ گیا۔ رامے صاحب نے مجھے بہت تپاک کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ اب ہم اصل منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ اِس سے پہلے تک ہم منزل کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ مجھے اُن کے الفاظ یاد ہیں۔ کہنے لگے۔ ایک بار گھمسان کا رَن ضرور پڑے گا۔ مگر میدان ہمارے ہاتھ ہی رہے گا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اُن کو اپنی پہلی نظم ''اسلام کسی خطرے میں نہیں'' شائع کرنے کے لئے دی۔ اِس کے بعد تو ہر ہفتہ میں نئی نظم کہتا تھا اور نصرت شائع کرتا تھا۔ اِس طریقے کے ساتھ میرا اور حنیف رامے کا ایک مستقل ساتھ بن گیا اور

رفتہ رفتہ اُن کے ساتھ ایک نظریاتی وابستگی پیدا ہوگئی۔ نصرت میں پہلی مرتبہ اُنہوں نے میری تصویر شائع کی اور پہلی مرتبہ میرے نام کے ساتھ شاعرِ عوام کا خطاب تحریر کیا تھا۔ اِس اضافے کے علاوہ جو سب سے بڑا اضافہ ہوا، وہ پارٹی دفتر کے قیام کا اضافہ تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کے دفتر کا قیام

بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید صاحب کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا کہ اُنہوں نے انتہائی سیاسی مخدوش حالات میں لاہور میں پارٹی کا دفتر قائم کر دیا۔ یہ دفتر کہنے کو تو پنجاب بہاولپور پیپلز پارٹی کا دفتر تھا مگر اصل میں یہ دفتر پوری پاکستان پیپلز پارٹی کا دفتر تھا۔ اِس دفتر سے پہلے کسی دوسرے صوبے میں پارٹی کا کوئی دفتر قائم نہیں کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب کی جس بلڈنگ میں وکالت کا دفتر تھا، یہ بلڈنگ ابھی نئی تعمیر کی گئی تھی۔ اِس کے پہلے کرایہ دار ہی شیخ صاحب اور میاں عبدالستار نجم تھے۔ یہ بلڈنگ پیپلز پارٹی کے ہمدردوں کی بلڈنگ تھی۔

پارٹی کا ایک کارکن ہی اِس بلڈنگ کا مالک تھا۔ وگرنہ اُن دنوں کوئی عام انسان پیپلز پارٹی کو دفتر کے لئے اپنی بلڈنگ دینے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ اِس بلڈنگ کے نیچے کے حصے میں شیخ صاحب کی وکالت کا دفتر تھا۔ درمیان کے تمام حصے میں پارٹی کا دفتر قائم کیا گیا تھا اور اوپر کی منزل میاں نجم کی رہائش کے لئے وقف تھی۔ میاں نجم شادی شدہ تھا اور اوپر بیوی بچوں کے ساتھ رہائش رکھتا تھا۔ اِس طرح تمام بلڈنگ ہی پیپلز پارٹی کے قبضے میں آگئی تھی۔ کسی بھی سیاسی جماعت کے لئے ایک دفتر کا ہونا بہت ضروری تھا۔ اِس دفتر نے پارٹی کی وہ ضرورت بھی پوری کر دی تھی۔

اِس طرح 4/A مزنگ روڈ پر پارٹی کا دفتر قائم ہوگیا اور یہ دفتر پاکستان بھر کے پارٹی لیڈروں اور کارکنوں کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ رابطے کا ذریعہ بن گیا اور خاص طور پر لاہور اور پنجاب کے پارٹی کارکنوں کیلئے تو یہ دفتر ایک قسم کی جائے پناہ بن گیا۔ یہ دفتر کم تھا، سیاسی کارکنوں کا آشیانہ زیادہ تھا۔ اِس دفتر کے ایک چھوٹے سے کمرہ نما کونے میں، میں نے اپنی بود و باش کر رکھی تھی۔ پنجاب پارٹی کا یہ صرف دفتر ہی نہیں تھا بلکہ ایک سیاسی درس گاہ تھی۔ یہ ایک نظریاتی مدرسہ تھا جس کا سب سے بڑا معلم بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید تھے مگر بقول میر تقی میر۔

چمن میں ہم بھی زنجیری رہے ہیں
سنا ہوگا کبھی شیون ہمارا

اس دفتر کی آبیاری میں میرا اور طالب علم لیڈر امان اللہ خان کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ہم لوگ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی تعلیم و تربیت کیلئے ایک رول ماڈل کا کام کرتے تھے اور عملی طور پر اُن کی نظریاتی تعلیم کرتے تھے۔ گویا ہم پیپلز پارٹی کے عشرہ مبشرہ میں سے تھے۔

لاہور میں پیپلز پارٹی کا دفتر قائم ہو جانے سے پارٹی کا وجود مکمل ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے پنجاب بھر کے لوگوں کے لئے پارٹی کے ساتھ رابطہ قائم کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ یہ وقت پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیم سازی کا اصل وقت تھا۔ پنجاب اور لاہور میں پارٹی کی تنظیم سازی کے کام میں شیخ محمد رشید کی محنت کو بڑا دخل تھا۔ مگر شیخ رشید صاحب کچھ زیادہ بادسائل انسان نہیں تھے۔ اُن کی تمام گزر بسر اُن کی وکالت کے سر تھی۔ اب سیاسی کام زیادہ ہو جانے کی وجہ سے اُن کی وکالت میں بھی کچھ کمی آتی جا رہی تھی۔ تنظیم سازی کے لئے متحرک ہونا بہت ضروری تھا۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ضروری تھا۔ شیخ محمد رشید صاحب کے پاس اپنی گاڑی تک نہ تھی۔ ہر چند وہ ایک سخت جان انسان تھے۔ بسوں اور تانگوں میں سفر کیا کرتے تھے مگر پنجاب بہت بڑا صوبہ تھا۔ اِن حالات میں اُن کا پنجاب بھر میں جانا اور دیہاتوں میں جانا ناممکن تھا۔ جس کی وجہ سے پارٹی کی تنظیم سازی کا کام مکمل نہیں ہو سکا تھا۔ زیادہ تر لوگ خود ہی پارٹی کے دفتر آ جاتے تھے۔ وہ خود ہی اپنے شہروں کا اور اپنا تعارف شیخ صاحب کے ساتھ کراتے تھے۔ اِس طرح پنجاب کے دفتر میں ہی اُن کی عہدہ داری کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ اِس طریقے کے ساتھ ہر عہدہ دار خود ہی اپنے شہر واپس جا کر پارٹی کی تنظیم سازی اپنی مرضی اور اپنی پسند سے کیا کرتا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی چونکہ وجود میں آنے کے بعد ہی ابتلا کا شکار ہو گئی تھی۔ پارٹی کے چیئرمین تو پارٹی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی حکومتی جبر کا شکار تھے۔ جس کی وجہ سے پارٹی کی تنظیم سازی کا کام روزِ اوّل سے ہی ہنگامی طریقے سے کیا گیا تھا۔ پہلے تو پارٹی کو معمول کے حالات ہی میسر نہ آتے تھے اور جب ایوب خان کے حکومت سے باہر ہونے کے بعد جنرل محمد یحییٰ خان اقتدار میں آیا تو پارٹی کے لئے پہلے سے بھی زیادہ حالات مخدوش بنا دیئے گئے۔ اِن خراب انتقامی حالات میں جب ملک میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا گیا تو پارٹی کے قائدین کی تمام توجہ انتخابات کی طرف تبدیل ہو گئی اور پارٹی کی تنظیم سازی کی نوعیت ہی

www.bhutto.org

بدل گئی تھی۔ مگر یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ ابھی تو ہم کو بھٹو صاحب کی ایوب حکومت کے خلاف اُن کی طوفان خیز تحریک کی جدوجہد کی بات کرنا ہے۔ چیئرمین بھٹو نے 1968ء کا پورا سال ایک مسلسل تحریک کی شکل میں گذارا تھا۔ وہ ایوب خان کو اور اُس کی حکومت کو سانس نہیں لینے دیتے تھے۔ وہ آج اگر حیدرآباد سندھ میں گرجتے تھے تو کل صوبہ سرحد جا کر حکومت کو للکارتے تھے۔

وہ بلا کے نڈر اور بے خوف انسان تھے۔ پاکستان کا کوئی دوسرا سیاست دان اُن کی رفتار کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ ابھی لاڑکانے سے آئے ہوئے مجھے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر مبشر حسن نے مجھے چیئرمین بھٹو کا پیغام دیا کہ تمہیں پشاور پہنچنے کا کہا ہے۔

سرحد کا دوسرا دورہ

اب ڈاکٹر مبشر حسن صاحب پنجاب میں حنیف رامے صاحب کی طرح منظر عام پر کھل کر آ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے کہنے پر میں بذریعہ بس سروس پشاور پہنچ گیا اور پشاور سے حیات محمد خان شیرپاؤ کے گھر پہنچ گیا۔ حیات محمد خان شیرپاؤ کے ساتھ چونکہ پچھلے دورے میں نثار احمد بچی کی وجہ سے کچھ غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی۔ جس غلط فہمی کو میں نے اپنی نظر بندی کے دوران گاؤں سے خط تحریر کر کے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے موقع ملتے ہی اُن کا دل صاف کرنے کی کوشش کی مگر نثار اور اُن کے درمیان معاملات کچھ اور بھی زیادہ سنگین ہو چکے تھے۔ وہ مجھے زیادہ مطمئن دکھائی نہ دیئے۔ میرے پہنچنے کے دوسرے دن شیرپاؤ ہاؤس میں جلسہ عام تھا جو بڑا کامیاب جلسہ تھا۔ میری نظم کے بعد بھٹو صاحب کی تقریر ہوئی۔ وہ تقریر کیا تھی، اعلانِ بغاوت تھا۔ ایوب خان کی حکومت اُن دنوں اپنا 10 سالہ جشن خوشحالی منا رہی تھی جو پاکستان کے عوام کے ساتھ ایک بہت بڑے مذاق کے مترادف بات تھی۔ اِس پہلے حصے میں، میں نے اپنی نظم ''جشنِ خوشحالی'' پڑھی جس کے اشعار تھے۔

شاخیں پھول نگل جاتی ہیں یہ کیسی خوشحالی ہے
مالی سارا پھل کھا جائے یہ کیسی رکھوالی ہے

اِس طرح چیئرمین بھٹو نے ایوب خان کی خوشحالی کے جشن کا خوب پردہ فاش کیا تھا۔

دوسرے دن 29 اکتوبر کو بھٹو صاحب نے ایبٹ آباد میں جلسہ عام سے خطاب کیا۔ بھٹو صاحب نے عجیب قسم کی پیش گوئی کی کہ دوستو! آپ دیکھیں گے کہ کچھ دن کے بعد ایوب خان

اقتدار سے علیحدہ ہو جائے گا مگر اس سے پہلے مجھے گرفتار کیا جائے گا۔ ایوب خان کا جانا میری گرفتاری کے ساتھ منسلک ہو چکا ہے۔ مجھے جیل جانا ہے اور ایوب خان کو گھر جانا ہے۔

مجھے یہ سودا قبول ہے۔ بھٹو صاحب کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ ایوب حکومت اب مزید دیر نہیں کرے گی اور وہ اُن کو گرفتار کر لے گی۔ وہ ایوب خان کو اُس کے اپنے صوبے میں کھڑے ہو کر ڈرا رہے تھے۔ اُنہوں نے لوگوں سے کہا کہ جیل میں چلا جاؤں گا مگر جیل سے آپ مجھے نکالیں گے۔ لوگوں نے شور کرنا شروع کر دیا کہ ہم جیل توڑ ڈالیں گے۔ ایوب خان کا گھر جلا ڈالیں گے۔ اس طریقے کے خطاب سے چیئرمین بھٹو نے صوبہ سرحد کی یخ بستہ فضا میں شعلوں کی سی گرمی پیدا کر دی تھی۔ لوگوں میں انتہائی اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ اس طرح ایبٹ آباد کے جلسے کے بعد ہم واپس حیات محمد خان شیر پاؤ کے گھر آ گئے۔ دو دن بعد پشاور شہر میں جلسہ عام ہونا تھا۔ یہاں آپ ملاحظہ کریں کہ کس قدر ٹائٹ شیڈول تھا جلسوں کا۔ بھٹو صاحب ایک شہر سے نکلتے تو دوسرے شہر پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ سیاسی جدوجہد کا یہ عمل اُن کے بعد میں نے اتنا مستعد کبھی نہیں دیکھا۔ وہ جب سیاسی جلسوں کے لئے کسی بھی صوبے کے دورے پر نکلتے تھے تو اُن کا انداز چنگیز خان کے حملے کی طرح کا ہوتا تھا۔ چیئرمین بھٹو اپنا جلسہ اپنے ساتھ لے کر چلتے تھے۔ وہ ایک ہی شہر میں ایک ہی دن میں متعدد اجلاسوں سے خطاب کیا کرتے تھے۔ دوپہر کے بعد جلسہ عام میں آ جاتے تھے۔

اس طریقے کے ساتھ وہ اپنی مصروفیت کی بنا پر پورا شہر کھنگال ڈالتے تھے۔ پورے شہر کا کاروبار، اُن کی مصروفیات کی وجہ سے معطل ہو جایا کرتا تھا۔ سارے شہر میں بھٹو بھٹو ہی ہوا کرتی تھی اور کچھ نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ تمام کام بھٹو صاحب اپنی طبیعت کے مطابق کر رہے ہوتے تھے۔ اس میں، میں نے اُن کو کبھی اَن ایزی نہیں ہوتے دیکھا تھا۔ یعنی اُن کو کبھی بے آرام یا مشکل میں نہیں دیکھا تھا۔ شیر پاؤ ہاؤس میں رات کو پشاور کے جلسہ عام کے بارے میں بات چیت جاری ہوئی۔

چیئرمین صاحب کا دستور اور معمول تھا کہ جس شہر میں بھی جلسہ عام ہوتا تھا، وہ اس شہر کے بارے میں اچھی طرح معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ جلسے میں کچھ دوسرے لوگوں کو بھی تقریر کرنے کا موقع دیا جائے مگر حیات محمد خان نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ معاملہ یوں طے پایا کہ بھٹو صاحب کی آمد سے پہلے نثار محمد خان کچھی اور دو ایک لوگوں کی تقریریں کروا دی جائیں۔ چیئرمین بھٹو نے مجھے پوچھا کہ صبح کیا پڑھ رہے ہو۔ میں نے فوراً

www.bhutto.org

جواب دیا ''بغاوت''، بغاوت میری تازہ نظم کا عنوان تھا۔

بھٹو صاحب مسکرا کر کہنے لگے (یو کین ڈو اِٹ) ہاں تم بغاوت کر سکتے ہو۔ مگر وہ بے حد حساس انسان تھے۔ اُنہوں نے اپنی تسلی کے لئے مجھے کہا کہ تھوڑی سی بغاوت اُن کو سناؤ۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے ابھی نظم کے دو تین بند ہی پڑھے تھے کہ اُنہوں نے جذباتی انداز میں ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ باقی حصے جلسے میں سنیں گے۔ میں نے نظم کے اشعار سے اُن کے چہرے کو سرخ ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ جب وہ جذبات میں آیا کرتے تھے تو اُن کا چہرہ سرخ ہو جایا کرتا تھا۔ پشاور جلسے میں پڑھی گئی نظم بغاوت ملاحظہ کریں۔

نظم ''بغاوت''

اُٹھو کہ اب تو کوئی مصلحت نہیں باقی
چلو کے بحرِ تلاطم سے بیڑا پار کریں
بڑھو کے توڑ کے زنداں کا بند دروازہ
ستم کے ہاتھ سے آزاد ذوالفقار کریں

○

وطن کی رفعت و عظمت کا سرخ چنگارو
بھڑک اُٹھو کہ کہیں روشنی نہیں ملتی
زمینِ پاک کے ذرّو چمک اٹھو کہ کہیں
مہ و نجوم سے اب زندگی نہیں ملتی

○

ملوں کی آتشیں بھٹی میں جلتے مزدور
تمہارا قیمتی خوں تیل بن نہیں سکتا
تمہارے خون سے محلوں میں روشنی کیوں ہو
نظامِ زر کے لئے کھیل بن نہیں سکتا

www.bhutto.org

○

دیارِ پاک کے مفلس عظیم دہقانوں
تمہارے کھیت تمہارے لئے گراں کیوں ہیں
تمہارے خون پسینے کے خوشنما پودے
تمہارے اپنے مقدر پہ نوحہ خواں کیوں ہیں

○

سمجھ رہے ہو تمہاری جفا کشی کے ثمر
وہ کون لوگ ہیں جن کا طعام بنتے ہیں
جو لوگ دشمنِ جاں ہیں تمہارے بچوں کے
تمہارے خون سے جن کے مقام بنتے ہیں

○

جو خون چوس کے رکھ دے غریب لوگوں کا
ہم اس نظام کی خوشیاں منا نہیں سکتے
جو تاشقند میں سودا چکا دے ملّت کا
ہم ایسے شخص کو رہبر بنا نہیں سکتے

○

ہم ان سے اپنے لہو کا حساب مانگیں گے
لہو ہمارا جو دس سال سے یہ پیتے رہے
منا رہے ہیں یہ دس سالہ جشنِ ظلمت کو
حساب لیں گے ہم ان سے اگر یہ جیتے رہے

○

تمہارے جشن تمہارے سیاہ چہروں سے
ہمارے خون کے دھبّے چھپا نہیں سکتے
تمہارے جبر و تشدد کے خونچکاں منظر
ہمارے لب کے یہ نعرے دبا نہیں سکتے

www.bhutto.org

○

ہمارے گنتی کے دشمن تو سب اکٹھے ہیں
ستم تو یہ ہے کہ مظلوم منتشر کیوں ہیں
ہمارے سامنے اِن کی بساط ہی کیا ہے
ہم اتحادِ صداقت کے منتظر کیوں ہیں

○

دیارِ پاک کے بارہ کروڑ مظلوموں
حصولِ حق کے لئے اِک زبان ہو جاؤ
ستمگروں کا بہت مختصر سا ٹولہ ہے
تم ایک جسم بنو ایک جان ہو جاؤ

○

ہمارے حق و صداقت کی گریہ زاری کو
تو انتشار سمجھتا ہے، انتشار سمجھ
ہم اور دِل میں یہ نعرے دبا نہیں سکتے
تو ایک بار تو کیا ہے ہزار بار سمجھ

○

تم اشکِ خوں کو بغاوت کا نام دیتے ہو
جو وقت آیا بغاوت بھی کر دکھائیں گے
ہم اپنے حق و صداقت کے شور و غوغے سے
تمہارے جبر و تشدّد کا سر جھکائیں گے

○

ہم وہ نہیں کہ جو واپس پلٹ سکیں گے کبھی
ہم اپنی آخری کشتی جلا کے نکلے ہیں
یا تم رہو گے یا پھر ہم رہیں گے گلشن میں
ہم اپنے سر پہ کفن کو سجا کے نکلے ہیں

www.bhutto.org

O

ہمارا دردِ محبت دلوں کو موہ لے گا
ہم اپنے دیس کی ہر شے سے پیار کرتے ہیں
ہم وہ نہیں کہ جو لندن کو بھاگ نکلیں گے
ہم اپنی جان وطن پر نثار کرتے ہیں

O

مرے وطن تیرے گلشن کی ہر بہار کی خیر
مرے وطن تیرے فرزندِ ذوالفقار کی خیر

O

پشاور کا جلسہ عام

دوسرے دن ہی دوپہر کو پشاور کے جلسے کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد لوگوں کی تقریروں کا سلسلہ شروع کرا دیا گیا۔ چیئرمین بھٹو جلسہ گاہ میں تشریف لائے تو حسب معمول جلسہ گاہ میں بھونچال کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اُنہوں نے کچھ دیر اپنے مخصوص انداز میں لوگوں کو خوش آمدید کہا اور وہ آکر نشست پر بیٹھ گئے۔ پروگرام کے مطابق میرے نام کا اعلان کیا گیا۔ میں نے مائیک پر آکر کہا۔ حضرات! آج میں آپ کے سامنے نظم ''بغاوت'' پیش کروں گا اور میں نے نظم پڑھنا شروع کر دی۔ نظم مکمل ہونے تک میں نے جلسے میں شریک لوگوں کو مکمل طور پر بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔ میں نے عوام کو بہت مشتعل کر دیا تھا اور چیئرمین بھٹو خود بھی ایسی ہی فضا کے خواہش مند تھے۔ اس طرح میں نے لوگوں کو شعلوں کی طرح بھڑکا کر جلسے کو چیئرمین بھٹو کے سپرد کر دیا۔

چیئرمین بھٹو انسانی سائنس کے ماہر انسان تھے۔ وہ جس علاقے میں بھی جلسہ کرنے جاتے تھے، پہلے اُس علاقے کے مسائل کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لایا کرتے تھے۔ وہ جس صوبے میں جلسہ کرتے تھے، اُس صوبے کے بڑے مسائل اُن کو اَزبر ہوتے تھے۔ اُن دنوں صوبہ سرحد میں چینی کی مہنگائی کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ صوبہ سرحد پاکستان میں گنا پیدا کرنے کا سب سے بڑا علاقہ

www.bhutto.org

ہے۔ بھٹو صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز ہی چینی کی مہنگائی سے کیا۔ چینی کی مہنگائی کا ذکر لوگوں کی نبض پر ہاتھ رکھنے والی بات تھی۔ اُنہوں نے کہا کہ چینی پیدا تم کرتے ہو۔ تمہارے بچوں کو چینی نہیں ملتی۔ جو پیدا کرتے ہیں وہ چینی کو ترستے ہیں۔ جو گندم پیدا کرتے ہیں وہ روٹی کو ترستے ہیں۔ یہ عجیب حکومت ہے۔ اس حکومت کی ہر بات اُلٹ ہے۔ کماتا کوئی ہے، کھاتا کوئی ہے۔ اُگاتا کوئی ہے، کاٹتا کوئی ہے۔ میرا سوشلزم یہ ہے کہ جو اُگاتا ہے، وہ کھائے۔ جو کماتا ہے وہ کھائے۔ یہ لٹیروں کی حکومت ہے۔ 22 خاندانوں کی حکومت ہے۔ جرنیلوں کی حکومت ہے۔ ڈاکوؤں، چوروں کی حکومت ہے۔ یہ قاتلوں کے ٹولے کی حکومت ہے جو قوم کا سب کچھ کھا چکے ہیں۔

یہ آدم خوروں کی حکومت ہے۔ یہ خونی اسٹیبلشمنٹ کی حکومت ہے۔ یہ اسٹیبلشمنٹ ہی لیاقت علی خان کو کھا چکی ہے، خواجہ ناظم الدین کو کھا چکی ہے۔ حسین شہید سہروردی کو کھا چکی ہے۔ مادرِ ملّت کو کھا چکی ہے اور ابھی تک اِس کے خونی جبڑے کھلے ہیں۔ ابھی اور انسانوں کو کھانا چاہتی ہے مگر ذوالفقار علی بھٹو کو کھانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لوگ چینی کو رو رہے ہیں مگر حکومت جشن منا رہی ہے۔ لوگ روٹی کو ترس رہے ہیں، حکومت جشن منا رہی ہے۔ یہ قبرستان میں جشن منا رہی ہے۔ میری اور اِن تمام قوم دشمنوں کی یہ آخری جنگ ہے۔ میں ذوالفقار علی بھٹو اللہ کی تلوار ہوں۔ قوم کی تلوار ہوں۔ اُنہوں نے آخر میں لوگوں سے کہا کہ اے بہادر پٹھانوں لڑو گے، اُٹھو گے۔ لہٰذا اِس طرح کے کلائمیکس کے ساتھ جلسہ ختم ہو گیا۔ چیئرمین بھٹو کا سرحد کا دورہ ایوب خان کی حکومت کے اعصاب پر سوار ہو گیا۔ صوبہ سرحد میں حکومت نام کی کوئی چیز دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ ایوب خان نے اپنی گرتی ہوئی ساکھ بحال کرنے کیلئے پشاور میں جلسہ رکھ لیا۔ یہ جلسہ بھٹو صاحب کے جلسے کے پانچ دن بعد کیا گیا تھا۔ ایوب خان بھٹو صاحب کے جلسے کا اثر زائل کرنا چاہتا تھا۔ مگر معاملہ انتہائی اُلٹ دیکھنے میں آیا۔ ایوب خان نے اپنی تقریر شروع کی ہی تھی کہ لوگوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ چینی چور، چینی چور۔ اِس کے ساتھ ہی ہجوم میں سے کسی نے ایوب خان پر پستول سے فائر کر دیا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے فائر ایوب خان کو نہ لگ سکا۔ مگر ایوب خان خوف کے مارے نیچے زمین پر گر گیا۔ ایوب خان کے جلسے کا یہ انجام ایوب حکومت کے لئے زوال کا آخری پیغام تھا۔ چیئرمین بھٹو نے ایوب حکومت کو چت کر ڈالا تھا۔ اِس طرح صوبہ سرحد کے دوسرے جلسوں کے بعد ایوب حکومت کے مکمل طور پر پاؤں اُکھڑ گئے تھے۔ ہر طرف بھٹو ہی بھٹو نظر آ رہا تھا۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کو صوبہ سرحد میں آخری جلسہ ڈیرہ اسماعیل خان میں کرنا تھا۔ حکومت بری طرح بوکھلا چکی تھی۔ حکومت کے علاوہ مفتی محمود کی جماعت بھی بھٹو صاحب کے خلاف متحرک ہو چکی تھی۔ لہٰذا حکومت اور مذہبی عناصر نے مل کر ڈیرہ اسماعیل خان کا جلسہ ناکام بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بات کی اطلاع جلسے سے کچھ روز پہلے شیر پاؤ ہاؤس میں بھٹو صاحب کو مل چکی تھی۔

ڈیرہ اسماعیل خان کے جلسے کے بارے میں بھٹو صاحب کے ساتھ صبح ناشتے کی میز پر ہم تمام لوگ غور و فکر کر رہے تھے کہ مین اُس وقت میرے ساتھ ایک بدنصیبی کا واقعہ پیش آ گیا کہ میری بڑی ہمشیرہ انتقال کر گئی ہے۔ اُس وقت بھٹو صاحب کے ساتھ ہم لوگ اپنے جلسوں کی کامیابی کے معاملے پر بہت خوش ہو رہے تھے۔ مگر ٹیلی گرام کی وجہ سے تمام ماحول تبدیل ہو گیا۔ بھٹو صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ تم فوراً لاہور واپس چلے جاؤ۔ اس طرح میں ڈیرہ اسماعیل خان کے جلسے سے دو دن پہلے لاہور واپس آ گیا۔ میں ہمشیرہ کی وفات کے چار دن بعد لاہور پہنچا تھا۔

یوں تو میں پہلے سے ہی انسانی معاشرے میں انسانوں کی عظمت کو فروغ دینے کی ہی سیاست پر عمل پیرا تھا۔ میری تمام شاعری انسانی عظمتوں کیلئے وقف تھی۔ انسان کا وقار بڑھانا ہی میرا مطمع نظر تھا اور یہ مطمع نظر ایک سوشلسٹ سماج اور نظام برپا کرنے کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ میں ہمشیرہ صاحبہ کی وفات کے واقعے سے اپنے نظریات میں انتہا پرست بن گیا۔ اب میں نے زندگی کا اُوڑھنا بچھونا ہی انقلاب کو بنا لیا۔ میں نے اپنی تمام چیزیں اپنے عزیزوں میں تقسیم کر دیں۔ شاہ نور میں اپنے ڈیرے کی رہائش بھی ترک کر دی اور تمام دنیاداری چھوڑ چھاڑ کر میں نے پارٹی کے دفتر 4/A مزنگ روڈ کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنا ڈیرہ جما لیا اور مکمل طور پر انقلاب کا فقیر بن گیا۔ سوائے پارٹی کی سیاست کے زندگی کے کسی دوسرے پہلو پر دھیان دینا ہی موقوف کر دیا۔ لوگ تو سیاست کر رہے تھے۔ میں نے سیاست کو اپنا ایمان بنا لیا تھا۔ سیاست کی جنگ لڑنے والوں کی اکثریت تھی۔ ایمان کی جنگ لڑنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ لہٰذا اس جنگ میں میرا انجام وہی ہوا جو اکثریت کے سامنے اقلیت کا ہوا کرتا ہے۔

بقول شاعر اسلم گورداسپوری ؎

لوگ کارِ الفت کو دل لگی سمجھتے تھے
ہم نے کارِ الفت کو اپنا مُدعا جانا

ڈیرہ اسماعیل خان کا جلسہ اور پنڈی میں طالب علم حمید کا قتل

ڈیرہ اسماعیل خان کے جلسے میں، میں چونکہ خود موجود نہ تھا۔ اِس جلسے کے بارے میں دوستوں سے ہی تمام واقعات کا علم ہوا تھا۔حکومت نے مفتی محمود کی مقامی مذہبی جماعت کے انتہا پسند کارکنوں اور انتظامیہ کے غنڈوں کی مدد کے ساتھ اِس جلسے کو درہم برہم کرنے کی انتہائی کوشش کی۔جلسہ گاہ کے میدان میں جمع شدہ لوگوں کی طرف ٹرک چڑھانے کی کوشش کی۔لوگوں نے ٹرکوں کو آگ لگانے کی کوشش کی تو ٹرکوں والے میدان سے بھاگ گئے۔پولیس کا یہ عالم تھا کہ پولیس جلسہ گاہ کو ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھی تاکہ لوگ جلسہ گاہ کے اندر نہ جاسکیں۔اِس کے باوجود لوگ پولیس کا گھیرا توڑ کر جلسہ گاہ میں داخل ہو گئے تھے۔

آہ مرحوم حق نواز گنڈا پوری

حق نواز گنڈا پوری ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک مردِ آزاد تھا۔وہ چیئرمین بھٹو کا عاشق تھا۔ایک دیوانہ انسان تھا۔ایک انتہائی نظریاتی اور باغی انسان تھا۔میری اُس کے ساتھ حیدر آباد کے پارٹی کنونشن میں ملاقات ہوئی تھی۔وہ شخص ڈیرہ اسماعیل خان کی جلسہ گاہ کے میدان میں ٹرکوں کے آگے لیٹ گیا تھا۔اُس کے بعد اُس نے پولیس کو بندوق تان کر بھٹو صاحب کا راستہ چھوڑنے کا کہا تھا اور پولیس ایک طرف ہٹ گئی تھی۔ڈیرہ اسماعیل خان کے جلسے کی کامیابی کا تمام تر سہرا حق نواز گنڈا پور کے سر تھا۔

1970ء کے انتخابات میں حق نواز گنڈا پوری مفتی محمود کے مدمقابل پاکستان پیپلز پارٹی کا نیشنل اسمبلی کا اُمیدوار تھا۔مفتی محمود ایک خوفناک مذہبی مافیا کا لیڈر تھا جس کو صوبہ سرحد کے کروڑ پتی تاجروں، چرس کے سمگلروں اور خرکاروں کی حمایت حاصل تھی۔اُن کے مقابلے میں حق نواز گنڈا پوری اِس علاقے میں پہلا پرولتاری اور عوامی سیاسی کارکن قومی اسمبلی کے لئے انتخابی اُمیدوار تھا۔صوبہ سرحد کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا کہ حق نواز گنڈا پوری نے اِن تمام مذہبی اور سرمایہ دار اور جاگیردار مافیا کو اِس علاقے میں چیلنج کیا تھا۔وہ اپنے حلقہ انتخاب میں دور دراز پہاڑوں میں پیدل چل کر ووٹ مانگتا تھا۔اُس نے [illegible] پیپلز پارٹی کا جھنڈا

www.bhutto.org

ہوتا تھا۔ اُس کی انتخابی جدوجہد نے مفتی محمود کی پارٹی کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ اِس علاقے کے تمام سمگلر اور خرکار اُس شخص کی انقلابی تقریروں سے لرز گئے تھے۔ لہٰذا مفتی محمود کے انتخابی حلقے کے خرکاروں اور اسمگلروں نے اُس شخص کو اُس کے انتخابی حلقے کے ایک دور دراز پہاڑی علاقے میں قتل کر ڈالا اور مشہور کر دیا کہ آسمانی بجلی گرنے کی وجہ سے وہ ہلاک ہو گیا ہے۔ حق نواز گنڈاپوری کی بے وقت موت سے اُس علاقے میں پاکستان پیپلز پارٹی کو بے حد سیاسی نقصان پہنچا تھا۔ اُس کی خالی شدہ سیٹ پر وہاں کی پیپلز پارٹی کے ورکروں نے مفتی محمود کے مقابلے میں چیئرمین بھٹو کے کاغذات جمع کروا دیئے تھے۔ مگر اس علاقے کے پولنگ اسٹیشنوں پر پیپلز پارٹی کے ایجنٹ ہی نہیں تھے۔ بھٹو صاحب کا وہاں سے الیکشن لڑنا وہاں کے کارکنوں کی خواہش کا احترام تھا۔ ہر چند بھٹو صاحب اُس حلقے کے تمام علاقوں میں خود نہ جا سکے تھے۔ اِس کے باوجود بہت ہی کم ووٹوں کے ساتھ مفتی محمود انتخاب جیتا تھا۔ میں حق نواز گنڈاپوری سے اس قدر متاثر تھا کہ میں نے اپنی شاعری کے پہلے مجموعے کو حق نواز گنڈاپوری کے نام سے منسوب کیا تھا جس پر پارٹی کے نظریاتی لوگوں نے مجھے بہت داد دی تھی کہ تم نے ایک غریب سیاسی کارکن کے نام پر اپنی کتاب کو منسوب کر کے اپنی پرولتاری ہونے کا زندہ ثبوت دیا ہے۔

چیئرمین بھٹو ڈیرہ اسماعیل خان کو عوامی اعتبار سے فتح کر کے پشاور واپس آئے اور پشاور سے راولپنڈی آ گئے۔ اُن کا یہ دورہ عوامی جدوجہد کے لئے ایک طوفانی دورہ تھا۔ پچھلے دو سال سے وہ مغربی پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں جلسے کر چکے تھے۔ اُن کے جلسوں میں آتش بیانی سے مغربی پاکستان سیاسی اعتبار سے ایک آتش فشاں بن چکا تھا۔ ہر شخص فوجی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کئے ہوئے تھا۔ سب سے پہلے تو اُنہوں نے اپنے گھر اور سندھ کے عوام کے دلوں میں فوجی حکمرانوں کے خلاف بغاوت بھڑکا دی تھی۔

پورا صوبہ سندھ جوالا مکھی بن گیا تھا۔ اِس کے بعد چیئرمین بھٹو نے صوبہ سرحد کو سیاسی طور پر تپا کر سرخ بنا دیا تھا۔ سرحد کے بعد وہ اپنے ساتھ عوامی بغاوت کا طوفان لے کر پنجاب کے دارالخلافہ راولپنڈی میں داخل ہو گئے تھے۔ بھٹو صاحب جب پنڈی انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل پہنچے تو اُن کے آنے سے پہلے ہی ہوٹل کو ہزاروں طلباء نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ پولیس نے طالب علموں کا ہجوم ختم کرنے کے لئے بدترین قسم کی آنسو گیس استعمال کی اور لاٹھی چارج کیا۔ پولیس کی

اس لاٹھی چارج کے دوران چیئرمین بھٹو ہوٹل میں پہنچ گئے ۔ یوں تو طالب علموں کا ہجوم چھٹ چکا تھا مگر اِکا دُکا طالب علم ابھی تک پولیس کے نرغے میں تھے۔ پولیس میں گھرے ہوئے طالب علموں میں ہی لاہور کا خالد چوہدری بھٹو صاحب کو لاٹھیاں کھاتا ہوا دکھائی دیا۔ بھٹو صاحب ہوٹل کے برآمدے سے باہر آ کر پولیس کو ڈانٹنے لگ گئے ۔ اِس طرح بھٹو صاحب نے خالد چوہدری اور کچھ دوسرے طالب علموں کو پولیس کے گھیرے سے چھڑایا۔ خالد چوہدری کی پولیس تشدد سے حالت غیر ہوگئی تھی۔ بھٹو صاحب کے کہنے پر ان کو ہسپتال پہنچایا گیا۔ بھٹو صاحب نے پولیس کو ہوٹل سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ جب تک پولیس بھٹو صاحب کے سامنے سے ہٹ نہ گئی، بھٹو صاحب ہوٹل کے لان میں کھڑے رہے۔ ممتاز بھٹو نے بھٹو صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ہوٹل کے اندر چلنے کا کہا اور وہ ہوٹل کے اندر چلے گئے ۔ اِس دوران آنسو گیس کی وجہ سے بھٹو صاحب کی طبیعت بے حد خراب ہوگئی تھی۔

طالب علم عبدالحمید شہید

اسی دوران بھٹو صاحب کے کمرے میں کچھ طالب علم آ گئے اور اُنہوں نے خبر دی کہ پولی ٹیکنیکل کالج میں پولیس کی گولی سے ایک طالب علم عبدالحمید شہید ہوگیا ہے۔ طالب علم اُس کا جنازہ لے کر صدر پاکستان کے صدر ہاؤس کی طرف چلے گئے ہیں اور کل اُس کی نماز جنازہ اُس کے گاؤں راولپنڈی سے کچھ فاصلے پر ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اُس کے جنازے میں شرکت کریں۔ بھٹو صاحب نے جنازے میں شرکت کا وعدہ کرلیا۔ دوسرے روز بھٹو صاحب، میر خورشید حسن کے ساتھ عبدالحمید کے گاؤں گئے ۔ وہاں جا کر اُس کے جنازے میں شریک ہوئے اور اُس کے ماں باپ کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ بھٹو صاحب کے اظہار ہمدردی کے الفاظ اخبارات میں کچھ یوں پڑھنے میں آئے تھے کہ عبدالحمید پاکستان کی جمہوری تحریک کا پہلا شہید ہے اور پاکستان کے عوام کی آزادی کی بارش کا پہلا قطرہ ہے۔ میں اِس کی قربانی کو سلیوٹ کرتا ہوں۔ بھٹو صاحب کے اِن انقلابی الفاظ پر مبنی تعزیت پنجاب بھر کے طالب علموں کے لئے پیغام بغاوت بن گئی۔ اُن کے اِن الفاظ کا اثر سب سے زیادہ لاہور کے طالب علموں پر ہوا۔ لاہور میں طالب علموں نے مال روڈ کو مستقل طور پر اپنے قبضے میں کرلیا۔ مال روڈ پر پولیس اور طالب علموں کی جنگ روز کا معمول

www.bhutto.org

بن گئی تھی اور اس جنگ کا خاتمہ ایوب خان کے اقتدار سے علیحدہ ہونے کے بعد ہوا تھا۔ چیئرمین بھٹو ابھی راولپنڈی میں ہی تھے کہ خورشید حسن میر کو گرفتار کر لیا گیا۔

چیئرمین بھٹو کی لاہور آمد

راولپنڈی سے چیئرمین بھٹو لاہور تشریف لائے۔ لاہور آ کر اُنہوں نے مجھے ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر بلایا۔ اُس وقت وہ ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے میرے ساتھ میری ہمشیرہ کی وفات پر اظہارِ افسوس کیا۔ مجھ سے ہمشیرہ کی وفات کا تمام معاملہ معلوم کیا۔ مجھے اُنہوں نے کہا کہ اُن کے لائق کوئی خدمت ہو تو بتاؤ۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اُنہوں نے مجھ سے لاہور کی صورتحال کے بارے میں دریافت کیا۔ اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے کہا کہ ایوب حکومت کسی وقت بھی ہم لوگوں کو گرفتار کر سکتی ہے۔ آج شام کو کچھ اہم فیصلے کرنے ہیں۔ تم ڈاکٹر صاحب کے گھر میں موجود رہو اور پارٹی کے دوستوں کو میرے واپس آنے تک یہاں روکو۔ اِس کے ساتھ ہی وہ میاں محمود علی قصوری کے گھر روانہ ہو گئے۔ میاں محمود علی قصوری کے پاس وہ اپنی متوقع گرفتاری کے سلسلے میں بات کرنے گئے تھے۔

چیئرمین بھٹو کو اپنی گرفتاری کا علم ہو چکا تھا

اُن دنوں پنجاب کا چیف سیکریٹری بندیال تھا۔ بندیال حنیف رامے کا کلاس فیلو تھا۔ بندیال نے رامے صاحب کو بھٹو صاحب کی گرفتاری کے متعلق بتا دیا تھا اور رامے صاحب نے بھٹو صاحب کو اُن کی گرفتاری کے حکم سے آگاہ کر دیا تھا۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو اپنی گرفتاری کیلئے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھے۔ بھٹو صاحب کے قصوری صاحب کے گھر جانے کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام اہم لیڈر ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ جلد ہی بھٹو صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر یہ فیصلہ ہوا کہ کل ہر صورت میں لاہور میں بھٹو صاحب کی تقریر ہونی چاہیے۔ جگہ کا معاملہ زیرِ غور آیا۔ بھٹو صاحب کی آمد سے پہلے ہی شیخ محمد رشید صاحب کے ساتھ کارکنوں کی بات چیت چل رہی تھی کہ بھٹو صاحب سے پارٹی کے دفتر کا افتتاح کرانا چاہیے۔ اُن کے آنے سے ایک تو پارٹی کے دفتر کا پورے پاکستان میں نام ہو جائے گا۔ دوسرے لاہور میں پارٹی کی

www.bhutto.org

سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ اب جب کل چیئرمین بھٹو کی تقریر کے بارے میں جگہ کی تلاش ہو رہی تھی تو میں نے رائے پیش کی کہ کل بھٹو صاحب پارٹی کے دفتر کا افتتاح کریں۔ ہم رات بھر لوگوں تک اور کارکنوں تک یہ خبر پہنچا دیں گے۔ اِس طریقے سے دفتر کا افتتاح بھی ہو جائے گا اور بھٹو صاحب کو تقریر کرنے کا موقع بھی ہاتھ آ جائے گا۔ میری اِس تجویز کو شیخ محمد رشید صاحب نے بہت زور وشور سے پسند کرتے ہوئے بھٹو صاحب سے کہا کہ بھٹو صاحب! یہ ایک تاریخی افتتاح ہوگا۔ ہم آپ کو بالکونی سے تقریر کرائیں گے۔ دفتر کے نیچے بہت کھلی جگہ لوگوں کے کھڑے ہونے کی موجود ہے۔ چیئرمین بھٹو نے میری اِس تجویز کو پسند کرتے ہوئے بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا مگر صبح وہاں دفتر میں لوگوں کا اور کارکنوں کا آنا کیسے ہوگا۔ ہم سب نے کہا کہ ہم رات بھر پارٹی کے کارکنوں کو اطلاع کرتے رہیں گے۔ لوگ صبح ہر صورت اچھی خاصی تعداد میں وہاں پہنچیں گے۔ چیئرمین بھٹو کا خیال تھا کہ حکومت اُن کو 11 نومبر 1968ء کی رات ہی گرفتار کر لے گی مگر اُس رات بھٹو صاحب کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر سے ہم تمام پارٹی کارکن، لاہور کے پارٹی کارکنوں کو صبح دفتر پہنچنے کی اطلاع کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ تمام اخبارات میں پارٹی دفتر کے بھٹو صاحب کے افتتاح کرنے کی خبریں پہنچا دیں گئیں۔ اِس طریقے کے ساتھ پارٹی کارکن بہت رات گئے تک لوگوں کو اطلاع کرتے رہے۔ پروگرام کے مطابق صبح 9 بجے چیئرمین بھٹو کو لاہور ڈسٹرکٹ بار کو خطاب کرنا تھا، اس کے بعد ان کو پارٹی کے دفتر آنا تھا۔

لہٰذا صبح پروگرام کے مطابق چیئرمین بھٹو ڈسٹرکٹ بار لاہور مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔ ڈسٹرکٹ بار لاہور کی تقریب کے بعد ٹھیک 11 بجے چیئرمین بھٹو کو پارٹی دفتر لایا گیا۔ اُن کی آمد کے ساتھ ہی میں نے سب سے پہلے بالکونی پر کھڑے ہو کر نظم ''بغاوت'' پڑھنا شروع کر دی۔ واضح رہے کہ یہ تمام کاروائی بغیر لاؤڈ اسپیکر کے ہو رہی تھی۔ حالات کی جارحیت کو محسوس کرتے ہوئے میں نے بہت ہی جوشیلے اور طیش کے انداز میں نظم پڑھی۔ دفتر کے نیچے جتنا بھی اکٹھ تھا، وہ نوجوان لوگوں کا تھا۔ نوجوانوں کے جم غفیر کا اشتعال آسمان کو چھو رہا تھا۔ چیئرمین بھٹو اِس قدر جوش میں تھے کہ اُنہوں نے بالکونی میں آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے کر دیا اور خود خطاب کرنا شروع کر دیا۔ اُن کے پہلے الفاظ یہ تھے۔ میرے بھائیو! میں نے اِس خونی حکومت

www.bhutto.org

کے دانت کھٹے کردیئے ہیں۔ میں نے آمریت کے سانپ کو زخمی کردیا ہے۔اب اِس کو کچلنا آپ کا کام ہے۔آمریت کا زخمی سانپ بل کھا رہا ہے۔ یہ مجھ پر جھپٹنے ہی والا ہے۔حکومت شکست کھا چکی ہے۔اب اُس کی قوت برداشت جواب دے چکی ہے۔بوڑھا ڈکٹیٹر بیمار پڑ چکا ہے۔ مجھے کسی بھی وقت گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ میں اِن کی جیلوں سے نہیں ڈرتا۔حکومت اگر مجھے جیل میں ڈالے گی تو لوگ اِن کی جیلوں کو توڑ دیں گے۔لوگوں نے کہنا شروع کردیا۔ہم جیلیں جلا دیں گے۔ہم گورنر ہاؤس جلا دیں گے۔ چیئرمین بھٹو نے آخر میں کہا کہ آج میں یہاں تقریر کرنے نہیں آیا۔ میں آپ لوگوں کو حالات سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔ جاگتے رہنا، ہوش میں، جوش میں رہنا۔ میں نے اپنا کام کردیا ہے۔اب آپ کو اپنا کام کرنا ہے۔ بھٹو صاحب نے حکومت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جنرل موسیٰ خان! بھٹو پنجاب کی بہادر سرزمین پر پہنچ گیا۔ بھٹو لاہور کے غیرت مند عوام کے درمیان کھڑا ہے۔ میں نے لاہور میں اپنا مورچہ قائم کردیا ہے۔میرا میدانِ جنگ لاہور ہوگا۔ میں نے اپنا فیصلہ پنجاب کے عوام اور لاہور کے عوام کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جو یہ فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔ میں آپ لوگوں سے اجازت چاہتا ہوں۔ بہت جلد میں آپ سے موچی دروازے کے جلسے میں ملاقات کروں گا۔شکریہ۔

چیئرمین بھٹو کی تقریر کیا تھی، الفاظ کا بارود تھی۔ چیئرمین بھٹو کے پارٹی دفتر سے واپس ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر جانے کے بعد نوجوانوں کی ٹولیاں پورے مال روڈ پر پھیل گئیں۔ مال روڈ کی ٹریفک جام ہوگئی۔ تمام دن طالب علموں اور پولیس کے درمیان آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ دوپہر کے بعد فوجی گاڑیاں شہر کی تمام بڑی سڑکوں پر گشت کرنے لگ گئیں۔ شہر میں ہر طرف سڑکوں پر پولیس مارچ کرنے لگ گئی۔ چیئرمین بھٹو لاہور میں کچھ اہم لوگوں کے ساتھ ملاقات میں مصروف رہے۔ شام کو میاں محمود علی قصوری کے گھر اُن کو جانا تھا۔ جب وہ ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر سے میاں محمود علی قصوری کے گھر جا رہے تھے تو میں ڈاکٹر صاحب کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ بھٹو صاحب نے چلتے چلتے مجھے کہا کہ اسلم تم ہمارے واپس آنے تک یہیں رہو۔ چیئرمین بھٹو کے حکم کے مطابق میں شام چھ بجے سے لے کر رات ساڑھے دس بجے تک ڈاکٹر مبشر حسن کے برآمدے میں کارکنوں کے ساتھ بیٹھا چیئرمین بھٹو کی آمد کا انتظار کرتا رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے برآمدے سے باہر سڑک صاف دکھائی دیتی تھی۔ پولیس کی گاڑیاں باربار آ جا رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ پولیس نے ڈاکٹر مبشر

www.bhutto.org

حسن کے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ پولیس کی نقل وحرکت کو دیکھ کر لوگ آہستہ آہستہ کھسکنا شروع ہو گئے۔ 9 بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کے برآمدے میں غلام کبریا خان اور میں ہی رہ گئے۔ طالب علم خالد چوہدری آف بیڈن روڈ جس کو راولپنڈی میں پولیس نے ہوٹل میں بھٹو صاحب کے نعرے مارنے کی وجہ سے بہت مارا تھا۔ بھٹو صاحب نے اُس کو خاص طور پر بلایا تھا۔ رات 9 بجے کے بعد خالد چوہدری رکشے پر آ گیا۔

کوٹھی میں ہُو کا عالم تھا۔ ہم تینوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ خالد چوہدری اُس وقت بھی زخمی دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی اُس کے سر کے زخم تازہ تھے۔ تقریباً رات 10 بجے کے قریب چیئر مین بھٹو تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ ممتاز علی خان بھٹو اور ڈاکٹر مبشر حسن بھی تھے۔ میاں محمود علی قصوری کے گھر حبیب جالب بھٹو صاحب کو مل گئے۔ بھٹو صاحب حبیب جالب کو بھی اپنے ساتھ لے آئے۔

بھٹو صاحب نے خالد چوہدری کو شاباش دی۔ اُس کو بہادر نوجوان کہا۔ بھٹو صاحب کے کمرے میں بھٹو صاحب کی کچہری شروع ہو گئی۔ حبیب جالب صاحب کے ساتھ خوب مذاق ہوئے۔ ممتاز علی بھٹو بہت شرارتی تھا۔ مجھے کہنے لگے کہ اسلم جالب صاحب پیپلز پارٹی میں آرہا ہے۔ اِس طرح کی چھیڑ چھاڑ غلام مصطفیٰ کھر مجھ سے اکثر کیا کرتا تھا۔ مگر میں جالب صاحب کا ذکر ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ مصطفیٰ کھر نے ایک بار مجھے چڑانے کی غرض سے جالب کی بہت تعریف کی۔ بھٹو صاحب خاموش بیٹھ کر اُن کی شرارت سے محظوظ ہوتے رہے۔ یہ پشاور میں حیات محمد خان شیر پاؤ کے گھر کا واقعہ ہے۔ بات اے۔ این۔ پی سے چلی تھی کہ کھر صاحب کا روئے سخن میری طرف ہو گیا۔ میں نے کھر صاحب کو کہا کہ جالب ایک اچھا فنکار ہے اور میرا دوست ہے۔ آپ جو اُس کی اتنی تعریف کر رہے ہیں، مجھے جالب کا کوئی اچھا سا شعر سنائیں۔ مجھے علم تھا کہ مصطفیٰ کھر کا شاعری کی طرف سے خانہ بالکل خالی ہے۔ کھر صاحب بس ایک ہی بات کہے جا رہے تھے کہ وہ بڑا اچھا شاعر ہے۔ میں نے کہا کہ اِس اچھے شاعر کا کوئی شعر تو سنائیں۔ میں نے بھٹو صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ چیئر مین صاحب وہ آدمی کس طرح کسی شاعر کو بڑا یا اچھا شاعر کہہ سکتا ہے جس آدمی کو اُس بڑے اور اچھے شاعر کا کوئی شعر ہی یاد نہ ہو۔ مصطفیٰ کھر بڑا چالاک ملتانی پٹھا تھا۔ کہنے لگا۔ وہ جو شعر ہے میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا۔ میں

www.bhutto.org

نے کہا کہ کیا نہیں مانتا، اس کی وضاحت اُس کے شعر سے کریں۔ وہ کیا نہیں مانتا تھا۔

اس کے بعد میں نے حبیب جالب کی نظم دستور مصطفیٰ کھر کو پوری پڑھ کر سنائی۔ چیئر مین بھٹو نظم پوری ہونے کے بعد کہنے لگے۔ مصطفیٰ کھر، گورداسپوری بہت وسیع ذہن کا آدمی ہے۔ یہ تمہاری چال میں نہیں آ سکتا۔ ممتاز علی بھٹو نے جب حبیب جالب کے پیپلز پارٹی میں آنے کا کہا تو میں نے کہا کہ میں جالب کی پیپلز پارٹی میں آمد پر جالب کی تعریف میں نظم کہوں گا۔ اُن کا شاندار استقبال کروں گا۔ اِس خوبصورت مذاق کے بعد بھٹو صاحب اپنے کپڑے تبدیل کرنے چلے گئے۔

ہماری اِس گپ بازی میں رات کے 12 بج چکے تھے۔ بھٹو صاحب شلوار قمیص پہن کر آ گئے۔ کہنے لگے کہ اب اِس محفل کو برخاست کرنا چاہیے۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ صبح تم کو ہمارے ساتھ ملتان چلنا ہوگا اور ملتان ہم بذریعہ ریل گاڑی جائیں گے۔ اِس طرح وہ محفل برخاست ہوگئی اور ہم لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا کر سو گئے۔

12 نومبر 1968ء کو بھٹو صاحب کو گرفتار کرلیا گیا

ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر سے ہم لوگوں کے نکلنے کی دیر تھی کہ پولیس ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچ گئی۔ اِس طرح 12 نومبر 1968ء کی رات کو تقریباً ایک بجے کے قریب چیئر مین بھٹو اور ڈاکٹر مبشر حسن اور ممتاز علی بھٹو کو گرفتار کرلیا گیا اور اِن سب کو میاں والی جیل پہنچا دیا گیا۔ اُس رات ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ جو اُس وقت صدر پاکستان پیپلز پارٹی لاہور تھے، اُن کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اُسی رات امان اللہ خان کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ اِن میں سے کچھ لوگوں کو منٹگمری جیل لے جایا گیا اور کچھ لوگوں کو ملتان جیل میں پہنچا دیا گیا۔ اِن کے علاوہ ملتان سے غلام مصطفیٰ کھر کو بھی گرفتار کرلیا گیا۔ مجھے صرف اِس لئے گرفتار نہیں کیا گیا تھا کہ میری ہمشیرہ کی موت واقع ہوگئی تھی جس کی وجہ سے میں کچھ دنوں کے لئے جلسے جلوسوں میں بھٹو صاحب کے ساتھ شریک نہیں ہو سکا تھا۔ اِس بات کا مجھے اُس وقت علم ہوا جب بھٹو صاحب کی گرفتاری کے تیسرے دن مجھے گرفتار کیا گیا تو عدالت میں میری رہائی کی درخواست دی گئی۔ عدالت میں سرکاری وکیل نے بیان دیا کہ حکومت نے اِس کو اِس لئے گرفتار نہیں کیا تھا کہ اِس کے ہاں کوئی موت واقع ہوگئی تھی۔ مگر اِس شخص نے حکومت کی اِس مہربانی کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ جلوسوں کی قیادت کرنے لگ گیا ہے۔ لوگوں کو توڑ پھوڑ پر آمادہ

کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حکومت نے شیخ رشید اور ملک حامد سرفراز کو کیوں گرفتار نہیں کیا

میں جب صبح اُٹھا تو اُس وقت تک بھٹو صاحب کی گرفتاری کا مجھے کچھ علم نہیں تھا مگر ایک بے چینی سی دل میں ضرور تھی۔ بھٹو صاحب کی گرفتاری کی خبر بھی صبح کے اخبارات میں نہ آ سکی تھی۔ مجھے چونکہ بھٹو صاحب نے ملتان چلنے کا کہا تھا جس کے لئے میں نے شیخ صفدر علی سے رابطہ کیا تا کہ ملتان جانے کا وقت معلوم کیا جا سکے۔ شیخ صاحب نے مجھے بتایا کہ رات کو بھٹو صاحب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں شیخ صاحب سے مل کر سیدھا چائنیز لنچ ہوم ہوٹل میں آ گیا تا کہ باقی لوگوں سے رابطہ کیا جا سکے۔ رفتہ رفتہ بھٹو صاحب کی گرفتاری کی خبر تمام شہر میں پھیل گئی۔ ایک ایک کر کے تمام پارٹی کے لیڈر اور کارکن چائنیز لنچ ہوم آنا شروع ہو گئے۔ ملک حامد سرفراز کی آمد کے بعد آگے کی منصوبہ بندی پر غور وخوض شروع کر دیا گیا۔ چیئرمین بھٹو کی گرفتاری کے بعد ہمارے پاس صرف دو ایسے رہنما لاہور میں آزاد رہ گئے تھے جن میں ایک شیخ محمد رشید تھے اور دوسرے ملک حامد سرفراز تھے۔ ہماری اس صورتحال کے بارے میں کسی حکمت عملی کو اختیار کرنے کا ابھی پہلا دن تھا۔ ابھی بھٹو صاحب کو گرفتار ہوئے 11 یا 12 گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ ہمارے درمیان کچھ اختلافی باتیں ہونا شروع ہو گئیں۔ سب سے زیادہ اختلاف کا مسئلہ یہ بنایا گیا کہ حکومت نے شیخ محمد رشید کو کیوں گرفتار نہیں کیا۔ شیخ محمد رشید کی گرفتاری کا مسئلہ کھڑا کرنے والا خرم واسطی تھا۔ مجھے چونکہ اس قسم کی سیاست کا پہلے کچھ تجربہ نہ تھا۔ میرے لئے یہ بات انتہائی تشویش کا باعث تھی کہ ہم بجائے اس کے کہ حکومت کے خلاف کسی اقدام کے اُٹھانے کا فیصلہ کریں، ہم اپنے ہی لوگوں پر شک کرنے لگ گئے ہیں۔ ہم ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ آفتاب ربانی آ گیا۔ اُس کا بھی یہی احتجاج تھا کہ شیخ محمد رشید کو کیوں گرفتار نہیں کیا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ بھٹو صاحب کے بعد پنجاب کا صدر سب سے اہم انسان تھا اس کا گرفتار نہ کیا جانا ایک راز کی بات ہے اس طریقے سے ربانی نے اور بھی جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا۔

میں نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا کہ حکومت نے ملک حامد سرفراز کو گرفتار کیوں نہیں کیا۔ ہم سب کو گرفتار کیوں نہیں کیا۔ ہم بڑی غلط بحث میں اُلجھ گئے ہیں۔ ہم لوگوں کو خوش ہونا

www.bhutto.org

چاہیے کہ کچھ لوگ تو باہر رہ گئے ہیں جو چیئرمین کی عدم موجودگی میں تحریک چلانے کا کام سرانجام دے سکیں گے۔ ہم لوگوں کو تحریک چلانے کی بات کرنی چاہیے۔ مگر میری باتوں سے کچھ فرق نہ پڑا اور یہ بات بار بار دہرائی گئی کہ شیخ محمد رشید کو گرفتار کیوں نہیں کیا گیا۔ کافی بحث کے بعد میں نے رائے دی کہ کیوں ناں شیخ صاحب کے ساتھ چل کر بات کی جائے کہ آگے کیا کرنا چاہیے۔ اس بات کو قبول کرلیا گیا۔ اِس طرح ہم لوگ پارٹی کے دفتر مزنگ روڈ پر آ گئے۔ وہاں ہم نے شیخ صاحب کے ساتھ ''آگے کیا کرنا ہے'' اِس معاملے پر بات چیت کی۔ شیخ صاحب نے مشورہ دیا کہ کل تک تمام لوگوں کو بھٹو صاحب کی گرفتاری کا علم ہو جائے گا۔ میرا پورا یقین ہے کہ لوگ ہر شہر میں احتجاج کرنا شروع کر دیں گے۔ پارٹی کی تنظیموں کو احتجاج کرنے کا پیغام دیں گے۔ مگر سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ طالب علم تنظیموں کے ساتھ رابطہ پیدا کیا جائے۔ اس وقت چونکہ طالب علم اِس تحریک میں ایک ہراوّل دستے کا کام کر رہے ہیں، اُن کو اپنے ساتھ شریک کرنا بہت ضروری ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے لئے تھوڑا سا وقت درکار ہے۔ ہم کو کوئی کچا قدم نہیں اُٹھانا چاہیے۔ شیخ صاحب کی باتوں سے ملک حامد سرفراز، فاروق بیدار، ملک پرویز، خرم واسطی اور آفتاب ربانی وغیرہ نے سخت اختلاف کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ کل صبح ہم کو ہر صورت جلوس نکالنا چاہیے۔ شیخ صاحب کا کہنا تھا کہ ہم کو اس جلوس کی پوری تیاری کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ پولیس تمام ورکرز کو گرفتار کر لے اور باہر کوئی کام کرنے والا ہی نہ رہے۔ اس طریقے سے شیخ صاحب دوسرے دن جلوس نکالنے کے ساتھ اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ مگر ملک حامد سرفراز اور دوسرے لوگ اس بات پر بضد تھے کہ صبح ہر صورت جلوس نکالا جائے گا۔ ہم لوگ شیخ صاحب کے پاس سے اُٹھ کر واپس ہوٹل آ گئے اور فیصلہ کیا گیا کہ کارکنوں کو کل کے جلوس میں شرکت کرنے کی اطلاع دی جائے۔ میں ہوٹل سے اُٹھ کر دوبارہ شیخ صاحب کے دفتر آ گیا اور اُن کو جلوس نکالنے کے بارے میں آگاہ کیا۔ اُنہوں نے وہاں بیٹھے ہوئے کارکنوں کو اِدھر اُدھر دوڑایا کہ کل کے جلوس کی کارکنوں کو اطلاع کرو۔ ہم لوگوں نے پوری کوشش کے ساتھ جلوس کی اطلاع پارٹی ورکرز تک پہنچائی۔ مگر وقت چونکہ بہت کم تھا، کچھ زیادہ لوگوں کو اطلاع نہ ہو سکی۔ مگر نوائے وقت اخبار میں جلوس نکالنے کی خبر شائع ہو جانے کی وجہ سے کچھ غیر کارکن لوگ بھی یعنی عام لوگ بھی صبح پارٹی کے دفتر کے سامنے جمع ہو گئے۔

لاہور میں ہمارا پہلا جلوس

ہم نے تمام جمع شدہ لوگوں کی دو دو لائنیں بنادیں اور اُن کو لمبی قطاروں میں کھڑا کر کے ملک حامد سرفراز کی قیادت میں جلوس کی شکل میں پارٹی دفتر سے مال روڈ کی طرف مارچ کرنا شروع کردیا۔ ہم اپنا یہ جلوس الفلاح سینما مال روڈ تک لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر الفلاح سینما کے سامنے پولیس نے ہمارے جلوس کو روک دیا۔ جلوس میں سب سے آگے ملک حامد سرفراز اور میں کھڑے تھے۔ پولیس آفیسر اصغر خان ہلاکو نے ہم کو جلوس کو منتشر کرنے کا کہا۔ اُس کے ساتھ ایک مجسٹریٹ بھی تھا۔ اُس نے کہا کہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی ہورہی ہے۔ اِس سے پہلے کہ آپ تمام لوگوں کو گرفتار کرلیا جائے، آپ لوگ یہاں سے منتشر ہو جائیں۔ جلوس کو ختم کردیں۔ کافی دیر تک وہاں تکرار جاری رہی۔

بالآخر پولیس نے جلوس کے پچھلے حصے پر لاٹھی چارج کرنا شروع کردیا۔ جلوس کے شرکا اِدھر اُدھر بھاگنا شروع ہو گئے۔ ہم لوگ فٹ پاتھ پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے تاکہ لوگوں کو ہم دکھائی دیتے رہیں۔ لوگ دور دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ ملک حامد سرفراز نے ورکروں کو کہا کہ لوگوں کو پارٹی دفتر واپس اکٹھا ہونے کا کہہ دیا جائے اور ملک صاحب اور میں نے پارٹی دفتر کی طرف چلنا شروع کردیا۔ لوگ ہر طرف سے ہمارے پیچھے آنا شروع ہو گئے اور ہم پارٹی دفتر پہنچ گئے۔ جب دفتر کے نیچے لوگوں کا دوبارہ ہجوم اکٹھا ہو گیا تو میں نے نظم پڑھنا شروع کردی۔ وہی نظم جس کا پہلا مصرع تھا ''اُٹھو کہ اب تو کوئی مصلحت نہیں باقی'' میری نظم کے بعد ملک حامد سرفراز نے تقریر شروع کردی۔ ابھی ان کی تقریر جاری تھی کہ پولیس نے دفتر کے نیچے کھڑے لوگوں پر لاٹھی چارج کرنا شروع کردیا۔ لوگ جس طرف راستہ ملا، بھاگ گئے۔ پولیس نے دفتر میں جتنے بھی کارکن تھے، اُن سب کو گرفتار کرلیا۔ اِس طرح ملک حامد سرفراز میاں عبدالستار نجم، ملک آفتاب ربانی، خرم واسطی، ملک پرویز اختر، ادریس کھٹانہ اور میرے سمیت 16 لوگوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ہم کو گرفتار کر کے تھانہ سول لائنز لے جایا گیا اور وہاں جا کر ہم کو حوالات میں بند کردیا گیا۔ ہم کو تقریباً گیارہ بجے دن کو گرفتار کیا گیا تھا۔ ایک بجے کے قریب سول لائن تھانہ میں بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید تشریف لائے اور ڈی۔ ایس۔ پی اصغر خان کو ملے اور میاں عبدالستار نجم کو آزاد کروا کر اپنے ساتھ

www.bhutto.org

لے گئے اور ہم تمام لوگ حوالات کی سلاخوں سے اُن کو تھانے سے باہر جاتا دیکھتے رہ گئے۔

ہمارا خیال تھا کہ وہ ہم تمام کارکنوں سے ملاقات کریں گے۔ ہمیں حوصلہ دیں گے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ شیخ محمد رشید صاحب کے اِس عمل سے گرفتار شدگان کو بہت صدمہ پہنچا۔ اُن کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ پہلے ہی یہ لوگ شیخ محمد رشید کے بھٹو کے ساتھ گرفتار نہ کئے جانے پر حرف گیری کر رہے تھے۔ بہت شکوک وشبہات کی باتیں کر رہے تھے۔

اب شیخ صاحب کے اکیلا نجم کو چھڑا کر لے جانے سے اور ہم کو ملے بغیر جانے کی وجہ سے اُن کے غیظ وغصب کا سورج سوانیزے پر آ کھڑا ہوا۔ ان تمام قیدیوں میں شیخ صاحب کا ایک میں ہی حمایتی کارکن اُن کو نظر آتا تھا۔ میں نے شیخ صاحب کی یہ کہہ کر حمایت کی تھی کہ شیخ صاحب جلوس نہ نکالنے کے حق میں اِس لئے تھے کہ اُن کو خطرہ تھا کہ پولیس تمام ورکرز کو پہلے دن ہی گرفتار کر لے گی۔ اس کے بعد جلوس نکالنے والا کوئی باہر نہ رہ جائے گا۔ مگر ملک حامد سرفراز اور اُن کے ساتھی میری اِس بات سے اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ ابھی ہم میں یہی باتیں چل رہی تھیں کہ شیخ صاحب کا تھانے والا معاملہ پیش آ گیا۔ لہٰذا میرے پاس شیخ صاحب کی حمایت میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

اس طرح پاکستان پیپلز پارٹی میں اندرونی اختلافات کے سلسلے کا پہلی مرتبہ آغاز کچھ اِس طریقے سے ہوا تھا۔ اِس سے پہلے پارٹی کے اندر کسی قسم کے اختلاف کی کوئی بات نہیں تھی۔ پارٹی کے کارکن ملک حامد سرفراز کو جلوس نکالنے کی وجہ سے پارٹی کا ہیرو قرار دے رہے تھے اور شیخ صاحب پر شک کا اظہار کرنے لگ گئے تھے۔ واضح رہے کہ شیخ صاحب پر شک کرنے والے اور اُن کے خلاف باتیں کرنے والے صرف وہ لوگ تھے جو ملک حامد سرفراز کے حلقہ اثر کے لوگ تھے جو آگے آنے والے وقت میں بہت ہی جلدی پارٹی چھوڑ کر چلے جانے والوں میں سب سے آگے تھے۔ وہ بہت ہی مختصر وقت میں پارٹی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی میں اختلافات کا آغاز

پارٹی میں اختلاف کا آغاز ملک حامد سرفراز اور اُس کے ساتھیوں کی طرف سے کیا گیا تھا۔

www.bhutto.org

اُن کا پہلا ہدف شیخ محمد رشید تھے۔ سول لائن تھانے کی حوالات میں ہمارے ایک ایسا لڑکا بھی پکڑا گیا تھا جس کی ماں گنگا رام ہسپتال میں داخل تھی اور وہ اپنی ماں کیلئے دوائیاں لے کر ہسپتال جا رہا تھا کہ راستے میں پارٹی کے دفتر میں ہمارا جلسہ ہو رہا تھا۔ وہ ہماری تقریریں سننے کیلئے وہاں کھڑا ہو گیا اور پولیس نے اُس کو گرفتار کر لیا۔ ہمارا اصغر خان ہلاکو سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ اِس لڑکے کو آزاد کر دے۔ نجم کی رہائی کے بعد ملک حامد سرفراز نے اصغر خان کے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا۔ اُس کو کہا کہ تم اگر ایک آدمی کو رہا کر سکتے ہو تو دوسرے آدمی کو رہا کرنے میں تمہیں کیا اعتراض ہے۔ اصغر خان کا جواب یہ تھا شیخ محمد رشید صاحب نے کہا ہے کہ نجم اُن کا جونیئر ہے اور پولیس اُس کو وکالت کے دفتر سے پکڑ کر لائی ہے۔ اُس کو جلوس سے نہیں پکڑا گیا۔ لہٰذا شیخ صاحب کے کہنے پر ہم نے اُن کے جونیئر کو چھوڑ دیا ہے۔ ہم تمام گرفتار شدگان نے اصغر خان کو اُس لڑکے کی ماں کی دوائیاں دکھائیں جس کے بعد اُس نے اس لڑکے کو بھی رہا کر دیا۔

ہم تمام گرفتار شدگان کو سول لائن تھانے کی حوالات سے شام کو کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا اور ہم پر شہر میں توڑ پھوڑ کرنے اور توڑ پھوڑ کرانے کے الزامات عائد کر دیئے گئے۔ دو تین دن کے بعد ضلع کچہری لاہور میں ایک مجسٹریٹ کے سامنے ہماری رہائی کی درخواست دی گئی۔ اُس مجسٹریٹ کے سامنے پولیس نے میرے بارے میں خاص طور پر کہا کہ حکومت نے اس کی ہمشیرہ کی وفات کی وجہ سے اِس کو بھٹو صاحب کے ساتھ گرفتار نہیں کیا تھا مگر بد قسمتی سے اِس نے حکومت کی مہربانی کا صلہ یہ دیا ہے کہ یہ طالب علموں کو بغاوت کی نظمیں پڑھ کر اُن کو بغاوت پر آمادہ کرتا ہے اور توڑ پھوڑ کرواتا ہے۔ مجسٹریٹ نے چند لوگوں کو رہائی کے احکامات جاری کر دیئے مگر میری اور ملک حامد سرفراز کی درخواست مسترد کر دی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ دونوں حضرات جلوس نکالنے اور پولیس پر پتھراؤ کروانے کے ذمے دار ہیں۔

جیل میں ملک حامد سرفراز کے ساتھ شیخ رشید صاحب کے بارے میں بڑی کھل کر بات ہوتی رہتی تھی۔ میرا ملک صاحب سے یہ آرگومنٹ تھا کہ آپ کے دوست شیخ صاحب کی گرفتاری کی بات کرتے ہیں۔ یہ بات ملک صاحب آپ پر بھی تو کوئی لاگو کر سکتا تھا۔ آپ بھی تو ایک اہم ترین لیڈر تھے۔ اگر آپ کے گرفتار نہ کیے جانے پر کسی کو کوئی شک نہیں گزرا تو کسی دوسرے کے گرفتار نہ ہونے پر بھی کسی کو غلط بات نہیں کرنی چاہیے۔

www.bhutto.org

10 روز کے بعد لاہور ہائی کورٹ سے میری اور ملک حامد سرفراز کی رہائی عمل میں آئی۔ جیل سے واپس آ کر دوستوں کے ساتھ ملاقات کا دوبارہ سلسلہ اور تعلق قائم ہو گیا۔ چائنز لنچ ہوم میں صبح شام بیٹھنا پھر سے شروع ہو گیا۔ چائنز لنچ ہوم سے کچھ لوگوں نے شیخ محمد رشید کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کر لیا۔ ان محاذ قائم کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ملک نوید، خرم واسطی، آفتاب ربانی، فاروق بیدار اور احسان وائیں تھے۔ ملک حامد سرفراز ہر چند اِن لوگوں کے پیش امام تھے مگر وہ کچھ محتاط بات کیا کرتے تھے مگر یہ لوگ شیخ صاحب کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے نزدیک نہ تو ایوب خان کی آمریت کوئی مسئلہ تھی اور نہ بحالی جمہوریت کوئی قضیہ تھی، نہ آئین اور قانون کی عملداری کی کوئی اہمیت تھی اور نہ ہی بھٹو صاحب کی گرفتاری ان کا کوئی مسئلہ تھی۔ اُن کا کام صرف شیخ رشید کا مذاق اُڑانا ہوتا تھا۔ اِن لوگوں کی باتوں سے نوآموز سیاسی کارکنوں کے ذہن بہت متاثر ہوا کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی کے مخالفین ان کی باتوں سے بہت خوش ہوا کرتے تھے۔ اِن میں سے نہ تو کبھی کوئی جیل گیا تھا اور نہ کبھی کوئی مارشل لاء کے خلاف جلوس میں شامل ہوتا تھا۔ نہ کوئی تقریر کرتا تھا۔ اِن تمام گونگے پہلوانوں کا کام صرف پیپلز پارٹی اور شیخ محمد رشید کی مخالف کرنا ہوتا تھا۔ پارٹی کے ہر احتجاجی فیصلے سے اختلاف کرنا اور پارٹی کے لیڈروں پر تنقید کرنا ہی اِن کا کاروبار تھا۔

میں نے شیخ محمد رشید صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ ملک حامد سرفراز کے ساتھ باہمی مشورہ کر کے تحریک کو آگے بڑھانے کی بات چیت کریں۔ شیخ رشید صاحب نے ملک حامد سرفراز کو مجھے پارٹی دفتر بلا لانے کو کہا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ ملک حامد سرفراز پارٹی دفتر چلیں مگر درمیان میں پھر وہی لوگ حائل ہو گئے جو پہلے حائل تھے۔

سرگودھا کا احتجاجی جلوس

اسی دوران ممتاز احمد کاہلوں صاحب لاہور تشریف لائے۔ ممتاز احمد کاہلوں پیپلز پارٹی سرگودھا کے پہلے صدر تھے۔ شیخ رشید صاحب اُس وقت پارٹی دفتر میں موجود نہ تھے۔ میں ممتاز احمد کاہلوں کو چائنز لنچ ہوم میں ملک حامد سرفراز کے پاس لے گیا۔

ممتاز احمد کاہلوں نے کہا کہ میں شیخ رشید صاحب کو سرگودھا بلانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش

www.bhutto.org

ہے کہ پارٹی کے لیڈر سرگودھا تشریف لا کر کارکنوں کی حوصلہ افزائی کریں اور اُن کو پارٹی لائن دیں۔ تاکہ کارکنوں کو علم ہو سکے کہ موجودہ صورتحال میں اُن کو کیا کردار ادا کرنا ہے۔ ملک حامد سرفراز نے ممتاز احمد کاہلوں کے ساتھ سرگودھا کے دورے کی تاریخ طے کر لی۔ طے پا گیا کہ اِس ملاقات کے دو دن بعد ہم لوگ سرگودھا پہنچ جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ ملک حامد سرفراز شیخ رشید صاحب کو ساتھ چلنے کے لئے کہیں گے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ لہٰذا ملک حامد سرفراز اور میں پروگرام کے مطابق مقررہ دن سرگودھا پہنچ گئے۔ سرگودھا میں ایک مکان کی دوسری منزل پر پیپلز پارٹی کا دفتر بنایا گیا تھا۔ اِسی دفتر میں سرگودھا کے پیپلز پارٹی کے کارکن جمع تھے۔ کارکنوں میں بہت جوش وخروش تھا۔ یہاں پر پہلی مرتبہ میری ملاقات میاں جمیل اختر ایڈووکیٹ کے ساتھ ہوئی جو اُس وقت شعلہ جوالا تھا (مگر صد افسوس کے چیئرمین بھٹو کی پھانسی کے وقت جب ضیاء الحق حکمران تھا، اُس وقت اُس کی سیاست نے مجھے بے حد مایوس کیا تھا۔ وہ شخص ضیاء حمایت تحریک کا عہدے دار بن گیا تھا) اس کی وجہ شاید اس کا جالندھر کا آرائیں ہونا تھی۔ اس لئے کہ ضیاء الحق بھی جالندھر کا آرائیں تھا۔ اس کے علاوہ میں نے سجاد بخاری کو بھی دیکھا تھا جو اُس وقت شاید کسی سکول کا طالب علم تھا۔ میں نے سرگودھا کے کارکنوں کے اِس اجتماع میں اپنی تازہ ترین نظم، جو بھٹو صاحب کی گرفتاری کے بعد تخلیق کی تھی، سرگودھا میں پہلی بار پڑھی تھی۔ نظم کا عنوان تھا ''آگ اور خون۔''

آگ اور خون

بھڑک اُٹھے ہیں شرارے وطن کی عظمت کے
چمک اُٹھے ہیں میری قوم کے جواں بچے
لہو حمید کا چہروں پہ مل کے نکلے ہیں
ہر ایک شہر میں مظلوم و خوں چکاں بچے

○

یہ اس نظام کا تختہ الٹنے نکلے ہیں
کہ جو نظام فقط گولیوں پہ چلتا ہے
یہ قاتلوں کے نشیمن جلانے نکلے ہیں

www.bhutto.org

ہمارا خون جہاں تیل بن کے جلتا ہے

○

ہر ایک شہر میں پھیلی ہے آگ نفرت کی
وہ آگ جس میں لہو بھی شمار ہوتا ہے
دلوں کی آگ بجھانا تمہارے بس میں نہیں
کہ حشر خیز دلوں کا شرار ہوتا ہے

○

لپک لپک کے یہ اہلِ ستم کے مسکن کو
دِلوں کی آگ کے شعلے تلاش کرتے ہیں
یہ آگ اب کسی گولی سے بجھ نہیں سکتی
دلوں کے عزم کہیں گولیوں سے مرتے ہیں

○

یہ کشت و خون بہت جلد رنگ لائے گا
رگوں میں گرم ہے اب انتقام کا جذبہ
یہ خاک و خوں کے بگولے ٹھہر نہیں سکتے
نہ دب سکے گا عدو عوام کا جذبہ

○

جو لوگ ان کے تشدد سے جان فگار ہوئے
وہ قاتلوں کے بھی سر کو اتار سکتے ہیں
وہ جن کے جسم ہوئے ان کے ہاتھ سے چھلنی
وہ لوگ ان کو بھی گولی سے مار سکتے ہیں

○

عوام اب کسی آمر سے ڈر نہیں سکتے
عوام نعرہ بلب اشکبار نکلے ہیں

www.bhutto.org

مقابلے کے لئے اب عوام کو لے کر
دغا کے دشت میں اب ذوالفقار نکلے ہیں

○

وطن کے چاہنے والے پڑے ہوں جیلوں میں
اب اس سے بڑھ کے ستم اور اے خدا کیا ہے
اُٹھو کہ آگ لگا کر جلائیں زنداں کو
وطن کے چاہنے والو! تمہیں ہُوا کیا ہے

○

مرے وطن کے جواں ذوالفقار، زندہ باد
شجاعتوں کے نشان ذوالفقار، زندہ باد
کلیمِ شعلہ بیاں ذوالفقار، زندہ باد
تو قوم کی ہے زباں ذوالفقار، زندہ باد

○

میری نظم کے بعد ملک حامد سرفراز نے کافی لمبی تقریر کی۔ تقریر کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ جلوس نکالا جائے۔ یہ جلوس پچاس ساٹھ آدمیوں سے زیادہ نہ تھا۔ جلوس کچہری کی طرف چلنا شروع ہو گیا۔ جلوس جب سرگودھا کی مرکزی سڑک پر پہنچ گیا تو پولیس نے جلوس کا راستہ روک لیا۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ کچہری جا کر جلوس ختم کریں گے۔ مجسٹریٹ کی ضد تھی کہ جلوس کو یہیں پر ختم کر دیا جائے۔ مگر ملک حامد سرفراز صاحب جلوس کو کچہری تک لے جانے پر بضد تھے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ آگے چوک میں آ کر جلوس کو ختم کر دیں۔ مجھے ممتاز احمد کاہلوں نے کہا کہ ملک صاحب کو کہو۔ ٹھیک ہے، چوک میں جا کر جلوس کو ختم کر دیں۔ مگر وہ اُس وقت اپنے جلو میں آ چکے تھے۔ اُنہوں نے دھکا دے کر مجسٹریٹ کو ایک طرف کر دیا اور آگے جانا شروع کر دیا۔

آگے راستے میں ہی سرگودھا سٹی کا تھانہ تھا۔ پولیس نے جلوس کو ہر طرف سے گھیر لیا اور گھیرے میں لے کر تھانے کی طرف چلنے کا کہا۔ پولیس کی تعداد زیادہ تھی، جلوس کی تعداد کم تھی

www.bhutto.org

لہٰذا پولیس نے جلوس کے تمام شرکاء کو گرفتار کرلیا۔صرف ممتاز احمد کاہلوں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔اُن کا آزاد رہ جانا ہمارے لئے فائدے مند ثابت ہوا۔اِس لئے کہ تھانے میں کھانے پینے کا بندوبست، پھر کاہلوں صاحب کو ہی کرنا پڑا تھا۔رات ہم سب نے تھانے کی حوالات میں گزاری۔رات میں نے ملک حامد سرفراز کو کہا کہ اچھا بھلا مجسٹریٹ ہم کو چوک تک جانے کا موقع دے رہا تھا۔آپ نے خوامخواہ اُس کو دھکا دے دیا۔ملک صاحب فرمانے لگے۔جلوس کی خبر اِسی طریقے سے بنوائی جاتی ہے۔میں دو آدمیوں یعنی دو لیڈروں کے ساتھ جلوس لے جانے سے بہت گھبراتا تھا۔ایک کا پہلے ذکر کیا جا چکا تھا، وہ خواجہ محمد رفیق تھے۔وہ اپنے ہی کارکنوں کو تھپڑ مار کر پولیس کو ڈرایا کرتے تھے۔دوسرے ملک حامد سرفراز تھے۔وہ اچھا بھلا جلوس جا رہا ہوتا تھا، مجسٹریٹ کو تھپڑ وغیرہ مار دیا کرتے تھے۔میں نے اپنی سیاسی زندگی میں ایسا کوئی جلوس نہیں دیکھا جس میں ملک حامد سرفراز ہوں اور اِس جلوس پر لاٹھی چارج نہ ہوا ہو۔

صبح ہم سب کو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا کر سرگودھا جیل پہنچا دیا گیا۔شام تک تو جلوس کے تمام گرفتار شدگان کو جیل کی ڈیوڑھی میں بٹھائے رکھا گیا۔شام کے وقت صرف ملک حامد سرفراز کو جیل کے اندر لے گئے اور ہم لوگوں کو جیل کی ڈیوڑھی سے باہر نکال کر آزاد کر دیا گیا۔ملک حامد سرفراز پر الزام تھا کہ اُس نے مجسٹریٹ کو تھپڑ مارا ہے۔ہم تمام گرفتار شدگان نے جیل کے باہر دھرنا دیا کہ ملک حامد سرفراز کو آزاد کر دو تو ہم جائیں گے ورنہ ہم کو بھی جیل کے اندر لے جاؤ۔یہ احتجاج رات 8 بجے تک جاری رہا۔ممتاز کاہلوں اور دوسرے لوگوں نے ہمارا احتجاج ختم کروا دیا اور میں بس میں بیٹھ کر لاہور واپس آ گیا۔لاہور آ کر شیخ محمد رشید صاحب سے پارٹی دفتر میں ملاقات ہوئی۔وہ میرے سرگودھا جانے پر بہت ناراض تھے۔اُن کا شکوہ تھا کہ اُن کو بائی پاس کیا گیا ہے۔اُن کو مجھ سے گلہ تھا کہ میں ممتاز کاہلوں کو ملک حامد سرفراز کے پاس کیوں لے کر گیا تھا۔میری اُن سے گذارش یہ تھی کہ شیخ صاحب آپ دفتر میں موجود نہیں تھے۔ممتاز احمد کاہلوں کو واپس جانے کی جلدی تھی۔اُس وقت ملک حامد سرفراز ہی ایک ایسے لیڈر تھے جو دستیاب تھے لہٰذا ممتاز احمد کاہلوں کی ملک حامد سرفراز سے ملاقات کرا دی گئی۔ملک صاحب نے سرگودھا جانے کا پروگرام ہی اتنا جلدی طے کر لیا کہ آپ کے ساتھ ملاقات کا موقع ہی نہ مل سکا۔میں نے شیخ رشید

www.bhutto.org

صاحب سے پوچھا۔ شیخ صاحب! ملک حامد سرفراز کا آپ کے ساتھ کچھ اختلاف ہے۔ کیا بات ہے کہ اُس وقت تو ہم تمام لوگ ایک مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔ اِس وقت تو ہمارے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہونا چاہیے۔ شیخ محمد رشید ملک حامد سرفراز کے پرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ کہنے لگے کہ میرا حامد سرفراز کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ملک حامد سرفراز کی سیاست ہمیشہ گروپ بندی کی سیاست رہی ہے۔ وہ جس جماعت میں بھی جاتا ہے، اپنا گروپ بناتا ہے اور اپنی سیاست میں وہ سولوفلائٹ کا قائل ہے۔ وہ کبھی بھی کسی پارٹی کے نظم وضبط کو خاطر میں نہیں لایا کرتا۔ اُس کی سیاست کوئی نظریاتی سیاست نہیں ہوا کرتی۔ وہ اُس کی اپنی ذات کی سیاست ہوتی ہے۔ اُس کی اِس قسم کی سیاست بازی کی وجہ سے وہ ہمیشہ نیو۔ اے سینسی بن جایا کرتا ہے۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں بھی ویسی ہی روش اپنانا چاہتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ ابھی تو اِس جنگ کا آغاز ہی ہوا ہے۔ ابھی تو ہم کو بہت لمبی جدوجہد کرنی ہے۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ اِس جدوجہد میں کون ثابت قدم رہتا ہے۔ ملک صاحب کی رہائی کیلئے لاہور ہائی کورٹ میں رِٹ داخل کردی گئی اور کچھ دنوں کے بعد ملک صاحب کو ہائی کورٹ کے حکم پر آزاد کردیا گیا۔ شیخ صاحب کی نظر تحریک کو ایک تسلسل کے ساتھ قائم رکھنے پر بہت زیادہ تھی۔ اُنہوں نے مجھے جو مشورہ دیا کہ تم سب سے زیادہ لاہور پر توجہ دو۔ لاہور کو اپنی نظموں سے گرماؤ۔ طالب علموں کے جلوسوں میں شرکت کرو۔ مزدوروں کے جلوسوں میں جاکر نظمیں پڑھو۔ پارٹی کارکنوں کی ریلیوں کی قیادت کرو۔ لاہور کا مال روڈ بند رہنا چاہیے۔ لاہور ہی حکمرانوں کی کمر توڑ سکتا ہے۔ لاہور سے باہر خواہ کتنے بڑے بھی جلوس نکال لئے جائیں، اُن کی خبر بھی کسی کو نہیں ملے گی۔ لاہور کا چھوٹا سا جلوس بھی اخبار کی خبر بن جائے گا۔ شیخ صاحب نے مجھے کہا کہ ابھی تھوڑی دیر میں فتنہ آنے والا ہے۔ وہ کل طالب علموں کا جلوس نکال رہا ہے۔ اُس سے مل کر کل کا پروگرام بناؤ اور مجھ سے پوچھ کر لاہور سے باہر جانا۔ میں شیخ صاحب کی بات پر بہت حیران ہوا کہ یہ فتنہ کیا چیز ہے۔

افتخار احمد فتنہ کے ساتھ ملاقات

ابھی یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک گورا سا لڑکا تین چار لڑکوں کے ساتھ دفتر آ گیا۔ اُس

www.bhutto.org

کے ساتھ تعارف ہوا کہ یہ افتخار فتنہ ہے۔ وہ بہت تیز طرار قسم کی چیز تھا۔ وہ بے حد مشتعل، بے حد سیماب پا، بے حد منہ پھٹ، عجیب قسم کا لڑکا تھا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھ سے وہ شاعرِ عوام کہہ کر مخاطب ہوا۔ ورنہ وہ ہر کسی کے ساتھ صیغہ واحد میں بات کر رہا تھا۔ ہر چند وہ مجھے شاعرِ عوام کہہ کر کل کے جلوس میں شریک ہونے کی دعوت دے رہا تھا مگر اُس کا انداز کچھ یوں تھا کہ جس طرح کہ وہ مجھے کہتا ہو کہ اوے شاعر کل جلوس میں آ جانا۔ وہ چند منٹ تک دفتر میں ٹھہرا۔ وہ دفتر کا تمام سکون درہم برہم کر کے چلتا بنا۔ خدا جانے وہ انسانی نفسیات کا کوئی ماہر تھا جس نے اِس کا نام فتنہ تجویز کیا تھا۔ وہ واقعتاً فتنہ تھا۔ اُس کی باڈی ٹاک ہی فتنہ پردازی کا شاہکار تھی۔ گویا وہ سراپا فتنہ تھا۔ میں نے شیخ صاحب کو کہا کہ شیخ صاحب! یہ کیا چیز تھی۔ شیخ صاحب اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ جس میں شیخ صاحب کے تمام دانت ظاہر ہو جایا کرتے تھے کہنے لگے۔ ''فتنہ۔'' واضح رہے کہ اس سے پہلے میں نے فتنہ صاحب کو پارٹی کے تاسیسی اجلاس میں مندوبین کے کارڈ بناتے دیکھا تھا۔

دوسرے دن صبح 10 بجے میں یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچ گیا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں وہاں سوڈیڑھ سو لڑکا جمع ہو گیا۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد جلسے کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ تلاوت کے بعد فتنہ صاحب نے مختصر تقریر کر کے مجھے نظم پڑھنے کو کہا۔ میں نے اپنے معمول کے انداز میں نوجوانوں کو نظم ''بغاوت'' پڑھ کر آگ بگولا کر دیا۔ میری نظم کے ختم ہونے کے ساتھ ہی یہ ٹڈی دل پرانی انارکلی کی طرف چل نکلا اور دیکھتے ہی دیکھتے مال روڈ پر پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اِن بچوں نے اڈلجی یعنی شراب کی دوکان پر پتھراؤ کیا۔ اِس کے بعد مال روڈ کو مکمل طور پر بند کر دیا۔ دونوں جانب سے آنے والی گاڑیاں روک دی گئیں اور ٹریفک کا نظام مکمل طور پر معطل کر دیا گیا۔ لڑکوں نے پولیس پر پتھراؤ کیا۔ پولیس نے اِن لڑکوں پر آنسو گیس پھینکی۔ اِس طرح پولیس اور لڑکوں کا ٹکراؤ تمام دن چلتا رہا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا دفتر قائم کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ لوگ خود آ کر جلوس نکالنے کی اطلاع دیا کرتے تھے اور ہم لوگوں کو جلوسوں میں شرکت کا کہا کرتے تھے۔ فتنے کے جلوس کے بعد چند مزدور لیڈر دفتر آئے اور اُنھوں نے واپڈا کے مزدوروں کے جلوس کے بارے میں بتایا کہ واپڈا کے مزدور اور کچھ دوسرے شعبوں کے مزدور مہنگائی کے خلاف جلوس نکالیں گے۔

www.bhutto.org

اُنہوں نے مجھے نظم پڑھنے کی دعوت دی۔دوسرے دن میں لکشمی چوک پہنچ گیا جہاں پر مزدوروں کی بھاری تعداد جمع تھی ۔جلوس کے آغاز میں مجھ سے نظم پڑھوائی گئی۔ میں نے ابھی نظم ختم ہی کی تھی کہ پولیس نے لاٹھی چارج شروع کر دیا۔آنسو گیس پھینکنا شروع کر دی۔تمام مزدور اِدھر اُدھر بھاگ کر منتشر ہو گئے۔ کچھ مزدور اسٹیشن کی طرف چلے گئے۔راستے میں اُنہوں نے اومنی بس کو آگ لگا کر اپنا غصہ ٹھنڈا کیا۔

انتظامیہ نے بس کو آگ لگانے والوں میں میرا نام بھی شامل کر دیا۔ایف۔آئی۔آر کے مطابق شاعر اسلم گورداسپوری اور کچھ نامعلوم لوگوں نے بس کو آگ لگائی اور پولیس پر پتھراؤ کیا تھا۔ اِن پتھراؤ کرنے والوں اور آگ لگانے والوں کی قیادت اسلم گورداسپوری کر رہا تھا۔

رات کو مجھے گرفتار کر لیا گیا۔دوسرے دن شام کو مجھے کوٹ لکھپت جیل بھیج دیا گیا۔ اِس مرتبہ معاملہ بڑا ٹیڑھا پڑ گیا۔کئی دن تک میری رہائی نہ ہو سکی۔تقریباً 15 دن کے بعد ہائی کورٹ سے میری رہائی ممکن ہو سکی مگر بس جلانے کا مقدمہ مجھ پر بہت لمبے عرصہ تک چلتا رہا۔

میری رہائی تو ہو گئی مگر لاہور کی پولیس بُری طرح میرے پیچھے پڑ گئی۔ جہاں بھی کوئی واقعہ ہوتا، پولیس اُس میں میرا نام ڈال دیتی تھی۔پیپلز پارٹی میں جو لوگ دوسری تنظیموں سے آ کر شامل ہوئے تھے، وہ بہت سیانے تھے۔وہ نہ تو کسی سٹیج پر چڑھتے تھے اور نہ تقریر کرتے تھے۔مثال کے طور پر بس جلانے والے جلوس میں مجھے لیبر لیڈر ضیاالدین بٹ ساتھ لے کر گیا تھا مگر بس جلانے کا پرچہ میرے خلاف کاٹا گیا تھا۔ مجھے نظم پڑھنے کے لئے سامنے آنا پڑتا تھا جس کی وجہ سے میں ہر جلوس میں نظر آجاتا تھا۔ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ میں جلوس میں شامل ہی نہ تھا اور نہ میں نے نظم پڑھی تھی مگر پولیس نے پرچے میں میرا نام شامل کر دیا تھا۔ جب تک چیئرمین بھٹو جیل میں رہے، پولیس نے مجھے شٹر کاک بنائے رکھا۔13 نومبر 1968ء سے لے کر 30 فروری 1969ء تک یعنی اِن چار ماہ میں مجھے 10 مرتبہ گرفتار کیا گیا تھا اور میرے خلاف 4 مقدمے بنائے گئے تھے۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی نظر بندی کے خلاف مقدمہ کی سماعت شروع ہوگئی۔ اخبار کا عکس

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی نظر بندی کیخلاف مقدمہ کی سماعت شروع

ہوم سیکرٹری کا بیان اور مسٹر قصوری کی طویل جرح

ہائی کورٹ کا سپیشل بنچ پرسنل جیل میں آج بھی سماعت جاری رکھے گا

[illegible]

[illegible]

[illegible]

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کو ساہیوال جیل سے لاہور بورسٹل جیل میں منتقل کر دیا گیا

روزنامہ نوائے وقت کی 10 جنوری 1969ء کے مطابق چیئرمین بھٹو کو 7 جنوری کو ساہیوال جیل سے لاہور بورسٹل جیل عدالتِ عالیہ کے حکم پر منتقل کیا گیا جہاں 10 جنوری کو ان کے مقدمے کی سماعت کا آغاز کر دیا گیا۔ مسٹر بھٹو کمرہ عدالت میں موجود تھے۔ آپ کاڈرائے کے سوٹ اور بوسکی کی قمیص میں خوش وخرم نظر آتے تھے۔ ساہیوال جیل جس کو پنجاب کی سب سے زیادہ سخت جیل قرار دیا جاتا ہے وہاں پر لاہور منتقل ہونے سے چند روز پہلے مسٹر بھٹو نے احتجاجاً ڈاڑھی بڑھالی تھی انہوں نے شیو کرنا چھوڑ دیا تھا۔ جو لاہور جیل میں منتقلی کے ساتھ ہی انہوں نے صاف کر دی تھی۔ آپ نے کمرۂ عدالت میں اپنی ایک بیٹی اور دو بیٹوں کے ساتھ ملاقات کی۔ ملاقات کے موقعہ پر انہوں نے پدرانہ شفقت کا پُر جوش مظاہرہ کیا۔ کمرۂ عدالت سے باہر بورسٹل جیل کے بڑے دروازے کے نزدیک پیپلز پارٹی کے چند کارکن اور طلباء جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے پٹاخے چلا کر مسٹر بھٹو کو سلامی دی اور بھٹو زندہ باد کے نعرے لگائے۔

مولوی مشتاق نے مقدمے کا آغاز کر دیا

مولوی مشتاق نے مقدمے کے شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے درخواست دہندہ کے وکیل کو بتایا کہ اس کمرۂ عدالت میں تھوڑے لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے مگر مسٹر بھٹو نے پیغام پہنچایا ہے کہ وہ اس وقت تک کمرۂ عدالت میں نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ ان کے کم از کم 20 لواحقین کو یہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ فاضل جج نے کہا کہ ہم بیگم بھٹو کا احترام کرتے ہیں۔ کیوں وہ خاتون ہیں اور درخواست دہندہ ہیں۔ مگر ان کو دھمکی آمیز رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔ عدالت اس قسم کے رویے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

چیف جسٹس مولوی مشتاق کے اس ریمارکس پر مسٹر بھٹو اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ یہ کہہ کر واک آوٹ کرنے لگے کہ عدالت میں میری اور میرے خاندان کی توہین کی جارہی ہے۔ عدالت دھمکی دے رہی ہے۔ میں یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ چیف جسٹس مولوی مشتاق آپ اس کمرۂ عدالت سے باہر نہیں جاسکتے۔ آپ کو علم ہونا چاہئے کہ آپ اس وقت عدالت کی تحویل میں ہیں۔ آپ بیٹھ جائیں۔

www.bhutto.org

مسٹر بھٹو۔ میں یہ توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ جو چاہیں میرے خلاف کارروائی کریں۔ میں یہاں نہیں بیٹھوں گا۔ مولوی مشتاق۔ مسٹر بھٹو آپ کمرۂ عدالت سے باہر نہیں جاسکتے۔ مسٹر بھٹو میں یہاں نہیں بیٹھوں گا آپ جو کرنا چاہیں کریں۔ مولوی مشتاق آپ کو یہاں بیٹھنا ہوگا۔ آپ ایک بیرسٹر ہیں آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ آپ کمرۂ عدالت میں ہیں۔ مہربانی فرما کر بیٹھ جائیں۔ مسٹر بھٹو جو کمرۂ عدالت سے باہر جارہے تھے ان کو ان کے وکیل مسٹر محمود علی قصوری نے پکڑ لیا اور ان کو ترغیب دے کر ان کو ان کی نشست پر بٹھا دیا۔ جب مسٹر بھٹو اپنی نشست پر عدالت میں بیٹھے ہی تھے کہ توعین اس وقت بیگم بھٹو اپنے تین بچوں کے ساتھ کمرۂ عدالت میں داخل ہوگئیں۔ مسٹر بھٹو نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ ان کی آمد کے بعد عدالت کی کارروائی خوشگوار ماحول میں شروع ہوگئی۔ عدالت کی کارروائی کا آغاز صوبائی ہوم سیکرٹری مسعود نبی نور کے بیان سے شروع ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ حکومت نے مختلف شہروں سے موصول ہونے والی رپورٹوں سے تاثر لیا تھا کہ صوبہ میں امن وامان اور نظم ونسق کی حالت تیزی سے خراب ہورہی ہے۔ لوٹ مار، توڑ پھوٹ، آتش زدگی، غنڈہ گردی کا سلسلہ جو کراچی شہر سے شروع ہوا تھا۔ اس کی لپیٹ میں صوبے کے دوسرے علاقے بھی آگئے ہیں۔ (اس وقت پورا مغربی پاکستان ہی ایک صوبہ تھا) مسٹر بھٹو نے جب صوبہ مغربی پاکستان کا دورہ شروع کیا تھا۔ اس وقت طلباء اور مزدوروں میں کچھ بے چینی پائی جاتی تھی۔ مسٹر بھٹو نے اپنے دورے کا آغاز حیدرآباد سے کیا۔ انہوں نے حیدرآباد میں 21 ستمبر کو پیپلز پارٹی کے کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے طلباء کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ حکومت کی طرف سے طلباء پر جو ظلم کیئے جارہے ہیں، طلباء ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں، جدوجہد شروع کریں۔ پیپلز پارٹی اس جدوجہد میں ان کے ساتھ ہوگی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ طلباء کی یادگاریں قائم کی جائیں گی۔ ملک کے مختلف علاقوں میں ان کی یادگاریں تعمیر کی جائیں گی۔ اسی قسم کا وعدہ انہوں نے چارسدہ میں 27 اکتوبر کو بھی کیا تھا۔ مسٹر بھٹو نے کہا تھا۔ وہ وقت آئے گا جب ملک میں خون خرابہ ہوگا۔ یہ میری پیشین گوئی نہیں کامن سینس ہے۔ کہا جائے گا کہ میں بغاوت پھیلا رہا ہوں۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں بغاوت پھیلاؤں گا۔ میں ڈرتا نہیں ہوں۔ ''میں سب سے پہلے اپنا خون دوں گا۔''

انقلاب میں خون خرابے سے ہم نہیں ڈرتے ہم سر پر کفن باندھ کر نکلے ہیں اور اپنی کشتیوں

www.bhutto.org

کو جلا دیا ہے۔انہوں نے 28 اکتوبر کو کوہاٹ میں کہا۔صدر ایوب خان نے بہت مظالم کئے ہیں۔ بہت خون بہایا ہے۔عوام بزدل نہیں ہیں۔مسٹر بھٹو نے کہا کہ اگر موجودہ حکومت میرے حق میں دستبردار نہ ہوئی تو میں بہ زورِ قوت اقتدار پر قبضہ کرلوں گا۔اگرچہ میرے پاس پستول نہیں ہے۔مگر میں اپنے بھائیوں، طلباء، مزدوروں، کسانوں کو اس مقصد کے لئے استعمال کروں گا۔انہوں نے کہا تھا کہ حکومت کمزور ہو چکی ہے اب اس کو صرف آخری ٹھوکر کی ضرورت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ایوب حکومت کو مشرقی پاکستان کا خیال ہی نہیں تھا

مغربی پاکستان کی اسٹیبلیشمنٹ مشرقی پاکستان کے معاملے میں بالکل بے نیاز تھی۔اُس کی سازش کا تمام نظام مغربی پاکستان میں صرف ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ہی کارفرما تھا۔صرف مغربی پاکستان تک ہی محدود تھا۔مشرقی پاکستان کی سیاست کے ساتھ اُس کا کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدر ایوب خان کی حکومت کا دعویٰ یہ تھا کہ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔وہ پاکستان کے دو ٹکڑے کرنا چاہتا ہے۔وہ پاکستان کے وفاق کی سیاست پر یقین نہیں رکھتا۔وہ چھ پوائنٹ پر اپنی سیاست مرکوز کر چکا ہے۔وہ پاکستان سے مکمل طور پر الوف ہو چکا ہے۔اس صورت میں سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں پاکستان کی حامی قوتوں کو اکٹھا کیا جاتا۔اُن کو سیاست کرنے کا موقع دیا جاتا تا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کی علیحدگی کا راستے روکتے۔مجیب الرحمٰن کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کا کوئی مقبول بنگالی لیڈر پیدا کیا جاتا جو بنگالی عوام کو ایک اعتدال پسند سیاست کی طرف لاتا۔مجیب الرحمٰن کے چھ پوائنٹ کے غبارے سے ہوا نکالتا۔مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس دیکھنے میں آیا۔مجیب الرحمٰن کے لئے میدان صاف رکھا گیا اور چیئرمین بھٹو کے راستے میں ہر قدم پر سیاسی محاذ کو اُبھارا گیا۔اُس کے خلاف مغربی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اور مذہبی جماعتیں کردار کشی پر مامور کر دی گئیں۔ان کی پارٹی کے اندر بغاوت کرائی گئی۔آخر ایسا کیوں کیا گیا؟

اس کے دور کی اسٹیبلشمنٹ کے کردار سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کو مشرقی پاکستان کی کوئی فکر نہ تھی۔ایسا لگتا ہے کہ یا تو وہ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی یا اُس کو مشرقی پاکستان میں کوئی خطرہ نظر نہیں آتا تھا۔مشرقی پاکستان کی سیاست میں شاید وہ اس

www.bhutto.org

لئے تسلی میں تھی کہ مشرقی پاکستان کے سب سے مقبول لیڈر مجیب الرحمٰن پر اگرتلہ سازش کیس کا الزام لگا کر اُس کو غدار قرار دے چکی تھی۔ اُس کا غالباً منصوبہ یہ تھا کہ مجیب الرحمٰن کو وہ کسی بھی وقت پھانسی کے تختے پر چڑھا کر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی سیاست کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ ایک دوسرا آپشن بھی اسٹیبلشمنٹ کے پاس تھا کہ خود مجیب الرحمٰن اُس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ مگر یہ تمام باتیں اُس وقت کی ہیں جب ایوب خان کی حکومت کو مشرقی پاکستان میں کوئی چیلنج درپیش نہیں تھا۔ ایوب خان کی حکومت مغربی پاکستان میں صرف ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ہی اپنا سب سے بڑا دشمن اور ہدف تصور کر رہی تھی اور پیپلز پارٹی پر بھی کوئی غداری وغیرہ کا مقدمہ بنا کر مغربی پاکستان میں بھی اپنا راستہ صاف کرنے کا منصوبہ رکھتی تھی۔ چیئرمین بھٹو پر اُن کی گرفتاری کے بارے میں جو موقف ایوب خان اور گورنر موسیٰ خان نے لاہور ہائی کورٹ میں اختیار کیا تھا، وہ تقریباً تقریباً بھٹو صاحب پر غداری کا مقدمہ ثابت کرنے کا موقف تھا۔

چیئرمین بھٹو پر غداری کا مقدمہ بنا دیا گیا

حکومت کے بھٹو صاحب پر لگائے گئے الزامات میں سب سے سنگین الزام یہ تھا کہ بھٹو نے حکومت پاکستان کے اہم رازوں کا پبلک میں انکشاف کیا ہے جو کہ وہ بحثیت وزیر خارجہ حلف یافتہ تھا کہ وہ مملکت کے کسی راز کو کسی حالت میں بھی ظاہر نہیں کرے گا۔ حکومت کا چیئرمین بھٹو پر یہ الزام بے حد خطرناک الزام تھا۔ اِس الزام کے بعد الزامات کی ایک لمبی چوڑی فہرست تھی جس میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ بھٹو نے ملک میں لاقانونیت کی صورتحال پیدا کر دی ہے۔ طالب علموں کو بغاوت پر اُکسایا ہے۔ امن وامان کو تہہ وبالا کر دیا ہے۔ آخری الزام یہ تھا کہ بھٹو طاقت کے ذریعے حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتا تھا۔ اُس کی تحریک ایک مسلح بغاوت ہے۔ حکومت کی املاک کو جلایا گیا ہے۔ بھٹو کے سیاسی تصادم کی وجہ سے کئی قیمتی جانوں کا نقصان ہو چکا ہے جس کا قتل اور خون بھٹو کے سر پر ہی عائد کیا جا سکتا ہے۔ یہ شخص بغاوت کے ذریعے اقتدار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مملکت کے اہم راز ظاہر ہو جانے کی وجہ سے پاکستان کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات خراب ہو جانے کا خطرہ درپیش ہے لہٰذا حکومت عدالت سے ملزم کو سخت سے سخت سزا

www.bhutto.org

دینے کی سفارش کرتی ہے۔

چیئرمین بھٹو نے حکومت کی طرف سے اُن پر لگائے گئے تمام الزامات کا جواب جیل سے خود تحریر کر کے عدالت میں اپنے صفائی کے وکیل میاں محمود علی قصوری کی وساطت سے پیش کیا۔ چیئرمین بھٹو کا عدالت میں پیش کیا گیا جواب ایک سیاست دان کی حیثیت سے بھی اور ایک بیرسٹر اور قانون دان کی حیثیت سے بھی ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت کا حامل تھا۔اُن کے جواب کے سامنے حکومت کے الزامات کی فہرست انتہائی بوگس اور گھٹیا قسم کی حرکت ظاہر ہوتی تھی جس کا بھٹو صاحب نے بے حد مذاق اُڑایا تھا۔

حکومت کی فردِ جرم

چیئرمین بھٹو نے اپنے دفاعی جواب کا آغاز اِس فقرے سے کیا تھا کہ میں حکومت کے مجھ پر لگائے گئے جھوٹے الزامات کی تردید کرتا ہوں اور ان کو مسترد کرتا ہوں کہ یہ الزامات ایک جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

یہ تمام الزامات کینہ پروری کے ارادے سے لگائے گئے ہیں اور تمام کے تمام بددیانتی پر مبنی ہیں۔ عدالت میں میری تقریروں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔حکومت کے خلاف میری تقریروں سے جو ٹکڑے پیش کئے گئے ہیں۔ وہ تقریروں کے اصل متن سے ہٹا کر پیش کئے گئے ہیں جو بالکل من گھڑت ہیں۔اُنہوں نے واشگاف الفاظ میں اِس بات کا انکار کیا کہ میں نے کوئی اسٹیٹ سیکرٹ ظاہر نہیں کیا اور نہ ہی میں نے کسی سازش یا بغاوت یا مسلح طاقت کے ذریعے حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کی ہے۔ (واضح رہے کہ اُس وقت ایوب خان کی بیماری کی خبریں عام سنی جا رہی تھیں)

حکومت کے خلاف پاکستان کے عوام نے اپنا ردِ عمل ظاہر کیا ہے۔لوگوں نے گلی کوچوں میں حکومت کے ظلم کے خلاف احتجاج کیا ہے اور یہ احتجاج کو بغاوت کہہ رہے ہیں۔لوگوں کا احتجاج حکمرانوں کی لوٹ مار کے خلاف ہے۔اُن کی بدکرداری کے خلاف ہے۔مہنگائی کے خلاف ہے اور یہ احتجاج بہت بھرپور انداز میں کیا جا رہا ہے۔

چیئرمین بھٹو کے بیان کا آگے آنے والا حصہ ایک پیس آف لٹریچر ہے۔اِس سے خوبصورت

طریقے سے کوئی شخص لوگوں کی بدحالی کو بیان ہی نہیں کرسکتا، جس طریقے سے بھٹو صاحب نے بیان کیا تھا۔

اُنہوں نے بیان کیا کہ ہمارے عوام اپنے بچوں کی محرومیوں کا رونا روتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی خوشیاں مانگتے ہیں۔ اُن کی غربت ناقابل تصور ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اِس کے باوجود وہ ایک اچھے مستقبل کی اُمید رکھتے ہیں۔ بھوک اور افلاس نے ماؤں کی چھاتیاں دودھ سے خالی کردی ہیں۔ اُن کے باپوں کے آنسو خشک ہوچکے ہیں۔ جج صاحبان! کیا یہ قانون قدرت ہے کہ اِن کے بچے مایوسیوں کی زندگیاں گزار کر مرجائیں اور وہ بھوک اور بیماریوں کا لقمہ بن جائیں۔ ہمارے عوام اپنے بچوں کیلئے اچھی زندگی کا مطالبہ کررہے ہیں۔ وہ روٹی، کپڑا اور مکان مانگتے ہیں۔ روزگار مانگتے ہیں۔ مجھے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ خود کسی نجات دہندہ کی تلاش میں ہیں۔ اگر کوئی نجات دہندہ اُن کو نہ ملا تو وہ خود اپنی نجات حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیں گے۔ اِس صورتحال میں کسی سازش کرنے یا منصوبہ بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لوگوں کے رویے اُن کے منصوبے ہوتے ہیں۔ جب حکمرانوں کے کان بہرے ہوجائیں اور اُن کے دل پتھر کے بن جائیں تو لوگ اپنے فیصلے خود کرنے لگ جاتے ہیں۔ نہ تو میں نے لوگوں کو تشدد پر آمادہ کیا ہے اور نہ ہی میں نے طالب علموں کو حکومت کے خلاف مشتعل کیا ہے۔ یہ فوجی حکمران پوری دنیا کو دھوکہ دے کر اپنی فوجی بغاوت اور اپنے فوجی راج کو انقلاب کا نام دے رہے ہیں۔ یہ اپنے کوپ کو انقلاب کہہ رہے ہیں اور اپنے فوجی حکمرانی کے ڈاکے کو انقلاب کہہ کر اُس کا جشن منائے جارہے ہیں مگر لوگوں کو جمہوریت کا نعرہ مارنے پر جیلوں میں ڈالے ہوئے ہیں۔ جس طرح روم جل رہا تھا اور نیرو بانسری بجائے جارہا تھا اسی طرح لوگ بھوکے مررہے ہیں اور فوجی ڈکیٹیٹر جشنِ خوش حالی منارہا ہے۔

یہ حکمران خزاں کے موسم میں جشن بہار منارہے ہیں

اِن بہروپیوں کا اقتدار اِسی طرح ہے جس طرح کے موسمِ خزاں ہوتا ہے۔ یہ خزاں کے موسم میں جشنِ بہار منارہے ہیں۔ پاکستان کے عوام کے جمہوریت کے نعرے بہار کی آمد کے نوشگفتہ پھول ہیں۔ یہ نعرے انتہائی آزادی کی موسیقی ہیں۔ اِن نعروں کا تعلق سننے سے زیادہ محسوس کرنے

کا ہے۔ یہ دلوں کی تالیں ہیں اور جذبوں کی رو دہم ہیں۔ ملاحظہ کرلیں، چیئرمین بھٹو اپنے جواب دعویٰ میں کیا خوب روحانی نوعیت کی شاعری کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جمہوری آزادی انسانوں کا بنیادی حق ہے جس کا فیصلہ انتخابات کے سیکرٹ بیلٹ سے ہوتا ہے۔ ووٹ بکس سے کیا جاتا ہے۔ جمہوریت ایک ایسا معاشرہ پیدا کرتی ہے جس میں ایک خودمختار عدلیہ ہوتی ہے۔ آئین اور پارلیمنٹ کو سب سے بڑی سپر قوت تصور کیا جاتا ہے۔

اِس کے مقابلے میں حکمران مطلق العنان ہیں۔ اسمبلی محض ایک ڈھونگ ہے۔ ملک کا آئین دفعہ 144 بنا دیا گیا ہے۔ کسی غم اور کسی دکھ کے اظہار کو بغاوت نہیں کہا جاتا۔ لوگوں کی چیخ و پکار اور کسی فریاد کو بغاوت نہیں کہا جاتا۔ لوگوں کے رونے دھونے کا نام لاقانونیت نہیں ہوسکتا۔ ظلم کے خلاف اُٹھائی جانے والی آواز کو بغاوت نہیں کہا جاسکتا۔

میں ذوالفقار علی بھٹو مظلوموں، غریبوں، کسانوں، مزدوروں اور پاکستان کے محنت کش عوام کا ساتھی ہوں۔ اُن کی آواز ہوں۔ اُن کی فریاد ہوں۔ مجھے جیل میں ڈال کر پاکستان کے عوام کی آواز کو دبایا نہیں جاسکتا۔ حکمرانوں نے اگر جلد انصاف نہ کیا۔ اگر وہ راہِ راست پر نہ آئے تو لوگ اِن کے جیل خانے توڑ ڈالیں گے۔ حکومت اپنی توپوں اور بندوقوں کے ساتھ لوگوں کے جذبوں کی بے حرمتی کر رہی ہے۔ انسانی جذبوں کی توہین کی جارہی ہے لہٰذا یہ غیر انسانی عمل ناقابل برداشت ہے جو زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا۔

چیئرمین بھٹو کے عدالت میں پیش کیے گئے جواب دعویٰ سے عوامی تحریک کو ایک نیا ولولہ ملا۔ اُن کے بیان کو ہر انسان نے اپنی داستان اور اپنی آواز تصور کیا۔

ائیر مارشل اصغر خان کی سیاست میں آمد

عین اُس وقت جب مغربی پاکستان میں چیئرمین بھٹو کی قیادت میں عوام کی جدوجہد کی تحریک کے شعلے آسمان کو چُھو رہے تھے۔ لوگ پاکستان کے غاصب حکمرانوں سے اپنی معاشی اور سیاسی آزادی کے حصول کی جنگ میں نبرد آزما تھے۔ چیئرمین بھٹو اپنی قیادت کا تاریخی کردار سرانجام دے کر جیل کی کال کوٹھری میں پہنچ گئے تھے، پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ اور (پرو امریکہ) امریکہ کے حمایتی طبقوں نے پاکستان کے عوام کی انقلابی جدوجہد کی تحریک کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے ائیر

www.bhutto.org

مارشل اصغر خان کو میدان میں اُتار دیا۔ اگر چہ ائیر مارشل نے بظاہر تو اپنی آمد کا مقصد چیئرمین بھٹو کی رہائی کی تحریک ظاہر کیا۔ اُن کا بیان تھا کہ تحریک کو بھٹو صاحب جہاں چھوڑ گئے ہیں، میں اِس تحریک کو وہاں سے آگے لے کر چلوں گا مگر اِس کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا۔ وہ اپنے ایک خفیہ مشن کے تحت سیاست میں آیا تھا۔ وہ عوام کی تحریک کو سبوتاژ کرنے آیا تھا۔ دھوکہ دینے آیا تھا۔ مگر پاکستان پیپلز پارٹی کے لئے مشکل یہ تھی کہ ہم ایک ہی وقت میں دو جنگیں لڑنے کے قابل نہیں تھے۔ ایک طرف پیپلز پارٹی کے کارکن حکومت کے جبر کا سامنا کر رہے تھے اور اپنی جان پر کھیل کر تحریک کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے محاذ پر جماعت اسلامی کے مسلح جتھوں کا سامنا کر رہے تھے۔ کفر اور اسلام کی جنگ میں مبتلا تھے۔ تیسرا محاذ پارٹی کے اندر حکومت کے ایجنٹوں نے برپا کر رکھا تھا۔ چوتھا محاذ سرخ انقلاب لانے والے انقلابی انتہا پسندوں نے کھڑا کر رکھا تھا۔ اندازہ کر لیں کہ ملک میں تقریر و تحریر کی آزادی نہیں تھی۔ ووٹ کا حق کسی کو حاصل نہیں تھا۔ مگر ہمارے انقلابی پیپلز پارٹی کو سرخ انقلاب برپا کرنے کا حکم دے رہے تھے۔ یہ سرخ انقلاب برپا کرنا بھی صرف پیپلز پارٹی کے ذمے تھا۔ اِس میں اُن کی عملی طور پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ اُن کا انقلاب صرف زبانی کلامی تھا۔

کچھ اِس قسم کے ماحول میں ائیر مارشل کی سیاست میں آمد ہوئی تھی۔ چیئرمین بھٹو کا جیل سے یہ پیغام موصول ہوا کہ ائیر مارشل کو کھلا نہ چھوڑا جائے۔ پیپلز پارٹی خود ائیر مارشل کے جلسے کرانا شروع کر دے۔ تاکہ ائیر مارشل کو تحریک کو نقصان پہنچانے کا موقع نہ مل سکے۔ اِس طریقے کے ساتھ پیپلز پارٹی نے پنجاب کے ہر شہر میں اصغر خان کے جلسے جلوسوں کا بندوبست کرنا شروع کر دیا۔ مجھے پارٹی نے حکم دیا کہ میں اصغر خان کے ساتھ ہر جگہ جلسے میں جا کر نظمیں پڑھوں اور ائیر مارشل کے ساتھ رہوں۔

میری پہلی ملاقات اصغر خان کے ساتھ لاہور میں مائی لاڈو کی حویلی میں ہوئی۔ مائی لاڈو کی حویلی گوالمنڈی کے چوک میں واقع ہے، جس چوک کو آجکل فوڈ اسٹریٹ کا چوک بنا دیا گیا ہے۔ لاہور میں چونکہ اُس وقت دفعہ 144 لاگو تھی۔ جس کی وجہ سے پہلا جلسہ چار دیواری کے اندر کیا گیا تھا۔ ائیر مارشل سے پہلے میں نے اپنی مقبول نظم ''بغاوت'' پڑھی۔ جلسہ خوب کِھل اُٹھا۔ ائیر مارشل نے پہلا عوامی خطاب کیا۔ پہلے خطاب میں اُس نے چیئرمین بھٹو کی خوب تعریف کی۔ اِس کے

www.bhutto.org

بعد ائیر مارشل کے ساتھ میں شیخو پورہ، گوجرانوالہ اور لائل پور (فیصل آباد) گیا۔ میری نظموں میں چونکہ چیئرمین بھٹو کا کہیں نہ کہیں ضرور ذکر ہوتا تھا۔ میں نے گوجرانوالہ کے جلسہ نما تقریب میں ائیر مارشل کا موڈ بہت آف پایا۔ میری وہاں پڑھی گئی نظم کا عنوان ''بھٹو'' تھا۔ میں جب نظم پڑھ رہا تھا تو مجھے ائیر مارشل کا چہرہ بالکل ساکت دکھائی دے رہا تھا۔ اِس پر نظم کا کوئی تاثر نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگلا جلسہ لائل پور میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ائیر مارشل کو بھٹو کے نام سے میری نظم میں کچھ تکلیف پہنچ رہی ہے۔ میں نے اِس نظم کے بعد اپنی اِس نظم کے بند میں ائیر مارشل کا نام بھی ڈال دیا۔ اِس نظم میں ایوب خان کی طرف اشارہ تھا:

اگر یہ خونی پرندہ فضا کی سمت اُڑا
فضا سے ''اصغر شاہین'' اسے اُتاریں گے
اگر زمیں پہ بھاگے گا جاں بچانے کو
تو ذوالفقار اِسے بڑھ کے تیر ماریں گے

جب میں اس بند کو پڑھ رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ ائیر مارشل لوگوں کے ساتھ خود بھی تالی بجا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی نے ائیر مارشل کو اپنے ہمراہ لے کر چلنے کی بے حد کوشش کی مگر ائیر مارشل کا مشن کچھ اور تھا۔ وہ ابتدا میں کچھ وقت تو پیپلز پارٹی کے ساتھ جلسوں میں شریک رہا مگر آہستہ آہستہ وہ اسٹیبلشمنٹ کے لوگوں اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاسی جماعتوں کے جلسوں میں شرکت کرنے لگ گیا۔ ایسے جلسے جلوسوں میں جن میں تمام مقررین چیئرمین بھٹو کے خلاف تقریر کر رہے ہوتے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ کی سازش یہ تھی کہ چیئرمین بھٹو کی عدم موجودگی میں ائیر مارشل لوگوں کا ہیرو بن کر عوام کو اپنے ساتھ بہا کر لے جائے اور پیپلز پارٹی اور بھٹو کا کردار ختم ہو جائے۔ یہاں پر ایک بات تحریر کرنا انتہائی ضروری ہے جو آنے والی نسلوں کی سیاسی تعلیم کے لئے بے حد ضروری ہے۔ واضح رہے کہ اسٹیبلشمنٹ آج کی ہو یا قرونِ اولیٰ کی یا قدیم زمانے کی، یہ عوام کو ہمیشہ جاہل اور ناسمجھ تصور کیا کرتی ہے۔

اس کا فلسفہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ عوام بے وقوف ہوتے ہیں۔ اِن کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ عوام بھیڑ چال کے عادی ہوتے ہیں۔ جس طرف اُن کا رُخ پھیر دیا جائے، یہ اُس طرف کو چل دیتے ہیں۔ حالانکہ اسٹیبلشمنٹ کی یہ بات انتہائی لغو اور غلط اندازوں پر

www.bhutto.org

مبنی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ اپنے پروپیگنڈے کے زور سے کچھ وقت کے لئے لوگوں کو بے وقوف بنا دے مگر ایسا تاریخ میں ہرگز نہیں ہوا کہ کسی اسٹیبلشمنٹ نے کُل وقت کے لئے اپنے عہد کے عوام کو بے وقوف بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو۔ ''قدیم روما'' کی تاریخ میں جولیس سیزر کی قاتل اسٹیبلشمنٹ اور اُس کے سازشی قاتلوں نے اُس عہد کے عوام کو سیزر کے قتل پر دھوکہ دینے کے لئے ایک فلسفے کو جنم دیا تھا۔ وہ فلسفہ یہ تھا:

"This is not that we love sezer less, We love Rome More."

''ایسا نہیں تھا کہ ہم سیزر سے کم محبت کرتے تھے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہم روم سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ یعنی ملک سے یا ریاست کے ساتھ زیادہ محبت کرتے تھے''۔

دیکھنے میں یہ فلسفہ انتہائی معنی خیز اور دلکش تھا مگر روم کے عوام، قاتلوں کے اِس جواز اور دلیل کو اور اُن کی جعلی فلسفے کی منطق کو اور اُن کے قتل کے موقف کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے اور اُنہوں نے سیزر کے قاتلوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا تھا۔

اِس معاملے میں آخری بات یہ ہے کہ انسان انفرادی طور پر گمراہ ہو سکتا ہے۔ بے وقوف بن سکتا ہے مگر انسان اجتماعی طور پر کبھی گمراہ نہیں ہوا کرتے۔ افراد گمراہ ہو سکتے ہیں، قومیں گمراہ نہیں ہوا کرتیں۔

برصغیر کی تاریخ میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں کا پاکستان بنانے کا فیصلہ بھی درست تھا۔ اِس لئے کہ اُس وقت کی سیاسی صورتحال میں اِس کے علاوہ مسلمانوں کے پاس اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔ مگر اُس وقت بھی مسلمانوں کے کچھ انفرادی گروہ اِس فیصلے کے خلاف تھے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ لوگوں کا اجتماعی فیصلہ ہی صحیح تھا۔

چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی تحریک کے دوران بھی پاکستان کی حکمران اسٹیبلشمنٹ اور اُس کے مفاد یافتہ با وسائل طبقے لوگوں کو یہ کہہ کر گمراہ کرنا چاہتے تھے کہ بھٹو ایک باغی انسان ہے۔ وہ اقتدار کو غیر قانونی طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے اقتدار کے لئے تمہارے بچے مروا رہا ہے۔ وہ طالب علموں کو گمراہ کر رہا ہے۔ بھٹو نے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظام تباہ کر دیئے ہیں۔ پیپلز پارٹی ایک لادین جماعت ہے۔ یہ جماعت اور اِس کا سربراہ ملک میں خانہ جنگی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بھٹو نے اہم قومی راز افشا کر کے ملک و قوم کے ساتھ غداری کی ہے، جس کی سزا

www.bhutto.org

صرف اور صرف موت ہی ہو سکتی ہے۔ بھٹو سے ڈرو۔ یہ تمہارے ایمان کو خراب کر دے گا۔ حالانکہ چیئرمین بھٹو کی پیپلز پارٹی کی تحریک کا نعرہ عوام کیلئے روٹی، کپڑا اور مکان تھا۔ اِس کے علاوہ اور کوئی نعرہ نہ تھا۔ پیپلز پارٹی ملک سے آمریت ختم کر کے ملک میں ایک جمہوری نظام قائم کرنا چاہتی تھی۔ چیئرمین بھٹو ملک سے غیر قانونی حکمرانوں کی حکمرانی کو ختم کر کے پاکستان کا آئین بنانا چاہتے تھے اور ملک پر آئین کے مطابق حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس آئین میں ملک کے قوانین کے مطابق فوج کو اقتدار سے علیحدہ کرنا تھا۔ مگر پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ چیئرمین بھٹو کو ایک قومی مجرم بنا کر جیل میں ڈالے ہوئے تھی اور جیل میں اُن پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ زخمی سانپ اور گرتی ہوئی آمریت بے حد خطرناک ہوتی ہے۔ ایوب خان کی آمریت اُس وقت دم توڑ رہی تھی مگر بھٹو دشمنی میں اپنے زہر میں بُری طرح کھول رہی تھی۔ چیئرمین بھٹو کا اِس کے ڈنک سے محفوظ رہنا اور خود کو محفوظ بنانا از حد ضروری تھا۔ اِس کے لئے ضروری تھا کہ چیئرمین بھٹو آمریت کے الزامات کا توڑ کر کے عدالت میں ثابت کرتے کہ وہ ایک قانون پرست اور قانون پسند شہری ہیں۔ ملک کے قوانین کا احترام کرتے ہیں اور کسی طرح بھی لاقانونیت کے حق میں نہیں ہیں۔ اِن تمام باتوں کو ثابت کرنے کے لئے اُنہوں نے ایوب خان کے بی ڈی الیکشن کرانے کے بارے میں جیل سے اعلان کیا کہ ایوب آمریت اگر ملک میں اپنے بی۔ ڈی نظام کے لئے ہی بضد ہے، یعنی اگر وہ بنیادی جمہوریت کے نظام کو ہی ملک پر مسلط رکھنا چاہتی ہے تو چیئرمین بھٹو اس انتخاب میں بھی حصہ لینے کے لئے تیار ہیں۔

چیئرمین بھٹو کی سیاسی حکمتِ عملی

واضح رہے کہ ایوب خان کی حکومت نے اُس وقت تازہ اعلان کیا تھا کہ وہ 1969ء میں بنیادی جمہوریت کے انتخابات کروائے گی۔ جبکہ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کا اور خود پاکستان پیپلز پارٹی کا یہ مطالبہ تھا کہ ملک میں بالغ رائے دہی کے مطابق پارلیمانی جمہوریت کے نظام کے تحت انتخابات کروائے جائیں۔ مگر ایوب آمریت اِس مطالبے کو تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھی۔ اِس صورتحال میں مغربی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں صرف بالغ رائے دہی کے مطالبے کی حد تک ہی بات کر رہی تھیں، کُھلی طور پر وہ ایوب خان کی آمریت کو گرانے کے لئے

www.bhutto.org

خود فرنٹ پر آ کر آمریت سے ٹکرانے سے گریز کر رہی تھیں۔ عملی طور پر صرف چیئر مین بھٹو ہی مغربی پاکستان میں ایوب آمریت سے براہِ راست نبرد آزما تھے اور ٹکرا گئے تھے۔ ایوب خان، چیئر مین بھٹو کو اپنا سیاسی حریف خیال نہیں کر رہا تھا۔ وہ اُن کو اپنا ذاتی دشمن قرار دے چکا تھا۔ ایوب خان پاکستان کے ہر سیاست دان کو برداشت کرنے کو تیار تھا مگر وہ بھٹو کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ لہٰذا جنرل ایوب خان کی ذاتی دشمنی سے بچنے کے لئے یا ذاتی انتقام سے محفوظ رہنے کے لئے چیئر مین بھٹو کے لئے ضروری تھا کہ وہ قانون اور آئین کا کور حاصل کرتے۔ ایوب حکومت کے بنیادی جمہوریت کے انتخابات کے اعلان سے چیئر مین بھٹو نے آئین اور قانون کے حصار حاصل کرنے کے لئے جیل میں اعلان کر دیا کہ وہ اِس حد تک جمہوریت پرست ہیں کہ وہ بنیادی جمہوریت کے انتخابات میں بھی حصہ لینے کے لئے تیار ہیں۔ اُن کے اِس اعلان نے قانونی طور پر لوگوں پر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ ایوب خان کے ذاتی دشمن نہیں ہیں اور نہ ہی کسی بلوے اور خانہ جنگی سے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ لوگوں کے آئینی حقوق کے لئے ہر طرح کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے تیار ہیں۔

جہاں تک اُس وقت پاکستان کی سیاسی صورتحال کے معروضی حالات وواقعات کا تعلق تھا، یہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ بنیادی جمہوریت کے انتخابات کو تسلیم کیا جاتا مگر چیئر مین بھٹو کی یہ ایک سیاسی مصلحت تھی، ایک حکمت عملی تھی جو بہت درست اور بروقت تھی۔ اِس لئے کہ اگر ایوب خان کی حکومت چیئر مین بھٹو کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی کرتی تو لوگوں پر ثابت ہو جاتا کہ ایوب خان بھٹو کا اِس قدر ذاتی دشمن ہو چکا ہے کہ وہ اُس کو خود اپنے اعلان کردہ بی۔ ڈی انتخابات میں بھی حصہ نہیں لینے دینا چاہتا۔ اِس کھیل کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ چیئر مین بھٹو چونکہ ایوب خان کی حکومت میں شامل رہے چکے تھے۔ وہ پاکستان میں فوجی اقتدار کی قوت کو بھی جانتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ تحریک ناکام ہو جاتی اور پارلیمانی انتخابات کا مطالبہ کامیاب نہ ہوسکتا اور مجبوراً لوگوں کو بی۔ ڈی نظام کے انتخابات میں ہی حصہ لینا پڑ جاتا۔ اِس صورتحال کا توڑ کرنے کیلئے بھی چیئر مین بھٹو کا یہ اعلان ایک اچھی حکمت عملی تھا کہ ایوب خان کو میدان صاف نہ دیا جائے اور اِس کا مقابلہ کیا جائے۔ تیسری اور آخری بات یہ تھی کہ اُس وقت تمام سیاسی جنگ میں مغربی پاکستان میں صرف چیئر مین بھٹو کی ذات ہی داؤ پر لگی ہوئی تھی اور تختہ مشق بنی ہوئی تھی۔ باقی تمام مغربی پاکستان

www.bhutto.org

کے سیاست دان خیر و عافیت کی زندگی گزار رہے تھے۔ بس یہی چند ایک وجوہات تھیں جن کے پیش نظر چیئر مین بھٹو نے ہر طرح کے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا تھا۔

حکومت نے پہلا کام تو یہ کیا تھا کہ چیئر مین بھٹو کو گرفتار کرنے کے بعد پیپلز پارٹی کی صفوں میں اپنے بھیجے ہوئے ایجنٹوں کے ذریعے پارٹی کی صفوں میں انتشار اور اختلاف رائے پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ حکومت نے سب سے پہلے ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ جن کو بھٹو صاحب کے ساتھ گرفتار کیا گیا تھا، رہا کر دیا۔

ملک اسلم حیات

ملک اسلم حیات ایک مرنجا مرنج قسم کی شخصیت کا انسان تھا۔ وہ کوئی نظریاتی قسم کا انسان ہرگز نہیں تھا۔ وہ لاہور ڈسٹرکٹ بار کی انتخابی سیاست کا کامیاب آدمی تھا۔ ڈسٹرکٹ بار لاہور کا تین بار صدر منتخب ہو چکا تھا۔ ایوب حکومت اور ایوب حکومت کے خلاف لوگ دونوں ہی اِس کو ووٹ دیا کرتے تھے۔ حکومت کے لئے اسلم حیات ایک قابل قبول صدر تھا جو ایوب خان حکومت کے لئے کسی طرح بھی خطرناک ثابت نہیں ہوتا تھا۔ اِس کے علاوہ ملک اسلم حیات کی سیاست کا تمام دارو مدار آغا شورش کشمیری کی ذات پر تھا اور آغا شورش کشمیری اُس عہد کی اسٹیبلشمنٹ کا ایک چیمپئن کھلاڑی تھا۔ لہٰذا ملک اسلم حیات کو وہی کچھ کرنا ہوتا تھا جو آغا شورش کشمیری اُس کو کہتا تھا۔ اِس معاملے میں ملک اسلم حیات کی اپنی کوئی سوچ نہیں ہوتی تھی۔ اسلم حیات ایک نیک دل جذباتی انسان تھا۔ وہ چیئر مین بھٹو کی مقبولیت سے متاثر ہو کر اور لاہور کے عوام کے جذبات کی رو میں بہہ کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ وگرنہ وہ اِس گاڑی کا بیل ہی نہیں تھا۔ وہ ذہنی طور پر احراری مزاج کا لیڈر تھا۔ جیل خانوں کی حکایات کو وہ کتابوں کی حد تک ہی جانتا تھا۔ عملی طور پر وہ بندی خانوں کی صعوبتوں سے واقف نہ تھا۔ اُس نے جیل جانے کے ایک ہفتے کے بعد ہی حکومت سے اپنی رہائی کا مطالبہ کر دیا اور حکومت نے اُس کو خوشی سے آزاد کر دیا۔

ملک اسلم حیات جب منٹگمری جیل سے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ہم پیپلز پارٹی کے ورکروں نے اُس کو حیلہ شیری دینے کے لئے اُس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ وہ ایک بے حد بھاری جسم کا آدمی تھا۔ اِس کے باوجود میں نے اُس کو اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ اُس کے نعرے

www.bhutto.org

لگائے گئے۔ مگر وہ بری طرح دل چھوڑ چکا تھا۔ اُس نے پہلی بات یہ کہی کہ خدا کے لئے یہ نعرے بند کرو اور مجھے گھر جانے دو.........اور دوسری مضحکہ خیز بات اُس نے اخبار نویسوں کو یہ بتائی کہ جیل میں بلیاں اور چوہے ایک ساتھ ہی مجھ پر چھوڑ دیئے گئے تھے۔

ملک اسلم حیات کی یہ بات لوگوں کیلئے ایک لطیفے سے کم ہرگز نہ تھی۔ ملک صاحب اپنے گھر چلے گئے۔ دوسرے دن میں ملک صاحب کے پاس اُن کی مزاج پرسی کے لئے گیا۔ میرے ساتھ ملک صاحب کا ویسے بھی بہت پیار تھا۔ وہ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ اِس وجہ سے میں اُن کے کچھ زیادہ ہی قریب رہتا تھا۔ اُن کے گھر پر اُس وقت کچھ سیاسی کارکن اور وکیل بیٹھے تھے۔ ملک صاحب ایوب خان کی تعریف کئے جا رہے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ وہ ایک بے حد شریف انسان ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ وہ تو ایک آمر ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے کہ اسلم گورداسپوری، وہ ڈاکو، قاتل اوروں کے لئے ہوگا، میرے لئے تو وہ رحمت کا فرشتہ ہے۔ میرا خیال تھا کہ احسان وائیں اس معاملے میں میری حمایت میں بولے گا مگر وہ ملک صاحب سے بھی آگے تھا۔ وہ کہنے لگا ہم بھٹو کی بی۔ ڈی ممبری میں حصہ لینے کی سیاست نہیں کر سکتے۔

جیل میں بھٹو صاحب کے ایوب حکومت کے اعلان کردہ صدارتی انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے کو پارٹی کی طرف سے باقاعدہ اعلان کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ پارٹی کا جنرل سیکرٹری جے۔ اے۔ رحیم اُن دنوں لاہور میں ہی مقیم تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ لاہور ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن میں پارٹی کے وکلا کی طرف سے مسٹر جے۔ اے۔ رحیم کو استقبالیہ دیا جائے گا اور اِس استقبالیے میں وہ بھٹو صاحب کے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کرے گا۔ ڈسٹرکٹ بار کے صدر ملک اسلم حیات سے اِس معاملے میں مشورہ کیا گیا۔ بی۔ ڈی کے انتخابات کے اعلان کا فیصلہ چونکہ ایوب خان کی حکومت کی طرف سے کیا گیا تھا، لہٰذا ملک اسلم حیات کے لئے اِس معاملے میں ڈر کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ استقبالیے کا انتظام لاہور ڈسٹرکٹ بار کے کھلے احاطے میں کیا گیا۔ بڑی تعداد میں وکلا، سیاسی کارکنوں اور صحافیوں نے اِس استقبالیے میں شرکت کی۔ ملک اسلم حیات کی صدارت میں کاروائی کا آغاز کیا گیا۔ مجھے نظم پڑھنے کو کہا گیا۔ میرے بعد پارٹی کے سیکرٹری جنرل جی اے رحیم صاحب نے خطاب کا آغاز کیا اور اپنے خطاب میں بھٹو صاحب کے B.D کے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ جے اے رحیم کے بعد ملک اسلم حیات کی صدارتی تقریر ہوئی۔ اُس نے

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کے اِس انتخاب میں حصہ لینے کے فیصلے کی بے حد تعریف کی اور اُن کو جمہوریت کا سچا مجاہد قرار دیا۔

دوسرے دن حکومت کے تمام سرکاری اخباروں، صحافیوں اور مغربی پاکستان کی تمام نام نہاد حزب اختلاف کی جماعتوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا۔ اُن کے بیانات یہ تھے کہ بھٹو نے جمہوریت کے ساتھ غداری کی ہے۔ ہم حزب اختلاف کے لیڈر بی ڈی کے صدارتی انتخابات میں کبھی حصہ نہیں لیں گے۔ بی۔ڈی انتخابات میں حصہ لینا عوام کی جمہوری تحریک کے ساتھ غداری کے مترادف ہے وغیرہ وغیرہ۔

اِس معاملے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہوئی کہ ملک اسلم حیات جس نے خود انتخابات میں حصہ لینے کی ایک رات پہلے تعریف کی تھی اور اِس کو ایک جمہوری اقدام قرار دیا تھا۔ اُس کا اخبارات میں بیان تھا کہ بی۔ڈی نظام کے انتخابات میں حصہ لینا ہماری جمہوری قربانیوں کے ساتھ غداری ہے جس کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ملک صاحب بہت دلچسپ آدمی تھے۔ جب اُن سے کہا گیا کہ ملک صاحب! کل آپ ہی نے تو اِس فیصلے کی تعریف کی تھی۔ ملک صاحب نے فرمایا کہ یہ میرا جمہوری حق ہے کہ میں جب چاہوں، اپنی رائے تبدیل کرسکتا ہوں۔ اِس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

جنرل ایوب خان کی حکومت کا پاکستان پیپلز پارٹی کو توڑنے کی سازش

چیئرمین بھٹو کو جیل میں ڈال کر ایوب حکومت نے پاکستان پیپلز پارٹی کو توڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا کردار شروع ہی سے پاکستان کی سیاسی جماعتوں کے خلاف رہا ہے۔ سیاسی جماعتوں میں انتشار پھیلانا، سیاسی جماعتوں کو بدنام کرنا۔ سیاسی لیڈروں پر الزام تراشی کرنا پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا آج کا کوئی نیا کردار نہیں ہے۔ سیاست دانوں کے خلاف اِس طرح کی گھناؤنی سازشوں کا آغاز پاکستان کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی کردیا گیا تھا۔ پاکستان میں جب کوئی نئی سیاسی جماعت وجود میں آتی ہے تو اسٹیبلشمنٹ فوری طور پر اپنے ایجنٹ اُس جماعت میں شامل کروا دیتی ہے تاکہ ہر سیاسی جماعت کے قائد کو قابو میں رکھا جاسکے۔ پاکستان میں جب بھی کسی سیاست دان کا کوئی سیاسی فیصلہ اسٹیبلشمنٹ کے مفادات سے ٹکراتا ہے، اسٹیبلشمنٹ فوری طور پر اُس لیڈر

www.bhutto.org

کے خلاف اُس کی جماعت میں انتشار اور اختلاف پیدا کر دیتی ہے اور اُس جماعت کے اندر بغاوت کرواکے اُس کی قیادت کو چیلنج کروا دیتی ہے جس کی تفصیل بہت لمبی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ نے یہی حربہ چیئرمین بھٹو کے خلاف بھی استعمال کیا۔ مگر چیئرمین بھٹو کے خلاف پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر اسٹیبلشمنٹ کا یہ حربہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ اِس لئے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کا دار و مدار پاکستان کے محنت کش عوام پر تھا۔ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح چند شخصیتوں پر نہیں تھا۔ پیپلز پارٹی میں چند لوگوں کی بغاوت یا چند لوگوں کا پیدا کیا گیا انتشار پارٹی میں کوئی خلل پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اِس لئے کہ جس طرح سمندر کے اندر چند اینٹیں پھینکنے سے سمندر میں طوفان کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی طرح پیپلز پارٹی کے اندر چند لوگوں کی بغاوت لاکھوں کروڑوں عوام کی پیپلز پارٹی کے ساتھ محبت پر اثر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ حکومت کے ایجنٹوں کا تجربہ پرانا تھا مگر پیپلز پارٹی ایک نئی جماعت تھی، جس نے عوام میں جنم لیا تھا۔ جس کی جڑیں لوگوں میں تھیں۔ لہٰذا حکومت کا یہ تجربہ ناکام ہو گیا اور چیئرمین بھٹو کی ذات کو اور پیپلز پارٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔

لہٰذا سب سے پہلے یکم جنوری 1969ء کو میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ نے چیئرمین بھٹو کے اِس انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے کا بہانہ بنا کر پارٹی کے اندر اپنے فارورڈ بلاک کا اعلان کر دیا اور میاں فقیر محمد خود اِس فارورڈ بلاک کا کنوینر بن گیا۔ میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ کے فارورڈ بلاک کی ملک اسلم حیات اور ملک حامد سرفراز نے فوری طور پر حمایت کر دی۔ اِن دنوں ایک دوسرا واقعہ بھی بڑا حیران کن دیکھنے میں آیا۔ وہ واقعہ یہ تھا کہ ملک آفتاب ربانی جو اِن لوگوں کے ساتھ ہی بطور لیبر لیڈر پیپلز پارٹی میں آیا تھا۔ وہ منٹگمری جیل (موجودہ ساہیوال) میں چیئرمین بھٹو کے ساتھ ملاقات کے لئے پہنچ گیا۔ بھٹو صاحب کو جیل میں ڈیفنس آف پاکستان کے رولز نمبر 32 کے تحت نظر بند کیا گیا تھا۔ جہاں پر اُن کے ساتھ اُن کے وکلاء کے علاوہ صرف اُن کی بیگم کو ملاقات کی اجازت دی جاتی تھی۔ کوئی دوسرا انسان بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ مگر تحریکوں میں اِس قسم کے واقعات عام ہو جایا کرتے ہیں۔ یہ واقعہ بھی اِسی طرح کا ایک تھا۔

باغیوں کا میر علی احمد تالپور کو قائمقام چیئرمین بنانے کا مطالبہ

چیئرمین بھٹو کی گرفتاری کے بعد پارٹی میں عجیب و غریب قسم کی باتیں دیکھنے میں آئیں۔

www.bhutto.org

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ بڑے بڑے سیاسی شرفاء حکومت کے ہاتھوں استعمال ہو گئے۔ اُن میں ایک میر علی احمد تالپور بھی تھے۔ میر علی احمد تالپور پرانے خاکسار تھے اور ایک پرانے سیاست دان تھے جن کے پاکستان کے تمام پرانے سیاست دانوں کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے۔ میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ کے فاورڈ بلاک کے لوگوں نے پارٹی سے مطالبہ کر دیا کہ چیئر مین بھٹو کی عدم موجودگی میں میر علی احمد تالپور کو پارٹی کا قائم مقام چیئر مین بنا دیا جائے۔ پہلے تو میاں فقیر محمد کا بنایا گیا پارٹی کے اندر فارورڈ بلاک ہی پارٹی کے نظم وضبط اور سیاست کے اُصولوں کے خلاف تھا، ایک کھلی سازش تھی۔ اِس کے بعد میر علی احمد تالپور کو قائم مقام چیئر مین بنانے کا مطالبہ کرنا ایک دوسری سازش تھی۔ حقیقت کی نظر میں اُن کے مطالبے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ایسے عناصر جو پارٹی کے خلاف بغاوت کیے ہوئے ہوں اور یہ بغاوت بھی اُس وقت کی گئی جب پارٹی انتہائی مشکل وقت کا سامنا کر رہی تھی۔ اُس کی قیادت انتہائی مشکلات میں گرفتار تھی۔ ایسے عناصر کے کسی مطالبے کو کوئی عقل مند انسان جائز قرار نہیں دے سکتا تھا۔ اُن کے اِس مطالبے سے سب سے زیادہ نقصان خود میر علی احمد تالپور کا ہوا جو اِن لوگوں کے مطالبے کے ساتھ اتفاق کر گئے تھے۔ افسوس کی بات تو یہ تھی کہ میر علی احمد تالپور کو پارٹی کے قائم مقام چیئر مین بنانے کی حمایت میں آغا شورش کشمیری اور لطیف بٹ جیسے سیاسی واگا بانڈ بھی پیش پیش تھے جن کا پارٹی کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ دراصل اسٹیبلشمنٹ میر علی احمد تالپور کو پارٹی کا قائم مقام چیئر مین بنا کر چیئر مین بھٹو کو پارٹی کی چیئر مین شپ سے برخاست کرانا چاہتی تھی۔ میر علی احمد تالپور ایک سادہ دل انسان تھے۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ پیپلز پارٹی کے اندر چند موقع پرستوں کی شورش چائے کی پیالی میں طوفان کے مصداق تھی جو چند دنوں کے بعد ختم ہو گئی۔ مگر میر علی احمد تالپور کی سیاست کے لئے زہر قاتل ثابت ہوئی۔ اِس لئے کہ دوبارہ میر علی احمد تالپور کا بھٹو صاحب کے دل میں اعتماد نہ بیٹھ سکا۔ اُن کا اعتماد پارٹی کے اندر بُری طرح مجروح ہو گیا جو دوبارہ کبھی بحال نہ ہو سکا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اُن کا اور پارٹی کا فاصلہ بڑھتا ہی گیا، کم نہ ہو سکا اور بالآخر وہ چیئر مین بھٹو کے بدترین مخالفوں میں شمار ہونے لگ گئے۔

ڈاکٹر مبشر حسن تقریباً ایک ماہ کی قید کے بعد رہا کر دیئے گئے تھے۔ اب اُن کی ذات پارٹی کے فیصلہ کن لوگوں میں شمار ہوتی تھی۔ اب وہ کھل کر پارٹی کی سیاست میں متحرک ہو چکے تھے۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کو اُن پر بے حد اعتماد تھا۔ بھٹو صاحب کے تمام فیصلے ڈاکٹر مبشر حسن کے ذریعے ہی ہم تک پہنچتے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کی رائے تھی کہ ملک اسلم حیات، میاں فقیر محمد ایڈووکیٹ اور ملک حامد سرفراز کو پارٹی کی جانب سے پارٹی کے نظم وضبط اور قیادت کے احکامات کی خلاف ورزی کے جرم میں شوکاز نوٹس جاری کئے جائیں۔ اِس معاملے پر شیخ رشید صاحب کے ساتھ پارٹی کے دفتر میں ہم لوگوں نے ملاقات کی۔ اِن لوگوں کو نوٹس دینے کا معاملہ زیر بحث آیا۔ خود شیخ صاحب بھی اُن کو نوٹس دینے کے حق میں تھے مگر میں نے نوٹس جاری کرنے کی سکیم سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ اِن لوگوں کی شورش کو باہر ہر شخص ناپسند کر رہا ہے اور اِن لوگوں کے کردار پر کھلی بحث ہو رہی ہے۔ اِن لوگوں کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ یہ لوگ خود بخود ہی لوگوں کے سامنے ننگے ہو رہے ہیں۔ ابھی اور ننگے ہوں گے۔ ہم لوگوں کو چیئرمین کی رہائی کی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ میری رائے کو تسلیم کر لیا گیا۔ میں چونکہ ملک حامد سرفراز اور ملک اسلم حیات وغیرہ کے حلقے میں اُٹھتا بیٹھتا تھا، یعنی کافی ہاؤس اور چائنیز لنچ ہوٹل میں۔ لہٰذا میری ڈیوٹی لگا دی گئی کہ میں اِن لوگوں کو اخلاقی طور پر پارٹی کے اندر رہنے پر آمادہ کروں۔ اِس کے علاوہ اُن کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھوں۔ اِس میٹنگ میں بابائے سوشلزم شیخ رشید صاحب نے بتایا کہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل جے اے رحیم کو پارٹی کا قائم مقام چیئرمین بنا دیا گیا ہے۔ اِس طرح کچھ لوگوں نے میر علی احمد تالپور کو پارٹی کا قائم مقام چیئرمین بنانے کا جو ہنگامہ کھڑا کیا تھا، جے اے رحیم کے چیئرمین بن جانے سے اُن کے ہنگامے کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ ویسے بھی چیئرمین بھٹو کے لاہور کیمپ جیل آ جانے کی وجہ سے پارٹی کی سیاست کا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ ہر روز وکلا حضرات چیئرمین بھٹو سے جیل میں ملاقات کر کے آتے تھے۔ لہٰذا اب کسی بھی حکومت کے ایجنٹ کیلئے پارٹی کے اندر ابہام پیدا کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اُن دنوں بیگم نصرت بھٹو صاحبہ لاہور تشریف لا چکی تھیں۔ بیگم صاحبہ مجھے اپنے ساتھ کیمپ جیل لے گئیں جہاں پر بھٹو صاحب پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ ہم جب جیل پہنچے تو اُس وقت مولوی مشتاق جیل کے ایک بوسیدہ کمرے میں بھٹو صاحب کے مقدمے کی سماعت جاری رکھے ہوئے تھا۔ کمرے میں بھٹو صاحب کے ساتھ میاں محمود علی قصوری، شیخ رفیق احمد، حفیظ پیرزادہ، ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفےٰ کھر اور دوسرے کچھ وکلاء حضرات بیٹھے ہوئے تھے۔ مقدمے کی سماعت ختم ہونے کے بعد بھٹو صاحب سے میری ملاقات

www.bhutto.org

ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ چیئرمین بھٹو اُسی سج دھج کے ساتھ خوبصورت سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے جس طرح وہ عام زندگی میں پہنا کرتے تھے۔ کسی قسم کی گھبراہٹ اُن میں دیکھنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اُنہوں نے مجھے گلے لگایا اور پہلا فقرہ ہی کہا کہ ملک حامد سرفراز کو کیا ہوا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ۔ میری طرف سے کہو کہ جب دوست مشکل میں ہوں تو ایسا نہیں کیا کرتے۔ اِس کے بعد اُنہوں نے مجھے کہا کہ بیگم صاحبہ کے ساتھ رابطہ رکھو اور اِن کے ساتھ رہو۔ میں چیئرمین بھٹو کا پیغام لے کر تمام دن ملک حامد سرفراز کو ڈھونڈتا رہا۔ وہ شام کو مجھے مل گئے۔ میری کچھ ملک صاحب سے دوستی بھی تھی۔ سب سے پہلے تو ملک صاحب نے میرے ساتھ اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ وہ ناراضگی یہ تھی کہ ہم پارٹی کے کارکنوں نے جے۔اے رحیم اور شیخ محمد رشید کی قیادت میں ورکروں کا ایک مختصر سا اجلاس بلا کر چیئرمین بھٹو کو صدارتی انتخاب میں حصہ لینے کے فیصلے کو ایک جمہوری شکل دینے کا فیصلہ کیا تا کہ پارٹی کے اجلاس میں اِس فیصلے کی توثیق کر دی جائے اور کچھ لوگوں کا یہ اعتراض ختم کر دیا جائے کہ یہ فیصلہ جمہوری فیصلہ نہیں ہے۔ ملک حامد سرفراز اور ملک اسلم حیات صاحب خود بھی کئی دن سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ پارٹی کا اجلاس بلایا جائے۔ لہٰذا اجلاس بلایا گیا۔ ملک صاحب اپنے مخصوص لوگوں کے ساتھ اجلاس میں آئے۔ اجلاس نے اتفاق رائے کے ساتھ چیئرمین بھٹو کے فیصلے کی توثیق کر دی۔ ملک صاحب نے اعتراض کیا کہ یہ ہاؤس اِس بات کا مجاز نہیں ہو سکتا کہ پارٹی کے کلیدی فیصلے کرے۔ یہاں کچھ لوگ غیر ضروری بیٹھے ہوئے ہیں جن کو اِس اجلاس میں نہیں بٹھایا جا سکتا۔ اُن کے اِس اعتراض پر میں نے اُن کو کہا کہ ملک صاحب! آپ کے ساتھ بھی تو کچھ لوگ ایسے ہی اِس اجلاس میں بیٹھے ہوئے ہیں جو آپ کے ساتھ آئے ہیں۔ وہ بھی تو یہاں پر بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرح پارٹی کے کارکن ہیں۔ اگر اِن پر ہم نے اعتراض نہیں کیا تو آپ کو بھی ہم پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔ مگر اجلاس میں ملک صاحب کے اُلجھنے کا معاملہ کچھ اور تھا۔ لہٰذا اکثریت کے فیصلے کی تاب نہ لاتے ہوئے اجلاس سے واک آؤٹ کر کے چلے گئے۔ اُن کا گلہ تھا کہ تم نے میرے اعتراض کا جواب کیوں دیا تھا حالانکہ میں نے اُصول کی بات کی تھی۔ خیر اِس گلے کے بعد وہ نارمل ہو گئے۔ میں نے ملک حامد سرفراز کو بحیثیت انسان بے حد شگفتہ اور شائستہ اطوار پایا ہے۔ خدا جانے اُن کی سیاست میں مرزا غالبؔ کے شعر کی سے خرابی کیوں مضمر ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

www.bhutto.org

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولہ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا

میں رات کو ملک حامد سرفراز صاحب کو اپنے ڈیرے پر شاہ نور سٹوڈیو لے گیا۔ میں نے بے حد یکسوئی کے ساتھ چیئرمین بھٹو کا پیغام ملک حامد سرفراز کو دیا۔ خاص طور پر چیئرمین بھٹو کے اس فقرے پر میں نے بہت زور دیا کہ ''دوست دوستوں کا ساتھ مصیبت کے وقت نہیں چھوڑا کرتے۔'' مجھے آج بھی اِس بات کا احساس ہے کہ ملک صاحب دل سے حقیقی صورتحال کو محسوس کرتے تھے مگر نہ جانے وہ کونسے عوامل تھے جس کی وجہ سے وہ پارٹی چھوڑنے پر مجبور تھے۔ وگرنہ کسی اعتبار سے پارٹی کے اندر ایسی کوئی چپقلش اُن کے خلاف موجود نہ تھی کہ وہ پارٹی چھوڑ کر چلے جاتے۔ ملک صاحب کے ساتھ دوستی اور محبت کی وہ آخری رات تھی۔ اُس رات کے بعد میرے اور ملک حامد سرفراز کے راستے بالکل ہی جدا ہو گئے۔

چیئرمین بھٹو کے لاہور جیل میں آنے کے بعد ملک صاحب کی سیاست اور بھی زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں چونکہ ملک صاحب سے مکمل طور پر مایوس ہو چکا تھا۔ میں نے چیئرمین بھٹو کو جیل میں جا کر بتایا کہ ملک صاحب نے آپ کے پیغام کا کچھ جواب نہیں دیا۔

اُسی روز ملک حامد سرفراز اور اُس کے ساتھیوں کا اخبار میں بیان تھا کہ بھٹو کی آمریت کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ چیئرمین بھٹو کو ملک کے اِس بیان پر بہت افسوس تھا۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب بھٹو صاحب کے بہت قریب کھڑے تھے۔ ملک کے ذکر کے ساتھ ہی مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ شاعر ورکروں کو ساتھ لو اور حامد سرفراز کو مارو۔ اِس کو سبق ملنا چاہیے۔ میرے لئے ڈاکٹر مبشر حسن کی بات بہت حیران کن تھی۔ اِس لئے کہ نہ تو میرا ایسا مزاج تھا اور نہ ہی میں ایسا کر سکتا تھا۔ میں تو ابھی خاموش کھڑا تھا کہ احمد رضا قصوری بول پڑا۔ آپ فکر نہ کریں سر! میں ملک حامد سرفراز کا مزاج درست کر دوں گا۔

ایک سیاسی جماعت کے اندر خرابی پیدا ہونے کی ابتدا

پاکستان پیپلز پارٹی جس کو چیئرمین بھٹو اور اُن کے ساتھیوں نے انتہائی خلوص کے ساتھ جنم دیا تھا۔ اِس سیاسی جماعت کا اسٹیبلشمنٹ جس طریقے سے ناطقہ بند کر رہی تھی، دنیا کے کسی بھی مہذب

www.bhutto.org

اور قانون پسند ملک میں اُس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اِس سے ظاہر تو یہی ہو رہا ہے کہ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ پاکستان میں کوئی حقیقی سیاسی جماعت بنانے کی اجازت ہی نہیں دینا چاہتی تھی۔ ایک ایسی جماعت جس کی ابھی عمر سالوں کی نہیں مہینوں کی تھی۔ اُس کے بنانے والے کو قید کر دیا گیا ہے۔ اُس پر جیل میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔ اُس کے ساتھیوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ اُس کی جماعت میں بغاوت کروادی گئی ہے اور ہر طریقے کے ساتھ ظلم اور جبر کے ساتھ اِس سیاسی جماعت کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ اسٹیبلشمنٹ کے اِس طرح کے کردار پر سیاسی قائدین اور سیاسی جماعتوں کے کردار تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ اِن حالات کا شکار ہونے والی سیاسی جماعتیں معمول کی سیاست سے ہٹ کر غیر سیاسی رویوں کا شکار ہو جایا کرتی ہیں۔ غیر نظریاتی بن جایا کرتی ہیں۔ انتقامی روش اختیار کر جایا کرتی ہیں۔ غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جایا کرتی ہیں۔ اِسی غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار بن جایا کرتی ہیں جس غصے اور جھنجھلاہٹ کو ملک حامد سرفراز کے بارے میں آپ نے ڈاکٹر مبشر حسن کی بات میں ملاحظہ کیا کہ کارکن ملک حامد سرفراز کو سبق سکھائیں۔

پاکستان پیپلز پارٹی کو اگر عوام کے درمیان اپنی سیاست کو آگے بڑھانے کیلئے اگر پرامن ماحول نصیب ہوتا تو پیپلز پارٹی کا عوامی اور سیاسی کردار آج کی پیپلز پارٹی سے بے حد مختلف ہوتا۔ بہت بلند کردار ہوتا مگر جب ایک ملک کی طاقتور اسٹیبلشمنٹ ایک سیاسی قائد اور اُس کی سیاسی جماعت کا وجود ہی خطرے میں ڈال دے۔ اُن کو اپنے وجود کو قائم رکھنے کی جدوجہد میں مبتلا کر دے۔ ایسا قائد اور ایسی سیاسی جماعت ملک میں کس طرح معمول کی سیاست کر سکتی ہے۔ کس طریقے سے اپنی روایات قائم رکھ سکتی ہے یا اپنے نظریات پر عمل کر سکتی ہے۔ اِس طرح کے ماحول میں سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہوتی ہے کہ سیاسی جماعتیں کچھ اور راستے تلاش کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ جو راستے اصولوں کی سیاست کے مخالف سمت کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ سیاسی قیادتیں انتقامی بن جاتی ہیں۔

قابل احترام بیگم نصرت بھٹو کی سیاست میں آمد

چیئرمین بھٹو کی گرفتاری کے بعد قیادت کی سطح پر ہمارا عوام سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اُن کے بعد پارٹی میں ایسا کوئی دوسرا قد کاٹھ کا سیاست دان نہیں تھا جو عوام کو اپنی طرف کھینچ سکتا۔

www.bhutto.org

ہماری تحریک صرف کارکنوں اور طالب علموں کی جدوجہد پر چل رہی تھی جو کبھی گرم اور کبھی سر پڑ جاتی تھی۔ اِس میں ایک تسلسل نہیں تھا۔ جہاں تک پاکستان کے دوسری حزبِ اختلاف کی سیاسی جماعتوں کا تعلق تھا، وہ ایک طرح سے پاکستان پیپلز پارٹی سے الگ تھلگ بیٹھی تھیں۔ وہ ہماری تحریک میں شامل نہیں ہونا چاہتی تھیں۔ ہمارے ساتھ ہماری تحریک میں شامل ہونے سے اُن کو اپنے وجود کے ختم ہو جانے کا خوف کھائے جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی کا عوام کی چلائی گئی تحریک پر اس قدر گہرا اثر چڑھ گیا تھا کہ جلسہ جلوس خواہ کسی کا بھی ہوتا تھا۔ نعرہ نصرت بھٹو زندہ باد اور پیپلز پارٹی زندہ باد کا لگتا تھا۔ اِن نعروں سے یہ سیاسی جماعتیں بے حد الرجک تھیں۔

افسوس کی بات تو یہ تھی کہ ایک سیاست دان نے ایوب خان کو آمریت کا تختہ اُلٹنے کا وہ کام جو پاکستان میں حزبِ مخالف کی تمام سیاسی جماعتیں اور سیاست دان 12 سال کے لمبے عرصے میں نہیں کر سکے تھے، اِس کام کو چیئرمین بھٹو نے ایک سال کے مختصر عرصے میں کر کے دکھایا تھا۔ اِس کے باوجود حزبِ مخالف کی سیاسی جماعتیں اور اُن کے قائدین نے مشترکہ انداز میں نہ تو چیئرمین بھٹو کی گرفتاری کی کھل کر مذمت کی تھی اور نہ ہی اُن کی رہائی کیلئے کسی مشترکہ لائحہ عمل اختیار کرنے کا اعلان کیا تھا۔ یہ تمام قائدین چیئرمین بھٹو کی سیاسی کامیابی کو اپنی سیاست کی موت تصور کرنے لگ گئے تھے۔ چیئرمین بھٹو قومی سیاست میں ایک طرح کے جیل میں یک و تنہا کھڑے تھے۔

مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی صورتحال مغربی پاکستان سے بالکل مختلف تھی۔ مشرقی پاکستان کے تمام سیاست دان اور سیاسی جماعتیں شیخ مجیب الرحمٰن کے حق میں سرنڈر کر گئی تھیں۔ مشرقی پاکستان کا کوئی ایک سیاست دان بھی شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف نہیں تھا۔ مغربی پاکستان میں تمام سیاست دان چیئرمین بھٹو کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اُن کی سیاست کا دائرہ کار بھی مغربی پاکستان تک ہی محدود تھا۔ مغربی پاکستان میں ایک نئے سیاست دان ائیر مارشل اصغر خان میدان میں اُترے تھے مگر وہ بھی چند ہی دنوں میں کانٹا تبدیل کر کے اپنے ہم رنگ کبوتروں میں جا ملے تھے جن کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ اِس صورت میں چیئرمین بھٹو کا اپنی بیگم صاحبہ کو سیاست کے میدان میں اُتارنے کا فیصلہ انتہائی بروقت اور درست ثابت ہوا۔ چیئرمین بھٹو اپنے ہر سیاسی اقدام کو تاریخی حوالے سے دیکھتے تھے۔ اُن کے سامنے برصغیر کی سیاست قیادت کی تاریخ موجود تھی۔ جب سیاسی قائدین جیلوں میں چلے جایا کرتے تھے۔ اُن کے بعد اُن کی بیگمات عوامی

جلسوں میں شریک ہوکر لوگوں کے حوصلے بڑھایا کرتی تھیں۔ خاص طور پر متحدہ ہندوستان کی سیاست میں ہندوستانی سیاست دان اکثر انگریز سامراج کی جیلوں میں ہوا کرتے تھے۔اُن کی عدم موجودگی میں اُن کے خاندان کی خواتین تحریکیوں کے تسلسل کو قائم رکھا کرتی تھیں۔ پنڈت جواہرلال نہرو کے خاندان کی خواتین کا ہندوستان کی آزادی کی سیاست میں بہت نمایاں کردار ہوا کرتا تھا۔بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ہمشیرہ نے بھی پاکستان کی سیاست میں ایک تاریخی کردار ادا کیا تھا۔لہٰذا محترمہ فاطمہ جناح کے بعد پاکستان میں چیئرمین بھٹو کے خاندان کی خواتین کا سیاست میں کردار ایک تاریخی مثال ہی نہیں بلکہ پاکستان کی سیاسی تاریخ بن چکا ہے۔جس کا تسلسل چیئرپرسن محترمہ بےنظیر بھٹو کی قیادت اوران کی شہادت کی شکل میں ہماری قومی سیاست کی تاریخ میں ان کے خون سے لکھا جا چکا ہے۔آج بھی اُن کی ذات کو پاکستان کی سب سے بڑی سیاسی قیادت تصور کیا جاتا ہے۔وقت اور تاریخ نے ثابت کیا کہ چیئرمین بھٹو کا محترمہ بیگم نصرت بھٹو کو پاکستان کی سیاست میں اپنی نمائندگی کے لئے میدان میں لانے کا فیصلہ ایک تاریخی فیصلہ تھا۔بیگم نصرت بھٹو نے چیئرمین بھٹو کی عدم موجودگی میں پاکستان پیپلز پارٹی کی سیاسی جدوجہد اور عوام کی چلائی گئی تحریک میں ایک شاندار کردار ادا کیا تھا۔ مجھے چیئرمین بھٹو کے حکم کے مطابق ہر جگہ اور ہر مقام پر بیگم صاحبہ کے ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو بے حد نڈر اور بے حد حوصلہ مند خاتون پایا تھا۔بیگم صاحبہ بھی چیئرمین بھٹو کی طرح اَن تھک اور محنتی قائد تھیں۔

میں نے اُن کو عوامی جلوسوں میں پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے تانگوں اور جیپوں میں جلوس کی قیادت کرتے کھڑے رہتے دیکھا تھا۔نہ تو وہ پولیس کی رکاوٹوں سے خوف کھایا کرتی تھیں اور نہ ہی پولیس کے لاٹھی چارج سے خوف کھاتی تھیں۔بیگم صاحبہ نے سب سے پہلے جلوس کی قیادت قصور شہر میں پیپلز پارٹی کے نکالے گئے احتجاجی جلوس سے کی تھی۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ بیگم صاحبہ کی پہلی عوامی تقریر میں نے تحریر کی تھی۔بیگم صاحبہ چونکہ فارسی دان تھیں لہٰذا اُردو اُن کے لئے بولنا کچھ مشکل نہیں تھا۔بیگم صاحبہ انتہائی استقامت کے ساتھ جلوس کی قیادت کرتے ہوئے پولیس کے درمیان سے لوگوں کو لے کر گزر گئیں۔جلوس کے اختتام پر میں نے نظم پڑھی اور بیگم صاحبہ کی تقریر کے بعد جلوس ختم کردیا گیا۔اس جلوس میں احمد رضا اور محترمہ سمعیہ گجرات اور بیگم عبادا حمد خان بھی شامل تھیں۔

www.bhutto.org

دوسرے دن ہم کو گوجرانوالہ جانا تھا۔ گوجرانوالہ کے بعد جہلم میں بیگم صاحبہ کو جلوس کی قیادت کرنا تھی۔ اِن جلوسوں میں ایک تو پولیس کا لاٹھی چارج بیگم صاحبہ کو پریشان کررہا تھا۔ دوسرا احمد رضا پریشانی کا باعث تھا۔ وہ ہر جلوس میں بیگم صاحبہ سے بھی آگے گاڑی میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ اخباروں والے بہت شور کرتے کہ بیگم صاحبہ کے آگے سے ہٹ جاؤ تاکہ وہ بیگم صاحبہ کی تصویر بنا سکیں مگر وہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

بیگم صاحبہ تمام صورتحال برداشت کرتی رہتیں مگر منہ سے کچھ نہ کہتی تھیں۔ احمد رضا قصوری کو تصویر اُتروانے کا صرف شوق نہیں تھا، سودا تھا۔ وہ اپنی شکل نمائی میں پاگل تھا۔ کسی ڈانٹ ڈپٹ سے ذرا شرمندہ نہیں ہوتا تھا۔ لاہور کے جلوس میں وہ بیگم صاحبہ سے بھی پہلے تانگہ میں چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ بیگم صاحبہ نے اُس کو دور سے تانگے پر کھڑا دیکھا۔ اُنہوں نے ورکروں کو حکم دیا کہ پہلے اِس کو نیچے اُتارو۔ پھر میں تانگے پر چڑھوں گی۔ لہٰذا اِس کو زبردستی ریگل چوک میں تانگے سے اُتارا گیا۔

لاہور کا جلوس ناصر باغ سے شروع کیا گیا تھا۔ میری عادت تھی کہ میں اُس وقت تک بیگم صاحبہ کے قریب کھڑا نہیں ہوتا تھا جب تک کہ بیگم صاحب خود نہیں بلاتی تھیں۔ جلوس میں مائیک مجھے دیا گیا۔ میں نے اعلان کیا کہ آج ہمارے ساتھ ہماری بہن جلوس میں شریک ہیں۔ آج اگر پولیس نے کوئی حرکت کی تو ہم پولیس کے تحفظ کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ میری اِس دھمکی پر بعد میں مجھ پر مقدمہ قائم کر دیا گیا تھا۔ جلوس جب لاہور ہائی کورٹ کے مقابل سے گزرا تو وکلا حضرات نے جلوس پر پھول پھینک کر جلوس کو خوش آمدید کہا۔ میں نے لاہور کے جمہوریت پسند وکلا کے نعرے لگوا کر اُن کو سلام پیش کیا۔ ساتھ ہی میں نے میاں محمود علی قصوری زندہ باد کے نعرے لگوائے جس کو عوامی نیشنل پارٹی کے وکلا اور سیاسی کارکنوں نے بے حد پسند کیا تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک سیاسی جماعت کے جلوس میں کسی دوسرے سیاست دان کو زندہ باد کہا جارہا تھا۔ میاں محمود علی قصوری نے دوسرے دن بھٹو صاحب کے ساتھ جیل میں بڑی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ کی پارٹی نے میری کھلے بندوں بہت عزت افزائی کی ہے۔ چیئرمین بھٹو اِن نعروں سے بے حد خوش ہوئے۔ اُنہوں نے بیگم صاحبہ سے کہا کہ آپ نے محمود علی قصوری کے نعرے لگوا کر بے حد سیاسی وسعت نظری کا ثبوت دیا ہے۔ بیگم صاحبہ نے چیئرمین بھٹو کو

بتایا کہ اِس میں میرا کوئی کمال شامل نہیں ہے۔ یہ نعرے اسلم گورداسپوری نے خود ہی لگوائے تھے۔ بھٹو صاحب نے بیگم صاحبہ کو کہا کہ اِس کو میری طرف سے شاباش کہنا۔ میاں محمود علی قصوری ہی کی طرح ریگل چوک کے فٹ پاتھ پر مجھے آغا شورش کشمیری دکھائی دیا۔ میں نے چند نعرے اُس کے بھی لگوا دیئے۔ آغا شورش کشمیری نے اِن نعروں کا اپنے ہفت روزہ چٹان میں بڑی شدومد کے ساتھ ذکر کیا تھا۔ اِس میں تحریر کیا تھا کہ پاکستان کی سیاست میں بھٹو پارٹی پہلی سیاسی جماعت ہے جس نے آغا شورش کشمیری کو عوام میں عزت عطا کی ہے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب آغا شورش کشمیری نے اپنی جون نہیں بدلی تھی۔

لاہور کے جلوس سے دوسرے دن میں بذریعہ ٹرین بیگم صاحبہ کے ساتھ فیصل آباد روانہ ہو گیا۔ فیصل آباد میں مختار رانا نے پیپلز کالونی میں بیگم صاحبہ کے استقبالیے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ٹرین میں بیگم صاحبہ نے مجھے بھٹو صاحب کی جانب سے شاباس دی۔ اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے پوچھا کہ تمہیں میاں محمود علی قصوری کے نعرے لگوانے کا کیسے خیال آیا تھا؟ میں نے گزارش کی کہ چونکہ میاں محمود علی قصوری بھٹو صاحب کے مقدمے میں اُن کے وکیل تھے۔ ظاہر ہے کہ اُنہوں نے کوئی فیس وغیرہ نہیں لی ہوگی۔ لہٰذا ہائی کورٹ کے سامنے زندہ باد کے نعرے لگوا کر میں نے اُن کو پارٹی کی طرف سے احترام پیش کیا تھا۔ میرا یقین تھا کہ وہ اِن نعروں کو پسند کریں گی۔ بیگم صاحبہ کہنے لگیں۔ یہ تم نے بہت اچھا کیا تھا۔ میاں محمود علی قصوری بے حد شریف النفس انسان تھے۔ وہ میرے نعروں سے اِس قدر خوش تھے کہ اُنہوں نے اپنے ایک سینئر کارکن رؤف طاہر کے ذریعے مجھے کھانے پر بلوایا۔ میاں محمود علی قصوری کا کھانا عجیب قسم کے ٹیسٹ کا تھا۔ نجانے وہ کونسا تیل کھانے میں پسند کرتے تھے۔ مجھے کھانے میں مزہ نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ پرہیزی قسم کا کھانا ہوگا۔

بیگم نصرت بھٹو کے عوامی جلسوں میں عوام کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ راولپنڈی کا جلوس بیگم صاحبہ کی قیادت کا سب سے بڑا جلوس تھا۔ میں نے بھٹو صاحب کے بعد اتنا بڑا جلوس پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ بیگم صاحبہ کا یہ جلوس ایک فیصلہ کن جلوس ثابت ہوا۔ راولپنڈی کے جلوس سے آمریت کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ اِس جلوس کے نعروں کی گونج سے صدر ایوب کے قصرِ صدارت کے درو بام لرز گئے تھے۔ حکومت نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ سڑکوں پر لوگ تھے یا پیپلز پارٹی کے جھنڈے تھے۔

www.bhutto.org

ڈاکٹر مبشر حسن کی شامت آ گئی

عین اس وقت جب چیئرمین بھٹو کا مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ڈاکٹر مبشر حسن نے ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس کر دی۔ انہوں نے اپنی پریس کانفرنس میں حکومت پر الزام لگایا کہ حکومت چیئرمین بھٹو پر بے بنیاد الزامات لگا رہی ہے اور عدالت عالیہ ان غلط الزامات کی روشنی میں چیئرمین بھٹو کو جیل میں قید رکھنے کے لئے مقدمے کو طول دینے کے ڈیلے انگ ٹیکٹس استعمال کر رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان مولوی مشتاق کو ریڈ کرٹن دیکھانے کے مترادف ثابت ہوا۔ مولوی مشتاق نے ڈاکٹر مبشر حسن کو عدالت میں طلب کر لیا۔ مولوی مشتاق نے ڈاکٹر مبشر سے بیان کے بارے میں تصدیق یا انکار کرنے کا کہا۔ مولوی مشتاق کا انداز انتہائی جارحانہ اور بدمعاشانہ تھا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ عین اس وقت جب مولوی مشتاق ڈاکٹر مبشر حسن کو ڈرا دھمکا رہا تھا چیئرمین بھٹو نے کھڑے ہو کر مولوی سے کہا کہ میں تائید کرتا ہوں کہ ان کا مقصد وہ نہیں تھا جو عدالت سمجھ رہی ہے۔ میں عدالت کو کہتا ہوں کہ عدالت میرے دوست کی جان خلاصی کرے۔ عدالت کو جو پوچھنا ہے وہ مجھ سے پوچھ سکتی ہے۔ تب کہیں جا کر قصاب مولوی مشتاق نے ڈاکٹر کی اس وعدے پر جان خلاصی کی کہ وہ کل اخبارات میں اپنے بیان کی تردید شائع کرائے۔

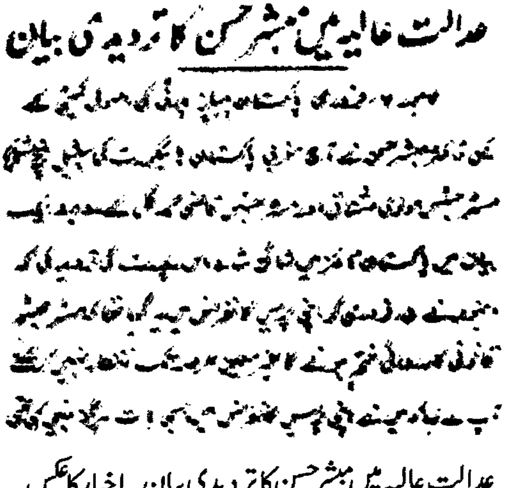
عدالت عالیہ میں مبشر حسن کا تردیدی بیان

عدالت عالیہ میں مبشر حسن کا تردیدی بیان۔ اخبار کا عکس

www.bhutto.org

پٹیشن کی تائید میں نظر بند مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا حلفیہ بیان

میں ذوالفقار علی بھٹو خلف مرحوم سر شاہنواز خان بھٹو، مسلم بالغ، ساکن لاڑکانہ، حال نظر بند در بورسٹل جیل لاہور، مغربی پاکستان، حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ:

1- میں مذکورہ بالا رٹ پٹیشن کے مطابق ''نظر بند'' ہوں۔ جو میری اہلیہ بیگم نصرت بھٹو، مدعی، نے گورنر مغربی پاکستان کے جاری کردہ میری گرفتاری کے اس حکم کو چیلنج کرتے ہوئے دائر کی ہے، جو انہوں نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے رول نمبر 32 کے تحت 12- نومبر 1968ء کو جاری کیا تھا۔

2- میں نے رٹ پٹیشن، مدعا علیہ کی جانب سے داخل کردہ متعلقہ تحریری بیان، نظر بندی کی وجوہ کی تائید میں عدالت عالیہ کے ریکارڈ پر لائے گئے مواد اور اس عدالت عالی وقار کے سامنے ہوم سیکرٹری نے جو بیان دیا تھا اس کا مطالعہ کیا ہے۔

3- میں نے اپنے دستخطوں سے اس عدالت عالی وقار کی خدمت میں پٹیشن کی تائید میں مزید وجوہ پیش کی ہیں۔ اور میں یہاں تصدیق اور اعادہ کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا مزید وجوہ کے مندرجات درست اور مبنی بر حقیقت ہیں اور انہیں اس حلفیہ بیان کا جز قرار دیا جا سکتا ہے۔

4- نظر بندی کا مجریہ حکم قانون کے اعتبار سے غلط اور مدعا علیہ کی بدنیتی پر مبنی ہے تاکہ مجھے قانونی استحقاق کے بغیر، اور غیر قانونی انداز میں نظر بند رکھا جائے۔ میں اس مؤقف کی تائید میں اس عدالتِ عالی وقار کی توجہ کے لئے مندرجہ ذیل حقائق اور وجوہ پیش خدمت کرتا ہوں۔

5- میں پُر زور طور پر ان الزامات کو رد کرتا ہوں جن پر ہوم ڈیپارٹمنٹ کا وہ میمورنڈم مشتمل ہے، جس میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت میری نظر بندی کی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ یہ الزامات حقائق کے اعتبار سے اتنے ہی بے بنیاد ہیں جتنے مقصد کے اعتبار سے بدنیتی پر مبنی ہیں۔ وہ مغز سے خالی ہیں۔ چنانچہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ انہیں قانونی لبادے میں پیش کیا جاتا۔ جو ڈیفنس آف پاکستان رولز کی بدولت بخوبی میسر آ سکتا تھا۔

میں نے 29- نومبر 1968ء کو عدالتِ عالی وقار کی خدمت میں جو تائیدی وجوہ پیش کی تھیں، میں نے ان میں اُن الزامات کو رد کیا تھا جو نظر بندی کی ان وجوہ میں شامل تھے جو مجھے

www.bhutto.org

13-نومبر 1968ء کو دی گئی تھیں۔ میں اس موقع پر پورے زور سے اس مؤقف کا اعادہ کرتا ہوں کہ یہ الزامات جھوٹ کا پلندہ ہیں بدنیتی پر مبنی ہیں۔ اور ان کا مقصد غیر دیانتدارانہ ہے۔ میں نے متعدد مقامات پر طویل تقریروں کے دوران جو زبانی بیانات دیئے اور اشارات کئے تھے انہیں دیدہ دانستہ سیاق و سباق سے جدا کیا گیا ہے بلکہ توڑا مروڑا گیا ہے۔ میں نے امور مملکت کے بارے میں کوئی راز افشائی نہیں کی کہ جس سے بیرونی طاقتوں کے ساتھ پاکستان کے روابط پر کوئی حرف آتا ہو، نہ ہی میں نے عوام کو خصوصاً طلباء کو برانگیختہ کیا ہے کہ وہ قانون شکنی کریں یا تشدد پر اتر کر بدنظمی پھیلائیں۔ مثال کے طور پر میں یہ عرض کروں گا کہ (حکومت کو بدلنے کے لئے) ''آخری دھکے'' کی اصطلاح کا استعمال مجھ سے بالکل غلط اور شر انگیز سیاق و سباق میں منسوب کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے یہ اصطلاح آئینی مؤقف کے دائرے میں رہتے ہوئے استعمال کی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے خاص طور پر ان دنوں کی صحیح صحیح تعداد بیان کی تھی جو آئین کے مطابق اس حکومت کے عہد کے باقی رہ گئے ہیں مثلاً میں نے لاہور میں 11-نومبر 1968ء کی تقریر میں کہا تھا کہ حکومت کے پاس صرف بارہ مہینے اور انیس دن رہ گئے ہیں۔ اسی طرح میں نے سابق صوبہ سرحد میں تقریروں کے دوران دنوں کی صحیح صحیح تعداد بیان کی تھی جو انتخابی عمل کے ذریعے حکومت کو تبدیل کرنے میں باقی رہ گئے ہیں۔

میں نے حیدرآباد میں میر رسول بخش تالپور کی کوٹھی کے صحن میں ایک محدود اجتماع سے اڑھائی گھنٹے سے زائد زبانی خطاب کیا۔ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی اس کنونشن میں یہ اعلان کیا تھا کہ اگر مشرقی پاکستان سے صدارتی انتخابات کے لئے کوئی متفقہ امیدوار سامنے نہ آیا، اور اگر مغربی پاکستان سے بھی کسی پر سمجھوتہ نہ ہو سکا تو میں خود انتخاب لڑوں گا یہ حقیقت میری اس نیت کی بہترین ترجمانی ہے کہ میں حکومت کے خلاف آئینی جدوجہد شروع کرنا چاہتا تھا۔

کوہاٹ میں بھی میں نے ایک گھنٹے سے زائد زبانی خطاب کیا، نظر بندی کی وجوہ میں غلط طور پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ میں نے اس تقریر میں یہ کہا تھا کہ اگر حکومت میرے حق میں دستبردار نہ ہوئی تو میں بزور اقتدار پر قبضہ کرلوں گا۔ اپنی تقریروں میں میں نے کہیں بھی اس طرح کا بے سروپا دعویٰ نہیں کیا۔

پٹیشن کی تائید میں نظر بند مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا حلفیہ بیان

پٹیشن کی تائید میں نظر بند مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا حلفیہ بیان۔ اخبار کا عکس

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کا جیل میں حکومت کو اُلٹی میٹم

6-فروری 1969ء کو روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت کے مطابق چیئرمین بھٹو نے لاہور بورسٹل جیل میں ایوب خان کی حکومت کو الٹی میٹم دیتے ہوئے اعلان کیا کہ حکومت ایک ہفتے کے اندر اندر ملک سے ہنگامی حالات ختم کرنے کا اعلان کرے اگر حکومت نے ہنگامی حالات ختم کرنے کا اعلان نہ کیا تو وہ جیل میں تادمِ مرگ بھوک ہڑتال کریں گے۔

چیئرمین بھٹو نے مولوی مشتاق کی عدالت کا بائیکاٹ کر دیا

چیئرمین بھٹو جیل میں بھی بہت ویل انفارمنڈ انسان تھے۔ ہر بات سے آگاہ تھے۔ اُنہوں نے جب عوام کے موڈ کا اچھی طرح تجزیہ کر لیا تو اُنہوں نے عدالت سے اپنا مقدمہ واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں عدالت سے اپنی رہائی کی درخواست واپس لینے کا اعلان کرتا ہوں۔ میں اپنی رہائی کے مسئلے کو پاکستان کے عوام کی عدالت میں رکھنا چاہتا ہوں۔ اب پاکستان کے عوام مجھے رہا کرائیں گے تو میں رہا ہو جاؤں گا۔ میں اپنی رہائی کے لئے کسی قسم کی مزید قانونی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔ بھٹو صاحب کا یہ اچانک فیصلہ مولوی مشتاق کی عدالت پر بم بن کر گرا۔ مولوی مشتاق ایک شکست خوردہ حکومت کے خلاف چیئرمین بھٹو کی رہائی کا فیصلہ دے کر عدلیہ کا ہیرو بننا چاہتا تھا۔ مولوی مشتاق بھٹو صاحب کا مقدمے کا بائیکاٹ کرنے کی وجہ سے بہت سٹپٹایا۔ اُس نے میاں محمود علی قصوری سے کہا کہ میاں صاحب بھٹو کو سمجھائیں۔ میں تو فیصلہ ان کے حق میں دینا چاہتا ہوں۔ چیئرمین بھٹو نے کہا۔

میاں صاحب میں عوام کا کریڈٹ مولوی مشتاق کو نہیں دینا چاہتا

بھٹو صاحب نے میاں محمود علی قصوری سے کہا کہ میاں صاحب! مولوی مشتاق انتہائی موقع پرست انسان ہے۔ یہ مقدمے کی ابتدا میں کسی قدر حکومت کا ساتھ دے رہا تھا۔ یہ جیل کے کمرہ عدالت میں چند وکلاء کے علاوہ میرے پارٹی کے کسی دوست کو اندر بیٹھ کر مقدمہ سننے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ عدالت میں میری بیگم بھٹو کے ساتھ بات کرنے تک پر معترض تھا۔

www.bhutto.org

آج جب پاکستان کے عوام نے ایوب خان کی آمریت کو پاش پاش کر دیا ہے۔ آج جب حکومت بے بس ہو چکی ہے۔ آج جب عدالت کے باہر بھٹو زندہ باد کے نعرے لگ رہے ہیں۔ آج مولوی مشتاق انصاف کا چیمپئن بننا چاہتا ہے۔ میری رہائی کا تمام کریڈٹ عوام کے سر ہوگا۔ میں یہ اعزاز کسی دوسرے کو ہرگز نہیں دوں گا۔

مولوی مشتاق دوسرے دن عدالت لگا کر بیٹھا رہا مگر بھٹو صاحب نے اپنے جیل کے کمرے سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ جب میں نے اپنا مقدمہ ہی واپس لے لیا تو اب میرا عدالت کے ساتھ کوئی سروکار باقی نہیں رہا۔ میں عدالت میں جانے کا پابند نہیں رہا۔ مولوی مشتاق جو اپنی فرعونیت کی عدالت لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کو جب جیل احکام نے بھٹو صاحب کے عدالت میں آنے سے انکار کا بتایا گیا تو وہ بے حد طیش میں آ گیا۔ میاں محمود علی قصوری سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ یہ میری توہین کی گئی ہے۔ اِس کے ساتھ ہی وہ عدالت کو ختم کرنے کا اعلان کر کے جیل سے باہر چلا گیا۔ (میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کہ مولوی مشتاق اُسی دن سے چیئرمین بھٹو کا دشمن بن گیا تھا۔ اِس لئے کہ وہ وڈا اقصائی بڑا کینہ پرور مشہور تھا)

چیئرمین بھٹو کا عدالت کے بائیکاٹ کا فیصلہ عوام میں بہت پسند کیا گیا۔ بیگم بھٹو کے جلوس میں لوگوں نے نعرے مارنے شروع کر دیئے کہ جیل کو توڑ کر بھٹو کو آزاد کرائیں گے۔

بندی خانہ جس کو عام زبان میں جیل کہا جاتا ہے۔ کوئی بھی انسان اگر اُس کو بے گناہ محبوس کر دیا گیا ہو تو وہ شخص قدرتی طور پر اپنے اندر سچائی کی ایک قوت محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ آنے والے واقعات کو آزاد لوگوں کی نسبت زیادہ سمجھنے کی استطاعت رکھنے کا حامل ہو جاتا ہے۔ چیئرمین بھٹو کا عدالت کے بائیکاٹ کا فیصلہ اِسی اندرونی قوت کا نتیجہ تھا۔ اُن کے دل کا آئینہ آنے والے حالات کو دوسرے لوگوں سے بہتر دیکھ رہا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ اُن کے عدالت کے بائیکاٹ کے فیصلے کے ساتھ ہی حکومت نے اُن کو جیل خانے سے آزاد کر کے لاڑکانہ میں اُن کے گھر المرتضیٰ میں نظر بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جیل سے چیئرمین بھٹو کی لاڑکانہ روانگی

12- جنوری 1969ء کو حکومت نے چیئرمین بھٹو کے عدالت کے بائیکاٹ کرنے اور بھوک

www.bhutto.org

ہڑتال کا الٹی میٹم دینے کے بعد ان کو فوری طور پر لاڑکانہ روانہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ حکومت نے پہلے بھٹو صاحب کو گورنر پنجاب کے ہیلی کاپٹر میں لاڑکانہ جانے سے آگاہ کیا۔ بعد میں گورنر کے ہیلی کاپٹر کے خراب ہو جانے کا بہانہ کر کے کسی دوسرے ہیلی کاپٹر کے ذریعے ان کو لاڑکانہ جانے کی پیش کش کی۔ چیئرمین بھٹو کو حکومت کے اس ہیلی کاپٹر کو تبدیل کرنے پر کچھ شک گذرا۔ انہوں نے بذریعہ ہیلی کاپٹر جانے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے اخبارات میں حکومت کی سازش کرنے کی باتیں شائع ہو گئیں۔ لاہور شہر میں افواہ گرم تھی کہ طیارے میں بم رکھ دیا جائے گا۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو کے انکار کے بعد حکومت نے ان کو بذریعہ خیبر میل لاڑکانے لے جانے کا فیصلہ کیا۔ چیئرمین بھٹو نے مطالبہ کیا کہ ان کے ساتھ ریل میں حفیظ پیرزادہ، ڈاکٹر مبشر حسن اور مصطفےٰ کھر کو بھی سفر کرنے کی اجازت دی جائے۔ صرف مصطفےٰ کھر ہی ان کے ساتھ ریل میں شریکِ سفر ہو سکے۔

اسٹیبلشمنٹ کا ترتیب دیا گیا سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ (DAC)

پاکستان میں ہمیشہ سیاسی جماعتوں کے بنائے گئے ہر متحدہ جمہوری محاذ کے پیچھے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی قوت کارفرما ہوتی ہے۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی خواہش کے برعکس پاکستان میں حزبِ اختلاف کی جماعتوں میں کبھی کوئی اشتراکِ عمل پیدا نہیں ہو سکا۔ اسٹیبلشمنٹ کا پہلا کام تو پاکستان کے سیاست دانوں کو باہم دست و گریبان رکھنا ہوتا ہے تاکہ سیاست دان اور سیاسی جماعتوں کو عوام کے حقوق کی اصل جنگ لڑنے کی فرصت ہی میسر نہ آسکے، تاکہ سیاسی جماعتیں اور سیاست دان آپس میں لڑتے رہیں اور اسٹیبلشمنٹ آرام اور سکون سے حکومت کرتی رہے۔ یہ کاروبار اسٹیبلشمنٹ ہمارے ہوش سنبھالنے سے پہلے سے کرتی چلی آ رہی تھی۔ وہی کاروبار ہمارے ہوش سنبھالنے کے بعد خود ہمارے ساتھ بھی بار بار کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا پاکستان ڈیموکریٹک الائنس بھی اسٹیبلشمنٹ نے ہی بنوایا تھا۔ یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی۔ اب اِس معاملے پر بات کرنا کسی سیاست دان کی کردار کشی تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ اِس لئے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ جس کو نہ جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ میری اِس بات کی تصدیق میں قارئین کتاب کو صرف ایک بات دھیان میں رکھنی ہوگی کہ پاکستان میں سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ عین اُس وقت بنوا دیا جاتا ہے جب پاکستان کی کوئی فوجی حکومت عوام میں بے حد بدنام ہو چکی

www.bhutto.org

ہوتی ہے۔ جب فوجی راج کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کے ڈنڈے اور کوڑے مارنے والوں کے ہاتھ شل ہو چکے ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کے دلوں سے اُن کی جیلوں کی ہیبت ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ جب اُن کی حکومت ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہی ہوتی ہے۔ جب پورے ملک کے عوام فوجی حکمرانوں کے خون کے پیاسے ہو چکے ہوتے ہیں۔ جب پاکستان میں کسی عوامی خونی انقلاب کا خطرہ درپیش ہوتا ہے۔ جب ہر فوجی آمریت کے دن گنے جا چکے ہوتے ہیں۔ جب پاکستان میں امریکی سامراج بھی کسی فوجی حکمران کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ عین اُس وقت پاکستان کے تمام سیاسی جماعتوں کا متحدہ محاذ بنوا دیا جاتا ہے۔ ایک ہی رات میں تمام سیاست دان اور تمام سیاسی جماعتیں اپنے تمام گلے شکوے، لڑائیاں بھلا کر ایک قومی محاذ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ آگ اور پانی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ کسی کا نہ کوئی نظریاتی اختلاف باقی رہتا ہے اور نہ کوئی دائیں اور بائیں کی تمیز باقی رہتی ہے۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ یہ تمام متحدہ محاذ پاکستان کے عوام کے غیظ و غضب سے بچنے کے لئے بنواتی ہے۔ اسٹیبلشمنٹ کے لئے ہر محاذ ایک طاقتور ڈیفنس لائن کا کام دیتا ہے یا کرتا ہے۔ اِس کام کے لئے اسٹیبلشمنٹ بے شمار سرمایہ خرچ کرتی ہے۔

میری اِس بات کی تصدیق کے لئے پاکستان کے ایک سابق کمانڈر انچیف جنرل مرزا محمد اسلم بیگ کا عدالت میں ریکارڈ کیا گیا بیان آج بھی موجود ہے کہ اُنہوں نے سابق وزیر اعظم، چیئر پرسن پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف PNA پاکستان نیشنل الائنس بنانے کے لئے سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کو 14 کروڑ روپیہ فراہم کیا تھا۔ کاش اِس چودہ کروڑ روپے سے کوئی سکول یا ہسپتال بنوا دیا جاتا۔

اسٹیبلشمنٹ کو سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ میں پھوٹ ڈالنے میں آسانی رہتی ہے، چلتی ہوئی تحریک کا رخ موڑنے میں آسانی رہتی ہے۔ تحریک سے خطرہ ہوتا ہے کہ یہ تحریک حکمرانوں کے گھروں کا رُخ نہ اختیار کر جائے۔ عوام کے مشتعل جلوس کا قصرِ صدارت کی طرف آنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ وزیروں اور گورنروں کو عوام کے ہاتھوں تباہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ حکمرانوں کو ہر طرف شہر میں اپنی موت دکھائی دینے لگتی ہے۔ اُس وقت متحدہ محاذوں کے ذریعے عوام کے مشتعل جلوسوں کو لگام ڈالی جاتی ہے۔ متحدہ محاذ میں شامل اسٹیبلشمنٹ کے سیاست دان اور سیاسی جماعتیں عوام کی توجہ اُن کے اصل ہدف سے ہٹا دیا کرتی ہیں۔ ایک سیاسی جماعت عوام کو مشرق کی طرف

www.bhutto.org

لے جانا چاہتی ہے۔دوسری سیاسی جماعت عوام کا رُخ مغرب کی جانب کروا دیتی ہے۔ ہر متحدہ محاذ حکومت کے ساتھ مذاکرات کا اعلان کر کے لوگوں کے جذبات کے بھڑکے ہوئے شعلوں پر پانی ڈالنے کا کام کرتا ہے۔حکومت کے ساتھ مذاکرات کی طوالت میں لوگوں کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے۔اکثر مرتبہ سیاسی جماعتیں آپس میں ہی جھگڑنا شروع کر دیتی ہیں۔کبھی اُن کی جلوسوں میں قیادت کرنے پر لڑائی کروا دی جاتی ہے۔کبھی اُن کی جھنڈے لہرانے پر لڑائی کرا دی جاتی ہے۔ جس طریقے سے ایم۔آر۔ڈی کے موچی دروازے کے جلسے میں ملک حامد سرفراز نے تحریک استقلال کے جھنڈے لہرانے سے پیپلز پارٹی کے ساتھ لڑائی کروا دی تھی اور ائیر مارشل اصغر خان نے ایم۔آر۔ڈی کے جلسہ عام میں پیپلز پارٹی کو وہی دھمکی دی تھی جو اُس نے چیئرمین بھٹو کو اُن کی زندگی میں دی تھی۔ائیر مارشل جیسے غیر سیاسی انسان کی یہ دھمکی بے حد خطرناک تھی۔ایم۔آر۔ڈی کے وجود کو مٹا سکتی تھی۔وہ تو پیپلز پارٹی کے کارکنوں کا سیاسی شعور اِس قدر بلند تھا کہ وہ درگزر سے کام لے گئے تھے۔

1969ء کا متحدہ محاذ

ان تمام مثالوں سے اسٹیبلشمنٹ کا متحدہ محاذ بنانے کی مصلحت اور حکمت کو واضح کرنا مقصود تھا۔1969ء میں بھی پاکستان میں ایوب حکومت کے خلاف لوگوں کی نفرت ایک خونی انقلاب کی تحریک کی شکل میں ظاہر ہوئی تھی۔چیئرمین بھٹو کی قیادت اِس تحریک میں عوام کی نمایاں ترین قیادت تھی۔ اِس طرح مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت بغاوت کا روپ دھارے ہوئے تھی۔پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کو اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے اپنے آزمودہ ہتھیار یعنی سیاسی جماعتوں کے ایک متحدہ محاذ کی ضرورت تھی جو اُس نے ایک ہی رات میں ڈیموکریٹک الائنس کے نام پر بنوا کر کھڑا کر دیا۔

یہاں پر ایک بات یہ بھی واضح رہے کہ یہ جمہوری متحدہ محاذ چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی چلائی گئی تحریک کے خلاف اور صرف چیئرمین بھٹو کی ذات کے خلاف بنوایا گیا تھا۔ اِس محاذ میں پاکستان کی تمام پارٹیوں کو جمع کر دیا گیا تھا۔یہاں تک کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کو بھی جمع کر دیا گیا تھا مگر اِس محاذ سے صرف اور صرف پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

www.bhutto.org

(نوٹ) پاکستان میں آل پارٹی متحدہ محاذ بنانے کے باوا آدم حضرت نواب زادہ نصر اللہ خان ہوا کرتے تھے جو اس کام میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اپنی مثال آپ تھے۔ انتہائی شیریں گفتار انسان ہوا کرتے تھے۔ اُن کی شخصیت کا جادو کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ سیاست کے پنچھی خود بخود پنجروں کی طرف کھنچتے چلے آیا کرتے تھے۔ اُن کی شفقت کے پھندوں میں پنچھیوں کو بے حد سکون ملتا تھا۔ گویا پنچھی مذاکرات زدہ اور قفس زدہ ہو کر رہ جایا کرتے تھے۔ تحریکیں اپنے انجام پر پہنچنے سے پہلے ہی دم توڑ جایا کرتی تھیں۔ اس لئے کہ اُن کے متحدہ محاذ کی کوئی منطقی منزل نہیں ہوا کرتی تھی۔ اُن کا فرمان تھا کہ اُن کا محاذ ایک ٹرین کی شکل کا ہے اور تمام سیاسی جماعتیں مسافر ہیں۔ جس کا جہاں اسٹیشن آ جائے، وہ اُتر جائے۔ یہی وجہ ہوتی تھی کہ جب جمہوریت کی ٹرین آمریت کے شہر پہنچتی تھی، اُس وقت بالکل خالی ہوتی تھی اور آمریت لوگوں سے صاف بچ جایا کرتی تھی۔ یہ اتحاد ہمیشہ عارضی اور وقتی ہوتا تھا۔ تحریکیوں کے منطقی موڑ پر پہنچ کر بکھر جایا کرتا تھا اور خود اُن کے کہنے کے مطابق لوگ جام اپنا اپنا اور سبو اپنا اپنا تھامنے کی روش اختیار کر جایا کرتے تھے یعنی دوبارہ ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ خیر یہ تو ایک ہماری سیاست میں تاریخی نوعیت کی بات تھی۔ جہاں تک نواب صاحب کی ذات کا تعلق تھا، وہ ایک بھاری برگد اور ایک ہمہ صفت شجر سایہ دار تھے۔ بہت فیض و برکت کے انسان تھے۔ اُن کی نگاہ بلند ہی نہیں، بہت بلند تھی۔ اُن کا سخن بے حد دلنواز تھا۔ ایک میر کارواں کے رختِ سفر کا تمام سامان اُن کے پاس موجود ہوتا تھا۔ مگر وائے قسمت کہ اُن کی قافلہ سالاری کا تمام فائدہ اسٹیبلشمنٹ کو ہی حاصل رہتا تھا۔ عوام کی تقدیر میں جلسے جلوس ہی رہا کرتے تھے۔ اس کڑوی صورتحال کے باوجود نہ اُن کی موجودگی میں اُن کا کوئی ثانی تھا اور نہ آج اُن کی غیر موجودگی میں اُن کا کوئی ثانی ہو سکا ہے۔ اُن کے بارے میں میر تقی میر نے کہا تھا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

ہماری بات متحدہ جمہوری محاذ کے معرض وجود میں آنے سے چلی تھی۔ اِدھر بابائے اتحاد نے پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کا سوائے پاکستان پیپلز پارٹی اور بھاشانی گروپ کے اتحاد کا اعلان کیا۔ اُدھر جنرل اور فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان نے گول میز کانفرنس کا اعلان کر دیا۔ ان

www.bhutto.org

دونوں چیزوں میں وقت کا تعین کس قدر موجود ہے۔

قصہ گول میز کانفرنس

فیلڈ مارشل ایوب خان کی حکومت ایک ایسے مردے کی طرح تھے جس کی صرف سانس ہی چل رہی تھی، باقی تمام جسم مفلوج ہو چکا تھا۔ پاکستان کے عوام کی ایک طویل غلامی کے ردِ عمل میں چلنے والی تحریک نے ایوب حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ لوگ جابر حکمرانوں کے تخت و تاج کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتے۔ لوگ ملک کا اقتدار خود اپنے ہاتھوں میں لے لیتے۔ اسٹیبلشمنٹ نے سیاسی اتحاد بنوا کر لوگوں کو سیاسی طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ملک کی سکہ بند لیڈر شپ اور پرانے مسیحا صفت رہنما لوگوں کو امن و آشتی کا درس دینے لگ گئے۔ لوگ حکومت اور سیاست دانوں کے مذاکرات کا شکار ہو گئے۔ (نوٹ) پاکستان میں جب بھی کسی فوجی حکومت کے خلاف کوئی عوامی تحریک جنم لیتی ہے۔ ہر بار اس تحریک کو کسی سیاسی اتحاد سے ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں جب تک کوئی ایک عوامی تحریک اپنا منطقی کردار ادا نہیں کرے گی، پاکستان کی سیاسی صورتحال تب تک ہرگز تبدیل نہ ہو سکے گی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے گول میز کانفرنس کا اعلان کیا کیا کہ پاکستان کے سیاست دانوں کے اسلام آباد کی طرف بھاگ بھاگ کر سانس پھول گئے۔ کوئی ترکی ٹوپی ہاتھ سے تھامے بھاگ رہا تھا۔ کوئی جناح کیپ ہاتھ میں پکڑے بھاگ رہا تھا۔ سیاست دانوں کیلئے ضروری تھا کہ پہلے حکومت کے ساتھ اُصول وضع کرتے کہ کن لازمی نکات پر بات ہو گی۔ مذاکرات کی شرائط کیا ہوں گی۔ اِن باتوں کا کسی کو ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ اُن پر تو صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ کہیں اقتدار کی گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ اِن بھولے بادشاہوں سے کوئی پوچھے کہ اگر فوجیں اتنی آسانی سے اقتدار دینے والی ہوتیں تو وہ پاکستان میں بارہ بارہ سال تک راج نہ کرتیں۔ یہ مذاکرات اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے کیا کرتی ہیں۔ اب تک تو ہمارا تجربہ یہی رہا ہے۔ فوجی حکومتیں جب بھی عوامی دباؤ کا شکار ہوتی ہیں، وہ ملک پر دوبارہ مارشل لا لگا دیتی ہیں۔ اور کچھ سیاست دانوں اور سیاسی پارٹیوں کو اپنی ہنگامی حکومت کی وزارتوں میں شریک کر کے عوام کی تحریک کی کمر توڑ دیا کرتی ہیں اور سیاست دانوں کو مذاق بنا کر رکھ دیا کرتی ہیں۔ جس طرح جنرل ضیاء الحق نے پیر سیاست

www.bhutto.org

حضرت نواب زادہ نصر اللہ خان کو شریک اقتدار کر کے سیاست دانوں کو ذلیل و خوار کیا تھا۔ جنرل ایوب خان کی حکومت نے پہلے 17-فروری کو گول میز کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ بعد میں تاریخ تبدیل کر کے 19-فروری 1969ء کا اعلان کر دیا گیا۔

چیئرمین بھٹو کی بھوک ہڑتال

ڈیموکریٹک اتحاد کے گول میز کانفرنس میں شرکت کے فیصلے کے برعکس چیئرمین بھٹو نے جنرل ایوب خان کی حکومت کی گرتی ہوئی دیوار کو ایک اور پر زور دھکا مارنے کیلئے یا ایک آخری دھکا دینے کے لئے اپنے گھر المرتضیٰ میں تا مرگ بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ چیئرمین بھٹو نے اپنی اس بھوک ہڑتال میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ ملک سے مارشل لا کی حکمرانی کو فوری طور پر ختم کیا جائے۔ ملک میں ایمرجنسی کا خاتمہ کیا جائے اور پاکستان میں بالغ رائے دہی کی بنیادوں پر قومی انتخابات کروانے کا اعلان کیا جائے۔ اِس کے علاوہ شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی کا مطالبہ بھی چیئرمین بھٹو کی شرائط میں شامل تھا۔ بھٹو صاحب کی بھوک ہڑتال کا ایکٹ ہندوستان کے لیجنڈ رہنما مہاتما گاندھی کی طرح کا تھا جو انگریز سامراج سے اپنی مانگیں منوانے کیلئے متحدہ ہندوستان کے وقت وہ اکثر کیا کرتے تھے اور ہمیشہ کامیاب رہا کرتے تھے۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی قومی سطح کے سیاست دان رہنما کی یہ پہلی اپنی نوعیت کی بھوک ہڑتال تھی جو کسی مسلمان سیاست دانوں کے لئے ایک نئی بات تھی۔ چیئرمین بھٹو کا اعلان تھا کہ حکومت نے اگر اُن کے مطالبات کو تسلیم نہ کیا تو وہ اپنی جان کو اپنی قوم پر بھوک ہڑتال کی شکل میں قربان کر دیں گے۔

13-فروری 1969ء کو چیئرمین بھٹو جب لاڑکانہ میں بھوک ہڑتال پر تھے تو ائیر مارشل اصغر خان اُن کی بھوک ہڑتال ختم کرانے کے لئے لاڑکانہ تشریف لے گئے اور کچھ وقت وہ مسٹر بھٹو کے ساتھ رہے۔ بھٹو صاحب نے اُن کی لاڑکانہ آمد پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ ملک کی سیاسی صورتحال پر بات چیت کے دوران بھٹو صاحب نے ائیر مارشل سے کہا کہ کچھ لوگ میرے اور آپ کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مہربانی کر کے اُن سے محتاط رہیے گا۔ مگر سیاست کا بُرا ہو کہ یہ اِس قدر بے رحم چیز ہے کہ اس ملاقات کے کچھ ہی دنوں بعد ائیر مارشل اصغر خان چیئرمین بھٹو کے مقابل کھڑا ہو گیا اور اُس نے اپنی دشمنی کا ہدف چیئرمین بھٹو کو بنا لیا۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو نے گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا

چیئرمین بھٹو کی اِس بھوک ہڑتال میں لاڑکانہ المرتضیٰ میں ہی ممتاز بھٹو اور ملک غلام مصطفےٰ کھر بھی شامل تھے۔ ان بھوک ہڑتالیوں کے علاوہ سندھ، کراچی، بلوچستان، آزاد کشمیر اور پنجاب میں بے شمار سیاسی کارکن تھے جنہوں نے اپنے قائد کی تقلید میں بھوک ہڑتال کر دی تھی۔

16- فروری 1969ء کو گول میز کانفرنس کا اعلان جنرل ایوب خان کی طرف سے عین اُس موقع پر کیا گیا تھا جب چیئرمین بھٹو بھوک ہڑتال پر تھے۔ چیئرمین بھٹو نے بغیر کوئی وقت ضائع کیے بغیر ایوب خان کی گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ ایوب خان حکومت کے مذاکرات کا اعلان ایک دھوکہ، ایک ڈھونگ اور ایک فریب ہے۔ جنرل ایوب خان کے ساتھ مذاکرات کرنا ایک مرتے ہوئے آمر کو زندگی دینے کے مترادف ہے۔ پاکستان کے عوام اگر محض جنرل ایوب خان سے کچھ مراعات حاصل کرنا چاہتے ہوں تو وہ اپنے بچوں کو ایوب خان کی گولیوں کا نشانہ نہ بننے دیتے۔ لوگ پولیس کی لاٹھیاں نہ کھاتے۔ لوگ جیلوں میں نہ جاتے۔ پاکستان کے عوام نے جنرل ایوب خان کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔ وہ اس کی صورت برداشت نہیں کرنا چاہتے۔ مگر پاکستان کے پرانے سیاست دان قوم کی رائے کے خلاف جنرل ایوب خان کے ساتھ گول میز پر بیٹھ کر مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کے مذاکرات قوم کی جدوجہد کے ساتھ کھلی غداری ہوگی۔ چیئرمین بھٹو قوم کو دھوکہ نہیں دے گا۔ وہ ملک وقوم کے دشمن کے ساتھ کسی طرح کے مذاکرات نہیں کرے گا۔ بھٹو کا اور قوم کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ جنرل ایوب خان حکومت قومی اسمبلی کے اسپیکر کے حوالے کر کے خود حکومت سے سبکدوش ہو جائے۔ چیئرمین بھٹو اسٹیبلشمنٹ کی نیت سے واقف تھے۔ وہ اسٹیبلشمنٹ کو اچھی طرح جانتے تھے۔ مگر اسٹیبلشمنٹ چیئرمین بھٹو سے بھی زیادہ ہوشیار تھی۔ اُس نے اکیلے چیئرمین بھٹو کے خلاف پاکستان کے باقی تمام سیاست دانوں کا شیلٹر حاصل کر لیا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ نے سیاست دانوں کو اپنی ڈھال بنا کر استعمال کیا۔ اُس کا اعلان تھا کہ یہ جنرل صدر ایوب خان کی کریڈبلٹی ہی تو ہے کہ ملک کے تمام سیاست دان گول میز کانفرنس میں آنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ مذاکرات پر رضامند ہیں۔ اکیلے ایک بھٹو کے مطالبے کو تمام سیاست دانوں کے مطالبوں سے برتر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کے علاوہ

www.bhutto.org

مغربی پاکستان کے اہم سیاست دانوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کر کے بھٹو کی طاقت کا توڑ کرے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے کانفرنس میں آنے کے بعد بھٹو بالکل ہی اکیلا رہ جائے گا اور اُس کی حیثیت صفر ہو جائے گی۔ سیاستدانوں اور حکمرانوں کی یہ انتہائی منفی قسم کی سوچ تھی۔ چیئرمین بھٹو نے تو خود اپنی بھوک ہڑتال کے مطالبوں میں شیخ مجیب الرحمٰن کی رہائی کا مطالبہ کر رکھا تھا۔ چیئرمین بھٹو کا مطالبہ مجیب الرحمٰن کو بغیر کسی سازش کے یا بغیر مجیب الرحمٰن سے کسی شرط منوانے کا مطالبہ تھا۔ مگر مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے ہمنوا سیاست دانوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اِس شرط پر حکومت سے رہائی دلوائی کہ وہ ایوب خان کی گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گا۔ حالانکہ وقت اور حالات کے پیش نظر ایوب حکومت مجیب الرحمٰن کو اب کسی صورت جیل میں نہیں رکھ سکتی تھی۔ حالات اِس طرح کے پیدا ہو گئے تھے کہ اگر حکومت خود ایک دو دن میں مجیب کو رہا نہ کرتی تو مشرقی پاکستان کے لوگ خود جیل توڑ کر مجیب الرحمٰن کو رہا کرانے کے موڈ میں تھے۔ پاکستان کی تمام حزب مخالف کی سیاسی جماعتوں نے متحدہ ڈیموکریٹک الائنس کی شکل میں چیئرمین بھٹو کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر لیا۔ 21 فروری 1969ء کو فیلڈ مارشل ایوب خان نے آئندہ پاکستان میں ہونے والے انتخابات سے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ ایوب خان کا اعلان تھا کہ وہ صدارتی انتخابات میں آئندہ حصہ نہیں لے گا۔ اس طریقے سے جنرل ایوب خان سٹیپ بائی سٹیپ اپنے حکمرانی کے مقام سے نیچے اُترتا چلا آ رہا تھا۔ تھوڑے سے مزید دباؤ کی ضرورت تھی۔ جس دباؤ کو بڑھانے کے لئے چیئرمین بھٹو نے حزب مخالف کی جماعتوں کے قائم کئے گئے اتحاد میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا اور صدر ایوب خان کے ساتھ مذاکرات کا بھی بائیکاٹ کر دیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کے ساتھ گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے والوں میں مولانا بھاشانی بھی شامل تھے۔ صدر ایوب خان نے جب چیئرمین بھٹو کی بھوک ہڑتال کا سنا تو اُس نے فوری طور پر شیخ مجیب الرحمٰن پر قائم کئے گئے غداری وغیرہ کے تمام مقدمات کو ختم کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کو ڈھاکہ جیل سے رہا کر دیا۔ چیئرمین بھٹو نے مجیب الرحمٰن کو رہائی پر مبارکباد دی۔ اُن کا اخبارات میں بیان تھا کہ ہماری تحریک کی پہلی کامیابی ہے۔ اگر سیاست دان صبر سے کام لیں تو ہماری تحریک کی مکمل کامیابی ہوگی۔ حکومت کے ساتھ مذاکرات حکومت کو آکسیجن فراہم کرنے کے مترادف ہیں۔

www.bhutto.org

ڈیموکریٹک الائنس ایوب خان کی بجائے چیئرمین بھٹو کے خلاف بنایا گیا تھا

محترم نوابزادہ نصر اللہ خان، ولی خان، اصغر خان، ممتاز دولتانہ اور ڈیک میں شامل تمام لیڈروں نے متفقہ طور پر چیئرمین بھٹو اور مولانا بھاشانی کے خلاف بیان جاری کیا کہ یہ دونوں ملک میں خانہ جنگ کرانا چاہتے ہیں۔ یہ ملک کے امن کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کے سرکاری اخباروں اور دائیں بازو کے اخباروں نے چیئرمین بھٹو کے خلاف کردار کشی کی مہم کا آغاز کردیا۔ نوائے وقت نے چیئرمین بھٹو کے بارے میں تحریر کیا کہ بھٹو گول میز کانفرنس کو ناکام بنا کر ملک کو شعلوں کی لپیٹ میں دینا چاہتا ہے۔ آغا شورش کشمیری اپنی اصل شکل کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ اُس نے چیئرمین بھٹو کے بارے میں تحریر کیا کہ بھٹو ملک میں لادین قوتوں کو اقتدار میں لانا چاہتا ہے۔ نوجوانوں کو سوشلزم کا نعرہ دے کر اسلام سے گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ اِس کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر کچھ لوگوں نے چیئرمین بھٹو کے خلاف بغاوت کا اعلان کردیا۔ اِن لوگوں کا بیان تھا کہ گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کرنا غداری ہے۔ اِس باغی ٹولے کے لیڈر ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ اور ملک حامد سرفراز تھے۔ یہ لوگ پہلے بھی پارٹی میں برائے نام ہی موجود تھے۔ اِن لوگوں کو پارٹی کے کسی کام میں شریک نہیں کیا جاتا تھا۔ اُن کے عزائم کافی پہلے ہی عیاں ہو چکے تھے۔ اس بار اُن کی بغاوت سے تنگ آ کر اِن لوگوں کی پارٹی کی بنیادی رکنیت ختم کرنے کا اعلان کردیا گیا۔ اِن لوگوں کو پارٹی سے نکالنے کے ساتھ ہی اِن کی بغاوت کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور یہ تمام لوگ اپنے اپنے مقامات پر واپس چلے گئے۔

مشرقی پاکستان کی پیپلز پارٹی میں بغاوت کروادی گئی

17- فروری 1969ء کو چیئرمین بھٹو کی انفرادی نظر بندی کے احکامات واپس لے لئے گئے۔ اِس کے ساتھ ہی ملک سے ہنگامی حالات کے نفاذ کا خاتمہ کردیا گیا۔ ملک سے مارشل لاء قوانین کو ختم کردیا گیا۔ چیئرمین بھٹو کے تمام ساتھیوں اور باقی سیاسی کارکنوں کو آزاد کردیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو حکومت پہلے ہی آزاد کر چکی تھی۔ اِس طرح چیئرمین بھٹو کی بھوک ہڑتال کے تمام مطالبات کو تسلیم کرلیا گیا۔ چیئرمین بھٹو کی جدوجہد کی یہ ایک تاریخی کامیابی تھی۔ وہ اگر حکومت پر

زیادہ دباؤ قائم نہ رکھتے تو یہ مطالبات حکومت قسطوں میں تسلیم کرتی اور اِس سے بہت سارا وقت ضائع کر دیا جاتا۔حزبِ اختلاف کے سیاست دان چیئرمین بھٹو کی اِس حکمت عملی کو کسی دور کی نگاہ سے دیکھنے کے خواہاں ہی نہیں تھے۔اُن کو ایوب خان سے زیادہ چیئرمین بھٹو سے خوف آتا تھا۔ اِن سیاست دانوں پر بھٹوفوبیا ایسا طاری ہوا جو بھٹو کی موت کے ساتھ بھی اُن سے جدا نہ ہو سکا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اور شیخ صفدر علی مرحوم دونوں کراچی پہنچ گئے۔ہم جب کراچی 70 کلفٹن پہنچے تو اُس وقت بھٹو صاحب سندھ کراچی کے دوستوں اور کارکنوں کے ساتھ ایک اجلاس کی شکل میں بیٹھے تھے۔ہم دونوں کو بھٹو صاحب نے اپنے قریب بٹھالیا۔بھٹو صاحب اُس وقت بڑی اہم بات کر رہے تھے۔وہ کہہ رہے تھے کہ ڈیک (DAC) کے لیڈر گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ پر ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں۔میں اُن کے مذاکرات کے خلاف کچھ نہیں کہہ رہا۔میں تو یہ کہتا ہوں کہ میں اِن مذاکرات میں شریک نہیں ہوں گا۔یہ لوگ اتنے بھولے نہیں ہیں کہ جان بوجھ کر میرے معاملے کو متنازعہ بنائے ہوئے ہیں۔میں اُن سے کہتا ہوں کہ کسی کو میدان میں بھی رہنا چاہیے۔کل جب صدر ایوب خان اور اُس کی اسٹیبلشمنٹ اِن سیاست دانوں کو بے عزت کر کے ملک پر دوبارہ مارشل لا لگا دے گی،اُس وقت یہ لوگ قوم کے سامنے کیا منہ لے کر آئیں گے۔میں میدان میں اِس لئے کھڑا ہوں کہ میدان خالی نہ ہو۔اِن سیاست دانوں کو چاہیے کہ یہ میرے ساتھ ایک قسم کی ورکنگ ریلیشن رکھیں۔میں باہر دباؤ ڈالتا جاؤں گا۔یہ اندر اپنی شرائط منواتے جائیں۔آخری فیصلہ تو انتخابات کے ذریعے قوم کو کرنا ہے۔نہ تو حکمران اُن کو اقتدار دینے والے ہیں،نہ مجھے اقتدار دیں گے۔اِن کو غلط فہمی ہے کہ ایوب خان اِن کو اقتدار دے دے گا۔میں کہتا ہوں کہ دھوکہ نہ کھاؤ۔یہی حکومت بہت جلد اِن پر اقتدار کے ہوس کے بھوکے مسافر ہونے کا الزام لگائے گی۔میں اِس الزام سے باہر رہنا چاہتا ہوں۔میں کل صبح ڈھاکہ جا رہا ہوں۔ڈھاکہ سے واپس سیدھا لاہور اور راولپنڈی جاؤں گا۔چیئرمین بھٹو کا ڈھاکہ جانا اِس لئے ضروری تھا کہ وہ انتہائی جلدی میں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملنا چاہتے تھے۔اُس کو اُس کی رہائی پر مبارکباد دینا چاہتے تھے۔دوسرے چیئرمین بھٹو کا مقصد شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ایک سیاسی اتحاد قائم کرنا تھا۔شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کا مقبول ترین لیڈر تھا۔بھٹو صاحب مغربی پاکستان کے مقبول ترین قائد تھے۔چیئرمین بھٹو کی یہ سوچ اور یہ کوشش کامیاب ہو جاتی تو آج ہماری قومی تاریخ کچھ اور

www.bhutto.org

ہوتی مگر ہم اتنے خوش قسمت ہر گز نہیں ہو سکتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ مجھے چیئر مین بھٹو نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اب جب بھی وہ ڈھاکہ جائیں گے، مجھے اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ میں نے بھٹو صاحب کو یاد دلایا کہ آپ نے مجھے ڈھاکہ ساتھ لے جانے کا فرمایا تھا۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ حالات بہت مختلف ہو گئے ہیں۔ اِس وقت پارٹی کے اندر وہاں حکومت نے بغاوت کھڑی کر دی ہے، انتہائی ہنگامی حالات ہیں۔ جب کبھی امن وامان ہوگا تو پھر تمہیں وہاں لے جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کی پیپلز پارٹی کے اندر بغاوت کا پس منظر یہ تھا کہ بھٹو صاحب مغرب پاکستان میں پیپلز پارٹی کے قیام کے بعد ملک حامد سرفراز کے ساتھ مشرقی پاکستان گئے تھے۔ ملک حامد سرفراز چونکہ بنگال کے سیاسی کارکنوں سے واقف تھے۔ لہٰذا ملک حامد سرفراز کی مدد کے ساتھ مشرقی پاکستان کی پیپلز پارٹی کا ڈھانچہ کھڑا کیا گیا تھا۔ یہاں پر یہ بات یاد رہے کہ ملک حامد سرفراز نے جن لوگوں کو پیپلز پارٹی کا عہدے دار بنوایا تھا، وہ باقاعدہ بھٹو صاحب سے نقد رقم لے کر پارٹی کے عہدوں پر قائم کئے گئے تھے اور اُن کے دفتر کھولنے کے تمام اخراجات بھی بھٹو صاحب نے ہی ادا کئے تھے۔ گویا وہ لوگ مشرقی پاکستان کے بکاؤ قسم کے نام نہاد سیاسی کارکن تھے۔ صدر ایوب خان کی حکومت نے جب اُن کو بھٹو صاحب سے بڑھ کر دام دے دیئے تو اُنہوں نے بھی بھٹو صاحب کے گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کرنے کے فیصلے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا اور مشرقی پاکستان میں ملک حامد سرفراز ہی کی طرح کے ایک فارورڈ بلاک کا اعلان کر دیا۔ چیئر مین بھٹو نے اِن تمام لوگوں کو پارٹی سے نکال کر ڈھاکہ میں نئے سیاسی لوگوں کو پیپلز پارٹی کی کمان سونپ دی جن کا لیڈر ایک قاسم نامی سیاست دان کو بنایا گیا تھا۔

چیئر مین بھٹو کی ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ملاقات

مشرقی پاکستان میں چیئر مین بھٹو کی پوزیشن بالکل اِسی طرح تھی جس طرح مغربی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی تھی۔ جس طرح شیخ مجیب الرحمٰن کی مغربی پاکستان میں عوامی لیگ کے نام سے کوئی موثر تنظیم نہ بن سکی تھی، ٹھیک اِسی طرح مشرقی پاکستان میں بھی چیئر مین بھٹو کی پیپلز پارٹی کی بھی کوئی موثر تنظیم بنگال میں نہ بن سکی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ اگر پاکستان متحد رہتا تو ان دونوں جماعتوں کی سیاسی تنظیمیں ایک فعال شکل میں دونوں حصوں میں قائم ہو جاتیں، یا اِن ل بڑی

www.bhutto.org

قیادتوں کا آپس میں مشرق ومغرب میں کوئی سیاسی اتحاد قائم ہو جاتا۔ مگر مقدر میں ہی نہیں تھا۔ ڈھاکہ میں چیئرمین بھٹو کی شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ بہت اچھی ملاقاتیں رہیں۔ شیخ چونکہ ایک لمبے عرصے سے عملی سیاست سے کٹا ہوا تھا۔ اُس نے بھٹو صاحب سے مغربی پاکستان کے عوام کی سوچ کے بارے میں پوچھا۔ چیئرمین بھٹو نے مجیب الرحمٰن کو صاف صاف کہہ دیا کہ مغربی پاکستان کے عوام کو آپ کے چھ نکات کے کچھ نکتوں پر اعتراض ہے۔ آپ اِن نکتوں پر نظر ثانی کر لیں۔ ڈھاکہ میں بقول چیئرمین بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اُن کی گول میز کانفرنس کے بارے میں تفصیل سے بات چیت ہوئی۔ جس میں بھٹو صاحب نے خود اُن کے بقول شیخ مجیب الرحمٰن کو گول میز کانفرنس کے بارے میں گفتگو کرنے کیلئے آسانی فراہم کرتے ہوئے اپنی بات کا آغاز ہی اِس طرح کیا کہ آپ تو چونکہ مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کے ساتھ وعدہ کر چکے ہیں کہ آپ گول میز کانفرنس میں شرکت کریں گے۔ آپ کانفرنس میں ضرور جائیں مگر اِس سے بہت زیادہ مطالبوں کی بجائے صرف ایک ہی مطالبہ کیا جائے کہ وہ اقتدار کو فوری طور پر قومی اسمبلی کے سپیکر کو منتقل کر دے۔ اِس کے علاوہ صدر ایوب خان کے ساتھ کوئی اور بات نہ کی جائے۔ ہمارے اِس ایک مطالبے کی تکمیل سے ہمارے تمام مطالبات پورے ہو جائیں گے۔ صدر ایوب خان کے پیچھے بیٹھے ہوئے جرنیل ایوب خان کو کبھی اِس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ سیاست دانوں کو اقتدار سونپ کر فارغ ہو جائے۔ وہ ہر قیمت پر اِس کو ڈٹا رہنے پر آمادہ کر لیں گے۔ خود ایوب خان بھی سیاست دانوں پر کبھی اعتماد نہیں کرے گا۔ اِس وقت سب سے بڑا خطرہ ملک پر ایک تازہ مارشل لاء کے نفاذ کا منڈلا رہا ہے۔ فوجی جنرل کسی صورت میں بھی اقتدار سے باہر نہیں ہونا چاہیں گے۔

اِس صورت میں جنرل ایوب خان کو فوری طور پر راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ وہ ایک ہی راستہ ہے کہ سپیکر قومی اسمبلی کو حکومت دینے کا مطالبہ کر دیا جائے۔ آپ کو اِس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اِس لئے کہ سپیکر بنگالی ہے۔ سپیکر قومی اسمبلی کو اگر اقتدار مل جائے تو اُس کے ساتھ انتخابات کے وقت کے تعین کا فیصلہ اور دوسرے فیصلے قائم کرنا ہم سب کے لئے ممکن بھی ہوگا اور آسان بھی ہوگا۔ ہماری پہلی مصلحت اور کوشش ہی یہی ہونی چاہیے کہ اقتدار کو فوج کے جنرلوں کی کانسٹی چوئنسی یعنی حلقہ اختیار سے باہر لایا جائے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھٹو صاحب کی یہ بات اُس وقت بے حد پسند آئی تھی۔

www.bhutto.org

23- فروری 1969ء کو ڈھاکہ میں انگلش میگزین ہیرالڈ ٹریبون کو بھٹو صاحب کا دیا گیا بیان

چیئرمین بھٹو نے امریکہ کے ایشیا میں کردار کے بارے میں سوال کے جواب میں کہا کہ امریکہ کا ایشیا میں کردار ایک حقیقت ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ امریکہ ایشیا سے نکل جائے۔ پاکستان کو ہر بڑے ملک کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنے ہیں۔ پاکستان چین اور امریکہ ان سب سے دوستی کا خواہاں ہے، ان سب سے فوجی سامان حاصل کرسکتا ہے۔ پاکستان ایک پُرامن ملک ہے۔

24- فروری 1969ء کو بھٹو صاحب کا لاہور کا جلوس اور امریکہ مردہ باد کے نعرے

شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو صاحب کے ساتھ وعدہ کیا کہ میں مغربی پاکستان کے تمام سیاست دانوں کو اِس ایک ہی مطالبے پر آمادہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں آپ کی رائے کے ساتھ سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ اِن باتوں کے علاوہ یہ بھی ایک تاریخی واقعہ ہے کہ چیئرمین بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن ایک ہی جہاز میں ڈھاکہ سے لاہور آئے۔ شیخ مجیب الرحمٰن گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے اسلام آباد چلے گئے۔ چیئرمین بھٹو لاہور میں ہوائی اڈے پر ایک جلوس کی شکل میں لاہور ہائی کورٹ کے مال روڈ چوک تک لائے گئے۔ اُن کے ٹرک پر شعر وغیرہ پڑھنے اور نعرے لگانے کا کام میرے سپرد تھا۔ میں نے کئی مقامات پر ''مجیب بھٹو بھائی بھائی'' کے نعرے لگوائے۔ بھاشانی بھٹو بھائی بھائی کے نعرے لگوائے۔ میرا یہ پنجابی کا نعرہ لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔ ''شیر توڑ زنجیراں آگیا'' یعنی شیر زنجیریں توڑ کر آ گیا۔ یہ نعرہ اُن کی رہائی کے متعلق تھا۔ بھٹو صاحب اِس نعرے پر باقاعدہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر لے جا کر زنجیریں توڑنے کا اشارہ دیتے تھے۔ اِس جلوس میں ایک بات یہ تھی کہ کچھ مخصوص قسم کے لوگ ہر چوک میں امریکہ مردہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ امریکہ مردہ باد کے نعرے لکھ کر مجھے کاغذ پکڑاتے تھے کہ ٹرک پر بھی امریکہ مردہ باد کے نعرے لگائے جائیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اصل معاملہ تو اِس وقت گول میز کانفرنس کے بائیکاٹ کا تھا۔ ایوب خان کو اقتدار سے باہر کرنے کا تھا۔ میرے اِن نعروں کا ہدف ایوب خان تھا۔ میرا مطالبہ تھا کہ ایوب خان قومی اسمبلی کے سپیکر کو اقتدار دے کر خود اقتدار سے دستبردار ہو جائے۔ اُس

www.bhutto.org

وقت کی صورتحال کے پیش نظر اِس کے علاوہ کسی اور نعرے کی کوئی تُک ہی نہیں بنتی تھی۔ مگر کچھ لوگ جن میں ہماری پارٹی کا امان اللہ خان بھی شامل تھا، وہ امریکہ مردہ باد کا نعرہ مار مار کر ہلکان ہوا جاتا تھا۔ جب بھٹو صاحب نے بینک اسکوئر لاہور کے مال روڈ چوک میں جہاں اُن دنوں امریکی قونصلیٹ کا دفتر تھا، وہاں جلوس کی اختتامی تقریر کا آغاز کیا تو اُن کی تقریر کو امان اللہ خان اور شیخ رشید صاحب کے سب سے بڑے انقلابی مزدور لیڈر ضیاالدین بٹ نے بار بار امریکہ مردہ باد کے نعرے لگا کر ڈسٹرب کرنا شروع کر دیا۔ جس پر بھٹو صاحب نے اُن کو خاموش کرانے کیلئے کہا کہ جاؤ امریکہ کو اُٹھا کر بحرِاوقیانوس میں پھینک دو۔ اُنہوں نے یہ الفاظ کافی غصے سے کہے۔ اِس کے بعد یہ تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ بھٹو صاحب کی تقریر کے بعد جلوس ختم کر دیا گیا۔ چیئرمین بھٹو نے ٹرک سے نیچے اُترتے ہوئے مجھے حکم دیا کہ میں اُن کے پاس ہوٹل آ کر اُن کو ملوں۔ میں اُن کے پیچھے ہوٹل گیا۔ وہاں اُن کے پاس اُس وقت شیخ محمد رشید، ممتاز علی بھٹو اور شیخ صفدر علی مرحوم بیٹھے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا کہ کل تم نے راولپنڈی کے جلوس میں ٹرک پر میرے ساتھ رہنا ہے۔ جس طرح تم نے آج ٹرک پر سے لوگوں کو نعرے لگوائے ہیں، اِسی طرح وہاں نعرے لگوانا۔ شیخ مجیب کا نعرہ بھی لگواتے رہنا۔ مجھ سے پہلے بھٹو صاحب کی محفل میں امریکہ مردہ باد کے نعروں کی بات چل رہی تھی۔ بھٹو صاحب نے شیخ رشید سے کہا کہ شیخ صاحب! اِن نعروں سے لوگوں کا کیا مقصد ہے؟ وہ کیا چاہتے ہیں؟ آج صورتحال تو گول میز کانفرنس کی ہے۔ ایوب خان کو نکالنے کی ہے۔ یہ لوگ ایوب خان مردہ باد کہتے ہی نہیں، امریکہ مردہ باد کہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے تیز انتہا پسندی کے نعرے لگا کر اپنی ذات کی اصلیت کو چھپانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگوں کی ڈائریکشن تبدیل کرتے ہیں۔ ہمارے اصل نشانے سے لوگوں کی توجہ ہٹاتے ہیں۔ میں حکومت میں رہا ہوں۔ اِن تمام باتوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں کسی ٹریڈ یونین کا لیڈر نہیں ہوں۔ میں قوم کی نمائندگی کر رہا ہوں۔ میری سیاست قومی بھی ہے اور بین الاقوامی بھی ہے۔ لوگوں کی سیاست کا دائرہ بے حد محدود ہے۔ وہ مجھے بھی محدود کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اِن لوگوں کو سمجھائیں۔ شیخ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ اِن نعرے لگانے والوں میں میرا کوئی ورکر نہیں تھا۔ میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ ضیاالدین بٹ جس کو آپ نے مزدور محاذ کا انچارج بنا رکھا ہے، سب سے زیادہ نعرے وہ لگا رہا تھا۔ شیخ صاحب نے کہا کہ بھٹو صاحب! میں اِن لوگوں کو ہر طرح سمجھاؤں گا۔ یہ

ٹریڈ یونین کے لوگ ہیں۔ اس طرح کی نعرے بازی اِن کی عادت بن چکی ہے۔ بھٹو صاحب کی مجلس سے اُٹھ کر جب ہم لوگ ہوٹل سے باہر آگئے تو شیخ صاحب نے مجھ سے گلہ کیا کہ آپ نے ضیاء الدین بٹ کا نام کیوں لیا۔ میں نے شیخ صاحب کو کہا کہ شیخ صاحب! ضیا الدین بٹ کے بارے میں خود ٹریڈ یونین کے لوگوں کی اچھی رائے نہیں ہے۔ اِن لوگوں کو ایک ٹریڈ یونین اور سیاسی پارٹی میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے۔

بابائے سوشلزم نے میری یہ تمام باتیں پارٹی کے دفتر میں امان اللہ خان اور ضیا الدین بٹ کو کہہ دیں۔ اُن دنوں میں زیادہ تر پارٹی کے دفتر میں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ دونوں کامریڈ میری موجودگی میں خاموش ہو جاتے ہیں اور اِس کے علاوہ کچھ کھچے کھچے بھی رہتے ہیں۔ اِن دلچسپ باتوں کا ذکر کبھی بعد میں کیا جائے گا۔ میں شیخ صفدر علی مرحوم کے ساتھ چیئر مین بھٹو کے حکم کے مطابق دوسرے دن صبح گیارہ بجے کے قریب اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر پہنچ گیا۔ ہوائی اڈے پر بے حد رش تھا۔ خورشید حسن میر ٹرک پر کھڑا کارکنوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ کارکنوں نے مجھے ٹرک پر چڑھا دیا۔ ہمارے جلوس کو تقریباً 12 بجے کے قریب ہوائی اڈے سے پنڈی شہر کی طرف چلنا تھا۔ عین اُسی وقت صدر پاکستان ہاؤس میں گول میز کانفرنس کا بھی آغاز ہونا تھا۔ گویا ہمارے جلوس کے آغاز کا اور ایوب خان کی کانفرنس کے آغاز کا ایک ہی وقت تھا۔ یہ سیاسی طور پر بے حد دلچسپ بھی اور سنگین مرحلہ بھی تھا۔ ایک طرف پاکستان کے تمام سیاست دان ایوب خان کی میز پر بیٹھ کر ایوب خان کے ساتھ اپنے معاملات طے کر رہے تھے۔ دوسری جانب چیئر مین بھٹو تنہا اس کانفرنس پر عدم اعتماد کا اظہار کرنے کے لئے اسی شہر میں جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ چیئر مین بھٹو کے لئے یہ معاملہ کچھ رِسکی تھا۔ خطرناک اور رِسکی اس لئے کہ اگر اُن کے جلوس میں لوگوں کی تعداد کم ہوتی تو خود بھٹو صاحب کی قیادت خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ مگر چیئر مین بھٹو قیامت کے معاملہ فہم اور دُور بین انسان تھے۔ وہ لوگوں کے بڑے بناض تھے۔ اُن کو علم تھا کہ لوگ کسی اور ہی موڈ میں ہیں۔ وہ ان پرانے سیاست دانوں کے مذاکرات کی کچھ اہمیت تصور نہیں کرتے۔ لوگ دوٹوک فیصلہ چاہتے ہیں۔ لوگ تبدیلی چاہتے ہیں۔ اُن کی لوگوں کے بارے میں ایس منٹ بے حد درست ثابت ہوئی۔ عوام کے موڈ کے بارے میں اُن کا تخمینہ صحیح نکلا۔ دن کے 12 بجے تک اسلام آباد کے ہوائی اڈے پر انسان ہی انسان تھے۔ اِس قدر انسانوں کا ہجوم پہلے کبھی اسلام آباد

www.bhutto.org

کے ہوائی اڈے پر دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ حالانکہ ہوائی اڈہ شہر سے کئی کلو میٹر دور تھا۔ عین وقت کے مطابق چیئر مین بھٹو ٹرک پر تشریف لے آئے اور ٹرک لوگوں کے ہجوم کے درمیان سے شہر کی طرف چلنا شروع ہو گیا۔ جئے بھٹو کے نعروں سے آسمان گونج اُٹھا۔ ٹرک پر بھی خورشید حسن میر نعرے لگواتا تھا۔ کبھی میں نعرے لگوانا شروع کر دیتا تھا۔ میرے نعروں میں شعر و شاعری کے علاوہ لوگوں کو اصل ہدف پر قائم رکھنے کے لئے چھوٹے چھوٹے تقریروں کے ٹکڑے بھی شامل تھے۔

گول میز کانفرنس اور بھٹو صاحب کا تاریخی جلوس

ہوائی اڈے کے باہر ایک چوک میں لوگوں کا سمندر دکھائی دے رہا تھا۔ جب ہمارا ٹرک اِس سمندر کے درمیان پہنچا تو میں نے نعرہ لگایا۔ وہ نعرہ پنجابی میں تھا (ساڈی گول میز قوم اے) ہماری گول میز قوم ہے۔ میں نے جب اِس نعرے کو بار بار ردھم کی شکل میں لگایا تو لوگ آگے سے جواب دیتے تھے (ہے جمالو) چیئر مین بھٹو کو یہ نعرہ اِس قدر پسند آیا کہ اُنہوں نے میری کمر پر تھپکی دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ایکسی لنٹ (Excellent)۔

مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے بھٹو صاحب کے دل کی بات کہہ دی ہے۔ بھٹو صاحب نے مائیک ہاتھ میں لے کر کہا کہ میری گول میز کانفرنس آپ ہیں۔ قوم ہے۔ ہم اپنی گول میز کانفرنس لیاقت باغ میں کریں گے۔ ایوب خان کی گول میز کانفرنس 15 آدمیوں کی کانفرنس ہے۔ ہماری لاکھوں انسانوں کی کانفرنس ہے۔ چیئر مین بھٹو کے اِن الفاظ نے ساڈی گول میز کانفرنس قوم کے نعرے کو قومی ترانہ بنا دیا۔ میں اگر تھوڑی دیر کے لئے مائیک خورشید حسن میر کو دم لینے کے لئے دے دیتا تو جلوس میں شامل نوجوانوں کے ردھم میں فرق آنے لگ جاتا۔ اُن کے ''ہے جمالو'' کے رقص کی رفتار بھی مدھم پڑ جاتی۔ وہ اشاروں سے کہنے لگ جاتے کہ تم نعرے لگواؤ۔ نوجوانوں کا اشتیاق دیکھ کر بھٹو صاحب نے مجھے آواز دے کر کہا کہ اسلم خود بولو۔ میں پانچوں صوبوں کی جلسہ گاہوں کا نام لے کر نعرے لگواتا تھا۔ ہماری گول میز کانفرنس قصہ خوانی بازار ہے۔ ''پشاور'' ہے۔ ہماری گول میز کانفرنس ''لیاقت باغ'' راولپنڈی ہے۔ ہماری گول میز کانفرنس موچی دروازہ ہے، لاہور ہے۔ ہماری گول میز کانفرنس ''نشتر پارک'' کراچی ہے۔ ہماری گول میز کانفرنس ''ڈھاکہ'' ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن ساڈا بھائی اے۔ ہے جمالو۔ بابا بھاشانی ساڈا

www.bhutto.org

بابا اے۔ ہے جمالو۔ اک بھٹو ساڈا شیر اے۔ ہے جمالو۔ باقی سارے ہیر پھیر اے۔ ہے جمالو۔

ان نعروں نے جنرل ایوب خان کی گول میز کانفرنس کا جنازہ نکال دیا تھا۔ ہمارے جلوس سے ایک روز پہلے ایوب خان نے بہت رونے والی آواز میں لوگوں سے خطاب کیا تھا۔ میرا اِس تقریر کے بارے میں نعرہ تھا۔ ''گیدڑ ریڈیو تے روپیا ہے جمالو'' گیدڑ ریڈیو پر رونے لگ گیا۔ ''ترے پت کھتے جان گے ہے جمالو''۔ تیرے بیٹے کہاں جائیں گے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے سوشلزم کے نعرے پر اُن دنوں دائیں بازو کی جماعتیں پارٹی کو کافروں کی پارٹی کہا کرتی تھیں اور سوشلزم کو کفر کہا کرتی تھیں۔ میں نے نعرہ دیا کہ سوشلزم روٹی کپڑا، ہے جمالو۔ سوشلزم روزگار اے، ہے جمالو۔ ساڈا دین اسلام اے، ہے جمالو۔ سوشلزم کم کار اے، ہے جمالو۔

اِن نعروں سے لوگوں کو آسان انداز میں پارٹی کے منشور کی فلاسفی سمجھ میں آ گئی۔ لوگ ہے جمالو کے رقص پر پارٹی کے نعروں کا جواب دے رہے تھے اور پیپلز پارٹی کے منشور کو پسند کر رہے تھے۔ چیئر مین بھٹو کے اِس جلوس کو پوری دنیا کے ٹیلی ویژن کور کر رہے تھے۔ بی بی سی کے کیمرہ مین نے بھٹو صاحب سے میرے نعروں کے بارے میں پوچھا۔ وہ بے حد حیرت زدہ تھا کہ میرے نعروں پر لوگ دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے کیمرہ مین کو میرے نعرے انگریزی میں ترجمہ کر کے بتائے۔

شام ڈھلے جلوس لیاقت چوک میں پہنچا۔ وہاں بھٹو صاحب نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لوگوں سے خطاب کیا۔ اُن کے خطاب کے بے شمار پہلو تھے۔ سب سے پہلے تو اُنہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستان میں آنے اور اُن کی رہائی پر مبارکباد دی اور اُن کو خوش آمدید کہا۔ اُن کی تقریر کا خلاصہ تھا کہ میں قوم کے خلاف کسی سازش میں شریک نہیں ہو سکتا۔ میں کھلے فیصلوں کا انسان ہوں۔ میرے تمام فیصلے قوم کے مشورے کے ساتھ ہوں گے۔ قوم اگر مجھے ابھی حکم دے کہ میں ایوب خان کی گول میز کانفرنس میں چلا جاؤں تو میں ابھی یہاں سے سیدھا صدر ہاؤس جانے کو تیار ہوں۔ بھٹو صاحب نے یہ الفاظ کہے تھے کہ لوگ آپے سے باہر ہو گئے۔ لوگوں نے ایوب خان کتا کہنا شروع کر دیا۔ لیڈروں کو گالیاں دینا شروع کر دیں اور کہا کہ ہم آپ کو چوروں کے ساتھ شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ بھٹو صاحب نے لوگوں کو بڑی مشکل سے رام کیا کہ بھٹو تمہارا موڈ جانتا تھا۔ اِس لئے وہ گول میز کانفرنس میں نہیں گیا۔ میں آپ لوگوں کا حکم مانوں گا۔ آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ

www.bhutto.org

کے ساتھ جیوں گا۔آپ کے ساتھ ہی مروں گا۔چیئرمین بھٹو کا یہ ایک تاریخی جلوس تھا۔ان کا آخری جملہ تھا میری گول میز قوم اے۔

یہ میرا تو پکی ہے

اس جلوس کا منظر اور پس منظر ایک حقیقی زندہ ڈرامے کی طرح تھا جس کا ایک رُخ گول میز کی شکل میں لوگوں کے سامنے تھا۔ دوسرا رُخ چیئرمین بھٹو کے لوگوں کے درمیان ہونے کا تھا۔ اُن دنوں فلموں کو لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔گول میز کانفرنس کی فلم بری طرح فلاپ ہوگئی۔چیئرمین بھٹو کے عوامی جلسے جلوس کی فلم ہٹ ہوگئی۔اِس لئے کہ لوگوں کے نعروں کی آوازیں گول میز کانفرنس کے ہال تک پہنچ رہی تھیں۔اسٹیبلشمنٹ اور اُس کے لیڈر اکیلے میز کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے تھے اور عوام لاکھوں کی تعداد میں لیاقت باغ میں کھڑے ہوکر اُن کی کانفرنس کی مذمت کررہے تھے۔کانفرنس کو نامنظور کررہے تھے۔لیڈروں کو چور کہہ رہے تھے اور اُن پر عدم اعتماد کا اعلان کررہے تھے۔اتفاق یہ ہوا کہ پہلے روز ہی کانفرنس میں صدر ایوب خان اور اصغر خان کے درمیان تلخ کلامی ہوگئی۔اصغر خان کی تلخ کلامی پر ائیر مارشل نور خان جو اُس وقت ہوائی فوج کا چیف تھا، اور کانفرنس میں بیٹھا تھا۔اُس نے اصغر خان کو کہا کہ تم کس بھرتے پر اتنا اونچی بول رہے ہو۔باہر تو بھٹو اور عوام تم لوگوں کی قیادت پر عدم اعتماد کا اظہار کررہے ہیں۔نور خان کے اِس سخت جملے پر اصغر خان بائیکاٹ کر کے کانفرنس سے باہر آگیا۔نواب زادہ نصراللہ خان دوبارہ اصغر خان کو منا کر کانفرنس میں واپس لے گئے تھے۔

جلوس کے بعد رات کو چیئرمین بھٹو نے اپنے کچھ خاص دوستوں کو پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں مدعو کر رکھا تھا۔ اِن لوگوں میں انگریزی اخباروں کے مشہور صحافی مسٹر برکی بھی شامل تھے۔ دوسرے لوگوں میں جلوس میں شامل بیرونی ممالک کے ٹی۔وی اور ریڈیو کے نمائندے تھے جنہوں نے چیئرمین بھٹو کے جلوس کی کوریج کی تھی۔اُن کے علاوہ جنرل اکبر خان اور کچھ دوسرے انتہائی اہم لوگ اِس دعوت میں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جرنلسٹ برکی نے بڑی بلند آواز میں انگریزی میں کہا ''یو شمیش دی گول میز کانفرنس'' ساتھ ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''تم نے گول میز کانفرنس تباہ کردی ہے۔''

www.bhutto.org

جنرل اکبر خان (پنڈی سازش کیس والے) نے بھی اِن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بھٹو صاحب! آپ کے شاعر نے حکومت اور لیڈروں کی سازش کو ننگا کر دیا ہے۔ بیرونی ممالک کے جرنلسٹوں نے بھی میرے نعروں کی بڑی تعریف کی۔ ایک انگریزی صحافی نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں میری نقل اُتارتے ہوئے کہا "راؤنڈ ٹیبل قوم" یہ تمام لوگ اُس وقت بڑے موڈ میں تھے۔ چیئرمین بھٹو نے مجھے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے حاضرین محفل سے کہا۔ یہ میرا توپچی ہے اور بہت اچھا نشانہ باز ہے۔(He is my guner and a good shooter) انگریز جرنلسٹ چیئرمین بھٹو کو گول میز کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال بتانے لگ گئے۔ یہ انگریز صحافی کانفرنس یعنی صدر ہاؤس سے ہو کر آئے تھے۔ وہ بات یہ تھی کہ کانفرنس کے تمام لیڈر باری باری اپنا نقطہ نظر پیش کر رہے تھے۔ جب شیخ مجیب الرحمٰن کی باری آئی تو شیخ صاحب نے پہلے صدر ایوب خان کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے مجھے رہا کیا اور گول میز کانفرنس میں آنے کی دعوت دی۔ میں کانفرنس میں شامل لیڈر نوابزادہ نصر اللہ خان اور ولی خان پر مکمل اعتماد کرتا ہوں۔ جو اِن کا فیصلہ ہوگا، مجھے وہ منظور ہوگا۔ اِس بات پر صدر ایوب خان نے کہا کہ آپ لوگ ملک میں جلسے جلوس بند کروائیں، تب بات آگے بڑھائی جائے گی۔ اور اِس کے ساتھ ہی گول میز کانفرنس کا پہلا راؤنڈ ختم ہو گیا۔ یہ کانفرنس 10 مارچ 1969ء سے لے کر 12 مارچ 1969ء تک چلتی رہی تھی۔ واضح رہے کہ تمام پاکستان میں ایوب خان کی گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے والے لیڈروں میں صرف مولانا بھاشانی اور چیئرمین بھٹو ہی کانفرنس سے باہر رہے تھے۔ باقی تمام سیاست دان گول میز کانفرنس میں شریک ہو گئے تھے۔

آغا شورش کشمیری کی پیپلز پارٹی کو گالیاں

مجھے یاد ہے کہ راولپنڈی کے اِس جلوس کے دوسرے دن عید تھی۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ وہ بڑی عید تھی یا چھوٹی عید۔ رات گیارہ بجے بھٹو صاحب کو ہم ایئر پورٹ پر چھوڑنے گئے۔ وہ کراچی روانہ ہو گئے۔ میں اور شیخ صفدر علی بذریعہ کار لاہور آ گئے۔ عید کی صبح میں اپنی والدہ کو سلام کرنے گاؤں چلا گیا۔ عید کی شام کو واپس لاہور آ گیا۔ شام کو میں اپنے جلوس کی شہرت کے نشے میں چائنز لنچ ہوم ہوٹل چلا گیا۔ چائنز لنچ ہوم میں آغا شورش کشمیری اپنا مجمع لگائے ہوئے تھا۔ عید کی وجہ سے ہوٹل میں کچھ زیادہ ہی رش تھا۔ میرے تمام دوست بھی میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں ہوٹل کے اندر

www.bhutto.org

داخل ہوا تو آغا شورش کشمیری نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ پنجابی میں بولا۔ آ گیا ایں، ہے جمالو کران والیا۔ تم لوگ قوم کو کنجر بنا کر نچا رہے ہو۔ قوم میں بے شرمی اور بے حیائی پھیلا رہے ہو۔ سوشلزم کو روٹی کپڑا کہہ کر اپنی لادینیت پر پردہ ڈال رہے ہو۔ تم قوم کو کتا بنا کر روٹی کا ٹکڑا اُس کے منہ میں ڈالنا چاہتے ہو۔ مذاکرات کا بائیکاٹ کر کے ملک میں خون خرابہ اور خانہ جنگی کرانا چاہتے ہو۔ اِس ملک کے غیرت مند لوگ تمہاری گردنیں اُڑا دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ میں بے حد حیران پریشان آغا شورش کشمیری کی تقریر سنتا رہا۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ ابھی کل ہی یہی شخص میری اور پیپلز پارٹی کی تعریف کر رہا تھا۔ میرے شورش کشمیری زندہ باد کے نعرے لگوانے پر قصیدے پڑھتا تھا۔ آج وہ شخص بالکل مختلف شخص تھا۔ آج وہ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو رہا تھا۔ شورش کشمیری کا یہ روپ بقول عبداللہ بٹ ''ایک غنڈے کا روپ تھا''۔ اِس تقریر کے بعد وہ چیئرمین بھٹو کو بُرا بھلا کہنے لگ گیا۔ میں نے آغا شورش کشمیری کو جواب دیا کہ میں آپ سے زیادہ بلند آواز میں بات کر سکتا ہوں مگر میں ایک مہذب انسان ہوں۔ آپ کی طرح لوگوں کو گالیاں نہیں دے سکتا۔ میرے دوست مجھے پکڑ کر دوسری طرف لے گئے۔

آغا شورش کشمیری کا مسئلہ یوں تھا کہ سیاسی بلیک میلنگ اُس کا ذریعہ معاش تھا۔ میری طرح کا غریب انسان تھا۔ قدرت نے اُس کو قوتِ گفتار سے نواز رکھا تھا۔ بلند قامت آدمی تھا۔ قد کی لمبائی اور اُس کی زبان درازی نے اُس کی شخصیت کو بھاری بھرکم بنا رکھا تھا۔ آغا شورش کشمیری ایک احراری مقرر تھا جس کا مبلغ علم مذہبی بنیاد پرستی تھا۔ وہ ایک سوفسطائی ادیب اور مقرر تھا۔ انتہائی درجے کا غیر نظریاتی قسم کا انسان تھا۔ مسئلہ ختم نبوت، اُس کی لیڈری اور اُس کی انکم کا ایک مستقل ذریعہ تھا۔ اُس کی تقریر اور اُس کا قلم ایک ہی سکے کے دو رُخ تھے۔ آج ایک شخص کی تعریف کر رہا ہوتا تھا، دوسرے دن اسی آدمی کی ماں بہن ایک کر رہا ہوتا تھا۔ اپنے آئے دن کے تبدیل شدہ خیالات سے اُس کو ہرگز جھجک نہیں آیا کرتی تھی۔ اُس کی تحریر اور تقریر میں اُس کو ایک نام ایک شخص یا جماعت کو گالی دینے کی اشد ضرورت رہتی تھی۔ اِس کے بغیر اُس کی تحریر اور تقریر مکمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنی اِس شورش گردی میں باقاعدہ ہاتھا پائی پر اُتر آیا کرتا تھا۔ آغا شورش کشمیری شاعر بھی تھا جس کی وجہ سے آغا کا میں احترام کیا کرتا تھا۔ مگر آج تو آغا نے اپنے اِس احترام کے احرام کو تار تار کر دیا تھا۔ مجھے آغا شورش کشمیری کے اِس رویے پر بے حد دکھ ہوا تھا۔ اکثر اوقات محفل میں آغا

www.bhutto.org

بہت لغو باتیں کیا کرتا تھا۔ میں اُن کو کہا کرتا تھا کہ آپ جیسے نامور ادیب اور لیڈر انسان کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ وہ جواب میں کہا کرتا تھا کہ کبھی بات کا مزہ بھی لیا کرو۔ ہر وقت ابوالکلام نہ بنے رہا کرو۔ آغا خود بھی ہوٹل میں لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ اسلم گورداسپوری میری دل سے عزت کرتا ہے۔ مگر اب تو آغا سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ اب تو وہ پیپلز پارٹی کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے آغا شورش کشمیری سے ہوٹل میں علیحدہ بیٹھنا شروع کر دیا اور آغا صاحب سے بول چال منقطع کر دی تھی۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی حالتِ زار، ہماری حالت بلال حبشیؓ کی طرح کی ہوتی تھی

جہاں تک میرے مشاہدے اور تجربات کا تعلق ہے۔ مجھے 1970ء میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ یحییٰ خان کی فوجی حکومت پاکستان میں صرف چیئرمین بھٹو کو ہی اپنا سب سے بڑا ہدف اور حریف اور اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ خیال کرتی تھی۔ وہ چیئرمین بھٹو کو کسی قیمت پر قومی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت ہی نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس فوجی حکومت کی حتی المقدور کوشش تھی کہ چیئرمین بھٹو کو انتخابات سے باہر کر دیا جائے۔ لہٰذا اِس فوجی حکومت نے پورے پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کو سنگل آؤٹ کر رکھا تھا۔ اِس پارٹی پر اور اِس کے قائد پر سرخ نشان لگا رکھا تھا۔ حکومت ہر وہ حربہ استعمال کرتی تھی جس سے کہ لوگوں کو اِس پارٹی سے ڈرایا جائے۔ ہر ایسا ہتھکنڈا استعمال کرتی تھی جس سے پارٹی کے کارکن خوفزدہ ہو کر پارٹی چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ چیئرمین بھٹو کا ہر طریقے سے ناطقہ بند کیا جا رہا تھا تا کہ بھٹو انتخابات کا بائیکاٹ کر کے انتخابات سے باہر ہو جائے۔ اُن کی ذات پر قاتلانہ حملے کرائے گئے جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کیلئے مغربی پاکستان کے ہر شہر، ہر دیہات، ہر گلی کوچہ کو گویا ابوجہل کا مکہ بنا دیا گیا اور ہم تمام پارٹی کارکن پارٹی کے مخالفین کیلئے بلال حبشیؓ بن گئے تھے۔ سندھ اور پنجاب کے پسماندہ علاقوں میں ہمارے کارکنوں کو بڑی اذیت ناک سزاؤں سے گزرنا پڑا تھا۔ دور دراز کے پسماندہ جاگیردار علاقوں کی بات چھوڑیئے، لاہور جیسے ترقی یافتہ شہر میں آغا شورش کشمیری اور اُس کا غنڈہ لطیف بٹ اور جماعت اسلامی کے کارکن میرے خون کے پیاسے

www.bhutto.org

بن گئے تھے۔ اُن کے نزدیک چیئرمین بھٹو کی لاہور میں مقبولیت اور شہرت گویا میری انقلابی شاعری کی وجہ سے تھی۔ یہ لوگ مجھے ہر صورت اور ہر قیمت پر پاکستان پیپلز پارٹی کو چھوڑنے پر مجبور کرتے رہتے تھے۔ پہلے پہلے تو لطیف بٹ میرے ساتھ بڑے لالچ کی باتیں کیا کرتا تھا۔ وہ انشورنس کا کام کرتا تھا۔ مجھے کہا کرتا تھا کہ تم میرے ساتھ انشورنس کمپنی میں شامل ہو جاؤ۔ بہت پیسے کمائیں گے۔ حبیب جالب بھوکا مر رہا ہے۔ اُس نے شاعری سے کیا حاصل کرلیا ہے جو تم کرلو گے۔ اِس طریقے کے ساتھ آغا شورش کشمیری مجھے طریقے طریقے سے پاکستان پیپلز پارٹی کو چھوڑنے کا کہا کرتا تھا۔ اُس کا کہنا ہوتا تھا کہ ہم غریب متوسط درجے کے لوگ ہیں۔ ہم کو ہر طرف اپنے راستے کھلے رکھنے چاہئیں۔ اِن لوگوں کی، اِن تمام چکنی چپڑی باتوں سے جب میں راہ راست پر نہ آیا تو اِن لوگوں نے کچھ جماعت اسلامی کے لڑکوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ یہ لڑکے لاہور میں رات کو ٹیکسی پر گھوما کرتے تھے۔ اِن لڑکوں کا کام تھا کہ لاہور کے ترقی پسند انقلابی نظریات کے حامل لوگوں کو جن کو یہ لڑکے کمیونسٹ یا لادین خیال کرتے تھے، اُن کو بڑے احترام کے ساتھ لفٹ دینے کے بہانے ٹیکسی کار میں بٹھا لیا کرتے تھے۔ اُن کو کہا کرتے تھے کہ آپ کہاں جائیں گے۔ آئیں ہم آپ کو پہنچا آتے ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔

مجھے قتل کرانے کی سازش

میرا معمول تھا کہ میں رات کو بیڈن روڈ کے ایک ہوٹل میں اپنے دوستوں کے ساتھ کافی رات گئے تک بیٹھا کرتا تھا اور وہاں سے پیدل 4/A مزنگ روڈ پارٹی کے دفتر میں آکر اپنے کمرے میں سویا کرتا تھا۔ یہی میری تقریباً روز کی روٹین تھی۔ اِس ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھنے والے پنجابی کے شاعر وارث لدھیانوی، بیڈن روڈ کے میاں اسلم، آج کے مشہور صحافی خالد چوہدری، مشہور ڈرامہ نگار اور ٹی وی آرٹسٹ خالد عباس ڈار، حبیب جالب اور آج کے ٹی وی پروڈیوسر ظہور بھائی ہوا کرتے تھے۔ ایک شب میں حسب معمول ہوٹل سے پیدل نکل کر جب مال روڈ پر آیا تو دو نوجوان مجھے انتہائی تپاک سے ملے اور مجھے گاڑی میں بیٹھنے کی گذارش کرنے لگ گئے۔ دیکھنے میں وہ بے حد مؤدب دکھائی دیئے۔ ویسے بھی ہم شاعروں میں یہ بلا کی کمزوری ہے کہ ہم لوگوں کو خواہ کوئی کسی وجہ سے بھی ملے، ہم لوگوں کی ملاقاتوں کو اپنی شہرت تصور کر لیتے ہیں اور

www.bhutto.org

یوں محسوس کرنے لگ جاتے ہیں جس طرح ہر شخص ہمارا گرویدہ ہے۔ میں نے بھی اپنی شاعرانہ کمزوری کی بنا پر ان برخورداروں کو اپنا فین خیال کیا اور اُن کے ساتھ گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ وہ دونوں لڑکے پچھلی سیٹ پر میرے دائیں اور بائیں بیٹھ گئے اور میں اُن کے درمیان بیٹھ گیا۔ میں چونکہ اُس وقت سرخوشی کے عالم میں تھا۔ یہ خیال نہ کر سکا کہ آگے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ اُس پر اُن میں سے کوئی کیوں نہیں بیٹھا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ لڑکے مجھ سے محبت کرتے ہیں جس کی وجہ سے میرے قریب بیٹھ گئے ہیں۔ بیڈن روڈ کے مال روڈ چوک سے ویسے بھی میرا دفتر قریب تھا۔ شاید میں نے اِس لئے اِس بات کا خیال نہیں کیا تھا کہ چند منٹ کا سفر ہے اور مجھے اُتر جانا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور گاڑی کو بڑی تیز رفتاری کے ساتھ مال روڈ پر دوڑانے لگا۔ وہ اِن لڑکوں کی طرح نوجوان لڑکا ہی تھا۔ میں نے اُن کو ہائی کورٹ کے ساتھ مزنگ کو مڑنے والی سڑک کی طرف جانے کا کہا۔ پیچھے بیٹھے لڑکوں نے کہا۔ آپ کو اتنی جلدی کیا ہے اُترنے کی۔ ذرا آپ کو اوپر سے چکر لگا کر اُتاریں گے۔ اِس طریقے کے ساتھ وہ گاڑی کو گھما پھرا کر یونیورسٹی گراؤنڈ کے اندر ایک ویران جگہ تھی، وہاں گاڑی لے گئے۔ اُس وقت وہ جگہ بالکل سنسان پڑی تھی۔ اُس نے گاڑی کھڑی کر کے مجھے نیچے اُترنے کو کہا مگر بڑے ادب کے ساتھ۔ کہنے لگے کہ آپ سے کچھ شعر سن کر آپ کو ڈراپ کر دیا جائے گا۔

میں گاڑی سے باہر آ گیا تو وہ مجھے گراؤنڈ کے ایک کونے کی طرف ساتھ لے کر چلنے لگے۔ میری طبیعت کو کچھ کھٹکا تو محسوس ہوا مگر میں نے کسی پریشانی کا اظہار نہ کیا اور اُن کے ساتھ قدم ملا کر چلتا گیا۔ وہاں گراؤنڈ کے ایک کونے میں وہ میرے اردگرد کھڑے ہو کر مجھے کہنے لگے کہ آپ کو ہمارے چند سوالوں کے جواب دینے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ پوچھئے۔ کہنے لگے کہ آپ کارل مارکس کو کیا تصور کرتے ہیں؟ وہ کون تھا؟ خدا کا شکر ہے کہ اُنہوں نے مجھ سے پہلا سوال ہی کارل مارکس کا کیا۔ یہ سوال آغا شورش کشمیری اور لطیف بٹ اکثر کیا کرتے تھے۔ اُن کے اِس سوال سے صورتحال پوری پوری میری سمجھ میں آ گئی۔ میں نے اُن کو جواب دیا۔ یہودی۔ وہ میرے اِس سوال پر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگ گئے۔ سوال اُن میں سے ایک لڑکے نے پوچھا تھا، باقی دونوں خاموش تھے۔

اِسی لڑکے نے دوبارہ سوال کیا کہ یہودی کن کے دشمن ہوتے ہیں۔ میں نے آرام سے

www.bhutto.org

جواب دیا۔ ہم مسلمانوں کے۔ اُس لڑکے نے تیسرا سوال کیا کہ آپ محمد ﷺ کو کیا سمجھتے ہیں۔ بس اُن کے اِس سوال نے مجھے جان بچانے کا موقع فراہم کر دیا۔ میں نے اُن کے اِس سوال پر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ میں نے کہا کہ اِس وقت جبکہ میری حالت اچھی نہیں ہے، اس وقت میں پاس ادب و احترام سے سرکار کا نام اپنی زبان پر نہیں لا سکتا۔ اِس وقت آپ لوگ مجھ سے اُن کے بارے میں سوال کر رہے ہیں۔ میں گناہ گار ضرور ہوں مگر گستاخ اور بے ادب نہیں ہوں۔ میں تم جیسے لادینیوں کے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتا۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے تیز تیز گراؤنڈ سے باہر سڑک کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ پہلے تو وہ کچھ دیر اِسی طرح کھڑے رہے جس طرح وہ اپنی اپنی جگہ گاڑھ دیئے گئے ہوں۔ پھر کچھ لمحوں کے بعد وہ بھاگ کر میرے قریب آ کر معافی مانگنے لگ گئے۔ ہم سے غلطی ہو گئی ہے۔ معاف کر دیں۔ مگر اب میرا پلہ بھاری تھا۔ میری عقیدت کا وار اُن پر چل چکا تھا۔ اُن میں اتنا دم نہیں تھا کہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر روکتے۔ وہ بس میرے ساتھ ہی چلتے آ رہے تھے۔ اتنے میں، میں سڑک پر آ گیا۔ میں نے آخری بار اُن سے بس اتنا کہا کہ تم گستاخ لوگ ہو۔ میں تمہارے ساتھ بات نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کچھ دیر سڑک پر کھڑے ہو کر اپنی ٹیکسی کار کی طرف واپس چلے گئے اور میں بھاگ کر روز گارڈن کے اندر داخل ہو گیا۔ وہاں مجھے رکشا مل گیا اور میں رکشے میں بیٹھ کر دفتر جانے کی بجائے کرشن نگر میں اپنے دوست شاعر آتش لدھیانوی کے گھر چلا گیا۔ رات اُس کو جگایا اور اُس کو اپنی تمام داستان سنائی۔ میں اُس کو علامہ کہا کرتا تھا۔ آتش بھی بہت بنیاد پرست مسلمان تھا۔ میں نے بڑے مذاق سے کہا کہ علامہ آج میں تمہارے اسلام کے پروانوں سے بچ کر آ گیا ہوں۔ دوسرے دن میں نے چائنز لنچ ہوم جا کر تمام وہاں بیٹھنے والے ہم خیالوں اور غیر ہم خیالوں کو رات کے اِس واقعے سے آگاہ کیا۔ ہمارے تمام دوست اِس واقعہ پر بے حد ابگختہ ہوئے۔ اتنے میں آغا شورش کشمیری تشریف لائے۔ لوگوں نے اِس خطرناک واقعہ کا آغا صاحب سے ذکر کیا۔ آغا شورش کشمیری اِس واقعے کو سُن کر ذرا بھی متحیر نہ ہوا۔ وہ اپنی مخصوص قسم کی ظالمانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ تو اندر سے سچا مسلمان ہے، عاشقِ رسول ہے۔ اِس کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اِس واقعے کے راز دار تھے۔ وہ اِس واقعے پر اظہار افسوس کرنے کی بجائے کہنے لگ گئے۔ یہ سوشلسٹوں کی چال ہے۔ وہ اسلام کو بدنام کرنے کے لئے اِس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں۔ بہت جلد وہ اپنے کیفر کردار

www.bhutto.org

تک پہنچ جائیں گے۔ اِس واقعے کا ذکر نوائے وقت اخبار میں مذمت کی شکل میں شائع کرا دیا گیا تھا۔ میرے ساتھ کئی بار ایسا ہوا کہ میں سڑک پر چل رہا ہوتا تھا اور لڑکے موٹر سائیکل پر پیچھے آ کر مجھے مار پیٹ کر بھاگ جاتے تھے۔ ان واقعات کے بعد تمام سوشلسٹ شہرت کے لوگوں نے رات کو باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ اُن میں، میں خود بھی شامل تھا۔ واضح رہے کہ شورش کشمیری اور اس کی طرح کے دوسرے فوجی ٹاؤٹوں نے ہم پیپلز پارٹی کے لوگوں کا سوشل بائیکاٹ کر رکھا تھا وہ ہمارے ساتھ بات نہیں کیا کرتے تھے۔

چیئرمین بھٹو سے تحریک چھیننے کی خفیہ ایجنسیوں کی سازش

فیلڈ مارشل ایوب خان نے عوامی تحریک کے دباؤ کے تحت صدر ہاؤس میں جب یہ اعلان کر دیا کہ آئندہ وہ انتخابات میں حصہ نہیں لے گا اور نہ ہی صدارتی اُمیدوار بنے گا۔ ایوب خان کے اِس بیان سے اُس کی حکومت کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکنے لگ گئی۔ ایوب خان کی کنونشن لیگ تو ایک اسٹیبلشمنٹ کی بنائی ہوئی اقتدار کی جماعت تھی جس میں لوگ صرف اقتدار کیلئے شامل ہو گئے تھے۔ جیسے ہی صدر ایوب خان نے حکومت سے علیحدہ ہونے کا عندیہ دیا، دیکھتے ہی دیکھتے کنونشن لیگ کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ گول میز کانفرنس میں مغربی پاکستان کی سیاسی جماعتیں اور جو سیاست دان شریک ہو چکے تھے، اُن کا عوام میں کوئی بھرم نہیں رہ گیا تھا۔ لوگ اُن کو صدر ایوب کے دم چھلے تصور کرنے لگ گئے تھے۔ مغربی پاکستان میں اُس وقت میدان میں صرف چیئرمین بھٹو اور پیپلز پارٹی ہی نظر آتی تھی۔ کنونشن لیگ میں پنجاب اور سندھ کے جتنے بھی جاگیردار، وڈیرے یا علاقائی الیکشنیئر بیئے شامل تھے، وہ بھاگ بھاگ کر پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہونے لگ گئے۔ چیئرمین بھٹو کے پاس اُن کے خفیہ پیغام آنے لگ گئے۔ بہت ممکن تھا کہ پاکستان میں کوئی سیاسی عبوری حکومت تشکیل پا جاتی۔ اسٹیبلشمنٹ کسی قیمت پر پاکستان کا اقتدار سیاست دانوں کے ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتی تھی۔ اسلام آباد کا جی۔ ایچ۔ کیو پوری طرح حرکت میں آ گیا۔ اسٹیبلشمنٹ نے فوری طور پر یہ سازش کی کہ عوامی تحریک کو چیئرمین بھٹو کے ہاتھوں سے چھین لیا جائے۔ چیئرمین بھٹو کے ہاتھوں سے عوامی تحریک چھیننے کے لئے اسٹیبلشمنٹ نے اپنی علمداری کے ہر شعبے اور ہر حلقے میں ہر تنظیم اور جماعت میں متعین کئے گئے افراد اور گروہوں سے

انتہا پسندی کے نعرے لگوانے شروع کر دیئے۔

چیئر مین بھٹو کے مطالبات بے حد سیاسی اور قانون کے دائرے میں تھے۔ وہ ملک میں فوری طور پر بالغ رائے دہی کے تحت عام انتخابات کا اعلان چاہتے تھے۔ وہ صدر ایوب خان کے حکومت سے علیحدہ ہو جانے کا مطالبہ کرتے تھے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ ملک کا نظام فوری طور پر قومی اسمبلی کے سپیکر کے سپرد کر دیا جائے۔

چیئر مین بھٹو کے مطالبات کی منظوری سے اسٹیبلشمنٹ مکمل طور پر حکومت سے باہر ہو جاتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر اِن مطالبات کو تسلیم ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے ایسے گمراہ کن نعروں کو ہوا دی جن نعروں کے شعلوں میں سب کچھ دب کر رہ گیا۔ لوگوں کو اِس قدر شوریدہ سر بنا دیا کہ عقل وہوش کی بات سننے کو کوئی تیار نہ تھا۔

اسٹیبلشمنٹ نے سب سے پہلے لاہور سیکرٹریٹ میں کلرکوں کی ہڑتال کرا دی۔ اِس کے بعد اس ہڑتال میں ڈاک خانہ کے ملازمین بھی شامل ہو گئے۔ اُن کے بعد ہسپتالوں میں چھوٹے ملازمین ہڑتال پر چلے گئے۔ اُن کے بعد روڈ ٹرانسپورٹ کے ملازموں کی ہڑتال ہو گئی۔

لاہور میں واپڈا یونین پاکستان کی سب سے بڑی مزدوروں کی منظم یونین تھی جس کا لیڈر بشیر بختیار اور خورشید نام کا ایک آدمی تھا۔ پیپلز پارٹی کی تحریک کے دوران پیپلز پارٹی نے بار بار بشیر بختیار سے رابطہ کیا کہ وہ اِس جمہوریت کی تحریک میں ہمارا ساتھ دے۔ اُن کا ایک ہی جواب ہوتا تھا کہ میری یونین غریب لوگوں کی تنخواہوں اور نوکریوں کے مسئلے حل کرواتی ہے۔ میں اِس کو سیاست میں ملوث نہیں کر سکتا۔ مگر اب بشیر بختیار ایوب خان کے خلاف تحریک چلانے اور جلوس نکالنے کے لئے پیپلز پارٹی سے بہت آگے کھڑا تھا۔ بشیر بختیار نے ایک ہی رات میں پورے مغربی پاکستان کی لیبر یونینز کی جائنٹ یونین (یعنی جے۔ ایل۔ سی) بنا کر ملک گیر ہڑتال کی کال دے دی۔ تمام مزدور ٹریڈ یونین کا اتحاد بنا کر جلوس نکالنے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئر مین بھٹو جو تحریک کے فرنٹ پر ہوتے تھے۔ اب تحریک کے پیچھے چلنا شروع ہو گئے۔ ہمیں علم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کون کس روز کس وقت جلوس نکال رہا ہے۔ صبح ہم پیپلز پارٹی والوں کو علم ہوتا کہ فلاں چوک میں مزدوروں کا یا طالب علموں کا جلوس نکل چکا ہے۔ ہم لوگ بھاگ بھاگ کر اُس جلوس میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ پارٹی کی طرف سے لاہور کے ہر اجلاس میں میری شرکت کو لازمی بنایا

www.bhutto.org

گیا تھا۔ مجھے حکم تھا کہ میں ہر جلوس میں نظم پڑھوں یا تقریر کروں تا کہ لوگوں کو پیپلز پارٹی کی شمولیت کا علم ہو جائے۔ ہماری تحریک میں تو دن میں ایک دو جلوس نکلا کرتے تھے، اب جب اسٹیبلشمنٹ نے جلوس نکلوانے شروع کیے تو دن بھر جلوس ہی نکلتے رہتے تھے اور جلوس کے نعرے اِس قدر انتہا پسندی کے ہوتے تھے کہ جن کے بارے میں ہم پیپلز پارٹی کے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ تمام نعرے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے قتلِ عام کے ہوتے تھے۔ خون خرابے کے ہوتے تھے۔ ہم پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکن اپنے منشور کے مطابق تقریر کیا کرتے تھے یا نعرے لگایا کرتے تھے۔ خانہ جنگی اور خون خرابے کی بات ہرگز نہیں کرتے تھے۔ ہماری پاکستان پیپلز پارٹی ابھی نئی نئی سیاسی جماعت تھی اور ہماری جماعت ابھی تنظیم سازی کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ مگر ہماری تمام تنظیم سازی اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹوں کے تیز نعروں کی نظر ہوگئی۔ ہم پیپلز پارٹی والے جلوسوں میں اِس لئے شامل ہو جاتے تھے کہ لوگ ہر جلوس میں ہماری نمائندگی ملاحظہ کرسکیں۔ سیاسی طور پر چونکہ لوگ پیپلز پارٹی کے ساتھ ہی ذہنی الحاق رکھتے تھے۔ وہ ہر طرح کے نعروں کو پاکستان پیپلز پارٹی کے نعرے ہی خیال کیا کرتے تھے۔ کمال کی بات تو یہ تھی کہ اِن انتہا پسندی کے نعروں میں بیک وقت دائیں باوز کے لوگ بھی شامل ہوتے تھے اور بائیں بازو کے لوگ بھی شریک تھے۔ اِن دونوں فریقوں کی انتہا ایک جیسی تھی جو کہ ایک عجیب قسم کا اتفاق تھا۔ اِس کے علاوہ اِن دونوں فریقوں میں ایک اور قدر مشترک تھی۔ وہ قدر مشترک یہ تھی کہ یہ دونوں فریقین پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کی ذات کے سخت مخالف تھے۔ پیپلز پارٹی کے خلاف منفی جذبہ رکھتے تھے۔ دائیں بازو والے پیپلز پارٹی کے خون کے پیاسے تھے تو لیفٹ والے پیپلز پارٹی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ اُن کا تمام زور پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کی کردار کشی پر صرف ہوتا تھا۔

بشیر بختیار اور بابا بھاشانی کا اتحاد کرا دیا گیا

بشیر بختیار دائیں بازو اور بائیں بازو کی بیک وقت قیادت کر رہا تھا جو ایک حیران کن بات تھی۔ پاکستان کا تمام لیفٹ بشیر بختیار کو اُس وقت ایک انقلابی لیڈر قرار دیتا تھا۔ اُس کو ہو چی من کہا کرتا تھا۔ بشیر بختیار کے مزدور اتحاد کے بنتے ہی بابا بھاشانی کا اس کے ساتھ الحاق کرا دیا گیا۔ مغربی پاکستان کا تمام لیفٹ بابا بھاشانی کے ساتھ تھا۔ اِس کے نعروں کو انقلاب کا اصل فلسفہ قرار دیتا تھا۔

ہماری پارٹی اِن دونوں انتہا پسند قوتوں کے درمیان سینڈوچ بنی ہوئی تھی۔جس طرح دائیں بازو کا نمائندہ آغا شورش کشمیری ہمارے منہ پر ہم کو قتل کی دھمکیاں دیا کرتا تھا، اِسی طرح ہمارا لیفٹ بھی ہمارے منہ پر ہم کو غیر انقلابی، انقلاب دشمن کہا کرتا تھا اور چیئرمین بھٹو کی ذات کو اور پیپلز پارٹی کو انقلاب کے رستے میں رکاوٹ قرار دیتا تھا اور بشیر بختیار جیسے اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹ کو ہو چی من کہتا تھا۔حافظ شیرازی نے اِس قسم کی صورتحال پر کیا خوب شعر کہا تھا۔

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالان
طوق زرّیں ہماں در گردن خری بینم

مطلب اِس شعر کا یہ ہے کہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی کمر پر تو معمولی قسم کے چمڑے کی زین یا پالان ڈال رکھی گئی ہے جس کی سختی سے گھوڑے کی کمر زخمی ہوگئی ہے۔مگر اِس کے مقابلے میں گدھے کی گردن میں اور کمر پر سنہری زین دیکھنے میں آرہی ہے۔گدھے کو تاج پہنا دیا گیا ہے۔

بشیر بختیار کی لیڈری کی انتہا ملاحظہ ہو کہ 17 مارچ 1969ء کو دو گھنٹے کے لئے صدر پاکستان ہاؤس کی اور جی۔ایچ۔کیو کی بجلی معطل کردی گئی۔اِس کے ساتھ ہی بشیر بختیار جو جائنٹ لیبر کونسل آف پاکستان کا صدر تھا، اُس نے بیان دیا تھا کہ جنرل ایوب خان کیلئے یہ ہمارا اشارہ ہے کہ وہ فوری طور پر اقتدار چھوڑ دے وگرنہ پورے ملک کی بجلی گل کردی جائے گی۔

واضح رہے کہ بشیر بختیار جی۔ایچ۔کیو اور پریذیڈنٹ ہاؤس کی بجلی بند کردیتا ہے تو اُس کو گرفتار نہیں کیا جاتا۔پیپلز پارٹی کے لیڈر اور کارکن صرف ملک میں فوری انتخابات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اُن پر تقریروں کے جرم میں مارشل لا کے تحت مقدمے بنائے جاتے ہیں اور اُن کو جیلوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔خود مجھ پر نظم پڑھنے کے جرم میں بغاوت کا مقدمہ بنا دیا گیا جس مقدمے میں، میں ایک سال مفرور رہا تھا۔

اِس طریقے کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ جنرل ایوب خان کو خوفزدہ کررہی تھی کہ جنرل ایوب خان اسٹیبلشمنٹ کی پناہ لینے پر مجبور کردیا جائے۔بشیر بختیار کے جنرل ایوب خان کو انتباہ کرنے کے بعد جماعت اسلامی کے مولوی طفیل محمد نے جنرل ایوب خان کو کھلی دھمکی دے ڈالی اور اُس کو فوری طور پر اقتدار چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔

لاہور میں کچھ ہی دنوں پہلے لیفٹ کے کچھ سیاسی کارکنوں کی تگ و دو سے مولانا بھاشانی کی

www.bhutto.org

مغربی پاکستان کی جماعت اور پاکستان پیپلز پارٹی کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا اشتراکی معاہدہ ہوا تھا۔ جس معاہدے کے تحت پیپلز پارٹی اور مولانا کی جماعت مشترکہ طور پر تحریک کو آگے بڑھانے کی جدوجہد کرے گی۔ اِس معاہدے کی تاسیس کے وقت بھٹو بھاشانی بھائی بھائی کے نعرے بھی لگائے گئے تھے۔ اِس معاہدے کی روح پاکستان میں جلد از جلد عام انتخابات کروانے کے مطالبہ کی تھی۔ باقی تمام باتیں تقریباً پیپلز پارٹی کے منشور سے ہی ملتی جلتی تھیں۔ مگر اب جب بشیر بختیار کی جائنٹ لیبر فیڈریشن اور مولوی طفیل محمد کی جماعت اسلامی ملک میں ایک خونی تحریک چلانے کی دھمکی دے رہی تھی۔ عین اُس وقت مولانا بھاشانی کی زبان آگ برسانے لگ گئی۔

مولانا بھاشانی کا ماضی کا کردار

مولانا بھاشانی پاکستان کی تمام لیفٹ کا چی گویرا تھا۔ جہاں تک ہماری لیفٹ کے اِس بابا آدم کی ذات کا تعلق تھا تو اُن کی ذات مادرِ ملت کے انتخاب میں تمام باضمیر لوگوں کی نظر میں مشکوک ہو چکی تھی۔ مولانا بھاشانی نے جنرل ایوب خان سے پیسے لے کر مشرقی پاکستان میں مادرِ ملت کے خلاف ووٹ ڈلوا کر مادرِ ملت کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ اُنہوں نے اپنی اِس انقلاب فروشی اور ضمیر فروشی پر پردہ ڈالنے کیلئے ایک مفروضہ مشہور کر دیا تھا کہ اُن کو جمہوریہ سوشلسٹ چین کے ماؤزے تنگ نے فیلڈ مارشل ایوب خان کا ساتھ دینے کا کہا ہے۔ ماؤزے تنگ جو اپنے ملک میں تمام سامراج افواج کو شکست دے کر چین کے استحصالی نظام کو ختم کر کے سرخ انقلاب کا موجب بنا تھا، گویا پاکستان میں وہ امریکہ نواز فوجی آمریت کے استحصالی نظام کو قائم رکھنے کا خواہاں تھا اور مولانا بھاشانی صاحب نے ماؤ کی اِس خواہش کا پورا احترام کرتے ہوئے جنرل ایوب خان کا ساتھ دیا تھا۔ کیا یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے۔ اب اِس قسم کی شہرت کا حامل شخص انتخابات کے بائیکاٹ کا اعلان کرے تو کیا اُس شخص کے اِس فیصلے کی صداقت پر یقین کیا جا سکتا تھا۔ اِس بات کا ایک دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ مولانا بھاشانی یہ تمام کاروبار صرف مغربی پاکستان میں کیوں کر رہا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان میں جا کر اپنی گوریلہ وار کی تیاری کیوں نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی سیاست کا صرف مغربی پاکستان کو کیوں اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ وہ صرف چیئرمین بھٹو کو انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا کیوں کہتا تھا۔ یہ عجیب قسم کا جنرل محمد یحییٰ خان کی اسٹیبلشمنٹ کا اور

www.bhutto.org

مولانا بھاشانی اور پارٹی کے اندر کی لیفٹ کا اور پاکستان کے تمام دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں اور تنظیموں کا آپس میں اتفاق تھا کہ اِس معاملے میں وہ تمام متفق تھیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اِن باتوں کا ہماری سیاست کی تاریخ میں کسی بھی شخص یا ادارے نے کوئی دیانت دارانہ تجزیہ نہیں کیا تھا۔ (نوٹ: ہماری قومی سیاسی تاریخ ازل سے اِس قدر ہنگامی نوعیت کی چلی آرہی ہے کہ ہم لوگوں کو اِن باتوں کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔

چیئرمین بھٹو کا مولانا بھاشانی پر اعتراض

پاکستان پیپلز پارٹی اور مولانا بھاشانی کی پارٹی کے معاہدے کے کچھ ہی دن بعد مولانا بھاشانی ایک خونی انقلاب برپا کرنے کی تقریریں کرنے لگ گئے۔ ایک طرف تو اسٹیبلشمنٹ کے سیاسی پہلوان بشیر بختیار اور مولانا طفیل محمد خانہ جنگی کرانے کی باتیں کر رہے تھے۔ دوسری جانب بھاشانی صاحب نے آگ اور خون کے نعرے لگوانے شروع کر دیئے۔ اُنہوں نے کراچی میں ایک فیکٹری کے مزدوروں کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج وہ وقت ہے کہ جب ہم کو تقریریں یا باتیں کم کرنی چاہیں اور اپنے ہتھیاروں کو تیز کرنا اور اکٹھا کرنا چاہیے۔ فیکٹریوں کو آگ لگا دینی چاہیے۔ سرمایہ داروں کا گھیراؤ کرنا چاہیے۔ فیکٹریوں پر قبضہ کرنا چاہیے۔ مولانا بھاشانی کی تقریروں کا ہمیں تجزیہ کرنا ہوگا۔ ہر چند آج یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں مگر ایک سیاسی کارکن کے لئے ماضی کے تجربات اُس کی تعلیم کا کام دیتے ہیں۔ مولانا بھاشانی کی سیاسی طاقت مشرقی پاکستان میں تھی، مغربی پاکستان میں اُن کی سیاسی طاقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ مولانا کی آگن، جالو، گھیراؤ جلاؤ کی تحریک اگر کوئی کارنامہ سرانجام دے سکتی تھی تو اُس کا اصل میدان مشرقی پاکستان ہونا چاہیے تھا۔ یہاں پر پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھاشانی صاحب یہ گھیراؤ جلاؤ مشرقی پاکستان میں کیوں نہیں کراتے تھے۔ وہ تحریک کے دوران مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان میں ہی ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔ تحریک کے محرکات کا اگر سیاسی نقطہ نظر سے سوچا جائے تو یہ بات سب سے پہلے دھیان میں آتی ہے کہ اگر مغربی پاکستان میں فیکٹریوں کو آگ لگانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا تو اِس قسم کے خونی انقلاب کو آگے بڑھانے کیلئے عوام کی صفوں میں مولانا بھاشانی کی جماعت کا ہونا انتہائی ضروری تھا۔ لوگوں کو انقلاب کی اصل منزل کی سمت گائیڈ کرنے کیلئے مولانا بھاشانی

www.bhutto.org

کی پارٹی کے کیڈرز کا ہونا ضروری تھا جو کہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ اب فیصلہ کن بات یہ ہوئی کہ ایک انقلابی لیڈر اگر ملک میں فیکٹریوں کو صرف آگ ہی لگاتا جائے گا یا کوئی دوسرا خون خرابہ کرتا جائے گا تو وہ اِس سے کیا حاصل کرے گا۔ وہ خونی انقلاب جو اقتدار حاصل کرنے کے مقاصد سے خالی ہو یا وہ انقلاب جو اقتدار حاصل کرنے کی اہلیت کے ہی قابل نہ ہو۔ جن کا اصل مقصد اقتدار کو حاصل کر کے انقلاب قائم کرنے کا نہ ہو، اُن کا خون خرابہ یا اُن کا گھیراؤ جلاؤ کس کے کام آئے گا۔ اِس خون خرابے سے کس کا نقصان ہوگا اور کس کو فائدہ پہنچے گا۔

فیکٹریوں کو جلانے کی پالیسی سے مولانا بھاشانی کا مقصد سرمایہ داری نظام کو ختم کرنے کا تھا تو سرمایہ داری نظام کے اصل محافظ تو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے ادارے تھے۔ پاکستان کی فوج تھی۔ فیکٹریاں خواہ جلا بھی دی جاتیں۔ چند مالکان کو اگر قتل بھی کر دیا جاتا تو اِس سے پاکستان پر قابض اصل طاقت جو فوج تھی، اُس کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا، یعنی مولانا بھاشانی اور مغربی پاکستان کے انتہا پسند لیفٹ کا یہ عجیب وغریب قسم کا انقلاب تھا کہ بندوق والے کو تو کچھ نہیں کہنا اور بے جان املاک کو جلا کر خاک کرنا انقلاب تھا۔ دنیا میں جہاں بھی کبھی انقلاب آیا تھا، وہاں کے انقلابیوں کو سرمایہ داروں کی اصل قوت وہاں کی فوج سے ٹکرانا پڑا تھا۔ عوامی جمہوریہ چین کا انقلاب ہو یا سوویت روس کا انقلاب۔ یہ تمام انقلاب اُس وقت کامیاب انقلاب ہوئے جب چین اور سوویت روس کی سامراجی افواج کو انقلابیوں کی مسلح جدوجہد سے شکست فاش ہوئی تھی۔ ماؤزے تنگ کا اور لینن کا ہدف فیکٹریاں یا املاک نہیں تھیں۔ شاہی افواج تھیں مگر ہمارے ہاں انقلابیوں کے انقلاب برپا کرنے کا جو طریقہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ وہ بے حد مضحکہ خیز اور حیران کن تھا۔ یہ فوج کو ذرا بھی گزید پہنچانا نہیں چاہتے تھے بلکہ چھاؤنیوں سے دور مزدوروں کی بستیوں میں کھڑے ہو کر انقلاب انقلاب کھیلنا چاہتے تھے اور یہ بات ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جیسے ہی جنرل ایوب خان نے اقتدار جنرل یحییٰ خان کے سپرد کیا، یہ تمام آگن جالو یا گھیراؤ کا کام ختم کر دیا گیا۔ سارے انقلابی جذبے ماند پڑ گئے، ٹھنڈے پڑ گئے۔ اب اِن تمام انقلابیوں اور غیر انقلابی قوتوں کا ہدف پاکستان پیپلز پارٹی بن گئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور بھٹو دشمنی میں اِن تمام قوتوں کا جذبہ مشترک تھا۔ اِس میں کسی کو کسی کے ساتھ الحاق کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اِس معاملے میں دشمن کا دشمن، دوست والی بات تھی۔ چیئر مین بھٹو کا بھاشانی صاحب پر یہ اعتراض تھا کہ:

www.bhutto.org

1- اُن کی جماعت مشرقی پاکستان میں گھیراؤ جلاؤ کی بات کیوں نہیں کرتی۔ وہ صرف مغربی پاکستان میں یہ پالیسی کیوں اختیار کیے ہوئے ہے۔

2- یہ تمام لیڈر اور مغربی پاکستان کی تمام بائیں بازو کی جماعتیں یا تنظیمیں اور دائیں بازو کی تنظیمیں اور جماعتیں صرف اور صرف بھٹو دشمن کیوں ہیں؟ پیپلز پارٹی کے خلاف کیوں ہیں؟

3- ملک کی اصل استبدادی اسٹیبلشمنٹ کی قوت کو چھوڑ کر اپنی طاقت کو اِدھر اُدھر کی باتوں پر کیوں ضائع کر رہی ہیں۔

4- کیا پاکستان کے عوام یا صرف مغربی پاکستان کے عوام کسی خونی انقلاب کے لئے تیار ہیں؟ یہ خونی انقلاب مشرقی پاکستان میں کیوں نہیں لایا جاتا۔ کیا عوام اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ وہ مسلح قوتوں سے ٹکر لے سکیں۔

5- ملک میں ایک مرکزی انقلابی قوت کے نہ ہونے کی وجہ سے اگر کوئی انارکی برپا ہو جاتی ہے تو تمام صوبے بکھر جانے کا خدشہ تھا۔ ملک کا کوئی آئین ہی نہیں تھا۔ اِس کو اکٹھا کس طرح رکھا جا سکتا تھا۔

چیئرمین بھٹو کی اِس بات کی صداقت مشرقی پاکستان میں بعد میں ظاہر ہوئی جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا تھا۔ اگر مغربی پاکستان کی تمام قوتیں یک زبان ہو کر ایسا ہی مطالبہ کرتیں جو چیئرمین بھٹو کا مطالبہ تھا کہ ایوب خان اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کو منتقل کرے۔ اِس کے علاوہ ہمارا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔ اِس طریقے کے ساتھ ملک میں ایک عارضی سول حکومت وجود میں آ جاتی۔ سپیکر قومی اسمبلی بنگالی تھا۔ اُس کی عارضی حکومت کے خلاف مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف کبھی نفرت پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تمام معاملے جمہوری طریقے سے طے پانے تھے۔ جو بعد میں اسٹیبلشمنٹ کی سازش کی وجہ سے طے نہ پا سکے اور پاکستان ٹوٹ گیا۔

چیئرمین بھٹو کا مولانا بھاشانی اور بائیں بازو کے انتہا پسندوں پر صرف اتنا ہی اعتراض تھا کہ وہ اپنی قوت کا ادراک کریں اور وہی کام کریں جو اُن کی قوت عمل کے دائرہ کار میں ہو سکتا ہے۔ مگر وہ لوگ اپنی انتہا پسندی پر مُصر تھے اور چیئرمین بھٹو کو جاگیردار کہہ کر اپنے انقلاب کے تمام منشور کو مکمل کر لیتے تھے اور پاکستان میں پیپلز پارٹی اُن کے نزدیک ایک عوام دشمن پارٹی تھی جبکہ

www.bhutto.org

عوام پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے لاہور اور راولپنڈی کے جلوس کے بعد مغربی پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں ایوب خان کی حکومت کے خلاف جلوس نکالا گیا۔ کراچی کا جلوس بھی بہت بڑا جلوس تھا۔ اِس جلوس میں پہلی بار میں نے چیئرمین بھٹو کو بوشرٹ اور پینٹ پہنے دیکھا۔ اِس سے بیشتر وہ ہمیشہ سوٹ میں عوام کے سامنے آیا کرتے تھے۔ بھٹو صاحب بنیادی طور پر انتہائی خوبصورت انسان تھے۔ جو لباس پہنتے تھے، اُن کو اچھا لگتا تھا۔ یہ جلوس تقریباً پانچ گھنٹے کی مسافت کے بعد اپنی منزل تک پہنچا۔ تمام راستہ مائیک تقریباً میرے ہاتھ میں رہا۔ کراچی میں تو ''ہے جمالو'' کے نعروں کا رنگ ہی کچھ اور تھا۔ کراچی کے جلوس میں ایک جگہ چند لوگوں نے امریکہ مردہ باد کے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور امریکہ کا جھنڈا جلا دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ لفیٹ کے بھیجے ہوئے لڑکے ہیں جو یہ کارنامہ سرانجام دے رہے تھے۔ ہمارے انقلابیوں کا بھی ایک عجیب انداز ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہر مرتبہ موجودہ معروضی حالات کے برعکس ہی نعرے لگوایا کرتے تھے۔ اُس وقت سارا زمانہ ایوب خان مردہ باد کے نعرے لگا رہا تھا مگر یہ ایوب خان کو چھوڑ کا امریکہ مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ اُن کی یہ منطق میری سمجھ میں نہ آسکی۔

جلوس کے بعد رات کو قاسم پٹیل کا کھانا تھا۔ اِس کھانے میں اُس وقت کے کراچی کے تمام اہم لوگ مدعو کیئے گئے تھے۔ وہاں پر میر علی احمد تالپور اور میر رسول بخش تالپور بھی تھے۔ میری رسول بخش تالپور میاں ممتاز دولتانہ کے حوالے سے بات کر رہے تھے کہ دولتانہ کا کہنا تھا کہ بھٹو صاحب کو ایوب خان کے ساتھ مذاکرات میں حصہ لینا چاہیے تھا۔ بھٹو صاحب کا میر صاحب کو جواب تھا کہ میر سائیں! ایوب خان ایک فوجی ڈکٹیٹر ہے۔ وہ بے حد انتقامی انسان ہے۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی مشتعل ہو جانا تھا۔ وہ مجھے کچھ کہتا، میں اُس کو کچھ کہتا، معاملہ سیاست سے ہٹ کر ذاتیات کا ہو جانا تھا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ میں اُس سے نفرت کرتا ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایوب خان کے ساتھ معاملات سیاسی طریقے سے نپٹائے جائیں۔ آپ نے دیکھا کہ اصغر خان کو بھی ایوب خان اپنا حریف خیال کرتا تھا۔ اُس کے ساتھ اِس کی تلخ کلامی ہو گئی۔ میرا فیصلہ درست فیصلہ ہے۔ ہم کو باہر میدان کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ مجھے آر۔ٹی۔سی کے سیاست دانوں کے ٹریپ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ فوج سیاست دانوں کو آپس میں لڑا کر بدنام

www.bhutto.org

کرے گی کہ یہ تو کسی ایک بات پر متفق ہی نہیں ہیں اور اِس طریقے سے وہ ملک پر دوبارہ مارشل لا مسلط کرنے کی راہ نکال سکتی ہے۔ ہم نے اِس کو اِس بات کا موقع نہیں دینا ہے۔ میں آر۔ٹی۔سی کو کامیاب بنانے کیلئے کل صبح اپنی پوزیشن دوبارہ کلیئر کردوں گا۔

فوج سیاست دانوں کو ٹریپ کرنے میں کامیاب ہوگئی

چیئرمین بھٹو نے آر۔ٹی۔سی کے سیاست دانوں کی اپنے بارے میں غلط فہمی دُور کرنے کیلئے بیان جاری کیا۔ وہ بیان یہ تھا کہ بھٹو اُسی لمحہ آر۔ٹی۔سی میں شمولیت کا اعلان کردے گا جس لمحہ بھی جنرل ایوب خان اپنے استعفےٰ کا اعلان کردے گا۔ یعنی ایوب خان کے استعفےٰ کے بعد بھٹو آر۔ٹی۔سی میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن آر۔ٹی۔سی کے لیڈروں کو ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ عوام مکمل تبدیلی کا مطالبہ کررہے ہیں۔ وہ کسی کنسیشن یعنی سہولت کا مطالبہ نہیں کررہے۔

چیئرمین بھٹو کے برعکس آر۔ٹی۔سی کے تمام لیڈر ایک مستقل قسم کے کمپلیکس کا شکار ہوگئے تھے۔ اُنکی شکایت یہ تھی کہ وہ پچھلے دس بارہ سال سے ایوب خان کے خلاف جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ اُنہوں نے بڑی ماریں کھائی ہیں۔ اُن کے مطابق ملک میں ایوب خان کے خلاف جو تحریک آج اپنے منطقی انجام کو پہنچی ہے، وہ اُن کی چلائی ہوئی ہے۔ مگر ذوالفقار علی بھٹو نے اُن کی تحریک کو اُن سے ہتھیا لیا، چھین لیا ہے۔ اِس تحریک کے قائدین ہم ہیں، ذوالفقار علی بھٹو نہیں ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کی محنت کے تمام ثمرات بھٹو اُڑا کر لے گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ دوسری جانب اِن لیڈروں کے خیالات کے برعکس چیئرمین بھٹو ایوب خان کے خلاف چلائی گئی تحریک کے روحِ رواں بن چکے تھے۔ بھٹو کو صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں اِس تحریک کا سمبل تصور کیا جاتا تھا۔ آر۔ٹی۔سی کے لیڈر جب کسی عوامی سٹیج پر جاتے تو لوگ صرف سینکڑوں کی تعداد میں اُن کے خیالات سننے آتے تھے۔ چیئرمین بھٹو جب عوام کے سامنے آتے تھے تو لوگ ہزاروں کی تعداد میں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں اُمڈ آیا کرتے تھے۔ لہٰذا آر۔ٹی۔سی کے لیڈروں کی اِس قسم کی سوچ اور اس طرح کے احساسات نے اُن کو اسٹیبلشمنٹ کے اور بھی قریب کردیا۔ اب وہ ہر ایسا کام کرتے چلے جارہے تھے جو اسٹیبلشمنٹ چاہتی تھی۔

فیلڈ مارشل ایوب خان کے ساتھ جب آر۔ٹی۔سی کا فائنل راؤنڈ شروع ہوا تو اسٹیبلشمنٹ

www.bhutto.org

نے ان تمام لیڈروں کو ایسے حتمی اور آخری مطالبات پیش کرنے کا کہہ دیا۔ اِن تمام لیڈروں کی دانائی یہ ہوتی کہ وہ صرف ایک ہی مطالبہ پیش کرتے کہ ایوب خان اقتدار کو قومی اسمبلی کے سپیکر کو منتقل کر کے خود مستعفی ہو جائے۔ باقی تمام باتیں ملک میں قائم ہونے والی عارضی سول حکومت کے قیام پر چھوڑ دینی چاہئیں۔ مگر یہ تمام لیڈر اسٹیبلشمنٹ کے ہتھے چڑھے ہوئے تھے۔ ہر لیڈر کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کا ایجنٹ کام کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ تمام لیڈر کوئی متفقہ فیصلہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ ایک فیصلہ کن تبدیلی تھی، بہت اہم موقع تھا اور خطرناک موقع بھی تھا۔ یہاں پر بڑی احتیاط کی ضرورت تھی۔ ایک مسلح قوت سے اقتدار حاصل کرنے کا مرحلہ تھا۔ اِس موقع پر تو کوئی اختلافی مسئلہ ہرگز کھڑا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اِس موقع پر شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھ نکات کا ایجنڈا پیش کر دیا۔ یہ ایک سیاسی ایجنڈا نہیں تھا۔ سیاسی خودکشی تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ آر۔ٹی۔سی کے لیڈر فائنل راؤنڈ میں جانے سے پہلے اپنا ایک متفقہ ایجنڈا طے پاتے کہ فیلڈ مارشل کے ساتھ بات کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آتی۔ یہ کس قسم کا اتحاد تھا کہ ہر لیڈر اپنا علیحدہ ایجنڈا پیش کر رہا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کے ایجنڈے پر نواب زادہ نصر اللہ خان اور ممتاز دولتانہ وغیرہ تو دم سادھے بیٹھے رہے مگر ولی خان نے اِس کی کھل کر حمایت کر دی۔ لہٰذا شیخ مجیب الرحمٰن کا ایجنڈا ہی آر۔ٹی۔سی کو قتل کرنے کیلئے کافی تھا۔ اسٹیبلشمنٹ نے ایک ہی دن میں چھ نکات کے ایک ہی وار سے پورے ملک کی سیاست کو خلط ملط کر دیا۔ آر۔ٹی۔سی میں شامل تمام مسیحا نفس پیرانِ سیاست مجیب الرحمٰن کے چھ پوائنٹ کے دھوئیں میں گم ہو گئے۔

اسٹیبلشمنٹ کے ذرائع ابلاغ نے اعلان کرنا شروع کر دیا کہ فوج نے اگر اقتدار کسی عارضی حکومت کو منتقل کیا تو ملک دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ اب ذرا صورتحال ملاحظہ کریں کہ آر۔ٹی۔سی سے باہر اسٹیبلشمنٹ آگن جالو کروا رہی تھی۔ گھیراؤ جلاؤ کروا رہی تھی۔ صدر پاکستان ہاؤس اور افواج پاکستان کے جنرل ہیڈ کوارٹرز کی بتی بند کروا رہی تھی۔ تمام سرکاری اداروں کے ملازمین ہڑتال پر جا چکے تھے۔ ٹرانسپورٹ کا پہیہ جام کرا دی چکی تھی۔ مولانا بھاشانی کا آخری بیان تھا کہ جو لوگ پاکستان میں انتخابات کی باتیں کر رہے ہیں یا اُس میں حصہ لینے کی باتیں کر رہے ہیں، ہم اُنکے گھر جلا دیں گے اور اُن کا قتل عام کیا جائے گا۔ مغربی پاکستان میں تمام لیفٹ کی پارٹیاں مولانا بھاشانی کا ساتھ دے رہی تھیں۔ خود ہماری پارٹی کا اندر کا لیفٹ بھی مولانا کے آگن جالو کے انقلاب میں

ہراول دستے کا کام کر رہا تھا۔ اِس ہراول دستے میں سب سے پیش پیش پیپلز پارٹی کا رہنما معراج محمد خان اور مختار رانا نظر آتا تھا جس کا لوگوں نے تخلص ہی قبضہ کرانا رکھ دیا تھا۔

اِس طریقے کے ساتھ آر۔ٹی۔سی سے باہر ہمارے لیفٹ اور رائیٹ دونوں نے مل کر انتہائی اَن سائنٹفک اور غیر دانشمندانہ آتش بیانی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ مولانا بھاشانی اور ہمارے لیفٹ کے انقلاب کے سپہ سالاروں کی مثال یوں تھی کہ ٹرینچ میں اُن کا کوئی سپاہی موجود نہیں تھا مگر یہ سپہ سالار ورلڈ وار کا اعلان کیے ہوئے تھے یعنی عالمی جنگ کا اعلان کیے ہوئے تھے۔

باہر کا عالم تو یہ تھا جو بیان کیا گیا ہے۔ آر۔ٹی۔سی کے اندر چھ پوائنٹ کا ایٹم بم چلوا دیا گیا۔ اِس صورتحال میں حقیقت پسندی اور دانشمندی کی تمام باتیں نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئیں۔ پاکستان کے تمام سیاست دان جو آر۔ٹی۔سی میں شریک تھے، بے معنی سیاست دان بن کر رہ گئے۔ اب نہ تو اُن کی آر۔ٹی۔سی میں کوئی حیثیت تھی اور نہ عوام میں اُن کی کوئی عزت باقی رہی تھی۔ اِس طریقے کے ساتھ اسٹیبلشمنٹ کو اپنے آگے کے انتظامات طے پانے کا پورا پورا موقع ہاتھ آ گیا۔ اسٹیبلشمنٹ نے حالات و واقعات کی سنگینی سے لوگوں پر ثابت کر دیا کہ اِس وقت سوائے فوج کے اور کوئی دوسری طاقت موجود نہیں ہے جو ملک کو سنبھال سکے۔ لہٰذا 25 مارچ 1969ء کو فیلڈ مارشل ایوب خان نے پاکستان کے اقتدار کو اپنے چیٹی بند بھائی جنرل محمد یحییٰ خان کو منتقل کر کے دوبارہ اقتدار فوج کے ہی سپرد کر دیا اور جنرل محمد یحییٰ خان نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر ملک کی باگ دوڑ ایک بار پھر اپنے آہنی ہاتھوں میں لے لی۔

پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور اُن کے تازہ دم مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد یحییٰ خان کا خیال تھا کہ ملک میں تازہ دم یعنی جوان مارشل لاء لگا دینے سے پاکستان کے عوام دبک کر خوفزدہ ہو کر گھروں میں بیٹھ جائیں گے۔ مگر اِس مرتبہ یہ اُن کی خام خیالی تھی۔ جوان مارشل لاء سے نہ تو مشرقی پاکستان کے عوام کے احتجاج کا لوہا ٹھنڈا پڑ سکا اور نہ ہی مغربی پاکستان کے عوام کے احتجاج کی آگ ٹھنڈی پڑ سکی۔ مشرقی پاکستان میں عوام کی قیادت شیخ مجیب الرحمٰن کے ہاتھوں میں تھی۔ مغربی پاکستان کے عوام کی قیادت چیئرمین بھٹو کے ہاتھوں میں تھی۔ مغربی پاکستان میں دو قوتیں نئے اور پرانے مارشل لاء کا سامنا کر رہی تھیں۔ ایک تو طالب علموں کی قوت تھی۔ دوسری قوت چیئرمین بھٹو اور پیپلز پارٹی تھی۔ اِن کے علاوہ مزدور تنظیمیں بھی اِس تحریک میں بے حد فعال کردار

www.bhutto.org

ادا کر رہی تھیں مگر ان کی طاقت کو انتہا پسندی کی سیاست کی نذر کر دیا گیا تھا۔ اِن کے علاوہ مغربی پاکستان کے وکلاء حضرات کا 1970ء کی تحریک میں بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اِس وکلاء طبقے کے احتجاج سے عوام کو اور تمام احتجاجی طبقوں کو بہت حوصلہ ملتا تھا۔ چیئرمین بھٹو اِن تمام سرگرم طبقوں کی اجتماعی قیادت اور اجتماعی طاقت تھے اور اپنی نیچر کے مطابق اِن تمام طبقوں سے زیادہ فعال، زیادہ متحرک اور زیادہ سرگرم انسان تھے۔ اُن کی اسی خوبی نے اُن کو مغربی پاکستان میں باقی تمام پرانے سیاست دانوں پر فوقیت عطا کر دی تھی۔ ہمارے یہ پرانے سیاست دان ابھی اپنی شیروانی کے بٹن بند کر ہی رہے ہوتے تھے کہ چیئرمین بھٹو پورے ملک کا دورہ کر چکے ہوتے تھے۔

چیئرمین بھٹو نے اِن تمام سیاست دانوں کو صرف اپنی وزڈم ہی سے نہیں پچھاڑا تھا۔ اُنہوں نے اِن کو اپنی سپیڈنگ نمار فتار سے بھی گھائل کر دیا تھا۔ بخدا میں نے اپنی زندگی میں چیئرمین بھٹو کی طرح کا کوئی دوسرا انسان اُن کی طرح جنوں جولاں نہیں دیکھا تھا۔ ان کے جنون پر میرا یہ شعر انتہائی صادق آتا ہے۔

تو شہنشاہِ جنوں جولاں ہے
دشت در دشت سلامی تیری

جنرل یحییٰ خان کے تازہ مارشل لاء کے لگتے ہی جماعت اسلامی اور نظام اسلام پارٹی اور کچھ دوسری مذہبی تنظیمیں تو فوری طور پر مارشل لاء کی بی ٹیم بن گئیں۔ باقی رہ گئے نواب زادہ نصراللہ خان اور ممتاز محمد دولتانہ۔ یہ بزرگ حضرات آر۔ٹی۔سی میں جانے اور جنرل ایوب کے ساتھ ہم زبان ہو کر لوگوں کو تحریک ختم کرنے کے بیان دینے پر عوام میں اپنی ساکھ کھو چکے تھے۔ اوپر سے مارشل لاء لگنے سے اِن کی سیاسی حیثیت ہی ختم ہو گئی تھی۔ اصغر خان کو لوگ قومی سیاست میں کسی گنتی میں شمار نہیں کرتے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکات کی وجہ سے پاکستان میں وجہ نزع بنا ہوا تھا۔ لہٰذا قیادت کے اِس بحران میں پاکستان میں دوبارہ چیئرمین بھٹو کی ذات ہی روشنی کا ایک مینار بن کر لوگوں کے سامنے کھڑی تھی۔ اُن کی ذات ویسے بھی قدرتی اعتبار سے 1970ء کی تحریک کے لئے فعال اور متحرک درجہ رکھتی تھی۔

لہٰذا چیئرمین بھٹو نے جنرل محمد یحییٰ خان کے جوان اور تازہ مارشل لاء کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بات کی تاریخ گواہ ہے کہ چیئرمین بھٹو واحد قومی سیاست دان اور قومی قائد تھے

www.bhutto.org

جنہوں نے یحییٰ خان کو الٹی میٹم دیا تھا کہ وہ فوری طور پر ملک میں عام انتخابات کروانے کا اعلان کرے۔ جب تک حکومت انتخابات کروانے کا اعلان نہیں کرے گی، عوام کی احتجاجی تحریک ختم نہیں کی جائے گی۔ تحریک کو جاری رکھا جائے گا۔

چیئرمین بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے سیاسی دباؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ یحییٰ خان کو اقتدار حاصل کرنے کے دوسرے دن ہی اعلان کرنا پڑا تھا کہ وہ بہت جلد عوام کے اصل نمائندوں کو اقتدار دے کر فوج کی نوکری پر واپس چلا جائے گا۔ یحییٰ خان کا اعلان تھا کہ پاکستان میں صاف اور شفاف انتخابات بالغ رائے دہی کے تحت کرائے جائیں گے اور عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار پُرامن طور پر منتقل کر دیا جائے گا۔ اُس نے اِس بات پر بار بار زور دیا تھا کہ وہ اقتدار کی کوئی خواہش نہیں رکھتا ہے۔

فوجی جنرل یحییٰ خان کے انتخابات اور ایل۔ ایف۔ او کا قانون

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد یحییٰ خان کا انتخابات کا اعلان وقتی طور پر ایک معجزے سے کم دکھائی نہیں دیتا تھا مگر جب اُس نے اپنے انتخابی لیگل فریم ورک کا اعلان کیا تو اُس کے اِس صاف اور شفاف انتخابات کروانے کے اعلان کی قلعی کھل گئی تھی۔ اِن انتخابات کے قانون کا نام ایل۔ ایف۔ او (L.F.O) رکھا گیا تھا۔ یہ قانون یحییٰ خان نے 20 نومبر 1969ء کو لاگو کیا تھا۔ اِس قانون میں مارشل لاء ریگولیشن آرڈر نمبر 60 کے تحت ایسی تمام شرائط دی گئی تھیں جو تمام کی تمام پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف جاتی تھیں۔

اِس قانون کے تحت کوئی سیاست دان یا سیاسی کارکن مارشل لا پر یا فوج پر کسی قسم کی تنقید نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے کسی فلسفے کی تقریر نہیں کر سکتا تھا جو اسلام کے خلاف ثابت ہوتا ہو۔ کسی قسم کی طبقاتی کشمکش کی بات کرنا خلاف قانون تھا۔ نظریہ پاکستان کے خلاف بات کرنا خلاف قانون تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نظریہ پاکستان کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں کرتی تھی مگر اُس کا روٹی کپڑا اور مکان کا فلسفہ اور منشور جو روزِ اوّل سے اسلام کے خلاف قرار دیا گیا تھا۔ وہ مارشل لا کے قانون کی زد میں آ گیا۔ طبقاتی تفریق کے خلاف پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی ہر بات کو خلاف قانون قرار دے کر جیلوں کو بھرنا شروع کر دیا گیا۔ پیپلز پارٹی کے تمام اہم لیڈر، کارکن اور اُمیدواروں پر

www.bhutto.org

مقدمے قائم کردیئے گئے۔ اِس طریقے کے ساتھ بڑی خوف وہراس کی فضا پیدا کردی گئی تھی۔

اسٹیبلشمنٹ کے سازشی انتخابات

جنرل محمد یحیٰی خان کے کرائے گئے یہ انتخابات بھی ہر اعتبار سے سازشی انتخابات تھے۔ قطعی طور پر صاف اور شفاف نہیں تھے۔ 1970ء کے انتخابات میں اُس دور کی اسٹیبلشمنٹ نے آج کی موجودہ اسٹیبلشمنٹ کی طرح انتخابات کے نتائج بدلنے کی پالیسی اختیار نہیں کی تھی۔ اُس نے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟ اِس کی صرف اور صرف ایک ہی وجہ تھی کہ اُس وقت تک پاکستان میں کبھی عام انتخابات ہوئے ہی نہیں تھے۔ اِس طرح کے انتخابات کا رواج ہی ختم ہو چکا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ کو اِس نوع کے انتخابات کے نتائج کا نہ تو تجربہ تھا اور نہ ہی اندازہ تھا۔ لہٰذا 1970ء کے انتخابات میں اسٹیبلشمنٹ نے وہی پرانے حربے استعمال کیئے تھے جو پاکستان کے ابتدائی ایام میں ممدوٹ اور دولتانہ اور کھوڑو اور ڈاکٹر خان کے وقت مغربی پاکستان میں استعمال کیئے جاتے تھے۔ یہ حربے کچھ اس طرح کے ہوتے تھے کہ سیاسی جماعتوں کو توڑ مروڑ کر گروپوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا۔ سیاست دانوں کو شخصی عداوتوں کا شکار بنا کر ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کردیا جاتا تھا۔ انتخابات میں علاقوں کی تقسیم ہو جاتی تھی۔ لوگ ٹکڑیوں میں بٹ کر انتخابات میں کامیابی حاصل کرتے تھے۔ اِس طریقے سے انتخابات میں کامیاب گروپوں اور ٹولیوں کو اسٹیبلشمنٹ ہر ضلع کے ڈپٹی کمشنر کے ذریعے اکٹھا کرلیا کرتی تھی اور اپنی مرضی کی حکومت تشکیل کرلیتی تھی۔ اِس طرح کی حکومتیں اسٹیبلشمنٹ کے پنجہ استبداد میں جکڑی رہتی تھیں۔ اِن میں سے اگر کوئی حکومت اسٹیبلشمنٹ کی مرضی کے خلاف کوئی اقدام کرتی تو فوری طور پر اُس کے مخالف خلاف دھڑے کو عدم اعتماد کے ذریعے اقتدار میں لے آیا جاتا تھا۔ جنرل ایوب خان کے مارشل لا سے پہلے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ سیاست دانوں کے ساتھ اِس طرح کے چوہے بلی کا کھیل کھیلتی چلی آرہی تھی اور سیاست دانوں کو ذلیل وخوار اور بدنام کرتی چلی آرہی تھی۔ 1970ء کے انتخابات میں بھی وہ اپنے پرانے تجربے کے مطابق مختلف دھڑوں کو انتخابات میں کامیاب کروانا چاہتی تھی۔

اب حیران کن بات یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے انتخابات سے وہ مکمل طور پر بے نیاز تھی۔ وہاں پر شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف کسی قسم کی بھی کوئی انتخابی دھڑے بندی نہیں کرائی گئی تھی۔ یہ تمام

www.bhutto.org

دھڑے بندیاں مغربی پاکستان میں صرف چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف قائم کی گئیں تھیں۔ بلکہ قیوم لیگ کو باقاعدہ سرکاری جماعت کی حیثیت سے میدان میں اُتارا گیا تھا اور اُس کو ڈھیروں سرمایہ فراہم کیا گیا تھا اور مغربی پاکستان کے تمام وڈیروں، پیروں اور میروں کو اِس میں شامل کرادیا گیا تھا۔ مغربی پاکستان میں تمام سیاسی اور مذہبی جماعتیں صرف پاکستان پیپلز پارٹی کا مقابلہ کررہی تھیں۔ اُن کا اور کسی دوسری جماعت کے ساتھ کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ چیئرمین بھٹو کے برعکس مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن تنہا میدان عمل میں تھا۔ اُس کا مقابلہ کرنے والا ہی کوئی نہیں تھا۔

چیئرمین بھٹو سے انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا مطالبہ

یہ بات اپنی جگہ انتہائی حیرت کا باعث تھی کہ پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر کا لیفٹ اور باہر کا لیفٹ صرف چیئرمین بھٹو سے ہی انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کا مطالبہ کررہا تھا۔ آخر شیخ مجیب الرحمٰن سے ان کا یہ مطالبہ کیوں نہیں تھا۔

آیئے اِس پہلو کو ایک دوسرے انداز سے جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو اگر انتخابات کا بائیکاٹ کربھی دیتے تو کیا پاکستان میں سرخ انقلاب برپا ہوسکتا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں سوشلسٹ انقلاب پرانے طریقہ انقلاب کے مطابق ہر کہیں اور ہر جگہ باقاعدہ مسلح جدوجہد سے آیا تھا۔ اِن انقلابات کی تکمیل کے لئے عوامی آرمی تشکیل دی گئی تھی۔ عوام کو مسلح جدوجہد کی تعلیم اور سامراج کی افواج سے جنگ کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ اُن کو ہتھیاروں سے لیس کیا گیا تھا۔ وہ عوامی انقلابی فوج کے نظریاتی سپاہی اور افسران اور لیڈران جنگلوں اور پہاڑوں کے دشوار گزار راستوں کے مصائب برداشت کرتے تھے۔ دلدلوں سے گزرتے تھے۔ شاہی افواج پر شب خون مارتے تھے۔ اُن عوامی انقلابی افواج کا نام سرخ فوج رکھا گیا تھا۔ جمہوریہ چین میں ماؤزے تنگ کی پارٹی نے ریڈ آرمی کا لشکر بنا کر لانگ مارچ کا عالمی ریکارڈ قائم کردیا تھا۔ سوویت روس میں لینن کی سرخ عوامی فوج نے اسٹالن گراڈ کے معرکے کی تاریخ کو اپنے خون سے رقم کیا تھا۔ اِن دو عظیم انقلابیوں کے انقلابات میں صرف اُن کی پارٹی ہی برسرِعمل نہیں تھی، اُن کے انقلابات میں عوام کی شرکت ہی اُن کی کامیابی کا اصل راز بنی تھی۔

www.bhutto.org

سوچنے کی بات یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے اندر کا لیفٹ یا باہر کا لیفٹ کس بھرتے پر چیئرمین بھٹو کو چین کی طرح کا یا روس کی طرح کا سرخ انقلاب برپا کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ یا پارٹی کی صفوں میں خلل اندازی اور انتشار پھیلا رہا تھا۔ کیا پارٹی کے اندر کوئی ایسا لیڈر موجود تھا جو لوگوں یا نوجوانوں کی گوریلا وارفیئر کی تعلیم و تربیت کرتا۔ کیا اِن انقلابیوں نے لوگوں کو مسلح جدوجہد کے لئے تیار کیا تھا۔ کیا اُن کے پاس پاکستان کی جدید تربیت یافتہ مسلح افواج اور پولیس سے ٹکر لینے کے لئے وہ جدید اسلحہ تھا جس سے وہ اِن کا مقابلہ کر سکتے۔ فرض کریں کہ چیئرمین بھٹو اگر اِن لوگوں کا کہا مان کر انتخابات کی بجائے انقلاب کا راستہ اختیار کر لیتے تو اُن کے انقلاب برپا کرنے کے کتنے امکانات ہو سکتے تھے۔

اِس سلسلے میں پہلی حقیقت پر مبنی بات تو یہ ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی جو ابھی تازہ تازہ وجود میں آئی تھی، بہت کم عمر کی تھی۔ وہ صرف مغربی پاکستان تک ہی محدود تھی۔ نہ صرف مغربی پاکستان تک محدود تھی بلکہ مغربی پاکستان کے صرف دو صوبوں میں اپنی عوامی مقبولیت رکھتی تھی اور اپنا تنظیمی ڈھانچہ رکھتی تھی۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ابھی تک پیپلز پارٹی کی تنظیم سازی کا سلسلہ بہت کمزور تھا۔

اِن دونوں صوبوں میں بھی یعنی سندھ اور پنجاب میں پیپلز پارٹی کی تنظیم سازی کوئی باقاعدہ انقلابی اور نظریاتی انداز میں نہیں کی گئی تھی۔ سندھ اور پنجاب میں اِس پارٹی کے کئی عہدے دار زمیندار اور جاگیردار تھے۔ کئی عہدے دار سرمایہ دار بھی تھے۔ اُن کے علاوہ پاکستان پیپلز پارٹی میں اکثریت انتہائی غریب مفلوک الحال لوگوں کی تھی۔ پیپلز پارٹی کی قیادت زیادہ تر وائٹ کالر طبقے کی تھی جس میں وکلا حضرات کی اکثریت تھی۔ یہ وائٹ کالر طبقہ ایک جمہوری سیاسی جدوجہد میں تو فعال تھا مگر یہ کسی مسلح جدوجہد کا بیڑا اُٹھانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔

کیا اِن عناصر پر تکیہ اور انحصار کر کے چیئرمین بھٹو کوئی خونی انقلاب لانے کا راستہ اختیار کر سکتے تھے۔ پاکستان میں اسٹیبلشمنٹ اِس قدر طاقتور اور منظم تھی کہ وہ چیئرمین بھٹو کو پیپلز پارٹی کو آزادی کے ساتھ انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ ہر جگہ پارٹی کا سرکاری انتظامیہ نے ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ اِن حالات میں کسی بھی قسم کی مسلح جدوجہد یا گوریلا وار کا سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ ایسا سوچنا ہر اعتبار سے خودکشی کے مترادف ہوتا۔

www.bhutto.org

چیئر مین بھٹو اگر پارٹی کے اندر اِس لیفٹ کا کہنا مان کر کسی مسلح جدوجہد کا راستہ اختیار کرتے تو اُن کا انجام بھی 1970ء میں چی گویرا کا سا ہی ہوتا تھا۔ کیا دنیا کا کوئی ایمان دار انسان چی گویرا کے اخلاص، اُس کی نیت، اُس کی جدوجہد اور اُس کے جذبے کے عظمت سے انکار کر سکتا ہے۔ ہرگز نہیں کر سکتا۔ دنیا کا ہر صحیح الفہم انسان چی گویرا کے عزم وارادے کا قدر دان ہے۔ اُس کے انقلابی اخلاص کا معترف ہے۔ مگر چی گویرا سے وہ غلطی سرزد ہوئی تھی جس غلطی کو سرزد کرنے کا مشورہ پارٹی کے اندر کا اور باہر کا لیفٹ چیئر مین بھٹو کو دے رہا تھا۔ چی گویرا ''بلیویا'' میں کسانوں کے حق میں ایک پرولتاری کسان انقلاب برپا کرنا چاہتا تھا۔ بلیویا کے جاگیرداروں کی جاگیریں طاقت سے چھین کر کسانوں میں تقسیم کرنا چاہتا تھا۔ دیکھا جائے تو چی گویرا کا یہ جذبہ کس قدر صالح اور عظیم تھا۔ مگر ہوا کیا کہ چی گویرا نے بلیویا کے مقامی باشندوں کسانوں کو اِس انقلاب کے لئے باقاعدہ تیار ہی نہیں کیا تھا۔ اُن کی مسلح جدوجہد کرنے کی تربیت ہی نہیں کی تھی۔ وہ صرف کسانوں کی محبت پر ہی انحصار کر کے اپنے مختصر ساتھیوں کے ساتھ بلیویا کی حکمران افواج کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ مقامی باشندے جو دل سے چی گویرا کے ساتھ تھے، یہ بھی جانتے تھے کہ اُس کی جنگ اُن کے مفادات کی جنگ ہے۔ اِس میں چی گویرا کا کوئی ذاتی مفاد مضمر نہیں ہے۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ مقامی باشندے بلیویا کی مسلح افواج کے خوف سے چی گویرا کا ساتھ نہیں دے سکے تھے۔ وہ خود اپنے حقوق کی اِس مسلح جدوجہد کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ اُنہوں نے چی گویرا کی کسی قسم کی کچھ مدد نہ کی۔ مقامی باشندے اِس قابل ہی نہ تھے کہ وہ چی گویرا کا ساتھ دے سکتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چی گویرا جو بلیویا کے کسانوں کا مسیحا بن کر اُن کے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا، وہ انتہائی بے بسی کے عالم میں حکمران فوجوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ انقلابی سائنس کے استادوں نے چی گویرا کی اِس انسان دوستی کی جنگ کو ایڈونچرازم کے نام سے منسوب کر دیا تھا اور چی گویرا جیسے عزم و ہمت کے پیکر کو مہم جو اور مہم باز کہا تھا۔

پارٹی کے اندر کا لیفٹ اور پاکستان بھر کا لیفٹ کس لئے اِس طرح کے ایڈونچرازم کے نعرے مار رہا تھا۔ کیا یہ اسٹیبلشمنٹ کے ایجنٹ اُن سے انقلاب، سوشلزم اور کیمونزم کے نام پر یہ نعرے لگوا رہے تھے۔ یہ لوگ بغیر کسی تیاری کے گوریلا وار کی باتیں کیوں کر رہے تھے۔ اِس کا انکشاف ماضی میں اچھی طرح ہو چکا ہے۔ اب وہ تمام چہرے بے نقاب ہو چکے ہیں جو ایک جمہوری جدوجہد کو

www.bhutto.org

گمراہی کے راستے پر ڈالنا چاہتے تھے۔

اِس مسئلے کو ایک تیسرے اینگل سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ تیسرا پہلو یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے آبادی زیادہ تھی اور یہی اکثریت شیخ مجیب الرحمٰن کی انتخابی اکثریت کا باعث ہوئی تھی۔ مجیب الرحمٰن کے سامنے نہ تو کسی ولی خان اور اکبر بگٹی، غوث بخش بزنجو، خیر بخش مری، دولتانہ، پیر پگارہ، نواب زادہ نصر اللہ خان، جماعت اسلامی کا مولانا مودودی، جمعیت الاعلمائے پاکستان کا مفتی محمود، خان عبدالقیوم خان اور ایئر مارشل اصغر خان کی طرح کی کوئی اپوزیشن تھی جس طرح کی چیئر مین بھٹو اور پیپلز پارٹی کے راستے میں تھی۔ پاکستان کے تمام سیاست دانوں کا لشکرِ جرار صرف اور صرف چیئر مین بھٹو کو ہی انتخابات سے باہر کرنا چاہتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی تمام آبادی مجیب الرحمٰن کے ساتھ تھی۔ پاکستان کی لیفٹ اگر شیخ مجیب الرحمٰن کو بائیکاٹ کا مشورہ دیتی، انتخابات کے بائیکاٹ کرنے کا کہتی تو تب یہ باور کیا جاسکتا تھا کہ ملک میں انقلاب برپا کیا جاسکتا تھا۔ مشرقی پاکستان کے عوام مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ سے زیادہ متنفر تھے۔ اُن کے رشتے بھی پاکستان کی عسکری قوتوں سے نہ ہونے کے برابر تھے۔ وہ انقلاب کے لئے مسلح جدو جہد بھی کر سکتے تھے۔ پاکستان میں انقلاب برپا کرنے کا یہ انتہائی سہل، آسان اور سائنسی طریقہ ہوسکتا تھا جو کہ ایک ممکن طریقہ تھا۔ اِس لئے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اگر انتخابات کا بائیکاٹ کر دیتا تو پاکستان کے یہ انتخابات کسی قیمت پر بھی ویلڈ انتخابات نہیں بن سکتے تھے۔ اِن انتخابات کو کوئی تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوسکتا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی بجائے اگر چیئر مین بھٹو انتخابات کا بائیکاٹ کرتے تو مغربی پاکستان میں باقی تمام سیاست دان اور سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لینے کو تیار تھیں۔ لہٰذا چیئر مین بھٹو کے انتخابات میں حصہ نہ لینے سے پاکستان کے انتخابات کی صداقت پر قطعی کوئی حرف نہیں آنا تھا اور نہ ہی انتخابات کو روکا جاسکتا تھا۔ اِس حقیقت کے پیشِ نظر سب سے صائب بات یہ ہوسکتی تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو ہمارا لیفٹ انتخابات کے بائیکاٹ کرنے کا کہتا۔ اُس کو انتخاب لڑنے کی بجائے انقلاب برپا کرنے کا کہتا۔ مگر ہمارا لیفٹ حقیقت کے بالکل اُلٹ بات کر رہا تھا۔ وہ صرف چیئر مین بھٹو کو انتخابات سے باہر رہنے کا مشورہ دے رہا تھا۔ نہ صرف مشورے دے رہا تھا بلکہ ایک بہت ہی تیز قسم کے نعروں کی تحریک چلائے ہوئے تھا۔ پاکستان میں پاکستان کے تمام لیفٹ کی سر پرستی اور رہنمائی برصغیر کی کیمونسٹ پارٹی کرتی

www.bhutto.org

تھی۔ اِس کیمونسٹ پارٹی کا مرکزی ہیڈکوارٹر ہندوستان میں تھا۔ پاکستان کے کیمونسٹ جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے پاکستان میں آ گئے تھے، اُن کا تمام سورس آف انفارمیشن ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی ہی تھا۔ پاکستان میں تمام کیمونسٹ اُن کے کہنے پر، اُن کی لائن پر عمل پیرا ہوا کرتے تھے۔ ہندوستان شیخ مجیب الرحمٰن کے انتخابات میں حصہ لینے کے حق میں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پاکستان کا تمام لیفٹ شیخ مجیب الرحمٰن کے حق میں تھا۔ ہندوستان چونکہ چیئرمین بھٹو کے خلاف تھا لہٰذا ہمارا لیفٹ بھی ان کے خلاف تھا۔

پاکستان میں کیمونسٹوں اور سوشلسٹوں کا اندازِ سیاست

چیئرمین بھٹو سے پہلے پاکستان میں لیفٹ صرف نظریوں کی سیاست کرتا تھا۔ انقلابی قصے کہانیوں کا شیدا تھا۔ انتہائی نظریہ ساز اور نعرہ زدہ تھا۔ ایک تصوراتی اور خیالی انقلاب کی دنیا میں رہتا تھا۔ تحریر و تقریر کی دنیا میں رہتا تھا۔ وہ کسی قیادت، تنظیم اور تنظیم سازی کا قائل ہی نہیں تھا۔ اُس کے انتہا پسندی کے نعرے ہی اُس کی زندگی کا حسن ہوتے تھے۔ اُس کی شعلہ بیانی ہی اُس کے انقلاب کی کامیابی کی دلیل ہوتی تھی۔ یہ لوگ عمل کے انقلاب کے داعی ہرگز نہیں تھے۔ یہ لفظوں کے انقلاب کے خوگر تھے۔ اپنی کسی ایک تقریر پر سالوں مست رہتے تھے۔ اپنے نظریات کے تصورات میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ افسانے اور ڈرامے لکھ کر انقلاب برپا کرنے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ چند مفروضوں پر زندگی گزارتے تھے۔ وہ مفروضے یوں تھے کہ ایک دن کسان خود اُٹھ کر زمینوں پر قبضہ کرلیں گے۔ مزدور اُٹھ کر ملوں پر قبضہ کرلیں گے۔ اِس طرح انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اُن کے اِن تمام نیک ارادوں اور نیک خواہشوں کے باوجود مزدوروں، کسانوں سے اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہوا کرتا تھا۔ مزدور جب کام پر جارہے ہوتے تھے تو اُس وقت یہ حضرات سو رہے ہوتے تھے۔ جب مزدور کام سے واپس آتے تھے، اُس وقت اِن کو اپنی شب باشی سے فرصت نہیں ہوتی تھی۔

سب سے زیادہ مشکل بات یہ تھی کہ اِن کے تصورات کے مارکسیٹ انقلاب کا ماڈل سوویت روس اور جمہوریہ چین سے کم درجے کا ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ اِس سے کم درجے کے کسی انقلاب کو نہ تو یہ خاطر میں لاتے تھے اور نہ ہی پسند کرتے تھے۔ ان حضرات کے ذہنی انقلاب کی

www.bhutto.org

منصوبہ بندی یہ تھی کہ سوویت روس ایک دن اپنی فوجوں کے ذریعے پاکستان پر قبضہ کر لے گا اور وہ پاکستان کا اختیار و اقتدار اُن کے سپرد کر دے گا اور یہ تمام انقلابی پاکستان پر سرخ جھنڈا لہرا کر پاکستان کے حکمران بن جائیں گے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ ہم کو صرف پاکستان کے محنت کشوں کی ذہنی تعلیم کرنی ہے اور اُن کو انقلاب کے لئے تیار کرنا ہے۔ انقلاب لانے کا تمام کام سوویت روس کی کیمونسٹ پارٹی کے ذمے ہے۔

پاکستان اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے امریکہ اور سوویت یونین کے لئے بڑا اہم ملک تھا اور بہت حساس خطے میں واقعہ تھا۔ پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے والی سول اور فوجی افسر شاہی انگریز سامراج کی تربیت یافتہ تھی۔ امریکی سامراج کا سرمایہ داری نظام پاکستان کے ان نوزائیدہ جاگیردار سیاست دانوں اور فوجی جرنلوں کے عین مزاج کے مطابق تھا اور ان کی فطرت کو سوٹ کرتا تھا۔ امریکہ کے برعکس سوویت یونین کا سوشلسٹ نظام ان جاگیرداروں اور سول و بیوروکریٹوں اور فوجی جرنلوں کے مفادات کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ سوویت یونین کی دوستی میں ان کو نقد مال نہیں مل سکتا تھا۔ اور نہ ہی فوجی ساز و سامان کے لئے بھاری قرضے مل سکتے تھے۔

عالمی سرمایہ داری نظام کے محافظ امریکہ کی سوویت یونین کے غیر سرمایہ داری سوشلسٹ نظام کے ساتھ کولڈ وار کا آغاز ہو چکا تھا۔ امریکی سامراج کو سوویت یونین کے انقلابی نظام سے پوری دنیا میں اپنے سرمایہ داری نظام کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا۔ وہ سوویت یونین کے ہوتے پوری دنیا کے ممالک کے وسائل پر قابض نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا سوویت روس اس کے لئے ایک مستقل خطرہ تھا جس خطرے سے نپٹنے کے لئے پورا یورپ امریکہ کی سربراہی میں اکٹھا ہو کر سوویت یونین کو دنیا کے نقشے سے نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا۔ لہٰذا سوویت یونین کا گھیرا تنگ کرنے کے لئے اس کا راستہ روکنے کے لئے اور اس پر حملہ آور ہونے کے لئے پاکستان کا علاقہ نہایت کارآمد تھا۔

(نوٹ) کہا جاتا ہے کہ انگریز اور سامراجی سو سال پہلے کی بات سوچتے ہیں۔

اس محاورے کی صداقت ہم کو پاکستان کے ہی علاقے میں سوویت یونین کی شکست اور اس کے انہدام کی شکل میں 93-1992ء میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ ثابت ہوا کہ امریکہ 1947ء کے فوراً بعد پاکستان کو سوویت یونین کے خلاف استعمال کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی پاکستان کے صوبہ بلوچستان کے قبائلی سرداروں نے

www.bhutto.org

بلوچستان کو ایک علیحدہ ریاست بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ بلوچ سرداروں کا یہ فیصلہ لارڈ مونٹ بیٹن کی تقسیم ہندوستان کے خلاف تھا۔ جس کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان باغی سرداروں کے علاقوں کو باقاعدہ فوجی کاروائی کے ساتھ پاکستان میں شامل کر لیا گیا تھا۔ پاکستان کی بلوچستان میں اس فوجی کاروائی سے کچھ بلوچ سرداروں کو قتل بھی کر دیا گیا تھا۔ ان کو پھانسیاں دے دی گئی تھیں۔ بلوچستان کے ان باغی سرداروں کو در پردہ خان عبدالغفار خان کے صوبہ سرحد کے سرخ پوشوں کی حمایت حاصل تھی جو صوبہ سرحد کو ان کی ہی طرح ایک آزاد ریاست پختونستان کے نام پر بنانا چاہتے تھے۔ یہ دونوں فریق اپنی علیحدگی پسندی کو کیمونزم کا نام دیتے تھے اور اپنی جدوجہد کو سوشلزم کی جدوجہد کہا کرتے تھے۔

ہندوستان اور سوویت یونین دونوں ہی چونکہ پاکستان کو ایک کمزور ملک دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک مضبوط پاکستان کو اپنے لئے خطرناک خیال کرتے تھے۔ لہٰذا ان دونوں ممالک نے پاکستان کو اپنے دباؤ میں رکھنے کے لئے پاکستان کے ان باغی ٹولوں کی پشت پناہی کرنا شروع کر دی۔ بلوچستان کے باغی سرداروں اور صوبہ سرحد کے علیحدگی پسندوں کو ہر طرح کی امداد دینا شروع کر دی۔ اسلحہ وغیرہ فراہم کرنا شروع کر دیا اور ان کو سیاسی پناہ دینا شروع کر دی۔ سوویت یونین کا خیال تھا کہ پاکستان کو امریکہ سے خالی کرانے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان میں صوبوں کی خودمختار ریاستیں بنوا کر پاکستان سے امریکہ کے فوجی اڈا کو اٹھوا دیا جائے جو امریکہ نے پشاور سے کچھ فاصلے پر بڈ بیڑ میں سوویت یونین کے سر پر قائم کر رکھا تھا۔

لہٰذا سوویت یونین کی پاکستان کے ساتھ اس طرح کش مکش کی وجہ سے پاکستان میں سوشلزم یا کیمونزم کی سیاست کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ پاکستان کے کیمونسٹ پاکستان کے بارے میں شروع دن سے ہی ڈبل مائنڈڈ تھے۔ ان میں سے کچھ تو وہ تھے جو پاکستان کی پیدائش کے ہی خلاف تھے۔ پاکستان کی پیدائش کو ہی غلط قرار دیتے تھے اور پاکستان کو دوبارہ ہندوستان میں شامل دیکھنا چاہتے تھے۔ پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کے درمیان ایک سازش کے تحت دونوں جانب کے انسانوں کے خون کی لکیر کھینچ دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پاکستان کی پیدائش کو غلط کہہ کر سوشلزم اور کیمونزم کی بات کرنے والے پاکستان میں اچھے تصور نہیں کئے جا سکتے تھے۔ ان کے فکر و فلسفے کی یہاں پذیرائی نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ ان لوگوں کو پاکستان میں بے حد نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کے

www.bhutto.org

علاوہ پاکستان میں کیمونسٹ انقلاب برپا کرنے والی انٹرنیشنل کیمونسٹ پارٹی کا نظریہ پاکستان پر ایک جبری انقلاب برپا کرنے کا نظریہ تھا۔ ان کا نظریہ تھا کہ جس طرح سوویت یونین کی فوجی طاقت سے پولینڈ میں سوشلسٹ انقلاب برپا کیا گیا ہے پاکستان میں بھی اسی طریقے کا انقلاب برپا کرادیا جائے گا۔

لہٰذا پاکستان میں ایک سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کے اس نوع کے کیمونسٹوں کے (Confusion) کی وجہ سے پاکستان میں عوام کی سطح پر محنت کشوں کی سطح پر کوئی بھی عوامی تنظیم یا سیاسی جماعت قائم نہ کی جا سکی تھی۔ پاکستان میں عوامی سطح پر ایک سوشلسٹ جماعت کے نہ بنائے جانے میں پاکستان کے امریکہ کے ایجنٹ فوجی حکمرانوں کا پاکستان میں کیمونسٹ اور سوشلسٹ دانش وروں اور لیڈروں پر پنڈی سازش کیس کے نام سے بنائے گئے مقدمہ کا بھی بڑا کردار تھا۔ جس سازش کے مقدمے میں سبطِ حسن، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض اور میجر اسحاق پر الزام تھا کہ یہ لوگ اوران کے کچھ دوسرے ساتھی پاکستان کے ایک فوجی میجر جنرل اکبر کے ذریعے پاکستان میں ایک مسلح انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے۔ اس مقدمے میں ان لوگوں کو سوویت یونین کے ایجنٹ قرار دے کر بغاوت کے جرم میں پانچ پانچ سال قید بامشقت سنا دی گئی تھی۔ پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے اس مقدمے اور اس نام نہاد سازش کیس کی بڑی تشہیر کی تھی۔ جس کی وجہ سے پاکستان میں تمام سوشلسٹ خیال رکھنے والے لوگوں کو خوفزدہ کر دیا گیا تھا۔ لوگ بھول کر بھی سوشلزم کا نام نہیں لیتے تھے۔ پاکستان میں محض کسی ایک انقلابی فکر وسوچ کے پمفلٹ کے کسی کے گھر سے پکڑے جانے پر سیاسی کارکنوں کو شاہی قلعہ لاہور میں ڈال دیا جاتا تھا۔ جس طرح کہ قمر یورش کو شاہی قلعے لاہور میں لے جایا گیا تھا۔

پاکستان میں کیمونزم اور سوشلزم کا نظریہ شاعری کی حد تک تو بہت مقبول اور موجود تھا۔ مگر کسی تنظیمی شکل میں عمل کی شکل میں موجود نہیں تھا۔ پاکستان میں کیمونسٹ اور سوشلسٹ خیال وفکر اور انقلابی جدوجہد کی وجہ سے حسن ناصر جیسے کچھ صاف دل کیمونسٹ لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کا بہت برا انجام دیکھنے میں آیا تھا۔ جس حسن ناصر کو لاہور کے شاہی قلعے میں تشدد کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ اس طرح کے تلخ واقعات کی وجہ سے بھی پاکستان میں کیمونسٹ اور سوشلسٹ خیال کے لوگ قیامِ پاکستان کو ایک جبر تصور کرنے لگ گئے تھے۔ پاکستان میں فوجی حکمرانوں کے یہ جبر

www.bhutto.org

کی ہی وجہ تھی کہ فیض احمد فیض کی طرح کا انقلابی انسان انقلاب کا نوحہ گر بن گیا تھا، اور یہ شعر کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

بیتا دید امید کا موسم دھول اڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کے بادل کب برکھا برساؤ گے

یعنی وہ بھی باہر سے آنے والے کسی انقلاب کی آس لگائے ہوئے تھے۔

لہٰذا اس طرح کے وہ حالات و واقعات تھے جن کی وجہ سے پاکستان کے ترقی پسند کیمونسٹ اور سوشلسٹ خیال کے لوگ پاکستان کے وجود کے خلاف ہو گئے تھے۔ وہ پاکستان کی سیاست کرنے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ پاکستان میں جتنے بھی بڑے بڑے انقلابی شہرت رکھنے والے کیمونسٹ لیڈر تھے ان کی سوشلسٹ نام کی سیاسی جماعتیں تو موجود تھیں مگر عوام میں ان کی کوئی تنظیم سازی یا ممبر سازی نہیں تھی۔ وہ اپنے اپنے نام میں اور اپنی ذات میں ہی خود پارٹی بن چکے تھے۔ یا خود کو ایک سوشلسٹ جماعت خیال کرتے تھے۔ ان تمام بڑے سوشلسٹ شہرت کے حامل کیمونسٹوں کا کام پاکستان کے فوجی حکمرانوں کا سوویت یونین اور جمہوریہ چین کے ساتھ دوستی کے رابطے پیدا کرانا تھا۔ اور ان سوشلسٹ ممالک کی پاکستان کے حوالے سے دوستی کی انجمنیں بنانا تھا۔ کیمونسٹ خیال وفکر کے جو لوگ زیادہ نمایاں نہیں تھے جن میں وکیلوں کی اکثریت تھی وہ مختلف ترقی پسند تنظیموں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی سب سے زیادہ تعداد نیشنل عوامی پارٹی میں شامل تھی اور وہ نیشنل عوامی پارٹی کو ایک لیفٹ کی پارٹی قرار دیتے تھے۔ ان لوگوں کی سیاست کا اوڑھنا بچھونا بھی ہندوستان پرستی تھی اور پاکستان کے قیام کی مخالفت ہوتا تھا۔ یہ لوگ پاکستان کی سیاست ہی نہیں کرتے تھے۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم ہی کرنا نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بے شمار تنازعات ہیں۔ ان تنازعات میں صرف پاکستان ہی ہٹ دھرم اور غلط نہیں ہے، ہندوستان بھی پاکستان کی ہی طرح اپنے مفادات میں ہٹ دھرم اور غلط ہے۔ یہ ان دونوں ممالک کے تنازعات کی ہٹ دھرمی ہی تو تھی جو بعد ازاں ان دونوں کو جنگوں تک لے گئی تھی۔ جس کا انت مشرقی پاکستان میں ہندوستان کی فوجی مداخلت میں دیکھنے میں آیا تھا۔

جہاں تک ہمارے کیمونسٹ حضرات کا ہندوستان کے ساتھ دوستی کرنے کا مسئلہ تھا وہ

www.bhutto.org

اصولی طور پر تو ایک درست مسئلہ تھا۔ مگر ان کا ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان کی کسی حیثیت کو ہی تسلیم نہ کرنا وقت اور حقائق کو تسلیم نہ کرنے والی بات تھی۔ جس طرح گزرا ہوا وقت واپس نہیں آ سکتا تھا اسی طرح ہندوستان اور پاکستان دوبارہ اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ ان لوگوں کی ہندوستان کے ساتھ انتہا پسندی کی یک طرفہ حمایت کی وجہ سے پاکستان کے لوگ ان پر ہندوستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام رکھتے تھے اور ان کی سیاست کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ لوگ اپنی اس روش پر نظر ثانی کرنے کو اپنی توہین خیال کرتے تھے یہ لوگ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی برابری کی حیثیت کے قائل ہی نہیں تھے اور نہ ہی اس کی سیاست ہندوستان کے پاکستان کے خلاف کسی معاندانہ رویے کی مذمت کرتے تھے۔ ان لوگوں کی سیاست دراصل خان عبدالغفار خان کی کانگرس کے اتحادی ہونے کی سیاست کا تسلسل تھی جو تقسیم ہندوستان سے پہلے کی سیاست تھی۔ جو سیاست پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ پاکستان جس طرح سے بھی وجود میں آیا تھا۔ پاکستان کا بننا غلط تھا یا صحیح تھا۔ یہ ایک الگ بات اور ایک علیحدہ نوعیت کی بحث کا مسئلہ ہے۔ مگر جب پاکستان بن گیا اس وقت اس بات یا اس بحث کی کوئی ضرورت اور گنجائش نہیں باقی رہ گئی تھی۔ یہی ہٹ دھرمی ہندوستان کے انتہائی متعصب حکمران سیاست دانوں کی تھی۔ جن کی غلط ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستان وجود میں آیا تھا جس کا ذکر بڑی جرات کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب ''آزادی ہند'' جس کا انگریزی میں نام ''India Wins Freedom'' تھا کے صفحہ نمبر 299 پر انتہائی جگر سوزی کے ساتھ کچھ اس طرح سے رقم کیا تھا۔ ''کانگرسیوں میں تقسیم کے مسئلے کے سب سے بڑے حامی سردار پٹیل تھے۔ انہوں نے جھنجھلاہٹ اور اپنی گھائل خود پسندی کی وجہ سے تقسیم کی حمایت میں اپنا پورا زور لگا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ متحدہ ہندوستان کا وزیر خزانہ لیاقت علی خان ان کی تجاویز کو رد کر دیتا تھا جس کے باعث ہر قدم پر انہیں شکست کا احساس تنگ کرتا تھا۔ اسی لئے محض غصے میں آ کر انہوں نے طے کر دیا کہ جب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں تو اس کو مان لیا جائے۔ مولانا آگے یہ بھی تحریر کرتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی یقین تھا کہ پاکستان کی ریاست پنپنے والی نہیں ہے اور زیادہ دن قائم نہیں رہ سکے گی۔ انہوں نے سوچا کہ پاکستان کی قبولیت مسلم لیگ کو کڑوا سبق سکھائے گی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پاکستان ڈھیر ہو جائے گا۔ مولانا تحریر کرتے ہیں کہ لارڈ مونٹ بیٹن کی ہر

www.bhutto.org

بات مان لینے کے معاملے میں ان پر ایک سحر اور تنویم کی طرح کا اثر کر دیا تھا۔ اب مولانا ابوالکلام کی تحریری گواہی کے بعد بھی کوئی صحیح الفہم انسان اس بات پر مصر رہ سکتا ہے کہ پاکستان غلط بنا تھا۔ ہمارے ترقی پسند دانش وروں اور سیاست دانوں کا تقسیم کی پاداش میں ہونے والی انسانی خوں ریزی کی مذمت کرنا بے حد درست تھا۔ اور دونوں جانب کے انسانوں کے قتل کا ماتم کرنا ان کی انسان پرستی کا عظیم ثبوت تھا۔ مگر ان کا تقسیم کو قبول نہ کرنا ان کی سوچ اور فکر کی انتہائی غلطی کا مظہر تھا۔ جس کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے وہ پاکستان میں پاکستان کی سیاست کرنے کے قائل ہی نہ ہو سکے تھے۔ وہ اپنے اس انسان دوستی کے آفاقی جذبے کو کیمونزم خیال کرتے تھے جس جذبے کی رو سے وہ ہندوستان کو دوبارہ متحدہ ہندوستان دیکھنے کے آرزومند تھے۔ جو دوبارہ متحد نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی بین الاقوامی سوچ میں پاکستان میں پاکستان کی سیاست کرنا اپنے نظریے کی شکست تصور کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ پاکستان اور پاکستان کی سیاست کو بے معنی خیال کرتے تھے۔ لہٰذا ہر وہ شخص اور ہر وہ سیاسی جماعت جو پاکستان میں پاکستان کی سیاست کرنے کا راستہ اختیار کرتا تھا ان کے نزدیک وہ لوگ اور وہ جماعت غیر انقلابی ہوتے تھے، غیر بین الاقوامی ہوتے تھے، غیر ترقی پسند ہوتے تھے، غیر کیمونسٹ اور غیر سوشلسٹ ہوتے تھے اور امریکہ کے ایجنٹ ہوتے تھے۔

لہٰذا پاکستان میں چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کا اختلاف اور ان کی نفرت کی بنیاد ان کا یہی بنیادی فلسفہ تھا جس فلسفے کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ وہ اس لئے کہ چیئرمین بھٹو خالصتاً ایک پاکستانی سوچ اور فکر کا انسان تھا۔ پیدائشی جاگیردار ہونے کی وجہ سے وہ بھی ایک طرح کا سن آف سائل تھا۔ وہ اپنا رشتہ اپنی اس دھرتی کے ساتھ محسوس کرتے تھے جس دھرتی پر پاکستان قائم ہوا تھا۔ وہ قدرتی اعتبار سے بلا کے وطن پرست اور دھرتی کے سپوت تھے۔ وہ پاکستان پرستی میں کسی سوچ اور کسی فکر کے ساتھ کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں تھے۔ خواہ کوئی سوچ اپنی حقیقت کے اعتبار سے کتنی بھی اہم اور کتنی بھی بڑی ہو۔ اس شخص کی یہی تو وہ سوچ تھی جس سوچ نے ان کو اپنے عہد کا سب سے بڑا پاکستانی بنا دیا تھا۔ ان کو ایک تاریخی انسان بنا دیا ہے۔ جس سے ان کا تشخص پاکستان کے تشخص کا حصہ بن چکا ہے۔

پاکستان میں پاکستان کی سیاست کا محور اور مرکز ہی ہندوستان دشمنی بن گیا تھا۔ جس کی بے شمار وجوہات تھیں۔ یہ وجوہات کچھ تو تاریخی پس منظر کی وجہ سے تھیں۔ کچھ قومی وجوہات تھیں۔ کچھ

www.bhutto.org

بین الاقوامی سیاست کی وجہ سے تھیں۔ کچھ علاقائی وجوہات تھیں۔ کچھ مذہبی انداز کی بھی تھیں۔ کچھ باہمی تعصب اور نفرت کی وجوہات تھیں اور کچھ وجوہات پاکستان کے وجود کو قائم رکھنے کی بنا کی تھیں۔ ہندوستان کے مقابلے میں ایک چھوٹا ملک ہونے کی نفسیاتی وجوہات بھی تھیں۔ دوسری جانب ہندوستان جو ایک بڑا ملک تھا اس کی علاقے میں بالادستی قائم کرنے کے خبط میں مبتلا تھا کچھ وجوہات اس کے اس خبط کی بنا پر قائم ہو گئی تھیں۔ مگر سب سے بڑی دشمنی کی وجہ کی بنیاد ہندوستان کا پاکستان کو دل سے نہ قبول کرنے کی وجہ تھی جس کا اظہار ہندوستان اپنی قومی اور بین الاقوامی سیاست میں کھل کر کیا کرتا تھا۔ جو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔

درویش شاعر حبیب جالب کے ساتھ مکالمہ

میں نے پہلے جیسا عرض کیا تھا کہ حبیب جالب کے ساتھ میرے بہت زیادہ دوستی اور محبت کے راز و نیاز تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو ہم دونوں کا شاعر ہونا تھی، بلکہ ایک ہی طرزِ فکر کا شاعر ہونا تھی۔ دوسری وجہ ہم دونوں کے غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے کی تھی۔ یہ ہم دونوں کی ایک طرح کی طبقاتی سانجھ تھی۔ میں نے حبیب جالب کو کہا کہ آپ کی پارٹی بھی خود کو سوشلسٹ پارٹی کہتی ہے میری پارٹی کا بھی موقف یہی ہے۔ ہم دونوں علیحدہ علیحدہ پارٹی میں ہونے کے باوجود ایک ہی طرح کی ایک ہی مضمون کی شاعری کرتے ہیں۔ آپ اپنی نظم کا عنوان رکھتے ہیں۔ ''خطرے میں اسلام نہیں'' میں اپنی نظم کا عنوان رکھتا ہوں۔ ''اسلام کسی خطرے میں نہیں'' یہ تمام باتیں ایک ہونے کے باوجود تمہاری پارٹی کے خان اور تم بھٹو کی کیوں مخالفت کرتے ہو۔ حبیب جالب کا جواب تھا کہ تمہارا بھٹو پاکستان کی سیاست کرتا ہے۔ ہندوستان کی دشمنی کی سیاست کرتا ہے۔ ہم اپنی سیاست کے میدان کو بہت وسیع دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ قصہ ختم ہو جائے تو ہماری سٹیج سکم تک اور بھٹان تک کھلی ہو جائے گی۔ ہماری فکر وسیع ہو جائے گی۔ ہندوستان میں ایک مسلمان ہندوستان کا صدر بن سکتا ہے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ میرے خان بین الاقوامی سیاست کرتے ہیں۔ وہ اس مصنوعی جبر کی تقسیم کو نہیں مانتے۔

حبیب جالب ایک معصوم شاعر تھے۔ وہ اپنی پارٹی کے خانوں کے بارے میں بڑی خوش فہمی کا شکار تھے۔ حبیب جالب کا جب انتقال ہوا تو اس کی نیشنل عوام پارٹی کا ایک بھی بڑا لیڈر ایک

www.bhutto.org

بھی بڑا خان اس کے جنازے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ آج ہم پاکستان پیپلز پارٹی والوں نے ہی جہانگیر بدر کی قیادت میں حبیب جالب کی برسی منانے کا آغاز کیا ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی نے آج تک حبیب جالب کی نہ تو کبھی پشاور میں برسی منائی ہے اور نہ ہی کبھی جالب کو نیشنل عوامی پارٹی کے شاعر ہونے کا کبھی کوئی ٹریبوٹ پیش کیا ہے۔

ہمارے ترقی پسندوں اور روس پرستوں کے لئے نہ تو پاکستان کا ہندوستان کے ساتھ دریاؤں اور پانی کا تنازعہ کوئی اہمیت رکھتا تھا، نہ مسئلہ کشمیر ان کی سوشلسٹ سیاست کا حصہ تھا، پاکستان کی خودمختاری تو ان کی سیاست کا مسئلہ ہی نہیں تھا، اور نہ ہی ہندوستان کی پاکستان پر کوئی جارحیت ان کے لئے کچھ مسئلہ تھا۔ ان تمام باتوں میں میں نے ان لوگوں کو بے حد غیر حقیقت پسند پایا تھا۔ ہندوستان کو اپنے مفادات عزیز تھے۔ پاکستان اور ہندوستان کی قومی سیاست اور علاقائی سیاست اور بین الاقوامی سیاست میں ان دونوں ممالک میں کون غلط تھا کون صحیح تھا۔ اِس میں ہندوستان زیادہ غلط تھا یا پاکستان زیادہ غلط تھا، اِس کی تخصیص باقی نہ رہ گئی تھی مگر پاکستان کے لیفٹ کا معاملہ یہ تھا کہ یہ ہر صورت میں اور ہر حالت میں ہندوستان کے لئے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ جہاں تک ایک ترقی پسند اور نظریاتی انسان دوستی کی بات ہے تو کوئی ترقی پسند اور انسان دوستی زندگی کے معروضی حالات کے خلاف یا برعکس قائم نہیں کی جا سکتی۔ مگر ہمارا لیفٹ اِس معاملے میں انتہا پسند تھا۔ وہ اپنی ترقی پسندی اور آزاد خیالی میں کسی حقیقت کو خاطر میں لانے کو تیار نہیں تھا۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ آج 2007ء میں بھی اندرا گاندھی کا پوتا بڑے فخر سے اعلان کرتا ہے کہ پاکستان کو دو ٹکڑے نہرو خاندان نے کیا۔

چیئرمین بھٹو کا اندازِ سیاست

ان حالات میں چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اُن کی اِس سوچ کے انتہائی برعکس اور مخالف سمت کے انسان تھے۔ ان کی سیاست ایک قومی سیاست تھی۔ اُن کی اِس بات کو کوئی بُرا جانے یا اچھا۔ وہ ہندوستان کو پاکستان کا سخت ترین دشمن تصور کرتے تھے۔ اُن کو احساس تھا کہ ہندوستان پاکستان کو دل سے ایک ملک تسلیم نہیں کرتا اور وہ پاکستان کو Dismentle کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ وہ پاکستان کو اپنی فوجی قوت کے ذریعے برباد کر دینا چاہتا ہے، ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہے۔ جس کا

www.bhutto.org

عملی ثبوت ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں اپنے فوجی ایکشن سے 1970ء میں مہیا کر دیا تھا۔ لہٰذا پاکستان کو اتنا طاقتور رہنا چاہیے کہ یہ ہندوستان کے اِس قسم کے ارادوں سے محفوظ رہے۔ اُن کا ایٹم بم بنانے کا سودا بھی اِسی تحفظات کا مظہر تھا۔ پاکستان کے لیفٹ کا کسی قیمت پر بھی چیئرمین بھٹو کے ساتھ الحاق نہیں ہوسکتا تھا۔ اِس لئے کہ چیئرمین بھٹو پاکستان میں ہندوستان دشمنی کا سمبل تصور کئے جاتے تھے۔ خاص طور پر پنجاب میں اُن کو ہندوستان کے مقابلے میں ایک مردِ میدان اور مردِ آہن خیال کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کی دشمنی کا گراف بھی پاکستان میں سب سے زیادہ پنجاب کے عوام میں اُونچا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی ہندوستان کے سامنے ڈٹ جانے کی خوبی نے ہی چیئرمین بھٹو کو پنجاب کا ہیرو بنا دیا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی چیئرمین بھٹو کی اِس شہرت اور ہندوستان کے ساتھ مخاصمت کے خلاف تھی۔ وہ چیئرمین بھٹو کی اِس سیاسی روش کو ہندوستان کی برتری کے خلاف تصور کرتی تھی۔

جہاں تک چیئرمین بھٹو کی ذات کا اوران کی سیاست کا تعلق تھا۔ ان کی ذات کی پہچان اور ان کی سیاست کا آغاز پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے عہدے سے شروع ہوئی تھی۔ پاکستان کی اور ہندوستان کا وزارتِ خارجہ کی کارکردگی کا طریقہ کار عام معمول کے ممالک کی وزارتِ خارجہ کی طرح کا نہیں تھا۔ ان دونوں ممالک کی خارجہ سیاست کا مسئلہ بڑا ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ ان دونوں ممالک کی وزارتِ خارجہ کی سیاست کوئی ڈپلومیسی کی سیاست نہیں تھی۔ وہ باقاعدہ ہندو مسلم دشمنی کی سیاست تھی۔ انتہائی عداوت اور نفرت کی سیاست تھی۔ وہ سر سے لے کر پاؤں تک اور ابتدا سے لے کر آخر تک تنازعات کی سیاست تھی۔ بدترین مخالفوں اور بدترین دشمنوں کی سیاست تھی۔ چیئرمین بھٹو کی سیاست کا آغاز ہی اس طرح کی سیاست اور مخاصمت اور عداوت اور نفرت سے بطور وزیر خارجہ پاکستان ہوا تھا۔ ان کے پورٹ فولیو کی نزاکت سے ہندوستان کے ساتھ مقابلہ بازی اور مخاصمت ہی ان کا عہدہ تھی اوران کے فرائض منصبی کا منطقی کردار تھی۔ ان دونوں ممالک کی ایک دوسرے کے وجود کو مٹانے کی خارجہ پالیسی کی سیاست تھی۔ لہٰذا اس قسم کی خارجہ پالیسی کی سیاست میں ایک کامیاب وزیر خارجہ کی ڈپلومیسی کی مہارت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملک کے دشمن یا حریف ملک کو ہر حالت میں اور ہر طریقے سے بین الاقوامی سیاست میں اور قومی سیاست میں نیچا دکھائے۔ اُس کو ذلیل وخوار کرے۔

www.bhutto.org

اُس کی حماقتوں کو اُجاگر کر کے دنیا کے سامنے اُس کے وقار کو مجروح کرے۔ اُس کا تمسخر اُڑائے اور اُس کی ہر چال کو ناکام بنانے کی کوشش کرے۔ جس طرح کہ چیئرمین بھٹو اپنی وزارتِ خارجہ کے زمانے میں سردار سورن سنگھ کا تمسخر اُڑا کر ہندوستان کو دنیا کے سامنے ایک غیر دانش مند قوم ثابت کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کو ایک لڑاکا اور فسادی ملک ثابت کیا کرتے تھے۔ ایک جارح ملک ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے چیئرمین بھٹو کی سفارت کاری کی حیثیت پوری دنیا تسلیم کرتی تھی۔ سفارت کاری کے ہنر اور آرٹ میں عوامی جمہوریہ چین کے چو۔ این۔ لائی کے بعد چیئرمین بھٹو کا نام ہی لیا جاتا تھا۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو کے معاملے میں اِس حقیقت کی بنا پر پاکستان کا لیفٹ جس کے نظریات کے تمام دھاروں کے چشمے ہندوستان کی کیمونسٹ پارٹی کے فیصلوں سے پھوٹتے تھے۔ وہ کسی طرح بھی چیئرمین بھٹو کا حامی نہیں ہو سکتا تھا۔ اِس کے علاوہ ہمارے کیمونسٹوں کے خانہ کعبہ ''یو۔ ایس۔ ایس۔ آر'' سوشلسٹ سوویت ری پبلک روس میں بھی پاکستان کے اِسی کیمونسٹ کو تسلیم کیا جاتا تھا جو کیمونسٹ یا لیفٹ یا بائیں بازو کی سیاسی جماعت یا تنظیم ہندوستان کی دوستی کی سیاست کرتی تھی۔

پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ بھی ہماری اِس لیفٹ کی سیاسی کمزوری کو اچھی طرح جانتی تھی جو وہ چیئرمین بھٹو کے بارے میں رکھتا تھا۔ اُس نے لیفٹ کی پارٹیوں میں اور گروپوں میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے اُس کی اِس کمزوری کو خوب ایکسپلائٹ کیا تھا۔ ہمارے کیمونسٹوں اور ہمارے لیفٹ کی یہ بات انتہائی طور پر حیران کن تھی۔ اُن کے لئے خان عبدالولی خان کا یا سرحد کے دوسرے جاگیرداروں کا جاگیردار ہونا قابلِ اعتراض نہیں تھا، نہ پنجاب کے دولتانے کا، نہ نواب زادہ نصر اللہ خان کا، نہ سندھ کے دوسرے کسی سیاست دان کا جاگیردار ہونا قابلِ اعتراض تھا۔ اُن کے نزدیک بلوچستان کے سیاست دانوں کا جاگیردار ہونا، سردار ہونا قطعی قابلِ اعتراض نہ تھا۔ اُن کے نزدیک صرف چیئرمین بھٹو کا جاگیردار ہونا قابلِ اعتراض تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بھٹو کے ساتھ کسی طرح کا بھی سیاسی اتحاد قائم نہیں کر سکتے تھے۔

ہم اپنے لیفٹ کے ماضی کے ان تمام عزت مآب بزرگوں کے خلوص اور نیت پر ہرگز ہرگز شبہ نہیں کر سکتے۔ جن کی زندگیاں انقلاب کے نیک کام کی نذر ہو گئیں تھیں۔ بے شک وہ لوگ اپنے مقصد میں صالح اور اپنی لگن میں انتہائی سچے اور کھرے لوگ تھے۔ جن کا کہنا تھا کہ رہ یار ہم

www.bhutto.org

نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا۔ یا جن کا کہنا تھا کہ ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے۔ میں نے صرف اور صرف ان کی حکمتِ عملی اور انقلاب کے لئے ان کے اندازِ سیاست پر بات کی ہے جن کی بات کو میں ظہیر کاشمیری صاحب کے ہی شعر پر ختم کروں گا۔ ۔

برقِ زمانہ دور تھی لیکن مشعلِ خانہ دور نہ تھی
ہم تو ظہیر اپنے ہی گھر کی آگ میں جل کر خاک ہوئے

افسوس کہ ہمارے ان عہد آخریں اور عہد ساز بزرگوں میں سے کسی ایک نے بھی اپنی داستانِ ستم کو ایک مکمل کتاب کی شکل میں تحریر نہ کیا تھا۔ ہم کو ان کی جدوجہد کی داستانیں، ٹکڑے ٹکڑے پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اور ایک تاریخ کی شکل میں ان کی تحریک کا عمل پڑھنے کو نہیں ملتا۔ واضح رہے کہ میں پیپلز پارٹی کے اندر کے اور باہر کے جس لیفٹ کا ذکر کروں گا۔ وہ لیفٹ ان عظیم ہستیوں کے بعد کا لیفٹ تھا۔ جس میں کچھ لوگ تو اپنی عمر کے آخری حصے میں پہنچے ہوئے تھے۔ کچھ اس راہ میں تھک ہار کر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ بس نام کے کیمونسٹ تھے۔ جنہوں نے کیمونزم اور سوشلزم کی دوکانیں کھول رکھی تھیں۔ اور مجھے افسوس کے ساتھ یہ بات تحریر کرنا پڑ رہی ہے کہ ان میں ایک بھاری تعداد ان غیر کیمونسٹ اور سوشلسٹ لوگوں کی تھی۔ جو جعلی اور نقلی سوشلسٹ اور کیمونسٹ تھے۔ خفیہ اداروں کے کارندے تھے۔ جو پاکستان کی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلے ہوئے تھے۔ جو تعلیم کے شعبے میں بھی تھے۔ بیوروکریسی کے شعبے میں بھی تھے۔ مگر ان کی سب سے زیادہ تعداد سیاسی جماعتوں اور سیاسی تنظیموں میں تھی۔ ٹریڈ یونین میں تھی۔ جو دیکھنے میں بڑے فعال دیکھائی دیتے تھے مگر اندر سے نظریے کی صداقت میں بے حد کنگال تھے۔ جن کی سیاست کا سب سے بڑا کارنامہ امریکہ کا جھنڈا اجلانا ہوتا تھا۔ ان کا کردار ایجنٹ پرووکیٹر کا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بھولے بھالے سیاسی کارکنوں کو پولیس کے جال میں پھنسا کر خود پانی کی طرح موجیں مارتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے جایا کرتے تھے۔ بڑے خوش حال سوشلسٹ ہوا کرتے تھے۔ اس قبیل کے سوشلسٹوں کے ساتھ تمام زندگی میرا واسطہ رہا ہے۔ وہ کسی انقلابی جدوجہد کو عملی طور پر اختیار کرنے کی بجائے اپنا نام ہی کیمونسٹ رکھ لیتے تھے۔ میں نے انتہائی سفلوں اور سیاسی اور سماجی تعلیم سے عاری لوگوں کو پولیس کے مخبروں کو خود کو کیمونسٹ کہتے اور کہلاتے دیکھا تھا۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو اپنے تشخص کے آئینے میں

چیئرمین بھٹو ایک پیدائشی جاگیردار تھے۔ ایک جاگیردار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک اعلیٰ پائے کے قانون دان اور تعلیم یافتہ انسان تھے۔ یہ باتیں تو اُن کی اکیڈمک تعلیم کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔ اُن کا تشخص اور اُن کی ذات کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعلیمات سے کہیں اوپر اور ماوراء تھی۔ وہ پیدائشی جینیس اور ارتقائی دانشور تھے۔ ایک عہد ساز انسان تھے۔ اُن کا شمار ہر انداز سے اِن لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو تاریخ سازی کیا کرتے ہیں۔ جو خود اپنی تاریخ اور خود اپنا عہد ہوتے ہیں۔ اُن کو روایتی سیاسیت دان یا وزیر اعظم تصور نہیں جاسکتا۔ وہ اِن نابغہ انسانوں میں سے تھے۔ جن کے ساتھ اُن کے عہد کی بہت سی چیزوں کو منسوب کیا جاتا ہے۔

وہ اپنی ذات میں بیک وقت ایک سخت گیر ایڈمنسٹریٹر اور قواعد و ضوابط کے پابند حکمران تھے۔ آئین اور قانون کے انسان تھے اور بے حد باعمل انسان تھے۔ وہ ایک حکمران سیاست دان تھے۔ وہ اپنی زندگی کے لمحے لمحے کا حساب رکھتے تھے۔ اُن کے عہد میں پاکستان میں بلکہ آج بھی پاکستان میں اُن کے برابر کا اُن کے ٹکر کا نہ تو کوئی سیاست دان تھا اور نہ کوئی اُن سے بڑھ کر کوئی سیاسی مفکر اور مدبر موجود ہے۔ وہ انتہا کے تیز فہم زیرک، معاملہ فہم اور دور اندیش انسان تھے۔ حالات اور واقعات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ تاریخ کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع میں انتہائی حسین و جمیل انسان تھے۔ بڑی موزوں اور دل کش قد و قامت کے آدمی تھے۔ اِس قدر خوش لباس تھے کہ اُن کے سامنے ہالی وڈ کے ہیرو ماند پڑتے تھے۔ وہ ہر انداز میں ایک اسٹائیلش انسان تھے۔ ایک ہیرو نما آدمی تھے اور ہر حالت میں ہیرو رہنا چاہتے تھے۔ اپنی تمام خوبصورتی اور جاذبیت کے ساتھ ساتھ ایک بلا کے محنتی انسان تھے۔ اِن تھک آدمی تھے۔ وہ اپنی ہٹ کے پکے اور دھن کے سچے آدمی تھے۔ بے حد ضدی اور جوشیلے انسان تھے۔ بہت تند خو اور اکھڑ تھے۔ بے حد شعلہ خو تھے۔ وہ اپنے مزاج کے خلاف ذرا سی بات بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ تمام باتیں اُن کی ذات میں اُن کے جاگیرداری ماحول کا خاصا تھیں۔ مگر اِن تمام باتوں کے باوجود اُن کے مزاج کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ وہ دوسرا پہلو اُن کی والدہ ماجدہ کی جانب سے اُن کی شخصیت میں بہت ممتاز نظر آیا کرتا تھا۔ وہ پہلو دوسروں کے لئے محبت، چاہت اور ہمدردی کا تھا۔ انسان دوستی کا

www.bhutto.org

تھا۔دردمندی کا پہلو تھا۔اِس معاملے کا پس منظر یہ ہے کہ اُن کی والدہ ماجدہ ایک غریب درمیانے طبقے کے متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ جبکہ اُن کے والد کا گھرانہ ایک کرونک قسم کا جاگیردار گھرانہ تھا اور ایک طرح کا قبائلی نظام کا گھرانہ بھی تھا جس میں حسب نسب کی بیماری عام ہوتی ہے۔قبائلی نظام کی جہالت میں کسی بھی دوسری ذات کو اپنے برابر خیال نہیں کیا جاتا۔لہٰذا بھٹو خاندان جو ایک قبائلی خاندان تھا۔اُس میں ایک باہر کے خاندان کی خاتون کے ساتھ بھٹو خاندان کی خواتین اور بھٹو خاندان کے مردوں کی آویزش کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات تھی۔اِس طرح کی صورتحال میں چیئرمین بھٹو کی والدہ کو اپنی زندگی میں بے حد پریشانیاں اُٹھانا پڑی تھیں۔جس کی وجہ سے چیئرمین بھٹو کے دل میں جاگیرداری نظام اور قبائلی نظام کے خلاف بغاوت کی آگ دبی ہوئی تھی جو کبھی کبھی شعلہ جوالا بن کر بھڑک اُٹھتی تھی۔میں اُن کو جلسوں میں تقریر کرتے قریب سے دیکھا کرتا تھا۔وہ جب غربت کے خلاف بات کر رہے ہوتے تھے تو اُن کا تمام جسم غصے سے لرز رہا ہوتا تھا۔اُن کے دل میں معاشرتی اونچ نیچ کے خلاف بڑی نفرت تھی۔اِس پس منظر کی بنا پر اُن کی شخصیت میں دو باتوں کی آمیزش تھی یا دو روّیوں کا آمیزہ تھا۔یعنی جاگیرداری اور غیر جاگیرداری روّیوں کا مرقع تھا۔زندگی کے حالات واقعات میں کبھی تو جاگیرداری رویہ اُن کی شخصیت پر حاوی ہو جاتا تھا، غالب آ جاتا تھا۔ جب اُن کے مزاج پر یہ رویہ غالب آ جاتا تھا تو اُس وقت وہ Uncompromized ہوا کرتے تھے۔اُن میں کوئی لچک نہیں ہوا کرتی تھی۔وہ سخت گیر بن جاتے تھے۔مگر اِسی بھٹو پر جب دوسرا رویہ ظاہر ہوتا تھا جو مادری رویہ ہوتا تھا، وہ بے حد دل سوز انسان، بے حد رحم دل انسان اور بہت حساس قسم کے انسان دکھائی دیا کرتے تھے۔اِس کے باوجود وہ اپنی شخصیت میں اپنے جاگیردارانہ پس منظر کے تفاخر کو بہت زیادہ نمایاں رکھتے تھے۔ حالانکہ اُن کے اِس مخصوص احساس کی وجہ سے اُن کو جاگیرداری نظام کا انتہائی دشمن ہو جانا چاہیے تھا۔اُن کا اصل انتقام ہی جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہونا چاہیے تھا۔دراصل چیئرمین بھٹو ایک حکمران سیاست دان تھے۔دنیا کے تمام جاگیرداروں کی عادت کے مطابق حکمرانی کرنا وہ اپنا حق خیال کرتے تھے۔

اس حاکمانہ جاگیرداری ورثے کے ساتھ ساتھ وہ علمِ سیاست اور رموزِ مملکت پر بھی عبور رکھتے تھے۔اِس فنِ مملکت گیری میں اُن کو اپنا کوئی مقابل جچتا ہی نہیں تھا۔جس کی وجہ سے وہ کسی کو

خاطر میں ہی نہیں لایا کرتے تھے۔وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی بیکار صرف کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لہٰذا وہ کسی ایسی سیاست میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے جو اُن کے حصولِ اقتدار کے لئے موزوں سیاست نہیں ہوتی تھی۔

ان کے بارے میں اگر میں یہ تحریر کردوں کہ وہ ایک پیدائشی حکمران تھے یا وہ پیدا ہی حکمرانی کے لئے ہوئے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ان کی سیاست اوران کی شخصیت کا تعلق ایک ایسے عہد سے تھا جس عہد کو انسانی تاریخ کے بڑے انسانوں کا عہد کہا جاتا ہے۔ان کے عہد میں وہ تمام عظیم لوگ زندہ تھے جن نابغہ عہد لوگوں نے انسانی تاریخ کے دھارے تبدیل کر کے رکھ دیے تھے۔ان کا عہد انقلابیوں کی تاریخ کا عہد تھا۔ان کا عہد جمہوریہ چین کے عظیم انقلابی مفکر دانش ور مدبر ماؤزے تنگ کی انقلابی قیادت کا عہد تھا اور چین کے عالی دماغ اور اعلیٰ پائے کے مفکر سیاست کار چین کے وزیر خارجہ چو۔این۔لائی کا عہد تھا۔چو۔این۔لائی تو چیئر مین بھٹو کے ذاتی دوستوں میں شمار کئے جاتے تھے۔مگر ماؤزے تنگ چیئر مین بھٹو کی سیاسی بصیرت کو تسلیم کرتے تھے اور ان کی عالمی سیاست کو پسند کرتے تھے۔اور تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کے لئے چیئر مین بھٹو کی جدوجہد کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

بیسویں صدی کا بین الاقوامی شہرت رکھنے والا فلاسفر برٹرنڈ رسل چیئر مین بھٹو کا ذاتی طور پر دوست تھا۔ان کا خیر خواہ تھا اور ان کی ذات کو اپنے انقلابی فلسفے کا شاہکار تصور کرتا تھا۔وہ چیئر مین بھٹو کو ایشیائی اقوام کا رہبر قرار دیتا تھا۔

اسی طرح انڈونیشیا کا فادر آف نیشن جناب سوئیکارنو چیئر مین بھٹو کے ذاتی دوستوں میں سے ایک تھے۔

برادر اسلامی ملک مصر کے جمال عبدالناصر چیئر مین بھٹو کو اپنے عہد کے عظیم مسلم رہنما کہا کرتے تھے۔پاکستان کے تمام کمیونسٹ اور سوشلسٹ جن لوگوں کے نام لے کر اپنے کمیونزم کی پہچان بنایا کرتے تھے۔وہ تمام کمیونسٹ عالمی لیڈر بھٹو صاحب کے ذاتی دوستوں میں سے تھے۔ اگر ذاتی دوست نہ بھی تصور کیے جائیں تب بھی وہ تمام چیئر مین بھٹو کی شخصیت کے سحر کے معترف تھے۔جس کے ثبوت کے لئے ان کے چیئر مین بھٹو کے بارے میں کہے گئے کلمات آج بھی تاریخ میں محفوظ اور موجود ہیں۔

چیئرمین بھٹو کا اپنے ہم عصر سیاست دانوں سے تضاد

چیئرمین بھٹو کا اپنے ہمعصر سیاست دانوں کے ساتھ ایک تو پرسنلیٹی کلیش تھا۔ دوسرا ان کا ان تمام سیاست دانوں کے ساتھ ذہنی تضاد تھا۔ ان کے تمام ہمعصر سیاست دان پرانی سیاست کے پرانی ڈگر کے رسم و رواج کے سیاست دان تھے۔ جو ایک طرح کے روایتی سیاست دان تھے۔ جو سیاست کو کوئی علم و فلسفہ اور حکمت و تدبر خیال نہیں کرتے تھے۔ وہ سیاست کو صرف اپنا پیشہ خیال کرتے تھے۔ ان میں اکثریت ایسے سیاست دانوں کی تھی جن کی نہ تو کوئی سیاسی جماعت تھی اور نہ کوئی تنظیم سازی تھی۔ وہ اکیلے اپنی ذات میں ہی سیاست دان تھے اور سیاسی جماعت تھے۔ نہ تو ان کا کوئی سیاسی فلسفہ تھا اور نہ ہی وہ پاکستان کے عوام کی زندگی میں کسی معاشی تبدیلی کا کوئی نظریہ رکھتے تھے۔ ان کا کام اپنے اس عہد کی طویل ترین سیاسی زندگی میں صرف سیاست برائے سیاست کرنے کا ہی کردار سرانجام دینا ہوتا تھا۔

یہ تمام سیاست دان اپنے اپنے علاقوں کے بڑے کھاتے پیتے خاندانوں سے تعلق رکھے ہوتے تھے۔ جن کا ذریعہ معاش سیاست کے علاوہ ان کی جاگیریں ہوتا تھا۔ ان کی اکثریت صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ سے تعلق رکھتی تھی۔ صوبہ بلوچستان میں اس قبیل کے تمام سیاست دان بلوچ سرداروں کی شکل میں تھے۔ یہ سیاست دان جس صوبے میں بھی تھے۔ ان تمام کی سیاست ایک رکھ رکھاؤ کی سیاست ہوتی تھی۔ یہ تمام سیاست دان اپنے اپنے علاقوں کی سیاست تک محدود تھے۔ ان تمام سیاست دانوں کی سیاست کسی دوسرے سیاست دان کی سیاست میں مداخلت کرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ یہ تقریباً ایک ہی طرح کی سب کی سیاست تھی جس کو اپنے اپنے مفادات کی سیاست کہا جاتا ہے۔ اس مفادات کی سیاست میں ان سیاست دانوں کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہونا ممکن ہی نہیں تھا اس لئے کہ ان تمام سیاست دانوں کی سیاست غیر نظریاتی سیاست ہوتی تھی ایک طرح کی شخصی سیاست تھی۔ علاقائی سیاست تھی۔ غیر قومی سیاست تھی۔ وہ خواہ کیمونزم یا سوشلزم کے نام پر بھی اگر کہیں تو وہ ایک شخصی سیاست ہی تھی۔ وہ پورے ملک یا پوری قوم کی سیاست نہیں ہوتی تھی۔

ان تمام سفید پوش سیاست دانوں کی اکثریت پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کی بنائی ہوئی سیاست

www.bhutto.org

کی اجیر تھی۔ کچھ سیاست دان اپنی علاقائی سیاست پر یقین رکھتے تھے یا کچھ سیاست دانوں کی سیاست کا دارو مدار ہی خفیہ اداروں کے اشاروں پر چل کر سیاست کرنا ہوتا تھا۔ آپ اس عہد کی سیاسی تاریخ کا مطالعہ کر کے دیکھ لیں کہ اس عہد کی سیاست میں کسی کا کسی کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ سب کے سب ایک ہی اتحاد میں باندھ دیئے جاتے تھے۔ کسی کا کسی کے ساتھ کوئی نظریاتی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔ جس میں جماعت اسلامی اور نیشنل عوامی پارٹی کو ایک ہی سیاست کے کھونٹے پر باندھ دیا جاتا تھا۔ لہٰذا اس قسم کی غیر نظریاتی اور غیر طبقاتی قومی سیاست کی فضا میں چیئر مین ذوالفقار علی بھٹو کی ذات پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک نظریاتی اور طبقاتی سیاست کی علامت بن کر پاکستان کی سیاست کے افق پر اُبھر کر سامنے آئی تھی۔ ان کی سیاست اور ان کی شخصیت کا انداز نیا تھا۔ یہ تمام سیاست دان بوڑھے تھے، وہ جوان تھے، یہ سست رو تھے وہ تیز رفتار تھے۔ یہ سیاست دان پرانے نظامِ سیاست کے سٹیٹس کو (Stats Co) کو قائم کیے ہوئے تھے۔ ایک ہی جگہ پر سیاست کو روکے ہوئے کھڑے تھے۔ خواص کی سیاست کا نظام بنائے ہوئے تھے۔ سیاست کو بڑے لوگوں کا مشغلہ بنائے ہوئے تھے۔ چیئر مین بھٹو نے پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ان پرانے سیاست دانوں کے پرانے خواص کے نظامِ سیاست کو نیست و نابود کر کے پاکستان میں عام لوگوں کی سیاست کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جس سیاست میں پاکستان کا عام انسان اپنی ذات کی نمائندگی کو محسوس کرنے لگ گیا تھا۔

چیئر مین بھٹو نے پاکستان میں جاگیردار سیاست کا اور اسٹیبلشمنٹ کی سیاست کا کلچر تبدیل کر کے، لوگوں کی سیاست کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ جس قومی سیاست میں امیر غریب کی پہچان ختم ہوگئی تھی۔ جاگیرداروں کی سیاست اور محنت کشوں کی سیاست کی تفریق ختم ہوگئی تھی۔ پاکستان کے مقبول پرانے جاگیردار سیاست دانوں کے مقابل بھٹو نے کمیوں کو سیاست دان بنا کر ان کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ بقول آغا شورش کمیوں کو بے لگام کر دیا ہے۔ گستاخ بنا دیا ہے۔ ان جاگیردار سیاست دانوں کا کہنا تھا بھٹو نے ہماری ثقافتی سیاست کو برباد کر دیا ہے۔ مصلیوں کے منہ میں زبان دے دی ہے۔ اس کی سیاست نے ہماری صدیوں کی پرم پرا صدیوں کے ہمارے آقاؤں کے اور غلاموں کے رشتے کو برباد کر دیا ہے۔ ہماری بے عزتی کی ہے۔ بھٹو نے غریب عوام کو بے اخلاق بنا دیا ہے۔ بے ادب بنا دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس معاملے میں میں آخری بات

www.bhutto.org

یہ کہوں گا کہ 1970ء کے عہد میں پاکستان کی سیاست ایک قدیم انگریز سامراج کے عہد کی سیاست کا ہی تسلسل تھی جس میں تمام جاگیردار طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ کسی نہ کسی انداز میں حکمران طبقہ تھا۔ فوجی حکمرانوں کا شریک اقتدار تھا۔ اس کے بعد تمام مذہبی قوتیں اور مذہبی تنظیمیں فوج کے اقتدار کے ساتھ تھیں۔ اور یہ تینوں برسرِ اقتدار طبقے امریکہ نواز طبقے تھے۔

یہ تینوں طبقے پاکستان میں بھٹو کی سیاست کے خلاف طبقے تھے اور بھٹو کی جان کے دشمن تھے۔ ان حالات میں پاکستان میں ایک ہی طبقہ باقی رہ جاتا تھا جو پاکستان کی سیاست میں اپنا وجود رکھتا تھا وہ طبقہ سوشلسٹ اور کیمونسٹ طبقہ تھا یا سوشلزم اور کیمونزم کی سیاست کرنے والا طبقہ تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فوج بھٹو کے اس لئے خلاف تھی کہ وہ فوج کی حکمرانی کو پاکستان میں ختم کرنا چاہتا تھا۔ جاگیردار اس لئے خلاف تھے کہ ان کو خوف تھا کہ یہ شخص پاکستان سے جاگیرداری نظام کو ختم کر کے ہماری عیش پرست زندگی کو تباہ و برباد کر دے گا۔ جس نے مصلیوں کو ہمارے سامنے سر اٹھانے کی جرات دے دی ہے۔ تیسرا طبقہ مذہبی طبقہ تھا وہ کہتا تھا کہ بھٹو کا سوشلزم اسلام کے خلاف ہے بھٹو کافر ہے۔ لہٰذا اس طرح کے سناریو میں پاکستان کی لبرل اور سوشلسٹ اور کیمونسٹ پارٹیاں اور ان کے لیڈر اور ان کے دانش ور ذوالفقار علی بھٹو کے کیوں خلاف تھے۔ ان کا فوجی حکمرانوں کے ساتھ الحاق کرنا، ان کا پاکستان کی رجعت پسند جماعتوں کے ساتھ الحاق کرنا، ان کا جماعت اسلامی کے ساتھ یا جمعیت العلمائے پاکستان کے ساتھ الحاق کرنا، کس بات کو ظاہر کرتا ہے، کس بات کی علامت تھا۔

واضح رہے کہ پاکستان کی سوشلسٹ اور کیمونسٹ پارٹیوں اور سوشلزم کے نام پر سیاست کرنے والے سیاست دانوں اور دانش وروں کا فوج کے ساتھ الحاق رجعت پسند جماعتوں کے ساتھ مذہبی انتہا پسند ملاؤں اور ان کی تنظیموں کے ساتھ وزیراعظم بھٹو کی پھانسی تک قائم رہا تھا۔ آخر اس کی کیا وجہ تھی۔ یہ تمام لوگ یہ تمام فریق کس بنیاد پر بھٹو کے خلاف ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ جو پلیٹ فارم صرف بھٹو دشمنی تھا۔

تاریخ اپنا فیصلہ دے چکی ہے کہ پاکستان میں صرف چیئرمین بھٹو ہی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف عوام کی سیاست کر رہے تھے۔ باقی تمام لوگ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ اسٹیبلشمنٹ کے سیاسی حلیف تھے۔

چیئرمین بھٹو عشق جنوں پیشہ تھے

چیئرمین بھٹو کا اپنے ہمعصر سیاست دانوں سے جو سب سے بڑا فرق تھا وہ فرق سیاست میں اور عوامی رابطہ کی تحریک میں جان فشانی کا فرق تھا۔ وہ بے حد سخت جاں محنت کش اور مشقت کش انسان تھے۔ دوسرا فرق باقی لیڈروں کے ساتھ ان کے جدید ہونے کا تھا اور دوسرے لیڈروں کے قدیم ہونے کا تھا۔ دیکھنے میں بظاہر وہ ایک سوٹڈ بوٹڈ سمارٹ انسان تھے۔ جن کی وضع قطع کو دیکھ کر ہر انسان ان کو نازک انسان تصور کر سکتا تھا۔ مگر وہ اپنی بظاہر وضع قطع سے بے حد مختلف انسان تھے۔ وہ چین سے کبھی بیٹھتے ہی نہیں تھے۔ کوئی آندھی کوئی برسات ان کے عوامی رابطے کی تحریک میں حائل نہیں ہو سکتی تھی۔ 1970ء کی انتخابی تحریک میں وہ جون اور جولائی کے مہینے میں بھی سندھ اور پنجاب میں اپنی انتخابی تحریک کو جاری رکھتے تھے۔ ملتان اور بہاولپور کا علاقہ تھا مہینہ جولائی کا تھا وہ صرف دوپہر کو دو بجے سے چار پانچ بجے تک وہ اپنی رابطہ مہم کے جلسوں کو مؤخر کر دیا کرتے تھے۔ بعد دوپہر وہ پھر سے اپنے جلسوں کی طرف چل نکلتے تھے۔ رات دیر تک جلسے جاری رہتے تھے۔ ان علاقوں میں اکثر اوقات شہروں سے باہر فارم ہاؤسز میں ہمارے قافلے کو ٹھہرنا ہوتا تھا۔ جہاں بجلی کی کوئی سہولت نہیں ہوتی تھی۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ بھٹو صاحب اپنی قمیص اتار کر صرف شلوار اور بنیان میں چارپائی پر دراز ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی زبان پر گرمی کی شدت کا یا مچھر مکھی کا کبھی ذکر تک نہیں ہوتا تھا۔ ان کو دیکھ کر ہم گرمی کی شدت وغیرہ کو بھول جایا کرتے تھے۔ سندھ کے دور دراز علاقوں میں تو ملتان بہاولپور سے زیادہ گرمی پڑتی تھی۔ مگر وہ جری مرد اپنی عوامی تحریک میں کشاں کشاں رہتے تھے۔ ان جگہوں پر نہ تو کوئی مناسب واش روم ہوتے تھے۔ کئی جگہوں پر تو کھیتوں میں جانا پڑتا تھا۔ ان کے جسم پر گرمی سے سرخ دھپڑ پڑ جاتے تھے۔ خدا جانے وہ کیا جنون تھا جس کی وجہ سے وہ مجذوب بن جاتے تھے۔ کسی موسم کی شدت یا بے آرامی اور بے آسائشی ان پر کچھ اثر ہی نہیں کرتی تھی۔ بلاشبہ وہ عشقِ عوام میں عشقِ جنوں پیشہ عاشق انسان تھے۔

دوسری سب سے بڑی خوبی

دوسری ان کی سیاست میں سب سے بڑی خوبی پاکستان کی خارجی سیاست میں ان کا عبور

www.bhutto.org

تھا۔ چیئرمین بھٹو کہا کرتے تھے کہ جس شخص کو دنیا کے خارجی امور کا علم نہ ہو وہ قوم کی سیاست نہیں کر سکتا۔ دنیا کے خارجی امور کا ملکہ ان کی شخصیت کا ایک بہت بڑا خاصا تھا۔ وہ قدرتی طور پر دنیا کے حالات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ پوری دنیا کے ممالک کی تاریخ جغرافیے سے واقف تھے اور ان کے اقتدار کی تاریخ کو جانتے تھے۔ خصوصی طور پر یورپ کے ممالک اور سوشلسٹ ممالک کے انداز سیاست اور نظریاتی تضاد کو جانتے تھے اور دنیا کے اندرونی اور خارجی معاملات کی سیاست کے ماہر تھے۔ دنیا بھر کے خارجی معاملات میں میں نے چو۔ این۔ لائی اور چیئرمین بھٹو کی طرح کے زیرک انسان بہت کم دیکھے ہیں۔

چیئرمین بھٹو کی سیاست کا انداز انگریزوں اور امریکنوں کی قیادتوں کی طرح کا تھا۔ وہ بھی یورپ کے لیڈروں کی طرح سو سال آگے کی بات سوچا کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں پاکستان کے باقی تمام لیڈر اس معاملے میں تقریباً تقریباً کورے تھے۔ جناب ولی خان کی سیاست پٹھانوں کی سیاست تھی۔ بلوچستان کے سرداروں کی سیاست صرف سرداری کی سیاست تھی۔ مولانا مفتی محمود اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سیاست ماضی کی سیاست تھی وہ قوم سے 14 سو سال پیچھے تھے۔ وہ اس موجود دنیا کی سیاست پر نہ یقین رکھتے تھے اور نہ ہی ادراک رکھتے تھے، باقی رہ گئے پنجاب کے میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور نواب زادہ نصر اللہ خان ان کی سیاست نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ سیاسی لاشے تھے جن کو لوگوں کو اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑتا تھا۔ یہ تمام پنجاب کے لیڈر پرانی نسل کے قائد تھے جو یا تو بوڑھی ہو چکی تھی یا اپنی زندگی پوری کر چکی تھی۔ ان کے برعکس چیئرمین بھٹو لمحہ موجود کے سیاست دان تھے اور نئی نسل کے قائد تھے۔ لہٰذا یہ تمام پرانے لیڈر بجھتے ہوئے دیئے تھے وہ آفتاب صبح نو تھے۔ یہ تمام پرانے لیڈران ان کا سیاست کے میدان میں مقابلہ ہی نہیں کر سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان تمام لیڈروں نے فوج کے ساتھ اور امریکہ کی سی۔ آئی۔ اے کے کارندوں کے ساتھ سمجھوتا کر لیا تھا۔ جس کا ذکر کتاب کے اصل مقام پر آئے گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے چند لیڈروں کا تعارف

قارئین کتاب چیئرمین بھٹو کے باب کے بعد میں چاہتا ہوں کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چند ایسے لیڈروں کا اپنی کتاب میں تعارف تحریر کر دوں جن کو اس وقت پاکستان کی سیاست میں

www.bhutto.org

کوئی خاص شہرت نہیں تھی۔ ان کے نام ان کے پیشوں کے حوالے سے صرف ان کے اپنے حلقہء احباب میں ضرور جانے پہچانے تھے۔ مگر پاکستان کی قومی سیاست میں ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔ ہاں البتہ ان میں صرف ایک نام شیخ محمد رشید کا تھا جن کے نام کو بہت محدود پیمانے پر کسان کمیٹی بنانے کی سیاست کی شہرت ضرور حاصل تھی اور کسانوں کی لیڈری ان کی پہچان تھی۔ اور سیاسی حلقوں میں ان کو ایک کسان رہنما کے طور پر جانا جاتا تھا۔

میری اس بات کی حقیقت سے کوئی انسان اختلاف نہیں کر سکتا کہ پاکستان پیپلز پارٹی جب وجود میں آئی تھی اس وقت چیئر مین بھٹو کی ذات کے علاوہ کوئی ایک بھی پرانا شہرت یافتہ لیڈر پارٹی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ یہ پارٹی کلی طور پر نئے لوگوں کی پارٹی تھی، حقیقت میں نوجوان نسل کی پارٹی تھی۔ ایسے نوجوان لوگوں کی پارٹی تھی جن کو پاکستان کی سیاست سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا۔ چیئر مین بھٹو کی قیادت کا کمال ہی یہ تھا کہ انہوں نے گلی گلی لیڈر پیدا کر دیئے تھے۔ پاکستان کی سیاست میں جو لوگ جغادری لیڈروں کو سیاست دان تصور کرنے کے قائل تھے۔ وہ اس وجہ سے پاکستان پیپلز پارٹی کو چھوروں کی اور بچوں کی پارٹی کہا کرتے تھے جبکہ پاکستان کی سیاست میں پہلی مرتبہ ایک سیاسی جماعت نے عوام کی صفوں میں سے جنم لیا تھا اور یہ نئے لوگ ہی اس پارٹی کا سب سے بڑا حُسن تھے۔ ہم نے دیکھا کہ جب اس پارٹی کے اقتدار میں آ جانے سے پیپلز پارٹی میں پرانے پاپی سیاست دان شامل ہو گئے تھے ان کی شمولیت سے پیپلز پارٹی کا وہ حُسن ماند پڑ گیا گہنا گیا تھا جو حُسن اس کی ابتدا میں اس کو حاصل تھا۔

بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید

بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید ایک باقاعدہ سیاست دان تھے۔ پاکستان کی قومی سیاست کا عملی تجربہ رکھتے تھے۔ وہ نظریاتی باتوں کی حد تک تو چیئر مین بھٹو پر تنقید کیا کرتے تھے مگر عمل سے وہی کچھ کرتے تھے جو چیئر مین بھٹو کی خواہش ہوتی تھی۔ جاگیرداروں کی دشمنی انہوں نے اپنی پہچان بنائی ہوئی تھی۔ اپنی اس پہچان کی سیاست میں وہ کبھی لچک کا مظاہرہ نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے ایک کسان رہنما ہونے پر فخر کیا کرتے تھے۔ طبیعت کے لحاظ سے بے حد مخلص انسان تھے۔ مگر انتہائی درجے کے خوشامد پسند تھے۔ اپنی تعریف سن کر بہت محظوظ ہوا کرتے تھے۔ اُن کی شخصیت کا

www.bhutto.org

یہ پہلو بے حد کمزور اور نا قابل اصلاح تھا۔

شیخ صاحب اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کے مقابلے میں ایک اعلیٰ درجے کے عوام دوست اور کارکن پرست انسان تھے۔ البتہ اُن کی کارکن پرستی میں یہ خرابی ضرور تھی۔ جو کارکن ہر وقت اُن کے قریب رہتا تھا، اُن کے حضور میں رہتا تھا، وہ اصلی انقلابی ہوتا تھا۔ شیخ صاحب اپنی سیاست کا تمام کام ورکروں کے درمیان بیٹھ کر سرانجام دیا کرتے تھے۔ اُن کا کھانا پینا ورکروں کے ساتھ رہتا تھا۔

شیخ صاحب بہت زیادہ کنجوس تھے۔ اُن کا دوپہر کا کھانا نان چھولے اور پکوڑے ہوتا تھا۔ شیخ صاحب انتہا کے دھڑے باز تھے۔ وہ اپنے دھڑے کے کارکنوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بہت محنتی انسان تھے۔ پارٹی کے کام میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ سیاسی جماعت کی تنظیم سازی کے ماہر انسان تھے۔ پیپلز پارٹی کے ابتدائی ایام کی تمام تنظیم سازی کا کام شیخ رشید صاحب نے ہی سرانجام دیا تھا۔ پیپلز پارٹی پنجاب کی تمام تنظیم سازی میں دوسرے لوگ بہت کم دلچسپی رکھتے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کی تنظیم سازی ایک ذاتی قسم کی نوازش ہوا کرتی تھی۔ ایک اپائنٹمنٹ یا تقرری کی طرح کی ہوتی تھی۔ مگر اُن کے مقابلے میں شیخ صاحب باقاعدہ تنظیمی ڈھانچہ تشکیل دیا کرتے تھے۔ شیخ صاحب پارٹی کی صحیح معنوں میں تنظیم سازی کے خواہاں ہوتے تھے۔ شیخ صاحب ڈاکٹر صاحب کی طرح ورکروں کو اپنا ذاتی ملازم تصور نہیں کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے شیخ صاحب کا کارکنوں کے ساتھ ایک مضبوط اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ صاحب کے کارکن اُن کیلئے ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ صاحب ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کے مقابلے میں کارکنوں میں زیادہ مقبول ہوا کرتے تھے۔

پارٹی کی صفوں میں ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کو یہ حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن اور مصطفیٰ کھر صاحب، شیخ صاحب کی اِس طرح کی شہرت اور حیثیت سے بہت الرجک تھے۔ وہ شیخ صاحب سے نفرت کیا کرتے تھے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ یہ دونوں لیڈر شیخ صاحب کے سامنے احساس کمتری کا شکار رہتے تھے۔ پارٹی سے باہر دانشوروں اور صاحب الرائے لوگوں میں بھی اِن دونوں کے مقابلے میں شیخ صاحب کو ایک بہتر انسان تصور کیا جاتا تھا۔ سیاسی طور پر زیادہ عزت کا مقام حاصل تھا۔ مگر شیخ صاحب اپنی اِس تمام نیک نامی

www.bhutto.org

کے باوجود پارٹی کے اندر ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کے مقابلے میں اتھارٹی کے اعتبار سے کمزور تھے۔ اِن دو حضرات کی پارٹی پر گرفت بہت زیادہ تھی۔ پارٹی پر اِن کی گرفت کی وجہ اِن دونوں حضرات کا چیئر مین بھٹو کے قریب رہنا تھا۔ ہر وقت چیئر مین کے ساتھ رہنے کی وجہ سے اِن دو حضرات کو بھٹو صاحب کے مزاج پر بڑا عمل دخل حاصل تھا۔ چیئر مین بھٹو اِن دونوں پر اندھا اعتماد کیا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ چیئر مین بھٹو کی زندگی کے آخری ایام میں انتہائی مایوس کن دیکھنے میں آیا تھا۔

ملک غلام مصطفیٰ کھر کا عوامی سطح پر شیخ رشید صاحب کے ساتھ آمنا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ اُن کی سیاست کا دائرہ چیئر مین بھٹو کی ذات تک ہی محدود ہوتا تھا۔ چیئر مین کی تمام آمد و رفت، میل ملاپ کا سلسلہ کھر صاحب کے پاس ہوتا تھا۔ اُن کے صبح و شام کے شیڈول کا کام ملک صاحب کے ہی ذمے ہوتا تھا۔ سیاست کے میدان میں اُن کا عملی طور پر کوئی کردار نہیں ہوتا تھا۔ مگر ڈاکٹر مبشر حسن کے ساتھ اُن کا عملی طور پر آمنا سامنا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سیاسی اعتبار سے اور تنظیمی اعتبار سے شیخ صاحب کے مقابلے میں بہت کمزور ہوا کرتے تھے۔ مگر سازش کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کا پلہ ہمیشہ بھاری رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب چیئر مین بھٹو کے کان میں یہ بات ڈالتے رہتے تھے کہ شیخ رشید پارٹی کے خلاف کام کرتا ہے۔ شیخ صاحب اور اُن کے کارکن اپنی انتہا پسندی کی وجہ سے بھٹو صاحب کیلئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو گالیاں دیتے ہیں۔ امریکہ کے جھنڈے جلاتے ہیں۔ امریکہ کے خلاف نعرے لگاتے ہیں۔ بہت غیر ذمہ داری کی سیاست کرتے ہیں۔ پارٹی سے باہر کے لوگوں کیمونسٹوں وغیرہ سے لائن حاصل کرتے ہیں۔ اُن کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔ چیئر مین بھٹو کو جاگیردار کہتے ہیں۔ خود اِن کو امریکہ کا ایجنٹ کہتے ہیں۔ چیئر مین بھٹو کے تو گویا آنکھ اور کان ہی ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر ہوا کرتے تھے۔ وہ اُن کی ہر بات پر یقین کرتے تھے۔ وہ شیخ صاحب کے بارے میں اِس طرح کی باتیں سن کر بہت پر مژدہ ہوتے تھے، خفا ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کے گھر رات کو بھٹو صاحب کے ساتھ معمول کی گپ شپ چل رہی تھی۔ کسی حوالے سے شیخ محمد رشید صاحب کا ذکر آ گیا کہ شیخ صاحب پارٹی کے اندر بغاوت پھیلاتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے بڑے افسردہ انداز میں کہا کہ کچھ لوگوں کو میری حالت پر ترس ہی نہیں آیا۔ اُن کو علم ہی نہیں ہے کہ

میں کن حالات میں کام کر رہا ہوں۔ یہ لوگ میری مدد کی بجائے میرے لئے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی بھٹو صاحب نے مجھے مخاطب کر کے پوچھا۔ اسلم! تم بتاؤ کہ کیا ہوتا ہے لاہور پارٹی کے آفس میں۔ میں نے بھٹو صاحب کو بڑے ادب سے کہا۔ سر! وہاں آپ کی پوجا ہوتی ہے۔ بھٹو صاحب ہنس کر دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے لگ گئے جو شیخ صاحب کے خلاف بات کر رہے تھے۔ بھٹو صاحب رات کی گپ شپ میں میری باتوں کا بہت مزہ لیا کرتے تھے۔ وہ جب خوشگوار موڈ میں ہوتے تھے تو مجھے کہا کرتے تھے۔ شیخ محمد رشید صاحب کی تقریر سناؤ۔ ڈاکٹر مبشر حسن کی تقریر سناؤ۔ مولوی کوثر نیازی کی تقریر سناؤ۔

تقریر کے معاملے میں شیخ رشید صاحب بہت کمزور واقعہ ہوئے تھے۔ وہ بے حد غیر موثر مقرر تھے۔ اُن کی تقریر کا ہر لفظ مشدّد ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنا ہر لفظ شد کے ساتھ ادا کیا کرتے تھے۔ وہ قائدعوام کو ''قائد عوّوآم'' کہا کرتے تھے۔ وہ کسان کو کساّن کہا کرتے تھے۔ شیخ صاحب ظاہری طور پر کچھ خشک مزاج آدمی دکھائی دیتے تھے مگر اندر سے بہت خوش مزاج اور حسین انسان تھے۔ وہ بہت حسن پرست اور دل جوان رکھتے تھے۔ بڑے عشق ومحبت کے آدمی تھے۔ اُن کی تمام زندگی چونکہ سیاست کے خارزار میں گزری تھی، جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی میں عشق ومحبت کی بہت کمی محسوس کیا کرتے تھے۔ اُن کی اِس زندگی کا راز اُن کے تھوڑا سا قریب رہنے والے ہر انسان پر کھل جایا کرتا تھا۔ بیگم شکیلہ صاحبہ کے ساتھ اُن کی دوسری شادی بھی اُن کے اِسی احساس کا نتیجہ تھی۔ شیخ صاحب بہت سیلف سنٹرڈ آدمی تھے۔ کبھی کبھی اُن کے مزاج کی یہ خرابی خودغرضی کی انتہا بن جاتی تھی۔ شیخ صاحب کی تعریف کرنے والا انسان خواہ کسی معیار کا بھی ہوتا تھا، وہ اُن کا پسندیدہ آدمی ہوتا تھا۔ شیخ صاحب سے اختلاف کرنے والا انسان خواہ وہ کتنا بھی عالم فاضل ہو، وہ اُن کے نزدیک ناپسندیدہ انسان ہوتا تھا۔ میرے مشاہدے کے مطابق شیخ صاحب کتابوں کا مطالعہ بہت کم کرتے تھے۔

ہر چند شیخ صاحب اپنے موقف میں بہت ضدی ہوتے تھے مگر چیئرمین بھٹو جب کبھی اپنی حتمی رائے ظاہر کر دیا کرتے تھے تو وہ اُن کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیا کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ایک کارکن کے ناطے آپ کا حکم تسلیم کرتا ہوں۔ شیخ صاحب کارکنوں کے میدان میں ڈاکٹر مبشر حسن اور غلام مصطفےٰ کھر پر بہت حاوی ہوا کرتے تھے۔ مگر مذاکرات کی میز پر ان لوگوں سے ہر

بازی ہار جایا کرتے تھے۔ کارکن شیخ صاحب کی وجہ سے کئی بار بہت نقصان اُٹھایا کرتے تھے۔ وہ ڈاکٹر صاحب اور کھر صاحب کی نفرت کا شکار بن جایا کرتے تھے۔

شیخ صاحب اپنی صرف اِس بات کو بہت کافی خیال کیا کرتے تھے کہ اُنہوں نے کارکنوں کے لئے پارٹی کے اجلاس میں جنگ کی ہے۔ وہ ہر کارکن کو تسلی دلانے کے لئے اُس کو کہا کرتے تھے کہ بیٹا! میں اکیلا ہی لڑتا رہا، باقی تمام موقع پرست تمہارے خلاف تھے۔ شیخ صاحب بہت سادہ لوح انسان تھے۔ ملک غلام مصطفےٰ کھر والے شیخ صاحب کی اِس کمزوری کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اپنے جس ورکر یا ساتھی کو کوئی عہدہ دلانا چاہتے تھے یا پارٹی ٹکٹ دلانا چاہتے تھے، وہ اُس کو شیخ صاحب کے پاس اُٹھنے بیٹھنے کا کہہ دیتے تھے۔ چند ہی دنوں کی حاضری میں وہ شخص شیخ صاحب کی آنکھوں کا تارہ بن جاتا تھا۔ اِس سلسلے میں آپ کے لئے ایک دلچسپ واقعہ تحریر کرتا ہوں۔ ملاحظہ کریں۔

ایک دفعہ ممتاز کاہلوں ایڈووکیٹ جو اُن دنوں کھر صاحب کا بہت اہم وزیر تھا، اُس کو اور مجھے لاہور سے باہر ایک جلسے سے خطاب کرنے کیلئے جانا تھا۔ میں جب گورنر ہاؤس گیا تو وہاں ضلع گجرات سے تعلق رکھنے والا چوہدری اسلم بیٹھا تھا۔ کاہلوں صاحب چوہدری اسلم کو حکم دے رہے تھے، تاکید کررہے تھے کہ کچھ دنوں کیلئے شیخ محمد رشید صاحب کے پاس ہر وقت موجود رہنا تمہارا کام ہے۔ تم کو اِس بات پر سختی سے عمل کرنا ہوگا۔ جب ہم گاڑی میں جارہے تھے تو میں نے کاہلوں صاحب سے پوچھا کہ چوہدری اسلم کا شیخ صاحب کے پاس جانے کا کیا معاملہ تھا۔ کاہلوں صاحب اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہنے لگے کہ کھر صاحب نے چوہدری اسلم کو سینیٹر بنانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ مگر ہم نے اِس کے ٹکٹ کو شیخ صاحب کے کھاتے میں ڈالنا ہے تاکہ شیخ صاحب کسی دوسرے امیدوار کی حمایت نہ کریں۔ اِس طریقے کے ساتھ چوہدری اسلم کو کھر صاحب نے آسانی کے ساتھ سینیٹر بنادیا تھا۔ جس کی سینیٹری کو شیخ صاحب اپنی فتح قرار دیا کرتے تھے۔

اُن دنوں میں نے دیکھا کہ چنبہ ہاؤس لاہور میں چوہدری اسلم ہمہ وقت شیخ صاحب کے چرنوں میں بیٹھا ہوتا تھا اور شیخ صاحب اُس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کی اِن تمام خوبیوں کے باوجود سیاست میں تمام بالغ نظر نظریاتی کارکنوں کو شیخ صاحب کے اقتدار میں آنے کے بعد بہت مایوسی ہوئی تھی۔ شیخ صاحب پارٹی کے ایک واحد پرولتاری طبقے کے لیڈر تھے جو

www.bhutto.org

سیاسی کارکنوں کے لئے ایک مثال تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک صحیح دیش بھگت تصور کئے جاتے تھے۔ ایک گاندھی نما انسان تھے۔ مگر افسوس کہ اقتدار میں آنے کے بعد وہ اپنی سابقہ زندگی کی ذاتی محرومیوں اور اپنی خواہشوں کی فرسٹیشن پر قابو نہ پا سکے تھے۔ وگرنہ جوان اولاد کے ہوتے ہوئے 68 سال کی عمر میں شادی کرنا کہاں کی دانشمندی تھی۔ اس کے بعد اُنہوں نے دوسرا ظلم شادمان میں دو رہائشی پلاٹ حاصل کر کے اپنے ساتھ کیا۔ پارٹی میں تمام موقع پرست وزیروں اور شاطر قسم کے کارکنوں نے پیپلز پارٹی کے اقتدار کا مقصد ہی پلاٹ حاصل کرنا ٹھہرا لیا تھا۔

شیخ صاحب کی ذات پرولتاری کارکنوں اور عوام کیلئے ایک رول ماڈل تھی۔ ایک مثال تھی۔ اُن کی اِس لغزش کی وجہ سے لوگوں کا پیپلز پارٹی کے نظریاتی کارکنوں کے وعدوں سے ایمان اُٹھ گیا تھا۔ لوگ ہم کو طعنہ دیا کرتے تھے کہ تمہارے بابائے سوشلزم کا سوشلزم شادمان میں دو پلاٹ نکلا ہے۔ ہر چند کسی انسان کیلئے پلاٹ حاصل کرنا یا گھر بنانا کوئی بُری بات نہیں ہوتا مگر دیش بھگت مثالی لوگ ہوتے ہیں۔ اُن کو اِس قسم کی چیزوں سے بلند رہنا چاہیے۔ بقول علامہ اقبال:۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اِن تمام باتوں کے باوجود میں شیخ صاحب کا مداح اور اُن سے بے حد محبت کرنے والا ایک سیاسی کارکن ہوں اور اپنے دل میں شیخ صاحب کا بہت احترام رکھتا ہوں۔ شیخ صاحب کا چیئرمین بھٹو کے باقی دوستوں سے پلہ اس لئے بھاری ہے کہ وہ ان کے ساتھ ان کی زندگی میں اور ان کے بعد اپنی زندگی کے آخری سانس تک ان کے وفادار رہے تھے، ان کے ساتھ رہے تھے۔

شاباش شیخ اشفاق

شیخ صاحب کے معاملے میں میں ان کے سب سے بڑے فرزند محترم شیخ اشفاق کو شاباش کہتا ہوں جو بڑی محبت کے ساتھ شیخ صاحب کی برسی کا اہتمام کرتے ہیں اور میرے سمیت پارٹی کے تمام پرانے ساتھیوں کو برسی میں شرکت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیخ اشفاق احمد نے ہماری سیاست میں یہ ایک اچھی رسم ڈالی ہے۔ وگرنہ ہماری پیپلز پارٹی کی سیاست میں ہر مرنے والے سیاست دان کو پارٹی فراموش کر دیتی ہے۔ اس معاملے کی انتہا

www.bhutto.org

یہ ہے کہ شیخ رفیق احمد کا پارٹی نے ریفرنس تک نہیں کیا تھا۔

شیرِ پنجاب ملک غلام مصطفیٰ کھر

میں نے ملک غلام مصطفیٰ کھر کو پہلی مرتبہ 1968ء میں فلیٹیز ہوٹل میں چیئرمین بھٹو کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ بے حد خاموش اور سیاسی گفت وشنید سے قطعی لاتعلق بیٹھے تھے۔ پارٹی کے اقتدار میں آنے تک میں نے اُن کو تقریباً اِسی حالت میں پایا تھا۔ اُن کے چند ذاتی دوستوں کا ایک حلقہ تھا۔ جن میں میاں اسلم بیڈن روڈ والا، میاں ساجد پرویز اور کچھ دوسرے لوگ تھے۔ یہ تمام لوگ عملی سیاست میں کبھی کوئی کردار ادا نہیں کرتے تھے۔ اُن کا کام کھر صاحب کی مصاحبی ہی ہوا کرتا تھا۔ کھر صاحب کی بھٹو صاحب کے ساتھ انتہا کی دوستی تھی۔ چیئرمین بھٹو کے معمولات کا جتنا علم کھر صاحب کو ہوتا تھا، اتنا کسی اور کو نہیں ہوتا تھا۔ وہ اُن کے انتہائی رازدار انسان تھے۔

چیئرمین بھٹو کے پنجاب میں تمام انتخابی دوروں میں ملک غلام مصطفیٰ کھر ہی اُن کے ساتھ ہوتا تھا۔ مصطفیٰ کھر کا کام اُن کے دوروں کے پروگرام کے شیڈول کو مرتب کرنا، اُن کی رہائش کا خیال رکھنا ہوتا تھا۔ اِس کے علاوہ چیئرمین بھٹو کو ہر جگہ لے جانے کا تمام کام کھر صاحب کے ذمے ہوتا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اِس قدر قوی دست کار ڈرائیور ملک غلام مصطفیٰ کھر سے بڑھ کر کسی اور کو نہیں دیکھا۔ وہ ہر جگہ اور ہر مقام پر بھٹو صاحب کے ساتھ ہوتے تھے۔ مگر نہ تو میں نے مصطفیٰ کھر کو کبھی کسی جلسے میں تقریر کرتے دیکھا تھا اور نہ ہی کسی ورکر میٹنگ میں میں نے اُن کو کبھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے پایا تھا۔

ملک غلام مصطفیٰ کھر کو اُن دنوں دیکھنے والا کوئی شخص بھی اِس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ شخص پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد پنجاب کا حاکم بن جائے گا اور شیرِ پنجاب کہلائے گا۔ میں نے غلام مصطفیٰ کھر کو دوسرے لوگوں کی طرح پارٹی کے معاملوں میں نہ تو کبھی بحث مباحثہ کرتے دیکھا اور نہ ہی لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ اُس کا تمام کام خفیہ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے مصطفیٰ کھر پارٹی کے کسی مسئلے میں کبھی متنازع نہیں بنتا تھا۔ آج مجھے اِس بات کی سمجھ آئی ہے کہ اُس کا دھیان صرف اقتدار حاصل کرنے کی طرف رہتا تھا۔ حکومت حاصل کرنے کی طرف رہتا تھا۔ اقتدار میں آنے سے پہلے اِس شخص نے کسی کو اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اُس کی کسی بھی منصوبہ

www.bhutto.org

بندی کو جان سکے۔لوگ صرف مصطفیٰ کھر کو بھٹو صاحب کی گاڑی چلاتا ہی دیکھا کرتے تھے۔اِس کے علاوہ اُس کی سیاست کے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اِس شخص کو 1968ء سے لے کر 1970ء تک یعنی اقتدار میں آنے سے پہلے مسلسل دیکھا تھا۔ مجھے بھی کھر صاحب کی طرح دن رات بھٹو صاحب کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔اِس شخص نے کبھی اتنا بھی اظہار نہیں کیا تھا کہ یہ کوئی سیاسی عہدہ چاہتا ہے یا کوئی لیڈر بننا چاہتا ہے۔اِس شخص کی تمام بھاگ دوڑ سے تمام جاں فشانی سے صرف ایک ہی بات سمجھ میں آیا کرتی تھی کہ یہ شخص جو کچھ کر رہا ہے، چیئرمین بھٹو کے لئے کر رہا ہے۔وہ نہ تو کسی کے ساتھ سیاست پر کبھی الجھا کرتا تھا اور نہ ہی کبھی میں نے اِس کو کسی سیاسی فلسفے پر بحث کرتے دیکھا تھا۔عام طور پر میں اُن کو ہنسی مذاق کی باتیں ہی لوگوں کے ساتھ کرتے دیکھتا تھا۔جن میں کافی سطحی باتیں بھی شامل ہوتی تھیں۔

میں نے اپنے تجربے کے مطابق اس قدر گہرا اور مبہم انسان دوسرا دیکھا ہی نہیں ہے۔اِس شخص نے اقتدار میں آنے سے پہلے کسی شخص کو اپنی ذات کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ملک غلام مصطفیٰ کھر کے دل میں کیا ہے؟ یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔نہ تو کبھی اِس کے مزاج میں جارحیت دیکھنے میں آتی تھی اور نہ ہی کبھی اُس کی انتقامی سوچ کا کوئی مظاہرہ دیکھنے میں آتا تھا۔

اِس شخص کے اندر کیا ہے، اِس کے ذہن میں کیا ہے۔وہ کسی کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ اِس کا اندازہ ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔اِس معاملے میں وہ انتہائی غیر معمولی انسان ہے۔ایکسٹرا آرڈی نریری آدمی ہے۔اُس کو مل کر کوئی یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ وہ محبت کرنے والا انسان ہے یا کہ کوئی ظالم انسان ہے۔نہ تو میں نے اُس کو کسی معاملے میں جذباتی پایا تھا اور نہ ہی کسی مسئلے میں اِس کو کبھی متفکر پایا تھا۔اِس کی ہر چیز اُس کی ذات کے اندر چھپی ہوئی ہوتی تھی۔اِس کا ظاہر جو کچھ تھا، اِس کا اندر اُس سے بے حد مختلف تھا۔ملک غلام مصطفیٰ کھر کو ظاہری طور پر دیکھنے والا ہر انسان اُس کو ایک کھلنڈرا قسم کا جاگیردار نوجوان خیال کرتا تھا۔

آج ملک غلام مصطفیٰ کھر کے بارے میں اُس کا جو سراپا میری سمجھ میں آیا ہے، وہ اتنا ہی ہے کہ اُس کا سب کچھ، اِس کی دین و دنیا، دوستی، سیاست صرف اور صرف اقتدار تھا۔اقتدار کے علاوہ نہ تو کوئی اُس کی سیاست تھی اور نہ ہی کوئی اُس کا نظریہ تھا۔جس طرح لوگوں کو علم حاصل کرنے کا شوق ہوتا ہے یا کسی کو لیڈر بننے کا شوق ہوتا ہے۔اِسی طرح مصطفیٰ کھر کو حکمران بننے کا شوق تھا۔

www.bhutto.org

واضح رہے کہ انسان کے کسی بھی شوق میں کسی اہلیت اور قابلیت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ قارئین! یہ بات بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں ہر انسان کے تمام شوق کبھی پورے نہیں ہوا کرتے۔ مگر غلام مصطفیٰ کھر دنیا کا واحد خوش نصیب انسان تھا جس کے تمام شوق چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی بدولت پورے ہو گئے تھے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ملک غلام مصطفیٰ کھر چیئرمین بھٹو کی سیاست کے آغاز سے ہی اُن کے ساتھ تھے مگر بڑی ہوشیاری کے ساتھ اُن کے ساتھ تھے۔ جب تک ایوب خان رہا یا اُس کے بعد جنرل یحییٰ خان کا مارشل آیا، وہ پس پردہ رہ کر بھٹو صاحب کا ساتھ دیا کرتا تھے۔ وہ بھٹو صاحب کے ساتھ عملی سیاست کے منظر پر کبھی کھلے عام دکھائی نہیں دیا کرتے تھے۔ ہمیشہ پردے کے پیچھے رہ کر سیاست کیا کرتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ سیاسی جوڑ توڑ کیا کرتا تھے۔ یہاں تک کہ ملتان کے جلسہ عام میں جو بھٹو صاحب کا پہلا جلسہ تھا اور ملتان ملک صاحب کا شہر بھی تھا۔ اِس جلسے میں بھی وہ تقریر وغیرہ کرنے کے لئے اسٹیج پر نہیں آئے تھے۔ وہ سیاست میں منظر عام پر اُس وقت نمودار ہونا شروع ہوئے تھے۔ جب 1970ء کے انتخابات کی مہم شروع ہوئی تھی اور اُن کو اپنے حلقے میں بطور اُمیدوار تقریر کرنا پڑتی تھی جس میں حکومت کی گرفت کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اگر اِس بات کو ہی تسلیم کر لیا جائے کہ اُنہوں نے چیئرمین بھٹو کا بہت ساتھ دیا تھا۔ اِس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ ایک سوالیہ نشان رہے گی کہ اُنہوں نے اپنی خدمات اور دوستی کی جو بھٹو صاحب سے قیمت وصول کی، وہ چیئرمین بھٹو کی شخصیت، اُن کی سیاست، اُن کی جماعت اور خود پنجاب کے عوام کے لئے ایک تباہ کن قیمت تھی جو تاریخی طور پر بعد میں احسان فراموشی اور اور محسن کشی کی ایک المناک داستان بن گئی تھی۔ جبکہ چیئرمین بھٹو کی مقبولیت اور ان کے اقتدار سے سب سے زیادہ فائدہ ملک مصطفیٰ کھر کے حصے میں آیا تھا۔

مجھے اب بھی جب ملک غلام مصطفیٰ کھر کی بھٹو کے خلاف بغاوت کے زمانے کی تاج پورہ لاہور کے جلسے کی تقریر کا وہ فقرہ یاد آتا ہے جو فقرہ ملک غلام مصطفیٰ کھر نے ہاتھ میں ایک مردہ یا زندہ سانپ پکڑ کر لوگوں کے سامنے اُس سانپ کا سر اپنے انگوٹھے سے دبا کر ادا کیا تھا کہ میں نے اس سانپ کا یعنی بھٹو کا سر کچل دیا ہے۔ تو میری روح کانپ اُٹھتی ہے کہ چیئرمین بھٹو بھی کس قدر بدنصیب قسم کے انسان تھے جو اپنی آستین میں کیسے کیسے لوگ لئے پھرتے تھے۔ یہاں پر مجھے فارسی

www.bhutto.org

کے طرح دار شاعر غنی کاشمیری کا کیا خوب شعر یاد آیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

صحبتِ ناجنس گر جاں بخشدت اُلفت مگیر
آب را دیدی کہ ماہی گر بہ دام افگند و رفت

شعر کا ترجمہ یوں ہے کہ کسی غیر فطری چیز کے ساتھ محبت نہیں کرنی چاہئے۔ خواہ اُس کی دوستی کتنی ہی جاں فزا کیوں نہ ہو۔ اِس لئے کہ تم مچھلی کو نہیں دیکھتے کہ وہ پانی کے ساتھ کس قدر محبت کرتی ہے مگر وہی مچھلی جو پانی کے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں رکھتی۔ جب جال میں پھنس جاتی ہے تو پانی موجیں مارتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ جس طرح بھٹو صاحب کے جیل میں پھنس جانے کے بعد کھر صاحب لندن بھاگ گئے تھے۔

اس شعر کی حکمت سے ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ کسی بھی بڑے انسان کی دوستی کا معیار بہت بلند ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ ہر انسان کی پہچان اس کی دوستیوں سے ہی ہوا کرتی ہے۔ افسوس کہ چیئرمین بھٹو بھی اپنے جاگیردار طبقے کے لوگوں کو ہی سیاست کرنے اور حکومت کرنے کا صحیح حقدار تصور کرتے تھے۔ وہ کسی غیر جاگیردار سیاسی کارکن کو اس قابل خیال نہیں کرتے تھے کہ اقتدار کی سیاست میں اس کو شامل یا شریک کیا جائے۔ چیئرمین بھٹو کی دوستی کی نوازشات کی سیاست پر باقی بات پارٹی کے اقتدار میں آنے کی سیاست کے باب میں کی جائے گی۔

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب مدظلہ

ڈاکٹر مبشر حسن صاحب اپنے علم و فضل کے لحاظ سے انجینئر تھے اور انجینئر بھی تعلیماتی انجینئر تھے، تعمیراتی انجینئر نہیں تھے، انجینئری کے معلم تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب خوش گفتار اور خوش رفتار انسان تھے۔ بڑے لائق فائق آدمی تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی چیئرمین بھٹو کی سیاست کی ابتدا میں ہی بھٹو صاحب کے ساتھ سیاست میں شریک ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ بھی پس پردہ رہ کر کام کرتے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد لاہور میں اُن کے گھر پر ہی رکھی گئی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے لاہور کے پہلے صدر جس کو اُس وقت کنویئر کہا جاتا تھا۔ ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ کے پارٹی سے نکل جانے کے بعد ڈاکٹر مبشر حسن پیپلز پارٹی لاہور کے صدر بن گئے تھے۔ یہ عہدہ تو اُن کو تنظیمی لحاظ سے ہی دیا گیا تھا، وگرنہ وہ پارٹی میں اِس سے کہیں زیادہ اہم لیڈر تھے اور پارٹی کی

www.bhutto.org

پہلی سینٹر کمیٹی جس کو اُس وقت اُصول کمیٹی کہا جاتا تھا، اُس کے بھی رکن تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کسی زمانے میں نوائے وقت اخبار کے بانی جناب حمید نظامی مرحوم کے بہت منظورِ نظر دوست ہوا کرتے تھے۔ اُن کی دوستی کی وجہ سے پاکستان کی صحافت کے بالائی طبقے میں اُن کی بہت وسیع جان پہچان تھی۔ پاکستان کے تمام بڑے صحافیوں سے اُن کی دوستی تھی۔ حمید نظامی مرحوم کی ہی دوستی کی وجہ سے پاکستان کے چند چوٹی کے بیوروکریٹس کے ساتھ بھی ڈاکٹر صاحب کی خصوصی دوستی تھی۔ پیپلز پارٹی کے وجود میں آنے کے ابتدائی ایام میں روزنامہ نوائے وقت اور مجید نظامی نے چیئرمین بھٹو اور پیپلز پارٹی کی کچھ دن حمایت کی تھی مگر جب پاکستان کے خفیہ اداروں نے چیئرمین بھٹو کی مخالفت کا سلسلہ شروع کیا تو روزنامہ نوائے وقت اور اُس کے مالکان مجید نظامی وغیرہ فوری طور پر چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی پر اسلام دشمنی کا الزام لگا کر چیئرمین بھٹو اور پیپلز پارٹی کے خلاف مورچہ بند ہو گئے تھے۔ آغا شورش کشمیری کی پیپلز پارٹی کی دشمنی کی وجہ بھی مجید نظامی ہی تھے۔ آغا شورش کشمیری بھی محترم مجید نظامی کے ہی حکم پر سوشلزم کا بہانہ بنا کر چیئرمین بھٹو کے مخالف ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن چیئرمین بھٹو سے محترم مجید نظامی کی وساطت سے ہی ملے تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا فوری طور پر انتخابات میں حصہ لینے کی وجہ سے پارٹی کی تنظیم سازی کا طریقہ کار تبدیل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پارٹی کا جو پہلا تنظیم سازی کا سلسلہ تھا وہ بہت نظریاتی قسم کا سلسلہ تھا۔ ابتدا میں پاکستان پیپلز پارٹی میں نمایاں طور پر شامل ہونے والے لوگوں کی اکثریت ان سیاسی کارکنوں کی تھی جو پہلے کسی پارٹی یا تنظیم میں شامل تھے۔ مگر وہ پارٹیاں اور وہ تنظیمیں غیر فعال تھیں۔ گلی کوچوں میں اُن کا تنظیمی ڈھانچہ ناپید تھا۔ وہ سیاسی جماعتیں گلی کوچوں میں پارٹی کی تنظیم سازی نہ ہونے کی وجہ اُن پارٹیوں اور اُن کی قیادتوں کا غیر مقبول ہونا تھا۔ وہ عوامی مقبولیت نہیں رکھتی تھیں۔ پیپلز پارٹی واحد سیاسی جماعت تھی جو شہروں اور دیہاتوں میں یکساں مقبول تھی۔ پیپلز پارٹی کی مقبولیت کا تمام تر سہرا چیئرمین بھٹو کی شہرہ آفاق اور ہر دلعزیزی پر تھا۔

قائداعظمؒ کے بعد اگر کسی سیاست دان کو عوام میں طلسماتی قسم کی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی تھی تو چیئرمین بھٹو کی ذات تھی۔ چیئرمین بھٹو کی مثال شہد کے چھتے کی کوئین مکھی کی طرح تھی۔ کوئین مکھی جس طرف منہ کر لیتی ہے، جس طرف اُڑنا شروع کر دیتی ہے، تمام چھتہ اُسی سمت اُڑنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ بیٹھتی ہے تو ہزاروں لاکھوں مکھیاں بیٹھ جاتی ہیں۔ یہی حالت چیئرمین بھٹو کی

عوام میں دیکھنے میں آتی تھی۔ اِس پارٹی کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ خود چل کر آتے تھے اور پارٹی کی رکنیت حاصل کرتے تھے۔ خود گلی کوچوں میں اپنے دفاتر قائم کرتے تھے۔ خود پارٹی کے دفتر میں آکر پارٹی کے لیڈروں کو دفتروں کا افتتاح کرنے کیلئے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اِس طرح کی دفتر سازی اور تنظیم سازی کرنے والے لوگ تقریباً تمام کے تمام سیاسی ذہن کے لوگ تھے۔ ترقی پسند ذہن کے لوگ ہوتے تھے۔ اُن میں پرانے سیاسی کارکن بھی ہوتے تھے اور نئے لوگ بھی ہوتے تھے۔ تمام نئے اور پرانے لوگوں کے ذہن میں ایک بات مشترکہ طور پر محسوس ہوتی تھی۔ وہ بات کسی معاشرے میں یا زندگی میں نئی تبدیلی کی بات تھی۔ ہر چند اِن ورکروں کی اکثریت کے ذہن میں تبدیلی لانے کا کوئی واضح تصور نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس طرح کی تبدیلی ہوگی۔ مگر اِس امر پر ہر کارکن کا ذہن آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھا کہ وہ سرمایہ داری اور جاگیرداری کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ وہ محنت کشوں اور غریب عوام کیلئے انقلاب لانا چاہتا ہے۔

مگر اِس طرح کی ذہنی قطار میں جب انتخابی سیاست کا دور دورہ شروع ہوگیا تو پارٹی کے اندر کارکنوں کی اہمیت اور ضرورت کا معیار تبدیل ہوگیا۔ پارٹی کے اندر اُن لوگوں کی تلاش شروع ہوگئی جو لوگ صاحب حیثیت لوگ ہوتے تھے۔ جو الیکشن لڑنے کے قابل خیال کئے جاتے تھے۔ افسوس کہ پارٹی کے بالائی سطح کے لیڈر چیئرمین بھٹو کی عوامی مقبولیت کا پورا اندازہ ہی نہیں رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اِن لیڈروں کو عوام کے تبدیل شدہ موڈ کا بھی پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ پاکستان کی قومی سیاست انتخابات کے معاملے میں اس قدر شخصیت زدہ تھی کہ چیئرمین بھٹو کے ساتھی انتخابات کے لئے وڈیروں کو تلاش کرتے تھے۔ جاگیرداروں کو تلاش کرتے تھے۔ شہروں میں بڑے لوگوں کو تلاش کرتے تھے۔ پرانے خوار شدہ سیاست دانوں کو تلاش کرتے تھے۔

اِس طرح کی صورتحال میں پارٹی کے اندر کسی کی شمولیت کسی نظریاتی سیاست پر کاربند نہ تھی۔ ہر اُس شخص کو ترجیح دی جاتی تھی جس کی مالی حیثیت اچھی تھی یا جس کا خاندان الیکشنوں میں حصہ لینے کی شہرت رکھتا تھا۔ انتخابات میں اس طرح کی سوچ اور درجہ بندی سے پارٹی کا ٹکٹ جس شخص کو بھی دے دیا جاتا تھا۔ اُس حلقے کا وہ شخص پارٹی کا صدر تصور کیا جاتا تھا۔ پارٹی کے ٹکٹ حاصل ہو جانے پر ٹکٹ ہولڈر کی قیمت تنظیموں سے بلندتر ہو جایا کرتی تھی۔ پارٹی کی تنظیمیں اُس کے ماتحت ہو جاتی تھیں۔ کسی پارٹی صدر کی ٹکٹ ہولڈر کے سامنے کوئی قیمت نہ

www.bhutto.org

رہی تھی۔ لہٰذا جس قسم کا ٹکٹ ہولڈر ہوتا تھا، اُس کے علاقے میں اُس قسم کی تنظیمیں بن جاتی تھیں۔ اگر تو کوئی ٹکٹ ہولڈر نظریاتی خیالات کا ترقی پسند ہوتا تھا تو اُس کے علاقے کی تنظیمیں بھی ترقی پسند بن جاتی تھیں۔

اگر ٹکٹ ہولڈر موقع پرست اور غیر نظریاتی قسم کا آدمی ہوتا تھا تو وہاں پر تنظیمیں بھی غیر نظریاتی بن جاتی تھیں۔ نظریاتی لوگوں کو پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا۔ نظریاتی سیاسی کارکنوں پر موقع پرست لوگوں کو اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔ سندھ اور پنجاب کے جاگیرداروں کے علاقوں میں تو تقریباً تقریباً جاگیرداروں کو ہی ٹکٹ دیئے گئے تھے۔ غیر جاگیردار علاقوں میں اکثریت اُن لوگوں کی تھی جو کچھ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ انتخابات میں ویسے بھی حصہ لینے والوں کی بہت کم تعداد اُن لوگوں کی تھی جو نظریاتی لوگ تھے اور سیاسی کارکن تھے۔ اُن کی تعداد کم ہونے کی وجہ وہی تھی جو اُوپر بیان کر دی گئی ہے کہ پارٹی کی پہلی ترجیح کسی شخص کے مالدار ہونے کی تھی۔ اِس لئے کہ دولت کے بغیر انتخابات میں حصہ لینے کا تصور ہی نہیں تھا۔

لاہور کے قومی اسمبلی کے جس حلقے سے چیئر مین بھٹو نے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُن کے نیچے ایک حلقے میں، میں نے صوبائی ٹکٹ کے لئے درخواست دی تھی۔ میں چونکہ عوام کو جلسہ گاہوں میں دیکھتا رہتا تھا۔ میں عوام کے موڈ کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پیپلز پارٹی کا ٹکٹ اگر کسی کھمبے کو بھی دے دیا گیا تو وہ کھمبا بھی ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ ووٹ چیئر مین بھٹو کی ذات کو پڑنا تھا۔ پارٹی کو پڑنا تھا۔ پارٹی کے منشور کو پڑنا تھا۔ لوگوں کے پاس پیپلز پارٹی کے علاوہ کوئی چوائس ہی نہیں تھا۔ میرے لیے سب سے زیادہ شرم اور حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ ٹکٹ کے لئے میرا انٹرویو لینے والا ملک اختر تھا جو تمام وقت تو جنرل ایوب خان کے ساتھ رہا تھا اور 1970ء کے انتخابات کے اعلان کے بعد حال ہی میں کچھ عرصہ پہلے پیپلز پارٹی میں شامل ہوا تھا۔ وہ شخص انتہا درجے کا غیر نظریاتی انسان تھا۔ وہ کرونک قسم کا انتخابی آدمی تھا۔ لاہوری قسم کا الیکشنر یا تھا۔ الیکشن لڑنا اُس کا پیشہ تھا۔ اُس میں کسی آڈیالوجی کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ ملک اختر میری برادری کا آدمی تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس نے مجھے دیکھتے ہی لاہوری انداز بیان میں یا لاہوری زبان میں کہا۔ تمہاری عقل تو نہیں ماری گئی۔ الیکشن نوٹوں کا کھیل ہے۔ اِس میں نظریے اور تنظیمیں نہیں چلتیں۔ نوٹ چلتے ہیں۔ میں نے ملک اختر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ میرے

www.bhutto.org

اوپر چیئرمین بھٹو ایم۔این۔اے کا انتخاب لڑ رہے ہیں۔اوپر قائدِ عوام ہوں گے، نیچے شاعرِ عوام ہوگا۔میرا انتخاب بے حد آسان اور مفت ہوگا۔اِس حلقے میں دولت کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ لوگ خود بخود انتخابات کے اخراجات کا بندوبست کریں گے۔جس طرح لوگ ہمارے جلسوں میں خرچہ برداشت کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔مگر ملک صاحب اِس معاملے میں کوئی دوسری بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے۔اُنہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ وہ اِس معاملے میں کسی مال دار آدمی کو ترجیح دیں گے۔اِس کے ساتھ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ابھی اِس ٹکٹ کا فیصلہ نہیں کرتا ہوں۔تم ڈاکٹر مبشر حسن سے مل لو۔اس حلقے میں اُن کی رائے فائنل ہوگی۔

میں ڈاکٹر مبشر حسن کے پاس گیا۔اُن کو تمام صورتحال سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اچھا مقرر ہوں۔میں تقریریں کروں گا، محنت کروں گا۔جو مناسب اخراجات ہوں گے۔وہ میں کروں گا۔ آپ مجھے اِس حلقے کا ٹکٹ دینے کی سفارش کریں۔ڈاکٹر صاحب میری غربت سے ملک اختر صاحب سے بھی زیادہ الرجک تھے اور مجھے الیکشن میں حصہ لینے کے لئے اہل ہی خیال نہیں کرتے تھے۔ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے۔شاعر! نہ تو تمہارے پاس گاڑی ہے۔نہ تمہارے پاس کوئی سرمایہ ہے۔تمہارا کام الیکشن لڑنا نہیں ہے، الیکشن لڑوانا ہے۔نظمیں پڑھنا ہے۔تقریریں کرنا ہے۔ بھٹو صاحب کے نیچے اُس جگہ میں نے ایک بہت مال دار آدمی تلاش کرلیا ہے۔وہ میری تمام توقعات پر پورا اُترے گا۔اُس کا نام مرزا طاہر بیگ ہے۔میں مرزا طاہر بیگ کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔وہ صدر کے علاقے میں رہتا تھا۔اُس کے گھر کے ساتھ والا گھر میرے ایک قریبی عزیز کا تھا۔ہمارا وہ عزیز صدر کا پیپلز پارٹی کا پہلا صدر تھا اور اِس وقت بھی وہی وہاں کا صدر تھا۔مرزا طاہر بیگ بے حد چالاک، بڑی چرب زبان رکھتا تھا۔آپ اُس سے لاکھ کی بات کریں، وہ کہے گا کہ کروڑ کی بات کریں۔بڑا دلچسپ آدمی تھا۔مرزا طاہر بیگ کو میں اور میرے دوست کبڑ کنیچ کہا کرتے تھے۔میری اُس کے ساتھ خاصی بے تکلفی تھی۔یہ تمام بے تکلفی اُس کی ذات کے اور اُس کی دلچسپ باتوں کی وجہ سے تھی۔میں نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کو کہا کہ آپ مجھ سے قسم لے لیں۔میں مرزا طاہر بیگ سے زیادہ خرچ کرسکتا ہوں۔وہ باتونی آدمی ہے۔آپ اُس کے دھوکے میں آگئے ہیں۔آپ جو سمجھ رہے ہیں وہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔مگر ڈاکٹر صاحب پر مرزا طاہر بیگ کا جادو چل چکا تھا۔اُس کے مقابلے میں وہ مجھے کوئی اہمیت دینے کو تیار ہی نہیں تھے۔اُنہوں نے

www.bhutto.org

جان چھڑانے کے لئے مجھے کہا کہ یہاں پر بھٹو صاحب الیکشن لڑ رہے ہیں۔ یہاں اُن کو فیصلہ کرنا ہے۔ بھٹو صاحب سے روز ملتے ہو، اُن سے بات کرو۔ ڈاکٹر صاحب سے مل کر میں بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ شیخ صاحب کے پاس ایک بات میرے حق میں گئی تھی۔ اُن کو میری غربت پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اِس لئے کہ وہ خود بھی تو میری ہی طرح کے غریب اُمیدوار تھے۔ مگر وہ میرے ٹکٹ کے مسئلے پر میری سفارش کرنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ اُن کے نزدیک صرف اور صرف ایک ضیاء الدین بٹ کی ہی ٹکٹ کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ وہ ضیاء الدین بٹ کے ٹکٹ کے مسئلے کو ویت نام کا مسئلہ بنائے ہوئے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ ضیاء الدین بٹ کے ٹکٹ کی ضرور کوشش کریں، سفارش کریں مگر میرے معاملے میں بھی کچھ مدد فرمائیں۔ اُن کے مدد کرنے کے وعدے کا انداز بے حد کمزور تھا۔ اُنہوں نے بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح کہنا شروع کر دیا کہ تمہیں تو چیئر مین بھٹو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ تم اُن سے بات کرو۔ تمہیں تو ٹکٹ مل ہی جائے گا۔ مجھے تو اِس کے لئے بات کرنی ہے جس کو بھٹو صاحب جانتے نہیں ہیں۔ اِس طرح ٹکٹ مرزا طاہر بیگ کو دے دیا گیا۔

انتخابات کے بعد بڑی دلچسپ صورتحال دیکھنے میں آئی۔ ڈاکٹر مبشر حسن اور مرزا طاہر بیگ کی آپس میں ٹھن گئی۔ ایک طرح کی جنگ شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب انتخابات کے بعد ایک جگہ ورکروں کو خطاب کرنے گئے۔ مرزا طاہر بیگ کے لڑکوں نے ڈاکٹر صاحب کی فوکسی کے ٹائروں سے ہوا نکال دی اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف نعرہ بازی کی۔ ڈاکٹر صاحب بڑی مشکل سے وہاں سے جان چھڑا کر گھر پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے چیئر مین بھٹو اور غلام مصطفیٰ کھر کو مرزا طاہر بیگ کی اِس حرکت کی شکایت کی۔ غلام مصطفیٰ کھر نے ایک کمیٹی مرزا طاہر بیگ کی انکوائری کرنے کے لئے بنا دی۔ مرزا جب کمیٹی کے سامنے پیش ہوا تو مرزا کا بیان تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ٹکٹ دیتے وقت پانچ ہزار روپیہ پارٹی کو فنڈ دینے کیلئے مانگا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے وعدہ کر لیا تھا کہ میں یہ رقم اُن کو دے دوں گا جبکہ میں یہ رقم دینے کے قابل ہی نہیں تھا اور میں نے ڈاکٹر صاحب کو چندہ نہ دیا جس کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب میرے دشمن بن گئے ہیں۔ مرزا طاہر بیگ بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ اُس کو علم تھا کہ شیخ محمد رشید کا گروپ ڈاکٹر مبشر حسن کے ساتھ سیاسی اختلاف رکھتا ہے، ڈاکٹر صاحب کو پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ شیخ صاحب کے گروپ کی حمایت حاصل کرنے کے

www.bhutto.org

لئے پارٹی کے دفتر مزنگ آیا۔ میں چونکہ پارٹی کے دفتر میں ہوتا تھا۔ مرزا طاہر بیگ کی وہاں بیٹھے ہوئے کارکنوں سے اِس معاملے پر بات ہوئی اور وہ اُن سے مدد کا طلبگار ہوا۔ اِن ورکروں میں، میں بھی موجود تھا۔ میں نے مرزا طاہر بیگ کو کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم لوگوں کے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کچھ نظریاتی اختلافات ہیں، کچھ تنظیمی اختلافات ہیں مگر ہم تمہارے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب کو زیادہ قابلِ عزت انسان خیال کرتے ہیں۔ تم ڈاکٹر صاحب پر پانچ ہزار روپے مانگنے کا الزام لگا رہے ہو۔ ہم اِس معاملے میں تمہاری کسی قسم کی مدد کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

وقتی طور پر تو ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی اور مرزا طاہر بیگ کی اِس پرخاش کی آگ دب گئی تھی مگر پارٹی کو اقتدار حاصل ہو جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مرزا طاہر بیگ کو فکس کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ کر لیا کہ مرزا طاہر بیگ سے صوبائی اسمبلی کی نشست خالی کروالی جائے۔ مرزا طاہر بیگ تو ایک عام روٹین کا چھوڑیا آدمی تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب جو خود کو ایک بہت بڑا بقراط تصور کرتے تھے اور کئی معنوں میں تھے بھی۔ اُن کو اِس طرح کا غیر جمہوری قسم کا اور انتہائی غنڈہ گردی کا فیصلہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اِس طریقے کی کاروائی جو مرزا طاہر بیگ کے ساتھ کی گئی تھی، وہ کھلی اناری تھی اور پارلیمانی نظام کے منہ پر ایک تھپڑ کے مترادف تھی۔ مرزا طاہر بیگ خواہ کچھ بھی تھا مگر اُس وقت جب وہ غریب عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو چکا تھا۔ اُس وقت اُس سے زبردستی استعفیٰ لکھوانا بڑے ظلم کی بات تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک ورکنگ پارٹنر اور اپنے پرانے سٹوڈنٹ کوثر علی شاہ کے ماموں اختر علی شاہ کے ذمے لگایا کہ وہ زبردستی مرزا طاہر بیگ سے استعفیٰ حاصل کرے۔ اختر علی شاہ بڑا عیاش طبع انسان تھا۔ اُس کا قیام ہی ہیرا منڈی میں رہتا تھا۔ اُس نے چند پارٹی کارکنوں اور چند اوباش غنڈوں پر مشتمل ایک ٹیم تیار کی اور اُس ٹیم کی قیادت کرتا ہوا مرزا طاہر بیگ کے دفتر واقع گلبرگ گیا اور وہاں سے مرزا طاہر بیگ کو زبردستی اغواء کر کے اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔ یہ تمام واقعہ دن کی روشنی میں شام تقریباً 3 بجے کے قریب کیا گیا۔ دفتر کے اردگرد کے لوگ اِس تمام واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور پیپلز پارٹی کے ڈاکٹر صاحب کے غنڈوں کی کاروائی کا اپنے ہی نمائندے کے ساتھ سلوک کا نظارہ کر رہے تھے۔

اختر علی شاہ کے غنڈے اور اختر علی شاہ مرزا طاہر بیگ کو اُٹھا کر کوثر علی شاہ کے گھر لے گئے۔ اُس کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ اختر علی شاہ بڑے بھاری جسم کا مالک تھا اور بڑی رعب دار

www.bhutto.org

آواز رکھتا تھا۔ اُس نے اپنی رعب دار آواز کے ساتھ مرزا طاہر بیگ سے اسمبلی کی رکنیت کے استعفےٰ پر دستخط کروائے۔ اُس وقت پنجاب اسمبلی کا سیشن چل رہا تھا۔ مرزا طاہر بیگ کو ایک کمرے میں ہی بند رکھا گیا اور اُس کا استعفےٰ اسمبلی میں جا کر سپیکر شیخ رفیق کو دے دیا گیا۔ شیخ رفیق احمد نے نہایت سعادت مندی کے ساتھ استعفےٰ کو قبول کرنے کا اعلان کرتے ہوئے مرزا طاہر بیگ کی رکنیت ختم کر کے اِس نشست کو خالی قرار دے دیا۔ شام 5 بجے کی ریڈیو کی خبروں میں سپیکر کے اِس فیصلے کا اعلان کیا گیا۔ اِس طرح ریڈیو کے اِس اعلان کے بعد مرزا طاہر بیگ کو کوثر علی شاہ کے گھر سے آزاد کر دیا گیا۔

پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف کے لوگوں نے دوسرے دن اِس بات پر بہت شور برپا کیا۔ اخباروں نے اِس بات کو بہت نمایاں طور پر شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اِس انتقامی ایکشن سے پارٹی کی انتہائی بدنامی ہوئی تھی۔ پارٹی کے اقتدار کا ابھی آغاز ہی تھا۔ اقتدار کا اِس نوع کا فاشٹ قسم کا مظاہرہ پارٹی کے لئے بڑی بدنامی کا باعث ہوا۔ مرزا طاہر بیگ نے الیکشن کمیشن میں مقدمہ دائر کر دیا۔ مقدمے کے دوران دونوں جانب کے لوگوں کے درمیان گولیوں کا مقابلہ بھی دیکھنے میں آیا۔ مقدمے کا فیصلہ الیکشن کمیشن نے مرزا طاہر بیگ کے حق میں کر دیا۔ وہ دوبارہ اسمبلی کا رکن بن گیا۔ میں نے بھٹو صاحب سے ذاتی طور پر اِس بات کی شکایت کی۔ بھٹو صاحب فرمانے لگے کہ تم اکیلے مرزا طاہر بیگ کے حمایتی ہو جبکہ باقی تمام لوگ اُس شخص کو بدمعاش کہتے ہیں۔ میں خاموش ہو کر رہ گیا۔ اختر علی شاہ کی ٹیم میں میرا ایک دوست پرانا پارٹی ورکر ادریس خان بھی شامل تھا۔ ادریس خان کو میں کہا کرتا ہوں کہ تم لوگوں نے پارٹی کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ اُس کا جواب ہوتا تھا کہ ہمارے بڑوں کا حکم تھا۔ ہم تو بچے تھے، ورکر تھے۔ اِس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی ایک جھلک دکھانا تھا۔

پیپلز پارٹی پر غیر سیاسی لوگوں کا قبضہ

جب تک پیپلز پارٹی لاہور کے ورکروں کا براہ راست رابطہ بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید کے ساتھ تھا، پیپلز پارٹی کے ورکروں کے رویے نہایت سیاسی انداز کے ہوتے تھے۔ وہ ہمیشہ نظریاتی اندازِ فکر کی باتیں سنتے اور کرتے تھے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ شیخ محمد رشید خود ایک نظریاتی انسان تھے

www.bhutto.org

اور اپنے خیالات و بیانات میں بہت واضح انسان تھے۔ وہ سیاسی معاملات میں ایک کھلی کتاب تھے۔ ہر چند وہ بے حد سلف سنٹرڈ انسان تھے۔ اپنی ذات کے علاوہ کچھ نہیں سوچتے تھے مگر اُن کے اِس سلف سنٹرڈ ہونے پر ایک گہری عوامی زندگی کی چھاپ تھی۔ اُن کے مقابلے میں جب ڈاکٹر مبشر حسن صاحب لاہور پیپلز پارٹی کے صدر بن گئے تو پارٹی کی اور پارٹی کے ورکروں کی ترجیحات ہی تبدیل ہونا شروع ہو گئیں۔

اِس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈاکٹر صاحب بہت ذہین اور محنتی آدمی ہیں۔ مگر اِن تمام خوبیوں کے باوجود وہ ایک غیر سیاسی انسان تھے۔ اُن کی ذہنی تربیت ایک بیوروکریٹک ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ بیوروکریٹک ماحول بھی درس و تدریس کا تھا۔ انجینئرَ کی تعلیم دینے کا تھا۔ یاد رکھیں کہ ایک استاد سے بڑھ کر کوئی انسان ڈکٹیٹر نہیں ہوتا۔ طالب علموں کی سعادت مندی ایک استاد کو رفتہ رفتہ تھانیدار بنا دیتی ہے۔ ایک استاد کسی سے ناں سننے کا متحمل ہی نہیں رہتا۔ خاص طور پر ہمارے معاشرے کے استادوں کا رویہ غیر جمہوری ہوتا ہے۔ متشدد ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں استاد شاگردوں کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کرتے۔ طالب علموں کی اُن کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہی رویہ لے کر ڈاکٹر مبشر حسن صاحب پیپلز پارٹی میں وارد ہو گئے۔ اِس استادانہ رویے کے علاوہ ایک اور رویہ بھی اُن کی شخصیت میں شامل تھا۔ وہ رویہ تھا ایک لمیٹڈ کمپنی چلانے کا رویہ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ملازمت ترک کرنے کے بعد ایک کاروباری کمپنی بنالی تھی جو ایک لمیٹڈ کمپنی تھی جس میں باقاعدہ ملازم رکھے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ ایک سخت گیر قسم کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ کمپنی کے ملازموں کو اپنے اشاروں پر نچانے کے عادی تھے۔ کاروباری نجی کمپنیوں میں مالکان کے یا باسز کے عام طور پر اِسی طرح کے رویے ہوا کرتے ہیں۔ کسی بھی لمیٹڈ کمپنی میں کسی ملازم کی مجال نہیں ہوتی کہ وہ اپنے باس کے کسی بھی حکم سے اختلاف کرے۔ اختلاف کرنے والے ملازم کو ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔

ہماری بدنصیبی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ دوسری قسم کا رویہ بہت زیادہ اُن کی ذات پر حاوی تھا۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی صدارت کا پیپلز پارٹی کے ورکروں کے ساتھ وہی رویہ تھا جو اُن کا اپنی لمیٹڈ کاروباری کمپنی میں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنے مزاج کے مطابق ایک لمیٹڈ کمپنی بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا مقام و مرتبہ لاہور کی صدارت کی وجہ سے نہیں تھا۔ وہ چیئرمین

بھٹو کے چند با اعتماد لوگوں میں سے نہ صرف ایک تھے بلکہ اُن میں بھی اہم ترین انسان تھے۔ اِس وجہ سے ڈاکٹر صاحب کی پارٹی پر گرفت بہت زیادہ تھی۔ وہ پارٹی میں سفید کریں یا سیاہ، اُن کو کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ اُنہوں نے لاہور پیپلز پارٹی کا صدر بنتے ہی اپنی طبیعت کے ہیجان اور میلان کے مطابق پارٹی ورکروں کو اپنی شخصی اور ذاتی حمایت کی طرف راغب کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب پارٹی کا ورکر صرف اُس کو تصور کرتے تھے جو ورکر اُن کے ذاتی ملازموں کی طرح اُن کا تابعدار ہوتا تھا۔ دوسرا کوئی ورکر خواہ وہ نظریاتی اعتبار سے کتنا بھی بلند خیال ہوتا تھا یا سیاسی طور پر ایک اعلیٰ کارکردگی کا حامل ورکر ہوتا تھا۔ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کے رویے اور ڈاکٹر صاحب کے پیمانے پر پورا نہیں اُترتا تھا تو اُس کی ڈاکٹر صاحب کے نزدیک نہ کوئی اہمیت ہوتی تھی اور نہ اُس کی کوئی حیثیت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب خود سے کسی بھی نوعیت کا اختلاف رکھنے والے کا وجود مٹا دینے کی حد تک اُس کے خلاف ہو جاتے تھے۔ اِس معاملے میں وہ کسی کی علم و دانش کو تسلیم کرنے کیلئے ہرگز تیار نہیں ہوتے تھے۔ میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی ایک اور بات حیران کن تھی۔ وہ خود کو تو سوشلسٹ اور کیمونسٹ خیال کرتے تھے۔ پاکستان کے تمام بڑے بڑے کیمونسٹوں کے ساتھ اُن کی بے تکلفی تھی۔ فیض صاحب کو وہ اپنے لکھنوی انداز میں ''فیضی'' کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ سبط حسن کو سبطے کہا کرتے تھے مگر پارٹی کے اندر ہر سوشلسٹ ورکر کے وہ دشمن جانی ہوا کرتے تھے۔ وہ ہر سوشلسٹ ورکر کے ساتھ بے حد نفرت کرتے تھے۔ شیخ محمد رشید اور ان کے ساتھیوں کا ان کی نفرت کا باعث ہی سوشلزم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ شیخ رشید پارٹی کے ورکروں کا دماغ خراب کرتا ہے۔ پارٹی کا ماحول خراب کرتا ہے۔ شیخ محمد رشید کا گروپ چیئرمین بھٹو کے خلاف کام کرتا ہے۔

دفتر پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب و بہاولپور 4/A، مزنگ روڈ لاہور

پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کا دفتر بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید صاحب کی تجربہ کار قیادت کے زیرِ سایہ کام کرتا تھا۔ ہمارا یہ دفتر پارٹی کارکنوں کے لئے ایک درس گاہ کا کام کرتا تھا۔ کارکنوں کی سیاسی اور اخلاقی تعلیم کا گویا ایک مدرسہ تھا۔ ہمارے اِس دفتر میں پارٹی کے تنظیمی اجلاس کے علاوہ تمام قومی تہواروں پر اجلاس منعقد کئے جاتے تھے۔ پارٹی کے منشور پر کھلی بحث ہوا کرتی تھی۔ بین الاقوامی موضوعات پر اجلاس کئے جاتے تھے۔ ملک کے مشہور دانشوروں کو پارٹی کے

www.bhutto.org

اجلاس میں بلایا جاتا تھا۔اُن کے لیکچرز کرائے جاتے تھے۔کیمونزم اور سوشلزم کے اُصولوں پر بحث مباحثے کرائے جاتے تھے۔ مارکسزم کی تعلیمات پر لیکچر دیئے جاتے تھے۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کی تدابیروں پر مبنی تقریریں کی جاتی تھیں۔ ہمارا یہ دفتر اظہار خیال اور آزادی اظہار کے لئے گویا اُس عہد کا ہائیڈ پارک تھا۔ ہمارے دفتر میں کارکن اخلاق و آداب کو بڑی سختی سے ملحوظ رکھتے تھے۔ ہمارے اِس دفتر میں تقاریر کا معیار بہت نظریاتی فکر کا معیار بلند ہوتا تھا۔ یہاں پر تمام مقرر ورکروں کے تقریری مقابلے ہوتے تھے۔ پارٹی کے وہ تمام کارکن جو تقریر کرنے کا ذوق وشوق رکھتے تھے۔اُن کو باقاعدہ تقریر کے موضوعات دیئے جاتے تھے۔

ہم لوگ بڑی کتابیں پڑھ کر تقریریں کیا کرتے تھے۔ پیپلز پارٹی پنجاب کے دفتر میں جن مشہور ومعروف دانشوروں کے لیکچرز کرائے جاتے تھے۔اُن کے نام ملاحظہ کریں۔ بابا ظہیر کاشمیری، حنیف رامے، ڈاکٹر مبشر حسن، پروفیسر عزیز الرحمٰن، پروفیسر مبارک حیدر، رضا کاظم ایڈووکیٹ، پروفیسر عزیزالدین احمد، خورشید حسن میر، جے اے رحیم، ڈاکٹر سہیل احمد خان، پروفیسر استقلال خان، معراج محمد خان، طفیل عباس، صفدر میر، احمد بشیر، شفقت تنویر مرزا، نذر کیانی، جاوید حکیم، قیوم بٹ، عبدالحمید خان، بابر اور مختار رانا وغیرہ۔

پارٹی کے اجلاس اور تمام تقریبات میں حنیف رامے، رانا مختار، تاج محمد لنگاہ، امان اللہ خان، میاں عبدالستار نجم، قیوم نظامی، طالب علم لیڈر سمیع خان، اعجاز سیفی، ایس۔ایم مسعود، اصغر علی چوہدری ایڈووکیٹ، بابا فاضل رشیدی، ایز د مسعود اور میرے درمیان تقریروں کا سخت مقابلہ رہتا تھا۔ پارٹی کی تمام تقریبات منعقد کرنے کا کام امان اللہ خان اور میں خود کیا کرتے تھے۔ دفتر کی اِن تمام تقریبات میں سب سے بڑے سپیکر بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید صاحب ہوا کرتے تھے جو ہر تقریب کے زیر بحث موضوع کو سمیٹا کرتے تھے۔ پارٹی کے دفتر کی تقریبات کی تقریروں کی کاروائی اخبارات کی زینت بنا کرتی تھی۔ ہر تقریب میں اخبارات کے رپورٹرز کو بلایا جاتا تھا۔ پارٹی کے دفتر میں اِس طرح کی تعمیری سرگرمیوں کی وجہ سے شیخ محمد رشید صاحب اور پنجاب پیپلز پارٹی کے دفتر کا پورے پنجاب میں غلغلہ تھا۔ بڑی دھوم تھی۔ تمام لوگ پڑھے لکھے، سیاسی ذہن کے لوگ اُس شخص کو پیپلز پارٹی کا نظریاتی کارکن یا لیڈر خیال کرتے تھے جس کا تعلق شیخ محمد رشید کے پنجاب کے دفتر کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ پارٹی اُس وقت بے حد مقبول تھی۔ پارٹی کے قائد چیئرمین بھٹو کی

www.bhutto.org

شہرت آسمانوں کو چھو رہی تھی۔ جو شخص بھی اُن کے قریب چلا جاتا تھا، لوگوں کی نگاہوں میں آ جاتا تھا۔ ہم کارکنوں کی باتوں کو لوگ بے حد دھیان سے سنتے تھے۔ لوگ ہماری باتوں کو چیئرمین بھٹو کی باتیں تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہماری تقریبات میں پارٹی کے کارکنوں کے علاوہ عام لوگ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ہمارا پنجاب پیپلز پارٹی کا دفتر ایک طرح کا سیاسیات کا مرکز بن گیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا کوئی لیڈر خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدے پر فائز ہو، اگر وہ اِس دفتر کی جدوجہد اور سرگرمیوں سے باہر رہتا تھا تو لوگ اُس کو پارٹی کا لیڈر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ پارٹی کے اِس دفتر کے نام اور اُس کی شہرت کی وجہ پہلے نمبر پر تو بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید کی پرولتاری شخصیت اور اُن کی شفقت بھری ذات ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اس دفتر کی عزت اور مقام میں اضافہ کرنے میں امان اللہ خان اور میرے جیسے ہمہ وقت دفتر میں موجود رہنے والے دیش بھگتوں کا بھی ہاتھ تھا۔ ہم لوگوں نے اپنی ذات کو کارکنوں کیلئے ایک مثال بنا رکھا تھا۔ ہم دونوں کے علاوہ یوسف ہمدانی، احسان اللہ خان، صادق مسیح، روزی خان، ادریس کھٹانہ، خالد بلوچ، اعجاز سیفی، ضیاء الدین بٹ، سمیع خان، چاچا شریف، بھولا ڈنگر، مرزا اکرام بیگ، میر حامد حسن، رشید خان، احسان اللہ خان، کرم الٰہی، پروفیسر استقلال اور میاں منیر احمد وغیرہ ہم اِس دفتر کے مستقل موجود رہنے والوں میں تھے۔

شیخ محمد رشید کے پارٹی کے دفتر کی اِس نوع کی شہرت کی وجہ سے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی پارٹی کے ہر سطح کے کارکنوں میں کوئی قدر و منزلت نہیں تھی۔ اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب خود کو کارکنوں کی عام سطح پر کبھی لاتے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنی ہی ایک فطری تحکمانہ اکڑ میں رہا کرتے تھے۔ کارکنوں کے ساتھ اُن کی ذہنی وابستگی قائم ہی نہیں ہوتی تھی۔ اُن کا رویہ انتہائی قسم کا غیر سیاسی ہوتا تھا۔ یہاں پر میں سیاسی عہدے داروں کے لئے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ایک نیک مشورہ رقم کرنا چاہتا ہوں تاکہ اُن کے کام آسکے۔

سیاسی جماعت میں سیاسی کارکنوں کا کردار

تمام حقیقی سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور عہدے داروں کو اِس بات کا اچھی طرح علم، ادراک اور احساس ہونا چاہیے کہ ایک سیاسی جماعت لوگوں کی رضا کارانہ اتفاق رائے کا مجموعہ ہوتی ہے۔ لوگوں کی نمائندہ ہوتی ہے۔ تمام لوگ اپنی پسندیدہ جماعت کو پسند کرتے ہیں مگر وہ عملی

www.bhutto.org

طور پر اپنی پسندیدہ جماعت کی تنظیمی اور فکری سرگرمیوں میں شریک نہیں ہوتے۔ایک سیاسی کارکن میں اور عام پارٹی کے ساتھ محبت کرنے والے انسانوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ کارکن اپنی پسند کی جماعت میں عملی طور پر شرکت کرتا ہے۔اپنی محبت میں آزادانہ تصور وخیال میں خودکو پارٹی کے سپرد کردیتا ہے۔پارٹی کے قواعد وضوابط کا رضا کارانہ طور پر پابند ہوجاتا ہے۔اپنی ذات پر رضا کارانہ طور پر بے شمار پابندیاں لگالیتا ہے۔مثال کے طور پر ایک سیاسی کارکن عام لوگوں کی طرح کے رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے سے خودکو مختلف کرلیتا ہے۔عام لوگوں کی طرح شوخ وشنگ کپڑے پہننے سے بھی اجتناب کرتا ہے۔عام لوگوں کے کھیل تماشوں سے بھی علیحدہ رہتا ہے۔بے حد سادہ کھانا کھاتا ہے اور بے حد سادہ لباس پہنتا ہے۔کھدر پوش ہوجاتا ہے۔وہ زندگی جو عام لوگوں کے لئے بڑی دلکش ہوتی ہے،شان وشوکت کی زندگی ہوتی ہے،ایک سیاسی کارکن اِس زندگی کوایک نمائشی زندگی قرار دیتا ہے۔وہ خودکو عاجز اور مسکین بنالیتا ہے۔وہ خودکو زیادہ سے زیادہ انسانیت کے قریب کرلیتا ہے۔عام لوگوں کے نزدیک تعلیم حاصل کرنے کا مقصد افسری اور ملازمتیں حاصل کرنا ہوتا ہے۔عام لوگوں کا کام بڑے کاروبار کرنا ہوتا ہے۔جائیداد بنانا ہوتا ہے۔ دولت کمانا ہوتا ہے۔ ہر طرح کی لوٹ مار کرنا ہوتا ہے۔رشوت خوری کرنا ہوتا ہے۔ملاوٹ کرکے پیسہ بنانا ہوتا ہے۔جعل سازی کرکے منافع کمانا ہوتا ہے۔اُن کا کام تو کاریں حاصل کرنا ہوتا ہے۔بڑی بڑی کوٹھیاں بنانا ہوتا ہے۔اِن کوٹھیوں پر ''ھذا من فضلِ ربی '' لکھوانا ہوتا ہے۔ یہ سب عام لوگوں کا طرزِ زندگی ہوتا ہے۔

مگر ایک سیاسی کارکن کا طرزِ زندگی انسانوں میں انسانوں کے لئے ایک تمثیلی، مثالی اور علامتی طرزِ زندگی ہوتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے کو اپنے اردگرد کے لوگوں کو اپنی شرافت، اپنی صداقت، اپنی قناعت، اپنے علم وفضل، اپنے رہن سہن کے طریقوں سے زندگی کے اعلیٰ مقاصد کا پیغام دیتا ہے۔وہ عام لوگوں کی لوٹ مار کی زندگی کو اور نفسانفسی کی زندگی کو اپنے کردار وعمل کے ساتھ ایک غیر انسانی زندگی ثابت کرتا ہے۔وہ تعلیم یافتہ افسروں کی رعونیت اور تمکنت کے سامنے اپنے عجز وانکسار سے لوگوں کی توقیر میں اضافہ کرتا ہے۔سرمایہ داری نظام کے ریاستی ادارے جو بنیادی طور پر انسانوں کی تذلیل کے لئے بنائے گئے ہوتے ہیں۔ان اداروں سے ڈرے ہوئے لوگوں کو،خوفزدہ لوگوں کے خوف کو اپنی محبت سے دور کرتا ہے۔وہ ریاست کے اداروں کے تشدد

www.bhutto.org

سے لوگوں کو بچاتا ہے۔ ریاستی اداروں کے ظلم وتشدد کے سامنے لوگوں کو کھڑا ہونا سکھاتا ہے۔ وہ لوگوں کو سر اُٹھا کر چلنا سکھاتا ہے۔ لوگوں میں اپنے افکار وعمل کے ساتھ آزادی کی رُوح پھونکتا ہے۔ لوگوں کو توہمات سے آزاد کراتا ہے۔ لوگوں میں بھائی چارے اور امن و آشتی کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ عدل وانصاف کی بات کرتا ہے۔ ظلم کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ اپنی بھوک اور پیاس کو لوگوں کی بھوک اور پیاس پر قربان کر دیتا ہے۔ اپنے وقت اور اپنی زندگی کو لوگوں کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر مقام پر لوگوں کی مدد کیلئے موجود رہتا ہے۔ اُس کا عشق اُس کا شوق لوگوں کے مصائب کو دور کرنا ہوتا ہے۔ وہ ہمہ وقت لوگوں کا مددگار بنا رہتا ہے۔ ایک سیاسی کارکن اپنے خیال وفکر سے زندگی کے نظام کو خوبصورت بناتا ہے۔ اُن کی محنت اور شفقت کو عظیم قرار دیتا ہے۔ انسانوں کو عظیم قرار دیتا ہے۔ انسانوں کے ذہنی استحصال کرنے والوں کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ انسانوں کے معاشی، سیاسی اور سماجی استحصال کرنے والوں کے خلاف اعلانِ جہاد کرتا ہے۔ انسانوں کو ذہنی طور پر آزاد کرانے کی تعلیم دیتا ہے۔ انسانوں کو معاشی طور پر آزاد کرانے کی جدوجہد کرتا ہے۔ انسانوں میں اعلیٰ خیالات پیدا کرتا ہے اور زندگی کی اُونچ نیچ کے تفرقوں سے آزاد کرانے کا سبق دیتا ہے۔ انسانوں میں برابری پیدا کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ انسان اور انسانی زندگی کو افضل قرار دیتا ہے۔ ایک سیاسی کارکن تعلیم یافتہ ہو، یا غیر تعلیم یافتہ، اُس کی سوچ اور اُس کا عمل ایک ہوتا ہے۔ اُس کے عمل کا معیار ایک ہوتا ہے۔ ایک باعمل سیاسی کارکن ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے ایک ہوتا ہے۔

لہٰذا اس طرح کے ایک باعمل متحرک، عقل وفکر کے حامل انسان کے ساتھ پارٹی کے عہدے داروں اور لیڈروں کا سلوک بے حد عزت واکرام کا سلوک ہونا چاہیے۔ اُن کی عزت کی جانی چاہیے۔ اُن کو ملازم تصور نہیں کرنا چاہیے۔ اُن کو ایک قسم کا رامیٹریل تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ اُن کو صرف نعرے باز نہیں خیال کرنا چاہیے۔ اُن کی عزتِ نفس کا احساس رکھنا چاہیے۔ اُن کو اُن کا جائز مقام دینا چاہیے۔ اُن کو بڑے قابلِ قدر لوگ تصور کرنا چاہیے۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کی عزت اور تکریم کا بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید تو بہت خیال رکھتے تھے بلکہ وہ خود کو بھی ایک لیڈر سے زیادہ سیاسی کارکن ہی خیال کیا کرتے تھے۔

مگر اِس معاملے میں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کا خانہ بالکل خالی ہوتا تھا۔ اُن کے نزدیک کسی

www.bhutto.org

سیاسی کارکن کی کوئی سیاسی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ اُن کے نزدیک سیاسی کارکن وہی ہوتا تر ھا جو اُن کے حکم کا غلام ہوتا تھا۔ حضرات! میں یہ باتیں ڈاکٹر مبشر حسن کے خلاف تحریر نہیں کر رہا۔ میں یہ باتیں آئندہ کے سیاسی لیڈروں کی اصلاح کیلئے تحریر کر رہا ہوں تا کہ وہ میرے تجربے سے سبق حاصل کریں۔ ڈاکٹر مبشر حسن آج بھی میرے لئے ایک محترم انسان ہیں۔ میں نے ہمیشہ اُن کی عزت کی ہے۔ مگر میں تو صرف اُن کے غیر سیاسی رویے کی بات کر رہا ہوں جو اُن کی شخصیت اور اُن کی صلاحیتوں پر بہت حاوی تھا۔

قارئین! آج ایک بہت ہی دلچسپ اتفاق ہوا ہے۔ آج مورخہ 29 نومبر 2005ء کو ڈاکٹر صاحب کی غنوئی پارٹی کے یوم تاسیس کے اجلاس کی کاروائی اخباروں میں پڑھنے میں آئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پر اِس اجلاس میں کچھ کارکنوں نے بڑی سخت تنقید کی ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہ تو تنظیم سازی کرتے ہیں اور نہ ہی کارکنوں کو عزت اور مقام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی پارٹی پر آمریت قائم ہے وغیرہ وغیرہ۔

قارئین کرام! میں تو اُس وقت کی بات کر رہا تھا جب آتش جوان تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب جوان تھے۔ بہت انرجیٹک تھے۔ بہت فعال تھے۔ مگر آج جبکہ ڈاکٹر صاحب بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میرے خیال میں وہ 80 کے لگ بھگ ہیں۔ خدا اُن کی عمر اور بھی دراز کرے۔ آج بھی اُن کی پارٹی کے کارکن اُن کے اُسی رویے کی شکایت کر رہے ہیں۔ جس کا پیچھے میں نے ذکر کیا ہے۔ غنوئی پارٹی کے کارکنوں کو میرا پیغام ہے کہ ہم نے تو ڈاکٹر صاحب کی جوانی کا رویہ برداشت کیا تھا۔ آپ لوگوں سے تو اُن کے بڑھاپے کا رویہ بھی برداشت نہیں ہو پا رہا۔ آپ لوگوں کو ہمارے حوصلوں کی داد دینی چاہیے۔

فوجی حکومت کی نمائندگی

ڈاکٹر مبشر حسن جنرل مشرف کی فوجی حکومت کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے طائفے لے کر ہندوستان جایا کرتے تھے۔ جس پر ان کی پارٹی کے ورکروں نے سخت تنقید کی تھی۔

غنوئی اور ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی پارٹی کے کارکنوں کا بیان ہے کہ یہ پارٹی جنرل مشرف

www.bhutto.org

حکومت کی بی ٹیم بن کر رہ گئی ہے۔ یہاں تک کہ غنویٰ پارٹی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات فرخ سہیل گوندی نے احتجاجاً اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ اخبار کے مطابق اُن کو شکایت ہے کہ اُن کی پارٹی کے لیڈروں نے پارٹی کو سیاسی بے عملی کا شکار کر دیا ہے۔ جب تک پارٹی موجودہ صورتحال میں عوام کی مشکلات دور کرنے کی سیاست میں حصہ نہیں لے گی۔ وہ اپنا استعفیٰ واپس نہیں لیں گے۔

میں 4/A، مزنگ روڈ کے پارٹی دفتر کی بات کر رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب 4/A، مزنگ روڈ سے بے حد الرجک ہو گئے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی بڑی محبت تھی۔ وہ مزنگ دفتر گاڑی پر آئے اور اُنہوں نے مجھے نیچے بلایا اور گاڑی میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ بتاؤ دفتر میں کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ دفتر میں پارٹی کا کام ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ خاک پارٹی کا کام ہوتا ہے۔ سارا دن تم لوگ جاگیرداروں کو گالیاں نکالتے رہتے ہو۔ تم لوگوں کو اتنا خیال نہیں آتا کہ پارٹی کا لیڈر جاگیردار ہے۔ تم لوگوں نے پارٹی کا منشور ہی علیحدہ بنا رکھا ہے۔ تم لوگ کارکنوں کو انتہا پسند بنا رہے ہو۔ شیخ محمد رشید نے اپنا علیحدہ دھڑا بنا لیا ہے۔ شیخ محمد رشید کا دھڑا باقی لوگوں کو غیر انقلابی کہتا ہے۔ غیر نظریاتی کہتا ہے۔ چیئرمین کو جاگیردار کہتا ہے۔ غیر انقلابی کہتا ہے۔ وہاں پر لوگ چیئرمین بھٹو اور شیخ محمد رشید کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک جس نے پارٹی بنا رکھی ہے وہ غیر انقلابی ہے اور شیخ محمد رشید انقلابی ہے۔ 4/A، مزنگ کے کارکنوں نے پارٹی میں بغاوت پھیلا رکھی ہے۔ تم پارٹی کے شاعر ہو۔ ہر جگہ بھٹو صاحب تمہیں ساتھ رکھتے ہیں۔ تمہارا فرض بنتا ہے کہ اِس دفتر کی سیاسی سرگرمیوں کی مجھے اطلاع دو۔ کون کیا تقریر کرتا ہے۔ کون کس کو گالی دیتا ہے۔ کس کی تعریف ہوتی ہے اور کس کو لیڈر قرار دیا جاتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی تمام باتیں سُن کر اُن کو بڑے ادب سے جواب دیا کہ وہاں پر کسی کو گالی نہیں دی جاتی۔ نہ ہی پارٹی کے منشور کے خلاف کوئی بات کی جاتی ہے۔ تمام لوگ چیئرمین بھٹو کو اپنا قائد تصور کرتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ چیئرمین بھٹو کے بعد شیخ محمد رشید کو اپنا لیڈر خیال کرتے ہیں۔ آپ کی ذات سے وہاں پر کارکنوں کو شکوہ ہے کہ آپ غیر سیاسی لوگوں کو پارٹی کی تنظیموں پر مسلط کرتے ہیں۔ سیاسی غنڈوں کو پسند کرتے ہیں۔ آپ نے افتخار تاری اور طارق وحید بٹ کو لاہور کا سب سے اہم سیاسی کارکن بنا رکھا ہے جو پارٹی کے اندر سیاسی کارکنوں کے ساتھ غنڈہ

www.bhutto.org

گردی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کو آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب یہ باتیں تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ تاری ہی تم لوگوں کو سیدھا کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے کہا کہ تم بے وفا ہو۔ تم بھی اُن لوگوں کی طرف ہو گئے ہو۔ اس ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے کاغذات پر سے میرا نام کاٹ دیا۔ ڈاکٹر صاحب پنجاب پیپلز پارٹی کے اندر جاسوسی کے لئے کوئی نہ کوئی کارکن بھیجا کرتے تھے۔ اُن کی جاسوسی کا مستقل کارکن اُن کے گھریلو ملازم کا بیٹا غلام حسین ہوتا تھا۔ غلام حسین پنجاب پیپلز پارٹی کے دفتر میں آکر خاموشی سے بیٹھ جاتا تھا۔ کارکنوں کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ آنے جانے والوں پر نظر رکھتا تھا۔ پارٹی دفتر میں بلائی جانے والی ہر میٹنگ میں موجود رہتا تھا۔ ہر کارکن کی تقریر کا متن یاد رکھتا تھا اور شام کو جا کر ڈاکٹر صاحب کو پوری پوری ڈائری دیا کرتا تھا۔

پنجاب دفتر میں ایک دن امان اللہ خان کا موڈ بے حد آف تھا۔ امان اللہ خان کا موڈ اُس دن آف ہوا کرتا تھا جس دن اُس کے پاس پیسے وغیرہ نہ ہوں۔ امان اللہ خان بہت خرچیلا آدمی تھا جس کی وجہ سے اکثر اوقات میری طرح تنگ دستی کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔ تنگ دستی اُس کی برداشت سے باہر ہو جایا کرتی تھی۔ اس حالت میں اُس کو کوئی چیز اچھی نہیں لگا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ انقلاب بھی اُس کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ شاعر عوام کس قوم کے لئے انقلاب کی جدوجہد کر رہے ہیں ہم، جس کو ہماری حالت کا علم ہی نہیں۔ امان اللہ خان کچھ ایسی ہی حالت میں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ جاسوس چوہدری غلام حسین دفتر آ گیا۔ اُس دن امان اللہ خان سے غلام حسین ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہ ہو سکا۔ امان اللہ خان نے اُس کو کہا۔ سنو لڑکے! تم ہماری غریب کلاس سے تعلق رکھتے ہو۔ ہماری جاسوسی تمہارا ذریعہ معاش ہے۔ آج میں بہت پریشان ہوں۔ آج میں تم کو ایک منٹ کے لئے بھی دفتر میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ مگر چونکہ تم میرے طبقے سے تعلق رکھتے ہو۔ اس لئے مجھے تمہارے مالی مفادات کا پورا پورا احساس ہے۔ تم یہاں سے جا کر ڈاکٹر صاحب کو کچھ بتاؤ گے تو کچھ پاؤ گے۔ آج ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کو جا کر کہہ دو کہ امان اللہ خان کہتا ہے کہ ڈاکٹر امریکہ کا ایجنٹ ہے۔ جاؤ شاباش۔ میں نے تمہارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں امان اللہ خان کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھ رہا تھا۔ امان اللہ خان کی بات سن کر میں نے قہقہہ لگا دیا۔ مجھ سے میری ہنسی یا قہقہہ ضبط نہ ہو سکا۔ غلام حسین کا تو گویا

www.bhutto.org

کام مکمل ہو گیا۔ وہ فوراً اُٹھ کر چلا گیا۔ مگر ہم لوگ تمام دن اس بات پر ہنستے رہے۔

امان اللہ خان کی دو ماہ کے لئے پارٹی رکنیت معطل کر دی گئی

غلام حسین نے جا کر ڈاکٹر مبشر حسن کو من وعن تمام قصہ ڈاکٹر مبشر حسن کو امریکہ کا ایجنٹ کہنے کا رپورٹ کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اسلم گورداسپوری اس بات کا گواہ ہے۔ چیئرمین بھٹو لاہور تشریف لائے تو ڈاکٹر مبشر حسن نے اپنی ہتک عزت کا دعویٰ چیئرمین بھٹو کی سپریم عدالت میں پیش کر دیا۔ چیئرمین بھٹو نے پہلے تو شیخ محمد رشید کو طلب فرمایا۔ شیخ صاحب کے ساتھ اس واقعہ کا گلہ کیا کہ پارٹی کے دفتر میں پارٹی کے لیڈر کے بارے میں پارٹی کا ایک کارکن کس قدر حقارت آمیز باتیں کرتا ہے۔ شیخ صاحب! آپ ان لوگوں کو غیر ذمہ دار باتیں کرنے سے منع نہیں کرتے۔ اگر ہمارے ورکر ہی پارٹی کے لیڈروں کو بدنام کریں گے تو دوسروں کو ہمارے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اس مسئلے پر ایکشن لیا جائے گا تاکہ آئندہ تمام کارکنوں کو غیر ذمہ دار باتیں کرنے سے روکا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی چیئرمین بھٹو نے بطور گواہ مجھے طلب کیا۔ میں جب ہوٹل کے کمرے میں پہنچا تو کمرے میں شیخ محمد رشید صاحب، ملک غلام مصطفیٰ کھر، شیخ صفدر علی، میاں اسلم اور کچھ دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ میں بھی بھٹو صاحب کو سلام کہہ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ بھٹو صاحب بیڈ پر آرام کرنے کے انداز میں بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے مجھے کہا کہ وہاں نہیں، اپنے بیڈ پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہاں بیٹھو۔ میں اُن کے بیڈ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔ اُنہوں نے مجھ سے اپنے مخصوص گرجدار لہجے میں پوچھا۔ تمہارے سامنے یا تمہاری موجودگی میں ڈاکٹر مبشر حسن کو امریکہ کا ایجنٹ کہا گیا۔ بولو یہ سچ ہے۔ میں اس سوال کے جواب کیلئے تیار ہی نہیں تھا۔ میں نے شیخ محمد رشید کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب کڑک کر بولے۔ شیخ صاحب کی طرف کیا دیکھتے ہو۔ تم جواب دو۔ میں نے جواب دیا کہ سر ڈاکٹر صاحب کے ملازم کا بیٹا دفتر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کو مزنگ دفتر کی اُلٹی سیدھی رپورٹیں دیتا رہتا ہے۔ اس لڑکے نے ڈاکٹر صاحب کو ہم سب لوگوں کے خلاف کر رکھا ہے جو اس دفتر میں بیٹھتے ہیں۔ اس لڑکے کی اس حرکت کی وجہ سے تمام لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں۔ امان اللہ خان اپنی طبیعت کے لحاظ سے اس لڑکے سے بے حد الرجک ہے۔ امان اللہ خان نے جو کچھ بھی کہا تھا۔ محض غصے کے انداز میں اس

www.bhutto.org

لڑکے سے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا تھا۔ وگرنہ وہ ڈاکٹر صاحب کا بہت احترام کرتا ہے۔ ملک مصطفٰی کھر مجھے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ وہ تمہیں کب بخشتا ہے۔ تمہیں وہ بھٹو کا ایجنٹ کہتا ہے۔ یہ تمام باتیں امان اللہ خان کی مختلف کیفیتوں کی باتیں ہوتی تھیں۔ اِن باتوں کو اگر سیاق و سباق سے علیحدہ کر دیا جائے تو بے حد قابل اعتراض بن جاتی تھیں۔

مجھے بھٹو کا ایجنٹ کہنے کا قصہ

ایک روز مزنگ دفتر میں لاہور سے باہر کے کچھ پارٹی کے کارکن آئے۔ میں نے اُن کارکنوں کو چائے پلانے کا انتظام کیا۔ میں اور امان اللہ خان اِن کارکنوں پر پارٹی کا فلسفہ جھاڑ رہے تھے۔ ایک کارکن نے کہا کہ ہمارے مخالف ہم کو کہتے ہیں کہ پیپلز پارٹی جاگیرداروں کی پارٹی ہے۔ امان اللہ خان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے کہہ دیا۔ یہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ پیپلز پارٹی جاگیرداروں کی پارٹی ہے۔ میرا رویہ سیاسی بحث مباحثے میں بڑا دھیما اور دوراندیشی کا ہوتا تھا۔ میں نے امان اللہ خان سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے مخالفوں کو ہماری مخالفت کرنے کا جب کوئی اور طریقہ ہاتھ نہیں آتا تو وہ ہمارے کارکنوں کو گمراہ کرنے کیلئے یہ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ پیپلز پارٹی جاگیرداروں کی پارٹی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ باتیں زیادہ تر نیشنل عوامی پارٹی کے لوگ کرتے ہیں۔ اِن ورکروں نے میری بات کی تائید کی کہ ہاں نیپ کے ورکر ہی ہم کو یہ بات کہتے ہیں۔ میں نے اُن کو کہا کہ آج جا کر اُن سے پوچھنا کہ ولی خان کون ہے۔ اعظم خان ہوتی کون ہے۔ بلوچستان کے عوامی نیشنل پارٹی کے سردار کون ہیں۔ بگٹی کون ہیں۔ مری کون ہیں۔ ہماری پارٹی کا لیڈر جاگیردار ضرور ہے مگر اِن تمام جاگیرداروں سے زیادہ روشن خیال، زیادہ انقلابی اور زیادہ عوامی حیثیت کا مالک ہے۔ وہ ایک بین الاقوامی شہرت کا حامل سیاست دان ہے۔ اِس طرح جب گفتگو کی میز پر کارکنوں نے میری بات پر سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اُن کا قیادت کے بارے میں ذہن صاف ہونے لگا۔ اُنہوں نے میری تعریف شروع کر دی کہ آپ جیسے لوگ ہماری اصلاح کر دیتے ہیں۔ آپ ہمارا فخر ہیں۔ کارکنوں کی باقی باتیں تو امان اللہ خان کوڑا گھونٹ کر کے سنتا رہا مگر جب اُنہوں نے مجھے پارٹی اور کارکنوں کا فخر کہا تو یہ خطاب اور یہ تعریف امان اللہ خان کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ اُس نے مجھے اپنے مخصوص انداز میں محبت کے لہجے میں کہا کہ کامریڈ!

www.bhutto.org

کیوں جاگیرداروں کی ایجنٹی کرتے ہو۔ میں نے محبت سے جواب دیا۔ کامریڈ! میں جاگیرداروں کا ایجنٹ نہیں ہوں۔ میں چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو جیسے شہرہ آفاق سیاست دان کا ایجنٹ ہوں۔ اس لئے کہ ہر ورکر اپنے قائد کا ایجنٹ ہی تو ہوتا ہے۔ میرا ایجنٹ کہنے سے میری مراد نمائندہ ہونے کی تھی۔ اس طریقے سے یہ تمام گفتگو بات چیت ہنسی خوشی ختم ہوگئی۔ ان ورکروں میں سے کسی ورکر نے یہ بات ملک غلام مصطفیٰ کھر کو بتادی مگر ایک ایسے انداز میں کہ جس میں بُرائی کا پہلو نکلتا تھا یعنی امان اللہ خان نے اسلم گورداسپوری کو چیئرمین بھٹو کا ایجنٹ کہا ہے۔

میں نے ملک صاحب سے کہا ہرگز نہیں۔ یہ بات کچھ اور انداز میں ہوئی تھی۔ میں نے بھٹو صاحب کو دیکھا۔ اُن کے چہرے پر بہت ناگواری کے آثار نمایاں تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ ڈاکٹر کو اور امان اللہ خان کو بلایا جائے۔ میں بھٹو صاحب کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے بعد امان اللہ خان کی پیشی ہوئی۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ سوائے شیخ محمد رشید کے باقی تمام امان اللہ خان پر برس پڑے۔ ان باتوں کے علاوہ بھی امان اللہ خان کی کچھ اور بھی اس طرح کی درفنطنیاں تھیں جن کو وہ اکثر اپنے موڈ کے مطابق چھوڑتا رہتا تھا۔ امان اللہ خان کی باتوں میں کچھ باتیں اپنے اندر گہرے معنی بھی لئے ہوتی تھیں۔ مگر بیک وقت ان باتوں میں ایک قسم کی برہمی اور برگشتگی بھی جھلکا کرتی تھی۔ جو لوگ امان اللہ خان کو اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ وہ اُس کی باتوں میں کچھ دیوانگی محسوس کیا کرتے تھے۔ امان اللہ خان ایک دانشور سیاسی ورکر تھا جس کی باتوں میں منطق اور فلسفہ ہوتا تھا مگر اُس کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ اُس کی سنجیدہ ترین باتوں میں بھی مزاح پیدا ہو جایا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر ایک دن میرے ساتھ قیادت کے احکامات کی تعمیل پر بحث کر رہا تھا۔ مجھے کہنے لگا کہ شاعرِ عوام دریا کس قدر انسانی زندگی کیلئے اہم اور ضروری ہوتے ہیں۔ اس سے فصلیں اُگتی ہیں۔ لوگ اس کا پانی پیتے ہیں مگر دریا اگر مجھے یہ کہے کہ مجھ میں ڈوب کر مر جاؤ تو کیا میں دریا کا کہا مان لوں گا۔ ہرگز نہیں مانوں گا۔ میں نے امان اللہ خان سے کہا۔ امان اللہ خان! انقلاب تو ایک رومانس ہوتا ہے۔ ایک عشق ہوتا ہے۔ اس کے لئے تو سر دینا ہی پڑتا ہے۔ اس کے لئے لومبا چی گیورا اور حسن ناصر بننا ہی پڑتا ہے۔ امان اللہ خان ذہنی طور پر کچھ برہم سا رہتا تھا۔ بہت شریف انسان تھا۔ مجھے کہنے لگا۔ کامریڈ! یہ بھوک اور ننگ کا عشق میں نہیں کر سکتا۔ بس کچھ اس طرح کے تضادات اُس کی شخصیت میں ہوتے تھے۔ امان اللہ خان کی

www.bhutto.org

اِن باتوں سے اِن تضادات سے ہر شخص واقف ہوتا تھا۔لوگ اُس کی باتوں کا مزہ لیا کرتے تھے۔

قصہ مختصر وہ تمام لوگ جو بھٹو صاحب کے کمرے میں بیٹھے تھے، اُنہوں نے امان اللہ خان پر اُس کے تضادات کو دہرانا شروع کردیا۔امان اللہ خان اتنے لوگوں کے تابڑتوڑ حملوں کی تاب ہی نہیں لاسکتا تھا۔وہ بہت شرمیلا سا آدمی تھا۔امان اللہ خان نے بھٹو صاحب سے کہا۔سر! یہ آپ نے مجھے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کردیا ہے۔چیئرمین بھٹو امان اللہ خان کی اِس بات پر ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔بھٹو صاحب نے سب کو کہا کہ اور کچھ مت کہو اور امان اللہ خان کو کہا۔تمہاری اصلاح کے لئے دو ماہ کے لئے تمہاری پارٹی رکنیت معطل کی جاتی ہے۔تم اپنی اصلاح کرو۔پارٹی کے نظم و ضبط کو ملحوظ رکھو۔یہ تمہارا امتحان ہے۔امان اللہ خان ایک انقلابی سیاسی کارکن تھا۔میرے ساتھ اُس کا سب سے زیادہ وقت گزرتا تھا۔اُس کی فرسٹیشن اُس وقت زیادہ ہوتی تھی جس وقت اُس کے پاس پیسے ختم ہوجایا کرتے تھے۔پھر وہ میرے کمرے میں آجاتا تھا۔مجھے دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا تھا۔یہ دوفٹ کے کمرے میں شاعرِ عوام پڑا ہے۔اِس کے ساتھ ہی کہتا۔کامریڈ! زندگی کے لئے دولت بھی بہت ضروری ہے۔میں چونکہ مساوات اخبار میں کچھ تنخواہ پاتا تھا۔مہینے کے ابتدائی ایام میرے اچھے گزرجاتے تھے۔

میں اپنی تنخواہ ہو یا کوئی بھی دوسری چیز امان اللہ خان کا اُس میں حصہ خیال کیا کرتا تھا۔میں جب بھی امان اللہ خان کو فرسٹیٹ دیکھتا تھا۔فوراً اُس کو کہتا۔کامریڈ! کہاں کھانا کھایا جائے۔امان اللہ خان کا موڈ فوراً ہی اچھا ہوجاتا تھا۔وہ فوراً کہتا۔جانا کہاں ہے کامریڈ۔حاجی بابے کا گوشت منگواؤ۔ظالم اپنے سالن میں اوپیم افیم ڈالتا ہے۔

سیاسی کارکنوں کا المیہ

ہمارے جیسے معاشروں میں جہاں انسان کی عزت ہی انسان کی اقتصادی حالت سے متعین کی جاتی ہے۔دولت اور مکانات سے انسان کو دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔اِس قسم کے معاشرے میں کسی قسم کی بھی دیش بھگتی کو کبھی عزت کی نگاہ سے دیکھا نہیں جاتا۔اِس پر ستم برائے ستم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے جیسے ممالک میں جہاں ملک پر فوجیں راج کرتی ہیں۔وہاں پر فوجی راج کے ساتھ یا کسی بھی ڈکٹیٹر کے ساتھ اختلاف کرنے والے انسان کو زندہ درگور کردیا جاتا ہے۔اُس پر حصول

رزق کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ایک سیاسی کارکن کو نہ تو حکومت کی ملازمت مل سکتی ہے اور نہ ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات میں اُس کو نوکری مل سکتی ہے۔ ہندوستان میں تمام کیمونسٹوں نے فلموں کے لئے گیت اور کہانیاں لکھ کر زندہ رہنے کا سامان پیدا کیا تھا۔

ہندوستان کی فلم انڈسٹری کا معیار اور وقار ان سیاسی لوگوں کی وجہ سے ہی قائم ہوا تھا۔ مگر ہندوستان میں سیاسی کارکنوں کی ایک لمبی اور طویل آزادی کی جدوجہد کی وجہ سے سیاسی کارکنوں کو بہت تعظیم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے پاکستان میں جہاں آغاز پاکستان میں ہی لوٹ مار کا نظام قائم ہو گیا تھا۔ زمینوں اور مکانوں کی الاٹ منٹ کو مالِ غنیمت تصور کر لیا گیا تھا۔ یہاں پر سیاسی کارکنوں کو یا سیاسی کارکن کا کوئی تصور ہی نہیں تھا جس کی وجہ سے یہاں پر سیاسی کارکنوں کو بڑے کٹھن دن دیکھنے پڑتے تھے۔

ہمارا 4/A مزنگ روڈ کا دفتر نظریاتی سیاسی کارکنوں کے اجتماع کا مرکز ہوتا تھا۔ ہر وقت اِس دفتر میں جلسے کی سی حالت رہتی تھی۔ اِس دفتر میں آنے جانے والے ہر کارکن کا تشخص پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کا ترجمان ہوتا تھا۔ لوگ پارٹی کے کارکنوں میں عملی طور پر پارٹی کے بنیادی فلسفے کی جھلک دیکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک پولیس والا ضلع تاندلیاں والا سے میرے وارنٹ گرفتاری لے کر پارٹی کے دفتر پہنچا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ سخت گرمی تھی۔ وہ پیدل چل کر دوپہر کے وقت دفتر پہنچا۔ دفتر میں اتفاق کے ساتھ ہم لوگ گڑ اور چنوں کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ پولیس والے کا پیاس سے بُرا حال تھا۔ اُس کو گھڑے کا پانی دیا گیا۔ دو روٹیوں پر تھوڑا سا گڑ رکھ کر اور ایک پیالی میں تھوڑے سے چنے ڈال کر اُس کی خدمت میں پیش کر دیے گئے۔ وہ پولیس والا ہماری حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا کہ ہم لوگ تو پیپلز پارٹی والوں کی تقریروں کو جھوٹی باتیں خیال کرتے ہیں۔ مگر تم لوگ تو عملی طور پر وہی زندگی گذار رہے ہو۔ جس طرح کی تم لوگ جلسے جلوسوں میں بات کرتے ہو۔

ہم نے جب اُس کی آمد کا سبب دریافت کیا تو اُس نے میرے وارنٹ دکھائے کہ اسلم گورداسپوری کو تاندلیاں والا کے جلسہ عام میں تقریر کرنے کے جرم میں تاندلیاں والا کی فوجی عدالت نے طلب کیا ہے۔ اُس نے بغیر ہمارے کسی جواب کے کہا کہ اِس پر لکھ دیں کہ اسلم گورداسپوری بھٹو صاحب کے ساتھ سندھ کے دورے پر گیا ہوا ہے تاکہ میں فوجی عدالت کا منہ بند

www.bhutto.org

کر سکوں۔ ہمارے آفس سیکرٹری صادق مسیح نے پارٹی کے لیٹر پیڈ پر اُس کو یہ تحریر لکھ کر دے دی اور وہ پولیس والا واپس چلا گیا۔ یہ تمام باتیں میں اِس لئے تحریر کر رہا ہوں تا کہ آج کے لوگوں کو پیپلز پارٹی کے اصل کارکنوں کی زندگی اور اُن کے حالات سے آگاہی ہو جائے۔ لوگوں کو یہ علم ہو جائے کہ پیپلز پارٹی کی کامیابی کی اصل وجوہات کیا تھیں۔

مگر یہ تمام باتیں جس کو میں پیپلز پارٹی کی کامیابی کی وجوہات بتا رہا ہوں، یہ تمام باتیں ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کے نزدیک کوئی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتیں تھیں۔ اُن کے نزدیک 4/A مزنگ روڈ دفتر میں بیٹھنے والے یا رہنے والے کارکن باغی کارکن تھے۔ پارٹی کے اندر بغاوت پیدا کرتے تھے۔ جاگیرداری کے خلاف اور سرمایہ داری کے خلاف نفرت پیدا کرتے تھے۔ سرمایہ داروں کو گالیاں دیتے تھے۔ کیمونسٹوں کے کہنے پر کام کرتے تھے۔ پارٹی کے باہر سے لائن حاصل کرتے تھے۔ شیخ محمد رشید کو بھٹو کے مقابلے میں اپنا لیڈر کہتے تھے۔ ڈاکٹر مبشر حسن کو سرمایہ داروں کا ایجنٹ کہتے تھے اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کو جاگیرداروں کا ایجنٹ کہتے تھے جس کی وجہ سے ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر 4/A، مزنگ روڈ کے دفتر کے بے حد خلاف تھے اور اِس دفتر کو اپنی سیاست کے خلاف تصور کرتے تھے اور اِس دفتر میں بیٹھنے والوں کو اپنا مدمقابل اور اپنا مخالف تصور کیا کرتے تھے۔ یہ لوگ 4/A، مزنگ روڈ دفتر کو اور اِس دفتر کو چلانے والوں کو اپنے اقتدار کی راہ میں رکاوٹ خیال کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک سیاسی کارکن کہلانے کا وہی انسان مستحق تھا جس کے پاس کوٹھی اور کار ہو یا وہ آدمی اُن کا صحیح ورکر تھا جو غنڈہ گردی کر سکتا ہو۔ اپنے ساتھ چند کن ٹٹوں کا گروہ رکھتا ہو۔ غنڈوں کو پارٹی سیاست کیلئے اہم خیال کرنے میں ملک غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن صاحب دونوں کا ذہنی اشتراک تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کمزور فزیق اور اپنی لمیٹڈ کمپنی کی حامل سیاست کی وجہ سے غنڈوں سے کام لینا پسند کرتے تھے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر اپنی جاگیرداری پس منظر کی وجہ سے غنڈہ گردی کو سیاست کا لازمی جزو خیال کرتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو غنڈہ گردی ہی اُن کی سیاست ہوتی تھی۔ چیئرمین بھٹو کو چونکہ ہر وقت ملک غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن کی ہی قربت اور مشاورت حاصل رہتی تھی۔ چیئرمین کے مزاج میں اِن دونوں انسانوں کو بہت اختیار حاصل تھا۔ چیئرمین کے خیالات میں اِن دونوں انسانوں کا پنجاب میں بڑا عمل دخل تھا۔ چیئرمین بھٹو ہر اُس چیز کو پسند کرتے تھے جس کو یہ دونوں پسند کرتے تھے۔ ہر

www.bhutto.org

اُس لیڈر یا سیاسی کارکن کو پسند کرتے تھے جس لیڈر یا کارکن کو مصطفیٰ کھر یا ڈاکٹر مبشر حسن پسند کرتے تھے۔ ہر اُس ورکر اور پارٹی لیڈر کو ناپسند کرتے تھے جس کو یہ دونوں حضرات ناپسند کرتے تھے۔ بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید کو چونکہ یہ دونوں حضرات ناپسند کرتے تھے۔ لہٰذا شیخ صاحب کی طرح پورا 4/A مزنگ روڈ کا دفتر ہی اُن کی وجہ سے چیئر مین بھٹو کیلئے ناپسندیدہ بنا دیا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو بڑی حقارت سے مزنگیئے کہا جاتا تھا۔

وہ سیاسی کارکن آٹومیٹک ہی پارٹی میں ناپسندیدہ قرار پا جاتا تھا۔ پرسونا نان گریٹا بن جاتا تھا جو شیخ محمد رشید کے ساتھ تعلق رکھتا تھا یا 4/A مزنگ روڈ کے دفتر میں آتا جاتا تھا۔ میری اور امان اللہ خان کی بدقسمتی یہ تھی کہ ہم اِس دفتر میں محض آنے جانے والوں میں سے نہیں تھے۔ ہم تو اِس دفتر میں باقاعدہ رہتے تھے۔ بقول شاعر اقبال ساجد

جہاں بھونچال بنیادِ فصیل و در میں رہتے ہیں
ہمارا حوصلہ دیکھو کہ ہم اس گھر میں رہتے ہیں

اس دفتر میں تو صرف کسی کے آنے جانے پر ڈاکٹر صاحب دفعہ 302 لگا دیتے تھے۔ ہمارا حوصلہ ملاحظہ ہو کہ ہم اِس دفتر میں رہائش رکھتے تھے۔ حضرات! یہ حوصلہ نہیں تھا، خودکشی تھی۔ بہرصورت میں اور امان اللہ خان اِس دفتر کے ایسے مجذوب تھے جن پر ملک غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی خوف ودہشت کا کچھ اثر نہیں ہوتا تھا۔ ہم لوگ اپنے نظریات کی مستی میں اِس قدر مست الست تھے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ ہر چند ہماری اِس بے نیازی سے ہمیں بڑی سخت سزائیں بھی بھگتنی پڑتی تھیں۔ امان اللہ خان تو پارٹی کے اقتدار میں آجانے کے بعد ملک غلام مصطفیٰ کھر کا پریس سیکرٹری بن کر مشرف با اسلام ہو گیا تھا مگر میرے کفر میں کچھ زیادہ ہی طاقت تھی کہ میں اقتدار کے بعد بھی ویسا ہی رہا جیسا کہ اقتدار سے پہلے تھا۔

میں بات کر رہا تھا ڈاکٹر مبشر حسن کے اندازِ سیاست کی اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کے اندازِ سیاست کی۔ یہ دونوں حضرات ورکروں کی کسی دیش بھگتی کے قائل نہیں تھے۔ نہ اُن کے نزدیک ورکروں کے کسی نظریاتی کردار کی کوئی اہمیت تھی۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کا تو پارٹی کارکنوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا تھا۔ اُس کا اپنا ایک حلقہ احباب تھا۔ وہی اُس کی پیپلز پارٹی تھی اور وہی اُس کی سیاست کا محور تھا۔ باقی اُس کی سیاست جاگیرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کے ساتھ ہوتی

www.bhutto.org

تھی۔اُس کے نزدیک پارٹی کے منشور اور نظریات وغیرہ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اسی طرح ڈاکٹر مبشر حسن بھی صرف اُن لوگوں کو پارٹی کا ورکر تسلیم کرتے تھے جو اُن کے نظریہ تابعداری پر پورے اُترتے تھے۔اِس طریقے سے ملک غلام مصطفےٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن صرف اور صرف حزبِ اقتدار کی سیاست کرتے تھے اور پنجاب کے تمام سیاسی اور غیر سیاسی اقتدار پسند ٹولے اُن کے دھڑے میں شامل ہو گئے تھے۔تمام موقع پرست اُن کے دروازے پر کھڑے رہتے تھے۔چیئرمین بھٹو کی چونکہ تمام کمیونیکیشن ملک غلام مصطفےٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے ساتھ ہوتی تھی۔اُن کی تمام تر مشاورت کا سلسلہ اِن دونوں حضرات کے ساتھ ہی زیادہ رہتا تھا۔لہٰذا چیئرمین بھٹو کی قربت کی وجہ سے اِن دو حضرات کی پارٹی میں اہمیت ضرورت سے زیادہ تھی۔ہر وہ شخص جو پارٹی ٹکٹ یا پارٹی کا کوئی عہدہ چاہتا تھا۔وہ اِن دو حضرات کو ہی اپنا حاجت روا خیال کرتا تھا۔اس طریقے سے یہ دونوں حضرات حکمران رویہ رکھتے تھے۔

اس صورتحال کی وجہ سے لاہور میں دو پیپلز پارٹیاں بن گئی تھیں۔ایک پارٹی تو شیخ محمد رشید صاحب کے 4/A مزنگ روڈ کی پیپلز پارٹی تھی جو چند نظریاتی سیاسی کارکنوں پر مشتمل تھی۔اُن کے مقابلے میں ڈاکٹر صاحب کی پیپلز پارٹی اکثریت میں تھی۔ویسے بھی ڈاکٹر صاحب کی پارٹی کا دھڑا پارٹی کا حکمران دھڑا تھا جس کے سامنے ہم 4/A مزنگ روڈ سے تعلق رکھنے والے سیاسی کارکن ایک روندہ درگاہ قسم کی اقلیت بن کر رہ گئے تھے۔پارٹی کے اندر اِس طرح کی شدید قسم کی تقسیم نے پارٹی کے نظریاتی کردار کو بہت گزند پہنچائی تھی۔پارٹی کی سیاست میں بہت ہی ابتدا میں پارٹی کا کردار تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔پارٹی شخصی دھڑا بندی میں تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی۔پارٹی کی بالائی سطح پر تو ڈاکٹر مبشر حسن کا دھڑا، ملک غلام مصطفےٰ کھر کا دھڑا، حنیف رامے صاحب کا دھڑا قائم تھا اور نچلی سطح پر شیخ محمد رشید صاحب کا دھڑا، ملک معراج خالد کا دھڑا قائم تھا۔اِن دو دھڑوں کے نیچے اُن لوگوں کے وفاداروں کے دھڑے ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر محلے میں قائم ہو گئے۔اِس کے علاوہ جو بات اِن تمام دھڑوں میں ہر سطح پر مشترک تھی، وہ یہ تھی کہ جس کسی ورکر سے اِن دھڑوں کے لیڈروں کا اختلاف ہوتا تھا۔اُس شخص کو یا اُس دھڑے کو اوپر سے لے کر نیچے تک ناپسند کیا جاتا تھا۔اِس پسند اور ناپسند میں کسی ورکر کی اہلیت، قابلیت اور پارٹی کے ساتھ وفاداری یا قربانی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔عوام کی سطح پر چیئرمین بھٹو کے بعد شاید ہی کوئی دوسرا شخص مجھ سے زیادہ فعال ہوتا

www.bhutto.org

تھا۔ مجھے چونکہ ملک غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن ناپسند کرتے تھے۔ اِس وجہ سے اُن کی تنظیموں کے لوگوں کا بھی میرے ساتھ رویہ بے حد غیر سیاسی ہوتا تھا۔ مجھے ملک مصطفیٰ کھر اور افتخار تاری کا رویہ کبھی کبھی یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ جس طرح میں پاکستان پیپلز پارٹی کا ورکر نہیں ہوں۔ پارٹی کی کسی دشمن پارٹی سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہ رویہ نجانے کتنے اور لوگوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہوگا۔ میں تو صرف شیخ محمد رشید صاحب کے دھڑے کے خلاف ہی ان سب لیڈروں کی ناپسندیدگی کا شاہد تھا۔

میرا یقین تھا کہ اس کے علاوہ بھی بے شمار لوگ پارٹی میں اس طرح کے غیر سیاسی رویے اور غیر کامریڈشپ کے رویے کا شکار ہوں گے۔ اور ہر شہر میں شکار تھے، ہر سطح پر شکار تھے۔ افسوس کہ ان لیڈران میں ایک انتہا کا مرض تھا کہ اپنے سے کسی قسم کا سیاسی یا نظریاتی اختلاف رائے رکھنے والے انسان کو پارٹی کارکن ہی تصور نہیں کرتے تھے۔

محترم حنیف رامے صاحب

خواتین وحضرات! آج مورخہ یکم جنوری 2006ء کی رات جناب حنیف رامے انتقال فرما گئے۔ ''اِنَّا لِللّٰہِ وَاِنَّا عَلَیہِ رَاجِعُون'' حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

رامے صاحب ہمیشہ اپنا نام محمد حنیف رامے لکھا کرتے تھے۔ حنیف رامے باقاعدہ عقل و خرد کے انسان تھے اُن کی زندگی کے ہر عہد میں اُن کو دانشور ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک مصوّر تھے۔ مصوّری کے آرٹ میں خطاطی اُن کا خاص مضمون تھا بلکہ وہ ایک جدید خطاط تھے۔ ایک اچھے بامعنی مقرر بھی تھے اور ایک بامقصد ادیب بھی۔ وہ ایک پُر مغز اور بامعنی فرد تھے۔ زندگی کے آخری حصے میں وہ روحانیت کی طرف بہت زیادہ مائل ہو گئے تھے۔ اخبارات و رسائل اور کتاب و ادبیات کی نشرواشاعت اُن کا خاندانی سلسلہ تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے آغاز میں ہی وہ ذہنی طور پر پارٹی سے منسلک ہو گئے تھے۔ اپنی کچھ وقتی مصلحتوں کے تحت کچھ عرصہ پس پردہ رہ کر کام کرتے رہے تھے۔ پارٹی کے تاسیسی اجلاس سے کچھ ہی عرصہ بعد وہ پارٹی سے ابتدائی قائدین جن کو بانی اراکین کہا جا سکتا ہے، اُن میں شمار ہونے لگ گئے تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے نشرواشاعت کے شعبے کی تمام تر ذمہ داری اُن کے کندھوں پر تھی۔

www.bhutto.org

پارٹی کے ابتدائی ایام میں اُنہوں نے اپنے ماہنامہ ''نصرت'' کو ہفت روزہ میں تبدیل کر کے لوگوں کی نظریاتی اور سیاسی تعلیم کا قابل قدر کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کے خلاف اسٹیبلشمنٹ کے چھپنے والے سرکاری اخبارات کے علاوہ جماعت اسلامی اور دیگر رجعت پسند لیڈروں کے جرائد ورسائل کے مقابلے میں اکیلا ہفت روزہ نصرت ہی علم جہاد بلند کئے ہوئے تھا۔ نوجوان نسل میں اسلامی مساوات اور اسلامی سوشلزم کی نظریاتی تعلیم کے پرچار کرنے میں نصرت کا بہت بڑا کردار تھا۔ ہفت روزہ نصرت اپنی صحافت اور سیاست کے اعتبار سے ایک معیاری پرچہ تھا۔ میں خود بھی ہفت روزہ نصرت میں مسلسل لکھنے والوں میں سے ایک تھا۔ ہفت روزہ نصرت کے بعد محترم حنیف رامے صاحب کی کوشش کے سر سہرا تھا کہ اُنہوں نے چیئرمین بھٹو کے ساتھ مل کر روزنامہ مساوات کی بنیاد رکھی۔ مساوات پاکستان پیپلز پارٹی کا سب سے بڑا موثر ہتھیار اور پارٹی آرگن ثابت ہوا تھا۔ پارٹی کے انتخابات کی مہم میں روزنامہ مساوات کا کردار بہت بلند تھا۔ 1970ء کے عہد میں مساوات پاکستان کا سب سے کثیر الاشاعت اخبار ہوتا تھا۔ میں خود بھی مساوات میں لکھنے والے قلمکاروں کے بانیوں میں سے ایک ہوں۔ محترم حنیف رامے صاحب میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں، وہاں اُن کی حسینیت ہونے کی خوبی کے سامنے اُن کی باقی تمام خوبیاں ماند پڑ جایا کرتی تھیں۔ مساوات میں میرے قطعہ تحریر کرنے کا معاوضہ اُنہوں نے دوسو روپے مقرر کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ دوسو روپیہ مجھے یک بار کم ہی ملتا تھا۔ مساوات میں ہماری تنخواہوں میں اضافہ حنیف رامے کے مساوات سے جانے کے بعد ہی ہوا تھا۔ ہر چند میرا تحریر کا سلسلہ کسی معاوضے کیلئے ہرگز نہیں ہوا کرتا تھا۔ میری تحریر کا سلسلہ تو ایک جنون تھا۔ ایک مشن تھا جس میں مال متاع کمانے کی باتیں ہمارے نزدیک ذلت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ میں تو اپنی تمام تحریر وتقریر کو پارٹی اور مساوات کیلئے صدقہ جاریہ ہی تصور کیا کرتا تھا۔ ورنہ بقول اسلم گورداسپوری۔

کون دے سکتا ہے عرفانِ ہنر کی قیمت
کون کر سکتا ہے احساسِ دل و جاں کو فروخت

بہر صورت رامے صاحب ایک پڑھے لکھے شفیق انسان تھے۔ پاکستان کے تقریباً تمام دانشوروں، شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور بڑے بیوروکریٹوں کے ساتھ اُن کی ذاتی دوستیاں

www.bhutto.org

تھیں۔ رائے صاحب بھی صرف حکومت اور اقتدار کی سیاست کرتے تھے۔ زندگی کے کسی معاملے میں کسی قسم کے گھاٹے اور خسارے کا کام وہ بہت کم کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ کچھ لکی بھی ثابت ہوتے ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے تنظیمی اُمور میں، میں نے اُن کی دلچسپی بہت کم دیکھی تھی۔ وہ روایتی قسم کے انقلابی سیاست دانوں یا لیڈروں میں سے ہرگز نہیں تھے جن کا اُٹھنا بیٹھنا سیاسی کارکنوں میں ہوتا تھا۔ اُن کی سیاست کا تعلق کارکنوں سے بالا سطح پر ہوتا تھا۔ وہ کھلی سیاست نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ خفیہ جوڑ توڑ کی سیاست کرتے تھے۔ پارٹی کی سیاست میں اُن کا ٹاکرہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ تھا۔ رائے صاحب کو اپنے علم پر ناز تھا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کو چیئرمین بھٹو کی دوستی پر گھمنڈ تھا۔ لہٰذا ایک طرف رائے صاحب کی خفیہ قسم کی خردکاری تھی۔ دوسری طرف ملک غلام مصطفیٰ کھر کی ناتجربہ کاری تھی، ہوشیاری تھی اور ملتانی قسم کی خالص عیاری تھی۔ چیئرمین بھٹو اپنی سیاست کے معمول کے مطابق اِن دونوں کے درمیان بھی توازن رکھنا چاہتے تھے جو ممکن نہیں تھا۔ اقتدار پر پہلے اِن دو حضرات کے درمیان کسی قسم کے اختلاف پیدا ہونے کی کوئی وجہ تسمیہ ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے کہ جو رائے صاحب کے علم و دانش کا حلقہ تھا، اُس سے ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب کو کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اِسی طرح ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب کے شغل اشغال سے رائے صاحب نابلد اور لاتعلق رہتے تھے۔ لہٰذا دونوں دوست ہوتے تھے۔ اختلافات تو اقتدار کے زمانے میں آکر پیدا ہوئے۔ جب دونوں جانب کے اقتدار پرست طبقوں نے اپنے اپنے کھلاڑیوں کے لئے میدان مارنے کی تحریکیں شروع کر دیں۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کی ٹیم کا کپتان افتخار تاری ہوتا تھا، ان کی ٹیم زور آزمائی زیادہ کرتی تھی، عقل سے کم کام لیتی تھی۔ اُس کے مقابلے میں حنیف رائے صاحب کی ٹیم جس کا کپتان راجہ منور احمد تھا، جو سیاست کے خفیہ کام کرنے کا ماہر انسان تھا۔ اپنے پیچھے اقتدار حاصل کرنے کی بڑی قوتیں رکھتا تھا۔ لہٰذا پاکستان پیپلز پارٹی کے پنجاب کا اقتدار ملک غلام مصطفیٰ کھر کے تاری ازم اور حنیف رائے صاحب کے راجہ منور احمد کے احمدی ازم کا شکار بن کر رہ گیا تھا۔ محترم حنیف رائے صاحب جب اقتدار میں آئے تو اُن کے کسی مشیر نے اُن کو مشورہ دیا کہ پنجاب کے لوگ مونچھ والے حکمران کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ حنیف رائے صاحب کلین شیو ہوا کرتے تھے۔ اُن کی مونچھیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔

ہم نے دیکھا کہ اقتدار کے کچھ ہی وقت کے بعد اُن کے چہرے پر اچھی خاصی مونچھیں اُبھر

www.bhutto.org

آ گئیں۔ افسوس کہ رائے صاحب جیسے زیرک انسان نے اس بات کی طرف دھیان ہی نہ دیا کہ پنجاب کے لوگ اگر صرف مونچھوں والے حاکم کو ہی پسند کرتے ہوتے تو وہ ملک غلام مصطفےٰ کھر کو اقتدار سے علیحدہ کیوں کرتے اور وہ محترم حنیف رائے جیسے بغیر مونچھ کے حکمران کو کیوں پسند کرتے۔ اِن بغیر مونچھ کے رائے صاحب کو پنجاب کا حاکم پسند کرنے میں خود میں پیش پیش تھا۔ لاہور پارٹی کے اجلاس میں ملک غلام مصطفےٰ کھر کی معزولی کے بعد رائے صاحب کے حق میں سب سے پہلی تقریر کرنے والا اسلم گورداسپوری ہی تھا۔ جبکہ دیگر لیڈران اُس وقت بھی رائے صاحب کے حق میں تقریر کرنے سے گریزاں تھے۔ جب ملک غلام مصطفےٰ کھر کو اقتدار سے علیحدہ کردیا گیا تھا یہ میری تقریر کے الفاظ تھے کہ پیپلز پارٹی نے ایک متوسط درجے کے شہر میں رہنے والے دانشور کو اقتدار دے کر پنجاب سے جاگیرداروں کے اقتدار کا خاتمہ کردیا ہے۔ رائے صاحب سے میرے بہت خصوصی تعلقات تھے۔ ملک غلام مصطفےٰ کھر صاحب کی میرے ساتھ بلاوجہ ناراضگی بھی رائے صاحب کے ساتھ میرے تعلقات میں اضافے کا باعث تھی۔ رائے صاحب کا اقتدار جب اپنے پورے شباب پر تھا۔ ایک دن اُنھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور مجھ پر اس بات کا انکشاف کیا کہ بھٹو صاحب تمہارے بہت خلاف ہیں۔ وہ آپ کا نام سننا گوارہ نہیں کرتے۔ میں آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا مگر افسوس کہ بھٹو صاحب کی ناراضگی کی وجہ سے آپ کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ اِس لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ آپ بھٹو صاحب سے اپنے تعلقات ٹھیک کرلیں۔ یہاں پر یہ بات یادرہے کہ بھٹو صاحب ملک غلام مصطفےٰ کھر کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ناراض ہوئے تھے۔ میں نے بھٹو صاحب کو خط تحریر کردیا تھا کہ پنجاب کو آپ ملک غلام مصطفےٰ کھر کے ساتھ اپنی دوستی کی سزا نہ دیں۔ رائے صاحب نے اپنی حکمرانی میں لاہور کے شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور تمام فنکاروں کو اُن کی رہائش کیلئے پلاٹ دینے کا وسیع پیمانے پر منصوبہ بناکر لاہور کے تقریباً تمام شاعروں، صحافیوں، دانشوروں اور فنکاروں کو پلاٹ الاٹ کردیئے تھے۔ اِن پلاٹوں کی تقسیم میں صرف پاکستان پیپلز پارٹی کے ورکروں، شاعروں اور صحافیوں کو پلاٹ دینے کی تخصیص نہیں تھی۔ ایسے تمام صحافیوں کو پلاٹ دیئے گئے تھے جو پاکستان پیپلز پارٹی کے انتہادرجے کے مخالف اور دشمن تھے۔ ایسے تمام شاعر، صحافی، دانشور اور ادیب جن کیلئے لاہور شہر ایک خواب کا درجہ رکھتا تھا، اُن کو گھر بنانے کے لئے زمین دینا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ پارٹی اور خود حنیف

www.bhutto.org

رائے صاحب کے لئے ایک بہت ہی عزت اور وقار کا باعث تھا۔ مگر اُن کی اور کھر کی وزارت کی لڑائی نے اس اعلیٰ ترین کام کو بھی ذاتی سیاست بنا دیا تھا۔ حکمرانی کے لئے سیاسی حمایت حاصل کرنے کی نذر کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ کچھ غنڈوں کو بھی پلاٹ الاٹ کر دیئے گئے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود لاہور میں منو بھائی کی طرح کے دانشوروں کو گھر کیلئے زمین فراہم کرنا پیپلز پارٹی کا قابلِ قدر کارنامہ تھا۔

محترم حنیف رامے صاحب کی اِس لوٹ سیل سے صرف ایک شاعر اور صرف ایک صحافی اور صرف پارٹی کا ایک کارکن باہر رہ گیا تھا۔ جس کو وہ خود شاعرِ عوام کہا کرتے تھے۔ وہ اسلم گورداسپوری تھا جس کا پورے پاکستان میں کسی بھی جگہ کوئی گھر نہیں تھا۔ حنیف رامے صاحب نے پلاٹ الاٹ کرنے کے لئے تین معیار بنائے تھے۔ ایک کسی کا صحافی ہونا معیار تھا۔ دوسرا کسی کا شاعر ہونا معیار تھا، ادیب ہونا معیار تھا۔ تیسرا پارٹی کا کارکن ہونا معیار تھا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق تھا۔ میں ان تینوں معیاروں پر اولیت رکھتا تھا۔ مگر افسوس کہ پارٹی کے ان لیڈروں کے میرے ساتھ پرسنلیٹی کلیش کے نفسیاتی احساسات نے ان کو میرا حریف بنا رکھا تھا۔ یہ لوگ میرے لئے کسی فائدے کا سوچنا اپنا نقصان خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ شخص اگر باوسائل بن گیا تو ان کے لئے خطرناک بن جائے گا۔ پلاٹوں کی بات تو محض تاریخ کے ریکارڈ کے لئے لکھی گئی ہے۔ ورنہ اِس سلسلے میں مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اگر میں نے پلاٹ ہی حاصل کرنے ہوتے تو اِس کے لئے بے شمار مواقع اور بے شمار ذرائع تھے۔ اِس قسم کی چیزیں ہماری قومی سیاست میں بہت آسانی سے دستیاب ہوتی رہی ہیں اور آج بھی ہو رہی ہیں۔

پنجاب میں قادیانی جماعت کا پیپلز پارٹی کی حمایت کا اعلان

پنجاب میں خاص طور پر سیاسی فضا کچھ اِس طرح کی ہو چکی تھی کہ سوائے پاکستان پیپلز پارٹی کے پنجاب میں اور کسی جماعت کا عوامی سطح پر کوئی نام ونشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہر طرف بھٹو ہی بھٹو تھا اور ہر طرف پیپلز پارٹی ہی پیپلز پارٹی تھی۔ قادیانی جماعت پاکستان میں بے حد اثر ورسوخ کی جماعت ہے۔ پاکستان کے ہر بڑے ادارے میں اُن کے لوگ بہت کلیدی عہدوں پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ بے حد باخبر جماعت ہے۔ پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات پر اُن کی بڑی

www.bhutto.org

گہری نظر ہوتی ہے۔ پاکستان کے بارے میں اِن بیرونی طاقتوں کے ساتھ بھی اُن کے رابطے ہوتے ہیں جن کے فیصلوں سے پاکستان میں حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی ہیں۔ اِسی سہولت کی بنا پر یہ جماعت آنے والے واقعات کو دُوسرے لوگوں سے زیادہ سمجھنے کے قابل ہوتی ہے اور اپنے معاملات میں بے حد حساس اور زود فہم جماعت ہے۔ پاکستان کی ہر حکومت کے اقتدار میں اُن کی شرکت لازمی رہی ہے۔ پاکستان کے قیام کی حمایت کا اعزاز بھی اِس جماعت کو حاصل ہے۔ یہ جماعت بہت دُور اندیش جماعت ہے۔ اِس جماعت کی دُور رس نگاہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آنے کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔ لہٰذا اِس جماعت کے امیر نے پاکستان میں چیئرمین بھٹو کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ واضح رہے کہ اِس جماعت کا اعلان کوئی کھلا اعلان نہیں ہوتا، یہ خفیہ اعلان ہوتا ہے اور یہ جماعت اپنے کردار و عمل کے ساتھ اپنی حمایت کا احساس دلایا کرتی ہے۔ اِس جماعت کا کوئی فیصلہ وقتی فیصلہ نہیں ہوتا۔ اِس کے ہر فیصلے کے پیچھے اُس کی منصوبہ بندی کا باقاعدہ نظام موجود ہوتا ہے جو ایک تنظیم کے حوالے سے ایک قابلِ تعریف بات ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حمایت کرنا بھی اِس جماعت کی باقاعدہ منصوبہ بندی کا مرحلہ اور معاملہ تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں احمدی جماعت نے بڑی تیاری کے ساتھ شرکت کی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں اس جماعت کا سب سے بڑا نمائندہ خود محترم حنیف رامے کی ذات تھی۔ حنیف رامے مرزا غالب احمد صاحب کے بہت گہرے دوست تھے۔ مرزا غالب احمد احمدی جماعت کے کلیدی اراکین میں سے تھے اور احمدی جماعت میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ بہت آرٹسٹ مزاج کے دانشور انسان ہیں۔ حنیف رامے صاحب تو باقاعدہ آرٹسٹ اور دانشور بھی تھے۔ لہٰذا دونوں صاحبان کا مزاج بھی ایک تھا۔ میرا خیال ہے کہ احمدی جماعت میں حنیف رامے صاحب کو پسند کیا جانا اُن کی دوستی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ رامے صاحب کے احمدی جماعت کے ساتھ خصوصی تعلقات کا مجھے ذاتی طور پر اُس وقت علم ہوا تھا جب رامے صاحب خصوصی طور پر مرزا طاہر احمد کے ساتھ میری ملاقات کرانے کیلئے مجھے اپنے ساتھ سرکٹ ہاؤس لاہور میں لے کر گئے تھے۔ یہ بات غالباً 1969ء کی ہے۔ رامے صاحب نے مجھے خاص طور پر کہا تھا کہ مرزا طاہر احمد تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ اُن دنوں میں چونکہ شاعر کی حیثیت سے پیپلز پارٹی میں بے حد نمایاں ہوتا تھا۔ ہر جگہ چیئرمین بھٹو کے ساتھ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے پیپلز پارٹی کا بہت اہم کارکن خیال کیا جاتا تھا۔ میں سرکٹ ہاؤس لاہور

www.bhutto.org

جہاں آجکل جنرل پرویز مشرف کی فوجی حکومت نے نیب کی عدالت قائم کر رکھی ہے، وہاں مرزا طاہر احمد صاحب کو رائے صاحب کے ساتھ جا کر ملا۔ میری اُن کے ساتھ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اُن کو میرے ساتھ ملنے میں زیادہ دلچسپی اِس وجہ سے بھی تھی کہ جیسا کہ اُس وقت ظاہر کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے ضلع گورداسپور کی تحصیل بٹالہ میں ہم دونوں کے گاؤں بہت قریب قریب تھے۔ اُن کا شہر نما گاؤں قادیاں میرے گاؤں سات کوہا سے صرف چار کلومیٹر کے فاصلے پر تھا یا اِس سے کچھ زیادہ فاصلے پر ہوگا۔ میرے ننہال کے کافی لوگ احمدی جماعت میں شامل ہو گئے جن میں میری والدہ کا رشتے میں چچا فیض قادر اور میری والدہ کے حقیقی چچا کے بیٹے میجر منظور احمد اور اُن کے بھائی ماموں ظفر اور میری والدہ کے حقیقی خالہ کے بیٹے میجر محمد افضل خان سیکرٹری ریڈ کراس شامل تھے۔

میرے اِن بزرگوں کے احمدی جماعت میں شامل ہونے کا وہ علم رکھتے تھے۔ اُن کے ساتھ میری رشتہ داری کا بھی اُن کو علم تھا۔ اِس ملاقات میں سب سے دلچسپ بات اُن کو یہ بھی یاد تھی کہ میرے اپنے گاؤں سات کوہا میں کوئی ککے زئی خاندان یا اُس کا فرد احمدی جماعت میں شامل نہیں ہوا تھا۔

اس طرح جناب حنیف رامے صاحب کی وجہ سے محترم مرزا طاہر احمد کے ساتھ میرے بہت خصوصی قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ اور وہ میری بہت عزت کیا کرتے تھے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے کہ ہم احمدی پاکستان کی قوت اور طاقت ہیں۔ اُن کے ساتھ میری گنتی کی چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ انتخابات مکمل ہونے کے بعد اُن کے ساتھ دوبارہ میری کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اِس طرح اُن کے ساتھ ملاقات کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو گیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی میں مولانا کوثر نیازی کے ساتھ بھی اُن کے بہت خصوصی تعلقات تھے۔ مولانا کوثر نیازی کا قومی اسمبلی کا انتخابی حلقہ بھی ایسے علاقے میں تھا جہاں احمدی جماعت کے ووٹوں کی تعداد زیادہ تھی اور اُن کے انتخاب کی تمام ذمہ داری احمدی جماعت کے لوگوں پر تھی اور الیکشن کے اخراجات بھی اُنہی لوگوں نے برداشت کئے تھے۔ اِس علاقے کے کچھ صوبائی ٹکٹ ہولڈر بھی احمدی تھے جو انتخابات میں کامیاب ہو کر اسمبلی کے رکن بن گئے تھے۔ اِن کے علاوہ بھی پنجاب میں کئی ایک جگہ احمدی جماعت سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو پارٹی کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ میرے خیال میں پارٹی کا اِن لوگوں کو ٹکٹ دینے کا فیصلہ بے حد درست اور اچھا فیصلہ تھا۔ اِن لوگوں کو ٹکٹ دینے سے پارٹی کی آزاد خیالی کی سیاست اور سیکولر

www.bhutto.org

سیاست کی عوام میں بہت تعریف ہوتی تھی۔ پارٹی کو ایک ترقی پسند خیالات کی پارٹی تصور کیا جانے لگا تھا۔ ایسی پارٹی جو کسی بھی قسم کے مذہبی تعصب سے آزاد پارٹی تھی۔

پاکستان پیپلز پارٹی میں احمدی جماعت کی شرکت اور شمولیت کی وجہ سے پاکستان کے وہ تمام مذہبی حلقے جو ایک سیاسی سٹنٹ کے طور پر احمدیوں کے خلاف اپنی سیاست چمکائے ہوئے تھے، وہ تمام کے تمام پاکستان پیپلز پارٹی کو مذہبی حوالوں سے بدنام کرنے لگ گئے۔ اُن کی اِس تمام بدکلامی اور دشنام طرازی کا ہدف چیئرمین بھٹو کی ذات ہوتی تھی۔ مجھے اِس مسئلے کی نزاکت کا زیادہ احساس نہیں تھا۔ ملتان اور ساہیوال کے درمیان کا کوئی علاقہ تھا۔ وہاں پر کچھ احمدی خاندان زمیندارہ کرتے تھے۔ اُس علاقے میں انتخابی جلسہ تھا۔ اِس جلسے میں مرزا طاہر احمد خود سٹیج پر موجود تھے۔ مرزا صاحب نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اسی دوران چیئرمین بھٹو تشریف لے آئے۔ چیئرمین بھٹو لوگوں کو اپنی تالیوں سے خوش کر کے واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ پروگرام کے مطابق انتخابی اُمیدواروں کا لوگوں کے ساتھ تعارف کا سلسلہ جاری تھا کہ میں نے چیئرمین بھٹو کو کہا کہ مرزا طاہر احمد بھی یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ چیئرمین بھٹو نے ہلکی سی مسکراہٹ سے مرزا طاہر احمد کی طرف دیکھا اور پھر اپنا دھیان لوگوں کی طرف کر لیا۔ جلسے سے دوسرے دن جب ہم لوگ چیئرمین بھٹو کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے تو چیئرمین بھٹو مجھ پر برس پڑے۔ کہنے لگے۔ تمہیں عقل نہیں آنی۔ احمدیوں کی وجہ سے لوگ بے شمار بکواس کر رہے ہیں اور تم ہو کہ جلسے میں مجھے مرزا طاہر احمد کے ساتھ ہاتھ ملانے کا کہہ رہے تھے۔ میں فوراً کہا۔ آئی۔ ایم۔ سوری سر۔ مجھے اِس بات کا احساس نہیں تھا۔ اِس احمدی جماعت کو اقلیت کیوں قرار دے دیا گیا۔ پارٹی کا کردار کیوں تبدیل ہوا، اِس کا ذکر پارٹی کے اقتدار کی سیاست میں آگے چل کر آئے گا۔

احمدی جماعت کی خواہش تھی اور کوشش بھی تھی کہ محمد حنیف رامے کو پنجاب کا چیف منسٹر بنوایا جائے۔ وہ اپنی اِس کوشش میں بذریعہ راجہ منور احمد کے کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ مگر یہ بات بہت عجیب انداز میں دیکھنے میں آئی تھی کہ احمدیوں کو جب اقلیت قرار دیا گیا تو اُس وقت پنجاب کے چیف منسٹر رامے صاحب ہی تھے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار میں احمدی جماعت کو بہت عمل دخل حاصل تھا۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار کا آغاز پنجاب میں ملک غلام مصطفےٰ کھر کی حکومت سے ہوا تھا۔ لہٰذا کھر صاحب کی حکومت کے تمام کاروبار کا انچارج شیخ جاوید الرحمٰن ایڈووکیٹ تھا جو اقتدار

سے پہلے ہی کھر صاحب کے ساتھ وابستہ ہو چکا تھا۔ کھر صاحب کے لکھنے پڑھنے کے تمام معاملات اقتدار سے پہلے ہی شیخ جاوید الرحمٰن ایڈووکیٹ کے ذمہ تھے اور کھر صاحب کے اقتدار میں تو جاوید الرحمٰن کی ذات پنجاب کے اقتدار میں ایک کلیدی حیثیت کی حامل بن گئی تھی۔ جاوید الرحمٰن کی وجہ سے ملک غلام مصطفےٰ کھر کے اقتدار میں بھی احمدی حضرات کو پنجاب کی حکومت میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت میں اُن کو اقلیت قرار دیا جانا اُن کے لئے بہت صدمے کا باعث بن گیا تھا۔

مولانا کوثر نیازی کی پارٹی میں شمولیت

به طواف کعبه کر دی ز حرم ندا برآمد
چه بیرونِ خانه کر دی که درونِ خانه آئی

ترجمہ: میں طوافِ کعبہ کر رہا تھا کہ حرم کے اندر سے یعنی غیب سے آواز آئی کہ تم نے حرم سے باہر کیا کسر چھوڑی تھی کہ اب حرم کے اندر آ گئے ہو۔ تم نے گھر سے باہر کیا کم کی تھی کہ اب گھر کے اندر بھی داخل ہو گئے ہو۔

قارئین مولانا کوثر نیازی سب سے پہلا سکہ بند مولوی تھا جس نے چیئرمین بھٹو کی پارٹی کے تاسیسی اجلاس کی افتتاحی تقریر کے خلاف اخبارات میں ہنگامہ برپا کیا تھا۔ جس تقریر میں چیئرمین بھٹو نے کہا تھا کہ ہمارے رسول پاکؐ دنیا کے پہلے انقلابی اور پہلے سوشلسٹ تھے۔ سوشلزم کا پہلا پتھر رسالت مآبؐ نے دنیا میں رکھا تھا اور دنیا کے تمام انسانوں کو برابر قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ہمارے نبیؐ کے سوشلزم کا نام مساوات محمدی تھا۔ کوئی سوچے کہ کوئی ذی شعور اور صاحب عقل و فہم انسان چیئرمین بھٹو کی ان باتوں سے کسی طرح کا بھی اختلاف کر سکتا ہے؟

مگر حضرات! مولانا کوثر نیازی مرحوم و مغفور وہ انسان تھا جس نے چیئرمین بھٹو کی اِس تقریر کے خلاف اُن پر کفر کا پہلا فتویٰ صادر کیا تھا جو نوائے وقت اخبار کے ریکارڈ میں آج بھی موجود ہے۔ مولانا کوثر نیازی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کا عالم دین تھا۔ اسٹیبلشمنٹ میں اُن کی بھرتی اُس وقت کی گئی تھی جب وہ جماعت اسلامی میں مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے پیروکار تھے۔ جب پاکستان بنا تھا، اُس وقت مولانا مودودیؒ کی جماعت، جماعت اسلامی نظریہ پاکستان اور قیام

پاکستان کے خلاف ہونے کی وجہ سے کئی سالوں تک پاکستان مخالف جماعت تصور کی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اِس جماعت اور اُس کے لیڈر کو پاکستان دشمن قرار دیا کرتی تھی۔ ایک مذہبی جماعت ہونے کی وجہ سے پاکستان کی حکومت کی مذہبی حوالے سے ہر دن دیہاڑے عید اور بکر عید کے مسئلے پر اس کے ساتھ ٹھنی رہتی تھی۔ کشمیر کے مسئلے پر اِس جماعت کے قائد کا پاکستان کے ابتدائی ایام میں ہی شدید اختلاف ہو گیا تھا۔ مولانا مودودیؒ نے جہادِ کشمیر میں مرنے والوں کو نہ صرف غیر جنتی قرار دیا تھا بلکہ اُن کے بارے میں انتہائی قابل اعتراض زبان اور الفاظ استعمال کیے تھے۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ میں مولانا کا گھیرا تنگ کرنے کے لئے جماعت اسلامی میں جس سب سے پہلے انسان کو اپنا ایجنٹ بنایا تھا، وہ مولانا کوثر نیازی تھے جس کو صدر جنرل ایوب خان کے اقتدار میں فوجی حکومت کے ایجنٹ ہونے کے الزام کی وجہ سے جماعت اسلامی سے نکال دیا گیا تھا۔ اس معاملے میں سب سے حیرت کی بات تو یہ ہوئی کہ صدر جنرل ایوب خان کی حکومت ختم ہوتے ہی خود جماعت اسلامی کا امیر مولانا مودودیؒ اور اُن کے رفیق کار طفیل محمد پوری جماعت اسلامی کے لاؤ لشکر کے ساتھ جنرل محمد یحییٰ خان کی حکومت میں نہ صرف شامل ہو گئی تھی بلکہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے دونوں صوبوں میں اسٹیبلشمنٹ کے ہراول دستے کے طور پر کام کرنے لگ گئی تھی جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری و ساری ہے۔

ہم مولانا کوثر نیازی کی پیپلز پارٹی میں شمولیت کی بات کر رہے تھے۔ یہ بات میں نے پاکستان کی سیاست میں مستقل طور پر ایک تسلسل کے ساتھ دیکھی ہے کہ پاکستان میں جب بھی کوئی نئی سیاسی پارٹی وجود میں آتی ہے۔ پاکستان کے خفیہ ادارے فوری طور پر مخبروں کو اور ایجنٹوں کو اِس جماعت میں شامل ہونے کا اشارہ کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے خفیہ ادارے اس کام میں بے حد ماہر ہو چکے ہیں۔ یہ ادارے اور یہ ایجنسیاں اپنے لوگوں کے لئے ایسے ذریعے پیدا کر لیتی ہیں کہ کوئی انسان اِن کے لوگوں کو کسی بھی سیاسی یا مذہبی جماعت میں شامل ہونے سے روک نہیں سکتا۔ مولانا کوثر نیازی جب پیپلز پارٹی میں شامل ہوا تھا، اُس وقت محترم حنیف رامے اور ڈاکٹر مبشر حسن دونوں مولانا کی شمولیت کے حق میں تھے۔ مولانا کوثر نیازی کی جب پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کی افواہ گرم تھی۔ میں نے حنیف رامے سے کہا تھا کہ رامے صاحب! کل تک یہ شخص پیپلز پارٹی کو کافر پارٹی کہہ رہا تھا۔ پارٹی کے منشور کو خلاف اسلام قرار دے رہا تھا۔ آج ہم اس

www.bhutto.org

شخص کو پارٹی میں شامل کر رہے ہیں۔ رائے صاحب نے مجھے کہا۔ برادرم! ہمیں مولویوں کے توڑ کے لئے کسی مولوی کی ضرورت ہے۔ کسی بھی مولوی کے فتوے کا جواب مولوی ہی دے سکتا ہے۔ ہم اور تم نہیں دے سکتے۔ خفیہ اداروں کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے مولانا کوثر نیازی کو پیپلز پارٹی میں شامل کرنے کے لئے بڑی سنسنی خیزی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ مولانا کوثر نیازی کی آمد کے وقت آغا شورش کشمیری خفیہ اداروں کے اشاروں پر پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کے خلاف اپنے دائمی کاروبار اور اپنے معمول کے مطابق اعلان جہاد کر چکا تھا۔ ہماری پارٹی کے خلاف آغا کی آواز سب سے بلند تھی۔ خفیہ والوں نے مولانا کو پیپلز پارٹی میں آغا شورش کا نام نہاد مدمقابل بنانے کے لئے دونوں کی جعلی نورا کشتی کرادی۔ نورا کشتی کا یہ واقعہ یوں پیش آیا جیسا کہ ایک چشم دید گواہ نے جس کی ٹولینٹل مارکیٹ مال روڈ پر کتابوں اور رسالوں کی دوکان تھی، ہم کو بتایا تھا۔ پہلے آغا شورش کشمیری ٹولینٹل مارکیٹ کی طرف کافی ہاؤس کی طرف سے پیدل آئے اور وہ ٹولینٹل مارکیٹ کے ایک بڑے اسٹور کے اندر داخل ہو گیا۔ اب اس کے تھوڑی دیر بعد مولانا کوثر نیازی ایک سفید گاڑی سے اُتر کر اِس اسٹور میں داخل ہو گیا۔ کوثر نیازی کے پہنچتے ہی کچھ کیمرہ مین وہاں پہنچ گئے۔ اور کچھ ہی دیر میں آغا شورش کشمیری کی گرج دار آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ دوسری جانب سے مولانا کوثر نیازی کی آواز بھی بلند ہو گئی۔ دونوں پہلے تو ایک دوسرے کی طرف چھوٹے چھوٹے ڈبے اُٹھا کر پھینکتے رہے اور بالآخر ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو تھپڑ وغیرہ بالکل نہیں مار رہے تھے۔ ایک دوسرے کے کپڑے پھاڑ رہے تھے۔ آغا شورش کشمیری کا قد اور ہاتھ زیادہ لمبے تھے۔ اُس نے مولانا کوثر نیازی کا کرتا پھاڑ دیا۔ اتنے میں کئی لوگ درمیان میں آ گئے۔ کیمرہ مینوں نے اس تمام لڑائی کی تصویریں بنالیں۔ لوگوں نے بیچ میں پڑ کر اس جنگ کا خاتمہ کروایا۔ آغا شورش کشمیری واپس کافی ہاؤس کی طرف چلا گیا اور مولانا کے ساتھ آنے والے لوگ مولانا کو بینک اسکوئر مال روڈ کی طرف لے گئے۔ یہاں پر ایک دوسرا اتفاق ملاحظہ فرمائیں کہ عین اُس وقت مال روڈ پر پاکستان پیپلز پارٹی کا جلوس آ رہا تھا جس میں مزدور تنظیمیں اور طالب علم تنظیمیں اور وکلاء حضرات شامل تھے۔ کچھ لوگ مولانا کوثر نیازی کو گریباں چاک اور دریدہ دامنی کی حالت میں کوثر نیازی زندہ باد اور شورش کشمیری مردہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس کے آگے لے آئے۔ لوگوں نے جب مولانا کوثر نیازی کو قیس آمری کی شکل میں دیکھا تو جلوس میں شامل

www.bhutto.org

لیڈر حضرات بے حد جذباتی ہو گئے۔ اُنہوں نے مولانا کو جیپ پر اُٹھا کر کھڑا کر دیا۔ مولانا کوثر نیازی جو فن تقریر میں ایک مشاق مقرر تھا۔ وہ اپنی لفظ گری میں کمال کر سکتا تھا۔ ایک مولویانہ اندازِ خطاب میں، میں نے اُس سے اچھا خطیب کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے اپنی تقریر کا آغاز کر دیا۔ میرے لئے یہ اُن کی پہلی تقریر تھی۔

مولانا اپنی تقریر میں گویا ہوئے۔ حضرات! آج آپ مجھے گریباں چاک دیکھ رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں یہ میرا گریباں کس نے چاک کیا ہے۔ حضرات! یہ میرا گریباں اُس نے چاک کیا ہے جس کا گریباں ہی نہیں ہے۔ آج آپ دیکھ رہے ہیں میں آپ کے سامنے برہنہ سر ہوں، ننگے سر ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا سر ننگا کس نے کیا ہے۔ میرا سر ننگا اُس نے کیا ہے جو ننگے سر ہے۔ جس نے اپنے سر پر کبھی عزت کی ٹوپی نہیں پہنی۔ وہ اُس بازار کا صحافی ہے۔ وہ جسم زدہ ہے۔ شوراپست ہے۔ میں آج اِس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ آج سے میں بھٹو کا سپاہی ہوں۔ آج سے میں پیپلز پارٹی کا کارکن ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ شورش کشمیری کس طرح بھٹو پر کیچڑ اُچھالتا ہے۔ اب میں دیکھوں گا کہ یہ پیپلز پارٹی کو گالی کس طرح دیتا ہے۔ میں اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ آج سے کوثر نیازی نے سوشلزم قبول کر لیا ہے۔ آج کوثر نیازی محنت کشوں کا کوثر نیازی ہے۔

جلوس میں شامل پیپلز پارٹی کے لوگ تو پہلے ہی شورش کشمیری کے خلاف بھرے پڑے تھے۔ وہ مولوی کی باتوں سے مشتعل ہو گئے۔ آغا شورش کو گالیاں دینے لگ گئے، مولوی کو زندہ باد کہنے لگ گئے۔ ہر طرف مولوی مولوی ہو گئی۔ قارئین آپ نے ملاحظہ کیا کہ خفیہ اداروں نے مولانا کوثر نیازی کو کس طریقے کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل کرانے کا ڈرامہ سٹیج کیا۔

آغا شورش کشمیری اور مولانا کوثر نیازی دونوں اُس وقت اچھی خاصی عمر کے لوگ تھے۔ کوئی سوچے کہ یہ عمر کیا اِن دونوں حضرات کی ہاتھا پائی کی عمر تھی۔ بقول مرزا غالبؔ ؎

ناطقہ سر بہ گریبان کہ اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے

اس واقعہ کے دو تین دن بعد چیئر مین بھٹو لاہور تشریف لائے تو شیخ صفدر علی صاحب مولانا کوثر نیازی کو اپنے ساتھ لے کر فلیٹیز ہوٹل آئے۔ مولانا نے چیئر مین بھٹو کو شورش کشمیری کے ساتھ

www.bhutto.org

اپنی جنگ ٹولینٹل مارکیٹ کا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ چیئرمین بھٹو نے بہت ہی توجہ کے ساتھ مولانا کا قصہ سنا۔ یہ قصہ سنتے ہی چیئرمین بھٹو مولانا پر بہت مہربان ہو گئے۔ اُنہوں نے مولانا کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ آپ کو ہم بہت عزت دیں گے مولانا۔ آپ پارٹی میں کام کریں۔ میں ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہوں۔

اسی دن میرا مولانا کوثر نیازی کے ساتھ پہلی مرتبہ بھٹو صاحب کے کمرے میں ہی تعارف ہوا تھا۔ اِس سے پہلے میں اُن کو جانتا تو تھا مگر اُن سے واقف نہیں تھا۔ مولانا نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے میری شاعری کی تعریف کرنا شروع کر دی۔ کہا کہ یہ تو آپ لوگوں کی آواز ہیں۔ مگر افسوس کہ مولانا کوثر نیازی کے ساتھ پارٹی میں میری کبھی ذہنی اکویشن یا ذہنی ہم آہنگی نہ پیدا ہو سکی۔ مولوی نے اپنے اقتدار میں سب سے زیادہ مجھے نقصان پہنچایا تھا۔ لوگوں کے ساتھ تو اس کا جھگڑا سیاست کا تھا مگر میرے ساتھ مولوی کے کئی جھگڑے تھے۔ مولوی خود کو ایک بڑا شاعر خیال کرتا تھا۔ جبکہ میں اس کو ایک معمولی نوعیت کا شاعر سمجھتا تھا۔ تیسرا خطرناک ترین اختلاف مولوی کا مجھے لادین خیال کرنا تھا۔ حالانکہ وہ ایمان کے معاملے میں میرے مقابلے میں بہت کمزور انسان تھا۔ میں جو بھی تھا مگر میں منافق نہیں تھا۔ مگر مولوی سر سے لے کر پاؤں تک منافق انسان تھا۔ اور بڑے غیر انسانی خصائل کا آدمی تھا۔

شہید چیئرمین بھٹو کو اس شخص کے قرب کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ پارٹی کے اقتدار کے باب میں مولوی کے کردار پر تاریخ کے حوالے سے مفصل بات کی جائے گی۔

میاں محمود علی قصوری کی پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت

میاں محمود علی قصوری بڑے نامور قانون دان تھے۔ قانون کے پیشے میں وہ پاکستان کے چند چوٹی کے قانون دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ وکالت کے علاوہ اُن کو پاکستان میں انسانی حقوق کا علمبردار بھی خیال کیا جاتا تھا۔ بہت وجیہہ اور بلند آہنگ انسان تھے۔ وکالت میں اپنی قابلیت اور شہرت کی وجہ سے وہ انتہائی مصروف ترین انسان تھے۔ اُن کی مصروفیات کی وجہ سے لوگ اُن کو دولت کمانے کی مشین کہا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے بیٹے اور اُن کے جونیئر اُن کو قومی سیاست کی گہما گہمی سے دور رکھنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اُن کو عملی سیاست میں بہت کم حصہ لینے

www.bhutto.org

دیا کرتے تھے۔میاں صاحب کی سیاست کا آغاز آزاد پاکستان پارٹی اور خان عبدالغفار خان اور ولی خان کی عوامی نیشنل پارٹی سے ہوا تھا۔اِس پارٹی کو پنجاب میں حکمران طبقوں نے پاکستان کے خلاف پارٹی قرار دے رکھا تھا اور اِس پارٹی کو ہندوستان اور روسی ایجنٹ خیال کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے اِس پارٹی میں شامل ہونے والے لوگوں کو پنجاب میں بڑی مشکل پیش آیا کرتی تھی۔میاں محمود علی قصوری اِن لوگوں میں سب سے ٹاپ پر تھے۔ایک وقت ایسا آیا کہ اِس پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ایک حصہ تو بدستور ولی خان ہی کی قیادت میں متحدہ رہا مگر دوسرا حصہ مولانا بھاشانی کی قیادت میں کام کرنے لگ گیا۔اِس حصے کی اکثریت مشرقی پاکستان کے لوگوں کی تھی۔میاں محمود علی قصوری کے چیئرمین بھٹو کے ساتھ بہت خصوصی تعلقات تھے۔چیئرمین بھٹو کے مقدمے کی پیروی بھی میاں محمود علی قصوری نے ہی کی تھی۔1970ء میں چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی عوام میں جو مقبولیت کی لہر اُٹھی تھی۔اِس سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ پیپلز پارٹی آنے والے انتخابات میں سب سے بازی لے جائے گی۔

میاں محمود علی قصوری اور اُن کے ساتھیوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی اور چیئرمین بھٹو کی عوامی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔اِن لوگوں کا یہ فیصلہ بے حد سیاسی اور صحیح فیصلہ تھا۔خود چیئرمین بھٹو کی بھی یہ خواہش تھی کہ پنجاب میں کوئی بڑا سیاست دان پیپلز پارٹی میں شامل ہو۔لہٰذا میاں محمود علی قصوری کے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے سے پیپلز پارٹی کے تشخص میں اضافہ ہوا تھا۔

پیپلز پارٹی میں اُن کی آمد سے کچھ لوگوں کے ذہنوں کا یہ تاثر ختم ہو گیا تھا کہ یہ نئے لوگوں کی پارٹی ہے،جس میں چیئرمین بھٹو کے نام کے علاوہ کوئی قابل ذکر نام ہی نہیں ہے۔میاں محمود قصوری اور اُن کے ساتھ پارٹی میں آنے والے دوسرے لوگوں کا پنجاب کی لیفٹ کی سیاست میں ایک نام بھی تھا اور مقام بھی تھا۔ان لوگوں کے پیپلز پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کی پارٹی ہونے کے تصور کو بہت تقویت ملی تھی۔

میاں محمود علی قصوری کے ساتھ پیپلز پارٹی میں آنے والے اُن کے ساتھیوں کو اچھی خاصی تعداد میں پارٹی کے ٹکٹ دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے خاص طور پر پنجاب اسمبلی میں ترقی پسند سوچ کے اراکین اسمبلی کا اسمبلی میں پہنچنا ممکن ہوا تھا۔پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بائیں بازو

www.bhutto.org

کی ترقی پسند سوچ اور شہرت رکھنے والے ایک سیاسی کارکن شیخ محمد رفیق کو پنجاب اسمبلی کا سپیکر بنایا گیا تھا جو پیپلز پارٹی کا ایک انقلابی کارنامہ تھا۔ اس کے علاوہ شیر محمد بھٹی کو ڈاکٹر مبشر حسن کے بعد لاہور پیپلز پارٹی کا صدر بنایا گیا تھا۔ شیر محمد بھٹی کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ بھی دیا گیا تھا مگر وہ انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ اُن کے علاوہ گوجرانوالہ میں میاں اسماعیل ضیا کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔ گجرات میں کاکو شاہ کو اسمبلی کا رکن بنوا دیا گیا تھا۔ لاہور میں رؤف طاہر کو پنجاب اسمبلی کا ممبر بنوایا گیا تھا۔ اِن دوستوں کے علاوہ بھی شاید پنجاب میں کچھ اور لوگوں کو پارٹی ٹکٹ دیئے گئے ہوں گے جن کے میں نام نہیں جانتا۔ خود میاں محمود علی قصوری صاحب کو بھٹو صاحب کی جیتی ہوئی قومی اسمبلی کی نشست سے قومی اسمبلی کا ممبر منتخب کروایا گیا تھا۔ اِس طرح میاں صاحب اپنی زندگی میں پہلی بار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ میاں صاحب کو پاکستان پیپلز پارٹی کے اقتدار میں پاکستان کا وزیر قانون بنایا گیا تھا۔ اِس طریقے کے ساتھ میاں صاحب اور اُن کے ساتھیوں کی پیپلز پارٹی میں آمد کی بڑے کھلے دل سے پذیرائی کی گئی تھی۔ لاہور میں شیخ رفیق احمد اور رؤف طاہر کو ٹکٹ دینے پر شیخ محمد رشید کے گروپ کے کچھ لوگوں کو اعتراض پیدا ہوا تھا جس کی وجہ سے ضیاء الدین بٹ اور امان اللہ خان وغیرہ نے میاں محمود علی قصوری کے گھر کے سامنے بھوک ہڑتال کر دی تھی۔ اُن کی اِس ہڑتال کو چیئر مین بھٹو نے سخت ناپسند کیا تھا۔ اُنہوں نے شیخ محمد رشید اور مجھے اُن کی ہڑتال ختم کرانے کا کہا تھا۔ شیخ صاحب نے اور میں نے ضیاء الدین بٹ کی اور امان اللہ خان کی بھوک ہڑتال ختم کرا دی تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کا کہنا تھا کہ شیخ محمد رشید صاحب میاں محمود علی قصوری کے پیپلز پارٹی میں آنے سے خوش نہیں ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہوئی کہ میاں محمود علی قصوری کے ساتھ باقی تمام ان کے ساتھی ورکر جو پیپلز پارٹی میں آئے تھے وہ تمام کے تمام پیپلز پارٹی کا حصہ بن گئے تھے، پیپلز پارٹی بن گئے تھے۔ مگر ان لوگوں کے قائد میاں محمود علی قصوری بہت مختصر وقت میں بڑی عجلت کے ساتھ پیپلز پارٹی چھوڑ کر واپس خان عبدالولی خان کے ساتھ جا ملے تھے۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد وہ فوج کے بنائے ہوئے لیڈر رائیر مارشل اصغر خان کی بھٹو دشمنی کی سیاست میں ملوث ہو گئے تھے۔ تحریک استقلال میں شامل ہو گئے تھے۔ بھٹو دشمنی میں ان کے لئے لیفٹ اور رائٹ سب سوشلزم تھا۔

پیپلز پارٹی سے ان کی علیحدگی پاکستان کا آئین بنانے کے باب میں آگے پڑھنے کو ملے گی۔

1970ء کے انتخابات میں فوج کا منصوبہ کیا تھا؟

تمام لوگ 1970ء کے انتخابات کو بڑے صاف شفاف اور جمہوری انتخابات خیال کرتے ہیں۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ لوگوں کے ووٹ ڈالنے کی حد تک تو یہ انتخابات صاف شفاف تھے۔ انتخابات کے نتائج کی گنتی کے اعتبار سے بھی یہ انتخابات صاف شفاف تھے۔ مگر جنرل محمد یحییٰ خان اور اُس کے فوجی جنتا کی منصوبہ بندی کچھ اِس سے مختلف تھی۔ وہ منصوبہ بندی یوں تھی کہ انتخابات میں خاص طور پر مغربی پاکستان میں سیاسی جماعتوں کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے انتخابات میں لوگوں کو کامیاب کروایا جائے۔ کسی ایک جماعت کو اکثریت حاصل نہ کرنے دی جائے۔ فوج کی یہی وہ منصوبہ بندی تھی جس کے تحت فوج چیئر مین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کو انتخابات میں ہر قیمت پر ہرانا چاہتی تھی۔ مغربی پاکستان میں فوج نے ایجنسیوں کی کاروائی سے مغربی پاکستان کی تمام سیاسی اور مذہبی جماعتوں اور تنظیموں کو پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف صف آراء کر دیا تھا۔ یہ تمام تنظیمیں اور جماعتیں پاکستان پیپلز پارٹی کو صرف ہرانا ہی نہیں چاہتی تھیں، صفحۂ ہستی سے ہی مٹا دینا چاہتی تھیں۔

مغربی پاکستان میں تمام نامی گرامی سیاست دان ایسے سیاست دان جن کا شمار پاکستان بنانے والے سیاست دانوں میں ہوتا تھا۔ جو خود کو پاکستان کے خالق تصور کرتے تھے۔ میاں ممتاز احمد دولتانہ وغیرہ یا مسلم لیگ کے باقی بڑے بڑے جغادری لیڈر۔ وہ تمام چیئر مین بھٹو اور پیپلز پارٹی کے خلاف انتخابات کی جنگ لڑ رہے تھے۔ مغربی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں پیپلز پارٹی کے خلاف لڑ رہی تھیں۔ اِس کے علاوہ مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی جو ایک انتہا درجے کی منظم مذہبی تنظیم تھی، اُس کے لیڈر مولانا مودودیؒ نے انتخابات کی جنگ کو کفر اور اسلام کی جنگ بنا دیا تھا۔ یہ جماعت کھلم کھلا چیئر مین بھٹو کو اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو کافر قرار دیتی تھی اور اُن کو قتل کرنا اسلام کی فتح قرار دیتی تھی۔ خود جنرل یحییٰ خان کی حکومت اس کی پشت پناہ تھی۔

ہر شہر میں انتظامیہ اِس جماعت کے لٹھ بردار لشکر کی حفاظت اور اعانت کرتی تھی۔ دن کی روشنی میں چیئر مین بھٹو کی ذات پر قتل کے حملے کرتی تھی اور حکومت کی طرف سے اِس جماعت کے کسی کارکن کو گرفتار نہیں کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اِس جماعت نے خود قرآن پاک جلانے کا ڈرامہ رچا کر حکومت کی سازش کے تحت پیپلز پارٹی کے قتل عام کا منصوبہ بنایا تھا۔

www.bhutto.org

لاہور میں قرآن پاک جلانے کا جعلی واقعہ

لاہور میں قرآن پاک جلانے کے جعلی واقعات سے ہی جنرل یحییٰ خان کی حکومت اور اُس کی اتحادی جماعت جماعت اسلامی کی چیئرمین بھٹو اور پیپلز پارٹی کی دشمنی کی انتہا کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ ایک خوفناک واقعہ ہی اِس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کافی تھا کہ حکومت چیئرمین بھٹو کو ہر قیمت پر انتخابات سے باہر رکھنا چاہتی تھی۔ جماعت اسلامی کی قرآن پاک جلانے کے واقعے یا اپنی اِس حرکت کو کسی اعتبار سے کوئی سازش یا غلط کام تصور نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنی اِس حرکت کو دین کی خدمت خیال کرتی تھی۔

جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودیؒ کا فلسفہ یہ تھا کہ غیر اسلامی قوتوں یا لوگوں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی فریب کاری اور ہر طرح کا جھوٹ جائز ہوتا ہے۔ پیپلز پارٹی کو وہ باقاعدہ غیر اسلامی پارٹی قرار دیتے تھے اور اِس جماعت سے تعلق رکھنے والے ہر انسان کو کافر قرار دیتے تھے اور اُن کے قتل عام کو اسلام کی رو سے جائز خیال کرتے تھے۔

جماعت اسلامی کے پیروکاروں نے اپنے لیڈر کی اِس سوچ اور فکر کو عملی جامہ پہنانے کیلئے خود لاہور میں قرآن پاک پر استری رکھ کر قرآن پاک کی بے حرمتی کی اور شہر میں گاڑیوں پر لاؤڈ سپیکر لگا کر اعلانات شروع کر دیئے کہ پیپلز پارٹی نے قرآن پاک جلا دیا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ پیپلز پارٹی کے لوگوں کے گھر جلا کر اور اُن کی گردنیں اُڑا کر قرآن پاک کی بے حرمتی کا انتقام لیں۔ جماعت اسلامی نے لاہور میں پیپلز پارٹی کے دفتر پر مسلح حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے جماعت کے حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر تیاری کی تھی۔ حکومت کی خفیہ ایجنسیوں کو جب اِس تیاری کا علم ہو گیا تو اُنہوں نے جماعت اسلامی کو حملہ کرنے سے منع کر دیا تھا۔

جماعت اسلامی اور حکومت کی سازش یہ تھی

جماعت اسلامی اور جنرل یحییٰ خان کی اسٹیبلشمنٹ کی سازش یہ تھی کہ لاہور شہر میں قرآن پاک کی بے حرمتی کا بہانہ بنا کر لوگوں کو مشتعل کر دیا جائے۔ لوگ اپنی عقیدت کے اندھے پن سے ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے لگ جائیں۔ شہر میں خانہ جنگی برپا کر دی جائے۔ پیپلز پارٹی کو خلاف اسلام قرار

www.bhutto.org

دے دیا جائے گا اور اُس کو انتخابات سے باہر کرنے کے لئے اسٹیبلشمنٹ کا راستہ صاف کر دیا جائے۔

خود میری حماقت ملاحظہ کریں

خود ہم پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے بھی جماعت اسلامی کا مقابلہ کرنے کو اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ تصور کر لیا تھا۔ میں ریگل چوک مال روڈ کے قریب لارڈ ہوٹل کے سامنے چند لوگوں کے ساتھ کھڑا تھا کہ جماعت اسلامی کی اعلان کرنے والی ایک گاڑی وہاں آگئی۔ اِس گاڑی میں جماعت اسلامی کے تین ورکر سوار تھے۔ وہ لاؤڈ سپیکر پر قرآن پاک جلانے کے واقعے کا اعلان کرنے لگ گئے۔ میری بے وقوفی کی انتہا ملاحظہ ہو کہ میں طیش میں آ گیا۔ میں نے مال روڈ کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر جماعت اسلامی کے خلاف تقریر کرنا شروع کر دی۔ چند ہی لمحوں میں میرے اردگرد لوگوں کا مجمع لگ گیا۔

میں نے اپنی شعلہ بیانی سے جماعت اسلامی پر انگارے برسانا شروع کر دیئے۔ لوگ میری تقریر سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ لوگوں نے جماعت اسلامی کی گاڑی کا گھیراؤ کر لیا۔ لوگوں نے جماعت اسلامی کی گاڑی کا ابھی گھیراؤ کیا ہی تھا کہ پولیس کی گاڑی ایک دم وہاں آ گئی۔ گویا یہ پولیس کی گاڑی جماعت اسلامی کی اعلان کرنے والی گاڑی کی حفاظت کر رہی تھی۔ اُس نے آتے ہی تمام لوگوں کو گاڑی سے دور ہٹانا شروع کر دیا اور جماعت اسلامی کے لڑکوں کو ان کی گاڑی سمیت وہاں سے بھگا کر لے گئے۔ میری یہ جرأت وہاں کھڑے لوگوں کو بہت پسند آئی۔ سڑک پر کھڑا ہو کر ہر انسان بلند آواز میں کہنے لگ گیا کہ قرآن اُنہوں نے خود ہی جلایا ہے۔ پیپلز پارٹی والو! فکر نہ کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ مجھے مال روڈ سے پولیس والے گاڑی میں بیٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے اور ہائی کورٹ کے چوک میں جا کر مجھے گاڑی سے نیچے اُتار کر کہنے لگے۔ ''اوئے پاگلا کسے دن جماعت والیاں دے ہتھ نا آجائیں۔ اوناں دے سر تے پیپلز پارٹی والیاں نوں قتل کرن دا بھوت سوار ہویا ہویا اے۔''

فوج کا اصل منصوبہ خان عبدالقیوم خان کو پاکستان کا طفیلی وزیر اعظم بنانا تھا

پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ یا یحییٰ خان کی فوجی جنتا نے پاکستان میں اپنی روایت کے مطابق

خان عبدالقیوم خان کی سرکردگی میں قیوم مسلم لیگ کے نام پر اپنی ایک کنگز پارٹی بنائی تھی۔ اِس فوجی پارٹی میں مغربی پاکستان کے اپنے تمام ایجنٹوں اور دلالوں کو شامل کروایا تھا۔ سندھ میں جی۔ ایچ۔ کیو کا مشہور و معروف ایجنٹ حُروں کا روحانی پیشوا پیر پگاڑا اِس قیوم لیگ کا سربراہ بنادیا گیا تھا اور قیوم لیگ کو بھاری سرمایہ دے کر انتخابات کے میدان میں اُتارا گیا تھا۔

حضرات! ایسا ہرگز نہیں تھا کہ فوج کو مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی مقبولیت کا علم نہیں تھا۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کی طاقت اور مقبولیت کو اچھی طرح جانتی تھی۔ فوج اپنی طاقت کے گھمنڈ میں شیخ مجیب الرحمٰن کو کسی خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن اپنے اقتدار کے لئے اُن کا محتاج بن جائے گا اور اُن کے اشاروں پر چلنا شروع کردے گا۔ جس طرح کہ مشرقی پاکستان کے دوسرے سیاسی لیڈر مولانا بھاشانی یا نورالامین وغیرہ یا اس طرح کے کچھ دوسرے لیڈر فوج کے ایجنٹ بن جایا کرتے تھے۔ فوج کا خیال تھا کہ انتخابات کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن اور خان عبدالقیوم خان کا حکومتی اتحاد بنادیا جائے گا۔ شیخ مجیب الرحمٰن پر اگرتلہ سازش کیس کی طرح کے کئی مقدمے قائم تھے جن کو غداری کے مقدمے کہا جاتا تھا۔ جن کو فوج نے وقتی طور پر التواء میں ڈال رکھا تھا۔ فوج کا خیال تھا کہ شیخ اپنے سر پر غداری کے مقدمے کی لٹکتی تلوار کی وجہ سے اُن کی ہر بات تسلیم کرنے کو تیار ہوجائے گا۔ فوج کے منصوبے کے مطابق سب سے پہلی فوج کی ترجیح یہ تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے اقتدار کو صرف مشرقی پاکستان تک ہی محدود رکھا جائے گا۔ اس لئے کہ شیخ مجیب الرحمٰن صرف مشرقی پاکستان میں ہی مقبول ہے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ مشرقی پاکستان کا چیف منسٹر بنادیا جائے گا۔ خان عبدالقیوم خان کا شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اتحاد کرواکر خان عبدالقیوم خان کو پاکستان کا وزیر اعظم بنادیا جائے گا اور خود فوج پاکستان کے اصل اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھے گی اور ایوب خان کی طرح پردے کے پیچھے بیٹھ کر ملک پر حکومت کرے گی۔

اگر فوج کو شیخ مجیب الرحمٰن کو وقتی طور پر پاکستان کا وزیر اعظم بھی بنانا پڑا تو وہ ایک برائے نام قسم کا وزیر اعظم بنادیا جائے گا۔ حکومت میں اُن کا اصل نمائندہ خان عبدالقیوم خان ہی ہوگا۔ جس کو بصورت دیگر مغربی پاکستان میں حکومت بنانے کے لئے آگے کردیا جائے گا۔ یہ وہ انتہائی قسم کی واحیات اور احمقانہ منصوبہ بندی تھی جس پر عمل کرانے کے لئے فوجی حکومت چیئرمین بھٹو کی دشمن ہوگئی تھی۔ یحییٰ خان کی فوجی حکومت کو اپنی منصوبہ بندی کے راستے میں صرف اور صرف چیئرمین بھٹو

www.bhutto.org

کی ذات ہی نظر آتی تھی۔ جس کو وہ ہر قیمت پر اپنے راستے سے ہٹانا چاہتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ چیئرمین بھٹو نے اپنی دانشمندی، اپنی ذاتی جرات اور اپنی شہرت کی طاقت اور عوام کی قوت کی یلغار سے مغربی پاکستان میں فوجی جنتا اور اِس قسم کی تمام اتحادی قوتوں کی صفوں کو روند کر رکھ دیا تھا۔ اُنہوں نے ہر قدم پر فوجی جنتا کی سیاسی اور غیر سیاسی قوتوں کی لشکر کشی کا مقابلہ کیا اور ہر مقام پر اُس کو شکستِ فاش سے دوچار کر دیا تھا۔

1970ء کے انتخابات کو چیئرمین بھٹو نے ایک سیاسی اور معاشی انقلاب بنادیا

چیئرمین بھٹو کی معاملہ فہمی اور سیاسی بصیرت کے بارے میں کوئی غلط انسان ہی انکار کر سکتا ہے۔ کوئی صحیح الدماغ انسان چیئرمین بھٹو کی سیاسی فہم و فراست کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے اپنی شہرت کی بنا پر انتخابات کا میدان مارا تھا۔ لوگوں کی یہ سوچ بالکل غلط تھی۔ کیا انتخابات سے پہلے جب ایوب خان کے خلاف تحریک چل رہی تھی، ائیر مارشل اصغر خان کم شہرت رکھتا تھا۔ میں نے تحریک کے دوران آغاز میں اصغر خان کی ریلیاں اور جلسے خود دیکھے تھے۔ وہ کسی اعتبار سے بھی چیئرمین بھٹو کے جلسوں سے کم نہیں ہوتے تھے۔ اصغر خان کی اسی شہرت کے بل پر ہی اسٹیبلشمنٹ نے اصغر خان کو چیئرمین بھٹو کے مقابلے میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

اصل بات یہ تھی کہ ائیر مارشل اصغر خان یا دوسرے پرانے جغادری لیڈروں کے پاس زندگی کا کوئی فلسفہ موجود نہیں تھا۔ وہ اپنی ذات کے تشخص کو ہی عوام کیلئے سب سے اہم خیال کرتے تھے۔ اُن کی سیاست میں لوگوں کی محرومیوں کا کچھ ازالہ ہی نہیں تھا۔ لوگوں کی غربت پاکستان کے استحصالی طبقوں کو یعنی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو اپنا قاتل قرار دیتی تھی۔ یہ تمام اِن طبقوں کے نمائندہ تھے۔ اِن طبقوں کی سیاست کرتے تھے۔ اِن کے مفادات کے محافظ تھے۔ یہ تمام رجعت پسند سرمایہ دار اور جاگیردار طبقے کے لیڈر لوگوں کی غربت کو اُن کی بدحالی کو اُن کا مقدر تصور کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک زمینیں، مکان، جائیداد اور دولت یہ سب کچھ خدا کی دین ہے۔ یہ لوگ معاشرے کی تمام ناہمواریوں، ناانصافی اور اُونچ نیچ کو خدا کی رضا قرار دیتے تھے۔ اِس کو یہ خدا کی تقسیم کہتے تھے۔ لوگوں کی ناداری اور مفلسی اور بیماری کو آسمانوں کا فیصلہ قرار دیتے تھے۔ اِس معاملے میں یہ تمام لیڈر جماعت اسلامی کے فلسفے کے مقلد تھے کہ خدا جس کو چاہتا ہے، عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے،

www.bhutto.org

ذلت دیتا ہے۔ حالانکہ خدا کے ایسا کہنے کی حکمت قطعی طور پر یہ نہیں تھی جس کو استحصالی طبقوں نے اپنی لوٹ مار اور اپنی جاگیروں اور اپنی دولت کا پروانہ بنا رکھا تھا۔

1970ء کے انتخابات میں چیئرمین بھٹو کا کمال یہ تھا کہ اُنہوں نے معاشرے پر مسلط اس طرح کی سوچ کے استحصالی نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی یہ نظریاتی بغاوت لوگوں کی ذہنی حالت کی معروضیت کا آئینہ تھی۔ نسل در نسل معاشی استحصال کے زخم خوردہ عوام کے زخموں کے لئے ایک طرح کی مرہم تھی۔ لوگوں میں زندگی کی روح پھونکنے کا ایک جذبہ تھا۔ لوگوں کو سر اُٹھا کر بات کرنے کا ایک وسیلہ تھی۔ لوگوں میں اُن کی ذات کا احساس پیدا کرنے کی ایک تحریک تھی۔ لوگوں کا خوف دُور کرنے کا ایک نعرہ تھی۔ لوگوں پر وجد اور کیف طاری کرنے کا سنگیت تھی۔

چیئرمین بھٹو ایک باکمال Anthropologist تھے یعنی ماہر سماجیات تھے

چیئرمین بھٹو کے ساتھ بدنصیبی یہ ہوئی کہ جن لوگوں کو وہ اپنی سیاست اور اپنے اقتدار کا اہل خیال کرتے تھے، اُن میں سے ایک حصہ جس کو اسٹیبلشمنٹ نے شروع دن سے ہی چیئرمین کے ساتھ نتھی کر دیا تھا جو سیاسی ٹاوٹی اور خوشامد کے علاوہ کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔ دوسرا حصہ اُن کے ساتھ سیاست میں اُن کے اپنے طبقے کے جاگیرداروں کا تھا جن کا اقتدار کے علاوہ اور کوئی شعور نہیں تھا۔ چیئرمین بھٹو کی ذات اُن کیلئے صرف اور صرف اقتدار حاصل کرنے کا پیکر اور ذریعہ تھی۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا کہ چیئرمین بھٹو کے احساسات اور اُن کے سماجی شعور کا ترجمان بن سکتا۔ باقی رہ گئے چیئرمین بھٹو کے کھلے دشمن تو دشمن اُن کی عظمت کا اعتراف کیوں کرتے۔ پارٹی کے اندر دوسری بدنصیبی یہ تھی کہ جو لوگ چیئرمین بھٹو کی سیاست کا صحیح فہم رکھتے تھے۔ جو باقاعدہ سیاسی شعور کے حامل تھے، وہ پارٹی کی سیاست میں پارٹی کے اِن دونوں حصوں کے سیاسی مفادات اور اُن کی سوچ اور اُن کے عمل کے برعکس تھے۔ چیئرمین بھٹو کی قربت کی وجہ سے یہ دونوں غیر نظریاتی دھڑے پارٹی کے اندر بہت طاقتور تھے۔ اِن لوگوں نے ہر سوچنے والے شخص کو پارٹی کے اندر بے اختیار بنا رکھا تھا۔ پارٹی کے اندر اِن لوگوں کو اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ لوگوں کے سامنے چیئرمین بھٹو کے فلسفے کے نظریات و خیالات کو صحیح طریقے پر پیش کر سکیں اور چیئرمین بھٹو کی ذات کو مکمل طور پر لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں۔ اُن کے تصورات لوگوں کو سمجھا سکیں۔

www.bhutto.org

چیئرمین بھٹو کے ساتھ بدنصیبی یہ تھی کہ ریاست کے تمام ادارے اور ان اداروں کے سرکردہ لوگ چیئرمین بھٹو کی ذات کو اور اُن کی سیاست کو اپنی موت تصور کرتے تھے۔ وہ شروع دن سے ہی چیئرمین بھٹو کے خلاف تھے۔ وہ چیئرمین بھٹو کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ یہ تو 1971ء کے سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ تھا جس کی وجہ سے چیئرمین بھٹو کے وجود کو برداشت اور تسلیم کر لیا گیا تھا۔
اِن تمام باتوں کو دہرانے اور بیان کرنے کا ایک مقصد ہے کہ چیئرمین بھٹو کی شخصیت کے اصل امیج کو شروع سے لے کر آخر تک لوگوں کے سامنے صحیح معنوں میں لایا جائے۔ اِس مقام پر مجھے صرف اُن کی ذات کے اقتدار سے پہلے تحریک کے زمانے کے تشخص کی بات کرنا ہے جس کو میں نے ایک ماہر سماجیات کا عنوان دیا ہے کہ وہ شخص کتنا بڑا ماہر سماجیات تھا کہ وہ اپنے اس عہد میں اکیلا پاکستان کے عوام کی نبض پہچانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پاکستان جیسی ریاست میں اصل قوت اور طاقت سوائے پاکستان کے عوام کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو کی سیاست کا تمام مرکز و محور اور فوکس پاکستان کے عوام تھے۔ وہ اپنی ہر بات پاکستان کے عوام کے حوالے سے کرتے تھے۔ وہ جمہوری آزادی کی بات کرتے تھے تو عوام کے حوالے سے کرتے تھے۔ وہ سوشلزم یعنی معاشی آزادی کی بات کرتے تھے تو عوام کے حوالے سے کرتے تھے۔ وہ طاقت اور قوت کی بات کرتے تھے تو عوام کے حوالے سے کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چیئرمین بھٹو کی سیاست کی پہچان روٹی، کپڑا اور مکان اور عوام بن گئے تھے۔ یعنی اُن کی طاقت کا سرچشمہ عوام تھے۔ تاریخ میں ایسا کبھی بھی اور کہیں بھی ممکن نہیں ہوا کہ ایک مصلح یا ایک رہبر کی جدوجہد سے لوگوں کی تمام ضروریات زندگی پوری ہو گئی ہوں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کسی بھی ماہر سماجیات اور سیاسیات کی جدوجہد سے تمام مسئلے حل نہیں ہو جایا کرتے۔ مگر ایک بات مسلم ہو جاتی ہے کہ لوگوں کو اپنے تمام مسئلے حل کرنے کا شعور حاصل ہو جاتا ہے۔ چیئرمین بھٹو کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اُنہوں نے اپنی فعال تحریک سے لوگوں میں شعور پیدا کر دیا تھا اور شعور ہی انسانی زندگی کے مسائل حل کرنے کی کلید ا ہوا کرتا ہے۔ بس یہ ایک کارنامہ ہی چیئرمین بھٹو کا پاکستان کی سیاست میں سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی سیاسی تحریک سے 1970ء کے انتخابی جلسوں سے لوگوں کو سیاسی شعور عطا کر دیا تھا۔ لوگ جاگ اُٹھے تھے۔ لوگوں کے شعور کا جن بوتل سے باہر آ گیا تھا۔
لوگوں کے شعور کا یہ جن کسی ظلم اور کسی خوف سے قابو میں نہیں لایا جا سکتا تھا۔ چیئرمین بھٹو کے

www.bhutto.org

اِسی سیاسی شعور نے غلام کو آقا کے برابر کھڑا کر دیا تھا۔ ہاری کو وڈیرے کے برابر کھڑا کر دیا تھا۔ دھرتی کے رینگتے ہوئے ڈاؤن ٹراڈن کمیوں کو چوہدریوں کے برابر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کا یہ کارنامہ جہاں ایک سیاسی کارنامہ ہے وہاں یہ کارنامہ ایک عظیم روحانی صداقت کا کارنامہ بھی تھا۔ جس کارنامہ نے ہر انسان کو زندہ کر دیا تھا۔ انسان بنا دیا تھا۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو کے اِس روحانی اور سیاسی عمل کے سامنے پاکستان کے تمام عوام دشمن لیڈروں کی ذاتیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ لاشیں بن گئی تھیں۔ ریاست کے طاقتور اداروں کا جسم بے معنی بن گیا تھا۔ پاکستان کے عوام جبر کے سامنے مزاحمت کرنے لگ گئے تھے۔ جبر کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ پاکستان کے عوام کو پاکستان کے تمام رجعت پسند سیاست دان جبر کے نمائندے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کو وہ اپنے شعور کے خلاف تصور کرتے تھے، اپنی نفرت کی انتہا دکھائی دیتے تھے۔ یہی وہ عوام کے شعور کی تحریک تھی جس سے ریاستی اداروں نے چیئرمین بھٹو کو طاقت کے ذریعے عوام کے اِس شعور کی تحریک سے علیحدہ کرنا چاہا تھا۔ اسٹیبلشمنٹ نے چیئرمین بھٹو پر قاتلانہ حملے کرانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

چیئرمین بھٹو پر قاتلانہ حملوں کی داستان

چیئرمین بھٹو کے چونکہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ بہت خصوصی مراسم تھے۔ جس کی وجہ سے پنجاب میں دوسرے علاقوں کی نسبت ملتان اور بہاولپور کی انتخابی تحریک میں چیئرمین بھٹو کو زیادہ وقت دینا پڑتا تھا۔ علاقہ خان پور کا ایک انتخابی جلسہ تھا۔ جہاں جماعت اسلامی کے غنڈوں نے چیئرمین بھٹو کے جلسے پر دن کی روشنی میں پہلا قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ یہ انتخابی جلسہ ایک مذہبی درسگاہ کے ساتھ کھلے میدان میں جاری تھا کہ اِس درسگاہ سے بھاری تعداد میں شلوار قمیض پہنے ہوئے داڑھیوں والے نوجوان ہاتھوں میں ڈنڈے اور خنجر لہراتے ہوئے باہر آئے اور اُنہوں نے جلسہ گاہ میں کھڑے پر امن شہریوں پر حملہ کر دیا۔ جلسہ گاہ پر اُنہوں نے عین اُس وقت حملہ کیا جس وقت تلاوت کے بعد میں اپنی نظم لوگوں کو سنا رہا تھا۔ جلسہ کی سٹیج کافی اونچی تھی جس کی وجہ سے تمام حملہ آور مجھے دکھائی دے رہے تھے۔ سٹیج پر میرے پیچھے چیئرمین اور پنڈی سازش کیس والے جنرل اکبر خان اور ملک غلام مصطفیٰ کھر بیٹھے تھے۔

میں نے جب اُن گھٹنوں سے اُونچی شلواروں والوں کو لوگوں پر حملہ کرتے ہوئے دیکھا تو

www.bhutto.org

میں لاؤڈ سپیکر پر لوگوں سے کہنا شروع کر دیا۔ لوگوں! اِن جماعت اسلامی کے غنڈوں کو پکڑو اور ان کی شلواروں کو اُتار دو۔ میں نے پیپلز گارڈز کو مخاطب کر کے اِس طرح ہدایات دینا شروع کر دیں جس طرح کہ جلسہ گاہ میں پیپلز گارڈ کا باقاعدہ انتظام تھا اور اِن حملہ آوروں کے حملے کا جواب دینے کی باقاعدہ تیاری کی گئی تھی۔ میں نے پیپلز گارڈ کو کہنا شروع کر دیا۔ دیکھو کسی کو گولی نہیں مارنی، کسی کو زخمی مت کرنا۔ اِن کو صرف جوتے مارو۔ حضرات اِن کی جوتوں سے تواضع کرو۔ وہ دیکھو تمہاری دائیں جانب ایک مولوی ڈنڈا لے کر آ رہا ہے۔ اِس کو پکڑو اور اُس کے سر پر دس جوتے لگا کر اُس کو جلسہ گاہ سے باہر نکال دو۔

شاباش دوستو! اور مارو اِن حرام کے پلوں کو اور مارو۔ گارڈ نمبر 12 سر یا مت مارو، جوتے مارو۔ پکڑ لو۔ اب یہ واپس بھاگ رہے ہیں۔ جانے دو اِن کو بھاگ جانے دو۔ مجمع زیادہ تھا۔ یہ حملہ آور کم تھے۔ لوگوں نے اِن کی خوب پٹائی کی۔ لاؤڈ سپیکر پر میری ہدایات سے وہ اِس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ وہ واپس مسجد کے اندر کے دروازے کی بجائے دیواریں کود کود کر اندر چھلانگیں مارنے لگ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے پنڈال اِن غنڈوں سے خالی ہو گیا۔ مدرسے کے سامنے پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں نے پولیس کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہاری گاڑیوں کے نمبر نوٹ کر لئے گئے ہیں۔ تم نے اپنی سرکردگی میں ہمارے جلسے پر حملہ کرایا ہے۔ تمہیں معاف نہیں کیا جائے گا۔

پولیس میرا اِس طرح کا اعلان سن کر وہاں سے اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر دور بھاگ گئی۔ جلسہ گاہ میں امن و امان ہو گیا۔ میں نے کچھ دیر چیئرمین بھٹو کے نعرے لگوا کر جلسہ گاہ میں دوبارہ جوش و خروش پیدا کیا۔ لوگوں کو اُن پر مبارکباد دی اور اُس کے ساتھ ہی میں نے چیئرمین بھٹو کی تقریر کا اعلان کر دیا اور چیئرمین بھٹو مائیک پر آ گئے۔

اُنہوں نے چونکہ جماعت کے غنڈوں کا یہ تمام خونی کھیل اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اُنہوں نے جماعت کی سخت مذمت کی اور حکومت کو اِس حملے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اِس جلسے کے بعد بھی کچھ انتخابی جلسے تھے۔ جس میں خطاب کے بعد ہمارا قافلہ رات کو واپس کھر ہاؤس پہنچ گیا۔ ہمارا ایک کارکن حلیم خان بابر تھا۔ اُس نے بڑی جرات سے اِن غنڈوں کا مقابلہ کیا تھا۔ مگر بڑا دلچسپ آدمی تھا۔ اِس بے چارے کا سچ بھی جھوٹ لگتا ہوتا تھا۔ اُس کی ٹانگ پر چوٹ آ گئی تھی اور وہ لنگڑا رہا تھا۔ وہ جب لنگڑاتا ہوا کھر ہاؤس پہنچا۔ وہاں پر ملک غلام مصطفےٰ کھر نے اُس کے ساتھ بہت

www.bhutto.org

دلچسپ مذاق کیا۔ کھر صاحب نے کہا کہ بھٹو صاحب جلسہ گاہ میں یہ دائیں ٹانگ سے لنگڑا کر چل رہا تھا۔ راستے میں آتے آتے اس کو یہ بات یاد نہ رہی۔ اب یہ بائیں ٹانگ سے لنگڑا کر چل رہا ہے۔ بھٹو صاحب قہقہہ لگا کر کہنے لگے۔ مذاق مت کرو، اس کی ٹانگ پر چوٹ لگ گئی ہے۔ اس طرح کے حادثات کے بعد ہم لوگ اس طرح کی گپ شپ کر کے اپنے حوصلے بلند رکھتے تھے۔

ریٹائرڈ میجر جنرل اکبر خان کی سادہ بیانی

میجر (ر) جنرل اکبر خان بہت حسین آدمی تھے۔ جنرل ایوب خان نے امریکہ کو خوش کرنے کے لئے اُس پر سوویت یونین کا ایجنٹ ہونے کا الزام لگا کر اُس پر پنڈی سازش کیس بنا کر اُس کو گرفتار کر لیا تھا اور مقدمہ چلا کر اُس کو دس سال قید بامشقت کی سزا سنادی تھی۔ یہ وہی پنڈی سازش کیس تھا جس میں فیض صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جس سازش کیس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فیض صاحب نے اپنا مشہور زمانہ یہ شعر کہا تھا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

میری جنرل اکبر صاحب کے ساتھ جلسہ گاہ میں یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے میرا اُن کے ساتھ کوئی تعارف نہیں تھا۔ معاملہ یوں ہوا کہ جب کھر ہاؤس میں ہماری معمول کی محفلِ شب جمی تو جنرل صاحب نے اپنے سپاہیانہ انداز میں جلسے کے سلسلے میں میری کارکردگی کی تعریف کرنا شروع کر دی۔ اُنہوں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ میں ایک کمانڈر انسان ہوں۔ ہر طرح کے میدانِ کارزار یا میدانِ جنگ کا نفسیاتی علم رکھتا ہوں۔ آپ کے اِس نوجوان لیڈر نے مائیک پر جس نفسیاتی انداز میں غنڈوں کے خلاف ہدایات جاری کرنا شروع کیں۔ یہ ہدایات ایک بہت بڑا نفسیاتی ہتھیار تھیں۔ ہم فوجی جنگ کی زبان میں اِس کو کمانداری کہتے ہیں۔ میں بغور جلسہ گاہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اُس کی آواز سے ان غنڈوں کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اُن کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اُن کے ہر طرف پیپلز گارڈ کھڑی ہے اور وہ درمیان میں گھر چکے ہیں۔ ہر چند وہ تمام مسلح تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور ہتھیار تھے۔ اُس کے باوجود وہ پاگلوں کی طرح واپس بھاگ گئے۔ یہ نوجوان اِس طرح اپنی آواز کے ساتھ اِن کا پیچھا کر رہا تھا۔ اِس طرح اِن پر گہری نگاہ رکھتا

www.bhutto.org

تھا کہ اُن کے کپڑوں اور ڈنڈوں کی نشانیاں بتا بتا کر لوگوں کو اُن کا مقابلہ کرنے کا کہتا جا رہا تھا۔

اس کے علاوہ اس قدر ہوشیار آدمی تھا کہ ایک ہی بات کہتا جا رہا تھا کہ صرف ان کو جوتوں سے مارو۔ جوتے مارو۔ اِس کے جوتے مارنے کہنے سے ایک تو غنڈوں کی بے عزتی کا پہلو نکلتا تھا کہ ان کے ہمارے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اگر اُن میں سے کوئی مر مرا بھی جائے تو پیپلز پارٹی پر کوئی حرف نہیں آسکتا تھا۔ اس لئے کہ ہم تو صرف ان ڈنڈے والوں کو جوتے مارنے کا کہہ رہے تھے۔ ہمارے پاس تو جوتوں کے سوا اور کوئی ہتھیار ہی نہیں تھے۔

جنرل اکبر نے اپنی سادگی میں کہہ دیا کہ میرا خیال ہے کہ آپ کی قیادت میں آنے والے وقت میں یہ شخص پنجاب کا بہت بڑا لیڈر بن جائے گا۔ بھٹو صاحب نے جنرل اکبر کو فوری طور پر ٹوک کر کہا۔ نہیں جنرل! پنجاب کا لیڈر غلام مصطفےٰ کھر ہوگا۔ تم فوجی آدمی ہو۔ تمہیں سیاست کا کچھ علم نہیں۔ تم پیپلز گارڈ بنانے کی تیاری کرو۔

چیئرمین بھٹو کی ذات پر جماعت اسلامی کا دوسرا قاتلانہ حملہ

جماعت اسلامی کے غنڈوں کا دوسرا حملہ بے حد خطرناک تھا۔ اِس حملے میں چیئرمین بھٹو کی ذات کا محفوظ رہنا معجزے کی بات تھی۔ مجھے اُس وقت بھی احساس ہوا تھا اور آج بھی ہے کہ خان پور کے حملے کے بعد جب ہم کو صادق آباد ضلع رحیم یار خان کے جلسے میں جانا تھا تو پیپلز پارٹی نے چیئرمین بھٹو اور دوسرے کارکنوں کی حفاظت کا انتظام کیوں نہیں کیا تھا۔ جبکہ پہلے حملے کی پسپائی کے بعد جماعت اسلامی کی طرف سے اخباروں میں اعلان کیا گیا تھا۔

ہم پاکستان کو دوسرا انڈونیشیا بنادیں گے

صادق آباد کے جلسہ عام سے پہلے آغا شورش کشمیری کی سرفروش تنظیم جو دراصل آئی۔ ایس۔ آئی اور جماعت اسلامی اور جمعیت الاطلباء کی یوتھ فورس کے نام پر بنائی گئی مسلح تنظیم تھی۔ اِس یوتھ فورس کا دوسرا نام سرفروش رکھا گیا تھا اور ظاہری طور پر اِس سرفروش فورس کا لیڈر آغا شورش کشمیری بنادیا گیا تھا۔ آغا شورش کشمیری کی اِس ڈنڈا فورس اور جماعت اسلامی کی اِس مسلح غنڈہ فورس کی طرف سے پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں دیواروں پر اشتہارات چسپاں کئے

www.bhutto.org

گئے تھے۔ وہ اشتہار پیپلز پارٹی اور پاکستان کے تمام ترقی پسند لیفٹ کے دانشوروں اور سیاست دانوں، شاعروں، ادیبوں صحافیوں اور بائیں بازو کے سیاسی کارکنوں کے لئے کھلی دھمکی لئے ہوئے تھے۔ ملتان شہر میں یہ اشتہار ہر دیوار پر پڑھنے کو ملتے تھے۔

ان اشتہاروں میں اُن تمام لوگوں کو انتباہ کیا گیا تھا اور صاف طور پر کہا گیا تھا کہ پاکستان میں سوشلزم کا نام لینے والوں کی زبانیں کھینچ لی جائیں گی۔ اُن کے قلم توڑ دیئے جائیں گے اور اُن کے سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ صادق آباد میں رحیم یار خان کی جماعت اسلامی کی یوتھ فورس نے ہی چیئرمین بھٹو پر قاتلانہ حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جماعت اسلامی کا ایک اہم رکن جو صادق آباد شہر کے باہر ایک بڑی مل کا مالک تھا، وہ اِس حملے کا سربراہ تھا۔

یہ تمام صورتحال بیان کرنے کا مطلب یا مقصد یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی اِس کھلی دھمکی کے بعد اور حاصل پور کے جلسہ پر حملہ کرنے کے بعد صادق آباد اور ملتان کی پیپلز پارٹی کیلئے انتہائی ضروری تھا کہ وہ چیئرمین بھٹو کی حفاظت کا کوئی فول پروف انتظام کرتے اور جلسہ گاہ کو ہر طرح کے خطرے سے محفوظ بناتے۔ مگر حقیقی بات یہ تھی کہ صادق آباد کے جلسے کا انتظام انتہائی ناقص انتظام تھا بلکہ یوں کہا جائے تو بے جانہ ہوگا، کوئی انتظام ہی نہیں تھا۔

یہ جلسہ صادق آباد شہر سے باہر ایک کھلی جگہ پر رکھا گیا تھا جو ایک عام گزرگاہ کی طرح کی جگہ تھی۔ سٹیج کا انتہائی کمزور اور ناقص انتظام تھا۔ لوگوں میں اور سٹیج میں کوئی فاصلہ ہی نہیں تھا۔ سٹیج بہت کم اونچی تھی جس پر بھاری تعداد میں لوگ چڑھ بیٹھے تھے اور وہ تمام لوگ ہمارے مخالف لوگ تھے۔ وہ پیچھے سے بری طرح مداخلت کر رہے تھے۔ حسب معمول جس طرح ہمارے جلسے میں ہوتا تھا، پہلے تلاوت ہوتی تھی۔ اِس کے بعد میں نظم پڑھتا تھا اور میرے بعد چیئرمین بھٹو کی تقریر ہوتی تھی۔

لہٰذا بہت شور شرابے میں تلاوت کلامِ پاک کے بعد میں اپنی اسلامی سوشلزم کی نظم پڑھ رہا تھا۔ آگے والے لوگ تو میں نے خاموش کرادیئے تھے مگر میرے اوپر دیوار پر بیٹھے لوگ میری نظم کے دوران مسلسل فقرہ بازی کرتے رہے۔ میری نظم میں تھا کہ اِن سرمایہ داروں کی کاروں میں پٹرول کی جگہ محنت کشوں کا خون جلتا ہے۔ اِس پر اُن کا فقرہ تھا کہ تم تو یہاں پیدل ہی آئے ہو۔ تمہاری کار تو سوشلزم سے چلتی ہے۔ اُن کی اِس طرح کی کھلی مداخلت اور فقرے بازی پر میں نے جلسہ گاہ کے لوگوں سے درخواست کی کہ دیوار پر چڑھے لوگوں کو پیچھے ہٹنے کا کہیں۔ لوگوں نے اُن کو پیچھے ہٹ

جانے کا شور کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں کے غم و غصہ سے ڈر کر وہ دیوار سے ہٹ کر پیچھے چلے گئے۔ اِس طرح چیئر مین بھٹو کی تقریر میں وہ شر پسند پیچھے سے شور کرنے اور مداخلت کرنے کے قابل نہ رہے مگر جلسہ میں شور کرنا اُن کے منصوبے کا حصہ نہیں تھا۔ اُن کا منصوبہ تو راستے میں قاتلانہ حملہ کرنے کا منصوبہ تھا۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ یہ جلسہ ہر اعتبار سے انتظام کے حوالے سے بے حد ناقص جلسہ تھا جس میں چیئر مین بھٹو کیلئے نہ تو آنے کیلئے کوئی محفوظ بندوبست تھا اور نہ ہی واپس جانے کیلئے کوئی اچھا انتظام تھا۔ چیئر مین بھٹو جب جلسے کے اندر آئے تھے تو اُس وقت بھی وہ ہجوم کے اندر سے ہی اپنا راستہ بناتے ہوئے سٹیج تک پہنچے تھے۔ اُن کا اِس طرح لوگوں کے درمیان سے گزرنا بہت خطرناک ہوسکتا تھا۔ اِس طرح کی دھکم پیل میں کسی غلط کار کیلئے کوئی شرارت کرنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اِسی طرح تقریر کے بعد واپس کار تک جانے میں بھی اُن کو وہی پہلے والی صورتحال درپیش تھی۔ بڑی مشکل کے ساتھ کارکنوں نے لوگوں کے ہجوم میں راستہ بنا کر چیئر مین بھٹو کو ملک غلام مصطفیٰ کھر کی گاڑی تک پہنچایا تھا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر چونکہ خود جلسہ گاہ میں نہیں آئے تھے۔ وہ جلسہ گاہ سے باہر گاڑی میں بھٹو صاحب کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ لہٰذا ملک صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ جلسہ کا جائزہ لیتے۔ مخالفین کی نیت صاف ظاہر تھی۔ اُن کو واپس اِس راستے سے نہیں جانا چاہیے تھا جس سے ہم آئے تھے۔ مگر شاید کھر صاحب بھی جماعت اسلامی کے غنڈوں کے اتنے شدید حملے کا ادراک نہیں رکھتے تھے۔ وہ چیئر مین بھٹو کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر واپس اُسی راستے پر چل پڑے، جس راستے میں حملہ آور باقاعدہ مورچہ بند ہو کر کھڑے تھے۔ ہماری تین گاڑیاں تھیں۔ پہلی گاڑی میں چیئر مین بھٹو، رفیع منیر اور مصطفیٰ کھر تھے۔ دوسری گاڑی میں امان اللہ خان اور چند دوسرے کارکن تھے۔ تیسری گاڑی میں میں تھا اور میرے ساتھ کچھ کارکن تھے۔ میرے والی گاڑی میں لوگوں کو بیٹھنے میں کچھ دیر ہوگئی تھی جس کی وجہ سے ہم اِن دونوں گاڑیوں سے تھوڑا پیچھے تھے۔

کامریڈ امان اللہ خان کا بازو توڑ دیا گیا

چیئر مین بھٹو کی گاڑی ہم کو دُور سے دکھائی دے رہی تھی۔ یہ راستہ سیدھا ریلوے کراسنگ کی طرف جاتا تھا۔ جہاں سے سڑک باہر ملتان کی طرف جاتی تھی۔ یہ راستہ ایک تنگ اور بند راستہ تھا۔ حملہ آوروں نے ریلوے پھاٹک کا راستہ اینٹوں سے لدے ٹرک سے بند کر رکھا تھا۔ ریلوے

پھاٹک کے بائیں طرف ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک کچا راستہ تھا جس راستے پر بہت گرد تھی۔ یہ راستہ عام گزر گاہ کا راستہ نہیں تھا۔ فیکٹریوں کے ٹرک وغیرہ ہی وہاں سے گزر سکتے تھے۔ اس طرح کا محل وقوع تھا جہاں پر بھٹو صاحب پر حملہ کیا گیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی گاڑی جب پھاٹک سے کچھ فاصلے پر تھی تو حملہ آوروں نے آگے سے اینٹوں سے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ باقاعدہ گولیاں چلائی گئی تھیں جن کی آواز ہماری گاڑی تک بھی آئی تھی۔ یہ چیئرمین بھٹو کی خوش قسمتی تھی کہ حملہ آوروں نے کچھ جلدی ہی اُن پر دھاوا بول دیا تھا جبکہ اُن کی گاڑی اور حملہ آوروں میں تقریباً 20 یا 25 فٹ کا فاصلہ تھا۔ اگر حملہ آور اُن کی گاڑی کو تھوڑا سا بھی آگے آنے دیتے تو اُن کی گاڑی کو کسی طرف بھی نکلنے کا راستہ نہیں مل سکتا تھا۔ مگر حملہ آور اِس یقین میں تھے کہ اُن کی گاڑی کو نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل سکے گا۔ لہٰذا انہوں نے اُن کی گاڑی پر ہلہ بول دیا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کو چونکہ ایک ماہر ڈرائیور ہونے کے علاوہ اِس علاقے کے راستوں کا بھی علم تھا۔ وہ اِن راستوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لہٰذا اُس نے ہجوم کے گاڑی کے قریب آنے سے پہلے ہی گاڑی کو دائیں طرف کچے راستے پر ڈال دیا جو کہ کار چلانے کیلئے تقریباً ناممکن راستہ تھا۔ گاڑی جب کچے کی طرف چلائی گئی تو گاڑی کی ڈکی حملہ آوروں کی زد میں آرہی تھی۔ لہٰذا چیئرمین بھٹو کی گاڑی کی ڈکی پر بے شمار ڈنڈے اور اینٹیں لگیں۔ گاڑی کی ڈکی پر فائر بھی کئے گئے۔ یہ کچا راستہ دھول سے اٹا ہوا راستہ تھا۔ گاڑی کی سپیڈ کی وجہ سے بھل یا گرد اِس قدر اوپر اُٹھی کہ بھٹو صاحب کی گاڑی حملہ آوروں کی نظروں سے اُوجھل ہوگئی۔ گاڑی اور حملہ آوروں کے درمیان گرد وغبار کی آندھی حائل ہوگئی۔ اِسی دوران پیچھے آنے والی گاڑی جس میں امان اللہ خان آگے بیٹھا ہوا تھا، وہ بالکل حملہ آوروں کے درمیان پہنچ گئی۔ اُس کو کچے کی طرف مڑنے میں تھوڑا وقت لگ گیا یعنی صرف چند لمحوں کا وقت اور گاڑی حملہ آوروں کی اینٹوں کی زد میں آگئی۔ حملہ آوروں نے دوسری گاڑی پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش کر دی۔ ایک اینٹ یا پتھر امان اللہ خان کے بازو کی کلائی پر آلگا جس سے اُس کے باوز کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ باقی ورکروں کے سروں پر پتھر لگے۔ خدا کا شکر تھا کہ گاڑی کا ڈرائیور ہوش وحواس میں رہا اور وہ گاڑی کو کچے راستے کی گرد میں لے کر دھنس گیا اور حملہ آوروں کی زد سے باہر نکل گیا۔ ہماری گاڑی چونکہ قدرتی طور پر پیچھے رہ گئی تھی۔ ہمارا ڈرائیور یہ تمام ماجرا دور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے حملہ آوروں سے کافی فاصلے سے ہی گاڑی کو کچے راستے کی طرف جانے والے میدان میں

www.bhutto.org

ڈال دیا تھا۔حملہ آوروں نے ہماری گاڑی پر بہت پتھر برسائے مگر ہمارا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ اُن کا کوئی پتھر یا اینٹ ہماری گاڑی تک نہ پہنچ سکی۔اور ہم صحیح سلامت میدان کے درمیان سے گزر کر کچے راستے میں داخل ہو گئے۔تقریباً 30 منٹ کے سفر کے بعد ہماری گاڑی بھی صادق آباد کینال کی پٹری پر پہنچ گئی جہاں چیئر مین بھٹو کی گاڑی اور زخمی کارکنوں کی گاڑی کھڑی تھی۔وہاں پر رک کر وہ ہماری ہی گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ہماری گاڑی کے پہنچتے ہی ہمارا قافلہ آگے کی طرف چل نکلا۔آگے نہر کے کنارے کوئی قصبہ نما شہر تھا۔وہاں ایک چھوٹا سا ہسپتال تھا۔ہم تمام لوگ اِس ہسپتال میں پہنچ گئے۔وہاں پر امان اللہ خان اور زخمی کارکنوں کو فوری طور پر طبی امداد دینے کے لئے داخل کرایا گیا۔ہسپتال میں علاقے کی پولیس کو بلایا گیا۔اِن زخمیوں کو ہسپتال میں پولیس کی حفاظت میں دے کر اور کچھ مقامی کارکنوں کو زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے ہسپتال میں چھوڑ کر ہم رات کی تاریکی میں سفر کرتے ہوئے واپس ملتان کھر ہاؤس پہنچ گئے۔آج میں سوچتا ہوں کہ چیئر مین بھٹو کے دشمن کس قدر اُن کی جان کے دشمن تھے جو بالآخر اُن کی جان لے کر ہی رہے۔

دوسرے دن امان اللہ خان اور دوسرے زخمیوں کو ملتان کے بڑے ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں پر اُن کا علاج تسلی بخش طریقے سے ہونا شروع ہو گیا۔

اِس معاملے میں سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ یحییٰ خان کی حکومت نے چیئر مین بھٹو پر حملہ کرنے والے کسی ایک ملزم پر نہ تو قاتلانہ حملہ کرنے کا کوئی مقدمہ بنایا اور نہ ہی کسی کو عدالت سے کوئی سزا سنائی گئی۔وقتی طور پر چند لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا اور کچھ دنوں کے بعد اُن کو رہا کر دیا گیا تھا۔

صادق آباد کے حملے کے دوسرے دن جماعت اسلامی لیڈروں اور حکومت کے اتحادیوں نے اخباروں میں الٹا پیپلز پارٹی کو قصور وار ٹھہرایا تھا۔اُن کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی کے جلسے میں جماعت اسلامی کے امیر کو گالیاں دی گئی تھیں اور اسلام کے اصولوں اور شعائر کے خلاف تقریریں کی گئی تھیں۔سوشلزم کے حق میں نظم پڑھی گئی جس کی وجہ سے صادق آباد کے مسلمان عوام مشتعل ہو گئے تھے وغیرہ۔

چیئر مین بھٹو کی ذات پر سانگھڑ میں قاتلانہ حملہ

مغربی پاکستان میں صوبہ سرحد میں ولی خان اور اُس کی جماعت انتخابی جلسے کر رہی تھی۔

www.bhutto.org

پنجاب میں دولتانہ نواب زادہ نصر اللہ خان جلسے کر رہے تھے۔ بلوچستان میں میر غوث بخش بزنجو اور تمام بلوچ تنظیمیں انتخابی جلسے کر رہی تھیں مگر حکومت کی طرف سے ہر طرح کی انتقامی کاروائی صرف پاکستان پیپلز پارٹی کے خلاف کی جارہی تھی۔ صرف پیپلز پارٹی کا گھیرا تنگ کیا جارہا تھا۔ چیئرمین بھٹو کے علاوہ کسی دوسرے لیڈر کی ذات پر یا کسی جلسے پر نہ تو کسی پارٹی نے حملہ کیا اور نہ ہی کسی دوسری پارٹی کے کسی لیڈر یا کارکن کو گرفتار کیا گیا تھا۔ اِن واقعات کے کافی عرصہ بعد میں نے ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع یوں تھا۔

وہ ایک ہم ہیں کہ جن پر وا ہیں تمہاری دوزخ کے باب سارے
ہمارے حصے میں آگئے ہیں عتاب سارے عذاب سارے

پاکستان میں بائیں بازو کی قیادت اور اُن کی تنظیمیں شاید انتخابات کی سیاست پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ اِن تنظیموں کو اقتدار حاصل کرنے کی سیاست کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی ہمارا لیفٹ پاکستان کے فوجی اقتدار کیلئے کبھی کوئی خطرہ بن سکا تھا۔ فوجی اقتدار ہر اِس سیاسی جماعت کی سرکوبی کرتا تھا جس جماعت سے اُس کے اقتدار کو خطرہ دکھائی دیتا تھا۔ بائیں بازو کے دانشوروں نے نہ کبھی اقتدار کی سیاست کی تھی اور نہ ہی کبھی ریاستی اداروں سے اُس کی کبھی ٹکر ہوئی تھی۔ انفرادی طور پر اُن میں سے کچھ لوگوں کو ریاستی جبر کا سامنا ضرور کرنا پڑا تھا مگر اجتماعی طور پر بایاں بازو فوجی حکومت کے ساتھ کبھی عوامی سطح پر نبرد آزما نہیں ہوا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کی پہلی بائیں بازو کی سیاسی جماعت تھی جس کی قیادت نے عوامی کی سطح پر اپنی سیاست کی بنیاد رکھ کر فوجی حکومت کو للکارا تھا۔ جس کی وجہ سے فوجی حکومت پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور اُس کے باقی لیڈروں اور کارکنوں کی ہر بات کا مواخذہ کرتی تھی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنے ہر لفظ کی قیمت چکانی پڑتی تھی۔ وہی نعرے جو بائیں بازو کے لوگ لگایا کرتے تھے۔ جب ہم پیپلز پارٹی والے لگاتے تھے تو ہم پر مقدمات بن جایا کرتے تھے۔

یہی مسئلہ امریکہ مردہ باد کے نعرے پر ہم کو درپیش تھا۔ باقی لوگ امریکہ مردہ باد کے نعرے لگاتے تھے امریکہ کا جھنڈا جلاتے تھے تو اُن کا کوئی نوٹس نہیں لیا جاتا تھا مگر ہمارے جلوسوں اور جلسوں میں جب ہمارے کارکن امریکہ مردہ باد کا نعرہ لگاتے تے تو امریکہ کی پاکستان میں قائم تمام ایجنسیاں اِن نعروں کا نوٹس لیا کرتی تھیں۔ انتخابات میں پیپلز پارٹی کے مخالفوں کی مدد کیا

www.bhutto.org

کرتی تھیں۔اُن کو باقاعدہ سرمایہ مہیا کرتی تھیں۔پاکستان میں سی آئی اے کا تمام نیٹ ورک چیئرمین بھٹو اور پیپلز پارٹی کے خلاف ہی ہوتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ حکومت اور جماعت اسلامی پیپلز پارٹی کے خلاف ہر طرح کی جارحیت کرنے کے لئے آزاد تھی۔

سانگھڑ کے حملے سے کچھ دن پہلے 5 مارچ 1970ء کو امریکہ کا بدنام زمانہ سفیر فارلینڈ نشتر کالج میڈیکل کالج ملتان کی ایک تقریب میں بلایا گیا۔اِس تقریب میں بائیں بازو کے طالب علموں اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے فارلینڈ کے خلاف مظاہرہ کیا۔امریکہ کے خلاف نعرے لگائے۔اِس مظاہرے میں ویت نام کے حق میں اور فلسطین کے حق میں اور جمہوریہ چین کے حق میں نعرے لگائے گئے اور فارلینڈ کو فلسطینی مجاہدوں کا قاتل کہا گیا اور امریکہ کا جھنڈا جلا دیا گیا۔

فارلینڈ کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد امریکہ چیئرمین بھٹو کے خلاف بہت مشتعل ہو گیا۔حکومت نے فوری طور پر ملتان میں محمود خان بابر کو گرفتار کر لیا۔خود مجھ پر فوجی عدالت میں مقدمہ بنا دیا گیا۔

فارلینڈ نے مغربی پاکستان میں چیئرمین بھٹو کے چیدہ چیدہ سیاسی مخالفین کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔اُس نے پاکستان میں پیروں فقیروں کو ملنا شروع کر دیا۔اُس کی سب سے اہم ملاقات پیر آف سیال شریف کے ساتھ ہوئی۔پیر آف سیال شریف انتخابات میں حکومتی جماعت قیوم لیگ کا حامی تھا۔جس قیوم لیگ کا سندھ میں پیر پگاڑا سربراہ تھا۔

31 مارچ 1970ء کو چیئرمین بھٹو کا سانگھڑ کا جلسہ تھا۔اِس جلسے سے پیشتر پنجاب کے اضلاع کے تمام انتخابی جلسے ہو چکے تھے۔اِن جلسوں کی کامیابیوں کی دھوم سندھ تک پہنچ چکی تھی۔جس کی وجہ سے سندھ کے تمام اضلاع کے انتخابی جلسے بہت کامیاب رہے تھے۔مگر سانگھڑ کا جلسہ سندھ کی انتخابی مہم کا اہم ترین جلسہ تھا۔سانگھڑ سے تقریباً 16 کلومیٹر کے فاصلے پر پیپلز پارٹی کے ایک عہدے دار کے کارخانے میں ہمارا ناشتہ تھا۔اِس ناشتے کے بعد چیئرمین بھٹو کو دوپہر کو سانگھڑ کے جلسے سے خطاب کرنا تھا۔جلسے کا وقت اعلان کے مطابق 11 بجے دن دیا گیا تھا۔ہمارا قافلہ ہمارے اس عہدے دار کے ڈیرے پر تقریباً بارہ بجے دن پہنچا تھا۔راستے میں چیئرمین بھٹو کو کئی ایک مقام پر لوگوں سے خطاب کرنا پڑا تھا جس کی وجہ سے ہم لوگ اُس مقام پر ٹھیک وقت پر نہ پہنچ پائے تھے۔

چیئرمین بھٹو نے ناشتے کی میز پر مجھے اور معراج محمد خان کو اپنے قریب بلا کر بٹھایا اور ہم

www.bhutto.org

دونوں کو جلدی جلدی ناشتہ کرنے کا حکم دیا۔ اُنہوں نے ہمیں کہا کہ تم لوگ ناشتہ کر کے فوری طور پر سانگھڑ جلسہ گاہ میں چلے جاؤ۔ جا کر عوام سے خطاب کرو۔ جلسے کو خوب گرماؤ۔ اُنہوں نے کہا کہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ خود جلسہ گاہ میں پہنچ جائیں گے۔ چیئر مین بھٹو کا حکم سنتے ہی میں اور معراج محمد خان دونوں ایک گاڑی میں سوار ہو کر سانگھڑ کی طرف روانہ ہو گئے۔ سانگھڑ شہر سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلے پر دائیں جانب ریت کا ایک اُونچا ٹیلہ تھا۔ اِس ٹیلے کے اوپر اور نیچے اچھی خاصی تعداد میں کچھ لوگ کھڑے تھے۔ تمام لوگ ٹھیٹھ سندھی لباس میں تھے۔ ہم جب اُن کے قریب سے گزرے تو ہمیں یہی گمان گزرا کہ یہ لوگ چیئر مین بھٹو کا استقبال کرنے کیلئے کھڑے ہیں۔ ہم دونوں سیدھے جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔ جلسے کا انتظام دیکھ کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ سٹیج بڑی اونچی اور نمایاں بنائی گئی تھی۔ لاؤڈ سپیکر کا انتظام بھی تسلی بخش تھا۔ ہم نے جاتے ہی مقامی پارٹی کے صدر کو تلاوت کلام پاک کرانے کا کہہ دیا۔ تلاوت کے بعد مجھے نظم پڑھنے کیلئے بلایا گیا۔ میں نے ایک نظم ختم کی تو دوسری نظم پڑھنے کی فرمائش کی گئی۔ اِس طرح میں دو نظمیں پڑھ کر واپس آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ میرے بعد معراج محمد خان کو تقریر کیلئے بلایا گیا۔ معراج محمد خان نے اپنے مخصوص انداز میں بڑی زوردار تقریر کی جس کی وجہ سے جلسے میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ایک گھنٹے کی تقریر کے بعد معراج محمد خان اپنی نشست پر واپس آ کر بیٹھ گیا۔ جلسے کے لوگوں میں بہت جوش پیدا ہو چکا تھا۔ صدر جلسے نے مجھے کہا کہ کچھ وقت کیلئے آپ تقریر کریں تاکہ جلسے کا نظم و ضبط قائم رہے۔ میں نے اُن کے حکم کے مطابق لوگوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔ میں اپنی تقریر کے عروج پر تھا کہ میری بائیں جانب سے کوئی 200 کے قریب حملہ آور جلسہ گاہ میں داخل ہو گئے۔ اِن تمام لوگوں نے اپنے منہ پر پٹکے باندھ رکھے تھے۔ عجیب قسم کی داڑھیوں اور مونچھوں والی وہ مخلوق تھی۔ اُن کے ہاتھوں میں بڑے بڑے بانس تھے۔ اُنہوں نے جلسہ گاہ کے تمام لاؤڈ سپیکر بانسوں سے توڑ دیئے۔ لوگوں پر لاٹھی چارج کرنا شروع کر دیا۔ ہوائی فائرنگ کر دی۔

ہماری سٹیج کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ ہماری خوش قسمتی کہ جلسہ گاہ میں پنجابی لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ یہ وہ پنجابی تھے جو پنجاب سے سانگھڑ کے ضلع میں جا کر زمینیں خرید کر آباد کار بن گئے تھے۔ اُن کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ وہ تمام کے تمام سٹیج کے سامنے بیٹھے تھے۔ پگاڑا کے حُروں نے جب ہماری سٹیج کو گھیرے میں لیا تو یہ تمام پنجابی سٹیج اور حُروں کے درمیان حائل ہو کر

www.bhutto.org

کھڑے ہو گئے۔ اُن میں سے ایک دو نے مجھے آواز دے کر پنجابی میں کہا۔ گھبرانا نہیں۔ اِن کو ہم آپ لوگوں کے قریب نہیں آنے دیں گے۔ جلسہ گاہ کی کناتوں کو حُروں نے آگ لگادی جس سے جلسہ گاہ میں دور دور تک دھواں پھیل گیا۔ معراج محمد خان اور میں نے سٹیج پر کھڑے ہو کر بھٹو کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ ہر چند جلسہ گاہ میں بھگدڑ ر مچی ہوئی تھی۔ اِس کے باوجود لوگ ہمارے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ مگر جلسہ گاہ میں خوف وہراس اِس قدر پھیل چکا تھا کہ سوائے کچھ پنجابی آباد کاروں کے اور جلسے کے صدر کے باقی تمام لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے۔ اِس صورتحال کے باوجود میں اور معراج محمد خان پاگلوں کی طرح جئے بھٹو کے نعرے لگاتے رہے۔ حیرانگی اِس بات کی تھی کہ اِن حملہ آوروں میں سے کوئی سٹیج پر نہ آیا اور نہ ہی اُن میں سے کسی نے ہم پر حملہ کرنے کی جرات کی۔ وہ خوفناک آنکھوں کے ساتھ ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور ہم دونوں اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھٹو زندہ باد کے نعرے مارتے جا رہے تھے۔ ایک وقت ایسا آ گیا کہ معراج محمد خان چیئر مین بھٹو کہتا اور میں اکیلا ہی آگے اُس کے جواب میں زندہ باد کا نعرہ لگاتا تھا۔ ہم دونوں کے نعروں کا سلسلہ اُس وقت ٹوٹا جب جلسہ گاہ میں بھاری تعداد میں پولیس پہنچ گئی۔ پولیس نے ہماری سٹیج کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیس کا ڈی۔ ایس۔ پی سٹیج پر ہمارے پاس آیا اور اُس نے ہمیں کہا کہ آپ اب ہماری حفاظت میں ہیں۔ اِس طرح پولیس حُروں کے گھیرے سے ہم کو نکال کر اپنی گاڑی تک لے آئی۔ ابھی ہم لوگ پولیس کی گاڑی میں سوار نہیں ہوئے تھے کہ ایک شخص نے بڑی اُونچی آواز سے ہمیں کہا کہ چیئر مین بھٹو کو راستے میں گولی مار دی گئی ہے۔ ہم نے ڈی۔ ایس۔ پی جو کوئی مزاری تھا، اُس سے بھٹو صاحب کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے اُس وقت ہماری بات کا کچھ جواب نہ دیا اور پولیس والوں نے ہم دونوں کو دھکیل کر گاڑی کے اندر بٹھا دیا اور پولیس کی وہ گاڑی ہمیں سانگھڑ کی پولیس لائن میں لے گئی۔

پولیس لائن پہنچ کر ہم نے دوبارہ ڈی۔ ایس۔ پی سے بھٹو صاحب کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ اِس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس نے ہمیں صرف اتنا جواب دیا کہ وہ ٹھیک ہیں اور واپس حیدر آباد چلے گئے ہیں۔ معراج محمد خان چونکہ بے حد تیز طبیعت کا آدمی تھا، وہ ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ اُلجھنے لگ گیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی کے ساتھ معراج محمد خان کی بڑی گرمی سردی ہوئی۔ میں نے معراج محمد خان کو کان میں کہا کہ بھیا! اس کے ساتھ اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

www.bhutto.org

معراج محمد خان میرا اتنا کہنے سے خاموش ہو گیا۔ میں نے ڈی۔ ایس۔ پی سے پوچھا کہ ہم دونوں کا مستقبل کیا ہے؟ آپ نے ہمیں گرفتار کیا ہے یا اپنی حفاظت میں لے رکھا ہے۔ مہربانی کر کے ہم کو بتا دیا جائے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے جواب دیا کہ ہم نے ہائی کمان کو آپ کی اطلاع کر دی ہے۔ اُن کا جواب آنے پر آپ کو بتا دیا جائے گا کہ آپ کا کیا مستقبل ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے چائے کا انتظام کیا۔ ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ اُس کو وائرلیس سیٹ پر پیغام آ گیا۔

ڈی۔ ایس۔ پی نے بڑی خوشی کے لہجے میں ہم کو بتایا کہ آپ لوگوں کو بڑی حفاظت کے ساتھ پولیس کی گاڑی میں حیدرآباد بھٹو صاحب کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ آپ ہر طرح سے آزاد ہیں۔ اِس طرح شام کے وقت میں اور معراج محمد خان پولیس کی گاڑی میں سوار ہو کر حیدرآباد میر رسول بخش تالپور کے گھر پہنچ گئے۔ جہاں چیئرمین بھٹو اور دوسرے تمام لوگ ہم دونوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

ہمارے بارے میں یہ افواہ اُڑا دی گئی تھی کہ ہم کو پیر پگاڑا کے حُروں نے جلسہ میں مار ڈالا ہے۔ یہ خبر اُن کو ایک ایسے آدمی نے دی تھی جو اُس وقت جلسہ گاہ سے بھاگ نکلا تھا جب حُروں کے جتھے نے جلسہ گاہ پر حملہ کیا تھا۔ اُس شخص نے جب دور کناتوں کو جلتا دیکھا تو اُس کو یہی اندازہ ہوا کہ ہم لوگ آگ اور حملہ آوروں کی زد میں آ گئے ہوں گے۔ وہ اپنی گاڑی بھگا کر حیدرآباد پہنچ گیا۔ اُس نے ہمارے بارے میں محض شبہ ظاہر کیا تھا مگر یہ بات جب ورکروں تک پہنچی تو شبہ کی بجائے ہماری موت کی خبر بن گئی۔ چیئرمین بھٹو مجھے اور معراج محمد خان کو دیکھ کر اپنی کرسی سے اُٹھے اور اُٹھ کر اُنہوں نے ہم دونوں کو اپنے بازوؤں میں لے کر انگریزی میں کہا'' تھینک گاڈ یو آل رائٹ'' چیئرمین بھٹو نے مجھ سے اور معراج محمد خان سے باری باری پوچھا۔ کوئی چوٹ ووٹ تو نہیں آئی۔ میں اور معراج محمد خان چیئرمین بھٹو کے قریب بیٹھ گئے۔ چیئرمین نے میرا نام لے کر مجھے کہا۔ اسلم! ہم نے آج بھی دوستوں کی وفائیں دیکھ لی ہیں۔ پھر معراج محمد خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ معراج محمد خان! آج خدا نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔ آج میرا بچ جانا ایک معجزہ تھا۔ آج میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میر رسول بخش تالپور جو وہاں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ حملہ ہمارے دشمنوں کی شکست کا اظہار ہے۔ چیئرمین بھٹو نے جواب میں کہا۔ میر صاحب! شکست خوردہ دشمن بے حد کمینہ ہوتا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار چیئرمین بھٹو کے

چہرے کی رنگت میں کچھ فرق پایا تھا۔ عام زندگی میں اُن کے چہرے کی رنگت سندھوری رنگ کی ہوا کرتی تھی مگر اُس وقت چہرے کی رنگت میں پیلاہٹ زیادہ نمایاں تھی۔

چیئرمین بھٹو نے ہمارے حیدرآباد پہنچنے سے پہلے جنرل یحییٰ خان کے لئے ٹیلی فون کال بک کرا رکھی تھی۔ کافی وقت گزر جانے کے باوجود کال نہیں مل رہی تھی۔ ٹیلی فون پر جنرل پیرزادہ بار بار ایک ہی پیغام دیئے جا رہا تھا کہ صدر صاحب فارغ نہیں ہیں۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں، وہ مجھے بتا دیں۔ میں صدر صاحب کے گوش گذار کر دوں گا۔ مگر چیئرمین بھٹو کا اصرار تھا کہ میں صرف جنرل یحییٰ خان کے ساتھ بات کرنا چاہتا ہوں۔

ہمارے جانے سے پہلی بی۔ بی۔ سی کے نمائندے نے حیدرآباد سے بی بی سی کے تمام اسٹیشنوں پر چیئرمین بھٹو پر قاتلانہ حملے کی آنکھوں دیکھی رپورٹ جاری کر دی تھی۔ بی بی سی کا نمائندہ بھٹو صاحب کے قافلے کے ساتھ موجود تھا جب اُن پر حملہ کیا گیا تھا۔ بی بی سی کی اسی خبر کے حوالے سے ایران کے وزیر خارجہ کا میر رسول بخش تالپور کے گھر فون آیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کے ساتھ اِس خطرناک واقعے پر اظہار افسوس کا کسی بیرونی حکومت کے نمائندے کا یہ پہلا فون تھا۔

ایران کے وزیر خارجہ نے چیئرمین بھٹو کی خیریت دریافت کی۔ بھٹو صاحب کی آواز سن کر خوشی کا اظہار کیا۔ اُن کی زندگی کی سلامتی کی اُن کو مبارکباد پیش کی اور ساتھ ہی بھٹو صاحب کو بتایا کہ شہنشاہ ایران، صدر پاکستان جنرل محمد یحییٰ خان کے ساتھ اِس افسوس ناک واقعے پر اپنی ناخوشی کا اظہار کر چکے ہیں۔ اِس ٹیلی فون کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ جنرل پیرزادہ نے بھٹو صاحب سے کہا کہ صدر صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

بھٹو صاحب نے صدر پاکستان یحییٰ خان کے ساتھ اُردو میں ہی بات کی۔ کہا ہیلو جنرل صاحب! خدا کے فضل سے میں زندہ ہوں۔ خدا نے مجھے بچا لیا ہے۔ ہمیں تو یہ علم نہیں ہو سکا کہ آگے صدر کا جواب کیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی بات سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ یحییٰ خان نے کہا تھا کہ میں نے حملہ آوروں کو گرفتار کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ چیئرمین بھٹو کا جواب تھا کہ کس حملہ آور کو آپ گرفتار کریں گے۔ اُس حملہ آور کو جو کل آپ کو صدر ہاؤس میں ملا تھا۔ بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ اِس حملے سے ایک دن پہلے پیر پگارا یحییٰ خان کے ساتھ ملاقات کرنے آیا تھا۔ جس کی پارٹی کے حُر وں نے چیئرمین بھٹو پر حملہ کیا تھا۔

یک دم چیئر مین بھٹو کی آواز میں تبدیلی آ گئی۔ اُن کی آواز غصے سے پھٹنے لگی۔ اُنہوں نے کہا کہ جنرل! میں ملک کو انگاروں پر رکھ دوں گا۔ اِس تلخ ترین جملے کے بعد بھٹو صاحب کی آواز میں ٹھہراؤ پیدا ہوگیا۔ وہ کچھ دیر یحییٰ خان کی بات سننے کے بعد بولے۔ آغا صاحب! آپ اچھا سلوک کریں گے تو میرا بھی آپ کے ساتھ اچھا سلوک ہوگا۔ اِس کے ساتھ ہی فون پر بات چیت ختم ہوگئی۔ ماحول پر سناٹا چھا گیا تھا۔ اِس خاموشی کو خود چیئر مین بھٹو نے توڑتے ہوئے کہا۔ خدا کی قسم! یہ جرنیل ملک کو توڑ کر دم لیں گے۔ بھٹو صاحب نے کہا۔ یحییٰ خان اِس وقت اِس قدر پیئے ہوئے تھا کہ اس سے ڈھنگ سے بات ہی نہیں ہو رہی تھی۔

اِس عرصے میں بھٹو صاحب کے کمرے کے باہر بھاری مقدار میں اخباری نمائندے جمع ہو چکے تھے۔ اِن تمام کو کمرے کے اندر بلایا گیا اور چیئر مین بھٹو نے پریس کانفرنس کی شکل میں اخباری نمائندوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔ بھٹو صاحب نے اپنے مختصر خطاب کے بعد جس میں شہنشاہ ایران اور وزیر خارجہ ایران کے اظہار افسوس کا بتایا اور صدر پاکستان کے ساتھ اپنی ٹیلی فون پر کی گئی بات سے آگاہ کیا۔

اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے میر رسول بخش تالپور کو کہا کہ میر صاحب! اِن دوستوں کو حملے کی تمام داستان سے آگاہ کریں۔ میر رسول بخش تالپور نے حملے کے تمام واقعات کو بیان کیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ سڑک کو حملہ آوروں نے ٹریکٹر کھڑے کر کے بند کر رکھا تھا اور ابھی راستہ بند ہونے کی وجہ سے ہمارا کارواں سڑک پر رکا ہی تھا کہ سڑک کے دونوں جانب سے گولیوں کی بارش برسنے لگ گئی۔ کارکن چونکہ بھٹو صاحب کی گاڑی کے آگے چلنے والی دو کھلی جیپوں پر کافی تعداد میں بیٹھے تھے۔ وہ گولیاں لگنے سے تڑپ تڑپ کر جیپ سے نیچے سڑک پر گرنے لگ گئے۔ چیئر مین بھٹو چونکہ سب سے آگے تھے۔ وہ اپنی گاڑی سے باہر نکل کر کھلی سڑک پر پیدل چل کر حملہ آوروں کو بلند آواز سے کہنے لگ گئے۔ میں بھٹو ہوں۔ تم تو صرف مجھے مارنا چاہتے ہو۔ کارکنوں کو کیوں قتل کر رہے ہو۔ مجھے گولی مارو۔ اِس کے ساتھ ہی حملہ آوروں کی گولیاں بھٹو صاحب سے کچھ فاصلے پر آ کر زمین پر لگنا شروع ہوگئیں۔ کارکنوں نے بھاگ کر بھٹو صاحب کو زمین پر لٹا دیا اور خود اُن کے اوپر لیٹ گئے۔ اوپر لیٹے ہوئے تین کارکنوں کی کمر پر حملہ آوروں کی گولیاں لگیں جو نیم مردہ حالت میں بھٹو صاحب کے اوپر پڑے رہے۔ اِس کے ساتھ ہی ہمارے کارواں کے لوگوں نے جوابی فائر

www.bhutto.org

کرنا شروع کر دیئے۔ چیئرمین بھٹو اپنی پوری جسمانی طاقت سے کارکنوں کو اپنے اوپر سے دھکیل کر دوبارہ کھڑے ہو گئے اور اُنہوں نے حملہ آوروں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ ایک شخص جس کو پیر آف رانی پور کہا جاتا تھا، وہ بڑی مستعدی کے ساتھ چیئرمین بھٹو کی طرف منہ کر کے آگے کھڑا ہو گیا۔ جس کی وجہ سے ایک سنسناتی ہوئی گولی اُس کی کمر پر آ کر لگی۔ حملہ آوروں کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ بھٹو کو ختم کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے واپس کھلیانوں کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ہمارے قافلے کی طرف سے بھی بڑی فائرنگ کی گئی۔ حملہ آوروں کا فاصلہ بڑھتا گیا اور وہ اپنی پناہ گاہوں کی طرف جا کر غائب ہو گئے۔ ہمارے قافلے میں زخمیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کارکن زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ مجھے بھٹو صاحب نے کہا کہ اِن زخمیوں کو فوری طور پر ہسپتال پہنچانا چاہیے۔ لہٰذا ہم نے زخمی کارکنوں کو گاڑیوں میں ڈالا اور وہاں سے واپس حیدرآباد جنرل ہسپتال آ گئے۔ ہمارے تین کارکن جو شدید زخمی تھے، وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِس طرح ہم باقی زخمی کارکنوں کو ہسپتال میں داخل کرا کے واپس اپنی رہائش گاہ پر آ گئے۔ میر صاحب نے کہا کہ یہ پاکستان کی تاریخ کا بدترین واقعہ ہے کہ ایک سیاست دان کو عوامی جلسے سے خطاب کرنے سے نہ صرف روکا گیا ہے بلکہ اُس پر قاتلانہ حملہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ بھٹو صاحب کی جان بچ گئی ہے۔ یہ سیاست نہیں، ہلاکت خیزی ہے۔ ظلم کی انتہا ہے۔ بے گناہ سیاسی کارکنوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا ہے۔

چیئرمین بھٹو نے میر صاحب کی بات کاٹ کر کہا کہ آج پیر پگاڑا کے منہ پر آمریت کی دلالی کی سیاہی مل جا چکی ہے۔ آج سندھ کے عوام نے پیر پگاڑا کا اصلی چہرہ دیکھ لیا ہے۔ پیر کے حملے کا بھٹو انتقام نہیں لے گا، سندھ کے عوام اِس کا انتقام لیں گے۔ بلکہ پاکستان بھر کے عوام اِس کا انتقام لیں گے۔ میری سیاسی جدوجہد پاکستان کے عوام کے تمام دشمنوں کے چہرے بے نقاب کر دیئے ہیں جن کا روپ کچھ اور ہے اور بہروپ کچھ اور ہے۔

چیئرمین کی بات مکمل ہونے کے بعد میر صاحب نے اخبار نویسوں کو ہلاک ہونے والے اور زخمی ہونے والے کارکنوں کے ناموں کی فہرست دی اور آخر میں کہا کہ جو کچھ سانگھڑ کے جلسہ گاہ میں غنڈوں نے کیا، اُس کی تفصیل آپ معراج محمد خان اور اسلم گورداسپوری سے حاصل کر لیں۔ میں اور معراج محمد خان نے پوری تفصیل کے ساتھ جلسہ گاہ میں جو کچھ ہوا، اخبار نویسوں کو اُس سے آگاہ کیا

www.bhutto.org

اور جس طریقے سے پولیس نے ہمیں حراست میں لیا اور حیدرآباد پہنچایا، یہ سارا واقعہ بیان کیا۔

اس کے ساتھ ہی میر صاحب نے اخبار نویسوں کو چائے پلانا شروع کر دی۔ جب ہم چائے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو میں اور معراج محمد خان بھٹو صاحب کے ساتھ چل رہے تھے۔ چائے کے کمرے میں کراچی کے کچھ کارکن بھی ہمارے ساتھ بھٹو صاحب کے قریب کھڑے ہو کر چائے پی رہے تھے۔ بھٹو صاحب نے اُن کی طرف دیکھ کر معراج محمد خان کو کہا۔ معراج اپنے دوستوں سے مل لو۔ یہ تمہاری وجہ سے بہت پریشان تھے۔ بھٹو صاحب کی اِس بات پر میر رسول بخش تالپور قہقہہ لگا کر مجھے ایک طرف اپنے ساتھ لے گئے۔ کہنے لگے کہ جب تمہارے اور معراج محمد خان کے بارے میں یوں غلط قسم کی خبریں اُڑنے لگیں تو کراچی کے یہ چند ورکرز بہت شور کرنے لگ گئے۔ اِن کا شور سُن کر بھٹو صاحب کمرے سے باہر آئے اور اُنہوں نے اِن ورکروں کو حوصلہ دیا اور کہا دیکھو حملہ آوروں کا نشانہ اور اُن کا دشمن میں تھا۔ معراج محمد خان یا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ میرا یقین ہے کہ معراج محمد خان صحیح سلامت ہوگا اور بہت جلد ہمیں اُس کی خیریت معلوم ہو جائے گی۔ مجھے معراج محمد خان کے بارے میں تمہارے اظہار تشویش پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اِس تشویش میں میں خود بھی تمہارے ساتھ شامل ہوں۔ مگر مجھے ایک بات کا افسوس ہے کہ تم میں سے کسی ایک کو بھی غریب اسلم گورداسپوری کے بارے میں کوئی تشویش نہیں ہے۔ اُس غریب کا کوئی نام ہی نہیں لے رہا۔ چیئرمین بھٹو کی اِس بات سے معراج محمد خان کے جیالے بہت شرمندہ ہوئے اور خاموش ہو کر ایک طرف چلے گئے۔ میر رسول بخش تالپور کی یہ باتیں سُن کر مجھے چیئرمین بھٹو کی ذات پر بہت پیار آیا اور خوشی بھی کہ کم از کم میرے قائد کے دل میں تو میرے لئے تشویش لاحق تھی۔

میں چونکہ شروع دن سے ہی تاریخ کے مطالعے کا طالب علم رہا ہوں۔ میں نے جنگ اُحد میں مسلمانوں کو شکست کے باب کے بارے میں رسول پاک کا ایک جملہ تازہ تازہ پڑھ رکھا تھا جو اتفاق سے مجھے اُس وقت یاد آ گیا جو آنحضرتؐ نے حضرت حمزہؓ کے بارے میں ادا کیا تھا۔ میں نے وہ جملہ میر صاحب کو سنایا۔ اِس جملے کا واقعہ کچھ یوں تھا کہ جب اُحد کی جنگ میں مدینے کے مسلمانوں کے تقریباً ہر گھر کا ایک ایک آدمی شہید کر دیا گیا تھا تو مدینے کے تمام مسلمانوں کے گھروں سے شہید ہونے والوں کی خواتین اپنے شہیدوں کے نام لے کر گریہ کر رہی تھیں اور بلند آواز سے بین کر رہی تھیں۔ شہیدوں کی لواحقین خواتین کا یہ گریہ سُن کر رسول اللہؐ نے انتہائی افسوس ناک لہجے میں کہا تھا

www.bhutto.org

کہ آہ! آج سارے مدینے میں ہمارے خاندان میں سے کوئی بھی نہیں ہے جو حمزہ کا گریہ کرتا۔ یہ بات جب مدینے کے مسلمانوں کے گھروں تک پہنچی تو خواتین نے گریہ زاری بند کر دی تھی۔

میر رسول بخش تالپور بہت بیانیہ طبیعت کے مالک انسان تھے۔ وہ میری بات سن کر جھومتے ہوئے رسول اللہؐ کا جملہ بار بار دہراتے ہوئے بھٹو صاحب کے پاس گئے اور کہنے لگے۔ بھٹو سائیں! اسلم گورداسپوری نے تو آپ کی بات کو تاریخی عظمت عطا کر دی ہے۔ میر صاحب نے بھٹو صاحب کو حضرت حمزہؓ کے بارے میں کہا گیا رسول اللہؐ کا جملہ سنایا اور اُس کا پس منظر بھی بتایا۔ چیئرمین بھٹو نے مجھے اپنے نزدیک آنے کو کہا۔ کہنے لگے کہ "**محمدؐ وازاے گریٹ پرافٹ**" میں تو اُن کے قدموں کی خاک ہوں۔ (تمہارے بارے میں میرے دل میں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ تمہارا کوئی نام ہی نہیں لے رہا تھا)

سانگھڑ کے حملے پر حکومت اور دائیں بازو کے رجعت پسندوں کا موقف

سانگھڑ میں چیئرمین بھٹو کی ذات پر قاتلانہ حملے کو تمام ملک میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ بیرون ملک میں مقیم پاکستانیوں نے بھی اِس حملے پر احتجاج کیا تھا۔ پاکستان میں بائیں بازو کے تقریباً تمام سیاست دانوں نے اِس حملے کی مذمت کی تھی۔ اِس کے برعکس حکومت اور حکومت کے رجعت پسند لیڈروں اور دائیں بازو کی مذہبی جماعتوں کے لیڈروں کا موقف بہت مضحکہ خیز اور قابل مذمت تھا۔ جماعت اسلامی کے ترجمان کا موقف تھا کہ پیپلز پارٹی چونکہ سوشلزم یعنی کفر کا پرچار کرتی ہے جس کو سندھ کے غیور اور غیرت مند مسلمان برداشت نہیں کر سکے۔ اُن کے نزدیک سانگھڑ کا حملہ کافروں پر مسلمانوں کا حملہ تھا جس میں حملہ آور مسلمان حق بجانب تھے۔

حکومت کی وزارت اطلاعات کا موقف

وفاقی وزیر اطلاعات نواب زادہ جنرل شیر علی خان کا موقف تھا کہ پیپلز پارٹی کے جلسوں میں مخالف قائدین کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ پارٹی کے مقرر اور کارکن شرفاء کی پگڑیاں اُچھالتے ہیں۔ یہ لوگ کسی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں ہیں۔ اسلام اور قرآن پاک کے خلاف تقریریں کرتے ہیں۔ لوگوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرتے ہیں۔ پاکستان کو اسلام کے نام پر بنایا گیا

www.bhutto.org

تھا، اس پاکستان میں کسی دوسرے ازم کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔

سندھ کے دین پرست عوام کے پیپلز پارٹی کے خلاف ردِ عمل سے پیپلز پارٹی کو اپنی اصلاح کرنی چاہیے اور اُس کے لیڈروں کو اس واقعہ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ ہر چند حکومت تمام حقائق سے آگاہ ہے۔ اِس کے باوجود حکومت اِس حملہ کی تحقیق کر رہی ہے اور حملہ آوروں کو گرفتار کیا جائے گا۔

آغا شورش کشمیری اور زندگی کے ایڈیٹر کا سانگھڑ کا دورہ

اِس حملے کے بعد حکومت کی طرف سے کچھ صحافیوں کو برائے نام حملہ کی تحقیق کرنے کے لئے سانگھڑ بھیجنے کا اعلان کیا گیا۔ حالانکہ اِس قسم کے سرکاری صحافتی تحقیقی طائفے کو سانگھڑ بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اِس لئے کہ چیئرمین بھٹو کے قافلے کے ساتھ ملک کے تمام بڑے صحافی اداروں کے نمائندے سفر کر رہے تھے جو اِس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ اِن صحافتی نمائندوں میں بی بی سی کے نمائندے سے لے کر اُس وقت کے مغربی پاکستان کے خصوصی طور پر کراچی کے اخباروں میں سب سے بڑے اخبار روزنامہ جنگ کا نمائندہ بھی شامل تھا۔ روزنامہ نوائے وقت کا نمائندہ بھی شریک سفر تھا۔ روزنامہ جسارت کا نمائندہ بھی شریک تھا۔ پاکستان ٹائمز کا نمائندہ بھی شریک سفر تھا۔ روزنامہ کوہستان کا نمائندہ بھی شریک سفر تھا۔ انگریزی کے سب سے بڑے اخبار روزنامہ ڈان کا نمائندہ بھی شریک سفر تھا۔

اِن تمام اخبارات میں اپنے اپنے نمائندے کے حوالے سے حملہ کی خبر شائع کی گئی تھی مگر یہ تمام خبریں واقعات کو توڑ مروڑ کر شائع کی گئی تھیں جس میں مرکزی موقف ایک ہی بیان کیا گیا تھا کہ پیپلز پارٹی کے لیڈروں نے اپنی تقریروں میں حُروں کے پیشوا پیر پگاڑا کا مذاق اُڑایا تھا۔ جس کی وجہ سے اُس کے پیروکار جن کو حُر کہا جاتا ہے، وہ مشتعل ہو گئے اور اُنہوں نے پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ اِس عہد میں کسی ایک اخبار نے بھی واقعات اور حالات کی صحیح تصویر پیش نہیں کی تھی۔ اخبارات پر چونکہ حکومت کی سخت گرفت ہوتی تھی جس کی وجہ سے اخبارات حکومت کے اختیار کئے گئے موقف کو ہی بیان کرنے پر مجبور تھے۔

اِس سلسلے میں صحافتی تحقیق کی ابتدا آغا شورش کشمیری اور زندگی کے ایڈیٹر نے کر دی تھی۔ آغا

www.bhutto.org

شورش کشمیری اور زندگی کے ایڈیٹر نے سندھ کے اُن تمام شہروں کا دورہ کیا تھا جہاں پر پیپلز پارٹی کے جلسے ہوئے تھے۔ آغا شورش کشمیری اور زندگی کے ایڈیٹر کے اِس دورے کا کسی دوسرے شخص کو علم نہیں ہوا تھا۔ اُن کے اِس دورے کا انکشاف اُنہوں نے خود ہی اپنے ہفت روزہ میں شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ تحقیقاتی رپورٹ نوائے وقت میں شائع کی گئی تھی۔ اِن دونوں حضرات کا ایک ہی موقف تھا۔ اِن دونوں حضرات کو یہ مشترکہ موقف یقیناً حکومت کی ایجنسی نے فراہم کیا ہوگا۔ اِن دونوں کے موقف میں پہلے نمبر پر چیئرمین بھٹو کو موردالزام ٹھہرایا گیا تھا کہ یہ شخص کسی دوسرے سیاست دان کی عزت نہیں کرتا۔ مخالف سیاست دانوں کا مذاق اُڑاتا ہے۔ اُن کے ناموں کو بگاڑتا ہے۔ خان عبدالقیوم خان کو ڈبل بیرل خان کہتا ہے۔ کسی مخالف لیڈر کو چوہا کہتا ہے۔ کسی کو بلی کہتا ہے۔ کسی کو آلو کہتا ہے۔ اپنی پارٹی کے کارکنوں کے مخالف لیڈروں کو گالیاں دینے پر خوش ہوتا ہے۔ خود گالیاں دے کر اُن کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اِن کے بعد پیپلز پارٹی کے دوسرے لیڈر اور مقرر اپنی تقریروں میں غریبوں کی ہمدردی کی آڑ لے کر اسلام کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کفر کے نظام سوشلزم کا پرچار کرتے ہیں۔ لینن اور مارکس کو مسلمانوں کے اسلاف سے بڑا ثابت کرتے ہیں۔ سوشلزم کو مبنی برانصاف نظام کہتے ہیں اور اسلام کو ظلم کا نظام قرار دیتے ہیں۔ آغا شورش کشمیری نے اور زندگی کے ایڈیٹر نے دو آدمیوں کو سانگھڑ کا حملہ یا واقعہ پیش آنے کا مجرم ٹھہرایا۔ اِن دو آدمیوں میں پہلا نام معراج محمد خان کا تھا اور دوسرا نام شاعر اسلم گورداسپوری کا تھا۔ اِن لوگوں نے معراج محمد خان کی تقریر کا حوالہ دیا تھا کہ اِس تقریر میں معراج محمد خان نے خان عبدالقیوم خان کی پارٹی کے امیدوار جاگیردار وسان کو جو پیر پگاڑا کا نامزد کردہ اُمیدوار تھا اور سانگھڑ کا مقامی وڈیرا تھا، جو بڑی عزت اور احترام رکھتا تھا، اُس کو معراج محمد خان نے تقریر میں دھمکی دی تھی کہ او! وسان کے بچے ہم تم کو کسان بنادیں گے یعنی تمہاری زمینیں چھین کر تمہیں مزارعہ بنادیں گے۔ اِس کے علاوہ پیپلز پارٹی کا شاعر اسلم گورداسپوری پورے دورے میں ہر جلسے میں میروں اور پیروں کے خلاف مسلسل اپنی نظموں کا زہر اُگلتا رہا تھا۔ وہ اپنی نظموں میں وڈیروں، جاگیرداروں کو دھمکیاں دیتا تھا۔ اِن قابل احترام ہستیوں کا مذاق اُڑاتا تھا۔ لوگوں کو زمینوں پر جبری قبضے کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ اِس کے ساتھ ہی آغا شورش کشمیری نے میری ایک نظم (اسلام خطرے میں نہیں) کے کچھ اشعار نقل کرتے ہوئے تحریر کیا کہ قارئین اس شاعر کے اشعار کی دریدہ دہنی خود اِس کے اشعار میں

ملاحظہ کریں۔اِس طرح آغا شورش کشمیری نے میری اِس نظم کا یہ بند تحریر کیا۔

اسلام کسی خطرے میں نہیں
ہاں خطرہ ہے جاگیروں کو
اسلام کے رسہ گیروں کو
کچھ مُلّاوں کچھ پیروں کو
اور نکسن کے کفگیروں کو
اسلام کسی خطرے میں نہیں

اس کے بعد آغا شورش کشمیری نے دوبارہ بند تحریر کر کے کہا کہ دیکھئے یہ شخص کس قدر قابلِ احترام قائدین کرام کا تمسخر اُڑا رہا ہے۔

خطرے میں اسلام نہیں
خطرے میں لال بجھکڑ ہیں
کچھ اَن پڑھ جاہل پھکڑ ہیں
کچھ لیڈر بوڑھے چھکڑ ہیں
کچھ اکڑ ہیں کچھ بکڑ ہیں
اسلام کسی خطرے میں نہیں

ان اشعار کو تحریر کر کے آغا شورش کشمیری کہتا ہے:

وہ لوگ جن کی زندگیاں قوم کی قیادت میں گزری ہیں۔اُن کے بارے میں اِس طرح کی زبان استعمال کرنا کہاں کی شرافت ہے۔اِس پارٹی کے لوگوں نے شرفاء کی تذلیل کی۔لوگوں کے روحانی پیشواؤں کا مذاق اُڑایا ہے جس کو لوگ یا اُن کے عقیدت مند برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اس طریقے کے ساتھ پاکستان کے تمام رجعت پسندوں اور فوجی حکومت کے اتحادیوں نے چیئرمین بھٹو کی ذات پر قاتلانہ حملے کی بل واسطہ حمایت کی۔حملہ آوروں کو حق پر ثابت کیا اور پیپلز پارٹی کو مجرم قرار دیا۔زندگی نے تو اِس معاملے میں آخیر کر دی۔اُس نے کہا کہ اسلام دشمنوں پر اللہ نے قہر نازل کیا ہے۔گویا حملہ آور پیر پگاڑا کے غنڈے نہیں تھے، بلکہ اللہ کے فرشتے تھے۔اِن باتوں کو اور اِن واقعات کو بیان کرنے کا میرا ایک ہی مقصد ہے کہ آج کے دور کے لوگوں کو معلوم ہو

www.bhutto.org

سکے کہ اُس دور میں پاکستان کے عوام کی صحیح معنوں میں سیاست کرنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا تھا۔ جس سیاست کا اکیلا علم بردار چیئرمین بھٹو تھا اور پاکستان پیپلز پارٹی تھی۔ سانگھڑ کے حملے میں پیر پگاڑا کے علاوہ جام صادق علی اور محمد خان جونیجو اور مقامی جاگیردار اور سانگھڑ کے اِس انتخابی حلقے کا نیشنل اسمبلی کا اُمیدوار جاگیردار وسان شامل تھا۔ مقام حیرت وعبرت ملاحظہ ہو کہ مذکورہ اُمیدوار کا 1970ء کے انتخاب کا نتیجہ سنتے ہی ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ انتخاب میں پیپلز پارٹی کا اُمیدوار بھاری اکثریت سے جیت گیا تھا۔ ''رہے نام اللہ کا باقی سب جھوٹ۔''

چیئرمین بھٹو کی قیادت میں یکم مئی 1970ء کا جلوس

یکم مئی 1970ء کا دن پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک تاریخی دن تھا۔ یکم مئی 1970ء کو چیئرمین بھٹو کی قیادت میں پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یکم مئی کا جلوس اتنی بھاری تعداد میں لاہور میں نکالا گیا جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ ماضی میں یکم مئی ایک یادگار ایونٹ کے طور پر ٹریڈ یونینز کی سطح تک ضرور منایا جاتا تھا۔ جس میں صرف مزدور حضرات ہی شرکت کیا کرتے تھے۔ مگر ایک قومی قیادت اور قومی سیاسی جماعت کی یکم مئی کے جلوس میں شرکت کا معاملہ پاکستان میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی قیادت کی وجہ سے لاہور کے لاکھوں عوام نے اس جلوس میں شرکت کی تھی۔ پاکستان کی تمام لیبر یونینز نے اپنی تنظیموں کے ساتھ جلوس میں شرکت کی تھی۔ ان کے ساتھ ہزاروں مزدوروں نے جلوس میں شرکت کی تھی۔ مزدوروں کے سرخ جھنڈے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے اس قدر لہرائے گئے تھے کہ جلوس پر چین اور سوویت روس کے اجتماع کا گماں ہوتا تھا۔ ہر طرف سرخ رنگ ہی نظر آتا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی قیادت میں مزدوروں کا یہ جلوس پاکستان کے رجعت پسند فوجی حکمرانوں اور دائیں بازو کی تمام رجعت پسند جماعتوں پر بجلی بن کر گرا تھا۔ پاکستان کے تمام مذہب فروش مذہبی لیڈروں مذہب کے تاجروں کی صفوں میں بھونچال آ گیا تھا۔ پاکستان کی تمام مذہبی جماعتوں اور رجعت پسند سیاسی جماعتوں نے جنرل یحییٰ خان کے وزیر اطلاعات نواب زادہ شیر علی خان کے ساتھ باقاعدہ اتحاد کرتے ہوئے بہ یک زبان ہو کر مزدوروں کے اس یکم مئی کے جلوس کو خلاف اسلام قرار دے دیا تھا۔ ان کا بیان تھا کہ بھٹو ملک میں سوویت روس کا لادینی انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ بھٹو کمیونسٹوں اور

www.bhutto.org

سوشلسٹوں کو ملک پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ بھٹو ملک پر غیر اسلامی سوشلسٹ نظام نافذ کرنا چاہتا ہے ان کا الٹی میٹم تھا کہ یہ نظام ان کی لاشوں کے ساتھ دفن کر دیا جائے گا۔ سوشلزم کفر ہے بھٹو کافر ہے وہ غریبوں کو نعرے دے کر گمراہ کر رہا ہے۔ ہم اسلام کے محافظ علماء اور اکابرین بھٹو کا ہر شہر ہر گلی میں مقابلہ کریں گے۔ رجعت پسندوں کے اور حکومت کے وزیر اطلاعات کے متفقہ فیصلے کے مطابق بھٹو کے اس غیر مذہبی لادینی جلوس کے مقابلے میں تمام اہلِ اسلام 31- مئی کو لاہور میں شوکتِ اسلام کا جلوس نکالیں گے اور موچی دروازے میں شوکت اسلام کا جلسہ منعقد کریں گے۔ اور بھٹو کو سوشلزم کو اور سوشلسٹوں کو ان کے کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔

(نوٹ) ان کا جلوس تمام نام نہاد مذہبی رجعت پسندوں اور جنرل یحییٰ خان کی امریکہ نواز حکومت کے لئے ریڈ کرٹن کا کام کیا تھا۔ اس جلوس کے بعد پاکستان کی تمام دائیں بازو کی جماعتوں کا اندر کھاتے حکومت کے ساتھ اتحاد ہو گیا تھا۔ دائیں بازو کے لیڈران اور دانش ور اور تنظیمیں اور جماعتیں چیئرمین بھٹو کی دشمنی اور ان کی مخالفت میں متحد ہو گئی تھیں۔ چیئرمین بھٹو اور عوام ایک طرف تھے اور تمام عوام دشمن اپنی صف بندی کر کے ایک طرف ہو گئے تھے۔ شوکتِ اسلام کا جلوس اور جلسہ ان کے اتحاد کا کھلا اعلان تھا۔

31- مئی کا یومِ شوکتِ اسلام

یومِ شوکت اسلام 31- مئی 1970ء کو لاہور باغ بیرون موچی دروازہ جو لاہور کی تاریخی جلسہ گاہ ہے وہاں منایا گیا۔ جس اجتماع میں پاکستان کے تمام علماء اسلام نے چیئرمین بھٹو کے سوشلزم کے خلاف جہاد کا اعلان کرتے ہوئے ایک مشترکہ علماء کے فتوے کا اعلان کیا۔

یومِ شوکتِ اسلام میں علماء کا مشترکہ فتویٰ

بھٹو کے سوشلزم کے طوفان کا مقابلہ کرنا بس جہاد ہے۔ پیپلز پارٹی روٹی کپڑے کے بدلے لوگوں کو ایمان سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ سوشلسٹ روٹی کپڑے مکان کے نعروں کی آڑ میں اسلام اور پاکستان کی بنیادوں کو ہلا رہے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مفتی پاکستان مولانا محمد شفیع، مولانا محمد صدیق احمد چٹاگانگ، مولانا عنایت اللہ شاہ اور مولانا امین الاسلام ڈھاکہ، مولانا احتشام الحق

تھانوی۔واضح رہے کہ اس شوکتِ اسلام کے جلسے کی صدارت مولانا ظفر احمد عثمانی نے کی تھی۔

ہالہ کانفرنس

ہالہ کانفرنس سے پہلے پارٹی کے اندر لیفٹ اور پارٹی سے باہر کے لیفٹ کی پارٹی کی قیادت کے ساتھ ایک کھلی ڈبیٹ چل رہی تھی۔وہ ڈبیٹ جاگیرداری نظام اور سرمایہ داری نظام کے خاتمے کی ڈبیٹ تھی۔یہ نظریاتی بحث اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔پیپلز پارٹی کی قیادت کو بیک وقت دو انتہاؤں کا سامنا تھا۔ایک انتہا تو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور اُس کی اتحادی مذہبی قوتوں، دینی جماعتوں اور انتہا پسند رجعت پسند تنظیموں پر مبنی تھی جس کے ساتھ حکومت کے تمام نشر و اشاعت کے ادارے، اخبارات اور رسالے تھے۔اِس کے علاوہ ملک کے اندر اور ملک سے باہر سرمایہ داروں کی مالی امداد اُن کو حاصل تھی اور امریکہ کی ہر طرح کی امداد اُن کو حاصل تھی۔جس کی یلغار کا پیپلز پارٹی کی قیادت اور پارٹی کو قدم قدم پر سامنا کرنا پڑتا تھا۔

دوسری انتہا ترقی پسندوں کی نظریاتی کشمکش کی درپیش تھی۔یہ انتہا اپنے نظریات اور اپنے انقلابی اُصولوں کے مطابق کسی بھی قسم کے عوامی جمہوری انتخابات کی حقیقت اور صداقت پر یقین نہیں رکھتی تھی۔انتخابات کو وہ لوگوں کے مسائل کا حل تصور نہیں کرتی تھی۔

انتخابات کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا کھیل تماشا قرار دیتی تھی اور ڈائریکٹ ایکشن پر زور دیتی تھی جس کا مطالبہ تھا کہ پیپلز پارٹی انتخابات کا بائیکاٹ کرے اور مسلح جدوجہد کر کے براہ راست ملک میں انقلاب برپا کرے۔یہ دوسری انتہا پاکستان کے بائیں بازو پر مبنی تھی جو خود کو انقلابی کہتا تھا۔اِس انتہا کے لوگوں میں اکثریت تو پارٹی کے سے باہر تھی مگر پارٹی کے اندر لیفٹ میں انتہا پسند چند نام کے لوگ تھے جن کو گنا جا سکتا تھا۔پارٹی کے اندر باقی تمام لوگ جو اکثریت میں تھے اور باقاعدہ انقلابی نظریات پر ایمان رکھتے تھے،وہ اپنے کردار و عمل میں اعتدال پسند تھے۔اِس کے باوجود پارٹی کے اندر لیفٹ کا انتہا پسند گروپ یا طبقہ پارٹی کے اندر کے تمام بائیں بازو کے لوگوں کو اپنی انتہا پسند کی سیاست سے مرغوب کرتا تھا۔اُن پر اپنے خیالِ فکر کی گہری چھاپ رکھتا تھا۔

ہالہ کانفرنس کے وقت پارٹی کے اندر کا انتہا پسند بائیں بازو کا گروپ پارٹی کے باہر کے

www.bhutto.org

بائیں بازو کے گروپ کے اِس موقف کو پارٹی پرسختی سے نافذ کرنا چاہتا تھا کہ پارٹی انتخابات کا بائیکاٹ کرے۔ اِس شکل میں اُن کا یہ موقف اور مطالبہ بالکل پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ سے ملتا جلتا تھا جس کی ہر طریقے سے یہ کوشش تھی کہ پیپلز پارٹی کو انتخابات سے باہر کردیا جائے یا انتخابات کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور کردیا جائے۔

مغربی پاکستان کے تمام لیفٹ کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ امریکہ کا ہر طرح سے بائیکاٹ کردیا جائے۔ اِس سلسلے میں مغربی پاکستان کا تمام لیفٹ چیئرمین بھٹو صاحب پر بڑی کڑی تنقید کرتا تھا۔ پنجاب میں خاص طور پر بائیں بازو کے تمام لیڈر اور اُن کے ترجمان اخبار اور رسالے چیئرمین بھٹو کے ایک انٹرویو پر سخت احتجاج کررہے تھے۔ یہ انٹرویو بھٹو صاحب نے سلگ ہیرسن (Selig harrison) کو دیا تھا جس میں اُنہوں نے کہا تھا کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ امریکہ ایشیا سے باہر نکل جائے۔ ایشیا کے اندر امریکہ کا کردار مسلم ہے۔ میں پُرامید ہوں کہ آنے والے وقت میں جمہوریہ چین اور امریکہ ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے جو ایشیا کی سیاست میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا باعث ہوں گے۔ میں تو صرف امریکہ کے سامراجی کردار کا مخالف ہوں۔ اُس سے اختلاف رکھتا ہوں۔

لیفٹ کی چیئرمین بھٹو کے خلاف اِس تنقید سے ایک ہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ خواہ ایشیا ہو یا پاکستان، وہ اُس کی کسی بھی معروضی سیاسی اور معاشی صورتحال کی کوئی اہمیت نہیں خیال کرتی ہے۔ پاکستان امریکہ کو ایشیا کی سیاست سے باہر نکال سکتا ہے یا نہیں نکال سکتا۔ اِس بات سے اِس کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ اِس کا بس فیصلہ ہے جو ایک نعرے کی شکل میں ہے۔ امریکیو! ایشیا سے نکل جاؤ۔ لہٰذا جو شخص بھی اِس نعرے کے خلاف بات کرتا ہے یا کام کرتا ہے، وہ گردن زدنی ہے۔ انقلاب دشمن ہے۔ جہاں تک چیئرمین بھٹو کا تعلق ہے، وہ ایک قومی سیاست دان تھا۔ ایک بین الاقوامی شہرت کا حامل انسان تھا اور پاکستان میں اقتدار حاصل کرنے کی سیاست کرتا تھا جیسا کہ دنیا کے تمام سیاست دان اپنا سیاسی کردار ادا کرتے ہیں۔ خود سوویت روس کے لیڈر اپنے بین الاقوامی اور قومی معاملات میں امریکہ کے ساتھ گفت وشنید کرتے ہیں۔ جمہوریہ چین کے لیڈر امریکہ کے ساتھ اپنے سفارتی مذاکرات جاری رکھتے ہیں۔ ہمارے لیفٹ کی یہ انتہا درجے کی غیر سیاسی بات تھی کہ امریکہ کے ساتھ کسی طور پر بھی کوئی بات نہ کی جائے۔ اِس طرح کا سیاسی انقلاب

www.bhutto.org

کا موقف دیوانوں کا موقف تو ہو سکتا تھا، دیوانوں کا خواب تو ہو سکتا تھا، چیئرمین بھٹو جیسے (پریگمٹو) ایک باعمل سیاست دان کا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارے لیفٹ کا یہ موقف عین اسی طرح کا ہے جس طرح کا موقف آج 2009ء میں امریکہ کے بارے میں طالبان اور اس کی حمایتی مذہبی جماعتیں جماعت اسلامی وغیرہ کہہ رہی ہیں کہ امریکہ کے ساتھ سفارتی تعلقات ختم کریں۔

ایک کھلا سوال

پاکستان کا تمام لیفٹ خود اپنی مسلح جدوجہد کے ساتھ ایک خونی انقلاب برپا کرنے کا راستہ کیوں اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف مغربی پاکستان میں چیئرمین بھٹو سے انتخابات کا بائیکاٹ کیوں کروانا چاہتا تھا۔ وہ چیئرمین بھٹو کے کندھوں پر اپنے انقلاب کی بندوق رکھ کر کیوں چلانا چاہتا تھا۔ یہ سوال آج تک ان کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں سے جواب طلب ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ انتخابی کمپین میں مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن پر قتل کے حملے کیوں نہ ہوئے۔ مغربی پاکستان میں صرف چیئرمین بھٹو کی ذات پر انتخابی مہم کے دوران قاتلانہ حملے کیوں ہوئے یا کیوں کرائے گئے تھے۔ افسوس کہ چیئرمین بھٹو جوان کے نزدیک غیر انقلابی تھے وہ تو سامراجی قوتوں کے ہاتھوں تختہ دار پر چڑھا دیئے گئے اور یہ خونی انقلاب کے داعی فوجی حکمران جنرل ضیاء الحق کے ساتھ بھٹو دشمنی میں اس کے اتحادی بن گئے تھے۔ ان کمیونسٹ حضرات کی اکثریت آج بھی زندہ ہے اور آج وہ امریکی سامراج کی بنائی گئی انجیوز (NGO's) کی ملازمتوں کے ذریعے پاکستان میں سرخ انقلاب برپا کر رہی ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ ان کا 1970ء کا سرخ انقلاب کیا ہوا۔ کدھر گیا۔ جس انقلاب کے لئے وہ ذوالفقار علی بھٹو کی جان کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

معراج محمد خان کا مشن انتخابات کا بائیکاٹ کرانا تھا

قصہ مختصر پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر کا وہ لیفٹ جس کا ترجمان معراج محمد خان تھا، اُس کا مطالبہ تھا کہ انتخابات کا بائیکاٹ کرا دیا جائے۔ حالانکہ اُس کے سامنے مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی مثال موجود تھی کہ مشرقی پاکستان میں سمندری سیلاب کی وجہ سے بھاری جانی و مالی نقصان ہو چکا تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ بے گھر ہو گئے تھے۔ لوگوں کی نعشیں سمندر میں تیر رہی تھیں مگر

www.bhutto.org

شیخ مجیب الرحمٰن نے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا تھا اور وہ انتخابات کرانے کا شدت سے مطالبہ کر رہا تھا۔

لہٰذا اِس طرح کی صورتحال میں یکم جولائی 1970ء کو ہالہ کانفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ پاکستان کے تمام صوبوں سے تقریباً ایک ہزار کے قریب مندوبین نے اِس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔

ہالہ کانفرنس ایک ریفرنڈم تھا

پاکستان پیپلز پارٹی کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے کے بارے میں ہالہ کانفرنس ایک ریفرنڈم کی حیثیت رکھتی تھی۔ پاکستان کے چاروں صوبوں سے پارٹی تنظیموں کے عہدے داروں نے اور چاروں صوبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیتوں، دانشوروں اور سیاسی کارکنوں نے اِس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ جس میں بھاری اکثریت رائے سے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یحیٰی خان کی فوجی حکومت پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کے خلاف پارٹی کے اندر اور پارٹی کے باہر بائیں بازو کو ایک باقاعدہ اخباری مہم کے ذریعے اُبھارنے کی کوشش کی پالیسی پر گامزن تھی۔ حکومتی اخبارات اور سرمایہ داروں کے حامی اخبار پیپلز پارٹی کے خلاف کی گئی ذرا سی تنقید کو بھی شہ سرخیوں میں شائع کرتے تھے۔ حکومت کی ہر طرح یہ کوشش تھی کہ پاکستان بھر کے لیفٹ کو چیئرمین بھٹو سے لڑا دیا جائے۔ حکومت کو اپنی اِس پالیسی میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ پیپلز پارٹی کی لیڈر شپ کے خلاف بائیں بازو کا تضاد ایک نظریاتی جنگ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ یہ جنگ صرف لفظوں کی جنگ تھی۔ اخبارات کی جنگ تھی۔ بائیں بازو کی تھیوریوں کی جنگ تھی جو مسلسل پبلسٹی مل جانے کی وجہ سے پارٹی کے اندر بڑی شہرت پکڑ گئی تھی۔ جس کی وجہ سے پارٹی کے اندر ایک قسم کی اپوزیشن کا سا سماں بن گیا تھا۔ ایک کھلی تقسیم دیکھنے میں آرہی تھی۔ پارٹی کے اندر بائیں بازو کی ترجمان تو محض مارکسزم اور لینزم کے نظریاتی فلسفے کے نشے میں ذہنی کفیت میں مبتلا ہو کر اپنی سیاست پر کاربند تھے۔ مگر اُن کے مقابلے میں پارٹی کے اندر متقدر جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ عملی طور پر متحد ہو کر بائیں بازو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اِس طبقے کو متحد کرنے میں

www.bhutto.org

بائیں بازو کی خوامخواہ کی تیز و تند تقریروں کا بہت ہاتھ تھا۔ اِس کے علاوہ پارٹی کے اندر کا تمام اعتدال پسند لیفٹ جو بہت بڑی اکثریت میں تھا، وہ پاکستان کی سیاست کے حالات وواقعات کی معروضیت کی صداقت کی وجہ سے اِس طبقے کی سیاست کا اتحادی بن گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اِس طبقے کی طاقت میں بیش بہا اضافہ ہوگیا تھا۔ لہٰذا اِس طرح کے مرکزی اتحاد کی وجہ سے پارٹی کے اندر انتہا پسند لیفٹ بے حد اقلیت میں مبتلا ہوکر پارٹی سے علیحدہ ہونا شروع ہوگیا۔ وہ ایک قسم کی آئیسولیشن کا یعنی تنہائی کا شکار ہوگیا تھا۔

بائیں بازو کی پارٹی کے اندر اِس انتہا پسندی اور اِس کے بعد اُس کی بے وقعتی یا اُس کی آئیسولیشن سے پارٹی کے مجموعی کردار کو بہت نقصان پہنچا۔ اگر بائیں بازو کے ترجمان پاکستان کی صحیح سیاسی صورتحال کا ادراک کرتے ہوئے پارٹی کے اندر اپنے انقلابی نظریات کا توازن قائم رکھتے۔ انتخابات کے بائیکاٹ کو اپنی جمہوری رائے تک محدود رکھتے۔ انتخابات میں اکثریت کے حصہ لینے کو ایک جمہوری اُصول کے مطابق تسلیم کرتے ہوئے پارٹی کے ساتھ چلتے تو اِس سے پارٹی کے نظریاتی تشخص کو کوئی نقصان نہ پہنچتا اور نہ ہی کارکنوں کی اکثریت کوئی ذہنی دھچکا محسوس کرتی، اور نہ ہی ان کا کردار بے معنی ثابت ہوتا۔

مگر افسوس کہ بائیں بازو کے انتہا پسند ترجمانوں کا رویہ ایک غیر جمہوری رویہ بن گیا تھا۔ وہ چیئرمین بھٹو کے ساتھ اپنے اختلاف کے انداز کو اپنا اعزاز تصور کرنے لگ گئے۔ اُن کے نزدیک پارٹی میں ایک نظریاتی اور انقلابی کارکن وہی ہوسکتا تھا جو چیئرمین بھٹو کی سیاست کی مخالفت کرتا تھا اور پارٹی کی اجتماعی سیاست کے خلاف بات کرتا تھا۔ میرے سیاسی تجربات کے مطابق یہ ایک انارکسٹ رویہ تھا اور کچھ لوگوں کی ذہنی انارکی پر مبنی تھا۔ اِس کا پارٹی کی صحت مند سیاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اِس معاملے میں ایک اہم ترین بات یہ بھی تھی کہ یہ رویہ اُس وقت اپنایا گیا تھا جب پارٹی نے نہ تو ابھی انتخاب جیتا تھا اور نہ ہی اقتدار حاصل کیا تھا۔ اُس وقت تو قیادت اور پارٹی صرف پاکستان کی طاقتور حکمران اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ سیاسی جنگ لڑ رہی تھی جس کا مارشل لائی نظام میں کوئی مستقبل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پیپلز پارٹی کا انتخاب میں حصہ لینا ہی پاکستان میں اسٹالن گراڈ کی جنگ بنا دیا گیا تھا۔ بہت مشکل بنا دیا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ انتخابات کی تحریک نہیں تھی، پیپلز پارٹی کے وجود کی جنگ تھی۔

www.bhutto.org

ہم نے دیکھا کہ اِس انتہا پسندی کی جنگ میں سب سے زیادہ نقصان خود بائیں بازو کے ترجمانوں کو ہی ہوا۔ انتخابات کے بعد ایک ایسا وقت آیا کہ وہ پاکستان کی سیاست سے ہی باہر ہو گئے، اور ایک وقت وہ بھی آیا جب وہ اسٹیبلشمنٹ کی ایجنسیوں کی سیاست کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ہالہ کانفرنس میں صرف معراج محمد خان نے انتخابات میں حصہ لینے کی مخالف کی تھی۔ اُن کی تقریر مسلح جدوجہد کے حق میں تھی۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ وہ خونی انقلاب سے کم تر کسی تبدیلی کو تسلیم نہیں کرتے۔ معراج محمد خان کے برعکس بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید نے انتخابات میں حصہ لینے کے حق میں تقریر کی تھی جس کی وجہ سے معراج محمد خان کے لوگوں نے شیخ رشید کو غیر انقلابی قرار دیا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا مسئلہ یہ تھا کہ یہ پارٹی اور اس کی قیادت پاکستان کی تخلیق کے بعد پاکستان میں پہلی سیاسی جماعت تھی جو اینٹی اسٹیبلشمنٹ پارٹی کی حیثیت سے وجود میں آئی تھی۔ یہ ایک جمہوری پارٹی تھی۔ ابھی اس پارٹی کی عمر دو سال کی تھی کہ ملک کے قومی انتخابات میں حصہ لینے کا موقع مل گیا۔ اس صورت میں پارٹی کے اندر کے لیفٹ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ لیفٹ کے لوگوں کو انتخابات میں حصہ لینے پر آمادہ کرتی اور زیادہ سے زیادہ بائیں بازو کے لوگوں کو اسمبلی کے ممبرز بنوانے کی کوشش کرتی۔ ہر جمہوری ملک میں پارلیمانی گروپ ہی زیادہ طاقتور ہوا کرتا ہے۔ منتخب نمائندے زیادہ اہم بن جایا کرتے ہیں۔ منتخب نمائندوں کی کلیدی حیثیت ہو جاتی ہے۔ وہ پارٹی کے اندر فیصلوں کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ پاکستان کی معروضی سیاست اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر پارٹی کے اندر کے لیفٹ کو قومی انتخابات کو بے حد سنجیدگی کی نظر سے دیکھنا چاہئے تھا۔ مگر افسوس کہ یہ مزدوروں کے ہمدرد، مجمع باز انقلابی وقت اور تاریخ کے دھارے کے مخالف تھے۔ زندگی کا اصل ادراک ہی نہیں رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے انتخابات لڑنے کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ خود بھی انتخاب لڑنے سے دستبردار ہو گئے۔ اُن کے انتخاب کا میدان کھلا چھوڑنے سے پارٹی کے اندر انتخابات کی سیاست کرنے والوں کے لئے پارٹی کے دروازے کھل گئے۔ انتخابات چونکہ ہمارے جیسے ملکوں میں ہمیشہ جاگیردار اور سرمایہ دار ہی لڑا کرتے تھے۔ لہٰذا پارٹی میں اُن لوگوں کی زیادہ بھرمار ہو گئی۔ جب معراج محمد خان خود کہہ رہا تھا کہ میں غریب ہوں، انتخاب نہیں لڑ سکتا۔ اُس کی اس بات سے کسی دوسرے غریب کارکن کی انتخاب میں حصہ لینے کی کیا گنجائش باقی رہ سکتی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید ہی

www.bhutto.org

وہ واحد لیفٹ کے انسان تھے جو بے حد بیلنس سوچ کے انسان تھے۔ وہ پاکستان کی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عوام کے موڈ سے بھی واقف تھے اور پارٹی کی معروضی قوت اور طاقت سے بھی آگاہ تھے۔ جس کی وجہ سے انہوں نے چیئرمین بھٹو کے انتخابات میں حصہ لینے کی حمایت کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے معراج محمد خان اور اُن کے دوست اُن پر تنقید کیا کرتے تھے۔ 1970ء کے انتخابات میں پنجاب میں پنجاب کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ بھاری تعداد میں عام طبقے کے سیاسی کارکن اور درمیانے طبقے کے لوگ اسمبلی کے ممبر بن گئے تھے۔ سیاسی کارکنوں کو ٹکٹ دینے میں شیخ محمد رشید کا بڑا عمل دخل تھا۔ البتہ پنجاب کے ملتان ڈویژن اور بہاولپور ڈویژن میں چونکہ ٹکٹوں کو الاٹ کرنے کا اختیار ملک غلام مصطفےٰ کھر کے پاس تھا۔ یہ دونوں علاقے جاگیرداروں کے علاقے تھے۔ ان علاقوں میں اکثریت میں ٹکٹ جاگیرداروں کو دیئے گئے تھے۔ یہاں تک کہ نواب صادق قریشی اور اُس کے تمام ساتھیوں کو بھی پارٹی کے ٹکٹ دے دیئے گئے۔

کیا انقلابی دشمن کا ایجنٹ ہوتا ہے یا پاگل ہوتا ہے

چیئرمین بھٹو نے ہالہ کانفرنس میں صرف دو اہم باتیں کی تھیں۔ پہلی بات تو اُنہوں نے اندر اور باہر کے لیفٹ کو مخاطب کر کے کہی تھی کہ تم لوگ اگر کسی انقلاب کے نام پر مجھے خودکشی پر آمادہ کرو گے تو میرا ذہن اِس قسم کی خودکشی کے لئے آمادہ نہیں ہوگا۔ دوسری بات اُنہوں نے کہی تھی کہ جو انقلابی اپنی قوت اور طاقت کا صحیح ادراک نہیں رکھتا، وہ یا تو دشمن کا ایجنٹ ہوتا ہے یا پاگل ہوتا ہے یا مہم جو ہوتا ہے۔ ایجنٹ ایک خاص مقصد کے تحت انقلابی جدوجہد کو تباہ کرانے کی غرض سے لوگوں کو مشتعل کرتا ہے۔ دوسرا اپنی ذہنی وحشت سے تحریک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ تیسرا اپنے تمام خلوص اور اپنے ایمان اور جذبے کی انتہا کی بناء پر اپنی جدوجہد کی تحریک کی قوت کا اندازہ لگائے بغیر ایسی صورتحال کا شکار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ سیاسی خودکشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اپنی نوعیت کے یہ تینوں عمل لوگوں میں مایوسی پھیلاتے ہیں۔ لوگوں کو انقلاب کی جدوجہد سے خوف زدہ کرتے ہیں۔ میں سیاسی مہم جوئی کے خلاف نہیں ہوں مگر ایسی مہم جوئی جو سیاسی جدوجہد کا راستہ روکنے کا باعث بن جائے، اُس کی تعریف یا تقلید کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ کسی بھی قسم کی مسلح جدوجہد کا آغاز کرنا کسی ایمپائر یا حکومت کے خلاف مسلح بغاوت کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔

www.bhutto.org

تمام ریاستی قوتوں یعنی فوج اور پولیس کے خلاف جنگ کرنا ہوتا ہے۔ اِس طرح کی مسلح جدو جہد کی کامیابی کا نام انقلاب بن جاتا ہے اور اگر کوئی مسلح جدو جہد ناکام ہو جائے تو اُس کا نام بغاوت بن جاتا ہے اور اُس کو ملک و قوم کے خلاف غداری قرار دے دیا جاتا ہے۔ جس کی رو سے آمریت اور بادشاہوں کو انقلابیوں کا سرعام قتل کرنے کا قانونی حق حاصل ہو جاتا ہے اور جابر حکومتیں انقلابیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا کر رکھ دیتی ہیں۔

پاکستان امریکی سامراج کا اتحادی ملک ہے۔ جنوبی ایشیا میں سوویت روس کے سرخ انقلاب اور سوشلزم کے خلاف پاکستان امپریلزم کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ سوشلزم کے خلاف پاکستان کی فوجی حکومتیں امپریلزم کی فرنٹ لائن کا کام دیتی ہیں۔ یورپ کے امپریلزم نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے پاکستان کی فوج کو ہر طرح کے جدید اسلحے سے لیس کر رکھا ہے۔ اِس طرح کی جدید ہتھیاروں سے لیس فوجی قوت کو سیاسی تقریروں اور انقلابی نعروں سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

نہ تو میری پارٹی کے اندر ایسے گوریلے موجود ہیں جو ریگستان کی تپتی ہوئی ریت پر چل کر ایک مسلح فوج کا سامنا کر سکیں اور نہ ہی ایسے کمانڈر موجود ہیں جو پہاڑوں پر چڑھ کر گوریلا جنگ جاری رکھ سکیں۔ میری پارٹی کے اندر پنجاب کا سب سے بڑا رہنما شیخ محمد رشید ہے جو دمے کا پرانا مریض ہے جس کا پہاڑ پر چڑھتے ہی سانس اُکھڑ جانے کا خطرہ ہے۔ باقی رہ گیا معراج محمد خان تو معراج محمد خان کا کام تو اختلاف کرنا ہے، عین ممکن ہے کہ اِس کا پارٹی کے انقلاب سے بھی اختلاف ہو جائے اور وہ انقلاب کے بائیکاٹ کا نعرہ لگا کر انقلاب سے باہر ہو جائے۔ چیئرمین بھٹو کی اِس بات پر ہال میں بہت قہقہے لگے۔ کافی دیر تک تالیاں بجتی رہیں اور کانفرنس کا ماحول خوشگوار بن گیا۔ اُن کے اِس طرح کے مزاح سے کانفرنس کے شرکاء کے ذہنوں سے انتخابات کے بارے میں شک و شبہ جاتا رہا۔ اُن کی تقریر کے بعد انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا گیا۔ میرے خیال میں چیئرمین بھٹو کا انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کرنے کا انداز ایک جمہوری انداز تھا اور تعریف کے قابل تھا۔ ہالہ کانفرنس میں پارٹی کے سیکرٹری جنرل جے اے رحیم کی طرف سے ایک کتابچہ جاری کیا گیا تھا جو پارٹی کے بنیادی منشور کی حیثیت رکھتا تھا اور جس میں انتخابات میں حصہ لینے کا تمام طریقہ کار تحریر کر دیا گیا تھا۔

www.bhutto.org

پرچی اور برچھی کی بات

معراج محمد خان نے اپنی انتہائی جذباتی قسم کی معمول کی تقریر میں انقلاب کے بے حد گھسے پٹے محاورے استعمال کرتے ہوئے جملہ کہا کہ ہم پرچی سے نہیں برچھی سے انقلاب لائیں گے۔ اس جملے سے ان کی مراد یہ تھی کہ ہم ووٹ کی پرچی سے نہیں برچھی سے انقلاب لائیں گے۔ اس کے جواب میں چیئرمین بھٹو کی دانش اور منطق ملاحظہ ہو۔

لوگو پرچی کو برچھی بنالو ـــــ بھٹو

چیئرمین بھٹو نے معراج محمد خان کو بڑی استادانہ شفقت کے ساتھ مخاطب کر کے کہا کہ معراج کیوں بیچارے لوگوں کو مشکل میں ڈال رہے ہو جو کام پرچی سے ہو سکتا ہے اس کو میرے بھائی برچھی سے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آج کے کنونشن میں شریک دوستو گواہ رہنا وقت آنے پر میں ووٹ کی پرچی کو برچھی بنا دوں گا۔ میں لوگوں کو کوئی ناقابلِ عمل نعرہ نہیں دوں گا۔ میں پاکستان کے غریب عوام کو آج پیغام دیتا ہوں کہ وہ اپنے ووٹ کو برچھی بنا کر ظالموں، جاگیرداروں، وڈیروں، میروں، پیروں، سرمایہ داروں، ذخیرہ اندوزوں، چوروں، لٹیروں، فوجی آمروں کے دلالوں کے سینوں میں گونپ دیں۔

الیکشن کے دن اپنی کاغذ کی پرچی کو برچھی سمجھیں۔ ظالموں جابروں سے اپنی محرومیوں کا، اپنی مایوسی کا، اپنی مظلومیت کا، اپنی غربت کا، اپنی بے بسی کا انتقام لیں۔ افسوس کہ مجھے قوم کی رہنمائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان انقلابیوں کی بھی تعلیم کرنا پڑ رہی ہے۔

بھٹو ڈوکٹرائن (Bhutto Doctrine)

ثابت ہوا کہ قائد وہ ہوتا ہے جو عوام کی طاقت کو اور ان کے معروضی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کو قابلِ عمل باتوں کی ترغیب دے۔ یہی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت کا کمال تھا۔ لہٰذا یہی وہ بھٹو ازم تھی جس کو بھٹو (Doctrine) کہا جاتا ہے کہ حالات اور ماحول اور واقعات اور صورتِ حال کے برعکس کوئی کام نہ کیا جائے۔

عزت مآب مخدوم محمد زماں طالب المولیٰ مدظلہ آف ہالہ شریف (سندھ)
سینئر وائس چیئرمین پاکستان پیپلز پارٹی

زباں پہ ہمارے خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

قارئین کرام! میں پیر پرست ہرگز نہیں ہوں۔ ہر چند نوشاہی دربار آف ماڑی ٹھاکراں ضلع گوجرانوالہ تحصیل کاموکی میرے دادا کی آخری آرام گاہ ہے۔ اس نسبت سے میں اُن کے پوتے کی حیثیت سے سجادہ نشینوں میں شمار ہوتا ہوں۔ اس کے باوجود میں کبھی دربار کے سالانہ عرس کے میلے میں شریک نہیں ہوتا اور نہ ہی اُن کے مریدوں کے ساتھ اپنا کوئی روحانی تعلق رکھتا ہوں۔ میں اپنے دادا پیر محمد علی المعروف پیر حسن نوشاہی قادری کے مقام و مرتبے کو ہر اعتبار سے تسلیم کرتا ہوں۔ فرق میری اور اُن کی تعلیمات میں آپڑا ہے۔ اُن کی تعلیم خلق خدا کو راضی بارضا رکھنے کی تھی مگر میں اس نوع کی تعلیم کو انسانوں کی غلامی کی تعلیم تصور کرتا ہوں۔ انسانوں کو اپاہج بنانے کی تعلیم قرار دیتا ہوں۔ میں انسانوں کو راضی بارضا رہنے کی نہیں بغاوت اور جدوجہد کی تعلیم دیتا ہوں۔ اُن کو سر جھکانے کی نہیں سر اُٹھانے کی تعلیم دیتا ہوں۔ دعاؤں کی نہیں عمل کی تعلیم دیتا ہوں۔ چھین لینے کی تعلیم دیتا ہوں۔

مگر اپنے فقیر دادا کے ساتھ اپنے اس نظریاتی اختلاف کے باوجود فقیری میرا ورثہ ہے۔ میرے اندر موجود ہے۔ میں فقیر خانوں اور درویشوں اور فقرا کی دل سے پرستش کرتا ہوں۔ اُن سے محبت کرتا ہوں۔ مجھے یہ لوگ دنیا میں سب سے اچھے لوگ لگتے ہیں۔ مجھے یہ لوگ معصوم لوگ لگتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ ہمارے جیسے سفاک معاشروں میں انسانوں کو قلبی سکون عطا کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو روحانی کیمونسٹ خیال کرتا ہوں۔ یہ لوگ ذات پات رنگ نسل مذہب خاندان کی کوئی تفریق نہیں رکھتے۔

ان لوگوں میں مخدوم طالب المولیٰ تو مجھے بے حد معصوم، دلکش اور مثالی انسان دکھائی دیئے تھے۔ وہ اپنی ذات میں جہاں روحانیت کے پیکر تھے۔ لوگوں کی روحانی تعلیم کرتے تھے، وہاں وہ لوگوں کی معاشی اور سماجی ترقی کے بھی معلم تھے۔ ایک باقاعدہ ترقی پسند انسان تھے۔ وہ اپنی

www.bhutto.org

سکّہ بند اور بھاری گدی رکھتے ہوئے بھی ایک سوشلسٹ انسان تھے۔ انسانوں میں معاشی عدل کے خواہاں تھے۔ اُن کا فرمانا تھا کہ دنیا میں دولت اور زمین کی تقسیم خدا کی تقسیم ہرگز نہیں ہے۔ یہ ہماری انسانوں کی قائم کی گئی تقسیم ہے۔ خدا نے زمین کو تمام انسانوں کے لئے بنایا تھا مگر چند لوگوں نے اس کو آپس میں بانٹ کر پوری خلقتِ خدا کو اُن کے حصے سے محروم کر دیا ہے۔ میں اِس زمین کو انسانوں میں برابر برابر بانٹنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ میں پاکستان پیپلز پارٹی کو اپنے مسلک کی علمبردار خیال کرتا ہوں اور اِس پارٹی کا کارکن ہونے پر فخر کرتا ہوں۔ قارئین! ایک بات مخدوم صاحب نے میرے ساتھ بے حد حیران کن کی تھی۔ وہ بات اُس وقت میری حیرانی کیلئے کافی تھی۔ اُنہوں نے مجھے ہالہ شریف میں اپنے دربار نما گھر میں ہی کہی تھی کہ میں ذوالفقار علی بھٹو کو مل کر روحانی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہ شخص اندر سے فقیر ہے۔ میں اُس وقت ان کی بات کی مصلحت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ مگر آج یہ بات آسانی سے میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ مخدوم صاحب لوگوں کے روحانی پیشوا تھے۔ چیئرمین بھٹو لوگوں کے عرفانی پیشوا تھے۔ اِس صورتحال میں لوگوں کیلئے روحانی اور شعوری تعلیم کا نظام قائم ہو گیا تھا اور چیئرمین بھٹو کی شہادت تو لوگوں کیلئے ایک روحانی قوت بن چکی ہے جس قوت سے ہالہ شریف کا فقیر درویش انسان اُن کی زندگی میں ہی راحت اور خوشی محسوس کرتا تھا۔ یہ کیا تعلق تھا؟ کیا سلسلہ تھا۔ میں اِس کی وضاحت میں نہیں جانا چاہتا مگر اُن کے فرزند مخدوم امین فہیم کو اُن کے اِس سلسلے کا تسلسل ضرور خیال کرتا ہوں۔

میں جب ہالہ شریف میں مخدوم طالب المولیٰ کے دربار نما گھر میں پہنچا تو مخدوم صاحب اپنی فقیری روایت کے مطابق قالین پر اپنی کچہری لگائے ہوئے تھے اور اِس کچہری میں میر مجلس چیئرمین بھٹو تشریف فرما تھے۔ اُن کے دائیں بائیں میر رسول بخش تالپور، محترم ممتاز علی بھٹو، محترم حفیظ پیرزادہ، محترم قاسم پٹیل، محترم عبدالرزاق سمرو، محترم مرحوم چاکر علی جونیجو، محترم حنیف رامے (مرحوم) تشریف رکھتے تھے۔

میں چونکہ خود بھی فقیر زادہ تھا۔ ایک درویش کے دربار کی تسلیمات سے واقف تھا۔ میں نے اُن کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ اپنے سر کی جنبش سے اُن کی تعظیم کو تسلیم کیا اور اُن سے کچھ دور بیٹھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک دم اپنی فرشی نما نشست سے اوپر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ شاعر صاحب آپ وہاں نہیں، میرے قریب آ کر بیٹھیں۔ اِس طرح میں اُن کے قریب چلا گیا۔ اُن

www.bhutto.org

سے بغل گیر ہوا اور اُن کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ چیئرمین بھٹو ہر چیز کو بہت غور سے دیکھا کرتے تھے۔ اُنہوں نے میری بطور شاعر پذیرائی کو بغور دیکھا اور مسکرا دیئے۔

میرے بیٹھنے کی دیر تھی کہ مجھے بھٹو صاحب نے اپنی حسب عادت کہا۔ اسلم! مخدوم صاحب کو اپنی نظم ''اسلامی سوشلزم'' سناؤ۔ میں نے حاضرین محفل کو نظم اسلامی سوشلزم سنانا شروع کر دی۔ میں نے دیکھا کہ مخدوم صاحب کا داد دینے کا طریقہ دوسرے لوگوں سے بے حد مختلف تھا۔ میں نے جب نظم ختم کی تو کہنے لگے کہ بھٹو صاحب! یہ نظم آپ کی عوامی جدوجہد کا جنگی ترانہ ہے۔ اُن کی اِس بات کی سب لوگوں نے تحسین کی۔ میں نے اُن اِس دانش ورانہ بلکہ شاعرانہ آرا پر اُن کے زانوں کو ہاتھ لگایا۔ یہ انداز ہم شاعر لوگ اُس وقت اپناتے ہیں جب کسی شخص کو استادانہ قسم کی تعظیم دینا چاہتے ہیں۔

چیئرمین بھٹو کا مجھے نظم پڑھنے کا کہنے کا مقصد مخدوم صاحب سے میرا تعارف کروانا مقصود تھا۔ نظم کے بعد مندوبین کو ٹھہرانے کے بارے میں باتیں شروع ہوگئیں۔ جب یہ مجلس برخاست ہونے لگی تو بھٹو صاحب نے مجھے کہا کہ تم قاسم پٹیل کے ساتھ چلے جاؤ۔ چیئرمین بھٹو میں ایک بلا کی خوبی تھی۔ وہ خوبی یہی تھی کہ سندھ میں باہر سے آنے والے اپنے ہر مہمان کا وہ خود خیال رکھتے تھے۔ اِس معاملے میں، میں نے اُن کو ہمیشہ بہت حساس پایا تھا۔ مجھے قاسم پٹیل کے ساتھ بھیجنے میں بھی اُن کا وہی مہمان نوازی کا احساس کارفرما تھا۔ قاسم پٹیل کراچی کے ایک بہت مالدار انسان تھے جن کو کراچی میں سیٹھ کہا جاتا تھا۔ وہ بہت اچھے انسان تھے اور میرے بہت مہربان دوست تھے۔ چیئرمین بھٹو کا خیال تھا کہ قاسم سیٹھ میرا اچھی طرح خیال رکھے گا۔ مگر مخدوم طالب المولیٰ صاحب نے مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کا کہہ دیا۔ اُنہوں نے بھٹو صاحب سے کہا کہ سائیں! یہ تو ہمارے پاس ہی ٹھہرے گا۔ چیئرمین بھٹو میری شاعرانہ عادت کو جانتے تھے۔ اُنہوں نے فوراً سندھی میں طالب المولیٰ صاحب کو کہا کہ پیر سائیں! ماڑوں شاعر تھیند و۔ یعنی یہ شاعر ہے۔ اُن کے اِس ایک لفظ میں بڑے معنی پوشیدہ تھے۔ اُن کا مطلب تھا کہ یہ بہت آزاد رو قسم کا انسان ہے۔ مخدوم صاحب نے بہت محبت کے ساتھ بھٹو صاحب کو کہا کہ سائیں! اِسی لئے تو اِس کو اپنا خاص مہمان بنایا جا رہا ہے کہ یہ شاعر ہے اور ایک شاعر کو تو ایک شاعر کے گھر ہی ٹھہرنا چاہیے۔ مجھے اُس وقت معلوم ہوا کہ مخدوم زمان طالب المولیٰ شاعر بھی ہیں۔ اِس طرح اُن کی شفقتِ خاص

www.bhutto.org

کے تحت مجھے اُن کے خاص مہمانوں کی طرح مخدوم ہاؤس میں ٹھہرا دیا گیا۔

رات کو مخدوم صاحب کی مجلس خاص کی کچہری منعقد ہوئی۔ مجھے اُس میں طلب کیا گیا۔ میر رسول بخش تالپور اور کچھ دوسرے پارٹی کے لوگ اُن کے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے مخدوم صاحب کو اُن کا کلام سنانے کی فرمائش کی جو منظور کر لی گئی۔ وہ اپنے سندھی اشعار کا ترجمہ بھی خود ہی کرتے جاتے تھے۔ مخدوم صاحب سندھی زبان کے شاعر تھے۔ اُن کے اشعار کا ترجمہ سن کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ مکمل طور پر تصوف کے شاعر تھے۔ دوسرے صوفی شاعروں کی طرح وہ بھی وحدت الوجود یئے تھے اور اپنی زبان کے قادرالکلام سخنور تھے۔ اُن کا دیوان بھی شائع ہوا تھا۔ اُس وقت مجھے اُن کے دیوان کا نام یاد نہیں آرہا۔ اُن کے سنائے گئے شعروں میں ایک جگہ زخمی آہو یعنی ہرن کا ذکر آیا تو میں نے اُن کو فارسی کے فقید المثل شاعر صائب کا شعر سنایا جو فارسی شاعری میں ایک سند کی حیثیت رکھتا تھا۔

دوست دشمن می شود صائب بہ وقتِ بے کسی
خونِ زخمِ آہو اں رہ می دہد صیّاد را

شعر کا مطلب یہ ہے کہ بُرے دنوں یا مصیبت کے دنوں میں انسان کے دوست بھی اُس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ جس طرح زخمی ہرن کا اپنا خون ہی زمین پر گر کر شکاری کو اُس کی پناہ گاہ میں لے جاتا ہے۔

مخدوم صاحب صائب کا شعر سُن کر جھوم اُٹھے۔ اُس کے ساتھ ہی اُنہوں نے صائب کی پوری غزل سنادی جس غزل کا میں نے اُن کو یہ شعر سنایا تھا۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ اُن کی زبان سے سرمد مجذوب کا شعر سنا تھا جس کو مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جرم برہنگی پر تہہ تیغ کر دیا تھا۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ بے لباسی اختیار کیئے رکھتا تھا اور اپنی حالت سے بیگانہ رہا کرتا تھا۔ مجھے مخدوم صاحب کی زبانی اس بات کا علم حاصل ہوا کہ سرمد صاحبِ حال ہونے کے ساتھ فارسی زبان کا باکمال شاعر بھی تھا۔ مخدوم صاحب نے مجھے سرمد کا یہ شعر سنایا تھا۔

شورِ شدؔ از خوابِ عدمِ چشم کشودیم
دیدم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

میں ابھی عدم میں ہی سویا ہوا تھا جس کو خواب کی زندگی کہا جاتا ہے کہ زندگی کے شور وغل

www.bhutto.org

سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ زندگی کی سیاہ رات کی فتنہ پردازی ابھی باقی تھی۔ میں دوبارہ سوگیا۔ مقصد اِس کا یہ تھا کہ میں زندگی کے ہنگامے میں شریک ہی نہیں ہوا۔

مخدوم صاحب نے سرمد کا ایک دوسرا شعر بھی سنایا تھا جس کا صرف مفہوم مجھے یاد رہ گیا ہے۔ مفہوم یوں تھا۔ میرا سر میرے کندھوں پر بھاری بھوج بن چکا تھا۔ جلاد کے اُتارنے سے میں آسودہ ہوگیا ہوں۔ مجھے راحت مل گئی ہے۔

میں نے مخدوم صاحب کو قرۃ العین طاہرہ بابی کے کچھ شعر سنائے جس کو زرّین تاج بھی کہا جاتا تھا۔ زرّین تاج کو بھی ایران کے شہنشاہ قاچار نے کفر کا الزام لگا کر قتل کروادیا تھا۔ اُس کا انجام بھی سرمد ہی کا سا تھا۔ مخدوم صاحب نے میری بڑی تعریف کی کہ ایک سیاسی شاعر کو فارسی ادب کی کلاسیکل شاعری کا بھی شعور حاصل ہے۔ مخدوم صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا استاد کون ہے؟ میں نے اُن کو ظہیر کاشمیری صاحب کا نام بتایا۔ اتفاق یہ تھا کہ ظہیر کاشمیری مخدوم صاحب کے چند خاص ترین دوستوں میں سے تھے۔ مخدوم صاحب نے ظہیر صاحب کی نظم ''آدمی نامہ'' اور ''نئے چاند'' کے عنوان سے کہی گئی نظم کی بہت تعریف کی۔

مخدوم زماں طالب المولیٰ صاحب جب تک حیات رہے، میرا اُن کے ساتھ بہت نیاز مندی کا سلسلہ قائم رہا۔ مخدوم صاحب ایک صاحب علم اور دانشور انسان تھے اور بڑے وسیع مطالعے کے آدمی تھے۔ مخدوم صاحب کے بعد اُن کے فرزند ارجمند سینئر وائس چیئرمین مخدوم امین فہیم کا بھی حسن مذاق اور ذوق علم وادب اپنے برگزیدہ والد محترم کا سا ہی ہے۔ اُن کے ساتھ بھی میری محبت کا بہت جذباتی سلسلہ قائم ہے۔ محبت کے اِس سلسلے میں خود اُنہی کی جانب سے سرد مہری کا مظاہرہ ہوا تھا۔ حالانکہ میں نے تو اپنی محبت اور عقیدت کے مظاہرے کیلئے پچھلے سال اپنی مشہور تاریخی کتاب ''کیا پاکستان ایک ناکام ریاست ہے؟'' کی تقریب رونمائی کا اُنہیں صدر مجلس بنایا تھا۔ باقاعدہ کارڈز تقسیم کیے تھے جس میں مخدوم صاحب کی اجازت اور رضامندی بھی شامل تھی۔ مگر عین اُس روز جس روز کتاب کا افتتاح تھا، اچانک اُن کے ایک ذاتی دوست چوہدری بشیر حسین تشریف لائے اور اُنہوں نے مجھے مخدوم صاحب کی جانب سے معذرت کا پیغام پہنچادیا جو میرے دل ودماغ کے لئے ایک بہت بڑا جھٹکا تھا۔ وہ اِس لئے کہ میں ایک صاحب سلوک خاندان کے چشم و چراغ اور سجادہ نشین سے اِس طرح کی وعدہ خلافی کی اور قول

www.bhutto.org

شکنی کی تو قع نہیں رکھتا تھا۔تقریب کے بعد مجھے علم ہوا کہ مخدوم صاحب پارٹی کے دو ایک جاہل ترین عہدے داروں کے کہنے کی وجہ سے تقریب میں تشریف نہیں لائے تھے۔افسوس کہ مخدوم زمان طالب المولیٰ کے نورِعین مخدوم امین فہیم سجادہ نشین آف ہالہ شریف، پارٹی کے دو تین جہلا اور ایک فقیر علم و ادب میں فرق اور موازنہ ہی نہ کر پائے۔ حالانکہ ایک پیر طریقت کی بنیادی صفت ہی اُس کا صاحب نظر ہونا ہوتا ہے۔

حضرات! یہاں پر مجھے جھنگ کے ایک جانگلی شاعر کی کہاوت یاد آ گئی ہے۔جو کہاوت اُس نے تقسیم ہندوستان پر قائداعظم کو مخاطب کر کے جھنگ کی پنجابی میں کہی تھی۔اُس نے کہا تھا:

کونجاں دے کے گرجاں لیاں ایں
کی کیتا ای محمد علی جناح

اُردو میں اِس کو یوں تحریر کیا جائے گا کہ اے محمد علی جناح! تو نے تقسیم ہندوستان میں تبادلہ آبادی میں کونج جیسے خوبصورت لوگوں کو ہندوستان کو دے دیا اور اُس کے بدلے چیلوں کی طرح کے لوگوں کو قبول کر لیا۔یہ کیا سودا کیا تو نے؟

قصہ میرے پارٹی کے مقرر بن جانے کا

پاکستان پیپلز پارٹی کے جب انتخابی ٹکٹ تقسیم کر دیئے گئے تو پورا مغربی پاکستان انتخابی حلقوں میں تقسیم ہو گیا۔اس کے ساتھ ہی پاکستان پیپلز پارٹی بھی انتخابی حلقوں میں تقسیم ہو گئی اور ہر انتخابی حلقے میں جلسے جلوس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ملک کی اجتماعی سیاست صرف چیئرمین بھٹو کے بڑے جلسوں تک ہی محدود تھی۔باقی ہر اُمیدوار اپنی انفرادی انتخابی سیاست میں مصروف تھا۔اُس کی سیاست کا دائرہ اپنے حلقے تک ہی محدود ہوتا تھا۔اِس طریقے سے ایک ہی وقت میں جلسوں کی بھرمار ہو جاتی تھی۔

یہ کریڈٹ بھی چیئرمین بھٹو کی ذات اور پیپلز پارٹی کی سیاست کو جاتا ہے کہ اِس پارٹی نے گلی گلی شہر شہر سیاسی مقرر پیدا کر دیئے تھے۔وگرنہ پیپلز پارٹی کی سیاست سے پہلے تمام سیاسی جماعتوں میں چند نام کے مقرر ہوا کرتے تھے۔اُن کے علاوہ کسی دوسرے کا یا عام سیاسی کارکن کا تقریر کرنا ممکن ہی نہیں تھا، رواج ہی نہیں تھا۔اِس کے علاوہ اصل بات یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کی عوامی

www.bhutto.org

سیاست سے پہلے انتخابات کی سیاست کا طریقہ کار بہت مختلف ہوا اور محدود ہوا کرتا تھا۔ انتخابات کیلئے چیئرمین بھٹو کی طرح کے جلسہ عام کا کوئی رواج نہ تھا اور نہ ہی عام انتخابات میں کسی سیاسی جماعت کا کوئی منشور ہوتا تھا۔ اوّل تو پاکستان میں قیام پاکستان کے بعد کبھی بھی ملک گیر جمہوری انتخابات کرائے ہی نہیں گئے تھے۔ پاکستان کے ابتدائی ایام میں انتخابی حلقے جاگیرداروں اور الیکشن باز قسم کے لوگوں کے نام سے منسوب ہوتے تھے۔ اُن کے ناموں کا اعلان کر دیا جاتا تھا۔ ہر حصے میں چند چوہدریوں کے اجتماع ہو جایا کرتے تھے اور یہ چوہدراہٹیں جس امیدوار کے حق میں فیصلہ کر دیتی تھیں، لوگ اُس کو ووٹ ڈال دیتے تھے۔ ووٹ ڈالنے کا تعلق کسی بھی ووٹر کے کسی نظریے یا کسی موقف کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا تھا۔ جس طرح حکومت بنانے کا طریقہ حکومت برائے حکومت ہوتا تھا۔ بس ایک نئی حکومت بنانا ہوتا تھا۔ اِسی طرح ووٹ ڈالنا بھی بس ووٹ ڈالنا ہی ہوتا تھا۔ نہ تو یہ کوئی متعین اُصول تھا کہ نئی حکومت کیوں بنائی جا رہی ہے اور نہ ہی یہ اُصول کارفرما تھا کہ کسی جماعت یا کسی اُمیدوار کو ووٹ کیوں ڈالے جا رہے ہیں۔ حکومتیں تبدیل کرنا یا نئی حکومتیں بنانا ووٹ ڈالنا چند دن کیلئے دعوتیں اُڑانے کا عمل ہوتا تھا۔ ہر اُمیدوار اپنے حلقے کے کھاتے پیتے گنتی کے کچھ لوگوں کو مرغ پلاؤ کھلا دیا کرتا تھا۔ اِس انتخابی من وسلویٰ میں عام آدمی کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ اور اِس کھابہ گیری کے عمل کو انتخابی جلسہ تصور کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ قیام پاکستان کے بعد بہت مختصر وقت تک قائم رہا تھا۔ 1958ء میں پاکستان میں مارشل لا لگا کر اِس طرح کا سیاسی عمل بھی ختم کر دیا گیا تھا۔ اِسکے بعد فوجی جرنیلوں نے اپنی پارٹیاں بنا کر محدود قسم کے انتخابات کا طریقہ ایجاد کر دیا۔ جن انتخابات کو کبھی تو بنیادی جمہوریت کے انتخاب کا نام دیا گیا اور کبھی غیر جماعتی انتخاب کا نام دیا گیا تھا۔ لہٰذا 1970ء کا انتخاب پاکستان کا پہلا جمہوری انتخاب تھا جس انتخاب کو پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ آج تک اپنی پہلی غلطی قرار دیتی چلی آ رہی ہے۔ اُس کے کہنے کے مطابق عام جمہوری انتخابات کے نتائج کی وجہ سے اقتدار کی ہر چیز اُن کے ہاتھوں سے باہر ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ کبھی بھی پاکستان میں آزادانہ اور جمہوری انتخاب نہیں ہونے دیتی۔ اب اُس نے کنٹرولڈ انتخابات کا طریقہ اختیار کر رکھا ہے جس کی وجہ سے انتخابات ہو جانے کے باوجود ملک کا تمام اقتدار اُس کے پاس ہی رہتا ہے۔

بات میرے مقرر بن جانے کی ہو رہی تھی۔ معاملہ یوں تھا کہ انتخابات کی تحریک میں گلی گلی

www.bhutto.org

جلسے کیئے جارہے تھے۔ میں 1970ء کے انتخابات کو محض انتخابی مہم نہیں کہتا۔ وہ انتخابات ایک تحریک تھے۔ ایک مشن تھا۔ ایک نظریہ تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ 1970ء کے انتخابات سوشلسٹ انتخابات تھے تو غلط نہ ہوگا۔ 1970ء کے انتخابات میں رجعت پسندوں کو شکست فاش ہوئی تھی اور سوشلزم کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ لہٰذا 1970ء کے انتخابات کو چیئرمین بھٹو کی عوامی سیاست اور دانش وفکر اور عوامی حقوق کی جدوجہد نے ایک قسم کے نظریاتی انتخابات بنادیا تھا۔ یہ انتخابات رائیٹ اور لیفٹ کے انتخابات بن گئے تھے۔ یہ انتخابات ایک ڈائیلاگ بن گئے تھے۔

یہ انتخابات ''جیو'' اور ''جیو ناٹ'' کی جنگ بن گئے تھے۔ یہ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے خلاف عوام کا ریفرنڈم بن گئے تھے۔ یہ انتخابات استحصالی طبقوں کے خلاف عوام کی بغاوت بن گئے تھے۔ یہ انتخابات امریکی سامراج کی کلونلزم کی سیاست کے خلاف نفرت کا اظہار تھے اور پاکستان کو امریکہ کی غلامی سے آزاد کرانے کا اعلان تھے۔ اِس کے ساتھ ہی یہ انتخابات پاکستان کے عوام کو پاکستان کی سامراج پرست پٹھو اسٹیبلشمنٹ کی حکمرانی سے نجات دلانے کا ایک آئینی ذریعہ بن گئے تھے۔ جس کو بعد میں قبول نہ کیا گیا اور پاکستان توڑ دیا گیا تھا۔

لہٰذا اِس طرح کے شعوری قسم کے انتخابات نے پاکستان پیپلز پارٹی کے انتخابی جلسوں کی بجائے اِن جلسوں کو سوشلزم کی تعلیم کے مدرسے بنادیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کی سیاسی تعلیمات نے شہروں کو اور دیہاتوں کو نظریاتی بحث ومباحثے کے سکول اور کالج کا بنادیا تھا۔ وہ اَن پڑھ عوام جو سوشلزم کے نظریاتی اُصولوں کے گوعلم سے واقف نہیں ہوتے تھے، مگر وہ دل سے اِس علم کے مفہوم کو محسوس کرتے تھے۔ وہ ہر مقرر کی بات آسانی سے سمجھ لیتے تھے۔

لہٰذا انتخابی جلسوں کی اِس قسم کی ذہنی اور نظریاتی فضا میں پیپلز پارٹی کا ہر کارکن مقرر بن گیا تھا۔ لہٰذا 1970ء کی تمام عوامی تحریک تقریروں کی تحریک تھی۔ نظریات کی ڈبیٹ تھی۔ جس تحریک کی تمام طاقت اور قوت سیاسی جلسے اور جلوس تھے۔ اِس کے علاوہ اِس تحریک میں کسی منظم نظریاتی عمل کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انتخابات کے نتائج نکلنے کے بعد اِس تحریک کی تمام قوت اور طاقت کا استخراج ہوگیا تھا۔

ہر مقرر کا اپنا سوشلزم تھا۔ اپنا انقلاب تھا۔ کسی مقرر کو بھی اِس بات سے کوئی علاقہ نہیں تھا کہ سوشلزم لاگو کیسے کیا جائے گا یا ایک سوشلسٹ حکومت کی تشکیل کس طرح ممکن ہوگی۔ سماجی قوانین کس

www.bhutto.org

طرح بنائے جائیں گے۔ معاشرے کے طبقاتی تضادات اور امتیازات کس طرح ختم کئے جائیں گے۔ اِن کے بارے میں کوئی مقرر کچھ نہیں جانتا تھا۔ ہر مقرر اِن عوامل سے قطعی طور پر بے بہرہ تھا کہ محنت کشوں کے حالات کو کس طریقے سے تبدیل کیا جائے گا۔ کسان اور مزدور کے حالات کو کس طرح بدلا جائے گا۔ صنعتوں کا نظام کس طرح کا بنایا جائے گا۔ زمینوں کا نظام کس طرح بنایا جائے گا۔ اِن باتوں کا اُن کو کچھ علم نہیں ہوتا تھا۔ اُن کی تقریروں میں صرف ہر چیز کو چھین لینے کا مدعا ہوتا تھا۔ بس وہ ایک ہی بات کہے جاتے تھے کہ زمینوں کو چھین لو۔ کارخانوں کو چھین لو۔ اِس طریقے کے ساتھ بغیر کسی منظم تیاری اور تنظیم کی قوت کے اِس طرح کے انتہا پسندی کی تقریریں کی جاتی تھیں اور نعرے لگائے جاتے تھے جو بالآخر لوگوں کی خواہشات کو ایک ایسی انتہا تک لے گئے، جس انتہا کی تکمیل کرنا ناممکن بات تھی۔ جس کا نتیجہ ذہنی انارکی کے سوا کچھ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

لوگ انتخاب کو ہی انقلاب تصور کر بیٹھے تھے

جو کہ ایک اَن سائنٹیفک بات تھی۔ وہ انتخابات تو 25 سال کی لوگوں کی زبان بندی اور سیاسی اور معاشی گھٹن کا کتھارسس تھا۔ جس کتھارسس کو چیئرمین بھٹو کی انتخابی حکمت عملی نے ایک ذہنی انقلاب بنا دیا تھا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ چیئرمین بھٹو نے پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور اُس کے آقا امریکی سامراج کے سامنے عوام کے تشخص کا مینار کھڑا کر دیا تھا۔ پاکستان کے عوام کو اُس کی حیثیت سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس کو اس کی ذات کا احساس دلا دیا تھا۔ اس کو شعور دے دیا تھا۔ یہی کام چیئرمین بھٹو کا ایک باکمال اور لازوال کام تھا جو اُنہوں نے اپنی قوم کے لئے سرانجام دیا تھا۔ اِس لئے کہ رہنما تو صرف شعور ہی عطا کیا کرتے ہیں۔ باقی کام قوموں کو خود ہی کرنا ہوتا ہے۔

ہماری پارٹی کے مقررین جیسا کہ میں نے پیچھے عرض کیا کہ ایک قسم کے انتہا پسندی کے مقرر ہوتے تھے، ان کی تقریر میں علم و فلسفے کی کوئی بات نہیں ہوتی تھی، بس چھین لو کی بات ہوتی تھی مگر اُن کی اِس تمام انتہا پسندی میں ایک چیز مشترک ہوتی تھی کہ وہ اپنے معاشرے میں اور اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ آگے بڑھنے کی خواہش ضرور رکھتے تھے۔ لہٰذا اِس طرح کی تقریروں کی فضا میں ہر اُمیدوار کی خواہش ہوتی تھی کہ اسلم گورداسپوری ہر صورت اُس کے حلقے میں آ کر نظم پڑھے۔ میں جب اِن جلسوں میں شروع شروع میں نظم پڑھ کر بیٹھ جاتا تو نظم کے بعد

مجھے بے شمار قسم کی بے ربط تقریریں سننا پڑتی تھیں۔ میرے ذہن میں بار بار یہ خیال اُٹھتا تھا کہ اِن مقررین سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ اِن باتوں کو کہا جاسکتا ہے جو باتیں وہ انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اِن مقررین کی تقریروں سے پڑھنے لکھے لوگوں کی پارٹی کے بارے میں یہ رائے قائم ہوتی جارہی تھی کہ یہ محض نعرے بازوں کی پارٹی ہے۔ اِس طرح کی صورتحال نے میرے اندر تقریر کرنے کی تحریک پیدا کردی۔

میں نے اپنی تقریر کا آغاز شیخ صفدر علی مرحوم کے انتخابی جلسے سے کیا تھا۔ شیخ صاحب کا جلسہ سمن آباد گول چکر مزنگ روڈ پر ہورہا تھا۔ شیخ صفدر صاحب کوثر نیازی کی منت سماجت کرکے جلسے میں آنے کا کہہ کر آئے تھے۔ کوثر نیازی کو کوئی دوسرا ضرورت مند انتخابی اُمیدوار اپنے جلسے میں لے گیا۔ شیخ صاحب بے حد پریشان تھے کہ میں اُن کے جلسے میں پہنچ گیا۔ وہ کوثر نیازی کا گلہ کرنے لگ گئے۔ میں نے شیخ صاحب کو کہا کہ آپ فکر نہ کریں۔ آپ میری تقریر کا اعلان کریں اور باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیں۔ شیخ صاحب نے میری تقریر کا اعلان کردیا۔ میں نے لوگوں سے خطاب کرنا شروع کردیا۔ دو چار منٹ میں ہی میں نے لوگوں کے سانس مٹھی میں بند کرلئے۔ لوگ تو جلسے کے اعلان کے مطابق کوثر نیازی کو سننے آئے تھے مگر میں نے اپنی تقریر کے زور سے لوگوں کے ذہنوں سے کوثر نیازی کا خیال ہی نکال دیا۔ اس طرح یہ جلسہ میری تقریر کے ساتھ ہی اختتام پذیر ہوگیا۔ شیخ صفدر صاحب مرحوم بہت خوش ہوئے۔ اِس طرح اُنہوں نے اپنے تمام انتخابی جلسوں کا سب سے بڑا مقرر مجھے بنالیا اور وہ کوثر نیازی کی محتاجی سے آزاد ہوگئے۔

میں نے شیخ صفدر علی کے جلسوں میں ابھی پانچ چھے تقریریں ہی کی تھیں کہ پورے لاہور میں میری تقریروں کی دھوم مچ گئی۔ شہر کے دوسرے اُمیدواروں نے مجھے اپنے جلسوں میں بلانا شروع کردیا۔ اِس طریقے سے میں 1970ء کے انتخابی جلسوں کا کوثر نیازی کے بعد سب سے زیادہ مصروف ترین مقرر بن گیا تھا۔ لاہور سے میری تقریروں کا غوغا پنجاب کے دوسرے شہروں تک بھی پہنچ گیا۔ لوگوں نے مجھے لاہور سے باہر کے جلسوں میں بھی بلانا شروع کردیا۔ اِس طرح فیصل آباد کے انتخابی جلسے میں میرا کوثر نیازی کے ساتھ تقریری ٹاکرا ہوگیا اور اُن کے ساتھ ناچاکی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کوثر نیازی کی شکل تو سرخ سفید تھی مگر اُس کا دل بہت کالا تھا۔ وہ اندر سے انتہا کا کینہ پرور انسان تھا۔

www.bhutto.org

کوثر نیازی کے ساتھ مناقشت اور ناچاکی کی ابتداء

کوثر نیازی کے ساتھ جلسے میں جانے سے پہلے ایک اُمیدوار کے گھر میری ملاقات ہوگئی۔ مولانا مجھ سے اِس بات کا اصرار کرنے لگ گئے کہ تم جلسے میں نظم پڑھو اور میں تقریر کروں گا۔ اُن کا کہنا تھا کہ تم بھٹو صاحب کے جلسے میں نظم پڑھتے ہو، لہٰذا میرے جلسے میں بھی نظم پڑھو۔ اِس مسئلے میں وہ خود کو ایک طرح سے بھٹو صاحب کے برابر ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ میں نے اُسے کہا کہ حضرت! میں صرف بھٹو صاحب کے جلسے میں نظم پڑھتا ہوں۔ اُن کی عدم موجودگی میں صرف تقریر ہی کرتا ہوں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہاری تقریر بازی سے تمہاری شاعری کو بہت نقصان پہنچے گا۔ میں نے اُن سے کہا کہ مولانا! مجھ سے لوگوں کی جہالت کی تقریریں نہیں سنی جاتیں۔ جس کی وجہ سے میں نے تقریریں کرنا شروع کر دی ہیں۔ مجھے اگر یہ علم ہوتا کہ اِن لوگوں نے آپ کو تقریر کے لئے بلایا ہے تو میں اِن کے جلسے میں ہرگز نہ آتا۔ کسی دوسرے جلسے میں چلا جاتا۔ مجھے آپ کا مقابلہ کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ میرا اِس شہر میں آپ کے ساتھ تقریر کرنے کا اعلان ہو چکا ہے۔ لہٰذا میرا اِس جلسے میں تقریر کرنا ہی مناسب رہے گا۔ نظم پڑھ کر میں کارکن ساتھیوں کے اشتیاق کو پورا نہیں کر سکوں گا۔ اِس کے ساتھ ہی وہ لوگ مجھے اور مولانا کو جلسے میں لے کر چلے گئے۔ عشاء کی اذان کے بعد کا جلسہ تھا۔ رات کا سماں تھا۔ موسم خوشگوار تھا اور آتش جوان تھا۔

مولانا سے پہلے مجھے تقریر کے لئے پکارا گیا۔ اُن دنوں تقریروں کا موضوع سوشلزم اور اسلام ہی ہوا کرتا تھا۔ میری تقریر کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اگر خداوند کریم اِن مولویوں کی مانتا تو یہ دنیا چار دن قائم نہ رہتی۔ ہر شے ختم ہو جاتی۔ شہر سنسان ہو جاتے۔ گلیاں ویران ہو جاتیں۔ میں نے کہا کہ مولویوں کا مذہب مرزا صاحباں کے قصے کی طرح صاحباں کی بددعا کی طرح کا ہے۔

گلیاں ہو جان سنجیاں وچ مرزا یار پھرے

میں نے کہا کہ ہر فرقے کا مولوی دوسرے فرقے کیلئے خدا تعالیٰ سے یہ دعا کرتا ہے کہ اِس کو تباہ کر دیا جائے۔ مثال کے طور پر خدا اپنی رحمت کی بارش کو تمام انسانوں پر برساتا ہے۔ اِس میں کافروں اور مسلمانوں کی کچھ تخصیص نہیں ہے۔ خدا کی خدائی کی تقسیم کے برعکس سنی فرقے کا مولوی کہتا ہے کہ وہابی فرقے کے لوگوں کی زمینوں کو اپنی بارانِ رحمت سے محروم کر دے۔ اِسی

www.bhutto.org

طرح اُن کا بھی مطالبہ ہے کہ سنی فرقے کے لوگوں کی فصلیں اُجاڑ دے۔ کہو لوگو! خدا کس کا مطالبہ تسلیم کرے۔ یہ لوگ تو صرف اُجاڑ مانگتے ہیں۔ اِن کا آباد کاری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب میں یہ فقرہ کہتا کہ لوگو! مولوی پر اعتبار کبھی نہ کرنا تو کچھ من چلے جیالے مولانا کوثر نیازی کی طرف ہاتھ کر کے کہنے لگ جاتے۔ ''وہ خواہ مولانا کوثر نیازی ہی کیوں نہ ہو''میں نے بار باراُن کو ایسا کہنے سے منع کیا۔ نہیں دوستو! یہ تو ہمارے مولوی ہیں۔ مولوی کوثر نیازی کو یہ صورتحال بڑی ناگوار لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی تقریر کا مضمون بدل کر لوگوں کی توجہ کو سوشلزم کی طرف مائل کر دیا اور پارٹی کا منشور بیان کرنا شروع کر دیا۔ مجھے اپنی تقریر کا آخری مصرعہ یاد آ رہا ہے جس میں، میں نے لوگوں کو عیسائی دنیا کا مسلمان دنیا کے ساتھ موازانہ کر کے بتایا تھا کہ مثال کے طور پر انگلستان جس کو ہم کافروں کا ملک کہتے ہیں، وہاں ایک بچے کے پیدا ہوتے ہی ریاست اور حکومت اُس کے دودھ کا وظیفہ لگا دیتی ہے۔ وہ بڑا ہوتا ہے تو مفت تعلیم اُس کو فراہم کرتی ہے۔ تعلیم سے فارغ ہوتا ہے تو اُس کو ملازمت فراہم کرتی ہے۔ بے کار کو بے کاری الاؤنس دیتی ہے۔ بیمار ہوتا ہے تو اُس کا مفت علاج کرتی ہے۔ شادی کرتا ہے تو شادی الاؤنس دیتی ہے۔ مرتا ہے تو سرکاری خرچ پر اُس کے تجہیز و تکفین ہوتی ہے۔ ہماری اسلامی دنیا جس کو خدا اور رسولؐ پر بڑا ناز ہے۔ اُس کا یہ عالم ہے کہ کوئی مسلمان ملک اپنے کسی شہری کی کوئی ذمہ داری ہی نہیں لیتا۔

یہاں لوگ پیدا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہر شہری حالات کے رحم و کرم پر زندگی گزار کر اِس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ہم کس منہ سے خود کو مسلمان کہتے ہیں۔ اسلامی معاشرے کی کس بات پر فخر کرتے ہیں۔ ہم چوری، ڈاکے، لوٹ مار، قتل و غارت، منافع خوری، بلیک مارکیٹ، ظلم و جبر پر فخر کرتے ہیں۔ ہم خدا سے بھی شرمندہ ہیں۔ ہم انسانوں سے بھی شرمندہ ہیں۔ لوگو! یہ انتخاب نہیں ہے۔ یہ بغاوت ہے، ظلم کے خلاف، ظالموں کے خلاف، آمروں کے خلاف، دین فروشوں کے خلاف، سرمایہ داروں کے خلاف، جاگیرداروں کے خلاف وغیرہ وغیرہ۔ کچھ اِسی طرح کی تقریر تھی جو بڑی پسند کی گئی تھی۔ یہ مارکسزم کے نقطہ نظر کی تقریر تھی جس میں لوگوں کے ساتھ ڈائیلاگ کرنے کا انداز ہوتا ہے۔

میرے بعد مولانا کوثر نیازی کی باری آئی۔ مولانا نے ایک لمبی چوڑی آیت پڑھ کر میری تقریر کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی مگر جلسے کے لوگوں کا ذہن چونکہ جدلیاتی سوچ کا حامل ہو چکا

www.bhutto.org

تھا۔ مولوی کی آیت کا اثر کچھ زیادہ نہ ہوسکا۔ آیت کے بعد مولانا نے اپنی خطابت کے تمام ہنر آزمائے۔ اس طرح شاید پہلی مرتبہ اُن کو خطابت کے میدان میں کچھ مشکل پیش آئی تھی۔

پارٹی کے اقتدار میں آنے کے بعد دوسرے لوگوں کے ساتھ میرے اختلافات کی کچھ اور طرح کی وجوہات تھیں۔ مگر مولوی کے ساتھ میری تمام تر ناراضگی کا آغاز اِس تقریر سے ہی ہوا تھا۔ میں تو پارٹی کی خدمت کے لئے مقرر بنا تھا۔ مگر افسوس کہ میری یہ بلا معاوضہ خدمت بھی میرے حق میں اچھی ثابت نہ ہوسکی۔ میری اس صلاحیت سے بھی مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ میرے ان نقصانات کا سلسلہ چیئر مین بھٹو شہید کے دور تک محدود نہ رہا تھا۔ اُن کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور میں تو میری تقریر کا سلسلہ میرے لئے اور بھی زیادہ سوہانِ رُوح بن گیا تھا۔ جب محترم جہانگیر بدر کو چھوڑ کر پورے پنجاب پیپلز پارٹی کی تنظیم میرے خلاف متحد ہوگئی تھی۔ اور وہ میری تقریروں کے دوران لوگوں سے نعرے بازی کروایا کرتی تھی۔ میں ایک طرف تو فوجی حکومت سے اپنی ان تقریروں کی وجہ سے سزائیں پاتا تھا۔ دوسری طرف میں پارٹی کے اندر کے لوگوں کی اذیت برداشت کرتا تھا۔ میرے اُن دنوں کے حالات پر کسی فارسی شاعر کا یہ مصرع انتہائی صادق آتا ہے کہ: ''اے روشنی طبع تو بر من بلا شُدی''۔

دوسرا ٹاکرا

مولانا کوثر نیازی کے ساتھ تقریر کا دوسرا ٹاکرا بھی فیصل آباد کی سرزمین پر ہی پیش آیا تھا۔ فیصل آباد شہر پاکستان کا ایک منفرد اور دلچسپ شہر ہے۔ یہ شہر زندگی کے تمام طبقوں کے نمائندہ انسانوں کا شہر ہے۔ یہ شہر اعلیٰ پائے کے قوالوں کا شہر ہے۔ گلوکاروں کا شہر ہے۔ ڈرامہ اور تھیٹر کے اداکاروں کا شہر ہے۔ جہاں تک کاروباری حضرات کا تعلق ہے، یا صنعت وحرفت کا تعلق ہے۔ اِس تعلق میں فیصل آباد کو پاکستان کا مانچسٹر کہا جاتا ہے اور جہاں تک فنونِ لطیفہ، ادب اور شاعری کا تعلق ہے، اِس قسم کی چیزیں فیصل آباد میں بڑی کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ وہاں پر ہر شخص دانشور اور ہر شخص عقلِ کُل ہے۔ وہاں پر ہر انسان اپنے علم و ہنر میں صرف نبی ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ اپنے علم کے بارے میں ختم نبوت کا دعویٰ کرتا ہے بڑی بوقلمنیوں کا شہر ہے۔ بڑا تنوع ہے اس شہر میں۔ تحریر وتقریر کا بڑا رسیا شہر ہے۔ اگر یہ بات فیصل آباد کی زبان میں کہی جائے تو یوں ہوگی۔ بڑا ٹَن رس شہر ہے۔

www.bhutto.org

ہر فن میں تقابل اور مسابقت کو پسند کرتا ہے۔ اگر اب بھی کسی کو اِس شہر کو سمجھنے میں مشکل پیش آ رہی ہو تو اُس کی آسانی کے لئے کہوں گا کہ بڑا مختار رانا قسم کا شہر ہے۔ وہ اپنے ہر معاملے میں انتہا کا شہر ہے۔ جو شہر اپنے فنون لطیفہ کے مزاج میں نصرت فتح علی خان اور شاعر احمد ریاض کی طرح کی انتہا رکھتا ہو، اُس کی عام زندگی کی انتہائیں کیا ہوں گی۔ اِس کا اندازہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں۔

واقعہ کچھ یوں ہوا کہ انتخابات کے بعد مختار رانا جو پیپلز پارٹی کا ایم۔ این۔ اے منتخب ہوا تھا۔ وہ اپنے شہر کی عمومی ذہنی کیفیت کے مطابق اپنے انقلاب کی انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ وہ انتخاب کی جیت کو اور وہ بھی صرف مغربی پاکستان کے دو صوبوں میں پیپلز پارٹی کے جیت کو انقلاب کی انتہا تصور کرتا تھا۔ اُس نے سقوط ڈھاکہ کے بعد جب بقیہ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک کمزور پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اُس نے عین اُس وقت فیصل آباد کے صنعتی ماحول میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ اُس نے اپنے پیروکاروں کو اپنی تقریروں میں کہنا شروع کر دیا کہ کارخانوں پر قبضہ کر لو۔ اِس طرح ایک کارخانے میں مزدوروں کے اِسی قسم کے احتجاجی مظاہرے کے دوران ایک آدمی کا قتل ہو گیا۔ مجھے اِس وقت یاد نہیں آ رہا کہ قتل ہونے والا شخص کارخانے کا مالک تھا یا حصے دار تھا۔ مختار رانا کو اُس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ حالانکہ مختار رانا اگر ذرا بھی صبر سے کام لیتا تو اِس قتل کے کچھ ہی دنوں بعد چیئرمین بھٹو نے ان تمام کارخانوں کو سرکاری طور پر ملک میں ایک انقلابی منشور کے مطابق قومی ملکیت میں لے لیا تھا۔ مگر افسوس کہ یہ شخص بھی دوسرے انتہا پسندوں کی طرح اپنی انتہا پسندی کی نظر ہو گیا اور اُس کا بھی تمام انقلاب انگلینڈ کی سیاسی پناہ حاصل کرتے ہی ختم ہو گیا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد جب بقیہ پاکستان میں پیپلز پارٹی کو حکومت دی گئی تو ملک غلام مصطفےٰ کھر صاحب کو پنجاب کے گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا دیئے گئے تھے۔ ایک تو خود ملک غلام مصطفےٰ کھر کی اپنی ذات اور اُس پر گورنری اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹری کا کلف۔ اُن کے فوجی اور جاگیرداری قسم کے مزاج کا مختار رانا پہلا شکار بن گیا۔ مختار رانا کو پانچ سال کی ملٹری کورٹ سے سزا سنا دی گئی۔ جس کی وجہ سے قانونی طور پر اُس کی اسمبلی کی رکنیت ختم ہو گئی اور اُس کے حلقہ انتخاب میں دوبارہ ضمنی انتخاب کرایا گیا۔ مجھے پنجاب حکومت اور پیپلز پارٹی پنجاب کی طرف سے خاص طور پر تقریریں کرنے کے لئے فیصل آباد لے جایا گیا۔

فیصل آباد کے ایک انتخابی حلقے میں تقریر کے سلسلے میں مولوی کے ساتھ میرا ایک بار پھر آمنا

www.bhutto.org

سامنا ہو گیا۔ اُس وقت مولانا بڑے پاور فل وزیر اطلاعات تھے۔ اُن کے مزاج میں بڑی فرعونیت تھی۔ اُنہوں نے جلسہ کی سٹیج پر آتے ہی جلسہ کے منتظمین کو حکم دیا کہ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ تمام لوگوں کی تقریروں کا سلسلہ بند کر دیا جائے اور اُن کی تقریر کا اعلان کر دیا جائے۔ اتفاق سے یہ جلسہ فیصل آباد کے بڑے انقلابی بائیں بازو کے خیالات رکھنے والے کارکنوں کا جلسہ تھا۔ اُنہوں نے مولانا کو صاف کہہ دیا کہ باقی تمام مقامی لوگوں کی تقریریں ہم نہیں کرائیں گے مگر اسلم گورداسپوری کی تقریر ضروری کرائی جائے گی۔ اِس کے بعد آپ کی ہی تقریر ہو گی۔ ان کارکنوں نے مولوی کی ناراضگی کی پروانہ کرتے ہوئے میری تقریر کا اعلان کر دیا۔ میں نے حسب معمول اپنی تقریر کے انداز میں تقریر کی۔

تقریر میں، میں نے کہا کہ جس طرح پاکستان میں صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا ہے۔ اسی طرح پاکستان میں جاگیرداری کو بھی ختم کیا جائے گا۔ جاگیروں کو بھی قومیایا جائے گا اور اُن جاگیرداروں کی زمینوں کو کسانوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ مگر کوئی چیز بغیر کسی جدوجہد کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اِس کے لئے عوام کو جدوجہد کرنا ہو گی۔ پیپلز پارٹی کو جدوجہد کرنا ہو گی۔ جس طریقے سے عوام کی جدوجہد کے ساتھ پیپلز پارٹی نے صنعتوں کو قومی تحویل میں لیا ہے، اسی طرح پیپلز پارٹی جاگیروں کو بھی بہت جلد قومی تحویل میں لے لے گی۔ عوام کو چیئرمین بھٹو اور پیپلز پارٹی کا ساتھ دینا ہو گا اور ہم پر اعتماد کرنا ہو گا۔ میری تقریر کا لب لباب یہی تھا۔ مولوی نے اپنی حاکمانہ قسم کی تقریر کی۔ جس تقریر کو نظریاتی قسم کے ماحول میں زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ انتخابی جلسے ختم ہو گئے۔ پیپلز پارٹی انتخاب جیت گئی مگر مولوی کی انتقام کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔

مولانا کوثر نیازی نے انتخاب کے بعد اپنی وزارت کی طرف سے وزیراعظم بھٹو کو ایک باقاعدہ سمری بنا کر پیش کی جس میں میرے متعلق تحریر کیا گیا کہ اِس شخص نے جلسہ عام میں پیپلز پارٹی کی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جس طرح ملوں کو قومی تحویل میں لیا ہے، اسی طرح جاگیروں کو بھی قومی تحویل میں لیا جائے۔ لہٰذا اِس قسم کے لوگوں کی تنبیہ کی جانی چاہیے کہ وہ عوام میں اشتعال نہ پھیلائیں اور پیپلز پارٹی کو انتہا پسندی کی جماعت بنانے کی کوشش نہ کریں۔ چیئرمین بھٹو نے حنیف رامے صاحب کو کہا کہ اِس کو کہو، مختار رانا بننے کی کوشش نہ کرے۔ حنیف رامے صاحب نے مجھے یہ ساری بات بتائی اور کہا کہ برادرم! ہوشیار ہو جاؤ۔ مولوی تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اِس

کے ساتھ مجھے مشورہ دیا کہ بھٹو صاحب کو خط لکھ کر اپنی پوزیشن کو واضح کرو۔ میں نے وزیر اعظم بھٹو کو وضاحتی خط لکھ کر ارسال بھی کیا مگر میری وضاحت سے بھٹو صاحب کا دل صاف نہ ہو سکا۔ اس طرح اقتدار کے ابتدائی دنوں میں ہی بھٹو صاحب مجھ سے ناراض ہو گئے تو اس طرح مولوی کا جادو چل چکا تھا۔ جس کا توڑ کرنا میرے بس کی بات ہی نہیں تھی۔ قصہ مختصر کہ میرا تقرر کرنے کا سودا مجھے بڑا مہنگا پڑا تھا۔ بقول یاس یگانہ۔

علم کا سودا بڑا مہنگا پڑا

چیئرمین بھٹو کا کمبوڈیا کے حق میں بیان اور امریکی جارحیت کی مذمت

چیئرمین بھٹو ایک بین الاقوامی اور عالمی ویژن کے لیڈر تھے۔ ان کی سیاست کی یہی خوبی اور صلاحیت ان کو پاکستان کے دوسرے سیاست دانوں پر فوقیت دیتی تھی۔ 1970ء میں جب امریکہ نے کمبوڈیا پر جارحیت کی تو اس وقت چیئرمین بھٹو پاکستان کے وہ اکیلے سیاست دان تھے جنہوں نے امریکی جارحیت کی کھل کر مذمت کی تھی ان کے باقی ہمعصر سیاست دانوں کو عالمی سیاست کا کچھ ادراک نہیں تھا۔

9 مئی 1970ء کے روزنامہ نوائے وقت کی اشاعت کے مطابق چیئرمین بھٹو پاکستان کے واحد لیڈر ہیں جو کہتے ہیں کہ پاکستان کا فرض ہے کہ حکومتِ پاکستان اس مسئلے پر ایک ایشیائی ملک کی حیثیت سے اپنا موقف اختیار کرے۔ چیئرمین بھٹو نے انتباہ کیا کہ اگر آج ہم خاموش رہے تو کل پاکستان کے معاملے میں دوسرے ایشیائی ممالک بھی خاموش رہیں گے۔ انہوں نے کہا کہ کمبوڈیا کے معاملے پر حکومتِ پاکستان انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کو سب کچھ نظر آ رہا ہے۔

اخبار کے مطابق بھٹو نے کہا کہ امریکی مداخلت کمبوڈیا میں کھلی جارحیت ہے اور یہ ایشیاء میں امریکیوں کی عدم مداخلت کی نکسن پالیسی کی سراسر خلاف ورزی ہے۔ بلکہ نکسن کی اصل پالیسی کا نفاذ ہے۔ چیئرمین بھٹو نے کہا کہ کمبوڈیا کے مسئلے پر عالمی کانفرنس طلب کی جانی چاہئے۔ اس کانفرنس میں جمہوریہ چین اور شمالی کوریا کے عوام کی ترجمانی کا سامان ہونا چاہئے یعنی ان کو دعوت دی جانی چاہئے۔ واضح رہے کہ اس وقت سوائے چیئرمین بھٹو کے پاکستان کے کسی دوسرے سیاسی راہنما نے

www.bhutto.org

کمبوڈیا کے مسئلے پر اس طرح دوٹوک بات نہیں کی تھی اور نہ ہی جمہوریہ چین اور شمالی کوریا کو عالمی نمائندگی دینے کا کسی نے کبھی مطالبہ کیا تھا۔ پاکستان میں صرف اور صرف چیئرمین بھٹو کی سیاست کی ہی ڈاکٹرائن تھی اور وزڈم تھی۔ جو مکمل طور پر عالمی سیاست پر عبور اور شعور رکھتی تھی۔

1970ء کے انتخابات میں بھٹو مخالف لیڈروں کے بیانات ملاحظہ فرمائیں

24 مئی 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ پاکستان کے عوام اسلام دشمن عناصر کے خلاف اسلام کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔ (نواب زادہ نصراللہ خان)

26 مئی 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ پاکستان کے لئے اسلامی آئین بنایا جائے گا۔ (مولانا شاہ احمد نورانی)

12 جون 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ اسلام دشمن طاقتیں اپنے عزائم میں کامیاب نہیں ہوں گی۔ سوشلزم کا نعرہ غیر اسلامی ہے۔ پاکستان میں ملحدانہ نظام برداشت نہیں کیا جائے گا۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

18 جون 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ مسٹر بھٹو نئی نسل کو گمراہ کر رہا ہے۔ (نواب زادہ نصراللہ خان)

27 جون 1970ء۔ قوم صرف اسلام چاہتی ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم کو قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (مولانا مفتی محمود)

27 جون 1970ء ہفت روزہ چٹان۔ بھٹو ایک ایکٹر اور مداری ہے۔ بھٹو اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں۔ (شورش کاشمیری)

بھٹو اور پیپلز پارٹی بے جمالو کی پیداوار ہیں۔ (شورش کاشمیری)

28 جون 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ کسی نابالغ پارٹی کے ساتھ ہمارا اتحاد نہیں ہو سکتا۔ (خان عبدالولی خان)

22 جولائی 1970ء روزنامہ آزاد۔ بھٹو جاگیردار ہے سوشلسٹ نہیں ہو سکتا۔ (سردار شوکت علی)

بھٹو کے خلاف سوشلسٹ اتحاد بنایا جائے گا۔ (راؤ مہروز اختر خان)

26 جولائی 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ پاکستان کو سوشلسٹوں کا قبرستان بنا دیا جائے

www.bhutto.org

گا۔ پاکستان کو کمیونسٹوں کا انڈونیشیا بنا دیا جائے گا۔ (متحدہ اسلامی محاذ)

6 اگست 1970ء ہفت روزہ چٹان۔ سوشلسٹوں کے گھروں پر نشان لگا دیئے جائیں۔

11 اگست 1970ء جماعت اسلامی کا مجلہ زندگی۔ 1970ء کے انتخابات کفر اور اسلام کی جنگ ہیں۔

الیکشن میں بھٹو اور اسلام کا مقابلہ ہوگا۔

بھٹو کہتا ہے کہ میں عوام پر رزق کے دروازے کھول دوں گا۔ ہمارے دین میں خدا کے سوا کوئی رازق نہیں ہے۔ خدا ہی انسانوں کو رزق دیتا ہے۔ بھٹو خدا کی ہمسری کرتا ہے۔ لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ بھٹو پارٹی کفر کی باتیں کرتی ہے۔

ہفت روزہ چٹان۔ پیپلز پارٹی کنجروں اور طوائفوں کی جماعت ہے۔ (شورش کاشمیری)

الیکشن میں شرفاء کی جیت ہوگی۔

ہفت روزہ چٹان میں ڈاکٹر مبشر حسن کی تصویر کے نیچے تحریر کیا گیا۔

سن وے بلوری اکھ والیا

انتخابات حق و باطل کے درمیان کھلی جنگ ہیں۔ ہم باطل (سوشلسٹوں) کو مٹا کر دم لیں گے۔ سوشلسٹوں کے کفر کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ (ہفت روزہ چٹان شورش کاشمیری)

3 ستمبر 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ پاکستان پیپلز پارٹی فاشسٹ پارٹی ہے۔ فسطائی تنظیموں پر پابندی لگائی جائے۔ سوشلسٹ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ انتخابات میں کفر اور اسلام کے درمیان فیصلہ ہوگا۔ قوم اسلام کو ووٹ دے کر سوشلزم کے کفر کو نیست و نابود کردے۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

روزنامہ نوائے وقت۔ سوشلسٹ جمہوریت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کر رہے ہیں۔ (نوابزادہ نصر اللہ خان)

10 ستمبر 1970ء روزنامہ نوائے وقت۔ سوشلزم آیا تو افسر حاکم اور بارہ کروڑ عوام غلام بن جائیں گے۔ (مولانا احتشام الحق تھانوی)

ہفت روزہ چٹان 1970ء۔ بھٹو پارٹی احمدیوں کی پارٹی ہے۔ (شورش کاشمیری)

پیپلز پارٹی کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔ سرفروش سرخوں کا صفایا کریں گے۔ (شورش کاشمیری)

www.bhutto.org

ہفت روزہ چٹان کی لغو گھٹیا اور شرمناک مخالفت

ہفت روزہ چٹان میں چیئرمین بھٹو کی ذات اور ان کے خاندان کے بارے میں اتنی لغو اور گھٹیا باتیں شائع کی جاتی تھیں۔ جن کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ مگر وہ تمام باتیں 1970ء کے سال بھر کے چٹان میں آج بھی موجود ہیں۔ اسی طریقے سے جماعت اسلامی کے مجلہ زندگی جس کو عوام نفرت سے ''گندگی'' کہا کرتے تھے۔ ان میں ایسی ایسی شرمناک باتیں شائع کی جاتی تھیں۔ جن کو یہاں دہراتے ہوئے شرم آتی ہے یہی کردار روزنامہ نوائے وقت کا تھا۔ جو 1970ء میں اسلام پسندوں کا سب سے بڑا ہتھیار بنا ہوا تھا۔ جس کی اشاعت کا مقصد ہی چیئرمین بھٹو اور عوام دشمنی پر مبنی تھا۔ وہ 1970ء کے انتخابات کو کفر اور اسلام کی جنگ بنائے ہوئے تھا۔ اور پاکستان پیپلز پارٹی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتا تھا۔

سیاست دانوں کی بدزبانی

انتخابات میں ان تمام سیاست دانوں کے دیئے گئے بیانات کے پیچھے میں نے چند نمونے ہی پیش کئے ہیں۔ ورنہ ان سیاست دانوں کی زبان چیئرمین بھٹو کی ذات کو گالیاں دے دے کر انتہائی گندی ہو چکی تھی۔ ان سب سے کچھ کی زبانیں تو خون اُگلتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ائیر مارشل اصغر خان اور احتشام الحق تھانوی نے مجھے ان کی مذمت کے لئے باقاعدہ نظمیں تحریر کرنا پڑیں تھیں۔ اصغر خان پر تحریر کی گئی نظم کا عنوان تھا ''ہوائی ڈرائیور''۔

ہوائی ڈرائیور

اِک ڈرائیور کو سیاست سے بھلا کیا نسبت
جس کی گفتار سے اخلاق بھی شرمندہ ہو
خاک وہ آیۂ اسلام سے واقف ہوگا
جو کہ نکسن کے خیالات کا کارندہ ہو

○

www.bhutto.org

بدزبانی تو کوئی شیوہ اشراف نہیں
اختلافات سیاست میں ہُوا کرتے ہیں
صاحب علم اگر برسرِ پیکار بھی ہوں
پھر بھی تہذیب سے وہ بات کیا کرتے ہیں

○

وہ جسے نعرۂ بھٹو نے کیا تھا پیدا
آج وہ طفلِ سیاست بھی ہے لیڈر بنتا
ایبٹ آباد کی دعوت کا اسے یاد نہیں
خوفِ آمر سے اشاروں میں تھا باتیں کرتا

○

ایسے لیڈر جنہیں ہنگامے جنم دیتے ہیں
وہ کبھی قوم کے معمار نہیں بن سکتے
وقت پڑنے پہ کسی سر پھرے آمر کے لئے
ڈھال بن سکتے ہیں، تلوار نہیں بن سکتے

○

تم اگر قوم کے محسن ہو تو جاؤ جا کر
نوجوانوں کو ہَوا بازی کے گُر سکھلاؤ
لیڈری کھیل نہیں ہے جسے بچے کھیلیں
کام جو آتا ہے اس کام پہ واپس جاؤ

○

احتشام الحق تھانوی کے خلاف تحریر کی گئی نظم کا عنوان تھا ''شاہی فقیر''۔

شاہی فقیر

شرپسندی کا مبلغ نام جس کا احتشام
سامراجیت کا پٹھو، دیں فروشوں کا امام

www.bhutto.org

دشمنِ مزدور و دہقاں، خادمِ سرمایہ دار
کذب گو، ناعاقبت اندیش مردِ بے لگام

○

دین کے پردے میں خرقہ پوش یہ شاہی فقیر
ڈالروں سے تول کر ہے بیچتا۔اسلام کو
ہر گھڑی پھیلا رہا ہے قوم میں یہ انتشار
دین کی خدمت سمجھتا ہے یہ قتلِ عام کو

○

اس کی تقریروں کا حاصل زر پرستی کا فروغ
اس کا مذہب پرمٹوں اور کوٹھیوں کا کاروبار
داغ ہے اسلام کے ماتھے پہ اس کا قول و فعل
آہ یہ اونچے محلّوں کا فقیہہِ نامدار

○

دے رہا ہے ملّتِ احمد کو محکومی کا درس
اور ملوکیت کے حق میں برسرِ پیکار ہے
اِک طرف ہیں بے سروسامان بیچارے عوام
ایک جانب وہ خدا ہے اور صنعت کار ہے

○

کچھ خدا کا خوف ان فصلی بٹیروں کو نہیں
چھوڑ کر مظلوم کو ظالم سے کرتے ہیں یہ پیار
روٹی کپڑا مانگنا اسلام میں جائز نہیں
حکم فرما دیں یہ مُلّاں ان کا گر ہو اختیار

○

www.bhutto.org

مسئلہ غربت کا ہے تم کفر کہتے ہو جسے
جس کو جی آئے اسے کافر بنا دیتے ہو تم
ہر گلی کوچے میں بکتے جسم کیا اسلام ہے
کیا سبب ہے اس حقیقت کا خبر لیتے ہو تم؟

○

اب مگر مظلوم ان لوگوں سے لیں گے انتقام
ایک ہو کر اب نظامِ زر سے وہ ٹکرائیں گے
اب نہ مانگیں گے کسی سے بھیک محنت کے عوض
اب وہ اپنا حق عدو سے چھین کر لے جائیں گے

○

یہ دونوں نظمیں ہفت روزہ نصرت میں شائع کی گئی تھیں عوام نے ان کو بہت پسند کیا تھا۔

چیئرمین بھٹو کے خلاف کعبے سے فتویٰ

جنرل یحییٰ خان کے نشریاتی وزیر نواب زادہ شیر علی خان کے پاکستان کے مقامی مُلّاؤں کے چیئرمین بھٹو کے خلاف دیئے گئے کفر کے فتوؤں پر ہی اکتفا نہ کیا گیا۔ بلکہ ان کے کفر کے فتوؤں کو مزید تقویت دینے کے لئے سعودی عرب کے تمام رجعت پسند مُلّاؤں بلکہ تمام عالمِ اسلام کے رجعت پسند مُلّاؤں کے چیئرمین بھٹو اور سوشلزم کے خلاف کفر کے فتوے امپورٹ کیئے گئے جن کی حکومت کے تمام اخبارات پر تشہیر کی گئی۔ جس میں پاکستان کے عوام کے نام کعبے سے پیغامات جاری کیئے گئے تھے کہ سوشلزم کفر ہے اور سوشلسٹ کافر ہیں۔ لہٰذا پاکستان کے عوام کافروں کا ساتھ نہ دیں اور وہ مُلّاؤں کو ووٹ دیں۔ جنرل یحییٰ خان کی امریکہ کی پٹھو حکومت اور اس کے پاکستان کے اتحادی مُلّاؤں اور مذہبی جماعتوں کا یہ آخری حربہ تھا جو پاکستان پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو اور سوشلسٹوں کے خلاف استعمال کیا گیا تھا۔ اب مکے سے پرے اجاڑ والی بات تھی۔ اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

www.bhutto.org

ان تمام سیاست دانوں اور فتوؤں کے برعکس چیئرمین بھٹو کے بیانات

جنرل یحییٰ خان کی حکومت کے انتہائی فاشسٹ پراپیگنڈے کے برعکس اور ان تمام رجعت پسند سیاست دانوں اور رجعت پسند مُلاؤں کے بیانات اور کفر کے مقامی اور سعودی عرب سے امپورٹ کئے گئے کفر کے فتوؤں کے برعکس چیئرمین بھٹو کی تقریریں اور ان کے بیانات پاکستان دوستی اور عوام دوستی پر مبنی ہوتے تھے۔ ان کے بیانات انقلابی ہوتے تھے۔ ان تمام عوام دشمن سیاست دانوں کے مقابلے میں ان کے بیانات ان کی تقریریں بڑی پُر مغز اور معانی خیز ہوتی تھیں۔ وہ لوگوں میں زندگی اور ولولہ پیدا کرنے کی باتیں کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو ان کے ایک عظیم مستقبل کا پیغام دیتے تھے۔ وہ طالب علموں اور پاکستان کے محنت کشوں سے براہِ راست مخاطب ہوتے تھے۔ وہ پاکستان کے عوام کی زندگی کے اصل مسائل کی بات کرتے تھے۔ زندگی کے اصل حقائق پر روشنی ڈالتے تھے۔ ان کی تقریریں عوام میں جوش پیدا کرتی تھیں۔ وہ پاکستان کے پسے ہوئے طبقوں ڈاؤن ٹراڈن میں عزتِ نفس پیدا کرتے تھے۔ ان پسے ہوئے زندگی کے مارے ہوئے اور حالات کے شکار طبقوں کے عوام کو ان معروضی پستی کی سطح سے اوپر اٹھا کر ان کو بڑے طبقوں اور سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں، میروں، پیروں، زمینداروں کے برابر کھڑا کرتے تھے۔ وہ عوام کا خوف دور کرتے تھے۔ ان کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھانے اور کچہری کے نظام کا خوف دور کرتے تھے۔ وہ لوگوں میں شعور بانٹتے تھے۔ لوگوں میں ان کی حیثیت کا احساس کا اجاگر کرتے تھے۔ انہوں نے عوام کو بے خوف بنا دیا تھا۔ عوام کے منہ میں زبان ڈال دی تھی۔ وہ عوام کو طاقت کا سرچشمہ خیال کرتے تھے۔ پاکستان کا ہر فرد بھٹو کے ساتھ کھڑا ہو کر خود کو ایک اکائی تصور کرتا تھا۔ پاکستان کی پوری قوم متحد ہو گئی تھی۔ ان میں سوچنے اور بولنے کی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ خود کو ایک فیصلہ کن طاقت خیال کرتے تھے۔ عوام اپنے ایمان اور یقین کے ساتھ چیئرمین بھٹو کی قیادت اور ان کی سیاست پر متفق تھے۔ وہ ان کی سیاست کو اپنا ایمان خیال کرتے تھے۔ وہ چیئرمین بھٹو کو اپنا نجات دہندہ خیال کرتے تھے۔ اس لئے کہ چیئرمین بھٹو عوام کے دلوں کی باتیں کرتے تھے۔ لہٰذا ان تمام بھٹو دشمن اور عوام دشمن لیڈروں کے بیانات کے مقابلے میں چیئرمین بھٹو کے بیانات انتہائی عوامی اور بامقصد تھے۔ جن میں لوگوں کو اپنی عملی زندگی کی نمائندگی اور

www.bhutto.org

جھلک دکھائی دیتی تھی۔لوگ ان کی باتوں میں کشش محسوس کرتے تھے اوران کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔پیپلز پارٹی کے روٹی کپڑے اور مکان کا نعرہ لوگوں کے دلوں کی آواز بن گیا تھا۔

اسلام پسندوں کے مقابلے میں چیئرمین بھٹو کے بیانات ملاحظہ کریں

سرمایہ داروں نے پاکستان کے عوام پر رزق کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔میں عوام پر رزق کے دروازے کھول دے گا۔(روزنامہ مساوات)

پاکستان پیپلز پارٹی پاکستان کے محنت کش غریب عوام کی جماعت ہے جوظلم اور غربت سے نجات چاہتی ہے۔

اب اقتصادی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر رہیں گی۔ہم پاکستان میں معاشی انقلاب برپا کریں گے۔(بھٹو)

میرے ساتھ خدا کی مدد اور عوام کی طاقت ہے۔میں انقلابی ہوں انقلاب برپا کر کے رہوں گا۔(بھٹو)

مزدورو ہاریو اپنی غلامی کی زنجیریں توڑ دو۔بھٹو کسانوں وڈیروں کے خلاف بغاوت کر دو۔

طالب علم اور نوجوان نسل میرے انقلاب کا ہراول دستہ ہیں۔(بھٹو)

مُلّاؤں کا اسلام نہ کھایا جاسکتا ہے نہ پہنا جاسکتا ہے۔(بھٹو)

اسلام غربت اور استحصال کے خلاف ننگی تلوار ہے۔(بھٹو)

سرمایہ داروں کے ایجنٹ محافظ مُلّاں اسلام کو سرمایہ داری کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔(بھٹو)

مشرقی پاکستان کے لوگ غربت اور استحصال کی وجہ سے ناراض ہیں۔بنگالی ہونے کی وجہ سے نہیں۔(بھٹو)

پاکستان کی دولت حکمرانوں اور چند خاندانوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ان سے چھین کر پوری قوم میں تقسیم کی جائے گی۔(بھٹو)

تمام بڑے کارخانے بحقِ قوم قومیائے جائیں گے۔(بھٹو)

زمینیں کسانوں میں تقسیم کی جائیں گی۔(بھٹو)

www.bhutto.org

سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بڑھائی جائیں گی۔(بھٹو)

تمام ملک کے بچوں کو میٹرک تک مفت تعلیم دی جائے گی۔(بھٹو)

تمام شہریوں کو مفت دوا اور علاج کی سہولت دی جائے گی۔(بھٹو)

پاکستان کے تمام ہمسایہ ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے جائیں گے۔مسئلہ کشمیر کشمیریوں کے حقِ خود ارادی کے تحت قبول کیا جائے گا۔(بھٹو)

1970ء کا انتخاب غریبوں اور امیروں کے درمیان جنگ کی طرح ہے۔(بھٹو)

غریبوں کو کافر کہنے والے خدا اور رسول کے مجرم ہیں۔(بھٹو)

میرا سوشلزم کا نعرہ حق ہے۔(بھٹو)

خطرہ اسلام کو نہیں۔اسلام فروشوں کو ہے۔(بھٹو)

او علامہ اقبال میں نے تیرے غریبوں کو جگا دیا ہے۔میں نے اقبال کے خواب کو پورا کر دیا ہے۔اس نے کہا تھا۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

(مساوات۔بھٹو)

لوگوں نے اپنے دشمن پہچان لئے ہیں۔وہ سب سے زیادہ مغربی پاکستان میں رہتے ہیں۔(بھٹو)

جاگیردار ووٹوں کے لئے ہاریوں کے پاؤں میں پگڑیاں ڈال رہے ہیں۔ان کی پگڑیاں رول دو۔(بھٹو)

ڈبل بیرل خان خان یعنی (عبدالقیوم خان) سرکاری پارٹی کا توپ خانہ ہے۔(بھٹو)

ہمارے خلاف اتحاد بنایا گیا ہے۔جس میں مسلم لیگ کی دال ڈالی گئی ہے۔جماعت اسلامی کی ہڈی ڈالی گئی ہے۔اور دو آلو بھی ڈالے گئے ہیں۔(آلو، ایئر مارشل اصغر خان اور نور خان)

بزدل میرا سیاست میں مقابلہ کریں۔مجھ پر قاتلانہ حملے نہ کرائیں۔(مساوات۔بھٹو)

پیپلز پارٹی کا انتخابی نشان تلوار تھا

لوگوں غریبو، ہاریو، مزدور، کسانوں میں نے تلوار تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے اپنے اپنے

www.bhutto.org

دشمنوں کے گلے اتار دو۔ (مساوات۔ بھٹو)

سوشلزم روٹی کپڑا اور مکان ہے۔ (بھٹو)

لوگو اپنی پرچی کو برچھی بنالو۔ (بھٹو)

لوگو ایک ہی دن میں فیصلہ کر کے ملک اپنے ہاتھ میں لے لو۔ (بھٹو)

الیکشن میں بھٹو نہیں قوم جیتے گی۔ (بھٹو)

ہمارا انتخاب ہی انقلاب ہوگا۔ (بھٹو)

قوم انتخاب کے دن ظالموں کا صفایا کر دے گی۔ (بھٹو)

الیکشن سے ایک دن پہلے کا بیان۔ مساوات 1970ء

کل کے دن قوم کی تقدیریں بدل جائیں گی۔

اوپر والے نیچے ہوں گے۔ نیچے والے اوپر آجائیں گے۔ (بھٹو)

اسلامی سوشلزم

زخم ہر دل میں شراروں کی طرح جلتے ہیں
داغ ہر دل میں ہیں اب مثل چراغاں روشن
روشنی کوچہ و بازار تک آپہنچی ہے
جگمگانے کو ہیں اس دیس کے ویراں مسکن

○

ایسے مسکن جہاں برسوں سے اندھیرے کے سوا
نسلِ انساں پہ ہلاکت کا سماں طاری ہے
بھوک اور ننگ کی تصویر کے عریاں ڈھانچے
جن کی تقدیر سے لپٹی ہوئی بیکاری ہے!

○

تنگ و تاریک مکانوں میں بلکتے بچے
جن کی چیخوں سے بری روح لرز جاتی ہے

www.bhutto.org

جن کے پاؤں میں نہ جوتا، نہ بدن پہ کپڑا
زندگی جن کے لئے بن کے قضا آتی ہے

○

جن کی ماؤں کی رگیں خشک ہیں صحرا کی طرح
جن کے بچوں کے حلق سُوکھ گئے رو رو کر
دودھ بھی ماؤں کے سینوں سے جنہیں مل نہ سکا
کیا ملا ان کو برے دیس میں پیدا ہو کر

○

دوسری سمت محلات ہیں انسانوں کے
لہلہاتے ہوئے باغات ہیں انسانوں کے
شام بھی جن کے لئے بن کے سحر آتی ہے
مختلف کس طرح حالات ہیں انسانوں کے

○

دور سے چمنیاں سہگل کے شبستانوں کی
میرے احساس کے شعلوں کو ہوا دیتی ہیں
خونِ مزدور کو بھٹی میں جلا دیتی ہیں
میرے ماحول کو تاریک بنا دیتی ہیں

○

اَن گنت مال پہ کاروں کے گرجتے انجن
جن میں خوں جلتا ہے اس دیس کے انسانوں کا
دنگ ہوں دیکھ کے بازار کے شو کیسوں کو
ذکر کرنا ہی حماقت ہے طرب خانوں کا

○

www.bhutto.org

اور جب دیں کے خطیبوں سے کریں چیخ و پکار
ہم کو تقدیر کی آیات سنا دیتے ہیں
مفلسی ہم کو مقدر میں خدا نے دی ہے
پیرِ مذہب ہمیں خاموش کرا دیتے ہیں

○

میں انہیں پوچھتا ہوں کونسا اسلام ہے وہ
جس نے داؤد کی قسمت میں ہی دولت دی ہے
جس نے سہگل کے مقدر میں لکھا ہے سونا
جس نے دس بیس لٹیروں ہی کو عزت دی ہے

○

ہم اگر دیں کو صحیح رنگ میں کرتے ہیں بیاں
دیں فروشوں کی جماعت کو جلال آتا ہے
یک بیک کفر کے فرمان سُنا دیتے ہیں
قتل و غارت کا انہیں طرفہ کمال آتا ہے

○

ہم پہ الحاد کی تعزیر بھلا کیا معنی
ہم تو اسلامی مساوات کا دیتے ہیں پیام
عام ہو جائے مرے دیس میں روٹی کپڑا
ہم تو کوشاں ہیں کہ رائج ہو یہاں ایسا نظام

○

میرا اسلام مساوات سکھاتا ہے مجھے
میرے اسلام میں یکساں ہیں شہنشاہ و غلام
میرے اسلام میں انساں کے لئے ننگ نہیں
میرے مذہب میں برابر ہیں سبھی خاص و عام

www.bhutto.org

○

ناصحو، عالمو، اسلام کے سودے بازو
نامِ اسلام پہ تم نے ہمیں صدیوں لوٹا
خود شمن پوش رہے، خوب بلا نوش رہے
اہل سرمایہ کے ہاتھوں ہمیں سستا بیچا

○

اب ہمیں ہوش ہے اسلام کے معنی کیا ہیں
اب کوئی ہم کو اندھیرے میں نہیں رکھ سکتا
کاخِ سرمایہ پرستی کے مداری سُن لیں
اب کوئی زہر کو دھوکے سے نہیں چکھ سکتا

○

تم اگر دیں کے معلّم ہو تو اتنا سُن لو
اپنی ملت میں مساوات کا پرچار کرو
وہ مساوات جو امّت کو نبیؐ نے دی تھی
اونچ اور نیچ کی دیوار کو ہموار کرو

○

اب گیا وقت کہ چوغوں میں سجے ہوں مُلّا
لوگ بھٹو کو صحیح دِل سے سمجھتے ہیں امام
جس کے سینے میں ہے اسلام کا سچّا جذبہ
ہم اسے فخر سے کہتے ہیں محمدؐ کا غلام

○

حاسدو! کینہ ورو! لغو خیالو! سُن لو!
جھوٹ کا سلسلہ تادیر نہیں چل سکتا
اہل ایماں کی صداقت کو کوئی خوف نہیں
مردِ مومن کسی آتش میں نہیں جل سکتا

www.bhutto.org

وہ خدا کا ہے سپاہی وہ محمدؐ کی صدا
اس کی خاطر ہے غریبوں کی زباں وقفِ دعا
یاعلیؓ! اس کے دل و جان میں ہے نقش ہُوا
مددِ مکی و مدنی سرِ مظلومِ وفا!
یاعلیؓ شیرِ خدا! احمدؐ تسلیم و رضا

O

یہ نظم چیئرمین بھٹو کے انتخابی جلسوں کا قومی ترانہ تھی۔ اور چیئرمین بھٹو کو بہت پسند تھی۔ وہ اس نظم کو پارٹی کا منشور کہا کرتے تھے۔ (نوٹ) چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کی اس تمام جدوجہد جو پیچھے بیان کی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ 1970ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کو فتح کیوں حاصل ہوئی تھی۔

1970ء کے انتخابات اور پاکستان پیپلز پارٹی کی فتح

1970ء کے انتخابات میں جس طرح پیچھے بتایا گیا ہے۔ مغربی پاکستان میں تمام برسرِاقتدار قوتیں اور اُن کے مفادات یافتہ طبقے جن میں سرمایہ دار، جاگیردار اور تقریباً تمام مذہبی جماعتیں اور قوتیں شامل ہیں۔ وہ پیپلز پارٹی اور چیئرمین بھٹو کے خلاف متحد ہو کر برسرِپیکار تھیں۔ ان تمام قوتوں کو انتخابات میں شکست فاش ہوئی تھی اور پاکستان پیپلز پارٹی کو تاریخ ساز انتخابی فتح حاصل ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں کیلئے پیپلز پارٹی کی فتح حیران کن قسم کی تھی۔ پیپلز پارٹی کی انتخابی فتح کو حیران کن کہنے والے وہ تمام طبقے تھے جو پاکستان میں عوامی سیاست پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ جو عوام کی سیاست سے نابلد طبقے تھے۔ جن میں فوج، بیوروکریسی اور سرمایہ دار، جاگیردار اور اُن کے حواری مذہبی طبقے تھے۔ جو سیاست کو اپنی طاقت، دولت کی قوت اور مذہبی اجارہ داری تصور کرتے تھے۔ جن کے نزدیک عام انسان کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی اور نہ ہی یہ تمام قوتیں قومی رائے عامہ کو کسی عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ مارشل لا کے حکام لوگوں سے اپنے جبر کے ذریعے ووٹ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار لوگوں سے اپنی دولت اور زور بازو کے بل پر ووٹ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دینی تنظیمیں اپنی مذہبی اجارہ داری اور اپنی فرقہ بازی کی قوت اور

www.bhutto.org

دہشت اور غنڈہ گردی سے لوگوں سے ووٹ حاصل کرنا چاہتی تھیں۔

چیئرمین بھٹو کی قیادت کا کمال تھا کہ اُس نے لوگوں کو اِن تینوں طبقوں کے خوف سے باہر نکال دیا تھا۔ چیئرمین بھٹو نے لوگوں کو اپنے جلسوں میں اجتماعی قوت کا احساس دلا کر ہر انسان کو ایک قوم اور قوت کی ایک اکائی بنا دیا تھا۔

لوگ خود کو بے حد طاقتور محسوس کرنے لگ گئے تھے۔ لوگوں کی قوت فیصلہ میں ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ جس کا اظہار انتخابات کے نتائج کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ مگر ہمارے ہاں چونکہ ہر معاملے میں ایک فوجی کلچر پیدا ہو گیا تھا اور کر دیا گیا تھا۔ ہمارے ہاں اِن انتخابات کا زرلٹ بے حد اُلٹا تصور کیا گیا تھا۔ ہمارے ہاں 1970ء کے انتخابات کو ملک وقوم کے خلاف فیصلہ تصور کر لیا گیا تھا۔ 1970ء کے عوام کے فیصلے کو ہمارے فوجی حکمرانوں نے فوج کی توہین تصور کیا۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے اِن نتائج کو اپنی بے عزتی تصور کیا۔ مذہبی قوتوں اور دینی طاقتوں نے اِن نتائج کو اپنی ذلت اور رسوائی تصور کیا۔ اِن تمام بنیاد پرست حلقوں نے عوام کی رائے کے فیصلے کو اسلام کے خلاف قرار دیا۔ دین کی حرمت کے خلاف فیصلہ کہا۔ یہاں تک کہ اُس عہد کے سب سے بڑے دین کے ٹھیکیدار اور جماعت اسلامی کے امیر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اِن انتخابات کو کفر کے انتخابات قرار دے دیا تھا اور کہا تھا کہ قوم نے کفر کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ اُنہوں نے اِن نتائج کو اسلام کی شکست قرار دیا تھا اور پوری قوم کو کافر قرار دے دیا تھا۔

آپ اِس تمام صورتحال پر غور کر کے خود فیصلہ کر لیں کہ جس ملک میں انتخابات کے عوامی فیصلے کے بارے میں مقتدر قوتوں اور بالا دست طبقوں اور حکمرانوں کا یہ نظریہ تھا، کیا وہ ملک قائم رہ سکتا تھا۔ یعنی کیا مشرقی پاکستان، پاکستان کا حصہ رہ سکتا تھا۔ دوسری ہماری بدقسمتی یہ تھی کہ یہ تمام شکست خوردہ حکمران طاقتیں ملک کے صرف ایک ہی حصے میں جمع تھیں یعنی مغربی پاکستان میں جمع تھیں، مشرقی پاکستان میں ان کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔

حنیف رامے کا ایڈیٹوریل روزنامہ مساوات 17 دسمبر 1970ء

آج پھر تلوار کا کوندا لپکے

آج کا دن پاکستان میں عوامی انقلاب کی پہلی یلغار کی تکمیل کا دن ہے۔ 7 دسمبر کو عوام نے

www.bhutto.org

اپنی اجتماعی قوت کا بھرپور ہاتھ دکھلایا تھا جس سے ظلم کے قدم اکھڑ گئے مگر ہر کوئی کوشش کر رہا ہے۔ نام نہاد اسلام پسندوں نے باشعور عوام کو جو معاشرے میں آزادی حاصل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں تلوار کے حق میں ووٹ ڈالنے کی بناء پر جاہل اور فسادی قرار دے دیا۔ اب وہ عوام کے خلاف اتحاد کر رہے ہیں۔ کئی مقامات پر انہوں نے قرعہ اندازی کا جوا کھیلنے کے مترادف ہے متفقہ امیدوار کھڑے کر دیئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر ہو رہا ہے۔ مگر مکر کی ان چالوں کو عوام سمجھتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ان کا مقصد بچے کھچے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی طاقت کو مجتمع کر کے عوامی اتحاد کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور زمین اور دیگر ذرائع پیداوار کی تقسیم میں مشکلات پیدا کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

جیت کا یہ مرحلہ عوامی انقلاب کی پہلی یلغار کی تکمیل کا مرحلہ ہے اور اس میں سے ہمیں حوصلے اور قطعیت کے ساتھ گزرنا ہے جس کا ہم نے 7-دسمبر کو مظاہرہ کیا تھا۔ انقلاب خدائی عمل ہے جو اپنی آمد میں انسانی ارادے کا محتاج نہیں، مگر وہ جس قوت اور انسان کو لے آتا ہے اس کا دارومدار ہمارے اجتماعی شعور اور اجتماعی عمل پر ہے۔ کل صوبائی اسمبلی کے لئے انتخابات ہوں گے۔ ان کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ عوام جو فیصلے کریں گے ان پر عمل صوبائی اسمبلیوں کی ذمہ داری ہوگی اور اگر صوبائی اسمبلی پر عوام کا مکمل قبضہ نہ ہوا تو زمیندار اور سرمایہ دار پھر اپنی پرانی چالیں چلیں گے۔ ہم اجتماعی تحفظ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس میں ہر شخص کو انفرادی طور پر فائدہ پہنچے گا۔ اس لئے ہر ذمہ دار مرد عورت کا فرض ہے کہ وہ اجتماعی تحفظ کے عمل کو جس کی ضمانت تلوار نے دی ہے اپنی ذمہ داری سمجھے۔

پیپلز پارٹی عوام کو ناقابل تقسیم سمجھتی ہے اس کا پروگرام انقلابی ہے وہ محض اصلاحات کو آخری سمجھتے ہوئے معاشرے کی مکمل تبدیلی چاہتی ہے جس میں کسان، مزدور، چھوٹے زمیندار، چھوٹے چھوٹے دکاندار اور طالب علم اپنی محنت کا پورا پھل کھائیں اور کوئی کاہل اور سست خاندانی مراعات یافتہ طبقے کے نظام کی غلط بخشیوں کے طفیل ان کی پیداوار اور ان کا استحصال کیا جائے۔ اس کے لئے زمینوں کی تقسیم نو کے علاوہ بھی بہت سے اقدامات ضروری ہیں۔ ملک کے مراعات یافتہ کاہل اور مفت خور طبقے کی شکست کے لئے ہمیں امریکی اور غیر ملکی سودی قرضوں اور غیر ملکی دلال سرمایہ داروں کے اقتدار کا بھی خاتمہ کرنا ہے جو اپنے مفادات سے ملکی عوام کا گلا گھونٹتے اور ہماری معیشت پر سامراجی ملکوں کی گرفت مضبوط کرتے ہیں۔ ان کی ترقی کا تصور تمیں خاندانوں کی ترقی

www.bhutto.org

ہے۔ ان کو ملک اور عوام سے دور کرنا ہے۔ یہی لوگ مہنگائی کے ذمہ دار ہیں۔ یہی لوگ افسروں سے ایسے قوانین بنواتے ہیں جن سے ان کو فائدہ ہو۔ ہمیں ان کے چکر سے نجات پانا ہے۔ یہ کام پاکستان پیپلز پارٹی کے بس کا نہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی تلوار عوام کی اجتماعی طاقت کی تلوار ہے جو سرمایہ داری کا سر کاٹ کر رکھ دے گی۔

ذوالفقار علی بھٹو نے صحیح کہا ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی ایک محمود غزنوی ہے جو ہر سومنات کو پاش پاش کر دے گی۔ اب بہتر زندگی آپ کی دسترس میں ہے۔ آپ 7- دسمبر کی طرح زیادہ سے زیادہ جذبے کے ساتھ گھروں سے نکلیں۔ اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو گھروں سے نکالیں اور پرے باندھ کر پولنگ بوتھ کی طرف جائیں۔ آپ کی اجتماعی قوت سے دشمنوں کو ہرانا ہے۔ ان کے انتخابی دفتر انشاء اللہ خالی ہوں گے، کیوں کہ اگر کسی کو نام نہاد لیڈروں کی چالوں کا صحیح اندازہ نہیں تھا تو ہارنے کے بعد ان کے بیانات اور ان کی بوکھلاہٹ سے دُور ہو چکا ہوگا۔ یہ عوام کو شرافت سے دُور، بے شعور اور اسلام دشمن بتاتے ہیں۔ ان پر عوام کی قوت ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عوامی طاقت کی تلوار کا کوندا لپکے!

پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے انتخابات کے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا

پاکستان کے اُس وقت کے فوجی حکمران یہ اعلان نہیں کر سکتے تھے کہ وہ انتخابات کے نتائج کو تسلیم نہیں کرتے۔ مگر اُنہوں نے انتخابات کے بعد جو حکمرانی کا طریقہ کار اختیار کیا، وہ اِس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ وہ عوام کے اس فیصلے کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے تھے اور کسی بھی قیمت پر عوامی نمائندوں کو انتقالِ اقتدار کے لئے تیار نہیں تھے۔

انتخابات میں اصل فتح مشرقی پاکستان کو حاصل ہوئی تھی

انتخابات میں جمہوری اُصولوں کے مطابق اصلی فتح شیخ مجیب الرحمٰن کو حاصل ہوئی تھی۔ مگر ان انتخابات میں ایک عجیب قسم کی تقسیم دیکھنے میں آگئی۔ وہ تقسیم یہ تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی انتخابی فتح کا تمام تر تعلق مشرقی پاکستان تک محدود تھا۔ مغربی پاکستان مین اُس کا کوئی امیدوار انتخابات میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اِسی طرح چیئرمین بھٹو کو مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ پیپلز

www.bhutto.org

پارٹی کا کوئی بھی اُمیدوار مشرقی پاکستان میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اِس کے باوجود انتخابات کے نتائج ہر اعتبار سے قومی نتائج تھے۔ اِن کو مغربی پاکستان کے نتائج یا مشرقی پاکستان کے نتائج ہرگز تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا انتخابات کے نتائج میں شیخ مجیب الرحمٰن کو اکثریت حاصل تھی اور پاکستان کا وزیرِاعظم منتخب ہونے کا اُس کو حق حاصل تھا۔ پاکستان پر حکمرانی کرنا اُس کا آئینی اور قانونی حق تھا جس کو تسلیم نہ کیا گیا اور پاکستان کو دو ٹکڑے کر دیا گیا۔ ہم نے دیکھا کہ انتخابات کے بعد اسٹیبلشمنٹ نے ملک میں سازش کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ تمام سیاسی جماعتوں کو اقتدار حاصل کرنے کی جنگ میں متحد کر دیا۔ اقتدار کی جنگ میں پاکستان پیپلز پارٹی سازشوں کا سب سے زیادہ شکار بنی۔

مغربی پاکستان میں انتخابات میں فتح حاصل کرنے کے فوراً بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے اندر اقتدار کی جنگ کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ مغربی پاکستان کے اندر اقتدار کی اِس جنگ میں مشرقی پاکستان کی فتح کا کسی میں احساس تک دکھائی نہیں دیتا تھا اور نہ ہی مغربی پاکستان کے عوام میں شیخ مجیب الرحمٰن کی فتح کے بارے میں جوش و خروش تھا۔ مغربی پاکستان کے عوام میں خصوصاً پنجاب کے عوام میں 1970ء کے انتخابات کی فتح کا تمام تر احساس پاکستان پیپلز پارٹی کی فتح تک ہی محدود تھا۔ اِس قسم کی صورتحال میں جب پاکستان کی فوجی حکومت نے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اپنے اقتدار کا کھیل کھیلنا شروع کیا تو مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی اہمیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ پنجاب چونکہ ہمیشہ ہی پاکستان کی سیاسی قوت کا مرکز رہا ہے۔ لہٰذا فوج پنجاب میں اپنی مرضی کے مطابق پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تشکیل دینا چاہتی تھی۔ فوج کی یہ خواہش کوئی ڈھکی چھپی خواہش نہیں تھی۔ فوج کا پارٹی کے اندر یہ عمل دخل باقاعدہ دیکھنے میں آنا شروع ہو گیا تھا۔

جنرل پیرزادہ کا کردار

جنرل پیرزادہ کے جنرل ایوب خان کے زمانے سے چیئرمین بھٹو کے ساتھ محض واقفیت کی طرح کے تعلقات چلے آتے تھے۔ مگر اُن تعلقات کو کسی طرح بھی دوستی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ جنرل پیرزادہ نے جنرل یحییٰ خان کے اقتدار میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ اُس کا کام تمام سیاست دانوں کے ساتھ رابطے کا ہوتا تھا۔ چیئرمین بھٹو کے ساتھ بھی اُس کے حکومتی مصلحت کے رابطے کی ہی کبھی کبھار ملاقات رہتی تھی۔ چیئرمین بھٹو کے ساتھ اگر جنرل پیرزادہ کی خصوصی دوستی

www.bhutto.org

ہوتی تو چیئرمین بھٹو پر یحییٰ خان کی حکومت اِس طرح انتخابی مہم میں قاتلانہ حملے نہ کراتی۔ جس طرح کے دیکھنے میں آئے تھے۔ انتخابات کے بعد پیرزادہ کے تمام رابطے فوج کے اقتدار کو تسلسل دینے کے رابطے تھے۔ ان رابطوں میں چیئرمین بھٹو کی ذات کے ساتھ کوئی محبت پیار کی بات نہیں تھی۔ فوج اپنے مقاصد کے لئے تمام سیاست دانوں کو استعمال کرنا چاہتی تھی جس کی وجہ سے فوج کا ولی خان کے ساتھ بھی رابطہ تھا۔ مفتی محمود کے ساتھ بھی رابطہ تھا۔ بلوچستان کے میر غوث بخش بزنجو کے ساتھ بھی رابطہ تھا۔ پنجاب میں تمام شکست خوردہ پرانے پاپی جاگیردار لیڈروں کے ساتھ بھی رابطہ تھا۔ اصغر خان کے ساتھ بھی رابطہ تھا۔ اِس طریقے سے فوج کا پیپلز پارٹی کی قیادت کے ساتھ بھی رابطہ تھا۔ چیئرمین بھٹو کسی بھی فوجی جنرل کے ساتھ خود ملنا اچھا تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ اس بات کو اپنی سیاست کے خلاف خیال کرتے تھے۔ اُن کی طرف سے فوج کے ساتھ تمام رابطے کا کاروبار ملک غلام مصطفیٰ کھر ہی کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پنجاب میں تمام اقتدار پرست طبقوں کا کھر صاحب کو بہت جلد اعتماد اور تعاون حاصل ہو گیا تھا۔ چیئرمین بھٹو اپنی پرسنل دوستی کے معاملے میں بڑے دریا دل انسان تھے۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ اُن کی دوستی انتہا درجے کی تھی۔ جس قدر کھر پر بھٹو صاحب کو اعتماد تھا، اتنا اعتماد شاید اُن کو اپنے بیٹوں پر بھی نہیں ہوگا۔

لہٰذا پیپلز پارٹی کی جانب سے کھر صاحب کے فوج کے ساتھ رابطہ ہو جانے کی وجہ سے فوج کے ساتھ کھر صاحب کا بہت تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے کھر صاحب کی سیاسی اہمیت میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ کھر صاحب کے ساتھ فوج کا یہ خصوصی تعلق ہی تو تھا جس تعلق نے اقتدار حاصل کرنے کے صرف دو سال کے مختصر ترین عرصے میں ہی کھر صاحب کو بھٹو صاحب کے مقابل لاکر کھڑا کر دیا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا پنجاب کے اندر اقتدار کی سیاست کا آغاز

پاکستان پیپلز پارٹی جس کو پنجاب میں اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔ انتخابات کے بعد آگے کا مرحلہ پنجاب میں حکومت بنانے کا مرحلہ تھا اور سب سے زیادہ اہم بات پنجاب کا وزیراعلیٰ بنانے کی تھی یا منتخب کرنے کی بات تھی۔ اِس معاملے میں لوگوں کے سامنے تین نام تھے۔ پہلا نام صدر پیپلز پارٹی پنجاب شیخ محمد رشید کا تھا۔ دوسرا نام حنیف رامے کا تھا اور تیسرا نام ملک غلام مصطفیٰ کھر کا

www.bhutto.org

تھا۔ ہم تمام وہ نظریاتی سیاسی کارکن جن کی اکثریت کا تعلق پنجاب پارٹی کے دفتر 4/A مزنگ روڈ سے تھا۔ ہمارا نظریہ اِس معاملے میں بہت جمہوری نظریہ تھا اور ایک اُصولی موقف کا تھا۔ وہ نظریہ اور موقف پارٹی کے اندر رائے عامہ کو تسلیم کرنے کا موقف تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ پنجاب میں پیپلز پارٹی جو بھی حکومت بنائے گی، وہ اکثریت کی رائے سے بنائے گی۔ اِس مسئلے میں کسی طرفداری اور دوست داری کو خاطر میں نہیں لایا جائے گا۔ مگر اِس مسئلے میں ہر بات ہماری توقع کے برعکس سننے میں آنے لگ گئی۔ پنجاب کے حکمران کے بارے میں کسی میرٹ اور ڈی میرٹ کی باتیں ہی نہیں کی جارہی تھی۔ پہلے دن سے ہی لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ پنجاب کا وزیر اعلیٰ ملک غلام مصطفیٰ کھر ہوگا۔ کھر صاحب کو وزیر اعلیٰ بنانے کا کہنے والے وہ تمام لوگ تھے جو انتہائی موقع پرست قسم کے لوگ تھے۔ جن کا کوئی سیاسی نظریہ نہیں تھا۔ جن کی سیاست، سیاست برائے اقتدار اور مفادات ہوتی ہے۔ جو کسی اصول اور نظریے کے قائل نہیں ہوا کرتے۔ اُن کے مقابلے میں پارٹی کے نظریاتی لوگوں کا موقف کچھ مختلف تھا۔ اُن کا موقف تھا کہ اِس معاملے میں امیدوار کی اہلیت، قابلیت اور شہرت کو ہر حال میں ملحوظ خاطر رکھا جائے۔ کھر صاحب ہم تمام کارکنوں کے ساتھی اور دوست تھے۔ مگر اُن کی شہرت ایک کھلنڈرے نوجوان کی تھی۔ اُن کو پنجاب کے دانشور طبقوں میں یا پڑھے لکھے طبقوں میں پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ ہم تمام نظریاتی سوچ کے سیاسی کارکن اِس معاملے میں بے حد حساس تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ پارٹی کے اقتدار کا نہایت صاف اور شفاف طریقے سے آغاز ہو۔ جس کیلئے ضروری تھا کہ کسی ایسے شخص کو آگے لایا جائے جس کے بارے میں کسی کو اعتراض نہ ہو۔ ہمارا کھر صاحب سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ہم تو صرف پارٹی کی بہتری کے بارے میں اپنی رائے رکھتے تھے۔ ہماری رائے تھی کہ محمد حنیف رامے کو یا شیخ محمد رشید کو وزیر اعلیٰ پنجاب بنایا جائے۔ مگر ہماری رائے سے زیادہ اہمیت اُن منتخب صوبائی اراکین کی تھی جن کے ذریعے وزیر اعلیٰ پنجاب کا انتخاب ہونا تھا۔

اِس سلسلے میں شیخ محمد رشید صدر پیپلز پارٹی پنجاب نے پنجاب کے تمام منتخب اراکین اسمبلی کو پنجاب کے دفتر میں مدعو کیا۔ اُن اراکین اسمبلی میں حنیف رامے صاحب اور چند سیاسی کارکنوں نے حکومت سازی کے بارے میں تقریریں کی تھیں جن میں، میں بھی شامل تھا۔ اُن سے اِس مسئلے پر رائے حاصل کی گئی۔ اِن اراکین کی اکثریت نے بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید کے حق میں اپنی

www.bhutto.org

رائے کا اظہار کیا۔ ان اراکین اسمبلی کو حنیف رامے صاحب کی ذات پر بھی کوئی اختلاف نہیں تھا۔ مگر چونکہ اِن اراکین کا تعلق پنجاب تنظیم سے تھا۔ جس کی وجہ سے ان کا زیادہ تر رابطہ شیخ محمد رشید کے ساتھ ہوتا تھا۔ اُن کو ٹکٹ دینے کے معاملے میں صدر پنجاب کا زیادہ عمل دخل تھا۔ جس کی وجہ سے شیخ صاحب کو اِس اجلاس میں لوگوں کی زیادہ تائید حاصل ہوئی۔

حنیف رامے بہت دُور اندیش انسان تھے۔ اُنہوں نے اراکین پنجاب اسمبلی کی رائے دیکھ کر وقتی طور پر اپنا فیصلہ تبدیل کرلیا۔ اِس طرح اب کھر صاحب کے مقابلے میں صرف شیخ محمد رشید صاحب ہی میدان میں رہ گئے۔ اراکین پنجاب اسمبلی کے اِس کھلے اجلاس سے کھر صاحب کے حامیوں کو بے حد تشویش لاحق ہوئی۔ لہٰذا کھر صاحب نے تمام اراکین پنجاب اسمبلی کو فرداً فرداً اپنے پاس بلا کر کہنا شروع کر دیا کہ بھٹو صاحب! ان کو پنجاب کا وزیرِاعلیٰ بنانا چاہتے ہیں۔ تم میں سے جو شخص بھی شیخ محمد رشید کی حمایت کرے گا، اُس کو پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔

شیخ محمد رشید نے پنجاب کے اضلاع کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔ شیخ صاحب نے سب سے پہلے گوجرانوالہ ضلع سے اپنی اِس مہم کا آغاز کیا۔ شیخ صاحب کی یہ مہم ہم کارکنوں کی بدقسمتی کا آغاز تھا۔ خاص طور پر سب سے زیادہ نقصان مجھے پہنچا تھا۔

میری بدقسمتی کا واقعہ

شیخ محمد رشید صاحب کی وزارتِ اعلیٰ حاصل کرنے کی اس جنگ میں ہر جگہ شیخ صاحب مجھے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے۔ ہم نے وزیرآباد، گوجرانوالہ اور منڈی کاموکی میں اراکین اسمبلی اور پارٹی کارکنوں کے جلسوں کو خطاب کیا۔ اِن تمام جگہوں پر میری تقریر کو بہت پسند کیا گیا۔ میں چونکہ سیاسی معاملات پر کھلے ڈائیلاگ کرنے کا عادی تھا۔ میں نے پارٹی کے اندر بھی کھلے ڈائیلاگ کا ہی طریقہ اختیار کیا۔ میرا ڈائیلاگ یہ تھا کہ چیئرمین بھٹو کے ہم تمام کارکن ہیں۔ اُن کا ہر حکم سرآنکھوں پر ہے مگر وہ ایک جمہوری قائد ہیں۔ ہم جمہوری اُصول کے مطابق اُن کو اپنی رائے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے خلاف کھر صاحب کے دوست بیان بازی کر رہے تھے کہ ہم پارٹی کے اندر انتشار پھیلا رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ غلط بات ہے۔ ہم تو پارٹی کے اندر جمہوریت پھیلا رہے ہیں۔ اصول کی بات کر رہے ہیں۔ ہم بھی ملک غلام مصطفیٰ کھر کے دوست ہیں۔ اُن کے ساتھی

www.bhutto.org

ہیں۔ اُن سے محبت کرتے ہیں۔اُن کو جو کمال حاصل ہے،اُس کے ہم معترف ہیں۔وہ بھٹو صاحب کے اچھے ساتھی ہیں۔اچھے دوست ہیں۔وہ ڈرائیونگ میں اپنا کمال رکھتے ہیں۔ہم شیخ صاحب کو ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ وہ کھر صاحب سے اچھے ڈرائیور ہیں۔اِسی طرح ہم کھر صاحب کو بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ شیخ صاحب کی طرح اچھے سیاست دان ہیں۔چیئرمین بھٹو سے اُن کی دوستی اپنی جگہ ہے مگر پارٹی کے معاملات اپنی جگہ ہیں۔اگر بھٹو صاحب کا قرب ہی کسی کیلئے وجہ انتخاب ہے تو اِس کا سب سے زیادہ حقدار بھٹو صاحب کا ذاتی ملازم نورا حقدار ہوگا۔جو ہمہ وقت دن رات بھٹو صاحب کی خدمت کرتا ہے۔بس یہ میری یہ تقریر تھی جس سے ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب کا میرے ساتھ ناراضگی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ہمارے اِن جلسوں اور ہماری تقریروں کا بھٹو صاحب کو بتایا گیا۔اُن دنوں میں پارٹی دفتر میں ہی رہا کرتا تھا۔ایک رات چیئرمین بھٹو کا دفتر فون آیا۔ پہلے تو اُنہوں نے امان اللہ خان کی خوب مرمت کی۔امان اللہ خان بھی شیخ صاحب کی اِس مہم میں تقریریں کیا کرتا تھا۔امان اللہ خان کے بعد اُنہوں نے مجھے فون پر طلب کیا۔ مجھے اُنہوں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔شرم کرو! تم کو تو میں وسیع ذہن کا انسان خیال کرتا تھا۔اُنہوں نے مجھے حکم دیا کہ آئندہ کھر صاحب کے خلاف تقریر وغیرہ نہیں ہونی چاہیے۔اِس کے ساتھ ہی اُنہوں نے فون بند کردیا۔شیخ صاحب کو چیئرمین بھٹو کی طرف سے پیغام آگیا کہ وہ جلسے جلوس کرکے پارٹی کے اندر انتشار نہ پیدا کریں۔بھٹو صاحب نے کہا کہ ایک تو میں مشرقی پاکستان کی وجہ سے پریشان ہوں۔ اوپر سے آپ پارٹی کے اندر میرے لئے پنجاب میں مشکل پیدا کررہے ہیں،اور میری پریشانی میں اضافہ کررہے ہیں۔بھٹو صاحب کے اِس حکم کے بعد ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ کچھ لوگوں نے پنجاب دفتر میں آنا ہی بند کردیا۔اُن کو خوف تھا کہ اُن کی آمد کے بارے میں غلام مصطفیٰ کھر کو علم ہوجائے گا اور وہ اُن کے خلاف ہوجائیں گے۔

مگر جو لوگ پارٹی کے اندر کچھ نظریاتی سوچ رکھتے تھے۔وہ پارٹی کے دفتر میں بدستور آتے رہتے تھے۔مگر چونکہ اقتدار کی سیاست نے پارٹی کے اندر بڑی تفریق پیدا کردی تھی جس کی وجہ سے پنجاب پیپلز پارٹی کا دفتر ایک شجر ممنوعہ بن کر رہ گیا تھا۔اِس دفتر کو پارٹی کا دفتر ہی تصور نہیں کیا جاتا تھا۔پارٹی کی ہائی کمان اِس دفتر کو اپنے خلاف تصور کرنے لگ گئی تھی۔اُنہی دنوں میں فلیٹیز ہوٹل گیا جہاں ملک غلام مصطفیٰ کھر مستقل ٹھہرا ہوا تھا۔وہاں پر ڈاکٹر مبشر حسن اور افتخار تاری

www.bhutto.org

کا لشکر موجود تھا۔ اُن کا رویہ میرے ساتھ اِس قدر حقارت آمیز تھا کہ میرا وہاں بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ خود ڈاکٹر مبشر حسن صاحب بار بار مجھے بے وفا کہہ کر شرمندہ کرر ہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ کیا اظہار رائے بے وفائی ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں یہ بے وفائی ہے۔ بھٹو صاحب کے فیصلے کے خلاف اظہار رائے ہے۔ یہ اظہار رائے نہیں ہے، بغاوت ہے۔ افتخار تاری اور طارق وحید بٹ دونوں بہ یک وقت بولے جو بھی کھر کے خلاف بات کرے گا ہم اس کی گردن توڑ دیں گے۔

وہاں مجھے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ہم بہت جلد پارٹی کا نیا دفتر قائم کررہے ہیں۔ ہم لاہور پارٹی کا دفتر کھول رہے ہیں اور اِس دفتر کو ہی پارٹی کا دفتر تسلیم کیا جائے گا۔ اِس کے سامنے کسی دوسرے دفتر کی کوئی وقعت نہیں ہوگی۔

میری بدقسمتی تھی کہ جیسے جیسے پارٹی اقتدار کے قریب آتی گئی، میرا پارٹی کے اقتدار سے فاصلہ بڑھنے لگ گیا۔ بقول شاعر

کیا قیامت تھی کہ خاطر کشتہ شب ہم ہی تھے
صبح ہونے پر بھی مجرم ہم ہی گردانے گئے

افسوس کہ ہماری اچھی سوچ کی قدر نہ کی گئی۔ اُلٹا ہماری سوچ کو پارٹی کے اندر انتشار پیدا کرنے سے محمول کردیا گیا۔ حالانکہ ہم جو کچھ بھی چاہتے تھے۔ چیئر مین بھٹو اور پارٹی کی بہتری کے لئے چاہتے تھے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیمی بدقسمتی کا آغاز

ملک غلام مصطفےٰ کھر کو جس انداز میں پنجاب کا گورنر بنایا گیا، وہ انداز ہی پاکستان پیپلز پارٹی کی تنظیمی بدقسمتی کا آغاز ثابت ہوا تھا۔ کسی بھی سیاسی جماعت میں کسی انسان کو کسی بھی صورت میں پارٹی سے بلند قرار نہیں دیا جانا چاہیے۔ پارٹی کا ہر رکن خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اُس کو پارٹی کے تابع نظر آنا چاہیے۔ پارٹی کو ہر صورت برتری حاصل رہنی چاہیے۔ سیاسی جماعت کے اقتدار کا سلسلہ بے حد نازک ہوتا ہے۔ اقتدار کو اگر غیر جمہوری طریقے کے ساتھ کسی کو تفویض کیا جائے یعنی اگر شخصی پسند یا ناپسند کے طریقے پر کسی کو اقتدار دیا جائے گا تو اِس طریقے سے بے شمار قباحتیں پارٹی

www.bhutto.org

کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ تمام لوگ کسی ایک انسان کے حق میں رائے دینے کے لئے تیار ہوں۔کسی ایک مسئلے پر یا کسی ایک انسان کے حق میں با قاعدہ جمہوری طریقہ اگر اختیار کرلیا جائے تو ہر معاملہ طے پاجاتا ہے۔پارٹی کے اندر کسی کے ساتھ بھی کسی بھی معاملے میں کسی کا اختلاف ذاتی اختلاف نہیں بن جانا چاہیے۔ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ ایک شخص تمام زندگی پارٹی اور پارٹی کی قیادت کی عبادت اور بندگی کرتا رہا ہو اور اگر وہ کسی ایک سجدے سے انکار کرے تو اُس کو جہنمی قرار دیا جائے،اُس کو شیطان بنا دیا جائے اور اِس کو پارٹی کی صفوں سے ہی نکال کر باہر کر دیا جائے۔اُس کو مردود تصور کرلیا جائے۔یہ بنیادی نقص پارٹی میں کھر صاحب کے اقتدار سے شروع ہوا تھا اور پارٹی کے اندر آج تک چلتا آرہا ہے۔پارٹی کے اندر کسی بات پر اختلاف رائے کو یا کسی عہدے دار کے خلاف اختلاف رکھنے کو پارٹی دشمنی قرار نہیں دیا جا سکتا، اختلاف رائے کو اکثریتی رائے کے ساتھ قائل کرنا چاہیے۔اختلاف کو ذاتی عناد نہیں بنانا چاہیے۔جس طرح کھر صاحب کے اقتدار حاصل کر لینے کے بعد مجھے ذاتی عناد اور نفرت کا شکار بنا دیا گیا تھا۔ہماری پارٹی کے اندر اکثر ایسے دیکھنے میں آیا ہے کہ پارٹی کے بڑے لیڈر آپس میں مفادات حاصل کرنے کے معاملے میں اختلاف رکھنے کے باوجود ایک ہو جاتے ہیں مگر مارے صرف کارکن جاتے ہیں۔یہ بات تجربے سے ثابت ہوتی ہے کہ کسی بھی سیاسی پارٹی کے غیر سیاسی رویے اور عہدہ داروں کی موقع پرستی اور بے جا نوازی کا تمام تر خمیازہ بالآخر پارٹی کی قیادت کو ہی بھگتنا پڑتا ہے۔لوگ کسی بھی عہدے دار کی غلط کاری کا تمام تر ذمہ دار پارٹی کی قیادت کو گردانتے ہیں۔1970ء میں، میں نے دیکھا کہ پارٹی جب اقتدار کے قریب پہنچی تو پنجاب پیپلز پارٹی کے اندر پنجاب کی روایتی اقتدار پرستی کا طوفان برپا ہو گیا۔پنجاب پیپلز پارٹی کے اندر شخصیت پرستی کو اتنا عروج حاصل ہو گیا کہ پارٹی کا نظریاتی عمل یکسر معدوم ہو کر رہ گیا۔نہ تو پارٹی کے اندر سینئر اور جونیئر کی تمیز باقی رہی نہ کارکنوں کی سیاسی خدمات کا کوئی معیار باقی رہا،نہ کوئی نظریہ باقی رہا۔پارٹی کے اندر ایک وسیع تر مفاد پرست حلقہ ڈاکٹر مبشر حسن کی پوجا کرنے لگ گیا۔کارکنوں کا ایک جم غفیر ملک غلام مصطفیٰ کھر کی پرستش کرنے لگ گیا۔میں نے پہلی مرتبہ زندگی میں لاہور کے ہوائی اڈے پر افتخار تاری کے نیفے سے پستول کو زمین پر گرتے دیکھا۔عین اُس وقت جب سینکڑوں لوگ چیئرمین بھٹو کے استقبال کے لئے ہوائی اڈے پر جمع تھے۔مجھے اُس وقت علم ہوا کہ سیاسی کارکنوں

کے پاس پستول بھی ہوتا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ ڈاکٹر مبشر حسن اور ملک غلام مصطفیٰ کھر صاحب تاری کے پستول گرنے کا سن کر بڑی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور تاری کو پہلوان تصور کر رہے تھے۔ اِن دونوں نے اقتدار حاصل کرتے ہی پیپلز پارٹی کے تمام کلچر کو ہی تاری کلچر بنا دیا تھا، اور پیپلز پارٹی ایک شخصی پارٹی بنا دی گئی تھی۔ کسی شریف آدمی کی پارٹی کو ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اوپر بیان کی گئی باتیں تو اقتدار میں آنے سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اقتدار میں آنے کے بعد کی باتوں کو کتاب کے اصلی مقام پر تحریر کیا جائے گا۔

1970ء کے انتخابات اور مشرقی پاکستان

مشرقی پاکستان جو آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان سے زیادہ اکثریت رکھتا تھا، 1970ء کے انتخابات میں اُس کو شاندار فتح حاصل ہوئی۔ مشرقی پاکستان میں یوں تو کافی تعداد میں سیاسی جماعتیں موجود تھیں مگر انتخابات میں صرف شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ ہی وہ واحد سیاسی جماعت تھی جس کو مشرقی پاکستان کے عوام نے انتخابات میں اپنے ووٹ سے منتخب کیا تھا۔ عوامی لیگ کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں کوئی دوسرا سیاست دان انتخاب میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ پورے مشرقی پاکستان میں صرف ایک نورالامین ہی ایسا انسان تھا جو انتخابات میں عوامی لیگ کے مقابلے میں کامیاب ہوا تھا۔ باقی تمام اُمیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئی تھیں۔ عوامی لیگ کا اگر کوئی سیاست دان انتخابات میں مقابلہ کرسکتا تھا تو وہ مولانا بھاشانی تھا۔ مگر اُس نے در پردہ انتخابات کا بائیکاٹ کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کی فتح کیلئے میدان صاف کر دیا تھا۔ اِس طرح شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان کی نیشنل اسمبلی میں 160 نشستوں کی برتری حاصل ہوگئی تھی۔ مغربی پاکستان میں چیئرمین بھٹو کی پیپلز پارٹی کو مرکزی اسمبلی کی 82 سیٹیں حاصل ہوئی تھیں۔ اِس طرح سے مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کو کامیابی حاصل ہوئی اور مغربی پاکستان میں چیئرمین بھٹو کو انتخابات میں فتح حاصل ہوئی۔ 1970ء کے انتخابات میں ایک بات اِن دونوں فتح مند رہنماؤں میں مشترک تھی۔ نہ تو شیخ مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستان میں کوئی سیٹ حاصل ہوئی تھی اور نہ مشرقی پاکستان میں چیئرمین بھٹو کو کوئی سیٹ حاصل ہوئی تھی۔ ایسا اِس لئے واقع ہوا تھا کہ تقریباً 20 سال کے عرصے سے فوج کی حکمرانی چلی آ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے پاکستان میں سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں

www.bhutto.org

پر حد بندی لگا کر اُن کو سیاست سے الگ کر دیا گیا تھا اور تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے سیاست دان مشرقی پاکستان تک محدود ہو کر رہ گئے تھے اور مغربی پاکستان کے سیاست دانوں مغربی پاکستان تک محدود کر دیئے گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ساتھ یا مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان کے ساتھ اگر کوئی رابطہ یا رشتہ پیدا ہو سکتا تھا تو وہ سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں کی سیاسی جدوجہد کے ذریعے ہی قائم ہو سکتا تھا۔ پاکستان میں قیام پاکستان کے بعد مستقل اور مسلسل عام قومی انتخابات کا سلسلہ اگر جاری رہتا تو پاکستان کے سیاست دانوں کو اور اُن کی سیاسی جماعتوں کو ملک کے دونوں حصوں میں تنظیم سازی کا موقع ملتا یا عوام سے رابطے کے موقع ملتا۔ مشرقی پاکستان کے سیاست مغربی پاکستان کی اور مشرقی پاکستان کے سیاست دان مغربی پاکستان کی ضرورت بن جاتے۔ پاکستان میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی سیاسی جماعتوں میں سیاسی اتحاد قائم ہو جاتے۔ انتخابی اتحاد قائم ہوتے اور اُن اتحادوں کی وجہ سے مغربی اور مشرقی پاکستان میں دونوں جانب کے عوام کا آپس میں اتحاد قائم ہوتا رہتا۔ بھائی چارہ قائم ہو جاتا۔ ایک تعلق بنا رہتا۔ ایک قوم اور ایک ملک کا لوگوں میں احساس پیدا ہوتا۔ اِدھر اور اُدھر کے تمام لوگ خود کو پاکستانی تصور کرنے کے عادی بن جاتے۔ مگر اِن تمام باتوں کے برعکس پاکستان میں دونوں صوبوں کے درمیان 25 سال تک جمہوری اور سیاسی تعلق ہی آپس میں کٹا رہا۔ ایک غیر جمہوری آمرانہ فوجی نظام نے دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے مکمل طور پر لاتعلق بنائے رکھا۔ پاکستان میں ایک جاری و ساری جمہوری سیاسی نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے لوگ بنگالی بن کر رہ گئے اور مغربی پاکستان کے لوگ صرف اور صرف مغربی پاکستان کے لوگ بن گئے۔ سندھی، پنجابی، پٹھان اور بلوچی بن کر رہ گئے۔ اِن لوگوں کے درمیان ایک قوم ہونے کا ایک مرکزی سیاسی رشتہ ہی نہ رہا تھا۔ سیاسی جماعتوں کا اگر کوئی سیاسی نظام تھا تو وہ انڈر گراؤنڈ ہی تھا، خفیہ تھا۔ اِس صورت میں مشرقی پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی سیاست صرف بنگال کی سیاست بن گئی۔ اُن کی سیاست کا مغربی پاکستان کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اِس کے علاوہ عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو فوج نے غداری کے الزام میں ایک مدت سے جیل میں ڈال رکھا تھا۔ اُس کے کارکنوں کو جیل میں ڈال رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے عوامی لیگ اپنی بنگالی قوم کی ایک قومی جماعت بن گئی۔ مشرقی پاکستان میں لوگ عوامی لیگ کے مقابلے میں

www.bhutto.org

دوسرے تمام سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں کو فوج کے ایجنٹ خیال کرتے تھے۔اُن کے برعکس مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں اور اُن کے اتحادی جاگیرداروں، سرمایہ سرداروں اور مذہب کے نام پر سیاست کرنے والوں نے مشرقی پاکستان کے انتخابی نتائج کو پاکستان کی سالمیت اور پاکستان کے وجود کے خلاف قرار دے دیا۔اُن کا کہنا تھا کہ بنگال میں علیحدگی پسندوں کی جیت ہوگئی ہے اور مغربی پاکستان میں سوشلزم یعنی کفر کو فتح حاصل ہوئی ہے۔یہ لوگ کہتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات کے نام پر الیکشن جیتا ہے اور بھٹو سوشلزم کے نام پر الیکشن جیتا ہے۔

اُن کے مطابق نہ تو شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کے حق میں ہے، نہ ہی بھٹو اسلام کے حق میں ہے۔اُن کے نزدیک مشرقی پاکستان کے عوام نے پاکستان کے خلاف ووٹ ڈال دیئے ہیں اور مغربی پاکستان کے عوام نے اسلام کے خلاف ووٹ ڈال دیئے ہیں۔کچھ اِس قسم کا سیاسی پروپیگنڈہ تھا جو انتخابات کے بعد فوجی حکمران اور شکست خوردہ سیاست دانوں اور مولانا مودودیؒ کی جماعت اور دوسرے مذہبی حلقے پاکستان میں کرنے لگ گئے تھے۔فوجی حکمران اِس طریقے کے پروپیگنڈے کو اپنے اقتدار کے لئے ڈھال بنائے ہوئے تھے۔

مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے انتخابات سے پہلے شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف چھ نکات کے سلسلے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔اِس کا مقصد یہ تھا کہ انتخابات سے پہلے فوجی حکمرانوں کا مجیب الرحمٰن کے ساتھ اندرکھاتے کوئی سمجھوتہ ہو گیا تھا۔

فوجی حکمران انتقالِ اقتدار کے حق میں نہیں تھے، چھ نکات ایک بہانہ تھے

جہاں تک چھ نکات کا تعلق ہے۔اِس کے بارے میں متعدد کتابوں میں بار بار تحریر کیا جا چکا ہے کہ چھ نکات کے شوشے کو جنرل ایوب خان کی حکومت نے پیدا کیا تھا۔یہ چھ نکات شیخ مجیب الرحمٰن کو فیلڈ مارشل ایوب خان کی حکومت کے بقراطی علم و دانش کی شہرت کے حامل مشیرِ خاص الطاف گوہر نے ایک سازش کے تحت دیئے تھے۔یہ چھ نکات شیخ مجیب الرحمٰن کی اپنی ایجاد نہ تھے۔اِن چھ نکات میں فوجی حکومت کی سازش کے دو راز پنہاں تھے۔پہلا راز تو مغربی پاکستان کے لوگوں کو ڈرانے کے لئے تھا کہ مشرقی پاکستان کے سیاست دان ملک توڑنا چاہتے ہیں اور یہ ملک جنرل ایوب خان کی حکومت میں ہی اکٹھا رہ سکتا ہے جس کا قائم رہنا ضروری ہے۔

www.bhutto.org

اس کے علاوہ پاکستان میں مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں کو بدنام کرنے کی سازش تھی کہ وہ ہندوستان کے ایجنٹ ہیں اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف ہیں۔ دوسرا اور تیسرا اہم راز یہ تھا کہ فوجی حکومت جس وقت اور جب بھی چاہے گی، مشرقی پاکستان کے سیاست دانوں کو خاص طور پر شیخ مجیب الرحمٰن کو ملک دشمنی قرار دے کر گرفتار کر لے گی۔ یہ وہ سازش تھی جب سازش کے تحت فیلڈ مارشل ایوب خان کی حکومت نے چھ نکات کے شوشے کو شیخ مجیب کے منہ میں ڈالا تھا۔ واضح رہے کہ یہ بات مغربی پاکستان کے اخبارات میں بار بار شائع ہو چکی ہے کہ بنگلہ دیش کے جھنڈے کراچی سے بن کر ڈھاکہ گئے تھے۔ یعنی اِن جھنڈوں کو کراچی میں بنوایا گیا تھا۔ اِس کے علاوہ شیخ مجیب الرحمٰن پر اگرتلہ سازش کا مقدمہ بھی بنایا گیا تھا۔ انتخابات سے پہلے فیلڈ مارشل ایوب خان کی حکومت نے اُس کو ایک قسم کے پیرول پر رہا کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انتخابات سے پہلے یحییٰ خان کی فوجی حکومت شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں قطعی کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی تھی۔ انتخابات کے دوران فوجی حکومت کے تمام تر انتقامات کا نشانہ مغربی پاکستان میں چیئر مین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی تھی۔ فوجی حکومت کے تمام اتحادی صرف پیپلز پارٹی کا قلع قمع کرنے پر آمادہ تھے۔ پیپلز پارٹی کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں تمام سیاسی اسلامی جماعتوں اور سیاست دانوں کا اتحاد تھا۔ یہ تمام مولوی اور سیاست دان چیئر مین بھٹو کی ذات کے ہی دشمن تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے بارے میں اُنہوں نے کبھی کوئی لفظ نہیں کہا تھا۔

فوجی حکمرانوں کا خیال تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن سے وہ جیسا چاہیں گے ویسا ہی منوالیں گے اور اگر وہ اُن کی بات کو تسلیم نہیں کرے گا تو اُس پر چھ نکات کی شکل میں علیحدگی کا الزام لگا کر اُس کو جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ فوجی حکمران اقتدار کی بندر بانٹ چاہتے تھے۔ انتقالِ اقتدار کے حق میں ہرگز نہیں تھے۔

دنیا کی سیاست میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ڈکٹیٹر شپ نے یا آمریت نے کبھی عوام پر فتح پائی ہو۔ عوامی رائے عامہ کے آگے آمریت کی ہر سازش ناکام بن جایا کرتی ہے۔ آمریت بے نقاب ہو جایا کرتی ہے۔ 1970ء کے انتخابات میں پاکستان میں آمریت پہلی مرتبہ عوامی سطح پر بے نقاب ہوگئی تھی۔ ملک کے دونوں طرف کے عوام نے آمریت کا اصل چہرہ دیکھ لیا تھا۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں لوگوں نے صرف اور صرف آمریت کے اقتدار سے

www.bhutto.org

گلوخلاصی کرنے کے لئے عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو ووٹ ڈالے تھے۔ یہی فوجی حکمرانوں کے خلاف نفرت کا اظہار تھا جس کا نام انتخابات کے نتائج تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو چونکہ اکثریت حاصل ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ پہلے والا شیخ مجیب الرحمٰن نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اب ایک حکمران مجیب الرحمٰن تھا۔ اِس کے علاوہ انتخابات کے بعد بین الاقوامی سیاسی قوتوں کے بھی اُس کے ساتھ رابطے شروع ہوگئے تھے۔ خصوصاً ہندوستان کے ساتھ اُس کی جماعت کے بڑے رابطے تھے اور انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس رابطے میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن فوجی حکومت کے ارادوں کو بہت اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی پاکستان کی فوجی حکومت کے شکنجے میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اُس نے انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے دھان منڈی میں اپنا ڈیرہ جمالیا اور اُس نے نیشنل اسمبلی کا اجلاس ڈھاکے میں طلب کرنے کا اعلان کردیا۔ فوج کے خوف سے مغربی پاکستان نہیں آنا چاہتا تھا۔ اِس طریق سے جب مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان میں اپنے اقتدار کا مورچہ قائم کرلیا تو مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ وہ اس قسم کی صورتحال کی توقع نہیں رکھتے تھے۔ فوجی حکمران کسی قیمت پر بھی اقتدار شیخ مجیب الرحمٰن کو نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ بنگالیوں کو ایک گھٹیا قسم کی مخلوق تصور کرتے تھے مگر اب جب پاکستان کی سیاست میں بنگالیوں کا تشخص اُبھر کر سامنے آگیا۔ بنگالی قوم ایک متحدہ قوم کی شکل میں ظاہر ہوگئی۔ لہٰذا فوجی حکمرانوں نے انتخابات کو اپنی توہین خیال کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف سازش کا آغاز کردیا۔ اُنہوں نے شیخ سے اپنی شرائط منوانا شروع کردیں۔ وہ شرائط فوج کے ساتھ شراکت اقتدار کی شرائط تھیں۔ جن میں اصل قوت فوج کے پاس رہنی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نام کا وزیراعظم بنایا جانا تھا۔ مگر فوجی حکمران اپنی بدنصیبی کا ادراک کرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ یہ حقیقت تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ وقت اور حالات اُن کے خلاف فیصلہ دے چکے ہیں۔ وہ اپنی طاقت اور قوت کے گھمنڈ میں وقت کے ساتھ جنگ کرنا چاہتے تھے جو ایک ناممکن بات تھی۔ مگر وہ بے وقوف ناممکن کو ممکن بنانے کے راستے پر چل نکلے۔ جس کا نتیجہ بنگلہ دیش بنانے کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ فوجی حکمرانوں نے تو شیخ مجیب الرحمٰن کو خوف زدہ کرنے کے لئے ڈھاکے میں فوجیں اُتارنا شروع کردیں۔

www.bhutto.org

مشرقی پاکستان کے مسئلے میں چیئرمین بھٹو کا کردار

چیئرمین بھٹو جو خود بھی شیخ مجیب الرحمٰن کی طرح ہی فوجی حکمرانوں کے عتاب اور عذاب کا شکار تھے۔ وہ فوجی حکمرانوں کو بہت نزدیک سے جانتے تھے۔ چیئرمین بھٹو کا اِس بات کا مکمل یقین تھا کہ مغربی پاکستان کی حکمران فوج پاکستان میں سیاست دانوں کو کسی قیمت پر اقتدار دینے کے حق میں نہیں ہے اور نہ ہی وہ پاکستان میں کسی قسم کی جمہوریت کے قائل ہیں۔ اور نہ ہی اُن کی نظر میں پاکستان کے عوام کا کوئی احترام ہے اور نہ اُن کے نزدیک سیاست دانوں کی کوئی عزت ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں سیاست دانوں کو جیلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ اُن کو بدنام کرتے ہیں۔ اُن کی کردار کُشی کرتے ہیں۔ یہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی حکومت ہی تھی جس نے چیئرمین بھٹو کو ہندوستان کا شہری ہونے کا طعنہ دیا تھا۔ یہ فوجی حکومت ہی تھی جس نے شیخ مجیب الرحمٰن کو غدار قرار دیا تھا۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ ایسا موقع آیا تھا کہ پاکستان میں قوم نے سیاست دانوں کو عزت عطا کی تھی۔ اُن کو اقتدار حاصل کرنے کے قابل بنایا تھا۔

چیئرمین بھٹو کا موقف

چیئرمین بھٹو انتہا درجے کے محب وطن تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک کانسٹی ٹیوشنل انسان تھے۔ وہ حکومتی معاملات میں بہت زیادہ آئینی اور قانونی سوچ رکھتے تھے۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کے بارے میں زیادہ نہیں تھوڑا سا تحفظ رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن اسمبلی میں جانے سے پہلے چھ نکات میں سے صرف دو یا ڈیڑھ نکات کو تبدیل کردے۔ اُن کا خیال تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنا انتخاب چھ نکات کے پروگرام کی وجہ سے جیتا ہے۔ چھ نکات ایک قسم کے اُس کے انتخابی منشور کی حیثیت رکھتے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کا آئین چھ نکات کی بنیاد پر بنانا چاہتا تھا جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان آئینی طور پر ایک طرح کے دو آزاد ملک بن جاتے تھے جن کی کرنسی اور کچھ دوسری چیزیں علیحدہ علیحدہ بن جاتی تھیں۔ چیئرمین بھٹو صرف ان نکات کو شیخ کے آئین سے حذف کرانا چاہتے تھے۔ اُن کو خوف تھا کہ شیخ کے پاس اسمبلی میں دو تہائی اکثریت ہوگی۔ وہاں اُس سے یہ بات نہیں منوائی جاسکے گی۔ لہٰذا اس بات کو اسمبلی

www.bhutto.org

میں جانے سے پہلے ہی طے کرلیا جائے۔ بس یہ وہ بات تھی جس کے لئے چیئرمین بھٹو نے اسمبلی میں جانے سے گریز کیا تھا۔

مگر میرا موقف یہ ہے کہ اس قسم کی قانونی موشگافیاں تو ایسے ممالک میں دیکھی اور پرکھی جاتی ہیں جہاں قانون کی حکومت ہو۔ ریاست آئین کی تابع ہو اور ملک اور قوم پر قانون کی عملداری ہو۔ جس ملک میں 23 سال سے ایک غیر آئینی حکومت قائم ہو۔ جہاں فوجی حکمران کسی طریقے سے بھی اپنے اقتدار سے علیحدہ نہ ہونا چاہتے ہوں۔ وہاں تو یہ موقع ہی غنیمت تھا جو بڑی مشکل سے 23 سال کے بعد ہاتھ لگا تھا۔

فوجی حکمران بددیانت حکمران تھے۔ فوجی حکمرانوں نے اسمبلی کا سیشن ہی نہیں ہونے دینا تھا۔ فوجی حکمرانوں نے چیئرمین بھٹو کو طاقت سے خود ہی روک لینا تھا۔ فوجی حکمرانوں نے کسی قیمت پر مغربی پاکستان کے اراکین اسمبلی کو مشرقی پاکستان جانے کی اجازت نہیں دینی تھی۔ لہٰذا کسی قسم کا بائیکاٹ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آنی تھی۔ اس قسم کی صورتحال کے بارے میں عابد علی عابد نے کیا قیامت کا شعر کہا تھا۔

یہ برہم ہونے والی محفل یوں بھی برہم ہو جاتی
ہم کہہ کے ہوئے بدنام کہ ساقی رات گزرنے والی ہے

ہم نے دیکھا کہ فوجی حکمرانوں نے چیئرمین بھٹو کا آئینی قسم کے اختلاف اور بائیکاٹ کو اپنی بددیانتی کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا تھا اور حالات بگڑنے کے بعد سارا الزام ہی چیئرمین بھٹو کی ذات پر تھوپ دیا تھا کہ اُن کے بائیکاٹ کی وجہ سے صورتحال خراب ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ فوج کے ہتھیار ڈالنے کے معاملے کو بھی چیئرمین بھٹو کی سازش بنادیا تھا۔ حالانکہ چیئرمین بھٹو کی ذات کا مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں کسی قسم کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ نہ تو چیئرمین بھٹو کے پاس پاکستان کا اقتدار تھا۔ نہ ہی وہ پاکستان کے اُس وقت کے حکمران تھے۔ نہ ہی وہ چیف آف آرمی سٹاف تھے۔ نہ ہی وہ مشرقی پاکستان کے گورنر تھے۔ نہ ہی وہ صدر پاکستان تھے۔ نہ ہی وہ ڈھاکے میں فوجوں کی کمان کررہے تھے۔ ملک کا تمام اقتدار فوج کے پاس تھا۔ ملک کا صدر جنرل محمد یحییٰ خان تھا۔ ملک کی تمام فوجی اور غیر فوجی طاقت صدر یحییٰ خان کے پاس تھی۔ فوجی حکمرانوں کے پاس تھی۔ وہ اگر نیک نیت ہوتے تو شیخ مجیب الرحمن کو نیشنل اسمبلی کا سیشن کرنے کا خود حکم دیتے۔

جنرل محمد یحییٰ خان اگر نیک نیت ہوتا تو اسمبلی کے اجلاس کو کسی قیمت پر ملتوی نہ کرتا۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اسمبلی کا اجلاس بلانے میں ہر طرح سے اُس کی مدد کرتا۔ شیخ کے پاس دو تہائی اکثریت تھی۔

اپوزیشن کا محتاج نہیں تھا۔ اپوزیشن اگر اسمبلی میں نہ جاتی تو لوگوں میں اپوزیشن کے خلاف نفرت پیدا ہو جاتی تھی۔ چیئر مین بھٹو کسی طرح بھی اسمبلی سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ اُن کو اسمبلی میں جانا ہی پڑتا۔ شیخ مجیب الرحمٰن بھی کسی طرح کی من مانی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کو مغربی پاکستان کے عوام اور اُن کے نمائندوں کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔ مگر افسوس کہ فوجی حکمرانوں نے اِس طرح کا ماحول ہی نہیں آنے دیا اور مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن شروع کر دیا تھا۔ فوجی حکمرانوں کے دماغ میں وہ نقشہ ہرگز نہیں تھا جو نقشہ بعد میں ڈھاکہ کے پلٹم میدان میں فوج کے ہتھیار ڈالنے پر دیکھنے میں آیا تھا۔ فوجی حکمران تو طاقت کے بل پر شیخ مجیب الرحمٰن کی اکثریت کو جعلی انتخاب کے ذریعے ختم کر کے اپنی مرضی کے جعلی ممبران اسمبلی منتخب کر کے ایک جعلی قسم کی جمہوری حکومت بنانے کے درپے تھی۔ جس کا اُس نے باقاعدہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے ممبران کی اسمبلی کی رکنیت ختم کر کے اپنے جعلی ممبروں کو جتوانے سے آغاز کر دیا تھا۔ جس کی چیئر مین بھٹو نے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے مال روڈ کے ریگل چوک لاہور میں ایک جلسہء عام میں کھل کر مذمت کی تھی اور ان ضمنی انتخابات کو بسکٹ بانٹنے کے مترادف اور جعلی کہا تھا۔ جن میں جماعت اسلامی کے لوگوں کو باقاعدہ فوجی طریقے سے اسمبلی کے رکن بنا دیا گیا تھا۔ جنرل یحییٰ خان کے اقتدار میں جماعت اسلامی کھل کر فوج کی اور آئی۔ ایس۔ آئی کی بی ٹیم کا کردار ادا کرنے لگ گئی تھی جس کا ثبوت مشرقی پاکستان میں فوج کا جماعت اسلامی کا کھلا اتحاد قائم ہونا تھا۔

میں چیئر مین بھٹو کی دانش وفکر سے آگاہ ہوں۔ وہ بے حد دور اندیش انسان تھے۔ چیئر مین بھٹو کو اِس بات کا مکمل یقین ہو چکا تھا کہ فوجی حکمران شیخ مجیب الرحمٰن کو کسی بھی قیمت پر اقتدار نہیں دیں گے۔ چیئر مین بھٹو خود کو اِس سازش سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اُن کا اسمبلی کا مشروط بائیکاٹ کرنا فوجی حکمرانوں کی اس سازش سے علیحدہ رہنے کا ایک عمل تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اسمبلی کے اندر جانے کے بعد فوج اقتدار بنگالیوں کو نہیں دے گی بلکہ بنگالیوں پر بغاوت کا الزام لگا کر جب فوجی ایکشن کرے گی تو بنگالیوں کے ساتھ خود اُن پر بھی مشرقی پاکستان میں علیحدگی کا الزام لگائے گی۔ وہ ایک ہی تیر سے دو شکار کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس احتیاط اور اسی خوف کی وجہ سے

www.bhutto.org

اُنہوں نے صورتحال سے باہر رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے بعد میں دیکھا کہ اِس احتیاط کے باوجود فوجی حکمرانوں نے کھل کر ملک میں پروپیگنڈہ کیا تھا کہ مشرقی پاکستان کو بھٹو نے علیحدہ کیا ہے۔ مگر بھٹو نے کس طریقے سے علیحدہ کیا تھا۔ اِس کا جواب نہ تو فوجی حکمران آج تک دے سکتے ہیں اور نہ ہی اُن کا کوئی مخالف ہی دے سکا ہے۔

مغربی پاکستان کی صورتحال اور پارٹی دفتر میں اشتہار چھاپنے کا معاملہ

عین اُس وقت جب فوجی اقتدار مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے بیج بو رہا تھا۔ اُس وقت مغربی پاکستان میں ایک عجیب وغریب قسم کے حالات دیکھنے میں آ رہے تھے۔ مغربی پاکستان میں فوجی حکمرانوں اور اُن کے اتحادیوں نے خصوصاً جماعت اسلامی نے ہندوستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے کی انتہائی مہم چلا رکھی تھی۔ شہر کی دیواروں پر اور کاروں پر کرش انڈیا کے بڑے قیمتی اشتہار دیکھنے میں آ رہے تھے۔ مسجدوں میں ہندوستان کے خلاف خطبے دیئے جا رہے تھے۔ سیاسی جلسوں میں ہندوستان کے خلاف تقریریں کی جا رہی تھیں۔ اخباروں میں دلی فتح کرنے کی خبریں شائع کی جا رہی تھیں۔ خود پاکستان پیپلز پارٹی پنجاب کے دفتر میں ایک حیرت ناک واقعہ دیکھنے میں آیا۔ ہمارے پنجاب کے دفتر میں ایک بہت پرانی سائیکلو اسٹائل مشین کہیں سے آ گئی تھی۔ جس مشین پر ہم سیاسی کارکن بڑی مشقت کے ساتھ پارٹی کے پروگرام کو سائیکلو اسٹائل کر کے کارکنوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ اس مشین پر زیادہ تر کام دفتر کا آفس سیکرٹری صادق مسیح کیا کرتا تھا۔ آج تک اِس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ پارٹی کے دفتر میں صادق مسیح کس شخص کی وساطت سے پہنچا تھا۔

ایک رات جب میں کافی رات گئے پارٹی کے دفتر پہنچا۔ مجھے چونکہ پارٹی دفتر میں ہی سونا ہوتا تھا۔ میں نے آدھی رات گئے سائیکلو مشین چلنے کی آواز سنی۔ میں نے صادق مسیح کے مشین والے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے کے اوپر کے حصے کے شیشے سے میں نے اندر دیکھا کہ صادق مسیح اور دو صحت مند سرخ سفید لڑکے جو بہت سوٹڈ بوٹڈ تھے، وہ مشین پر اشتہار پرنٹ کر رہے تھے۔ میں نے صادق مسیح کو زوردار طریقے سے کہا کہ دروازہ کھولو۔ اُس نے کچھ دیر کے توقف کے بعد دروازہ کھول دیا۔ وہ لڑکے وہاں سے اشتہارات اُٹھا کر بھاگ کر دفتر سے باہر کی طرف چل دیئے۔ میں نے صادق مسیح سے ان لڑکوں کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کون تھے؟ اور بھاگ

www.bhutto.org

کیوں گئے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے وہاں پڑے ہوئے ایک اشتہار کو اُٹھا کر پڑھا تو مقبوضہ کشمیر کی ایک جدوجہد آزادی کی تحریک کی انجمن کی طرف سے اشتہار پرنٹ کیا جارہا تھا۔ جس اشتہار میں مقبوضہ کشمیر کو مسلح جدوجہد کے ساتھ آزاد کرانے کا اعلان تھا اور ہندوستان کی فوج کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کا اعلان تھا۔ بلکہ ہندوستان کے ساتھ جنگ کا اعلان تھا اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کے نام پیغام تھا کہ وہ ہندوستان میں فوجی گاڑیوں پر حملے کرنا شروع کردیں اور حکومت پاکستان کی طرف سے ہندوستان کے خلاف اِس جنگ میں ہر طرح کی امداد دینے کا اعلان تھا۔
آپ دیکھیں کہ عین ایسے موقع پر جب ہندوستان مشرقی پاکستان میں مداخلت کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے ہندو عہدے داروں کے اور کچھ عوامی لیگ کے عہدے داروں کے ہندوستان کے ساتھ خفیہ رابطے تھے۔ ہندوستان فوجی حکمرانوں کی ہٹ دھرمی سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا۔ وہ پاکستان کا اُس وقت کھلا دشمن تھا۔ مشرقی پاکستان سے لوگ بھاگ بھاگ کر ہندوستان کی سرزمین پر سیاسی پناہ طلب کررہے تھے جن میں ایک اچھی خاصی تعداد منتخب اراکین اسمبلی کی بھی تھی۔ ہندوستان نے انسانی حقوق کی بنیاد پر مشرقی پاکستان کے لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے کا اعلان کردیا تھا۔ ہندوستان مشرقی پاکستان کے اور مغربی پاکستان کے فاصلے کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے طویل اقتدار سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے دلوں میں پاکستان کی فوج کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں۔ ہندوستان اِس بات کا پوری طرح اندازہ رکھتا تھا کہ پاکستان کے فوجی حکمران ایک سیاست دان کو کبھی اقتدار منتقل نہیں کریں گے۔ لہٰذا ہندوستان ان تمام باتوں کو دھیان میں رکھ کر مشرقی پاکستان میں اپنی مداخلت کا راستہ تلاش کررہا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے وجود میں آنے کا ایک پرانا انتقام لینا چاہتا تھا۔ وہ 1965ء کی جنگ کا حساب بھی چکانا چاہتا تھا۔ اس کا مکمل حساب کتاب تھا کہ مشرقی پاکستان کے علیحدہ ہوجانے کے بعد بقیہ پاکستان کے بھی حصے بخرے ہوجائیں گے۔ اس طرح کشمیر کے مسئلے سے بھی اُس کی جان کی خلاصی ہو جائے گی۔ مشرقی پاکستان کے معاملے میں ہندوستان کے بہت بڑے ہدف تھے جن کے لئے وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینا چاہتا تھا۔ ہندوستان کی خفیہ ایجنسی را کے ایجنٹ تمام پاکستان میں اپنا کردار سرانجام دے رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ان کا پچھلے 25 سال کا نیٹ ورک تھا۔ اُس

www.bhutto.org

وقت پاکستان پیپلز پارٹی کے دفتر میں مذکورہ نوعیت کے اشتہارات سائیکلو اسٹائل کرنا پیپلز پارٹی کو اس جنگ میں ملوث کرنے کی بہت خطرناک سازش تھی۔ اِس سازش سے پیپلز پارٹی کو فوج کا ساتھی ثابت کرنے کی چال تھی۔ ثابت یہ کرنا مقصود تھا کہ پیپلز پارٹی ہندوستان سے جنگ کی حامی ہے اور پیپلز پارٹی بھی مشرقی پاکستان کو اقتدار دینے کے خلاف ہے۔

جماعت اسلامی فوج کی مسلح ذیلی تنظیم کا کردار ادا کر رہی تھی

ہندوستان کی چال تھی کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں پر ثابت کر دینا چاہیے کہ پورا مغربی پاکستان ہی تمہارے خلاف ہے۔ وہ تم کو اپنا غلام رکھنا چاہتا ہے مگر ہماری بدنصیبی کہ اُس وقت کے فوجی حکمران کسی سیاسی مصلحت اور دور اندیشی کے قائل ہی نہیں تھے اور نہ ہی اِس کی اتحادی جماعت اسلامی کسی عقل و دانش کی بات کو تسلیم کرنے کو تیار تھی۔ وہ قومی رائے کو اپنے ایمان کے خلاف تصور کر رہی تھی۔ وہ پورے پاکستان میں کھل کر فوجی حکمرانوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ جب جماعت اسلامی اِس معاملے میں ننگی ہوئی تھی کہ وہ فوجی حکمرانوں کی ایک مسلح ذیلی تنظیم ہے۔ جس نے اپنی ہتھیار بندی کو مذہب کے لبادے میں چھپا رکھا تھا۔ مغربی پاکستان میں ہندوستان کے خلاف جنگ کرنے کا تمام پروپیگنڈہ جماعت اسلامی ہی کر رہی تھی۔ جماعت اسلامی کا اِس قسم کا پروپیگنڈہ ہندوستان کی مشرقی پاکستان میں مداخلت کا راستہ بنا رہا تھا۔ جماعت اسلامی کی کرش انڈیا کی مہم بازی نے ہندوستان کے لئے مشرقی پاکسان میں داخل ہونے میں کلی آسانی پیدا کر دی تھی۔ اِس کے علاوہ ہندوستان مغربی پاکستان میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے جنگ کا اشتعال پھیلانے کی چال چل رہا تھا۔ یہ اشتہار اِس سازش اور اِس چال کا حصہ تھے۔

میں نے پیپلز پارٹی پنجاب کے صدر شیخ محمد رشید صاحب کو صبح دفتر میں اِن اشتہاروں کے بارے میں آگاہ کیا۔ شیخ صاحب اشتہار دیکھ کر بے حد پریشان ہو گئے۔ مذکورہ قسم کی صورتحال کے پیشِ نظر وہ بے حد خطرناک اشتہار تھے۔ اتفاق سے چیئرمین بھٹو لاہور آئے ہوئے تھے۔ شیخ محمد رشید صاحب اور میں وہ اشتہار لے کر چیئرمین بھٹو کے پاس فلیٹیز ہوٹل گئے۔ چیئرمین بھٹو اشتہار دیکھ کر تڑپ اُٹھے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ انتہائی خطرناک کام پیپلز پارٹی کے دفتر کے اندر کرایا جا رہا ہے۔ شیخ صاحب کو کہا کہ آپ کی ناک کے نیچے ہو رہا ہے۔ فوراً اِس بات کی پولیس کو خبر کرو۔ بھٹو

www.bhutto.org

صاحب نے مجھے شاباش دی اور کہا کہ آئندہ دفتر میں تمام آنے جانے والوں پر نظر رکھا کرو۔ پاکستان بہت سنگین حالات سے گزر رہا ہے۔ پنجاب میں ہندوستان کے ساتھ جنگ کو ہوا دی جارہی ہے۔ یہ ہمارے لئے خودکشی کا باعث ہوگی۔

شیخ صاحب اور میں نے ڈی آئی جی پنجاب کو تمام بات بتائی اور اشتہارات اُن کو دکھائے اور اُن دو کشمیری لڑکوں کا بتایا کہ اُنہوں نے ہمارے دفتر کے ایک ملازم کو کچھ لالچ وغیرہ دے کر یہ اشتہار پرنٹ کرائے ہیں جس کو ہم نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ آپ حکومتی سطح پر اُن لڑکوں کو پکڑ کر اس معاملے کی تفتیش کریں۔ لڑکوں کے بارے میں ہمارے دفتر کے ملازم صادق مسیح سے پوچھا جاسکتا ہے۔ اس طریقے سے میں نے تحریری طور پر ڈی آئی جی لاہور کو اس معاملے سے آگاہ کردیا۔

مگر اس تحریری اطلاع کے باوجود ہم نے دیکھا کہ پولیس نے کوئی کاروائی نہ کی اور نہ ہی ہمارے دفتر کے ملازم صادق مسیح سے کوئی باز پرس کی۔ اس واقع کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے اُن دونوں لڑکوں کو لاہور میں ہندوستان کا گنگا نام کا طیارہ اغوا کرنے والے کشمیری ہائی جیکروں کے حق میں جلوس نکالتے دیکھا۔

ہندوستان کے طیارے گنگا کی کہانی

1971ء کی ایک صبح ہم لوگوں کو علم ہوا کہ چند کشمیری مجاہدین ہندوستان کا طیارہ اغوا کر کے لاہور ہوائی اڈے پر لے آئے ہیں۔ ایک تو ہندوستان کا طیارہ دوسرا اُس کا لاہور لایا جانا اور وہ بھی ایسے موقع پر لایا جانا جبکہ پاکستان کے سیاسی حالات انتہائی خراب تھے۔ مشرقی پاکستان میں ایک قسم کی بغاوت دیکھنے میں آرہی تھی۔ فوجی حکمران عقل کے ناخن نہیں لے رہے تھے۔ عین اس وقت لاہور میں گنگا طیارے کو اغوا کرنے کی خوشیاں منانا اور طیارہ اغوا کرنے والوں کو ہیرو کہا جانا ایک سیاسی خودکشی کا مکمل سامان تھا۔

مجھے یاد ہے کہ چیئرمین بھٹو مشرقی پاکستان سے سیدھے لاہور آئے تھے۔ ہم لوگ لاہور کے ہوائی اڈے پر اُن کے استقبال کو موجود تھے۔ بھٹو صاحب ہوائی اڈے سے چل کر ویٹنگ روم کی طرف آرہے تھے تو ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے بھٹو صاحب کو طیارے کے اغواء کا بتاتے ہوئے کہا کہ آپ مہربانی کر کے چند لمحوں کے لئے اغوا شدہ طیارے کی طرف چلیں۔ اس وقت لوگ طیارہ

www.bhutto.org

اغوا کرنے والوں کو ہیرو خیال کر رہے ہیں۔ آپ کے اُن کے پاس جانے سے لوگوں میں آپ کی عزت میں اضافہ ہوگا۔ میں بھٹو صاحب اور ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے پیچھے چلتا آ رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ ڈاکٹر! یہ بڑی خطرناک چال ہے۔ یہ کام ہندوستان کو اشتعال دلانے کے مترادف ہے۔ اِن لوگوں کو میں کہوں گا کہ ہندوستان کے طیارے کو فوراً آزاد کردو۔ اِس طرح بادل نخواستہ چیئر مین بھٹو ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر چند لمحوں کے لئے طیارے کے پاس گئے اور اُنہوں نے اُن ہائی جیکروں کو طیارے کو فوراً آزاد کردینے کا کہا۔ مگر ہائی جیکروں نے طیارے کو آزاد نہ کیا۔

ڈاکٹر مبشر حسن اور افتخار فتنہ نے ہائی جیکروں کے ساتھیوں کے جلوس کی قیادت کی

دوسرے دن میرے لئے سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ لاہور میں ان دو لڑکوں کے ساتھ جلوس کی قیادت ڈاکٹر مبشر حسن صاحب خود کر رہے تھے اور برادرم افتخار فتنہ اِس جلوس اور جلسے کے ایک طرح سے سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ یہ بات آج تک میرے لئے راز ہے کہ ڈاکٹر مبشر حسن اور برادرم افتخار فتنہ کو اِن لڑکوں کے لئے مال روڈ پر جلوس نکالنے کا کام کس نے سونپا تھا جبکہ لاہور ہوائی اڈے پر چیئر مین بھٹو نے اِس اغواء شدہ طیارے سے پیپلز پارٹی کو علیحدہ رہنے کا حکم دیا تھا اور اُنہوں نے صرف اِس اپیل پر ہی اکتفا کیا تھا کہ ہندوستان کے طیارے کو فوری طور پر آزاد کردیا جائے۔ اُنہوں نے اِس طیارے کے اغوا کو ایک سازش کہا تھا۔

طیارے کا اغواء ایک سازش تھی

ڈاکٹر مبشر حسن کے اور افتخار فتنہ کے اور اُن دو کشمیری لڑکوں کے جلوس کے بعد ہائی جیکروں نے اِس سازش کو عروج پر پہنچانے کیلئے طیارے کو بم دھماکے سے اُڑا دیا۔ اِس واقعے کے بعد ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کرنے کی کھلی دھمکی دے دی۔ معاملہ اِس قدر سنگین ہوگیا کہ کئی دوسرے ممالک نے بھی ہندوستان کی حمایت میں پاکستان کی مذمت شروع کردی۔ یہاں تک کہ حکومت برطانیہ نے پاکستان کو متنبہ کیا کہ پاکستان نے ہندوستان کے طیارے کے اغوا کرنے

والے تخریب کاروں کو سیاسی پناہ دے کر بہت بڑی سیاسی اور سفارتی غلطی کی ہے۔ جس کا نتیجہ پاکستان کے حق میں اچھا ثابت نہیں ہوگا۔

طیارہ اغواء مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے ساتھ ہوائی رابطہ ختم کرنا تھا

ہم نے دیکھا تھا کہ ہندوستان کو مشرقی پاکستان میں فوجیں داخل کرنے کے لئے گنگا کا اغوا اور اُس کو آگ لگانے کی سازش سے ایک کھلا بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ طیارے کو جلا دینے کے بعد ہندوستان نے اپنی فضا سے پاکستان کے ہوائی جہازوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اِس طریقے سے سب سے پہلے ہندوستان نے مغربی پاکستان کا مشرقی پاکستان سے فضائی رابطہ ہی ختم کر دیا جس کی وجہ سے افواج پاکستان کو مشرقی پاکستان میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ ہوائی سفر کا بند ہونا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا پہلا قدم تھا۔ ہندوسان نے پاکستان پر صاف الفاظ میں الزام لگایا کہ پاکستان کی حکومت طیارے کے اغوا میں برابر کی شریک ہے اور پاکستان نے عالمی قانون کی خلاف ورزی کر کے ہندوستان کے خلاف جنگ کا آغاز کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اِس نوع کے بیانات کے بعد پاکستان کی فوجی حکومت کو ہوش آیا۔ فوجی حکومت نے طیارہ اغوا کرنے والے لڑکوں اور اُن کے ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ ہمارے دفتر سے صادق مسیح کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پاکستان کی خفیہ ایجنسی کا ایک میجر ہماری پارٹی کے دفتر آیا اور اُس نے مجھ سے اشتہارات کے بارے میں بیان اور معلومات حاصل کیں۔ میں نے اور شیخ محمد رشید اور میاں عبدالستار نجم ایڈووکیٹ نے میجر کو کہا کہ جب ہم نے انتظامیہ کے ذمہ دار افسران کو تحریری طور پر اِس سازش سے آگاہ کر دیا تھا، اور طیارے کے اغوا سے پہلے خبردار کیا تھا۔ آپ لوگوں نے اُس وقت اُن لوگوں کے خلاف کیوں ایکشن نہیں لیا۔ حکومت نے اُن لڑکوں کو طیارے کو آگ لگانے سے کیوں نہ روکا اور طیارے کو آزاد کروا کر ہندوستان واپس کیوں نہ بھیجا۔ انٹیلی جنس کے اُس افسر کے پاس اِس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ ہمارا خیال تھا کہ طیارے کا تمام الزام کشمیری مجاہدین پر آئے گا۔ ہم نے کہا کہ طیارے کو لاہور اُترنے کی اجازت تو حکومت پاکستان نے دی تھی۔ ہائی جیکروں کی ناز برداری بھی حکومت پاکستان کر رہی تھی۔ اُن کے ساتھیوں کو مال روڈ پر جلوس نکالنے کی اجازت اور سہولت حکومت پاکستان نے دی تھی۔ اِس کے باوجود بھی آپ یہ کہتے

www.bhutto.org

ہیں کہ ہندوستان کی حکومت پاکستان کو طیارے کے اغوا میں ملوث نہیں سمجھے گی۔

انٹیلی جنس کے اس افسر کے پاس ہماری ان باتوں کا کچھ جواب نہیں تھا۔ وہ ہم سے صرف ایک ہی درخواست کئے جا رہا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کی طرف سے بیان جاری کیا جانا چاہئے کہ طیارے کے اغوا سے حکومت پاکستان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اغوا کا تمام کاروبار کشمیری مجاہدین کا کیا دھرا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ پیپلز پارٹی کے بیان سے ہمارے موقف کو تقویت حاصل ہو جائے گی۔ وہ میجر جاتے جاتے ایک حیران کن بات کر کے چلا گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ طیارے کا اغوا خود ہندوستان نے کرایا ہے۔

جب ہمارے دفتر سے انٹیلی جنس کا افسر چلا گیا تو ہم لوگ دیر تک اس بات پر بحث کرتے رہے کہ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے اور برادرم افتخار احمد فتنہ نے ہائی جیکروں کے جلوس کی قیادت کس کے کہنے پر کی تھی۔ بات صاف ظاہر تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے اس وقت کی اسٹیبلشمنٹ کے اشارے پر جلوس کی قیادت کی تھی۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی یہ خصوصیت تو اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہ گئی۔ وہ آج پیرانہ سالی میں بھی یعنی 2007ء میں بھی بڑے طمطراق کے ساتھ پاکستان کی موجودہ پرویز مشرف اسٹیبلشمنٹ کی سیاست میں ہندوستان دوستی کے سلسلے میں بہت نمایاں کردار سرانجام دے رہے ہیں۔ جس کا کتاب میں پیچھے ذکر کیا جا چکا ہے۔ ان کے بارے میں تو صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔

''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو''

مغربی پاکستان کے شکست خوردہ سیاست دانوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کا دماغ خراب کر دیا تھا

مغربی پاکستان کے تمام پرانے شکست خورہ سیاست دان جو قیام پاکستان سے پاکستان کی سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ ان سیاست دانوں کی اکثریت عوام میں اپنا تشخص کھو چکی تھی۔ اُن کے پس منظر میں چلے جانے کی کچھ ذمہ داری تو اُن کی اپنی نااہلی کے سر تھی اور زیادہ ذمہ داری فوجی جرنیلوں پر آئی تھی اور فوجی حکمرانوں پر آتی تھی۔ جنہوں نے باقاعدہ قانون بنا کر پاکستان کے سیاست دانوں کو پاکستان کی سیاست سے باہر نکال دیا تھا۔ ان سیاست دانوں کی اکثریت

www.bhutto.org

جاگیرداروں پر مشتمل تھی۔ یہ سیاست دان بے حد تن آسان اور ڈرپوک سیاست دان تھے۔ جن کی بزدلی کی وجہ سے فوجی حکمرانوں کو پاکستان کے اقتدار میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا۔ لہٰذا فوجی حکمرانوں کے ساتھ سمجھوتہ کر کے گھر بیٹھ جانے کی وجہ سے لوگوں میں اُن کے خلاف بے حد نفرت پائی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ 1970ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کے گمنام قسم کے اُمیدواروں نے اِن کی ضمانتیں ضبط کروادی تھیں۔

چیئرمین بھٹو جو اُن کے نزدیک ایک نیا سیاست دان تھا جس کو یہ لوگ نیو کمر کہتے تھے اور پیپلز پارٹی جس کو یہ لوگ چھوروں اور کمیوں کمینوں کی پارٹی کہتے تھے۔ اُس کے ہاتھوں شکست کھانے کی وجہ سے یہ تمام سیاست دان پیپلز پارٹی کی جان کے دشمن بن گئے تھے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ بھٹو نے کمیوں سے ہم خاندانیوں کی عزتوں کو پامال کروادیا ہے۔ ہم اپنی بے عزتی کا بھٹو سے انتقام لیں گے۔ اِن تمام شکست خوردہ سیاست دانوں کا فوجی حکمران یا مشرقی پاکستان کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ اُن کی دشمنی تو صرف اور صرف پیپلز پارٹی تھی جس کو یہ ہر صورت نیچا دکھانا چاہتے تھے۔

پرانے سیاست دان ہونے کی وجہ سے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اُن میں سے کئی ایک کے پرانے تعلقات تھے۔ کچھ کے سیاسی تعلقات تھے اور کچھ کے ذاتی تعلقات تھے۔ یہ تمام لوگ اکٹھے ہو کر مشرقی پاکستان چلے گئے۔ وہاں جا کر شیخ مجیب الرحمٰن کو ملے۔ اُن میں سے ہر کسی نے شیخ مجیب الرحمٰن کو مشورہ دیا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ کسی قیمت پر کوئی سیاسی بات چیت یا سمجھوتہ نہ کرے۔ اِن سیاست دانوں میں کئی ایک فوج کے ایجنٹ تھے۔ فوجی حکمران بھی یہی چاہتے تھے کہ یہ دونوں انتخابات میں کامیاب ہونے والے لیڈر آپس میں کوئی سیاسی سمجھوتہ نہ کر سکیں۔ اِن دونوں کو آپس میں لڑا دیا جائے۔ فوجی حکمرانوں کی یہ سازش مغربی پاکستان کے تمام شکست خوردہ سیاسی دانوں کی خواہش کے عین مطابق تھی۔ لہٰذا سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے ہی مغربی پاکستان کے سیاست دانوں کا اِس بات پر اتفاق تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو بھٹو کے نزدیک نہ آنے دیا جائے۔

پنجاب کے شکست خوردہ سیاست دانوں کے علاوہ سرحد اور بلوچستان کے سیاست دان جن میں ولی خان، اجمل خٹک، مفتی محمود اور بلوچستان کے میر غوث بخش بزنجو اور اُن کے سیاسی اتحادی مینگل اور مری اور بگٹی سرداروں کا معاملہ ذاتی تو شاید نہ تھا۔ اُن کا چیئرمین بھٹو کی مخالفت کرنا ایک سیاسی معاملہ تھا۔ یہ لوگ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے بعد انتخابات میں اپنے دونوں صوبوں

www.bhutto.org

میں اکثریت حاصل کرنے والے تھے۔ یہ وہ سیاست دان تھے جو قیام پاکستان سے ہی اپنے صوبوں کی خودمختاری حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے رہتے تھے۔

اب یہ اتفاق کی بات تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ پوائنٹ اُن کی صوبائی خودمختاری کے مطالبے سے بھی کئی ہاتھ آگے تھے۔ لہٰذا ان بلوچی سرداروں کا اور ولی خان کا مجیب الرحمٰن کا سیاسی الحاق ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ اِن پٹھان اور بلوچی سیاست دانوں کو چھ پوائنٹ اپنے خوابوں کی تعبیر سے بھی بڑھ کر نظر آرہے تھے۔ اُن کی صوبائی خودمختاری کا مطالبہ گو صرف سیاسی آزادی تک محدود تھا۔ اُن کے صوبوں میں اُن کی مقامی حکمرانی حاصل کرنے تک محدود تھا۔ مگر چھ نکات میں تو اُن کے مطالبوں سے کہیں زیادہ چیزیں پنہاں تھیں۔ چھ نکات ایک صوبے کو مکمل ملک بنانے کی طرح کے تھے۔ جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی کرنسی بھی علیحدہ ہوگی۔ تجارت بھی علیحدہ ہوگی۔ مشرقی پاکستان دوسرے ممالک کے ساتھ معاہدے کرنے میں بھی آزاد ہوگا اور مشرقی پاکستان کی اپنی فوج ہوگی۔ آج تک دنیا کی کسی جمہوریت میں ایسا نہیں دیکھنے میں آیا تھا کہ کسی ایک ملک میں کسی ایک صوبے کی کرنسی علیحدہ ہو۔ سٹیٹ بینک علیحدہ ہو اور تجارتی پالیسی علیحدہ ہو۔ مشرقی پاکستان چونکہ مغربی پاکستان سے بہت فاصلے پر تھا لہٰذا فوج کی حد تک تو اُن کا مطالبہ درست تھا۔ مگر کرنسی اور تجارت اور خارجہ پالیسی کو علیحدہ حاصل کرنے کا معاملہ بڑا ٹیڑھا معاملہ تھا۔ اِس کے لئے صاحب اختیار لوگوں کا بیٹھنا ضروری تھا۔ اِس مسئلے میں بنیادی طور پر شیخ مجیب الرحمٰن اور چیئرمین بھٹو کا آپس میں اعتماد قائم ہونا، اُن کا آپس میں اتفاق پیدا ہونا ضروری تھا، لازمی تھا، ناگزیر تھا۔ اِن دونوں منتخب عوامی رہنماؤں کا اتحاد اور اتفاق ہی کوئی بہتر راستہ نکال سکتا تھا۔ جس کے لئے منتخب اسمبلی میں ایک متفقہ آئین کا بنانا انتہائی ضروری تھا۔

چیئرمین بھٹو دیوانگی کی حد تک پاکستان پرست تھے

چیئرمین بھٹو جو دیوانگی کی حد تک پاکستان پرست تھے، وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کے کچھ حصوں پر اپنے تحفظات کا اظہار کر چکے تھے۔ یہ ایک آئینی قسم کا اختلاف تھا۔ اِس قسم کے اعتراضات اور اختلافات کی سیاست میں ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ اِس قسم کے اختلاف کو کسی طرح بھی شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار نہ دینے سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ولی خان اور بلوچ سرداروں کو

چیئرمین بھٹو کا یہ اختلاف اپنے سیاسی خوابوں کے خلاف دکھائی دے رہا تھا۔ لہٰذا خان عبدالولی خان، نواب اکبر بگٹی، مفتی محمود اور کچھ بلوچ سردار مشرقی پاکستان پہنچ گئے۔ اُنہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنا ہر طرح کا تعاون پیش کیا اور مجیب الرحمٰن کو چھ نکات کے مطابق دستور سازی پر قائم رہنے کا مشورہ دیا۔ وہ چھ پوائنٹ کو اپنی زندگی کی معراج تصور کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جب مشرقی پاکستان کو ایک صوبے کی حیثیت سے وہ تمام چیزیں حاصل ہو جائیں گی جن کا چھ پوائنٹ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور چھ پوائنٹ کے مطابق پاکستان کا آئین بن جانے کے بعد وہ تمام چیزیں قانونی طور پر اُن کو خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ اِس کے لئے اُن کو کسی علیحدہ جدوجہد کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی۔ اور اگر پاکستان ٹوٹ جاتا ہے تو یہ بات تو پٹھان اور بلوچ رہنماؤں کی دیرینہ خواہش کی تکمیل تھی جس کو وہ قیام پاکستان سے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا کرتے تھے۔ اِس طریقے سے دونوں ہی اُن کی مرادیں پوری ہو جانے کا موقع اُن کے ہاتھ آ گیا تھا۔ گویا چِت بھی اُن کی تھی اور پٹ بھی اُن کی تھی۔

خان عبدالولی خان، مفتی محمود اور بلوچ سرداروں نے مشرقی پاکستان میں باقاعدہ طور پر چیئرمین بھٹو کے خلاف بیان دینا شروع کر دیئے کہ مغربی پاکستان کا بھٹو اکیلا ترجمان نہیں ہے اور نہ ہی وہ پورے مغربی پاکستان کا لیڈر ہے۔ مغربی پاکستان میں دو صوبوں میں ہماری اکثریت ہے اور دو صوبوں میں بھٹو کی اکثریت ہے۔ وہ چیئرمین بھٹو کی مرکزی اسمبلی کی اکثریت کو ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی اکثریت کو تسلیم کرنے کا اعلان تو کرتے تھے مگر چیئرمین بھٹو کی مغربی پاکستان میں اکثریت حاصل کرنے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اُن لوگوں کی سیاست کا یہ تضاد بے حد خطرناک اور افسوس ناک تھا۔ ایک طرح کا غیر سیاسی رویہ تھا۔

چیئرمین بھٹو کی ٹانگیں توڑنے والی بات اور یادگار کی غلط اصطلاح کی درستی

چیئرمین بھٹو نے ٹانگیں توڑنے والی بات لاہور میں ''یادگارِ پاکستان'' کے جلسہ عام میں کہی تھی۔ چیئرمین بھٹو نے سب سے پہلے تو یادگارِ پاکستان کی غلط اصطلاح کو درست کیا۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ یادگار نہیں ہے۔ یادگار تو کسی چیز کے ختم ہونے کے بعد بطور یادگار کہی یا سمجھی جاتی ہے۔ یہ غلط اصطلاح ہے۔ آج سے یہ جگہ مینارِ پاکستان کہلائے گی جو ایک صحیح اور درست اصلاحی اصطلاح

www.bhutto.org

تھی۔ اب ایسا چیئرمین بھٹو کی طرح کا لیڈر دوبارہ قوم کو کہاں نصیب ہوسکتا ہے جو ملک وقوم کے معاملے میں اِس قدر سنجیدہ اور حساس تھا۔

ٹانگیں توڑ دینے والی بات کا پس منظر یہ تھا کہ فوجی حکمران نہ تو شیخ مجیب الرحمٰن کو ملک کا قائد تصور کرتے تھے اور نہ ہی وہ بھٹو کو قومی لیڈر تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہ اِن دونوں رہنماؤں کو اپنے دائرہ اختیار میں رکھنا چاہتے تھے۔ فوجی حکمرانوں کی سازش یہ تھی کہ مغربی پاکستان میں ایک طرح کا بھان متی کا کنبہ اکٹھا کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ایک حصہ داری کی حکومت قائم کرلی جائے۔ ایسی حکومت جس کے اراکین فوجی حکومت کے دست نگر ہوں۔ اِس سلسلے میں فوجی حکمران مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کے منتخب اراکین قومی اسمبلی کو لالچ دے کر، نقد روپیہ دے کر پارٹی سے علیحدہ کرنے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اُن کو پورے مغربی پاکستان میں صرف ایک رکن اسمبلی اُن کے ہاتھ آیا تھا جس کا نام تھا احمد رضا قصوری تھا۔ احمد رضا قصوری پاکستان پیپلز پارٹی کا واحد رکن قومی اسمبلی تھا جس نے راولپنڈی صدر ہاؤس میں صدر پاکستان جنرل محمد یحییٰ خان کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ اِس کے بعد وہ واحد رکن قومی اسمبلی تھا جس نے فوجی حکومت کے اشارے پر ڈھاکہ جا کر شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی تھی۔ احمد رضا نے شیخ مجیب الرحمٰن کو کہا تھا کہ میری طرح پیپلز پارٹی میں اور بھی میرے کئی ساتھی رکن اسمبلی ہیں جو بھٹو کے خلاف آپ کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں۔ آپ مجھے اُن کا نمائندہ سمجھیں جو وقت آنے پر آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے۔ احمد رضا کی یہ حرکت دنیا کے تمام سیاسی اُصولوں کے منافی حرکت تھی۔ یہ کھلم کھلا پارٹی ڈسپلن کی خلاف ورزی تھی اور قیادت کے موقف کے خلاف بغاوت تھی۔ ہم سیاسی کارکن بھی سیاسی جماعت میں کسی بھی ایک رکن کی اِس طرح کی حرکت کو بے حد نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ تمام دنیا اِس طرح کے دوغلے سوداکار ایجنٹ نما سیاسی لوگوں یا کارکن سے ہمیشہ نفرت کرتی ہے۔ اُن کو کبھی بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ احمد رضا قصوری کی جنرل یحییٰ خان کے ساتھ ملاقات کو بھی پارٹی کے تمام لوگوں نے بہت نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اِسی طرح ڈھاکہ جانے کی حرکت پر بھی پارٹی کے اندر اُس کے خلاف بہت نفرت اور حقارت پیدا ہو چکی تھی۔

پارٹی کے اراکین اسمبلی اور پارٹی کے کارکنوں نے چیئرمین بھٹو کے ساتھ اِس احمق احمد رضا قصوری کے خلاف بہت احتجاج کیا تھا۔ چیئرمین سے یہ بھی کہا تھا کہ اِس موقع پرست کو فوری طور پر

www.bhutto.org

پارٹی سے نکال دیا جائے۔ پارٹی کے اراکین کو خطرہ تھا کہ اس کے دیکھا دیکھی کچھ دوسرے لوگ بھی اس راہ پر نہ چل پڑیں۔ چیئرمین بھٹو نے مینارِ پاکستان کے جلسہ میں اپنے پارٹی اراکین کو مخاطب کر کے کہا جو بھی ہماری پارٹی سے تنہا اُڑان بھر کر ڈھاکہ جائے گا، اُس کی کارکن ٹانگیں توڑ دیں گے۔ اِس بات کا پارٹی کے اندر پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا کہ چیئرمین بھٹو جلسہ عام میں اِس طرح کی حرکت کی مذمت کریں۔ اِس فیصلے میں ڈاکٹر مبشر حسن، میاں محمود علی قصوری، حنیف رامے، میر رسول بخش تالپور وغیرہ تمام لوگ شامل تھے۔ یہ بات ایک سیاسی استاد کی صرف اپنے شاگردوں کو تنبیہ کی شکل میں تھی۔

یہ بات صرف اور صرف پارٹی ڈسپلن کے زمرے میں کہی گئی تھی۔ چیئرمین بھٹو کی اِس بات کا اشارہ مغربی پاکستان کی دوسری سیاسی جماعتوں اور اُن کے اراکین اسمبلی کی طرف ہرگز نہیں تھا۔ یہ سراسر پارٹی کے اندر کی بات تھی۔ جس بات کو اصل حقیقت سے کاٹ کر ایک خاص مقصد کے تحت ایک گھناؤنی سازش بنادیا گیا تھا۔ جس طرح اِدھر ہم اور اُدھر تم والی بات کو گھناؤنا بنایا گیا تھا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاست میں کسی بھی موضوع کو سیاق و سباق کے ساتھ بیان کرنے کی رسم ہی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ہر بات کو اپنے اپنے مفادات کے پیش نظر بیان کیا جاتا ہے۔ ہماری سیاست میں حقیقت پسندی کا کلچر ہی پیدا نہیں ہونے دیا گیا۔ ہمارے ہاں قومی سیاست کو ایک سازش کے تحت دھوکہ اور فریب کا استعارہ بنادیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں سیاست دان کا تشخص ایک جھوٹا، مکار اور دغا باز اور حیلہ ساز کا بنادیا گیا ہے۔ کسی سیاست دان کا نام زبان پر آتے ہی گالی بن جاتا ہے۔ سیاسی کارکن تو باقاعدہ گالی بن چکے ہیں۔ سیاست میں یہ عمل پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ نے کیا ہے۔ اسٹیبلشمنٹ ملک بھی توڑ ڈالے تو تب بھی باعزت اور باوقار رہتی ہے۔

فوجی جرنیل پاکستان کی بہادر افواج کے 93 ہزار فوجیوں سے ہتھیار بھی ڈلوائیں تو وہ فاتح پاکستان ہی رہتے ہیں۔ مگر ایک سیاست دان ذوالفقار علی بھٹو 93 ہزار گرفتار شدہ فوجیوں کو ہندوستان کی قید سے باعزت طور پر رہا کروا کے بھی لے آئے تو وہ بے وقار ہی رہتا ہے۔ افواجِ پاکستان سے ہتھیار ڈلوانے والے جرنیلوں پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جاتا۔ اُن کا کورٹ مارشل نہیں کیا جاتا۔ مگر ایک سیاست دان کو بے گناہ پھانسی پر لٹکا دیا جاتا ہے۔ یہاں پر مجھے میر کا شعر خوب یاد آیا ہے۔

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

www.bhutto.org

اِدھر تم اُدھر ہم

مشرقی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اور سیاسی قائدین چونکہ خود کو مغربی پاکستان کے محکوم و مظلوم خیال کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہ تمام کے تمام ایک ہو گئے تھے۔ مولانا بھاشانی جو خود کو مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان ایک پل قرار دیتا تھا اس نے بھی مغربی پاکستان کو سلام پیش کر کے شیخ مجیب الرحمٰن کی بیعت کر لی تھی۔ اس طریقے سے پوری بنگالی قوم شیخ مجیب الرحمٰن کی پشت پر کھڑی ہو گئی تھی۔ مگر مشرقی پاکستان کے برعکس مغربی پاکستان کی صورت حال بے حد مختلف تھی۔ مغربی پاکستان میں ہر سیاست دان باون گز کا تھا وہ کسی دوسرے سیاست دان کی قیادت کو تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ مغربی پاکستان میں جس طرح پیچھے حوالہ دیا گیا ہے دو طرح کے سیاست دان تھے۔ ایک تو قوم پرست سیاست دان تھے جو قیام پاکستان کے ساتھ ہی قید و بند کی صعوبتوں کے شکار بنا دیئے گئے تھے۔ اور پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ کے جبر اور ظلم کا تختہء مشق چلے آ رہے تھے۔ ان کا مجیب الرحمٰن کا ساتھ دینا ایک قدرتی بات تھی۔ ان کے علاوہ ایک بہت بڑی سیاست دانوں کی کھیپ جس کا تعلق پنجاب سے تھا وہ اپنی اقتدار پرستی کی روایتی فطرت کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن کے در دولت پر جا کر سجدہ ریز ہو گئی تھی۔ ان میں اکثریت ایسے سیاست دانوں کی تھی جن کی پیپلز پارٹی کے مقابلے میں انتخاب میں زرِ ضمانت تک ضبط ہو گئی تھی۔ ان سیاست دانوں کا نہ تو کوئی اصول تھا اور نہ ہی کوئی نظریہ تھا۔ اقتدار ہی ان کا نظریہ تھا اور اقتدار ہی ان کی زندگی کا سیاسی اصول تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہی تھی کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے قوم پرست سیاست دانوں کا اور پنجاب کے سیاست دانوں کا چیئرمین بھٹو کے خلاف فطری اتحاد ہو گیا تھا۔

لہٰذا ان دونوں قسم کی بااثر سیاسی قوتوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو اپنا غیر مشروط قسم کا تعاون پیش کرنا شروع کر دیا۔ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی ان تمام سیاسی شخصیتوں کی مشترکہ کوشش تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی مرکزی حکومت میں اپنے لئے راستہ بنایا جائے۔ شیخ مجیب کی چونکہ مغربی پاکستان میں پارٹی ہی نہیں تھی۔ اگر مغربی پاکستان میں کوئی عوامی لیگ کے نام کی جماعت تھی بھی تو وہ برائے نام تھی جس کی وجہ سے شیخ مجیب کو بھی ایسے سیاسی لوگوں کی ضرورت تھی جن کو مغربی پاکستان میں اپنا شریکِ اقتدار کیا جائے۔ لہٰذا شیخ مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستان میں اپنے اقتدار

www.bhutto.org

کے لئے کسی ایک فریق کا انتخاب کرنا تھا۔ ایک فریق تو وہ تھا جس کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہے جو قوم پرستوں اور پنجابی سیاست دانوں کا متحدہ فریق تھا جس کی سیاست فوج کی سیاست تھی۔ دوسرا فریق چیئر مین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن ذہنی طور پر یعنی طبیعتاً چیئر مین بھٹو سے لگاؤ نہیں کھاتا تھا۔ وہ چیئر مین بھٹو کو بہت چالاک اور ہوشیار سیاست دان خیال کرتا تھا۔ طبقاتی طور پر بھی وہ چیئر مین بھٹو کی ذات سے کچھ احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ چیئر مین بھٹو ایک بین الاقوامی شہرت کے حامل سیاست دان تھے ایک خوبصورت سمارٹ اور ماڈرن انسان تھے جبکہ شیخ مجیب الرحمٰن کی شخصیت اور شہرت صرف بنگال تک ہی محدود تھی۔

وہ چیئر مین بھٹو کے مقابلے میں اس دوسرے فریق کے ساتھ سیاست کرنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ ان کے ساتھ اپنی سیاست میں آسانی خیال کرتا تھا۔ خود کو ایزی محسوس کرتا تھا۔ اپنی سیاست کے لئے زیادہ مفید خیال کرتا تھا۔ سیدھی بات تھی کہ قوم پرستوں کی اور اس کی سیاست کا قدرتی اتحاد بن جاتا تھا۔ باقی رہ گئے پنجاب کے لیڈر یہ لیڈر چونکہ اپنی کوئی عوامی قوت نہیں رکھتے تھے یہ تمام کے تمام شیخ کے مرہونِ منت رہنے تھے۔ لہٰذا ان لوگوں سے بہتر شیخ کو اپنے لئے مغربی پاکستان میں کوئی دوسرا فریق سودمند نہیں ہوسکتا تھا۔

ان کے مقابلے میں چیئر مین بھٹو مغربی پاکستان میں عوامی نمائندگی کی اکثریت حاصل کرنے کے بعد خود کو اس بات کا پابند خیال کرتے تھے کہ وہ عوامی لیگ کے چھ پوائنٹ کے ایجنڈے کو تراش خراش کر پاکستان کے دونوں حصوں کا متفقہ آئین کے قابل بنا دیں۔ جس کے لئے وہ شیخ مجیب الرحمٰن پر زور دے رہے تھے کہ وہ اسمبلی میں جانے سے پہلے ایسے ایک آدھ نکتے کی اصلاح کر لیں جو اسمبلی میں جا کر وجہ نزع بن سکتے تھے۔ چیئر مین بھٹو کا یہ اصولی مطالبہ کسی انداز سے بھی غیر جمہوری مطالبہ نہیں تھا۔ ایک جائز اور دوراندیشی کا مطالبہ تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اگر اسمبلی میں چھ نکات کے مطابق اپنی اکثریت کے بل پر آئین بنا بھی لیتا تو فوج نے اس کو چلنے نہیں دینا تھا اور بالآخر اس آئین کو خلاف پاکستان یا علیحدگی پسند قرار دے کر اس اسمبلی کو توڑنے کا بہانہ مل جانا تھا۔ مگر شیخ مجیب الرحمٰن اپنی اکثریت کے نشے میں کسی کی عقل کی بات کو سننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔ اس پر ظلم یہ تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستان سے ایسے لوگ میسر آ رہے تھے۔ جن کو اس کے کسی نکتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ چیئر مین بھٹو کے کسی بھی مطالبے کو خاطر میں لانے

www.bhutto.org

کے لئے تیار نہیں تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے اس نوع کے رویے کے خلاف چیئرمین بھٹو نے کراچی کے نشتر پارک میں 14- مارچ 1971ء کو انتہائی حقیقت افروز الفاظ میں احتجاج کرتے ہوئے اس پر واضح کیا تھا کہ جس طریقے سے مشرقی پاکستان میں تم نے اور تمہاری جماعت عوامی لیگ نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی ہے اسی طرح مغربی پاکستان میں میں نے اور میری جماعت پیپلز پارٹی نے انتخابات میں اکثریت حاصل کی ہے اس نقطہ نظر کے حوالے سے تم مشرقی پاکستان کے عوام کے منتخب نمائندے ہو، میں مغربی پاکستان کے عوام کا منتخب نمائندہ ہوں۔ اس طرح وہاں تم کامیاب ہوئے، یہاں ہم کامیاب ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں رہنماؤں کے اتفاق اور اتحاد کے ساتھ ہی وفاقِ پاکستان کی نمائندگی مکمل ہو سکے گی۔

آج جو لوگ مغربی پاکستان کے لیڈر بن کر تمہارے پاس آ رہے ہیں وہ مغربی پاکستان کے لیڈر نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ تو اپنے اپنے علاقوں کے منتخب نمائندے ہیں مگر باقی وہ تمام لیڈر ہیں جن کو لوگوں نے اپنی نمائندگی کرنے کے قابل نہیں سمجھا وہ انتخاب میں شکست خوردہ لوگ ہیں۔ لہٰذا آپ کے لئے ضروری ہے اور وفاقِ پاکستان کے لئے بھی ضروری ہے کہ آپ مغربی پاکستان کی اکثریتی منتخب قیادت کے ساتھ سیاسی بات چیت کریں۔ مغربی پاکستان کی منتخب سیاسی قیادت ذوالفقار علی بھٹو ہے۔ یہ وہ تقریر تھی جس کو میں نے مختصر ترین الفاظ میں یہاں رقم کر دیا ہے۔ جس تقریر کو اِدھر تم اور اُدھر ہم کا تڑکا لگا کر ہمارے مہربان دوست محترم عباس اطہر شاہ نے جو ان دنوں آزاد اخبار کے معاون ایڈیٹر تھے اپنے اخبار آزاد کی سرخی بنا دیا تھا۔ سید عباس اطہر کی عادت تھی کہ وہ آزاد اخبار میں بڑی چبھتی ہوئی سرخی لگایا کرتا تھا۔ اخبار میں مین سرخی لگانے میں اس کا منفرد انداز ہوا کرتا تھا۔ سید عباس اطہر کی یہ سرخی ان کے اخبار ''آزاد'' کے مزاج کے مطابق سرخی تھی۔ یہاں پر بہت ضروری ہے کہ آزاد اخبار کی اصلیت کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ اس اخبار کی وجہ اشاعت اور وجہ پیدائش کیا تھی۔

''اخبار۔۔۔آزاد''

آزاد اخبار کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے پاکستان میں پرانے کمیونسٹوں نے نکالا تھا۔ جن میں عبداللہ ملک، حمید اختر اور کچھ دوسرے کمیونسٹ کہلانے کی شہرت رکھنے والے شامل تھے۔ یہ حضرات اتنے ہی پاکستانی تھے جتنا کہ میں خود ہوں۔ البتہ یہ حضرات اپنے سیاسی نظریات میں

www.bhutto.org

چیئر مین بھٹو کے ساتھ کچھ بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ وہ اختلاف ہندوستان کے بارے میں تھا۔ یہ حضرات کہتے تھے کہ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے۔ پاکستان کو چاہئے کہ وہ خود کو ہندوستان کے برابر کا ملک تصور نہ کرے۔ بلکہ ہندوستان کی ''ہجمنی'' یعنی اطاعت کو قبول کرے۔ ہندوستان کے ساتھ جنگ و جدل کی پالیسی کو ترک کر کے ایک چھوٹے ملک کی حیثیت سے اپنا سیاسی کردار ادا کرے۔ ان حضرات کا دوسرا بڑا اختلاف پاکستان کی خارجہ پالیسی کا اختلاف تھا یہ تمام لوگ سوویت روس کی کیمونسٹ پارٹی کے حامی تھے اس حوالے سے ہندوستان کے بارے میں یہ بڑا نرم گوشہ رکھتے تھے جبکہ پاکستان شروع دن سے ہی امریکہ پرست تھا اور سوویت روس کا اس خطے میں دشمن اول تھا۔

ان حضرات کے برعکس چیئر مین بھٹو کا موقف تھا کہ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے اور پاکستان ہندوستان کے ساتھ ہر مسئلے پر برابری کی سطح پر بات کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جہاں تک سوویت روس کی بات تھی اس معاملے میں چیئر مین بھٹو پہلے پاکستان کے وزیر خارجہ تھے جنہوں نے سوویت روس کے ساتھ پاکستان کی دوستی اور تجارت کا آغاز کیا تھا۔ مگر وہ سوویت روس کے اس طرح حامی نہیں تھے جس طرح یہ حضرات تھے۔ 1970ء کے انتخابات میں ہندوستان مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمن کی ہر طرح مدد کر رہا تھا۔ ہندوستان کی عوامی لیگ کے ساتھ ہمدردی یا مددگاری کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ہندوستان اپنی اندرونی سیاست کی بنا پر چیئر مین بھٹو کے خلاف کچھ نمایاں تحفظات رکھتا تھا۔ وہ چیئر مین بھٹو کے مقابلے میں ہر معاملے میں شیخ مجیب الرحمن کو زیادہ قابل اعتماد اور اپنا دوست تصور کرتا تھا۔ ہندوستان کی شیخ مجیب الرحمن کی حمایت کی اصل وجہ شیخ کے چھ نکات تھے۔ مجیب الرحمن کے چھ نکات ہندوستان کی ان تمام خواہشوں کو پورا کرتے تھے جو ہندوستان قیامِ پاکستان سے ہی اپنے دل میں پالے ہوئے تھا۔ ہندوستان کی یہ خواہش چیئر مین بھٹو سے ہرگز ہرگز پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

ان بزرگوں نے آزاد اخبار شیخ مجیب الرحمن کی مغربی پاکستان میں مدد اور ترجمانی کی غرض سے نکالا تھا جس اخبار کا قدرتی عمل چیئر مین بھٹو کی مجیب الرحمن کے مقابلے میں مخالفت کرنا تھا۔ مغربی پاکستان میں اس وقت چونکہ اسٹیبلشمنٹ بھی چیئر مین بھٹو کی مخالف تھی جس کی وجہ سے اس اخبار کو چند ہی دنوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہو گئی تھی۔ مغربی پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ یا فوجی حکمران شیخ مجیب الرحمن کو قطعی طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنی بنگال دشمنی پر پردہ ڈالنے کے لئے چیئر مین بھٹو کو

www.bhutto.org

بدنام کرنا چاہتے تھے کہ چیئرمین بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن کے اقتدار کے خلاف ہے۔ لہٰذا ان حضرات اور فوجی حکمرانوں کا چیئرمین بھٹو دشمنی پر اتفاق تھا۔ اور یہ سرخی اس اتحاد کی سب سے بڑی علامت بن گئی تھی۔ اس سرخی سے فوجی حکمرانوں اور ان حضرات کی وقتی طور پر مشترکہ خواہشات کی تکمیل ہوگئی تھی۔ فوجی حکمران چونکہ کسی بھی قیمت پر اقتدار ایک بنگالی سیاست دان کو دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ پاکستان کے سیاسی معاملات اور حالات کو اس نہج پر لے گئے جہاں جا کر مشرقی پاکستان کے عوام کے پاس بغاوت کے سوا کوئی راستہ موجود نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ اور یہ عوام کی بغاوت ہی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کی افواج کو مشرقی پاکستان کی سرزمین پر چڑھائی کرنے کا حوصلہ مل گیا تھا۔

پاکستان کے فوجی حکمران مشرقی پاکستان میں طاقت کے ذریعے عوام کی بغاوت کو کچلنا چاہتے تھے۔ فوجی حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو ملک پر مسلط رکھنے کے لئے جب مشرقی پاکستان پر باقاعدہ فوج کشی کر دی۔ جس کی وجہ سے تمام مشرقی پاکستان میں ایک طرح کی عوامی بغاوت برپا ہوگئی۔ مشرقی پاکستان کا ہر گھر پاکستان کی فوج کے خلاف مورچہ بند ہوگیا۔ بنگالیوں کی پاکستان کی فوج کے خلاف مسلح بغاوت اور نفرت سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان نے اپنی مسلح افواج کو مشرقی پاکستان میں داخل کر دیا۔ ہندوستان کی اس طرح کی مسلح مداخلت دنیا کے تمام قوانین کے خلاف تھی اور پاکستان پر ایک کھلے حملے کی طرح تھی۔ لہٰذا ہندوستان کی اس فوجی مداخلت کے خلاف مغربی پاکستان میں ہندوستان کے خلاف نفرت کا پیدا ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ ہرچند افواجِ پاکستان کی مشرقی پاکستان پر مسلح کارروائی کسی اعتبار سے بھی قابلِ تعریف نہیں تھی مگر ہندوستان کی مشرقی پاکستان میں افواجِ پاکستان کے خلاف فوج کشی تمام بین الاقوامی اصولوں کے خلاف تھی ہر طرح سے غلط اور جارحیت کے زمرے میں آتی تھی۔

کوئی محبِ وطن پاکستانی یا کوئی بھی اخبار یا کوئی بھی صحافی ہندوستان کی اس مسئلے پر حمایت نہیں کر سکتا تھا۔ اب تو ہر اخبار کو ہندوستان کے خلاف لکھنا پڑتا تھا۔ لہٰذا اس بات کی تاریخ گواہ ہے کہ جوں ہی ہندوستان نے مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں اتاریں تھیں ان حضرات نے فوری طور پر آزاد اخبار کو شائع کرنا بند کر دیا تھا۔ روزنامہ آزاد کو نہ تو فوجی حکمرانوں نے بند کیا تھا اور نہ ہی یہ اخبار کسی سرمایہ کی کمی کی وجہ سے بند کرنا پڑا تھا۔ روزنامہ آزاد اس وقت مغربی پاکستان خصوصاً لاہور اور پنجاب میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت اخبار تھا۔ مگر اب جب ہندوستان نے پاکستان کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندوستان کے جنگی جہازوں نے مغربی پاکستان کے تمام

www.bhutto.org

بڑے شہروں پر منڈلانا شروع کر دیا تھا۔ لاہور پر ہندوستانی جنگی جہازوں نے باقاعدہ بم باری کی تھی۔ ہندوستان پاکستان کے خلاف ننگی جارحیت پر اتر آیا تھا۔ پاکستان میں اس قسم کی صورت حال میں آزاد اخبار کا بند کرنا اس بات کا کھلا ثبوت تھا کہ یہ حضرات ہندوستان کی اپنی پالیسی کے مطابق مخالفت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان حضرات کے لئے اس صورت حال سے باہر نکلنے کا ایک راستہ تھا کہ اخبار بند کر دیا جائے۔ حالانکہ اس وقت اس اخبار کو فوجی حکمرانوں پر دباؤ ڈالنا چاہئے تھا کہ وہ اقتدار کو شیخ مجیب الرحمٰن کو دے کر ملک کی سالمیت کا تحفظ کرے۔

افسوس کہ ان بزرگوں کا تمام کیمونزم چیئر مین بھٹو کی ذاتی مخالفت تک محدود تھا۔ چیئر مین بھٹو کی پھانسی کے بعد ان کا تمام کیمونزم مشرف بہ اسلام ہو گیا، مشرف بہ جنرل مشرف ہو گیا، مشرف بہ امریکہ ہو گیا، آج یہ تمام حضرات جو زندہ سلامت ہیں ملٹی نیشنل کمپنیوں کی انجیوز کے کارپرداز ہیں۔ ہندوستان دوستی کے فورم چلا رہے ہیں۔ بسنت میلوں میں بھنگڑے ڈال رہے ہیں۔ اپنے گلے میں پیلے کپڑے ڈال کر ہندوستان کی یاترا کر رہے ہیں۔ مختلف طائفوں کی شکل میں ہندوستان کے مستقل مہمان بن چکے ہیں۔ آج ان کا کیمونزم فائیو سٹار ہوٹلوں کی چھتوں پر کھڑا ہو کر نائٹ بسنت منا رہا ہے۔ گڈیاں اور پتنگیں اڑا رہا ہے۔ آج گویا پاکستان میں غربت ہے نہ افلاس نہ بھوک ہے نہ پیاس نہ تو سرمایہ داری کی لوٹ کھسوٹ ہے نہ ہی جاگیرداروں کا استحصال آج یہ تمام مارکسزم کے سوداگر اور کیمونزم کے تاجر لاہور کی سب سے بڑی ہاؤسنگ سکیم سب سے مہنگی ہاؤسنگ سوسائٹی ڈیفنس میں رہائش پذیر ہیں اور خوب عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ شاید مرزا غالب نے ان کے بارے میں ہی یہ شعر کہا تھا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کب

نوٹ: آزاد اخبار کو بند کرنے کی بات جناب حمید اختر صاحب نے جرنلزم میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے والے میرے ایک دوست توصیف احمد خان کو میری موجودگی میں انٹرویو دیتے ہوئے کہی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب مشرقی پاکستان پر فوج کشی شروع ہوئی تھی ہم نے اخبار کو بند کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے کہ یہ کیمونسٹ پارٹی کا فیصلہ تھا۔

یوں تو چیئر مین بھٹو نے وہاں اور یہاں کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ جو ان کے محتاط ہونے

کی انتہا تھی۔ اگر ایک مقرر مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیانی فاصلے کے بُعد کی بنا پر اگر اِدھر تم اُدھر ہم کہہ بھی دے تو اس میں قیامت ڈھانے والی کونسی بات تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ اُدھر شیخ مجیب الرحمٰن جیتا تھا اور اِدھر چیئرمین بھٹو جیتے تھے۔ ''اِدھر تم۔ اُدھر ہم'' کا کھیل خفیہ ایجنسیوں کا کھیل تھا جو انہوں نے چیئرمین بھٹو کے خلاف خوب کھیلا تھا۔

جنرل یحییٰ خان نے قومی اسمبلی بلانے کا اعلان کر دیا، لیکن اب شیخ مجیب الرحمٰن نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا

مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف جب نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ جب چیزیں اپنی انتہائی شکل میں بگڑنا شروع ہو گئیں۔ تب جنرل یحییٰ خان نے مارچ 1971ء کے آخری ہفتوں میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا اعلان کر دیا۔ مگر شیخ مجیب الرحمٰن نے اسمبلی میں جانے سے انکار کر دیا۔ پہلے چیئرمین بھٹو نے اسمبلی کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اب شیخ مجیب الرحمٰن نے بائیکاٹ کر دیا۔ نشتر پارک کا جلسہ اس طرح کے پس منظر میں کیا گیا تھا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو صاحب پر الزام لگایا تھا کہ جنرل یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس بھٹو صاحب کے مشورے کے بعد بلایا ہے۔ چیئرمین بھٹو نے اپنے 14۔ مارچ کے جلسے میں روزنامہ مشرق اخبار کے مطابق چیئرمین بھٹو کے جلسے میں خطاب کی خصوصی سرخی لگائی۔ جس میں انہوں نے کہا۔ مجھے کلمہ پاک اور بچوں کی قسم صدر یحییٰ نے میرے مشورے سے اسمبلی کا اجلاس نہیں بلایا۔ اخبار نے ان کے خطاب کے بارے میں تحریر کیا قائدعوام نے اپنی تقریر کے دوران عاجزی اور انکساری سے کام لیا۔ انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے لئے معزز القاب استعمال کئے۔ ان کے بارے میں کوئی سخت الفاظ استعمال نہیں کئے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ مجیب خدا کی قسم ہم نے سخت غلطی کی ہے۔ جلسے میں چیئرمین بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن سے اپیل کی کہ وہ ملک کے اتحاد اور سالمیت کی خاطر قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کریں۔ میں آپ سے بار بار ملاقات کرنے کو تیار ہوں۔ میں حلف اٹھانے کو تیار ہوں کہ میں نے مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف بھی کوئی سازش نہیں کی۔ اخبار مشرق کے مطابق کراچی کے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے ایک مرتبہ بچوں کی قسم کھائی اور چار مرتبہ کلمہ طیبہ پڑھا اور چار مرتبہ خدا کی قسم کھائی۔

www.bhutto.org

نشتر پارک کی تقریر اور مجیب الرحمٰن کا فارمولا

نشتر پارک کے جلسہ میں چیئر مین بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کے ہی فارمولے کو اپنی تقریر کی بنیاد بنایا تھا۔ جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کے ہی فارمولے کے تحت انہوں نے مطالبہ کیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو اکثریت حاصل ہے لہٰذا مشرقی پاکستان میں اقتدار عوامی لیگ کو سپرد کر دیا جائے۔ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہے لہٰذا مغربی پاکستان میں اقتدار پی پی پی کے سپرد کر دیا جائے۔ تاکہ فوج کا کردار درمیان سے ہٹ جائے۔ اور یہ دونوں برسرِ اقتدار پارٹیاں اور ان کی قیادت ایک ڈھیلے ڈھالے جمہوری وفاق کی شکل میں پاکستان کو متحد رکھ سکیں۔ اس لئے کہ شیخ مجیب الرحمٰن فوجی جرنیلوں کے خوف سے مغربی پاکستان کا اقتدار حاصل کرنے کی خواہش ہی نہیں رکھتا تھا اور نہ ہی وہ کسی قیمت پر فوجی جنتا پر اعتبار کرنے کو تیار تھا۔

شیخ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان کے ساتھ اتنا ہی تعلق رکھنا چاہتا تھا جتنا اس نے اپنے اس فارمولے کے مطابق چیئر مین بھٹو سے ڈھاکہ میں آخری بار بات کی تھی۔ چیئر مین بھٹو نے سب کچھ جاتا دیکھ کر شیخ مجیب الرحمٰن کے تقسیم اقتدار فارمولے کے مطابق نشتر پارک میں اقتدار منتقل کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ جس مطالبے کو انتہائی غلط معنی پہنا کر خفیہ ایجنسیوں نے ملک میں سیاسی فضا کو مکدر کر دیا تھا۔ خفیہ ایجنسیاں شیخ مجیب اور بھٹو دونوں کو ہی اپنی سازش کا شکار بنا رہی تھیں۔ مجیب الرحمٰن پر الزام تھا کہ وہ مغربی پاکستان کو ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔ چیئر مین بھٹو پر الزام تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کو ساتھ نہیں رکھنا چاہتا۔ اس طریقے سے خفیہ ایجنسیاں دونوں لیڈروں کو بدنام کر کے اپنی سازش کو کامیاب بنانا چاہتی تھی جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکیں اور پاکستان دو ٹکڑے کر دیا گیا۔

قارئین کتاب میں ہم نے سید عباس اطہر کی ''اُدھر تم۔ اِدھر ہم'' کی سرخی کی حقیقت کو جاننے کے لئے چیئر مین بھٹو کی 14- مارچ 1971ء کی نشتر پارک کی تقریر کا مکمل متن جو مشرق اخبار اور مساوات اخبار میں شائع کیا گیا۔ کتاب میں اخبار کے صفحات کی شکل میں شامل کر دیا ہے۔ تاکہ روزنامہ آزاد کی اس مخصوص اور معروف سرخی کی صداقت اور حقیقت کا آپ کو علم ہو سکے۔ اس سلسلے میں پہلے آپ روزنامہ مشرق جو کہ فوجی حکومت کا اخبار تھا اس کی اشاعت ملاحظہ کریں۔ بعد میں روزنامہ مساوات میں تقریر کا متن ملاحظہ کریں۔

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اقتدار سونپ دیا جائے۔ (بھٹو)

(14-مارچ 1971ء، روزنامہ مشرق لاہور/کراچی) پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے مطالبہ کیا ہے کہ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو اقتدار سونپ دیا جائے۔ آج سہ پہر نشتر پارک کراچی میں ایک بہت بڑے جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ ہم متحدہ پاکستان پر یقین رکھتے ہیں اور ملک کو ایک سوشلسٹ جمہوریہ بنانا چاہتے ہیں۔ آج اس وقت جو آئینی بحران پیدا ہوا ہے اس کی ذمہ داری کسی صورت میں بھی پیپلز پارٹی پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہم نے عوام کو اقتدار کی منتقلی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی اور نہ ہی کسی سے ساز باز کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مفاد پرست عناصر مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اختلافات کو ہوا دے رہے ہیں انہوں نے اپنی اس پیش کش کو پھر دھرایا کہ وہ شیخ مجیب الرحمان سے بات چیت کے لئے ہر وقت ڈھاکہ جانے کو تیار ہیں۔ انہوں نے کہا میں عوامی لیگ کے چھ میں سے تین نکات پہلے ہی تسلیم کر چکا ہوں، دو اور نکات کے بارے میں تصفیہ ممکن ہے اور چھٹے نکتے پر بھی بات ہو سکتی ہے۔ تاہم انہوں نے کہا کہ مغربی پاکستان کے مفادات کا تحفظ پیپلز پارٹی ہی کر سکتی ہے جو ملک کے اس حصہ کی واحد اکثریتی پارٹی ہے۔

مسٹر بھٹو نے کہا کہ اگر ملک کا دستور تیار ہونے سے قبل شیخ مجیب الرحمان کے مطالبہ کے مطابق اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل کرنا ہے تو پھر اس کا طریقہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اقتدار منتقل کر دیا جائے جو دونوں حصوں کی اکثریتی پارٹیاں ہیں۔ مسٹر بھٹو نے آج کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک تقریر کی۔ جس کے دوران انہوں نے الیکشن کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا تفصیل سے ذکر کیا۔ انہوں نے موجودہ صورتحال اور دستور سازی کے بارے میں اپنی پارٹی کے مئوقف پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ ملک کے دو حصے ہیں۔ اس حصہ میں پیپلز پارٹی کو اکثریت حاصل ہے اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو اگر دونوں بازوؤں کی اکثریتی پارٹی کو اقتدار منتقل کیا جائے تو اس کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو اقتدار سونپ دیا جائے۔ انہوں نے ایک

www.bhutto.org

پاکستان کے بارے میں اپنے تصور کی وضاحت کرتے ہوئے ان حالات میں جبکہ ایک ملک میں اس طرح دو حصوں میں تقسیم ہو تو چھ نکاتی پروگرام کے پس منظر میں جمہوریت کے اصولوں کا اطلاق کس طرح ہوگا؟ اس طرح کہ دونوں بازوؤں کی اکثریتی پارٹیوں کو باہم سمجھوتہ کرنا ہوگا اور ایسے حالات میں اکثریت کے پورے ملک پر حکومت کرنے کے حق کا اطلاق صرف اسی صورت میں ہوگا کہ چھ نکات کا مطالبہ ختم کرایا جائے اور اگر چھ نکات سے دستبردار نہیں ہو سکتے تو پھر لازمی ہے کہ دونوں بازوؤں کی اکثریتی پارٹیوں کے درمیان مفاہمت کی صورت نکالی جائے۔

مسٹر بھٹو نے کہا کہ ہم نے عوامی لیگ سے آئینی مسائل پر تصفیہ کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ مگر عوامی لیگ نے ایک نہیں سنی۔ ہم آج بھی ملک کی اکثریتی پارٹی کے ساتھ اسمبلی میں بیٹھ کر مکمل اور جامع دستور بنانے کے لئے تیار ہیں جو ملک کی سلامتی، یکجہتی اور عوام کی خوشحالی کا ضامن ہو۔ میں اب بھی یہ سمجھتا ہوں کہ عوامی لیگ کے ساتھ کوئی نہ کوئی مفاہمت ہو سکتی ہے۔ انہوں نے شیخ مجیب الرحمن سے اپیل کی کہ وہ ان لوگوں کے مشوروں پر کان نہ دھریں۔ جنہیں عوام نے گذشتہ عام انتخابات میں مسترد کر دیا ہے۔ اور ان میں سے بعض کی تو ضمانتیں تک ضبط ہو چکی ہیں۔

پیپلز پارٹی کے سربراہ نے کہا کہ میری پارٹی کی دلی خواہش ہے کہ دونوں صوبوں کے عوام کا استحصال ختم کیا جائے مگر یہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ملک سے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کیا جائے اور اس کی جگہ سوشلزم نافذ کیا جائے۔ انہوں نے کہا کہ عوامی لیگ اسمبلی سے باہر آئینی امور پر بات چیت کی مخالف ہے اور اس جماعت کے لیڈروں کا اصرار ہے کہ تمام دستوری معاملات اسمبلی کے اندر ہی طے پا سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات میرے لئے حیرانی کا باعث ہے کہ عوامی لیگی رہنما نے اب اسمبلی کے اجلاس کے لئے چار شرائط کیوں پیش کر دی ہیں۔ حالانکہ یہ بھی اسمبلی کے باہر معاملات کو طے کرنے کی ہی ایک صورت ہے۔

پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمان سے دوبارہ اپیل کی کہ وہ عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی اور جمہوریت کی بحالی کی خاطر آئین بنانے میں مدد دینے کے لئے 25-مارچ کو شروع ہونے والے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کریں انہوں نے کہا کہ متنازعہ مسائل پر مصالحت اور افہام و تفہیم کے لئے ابھی وقت ہے آئین بن جائے تو مارشل لاء کو ختم کیا جا سکتا ہے اور اقتدار عوام کو منتقل کیا جا سکتا ہے شیخ مجیب الرحمان کو چاہئے کہ اسمبلی کے اجلاس میں

www.bhutto.org

شرکت کے لئے پیشگی شرط عائد نہ کریں۔ انہوں نے کہا کہ ہم ڈھاکہ جانے اکثریتی پارٹی کے لیڈر سے بات چیت کرنے اور قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے تیار ہیں۔

چھ نکات چھوڑ دو اور پورے ملک کی جمہوری حکومت کا حق لے لو (بھٹو)

(14- مارچ 1971ء، روزنامہ مساوات لاہور) ذوالفقار علی بھٹو آج تیسرے پہر نشتر پارک کراچی میں لاکھوں افراد کے ایک بہت بڑے جلسہ سے خطاب کرر ہے تھے۔ میں نے بیشمار تقریروں میں کہا تھا کہ ہم عوامی آئین بنائیں گے۔ محنت کشوں، غریبوں اور مزدوروں کا آئین ___ ایک طرف ہماری کتاب تھی اور دوسری طرف تقریروں کے یہ وعدے کہ ہم ایسا دستور بنائیں گے جس میں محنت کشوں اور غریبوں کے حقوق کی ضمانت ہو۔ ہم ایسا دستور نہیں بنائیں گے جس میں سرمایہ داروں کے حقوق ہوں انتخابی مہم میں ایک سال تک مفاد پرستوں اور سرمایہ داروں کا ہمارے ساتھ جو رویہ رہا وہ آپ سب جانتے ہیں۔

انہوں نے مکمل کوشش کی تھی کہ ہم جیتنے نہ پائیں۔ سرمایہ داروں، بڑے جاگیرداروں اور بڑے پیروں نے میری مخالفت کی کیونکہ میں استحصال کا مخالف تھا۔ بائیس خاندانوں اور سرکاری ملازموں نے میری بھرپور مخالفت کی۔ اب کہا جارہا ہے کہ بھٹو نے سازش کی ہے، سیاہ طاقتوں کے ساتھ مل کر منصوبہ بنایا ہے فوج کے ساتھ ساز باز کی ہے، کون سی حکومت کے ساتھ سازش؟ وہ حکومت کہ جو جب سے وجود میں آئی ہے اس نے پوری کوشش کی کہ پیپلز پارٹی کامیاب نہ ہو۔ کیا لوگوں کے حافظے اتنے کمزور ہیں۔ یاد نہیں کہ نشتر پارک میں پہلی تقریر میں، میں نے شیر علی سے کہا تھا کہ شیر علی تم اپنی سازشیں بند کردو۔ شیر علی اس وقت اسی حکومت کا وزیر تھا۔ آپ بھول گئے کہ میں نے لیاری میں کیا تقریر کی تھی (عوام نے کہا ''ہاں یاد ہے، یاد ہے'') اسی حکومت نے میری کتاب ''متھ آف انڈی پنڈنس'' پر پابندی لگائی اور اسی حکومت کے دور میں 13- اگست 1969ء کو میری پارٹی کے لیڈروں ممتاز علی بھٹو، عبدالواحد کیٹر، غلام مصطفیٰ جتوئی وغیرہ پر مقدمہ قائم کیا گیا۔ پھر حیدرآباد میں طلباء کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کیا گیا۔ میں ان کا مقدمہ لڑنے گیا تو ایک وکیل کی حیثیت سے مجھے مقدمہ نہ لڑنے دیا گیا۔ اسی حکومت نے میرے بھائی اور دوست معراج محمد خان کو گرفتار کیا۔ اسی حکومت نے میرے بزرگ میر علی احمد تالپور کو انتخاب سے چند روز قبل ایک

www.bhutto.org

سال کی سزا دی۔ اسی حکومت نے مولانا کوثر نیازی کو گرفتار کیا۔ ٹنڈو باگو میں میرے بائیس پولنگ ایجنٹوں کو گرفتار کیا گیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں بیلٹ بکس توڑ کر مفتی محمود کو کامیاب کرایا گیا کہ بھٹو چھ میں سے کم از کم ایک سیٹ پر سے تو ہار جائے۔ آخر بھٹو کس کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے؟ جو میرے دوست مشرقی پاکستان میں ہیں وہ اور جنہوں نے مغربی پاکستان میں شکست کھائی ہے، بتائیں کہ کیا میں سرمایہ داروں کے ساتھ ساز باز کروں گا جنہوں نے میری پارٹی کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی۔ کیا سرکاری ملازموں کے ساتھ ساز باز جو اس وقت سے میری مخالفت کر رہے ہیں، جب سے میں نے ایوب خان کی حکومت کو چھوڑا ہے۔

آپ مغربی پاکستان کے نمائندے ہیں آیئے بات کریں اس طرح انہوں نے کیا گناہ کیا؟ اگر شیخ صاحب مغربی پاکستان میں ہوتے تو ان کی ملاقات بھی اسی طرح ہوتی۔ خفیہ ملاقات پانچ گھنٹے کی۔ ہوا یہ کہ دس بجے ہم ملنے گئے۔ ساڑھے بارہ بجے تک گفتگو ہوئی۔ کھانے کا وقت تھا۔ صدر صاحب نے پوچھا کھانا کہاں کھاؤ گے؟ ہم نے کہا ہوٹل میں کھائیں گے اور کہاں۔ انہوں نے کہا کہ یہیں کھانا کھالو۔ میں آدھ گھنٹے میں ایک سفیر سے مل کر آتا ہوں۔ پھر کھانا کھاتے ہیں۔ وہ ڈیڑھ بجے واپس آئے پھر کھانا ہوا اور اس کے بعد ہم چلے آئے۔ یہ تھی پانچ گھنٹے کی خفیہ ملاقات اور ساز باز۔ آئندہ ہم اپنا سینڈوچ جیب میں ڈال کر لے جائیں گے اور ان کا کھانا نہیں کھائیں گے۔ ایک بار معراج میرے ساتھ تھا اور دوسری بار دوسرے چار لیڈر میرے ہمراہ تھے۔

شیخ صاحب نے ریس کورس کی تقریر میں کہا ہے کہ اسمبلی کی تاریخ 3۔مارچ، پیپلز پارٹی کی رائے سے مقرر کی گئی تھی لیکن میں کہتا ہوں کہ ہم سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ قسم سے کہتا ہوں، اپنے بچوں کی قسم کھا کر ہم سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا یہ بالکل غلط ہے۔ پشاور میں یوسف خٹک کے ہاں کھانا تھا وہاں پی پی آئی کے ایک ایجنٹ نے مجھے نہیں شیر پاؤ کو بتایا کہ 3۔مارچ کو اجلاس ہونے والا ہے۔ ہمیں اس وقت معلوم ہوا۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ، اس سلسلے میں ہم سے کوئی رائے نہیں لی گئی۔ ہم نے جانے سے انکار کیا تو اس کے بعد قانونی ڈھانچہ میں ترمیم کی گئی کہ جو رکن اسمبلی میں جانے سے پہلے استعفیٰ دینا چاہے وہ استعفیٰ دے سکتا ہے۔

آج مجھے بہت کچھ کہنا ہے اور میں کہہ بھی کہاں سکتا ہوں، ہمارے کون سے اخبارات ہیں۔ میں آپ کی عدالت میں پیشی دے رہا ہوں اور آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں تا کہ جواب دے سکوں۔

www.bhutto.org

لوگ کہتے ہیں کہ بحران کی ذمہ دار پیپلز پارٹی پر ہے یعنی وہ لوگ جنہوں نے ہماری مخالفت کی لیکن شکست کھائی اور ضمانتیں ضبط کروائیں۔ جن جماعتوں کو ہم نے شکست دی وہ ہمیں اور آپ کو کبھی معاف نہیں کریں گی۔ ان لوگوں نے آج بھی بڑے بڑے پوسٹر تقسیم کیے ہیں تاکہ عوام میں غلط فہمیاں پیدا کی جائیں، آج جو لوگ پیپلز پارٹی کو بحران کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ ہم آپ سے تعاون کریں گے آپ ہمارے لیڈر ہیں بلکہ سارے مغربی پاکستان کے لیڈر ہیں، انہوں نے غلام مصطفےٰ کھر سے کہا کہ میں تمہاری دونوں آنکھوں کا کتا ہوں، شاید وہ صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ مصطفےٰ کھر پنجاب کے وزیر اعلیٰ بنیں گے۔ انہی صاحب نے 16- فروری کو لاہور انٹر کانٹی نینٹل میں ظہور حسین کی شادی کے موقع پر مجھ سے کہا کہ ہم آپ کو اپنا لیڈر مانتے ہیں۔ جب اسمبلی کی تاریخ کا اعلان ہوا تو میں نے 13- فروری کو پشاور میں یوسف خٹک کے مکان پر خان قیوم خان کی موجودگی میں ان صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی اس گفتگو کے دوران انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کی رائے درست ہے، لیکن آج کل وہ بڑے بڑے بیان دے رہے ہیں کہ بھٹو کی انتہا پسندی کی وجہ سے بحران پیدا ہو رہے ہیں۔ حالانکہ ہم نے بات چیت کی، پہلے انہوں نے ہماری بات مانی، پھر انکار کر دیا۔

اس پر جلسہ کے سامعین نے مطالبہ کیا کہ اس لیڈر کا نام بتائیں۔

جناب بھٹو نے کہا ان کا نام ہے "میاں۔۔ممتاز۔۔محمد۔۔خان دولتانہ۔" ایک اور صاحب ہیں جو سیاست میں ابھی آئے ہیں، انہوں نے بڑی ممتاز غلطیاں کی ہیں، زبردست شکست کھائی ہے، ایک سیٹ بھی نہیں لے سکے لیکن جمہوریت، جمہوریت کرتے پھرتے ہیں، انہوں نے مجھ سے کہا "میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں" لیکن میں نہیں ملا۔ سیاسی اخلاق کا تقاضا ہے کہ جو باتیں ہوتی ہیں وہ بتائی نہیں جاتیں۔ میں نے شیخ مجیب سے جو باتیں کیں وہ خفیہ رہیں، سیاست کا بھی قانون ہوتا ہے، لیکن یہ باہر جا کر عوام کو غلط اور جھوٹی باتیں بتاتے ہیں۔ انہی صاحب نے 14- جولائی کو میرے ساتھ ملاقات کا پروگرام بنایا۔ پلاننگ کمیشن کے سابق چیئرمین کے گھر کھانا تھا، یہ صاحب مجھے وہاں ملے اور کہنے لگے راولپنڈی میں میری مدد کریں۔ میں نے کہا وہاں میرا اپنا نمائندہ کھڑا ہے، اگر آپ شروع میں میرے ساتھ ملتے تو میں آپ کی مدد کرتا اور ایوب خاں ملک میں مارشل لاء نہ لگاتا۔ بس اتنی بات ہوئی لیکن انہوں نے لوگوں سے کہا کہ بھٹو نے مجھ سے کہا ہے کہ اگر میں ایک طرف سے اور وہ دوسری طرف سے تحریک شروع کر دیں تو

www.bhutto.org

حکومت مل جائے گی۔ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں اب میں نے ان سے ملاقات اس لئے نہیں کی کہ وہ مجھ سے ایک بات کہہ کر جائیں گے اور مجیب کو کچھ اور کہہ دیں گے۔

ایک تیسرے صاحب بھی سیاست میں کود پڑے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ میں مزدوروں اور کسانوں کا دوست ہوں۔ میں کہتا ہوں اگر تم مزدوروں اور کسانوں کے دوست ہو تو مسلم لیگ میں دھکے کیوں کھا رہے ہو۔ ہارون کے چمچے کیوں بنے ہوئے ہو۔ نور خاں صاحب پیپلز پارٹی میں آنا چاہتے تھے میں نے نہیں آنے دیا۔ میں نے کہا کہ پیپلز پارٹی میں ان کو آنے دوں گا جو انقلابی نظریات رکھتے ہیں۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں نے اسمبلی کے اجلاس سے پہلے وقفہ کیوں مانگا تھا۔ مغربی پاکستان کی رائے عامہ چھ نکات کے خلاف ہے۔ شکست کھانے والی جماعتوں نے چھ نکات کے خلاف بہت پراپیگنڈا کیا ہے۔ چھ نکات میں ایسی باتیں ہیں جنہیں قبول کرنا مشکل ہے۔ میں نے شیخ مجیب سے کہا تھا کہ جس سند پر تم کامیاب ہوئے ہو، اسی سند پر ہم کامیاب ہوئے ہیں۔ عوام نے ہمیں ووٹ دیئے ہیں۔ ہمیں عوام کے اعتماد پر پورا اترنا چاہئے۔ تم روز کہتے ہو__ 15 فروری، 15 فروری لیکن میں کس منہ سے مغربی پاکستان جاؤں گا۔ مجھے مغربی پاکستان جا کر اپنے قومی اسمبلی کے ارکان اور صوبائی اسمبلی کے ارکان سے مذاکرات کرنے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری جماعتوں سے گفتگو کرنی ہے۔ مجھے عوام کے پاس جانا پڑے گا۔ پشاور، لاہور، ملتان، حیدرآباد اور کراچی میں ایک ایک تقریر کرنی پڑے گی۔ میرے مغربی پاکستان میں چار صوبے ہیں۔ وہاں عوام کو سمجھانا پڑے گا کہ چھ نکات کیا چیز ہیں۔ چھ نکات میں آپ کے مفاد کے خلاف کیا ہے اور آپ کے حق میں کیا ہے اور پھر معلوم کرنا ہے آپ کی رائے کیا ہے۔ کیونکہ میں نے عہد کیا تھا کہ آپ کی رائے کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھاؤں گا۔ اگر وہ صاحب کہتے ہیں کہ عوام کی رائے ہو چکی ہے اور بنگلہ دیش چھ نکات کے حق میں ہے تو آؤ میرے بھائی کوشش کریں۔ میری جگہ بھی آئیں۔ میں بتاؤں چھ نکات کے بارے میں مغربی پاکستان کی کیا رائے ہے۔ عوام کو یہ بتانے کی ذمہ داری نور خاں، اصغر خاں، دولتانہ، شیر علی خاں کی نہیں ہے۔ ذمہ داری بھٹو کی ہے۔ اگر میں مشرقی پاکستان گیا اور عوام کی رائے نہ لی اور عوام کو حقیقت نہ بتائی تو واپسی پر عوام پوچھیں گے ہم نے تم سے کیا کہا تھا۔ تم ہماری موت کے پروانے پر دستخط کیوں کر آئے۔ آپ بتائیں کیا آپ مجھ سے نہ کہتے؟

www.bhutto.org

چھ نکات میں اَسّی فی صد فیڈرل لیوی (وفاقی ٹیکس) سندھ اور پنجاب کو دینا پڑے گا۔ سندھ اور پنجاب کے لوگ مجھ سے کہتے کہ اکثریت مشرقی پاکستان کی ہے اور اَسّی فی صد ٹیکس ہم دیں۔ آپ کس رعب سے اسمبلی میں گئے تھے۔ ہم اتنا قرض کیسے دے سکتے ہیں؟ سندھ اور پنجاب کو اندرونی قرضہ اکتیس ارب روپے اور بیرونی ٹیکس اڑتیس ارب روپے دینا پڑتا ہے۔

عوام مجھ سے کہتے او بھٹو! تم وہی ہو جو ہمارے لئے روتے تھے اور کہتے تھے میں تمہارے لئے تبدیلی لاؤں گا۔ او بھٹو، تم کشمیر کے لئے کیا کر کے آئے ہو۔ تم نے بھارت سے تجارت کرنا منظور کر لیا ہے پھر ایسا ہوتا کہ جو لوگ بحران کا ذمہ دار مجھے ٹھہرا رہے ہیں وہ واپسی پر ہم سے کہتے۔ آپ بہت بڑے لیڈر بن کر آئے ہیں۔ ہمارے مفاد کے خلاف فیصلہ کر آئے۔

ہماری نظر میں استحصال اور سرمایہ داری کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے سوشلزم لاؤ، غریبوں کی خدمت کرو، مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان دونوں میں استحصال کو ختم کرو۔ ہم یہاں اکثریت میں ہیں آپ وہاں اکثریت میں ہیں۔ پاکستان کے دو حصے ہیں۔ دوسرے کی بات بھی سنو۔ آؤ باتیں کریں۔ ہم چاہتے ہیں۔ اقتدار منتقل ہو، وہاں کی اکثریت کو وہاں یہاں کی اکثریت کو یہاں۔ میں نے پاکستان کے لئے ہر قربانی دینے کا عزم کیا ہوا ہے۔ میری سیاسی زندگی گو بہت مختصر ہے لیکن پندرہ سال کی سیاسی زندگی میں میں نے پاکستان کی سالمیت کے لئے قربانی دی ہے۔ میں وزیر تھا تو اتنی بڑی طاقت سے ٹکر لی۔ جس سے بڑے بڑے ملکوں کے سربراہ بھی ڈر جاتے ہیں لیکن میں نے کوئی پرواہ کئے بغیر اپنے وطن کی محبت کے پیشِ نظر جانسن سے لڑائی کی۔ میں تاشقند میں روس کے وزیراعظم کوسیگن سے لڑا۔ میں نے ہندوستان سے جو کوئی معمولی مملکت نہیں ہے۔ اس سے لڑائی لی۔ میں کیوں لڑا۔ اس خطے کے لئے۔ جان و مال کی قربانی کوئی بڑی چیز نہیں، میں اب بھی پاکستان کے لئے، ایک پاکستان کے لئے، ایک سوشلسٹ جمہوریہ کے لئے قربانی دینے کو تیار ہوں۔

میں رو رہا ہوں، مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ اس لئے کہ مشرقی پاکستان میں لوگوں پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ میں نے بنگالی عوام کی بھی خدمت کی ہے۔ بنگالی میرے بھائی ہیں۔ میری آٹھ سال کی وزارت کے دوران کوئی سیکرٹری یا وزیر یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ میں نے بنگال کی خدمت نہیں کی۔ یہ میرے وہی بنگالی بھائی ہیں جب میں ایوب خان کی وزارت چھوڑنے کے بعد سٹیڈیم میں گیا تو ان بنگالی نوجوانوں نے میرے لئے تالیاں بجائیں، اور میری باتوں کو سنا۔ ہم بنگال کے لئے جان کی بازی لگا دیں گے۔

میں نے تار دیا وہ کہتے ہیں کوئی غور نہیں ہو رہا۔ میں اچھوت نہیں ہوں میں آپ کا نمائندہ ہوں، آپ نے مجھے منتخب کیا۔ مجھے آپ نے نوازا۔ یہ میرا ذاتی تار نہیں تھا یہ مغربی پاکستان کے دل کی دھڑکن تھی۔ میری نیت، سچی نیت یہ ہے کہ ہم مل کر ملک کو متحد رکھیں۔ مجیب الرحمٰن صاحب! اب بھی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ غلط مشوروں پر نہ چلو ان سیاستدانوں کے مشورہ پر جنہیں میں نے شکست دی ہے ان سرمایہ داروں کے مشورہ پر جنہیں میں ختم کر دوں گا، اور پھر سوشلزم لاؤں گا۔ مجیب تم نے غلطی کی میں تیار تھا، اب بھی تیار ہوں۔ اسمبلی کے اندر بھی اسمبلی سے پہلے بھی تاکہ اقتدار منتقل ہو اور مارشل لاء ختم ہو۔ آپ نے تار کو نہیں، مجھے نہیں مغربی پاکستان کو نظرانداز کیا ہے۔ مجیب صاحب! آپ مجھ پر ناراض ہیں۔ لیکن آپ نے مجھ سے نہیں مغربی پاکستان سے ناراضگی کی ہے۔ میں کل بھی جانے کو تیار ہوں آؤ محب وطن افراد کی طرح بیٹھ جائیں۔ مل جائیں اور غریبوں کی خوشحالی کے لئے باتیں کریں۔ میں اُن لوگوں کو کیسے بھول سکتا ہوں جنہوں نے مجھے ووٹ دیئے ہیں، پھٹے ہوئے کپڑوں والے لوگوں کو!

میں ایک دن بدین کے الیکشن میں جا رہا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ آگے نہ جاؤ آگے پیر پگاڑو کے حُر کھڑے ہیں۔ لیکن میں آگے گیا راستے میں حُر کھڑے تھے، پیر پگاڑو کے جھنڈے درختوں پر لگے ہوئے تھے۔ میرے راستے کے دوسری طرف ایک دس سال کی بچی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے راستہ عبور کیا۔ درخت سے پیر پگاڑو کا جھنڈا اتار کر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لگا دیا اور نعرہ لگایا "جئے بھٹو" میں اُس بچی کو نہیں بھول سکتا۔ ہم نے اُس بچی کے لئے، اُس کے بوڑھے باپ کے لئے، بھوکے ننگے لوگوں کے لئے، پھٹے ہوئے کپڑے والوں کے لئے حکومت بنانی ہے۔ انہیں خوشحال کرنا ہے۔

ہم نے شہید ذوالفقار علی بھٹو کی نشتر پارک کراچی کے جلسے میں روزنامہ مشرق اور روزنامہ مساوات اخبار میں رپورٹ کی گئی تقریر کا مکمل متن شائع کر دیا ہے۔ ان اخبارات کی تحریر کے مطابق بھٹو کی تقریر میں اِدھر تم اُدھر ہم والی کوئی بات نہیں مل سکی۔

مشرقی پاکستان صرف ایک بنگالی قوم پر مشتمل تھا

مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے سیاسی اعتبار سے بالکل مختلف خطہ تھا۔ مغربی پاکستان چار نمایاں قومیتوں کا خطہ ہے۔ ان میں دو قومیتوں کی سیاست صوبہ سندھ اور صوبہ پنجاب کی

www.bhutto.org

سیاست سے بہت مختلف رہی ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک سرحد اور بلوچستان کی سیاسی قیادت قوم پرستوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اب تو صوبہ سندھ کی سیاست بھی تقریباً تقریباً قوم پرستی کی ہی سیاست بن چکی ہے۔ اس سیاسی تیاریوں میں مغربی پاکستان سیاسی طور پر کبھی بھی ایک سیاسی اکائی نہیں بن سکا اور نہ ہی سیاسی اعتبار سے مغربی پاکستان کو ایک قوم کا صوبہ کہا جا سکتا تھا۔ مغربی پاکستان ہمیشہ چار صوبوں کا قومیتی صوبہ ہی کہلاتا رہا ہے۔ جبکہ اس تفریق کو مصنوعی طریقے سے ختم کرنے کے لئے ون یونٹ (One Unit) کا بھی ہتھیار استعمال کر کے دیکھا جا چکا تھا۔ مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان کا تشخص ہمیشہ ایک بنگالی قوم کی شکل میں رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کو ہمیشہ بنگالیوں کا ہی صوبہ کہا گیا ہے۔ ایسا صوبہ ایسا خطہ جس میں نہ تو پٹھانوں کی طرح کی کوئی قوم پرستی کی سیاسی تحریک تھی اور نہ ہی بلوچوں کی طرح کی کوئی علیحدگی کی سیاسی تنظیم یا سیاسی جماعت تھی۔ اور نہ ہی مغربی پاکستان کی طرح زبانوں کا کوئی مسئلہ تھا۔ یعنی اردو، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پشتو زبان کا مسئلہ۔ مشرقی پاکستان کے عوام صرف اور صرف ایک زبان بولتے تھے جو بنگالی زبان تھی لہٰذا وہاں کے تمام عوام بنگالی تھے۔ لہٰذا مشرقی پاکستان مغربی پاکستان کے مقابلے میں ایک قوم کا صوبہ تھا اور پوری قوم کی ایک سوچ تھی۔

مشرقی پاکستان کی اپنی تہذیب تھی اپنی ثقافت تھی اپنی سیاست تھی۔ مشرقی پاکستان کی مغربی پاکستان سے جداگانہ طرزِ زندگی اور طرزِ سیاست کی وجہ مشرقی پاکستان میں جاگیرداری نظام کا نہ ہونا تھا۔ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں جاگیرداری نظام کا تسلط اور تصرف ہے۔ مغربی پاکستان کے جاگیردار فوجی حکمرانوں کو اپنی جاگیروں کا محافظ خیال کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مغربی پاکستان میں فوجی راج کے خلاف مجموعی طور پر کبھی بغاوت دیکھنے میں نہیں آئی۔ مگر مشرقی پاکستان چونکہ جاگیرداری کی لعنت سے پاک صوبہ تھا۔ وہاں پر فوجی حکمرانوں کو کوئی سیاسی طبقہ یا حلیف اس طرح کا میسر نہیں تھا جس طرح کا اس کو مغربی پاکستان میں جاگیرداروں کا مضبوط طبقہ میسر ہے۔ جو کہ قیامِ پاکستان سے ہی فوج کا شریکِ اقتدار چلا آ رہا ہے۔

اس صورت میں مشرقی پاکستان کا مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے اقتدار میں شراکتِ اقتدار کا کوئی سلسلہ موجود نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان میں چند ایک سیاسی گھرانے جن کا تعلق قائداعظم کی مسلم لیگ سے تھا وہ ابتدا میں فوجی حکمرانوں کے اقتدار میں شریک تھے۔ جو اپنے

www.bhutto.org

اقتدار کے بہت ہی کم عرصے میں بنگالی قوم کی نفرت کا شکار بن گئے تھے۔

بنگال میں فوج کے ساتھ اقتدار میں شرکت کرنے والے سیاست دانوں کی کچھ عزت نہیں تھی۔اور نہ ہی عوامی سطح پر ان کی کوئی قدرو قیمت تھی۔اس طرح کے مسلم لیگی سیاست دانوں کو بنگال میں مغربی پاکستان یا فوج کے ایجنٹ کہا جاتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد ان تمام مسلم لیگی سیاست دانوں کی اکثریت مغربی پاکستان میں ہی رہائش پذیر ہوگئی تھی۔وہ بنگالیوں کے غیظ وغضب کے ڈر سے واپس مشرقی پاکستان نہیں گئی تھی۔ بنگالی قوم بنیادی طور پر ایک خالصتاً سیاسی قوم تھی۔ایک پڑھی لکھی قوم تھی۔ایک جمہوری قوم تھی۔ جو اپنے بنیادی سیاسی حقوق کا احساس رکھتی تھی۔ان کو تاریخ میں ہمیشہ ایک سیاسی تشخص حاصل رہا ہے۔ بنگالی قوم کو کبھی بھی ڈھگا یا اقتدار پرست قوم نہیں کہا گیا۔جس طرح کہ پنجابیوں کو پنجابی ڈھگے یا اقتدار کے غلام کہا جاتا رہا ہے۔ بنگالی قوم ہمیشہ انقلابی قوم رہی ہے۔اس کی سوچ میں من حیث القوم کبھی اختلاف یا انتشار نہیں رہا۔جس طرح مغربی پاکستان میں چاروں صوبوں میں رہنے والی قومیتوں میں سیاسی انتشار برپا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ فوج اور بیوروکریسی کا تعلق بھی مغربی پاکستان سے ہی تھا مشرقی پاکستان میں تمام کلیدی عہدوں پر ان افسران کو مقرر کیا جاتا تھا جن کا تعلق مغربی پاکستان میں ہوتا تھا۔لہٰذا اس طرح کے تفاوت اور تضادات کی وجہ سے بنگالی قوم کا فوجی حکمرانوں کے اقتدار میں کوئی فطری تعلق ہی قائم نہیں تھا ان کی حیثیت ہر اعتبار سے محکوموں کی تھی اور مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی حیثیت حاکموں کی تھی۔اوپر سے ان پر فوج کشی کر کے ان کو مظلوم بھی بنا دیا گیا۔اب ان تمام وجوہات کے بعد بھی اگر کوئی کہتا ہے کہ بنگالی پاکستان کا حصہ رہتے ،اس کو پاگل پن کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا آغاز

مشرقی پاکستان کو ایک طرح کا علیحدہ کرنے کا آغاز خود مغربی پاکستان کے فوجی حکمران فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان کے عہد میں ہوا تھا فوجی حکمرانوں کو مشرقی پاکستان میں حکومت کرنے میں بہت ساری دشواریوں کا سامنا رہتا تھا۔جنرل ایوب خان بنگالیوں کو کبھی بھی اچھے الفاظ سے یاد نہیں کرتا تھا۔وہ صاف کہا کرتا تھا کہ یہ ہماری ٹانگوں کو لپٹے ہوئے ہیں۔وہ ان کے بارے میں ایسے الفاظ کہا کرتا تھا۔جن کو تحریر کرنا تہذیب وشرافت کے خلاف ہے۔مغربی پاکستان کے فوجی

www.bhutto.org

حکمرانوں کا قبلہ وکعبہ امریکہ تھا۔ امریکہ مغربی پاکستان میں سویت روس کے خلاف اپنی کولڈ وار میں فوجی حکمرانوں کا جس طرح کا مکمل تعاون چاہتا تھا۔ وہ مشرقی پاکستان کے ہوتے اس کو ملنا بہت مشکل تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی جہاں ایک تاریخی عمل کا نتیجہ تھی وہاں یہ ایک بین الاقوامی سازش کا نتیجہ بھی تھی۔ جس کو ہنری کسنجر نے اپنی کتاب جس کا نام ''دی وائٹ ہاؤس ایئرز'' (The White House Years) تھا۔ اس میں اس نے اس بات کا صاف اعتراف کیا تھا کہ 1970ء میں پاکستان کے دو ٹکڑے کرنا امریکی پالیسی سازوں کا منصوبہ تھا۔ جس کو نکسن کا نظریہ کہا جاتا تھا۔ جس کے مطابق مشرقی پاکستان کو ایک علیحدہ اقتصادی وحدت قرار دیا گیا تھا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ پوائنٹ امریکہ کے جنوبی ایشیا کے ممالک کے فیصلہ سازوں اور فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان کے فوجی دانشوروں کی مشترکہ تخلیق تھے۔ جن کے مطابق مشرقی پاکستان میں اقتدار کا کوئی ایسا طریقہ وضع کرنا مقصود تھا جس سے مشرقی پاکستان فوجی حکمرانوں کی کالونی بھی رہے اور نیم قسم کی سیاسی آزادی بھی اس کو دے دی جائے۔ میری ان باتوں کو تو بہت دور از کار کی باتیں کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں پر میں ایک ایسی دستاویز کا انکشاف کروں گا جس کی روشنی میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے کی تمام حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔

حفیظ کاردار کا خفیہ دستاویز کا انکشاف

محترم حفیظ کاردار پاکستان کا ایک مایہ ناز سپوت تھا۔ وہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کا میرے خیال کے مطابق پہلا کپتان تھا۔ وہ ایک بے حد اصول پرست اور دیانت دار آدمی تھا۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی دوستی کا شرف حاصل رہا ہے۔ اس کی شخصیت میں جھوٹ فریب وغیرہ کی طرح کی کسی چیز کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بطور کرکٹر شہرت کے ایسے بلند مقام پر فائض رہ چکا تھا۔ اس کو کسی حیلے بہانے سے مزید شہرت حاصل کرنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

کاردار صاحب نے فال آف ڈھاکہ یعنی پاکستان ٹوٹنے کے بعد اپنی کتاب جس کا نام ''پیپلز کمٹ منٹ'' تھا جو انگریزی میں تحریر کی گئی تھی اس میں شیخ مجیب الرحمٰن اور جنرل یحیٰی خان کے ایک خفیہ سمجھوتے کا انکشاف کیا تھا جو باقاعدہ ایک دستاویز یا ایک مسودے کی شکل میں تھا یہ مسودہ ایک باضابطہ آئینی اعلان تھا جس میں دستوری طور پر پاکستان کو دو پاکستان بنانے کا اعلان تھا۔

دو پاکستان کے اعلان کا فارمولا

پاکستان کو دستوری طور پر دو پاکستان کے اس مسودے پر یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کو دستخط کرنے تھے تیسرے دستخط کی جگہ چیئر مین بھٹو کے لئے رکھی گئی تھی۔ اس معاہدے اور مسودے کے تحت جنرل یحییٰ خان کو تقریباً دونوں پاکستانوں کا تاحیات صدر بنانا مقصود تھا۔ مشرقی پاکستان کا وزیر اعظم شیخ مجیب الرحمٰن کو بنانا تھا اور مغربی پاکستان کا وزیر اعظم جنرل یحییٰ خان کا پسندیدہ سیاست دان خان عبدالقیوم خان کو بنانا تھا۔ جو کہ انتخابات کے نتائج کے بعد ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لئے کہ مغربی پاکستان میں چیئر مین بھٹو کو اکثریت حاصل ہو گئی تھی۔

لہٰذا اب اس سازشی مسودے پر چیئر مین بھٹو کے دستخط کرانے کی کوشش کی جانی تھی جو کہ یحییٰ خان اور اس کے فوجی ٹولے کی ایک آئینی مجبوری تھی۔ چیئر مین بھٹو نے اس خوفناک قسم کے مسودے اور سمجھوتے کو مسترد کر دیا تھا۔ چیئر مین بھٹو ایک انتہا درجے کے محب وطن انسان تھے۔ وہ کشتۂ وطن پرستی تھے۔ انہوں نے ملک و قوم کو وسیع تر مفادات کے پیش نظر قوم کو اس بات سے آگاہ کرنا خلاف مصلحت تصور کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس مسودے اور سمجھوتے کے انکشاف کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن کی مغربی پاکستان میں پوزیشن اور زیادہ خراب ہو جائے گی۔ مغربی پاکستان میں اس کو پہلے ہی غدار اور علیحدگی پسند کہا جا رہا تھا۔ اس انکشاف پر تو ان باتوں پر صداقت کی مہر لگانے والی بات تھی۔ یہی وہ ایک مصلحت تھی جس کے پیش نظر چیئر مین بھٹو نے بقول حفیظ کاردار اور جس کے حالات بھی شاہد ہیں شیخ مجیب الرحمٰن سے براہِ راست بات کرنا عقلمندی خیال کیا اور ملک و قوم کے مفاد میں زیادہ مناسب سمجھا۔ حفیظ کاردار کے بقول اس خفیہ معاہدے کے خلاف افواجِ پاکستان میں بھی چند فوجی افسران تھے جن کا اس معاملے میں چیئر مین بھٹو کے ساتھ رابطہ ہو چکا تھا۔ یہ فوجی افسران چیئر مین بھٹو کو اس سمجھوتے کو ناکام بنانے کی سفارش کرتے تھے۔

چیئر مین بھٹو تقریباً سات مرتبہ شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس گئے۔ ان سے اپنے اسمبلی کے سیشن کے بائیکاٹ کرنے کی وضاحت بیان کرتے ہوئے اس کو اس سمجھوتے کو مسترد کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ شیخ مجیب نے بھٹو صاحب کی وضاحت پر ایک قسم کی رعایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک آئینی دستور آپ مغربی پاکستان کے مطابق تیار کر لیں۔ ایک ہم مشرقی پاکستان کے مطابق

تیار کر لیتے ہیں اس طرح ہم ہاؤس میں دونوں پر اتفاق رائے کرلیں گے۔ چیئرمین بھٹو نے مجیب الرحمٰن کو کہا کہ شیخ صاحب اس طرح تو خود بخود ہی دو پاکستان بن جائیں گے۔

یہی وجہ تھی کہ کراچی کے نشتر پارک کے جلسے میں چیئرمین بھٹو نے بغیر اس خفیہ معاہدے کا ذکر کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن کو کہا تھا کہ آپ کے نکات کا نقشہ فیڈریشن کا ہرگز نہیں ہے یہ کنفیڈریشن کا نقشہ ہے۔ یہ نکات دو مملکتوں کی دو یونین تجویز کرتے ہیں۔ تم کہتے ہو صوبوں کو زرمبادلہ حاصل کرنے کی اجازت ہو۔ غیر ملکی تجارت اور سفارت کاری کی اجازت ہو تو اس شکل میں پاکستان کہاں ہوگا۔

حفیظ کاردار کی اس خفیہ معاہدے کی دستاویز کا انکشاف معروف صحافی احمد بشیر نے بھی اپنے کالموں میں کیا تھا۔ خود فوج کا ایک معروف لکھاری کرنل صدیق سالک اپنی کتاب ''وٹنس ٹو سرنڈر'' میں تحریر کرتا ہے کہ جنرل یحییٰ خان خود کو مطلق العنان حکمران سمجھتا تھا۔ وہ اپنی مرضی کی مراعات حاصل کئے بغیر مجیب کے ساتھ کوئی سمجھوتا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری عقل کے مطابق یہ مراعات وہی تھیں جن کا انکشاف حفیظ کاردار نے کیا تھا۔

حفیظ کاردار تحریر کرتے ہیں کہ چیئرمین بھٹو نے عوام کو خبردار کئے بغیر رازداری کے ساتھ یہ کام کرنا چاہا۔ جس میں ان کو باوجود کامیابی نہ حاصل ہوسکی۔

چیئرمین بھٹو، مجیب الرحمٰن اور جنرل یحییٰ خان کی مشترکہ ملاقات

22 مارچ 1971ء کو پریذیڈنٹ ہاؤس ڈھاکا میں جنرل یحییٰ خان کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن اور چیئرمین بھٹو کی مشترکہ ملاقات ہوئی، جس ملاقات کے متعلق چیئرمین بھٹو اپنی کتاب ''دی گریٹ ٹریجڈی'' یعنی عظیم المیے میں تحریر کرتے ہیں کہ کچھ دیر تک جنرل یحییٰ خان شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ تنہا مذاکرات کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے بھی بلا لیا گیا۔

جنرل یحییٰ خان نے بھٹو صاحب سے مخاطب ہوکر کہا کہ ہم نے جن نکات پر بات کی ہے ان نکات پر اب آپ کی رضامندی حاصل کرنا باقی رہ گیا ہے۔ آپ اور شیخ مجیب آپس میں بات چیت کریں تاکہ آگے پیش رفت ہوسکے۔ چیئرمین بھٹو تحریر کرتے ہیں کہ میں شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ جنرل یحییٰ خان کے دفتر کے ساتھ ملحقہ کمرے میں آگیا۔ پہلے تو شیخ مجیب الرحمٰن نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے قریب بیٹھنے کو کہا اس کے بعد شاید اس کو یہ گمان ہوا کہ کمرے میں خفیہ آلہ نہ لگا ہو۔ کمرہ بگڈ

www.bhutto.org

نہ ہو۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر ورانڈے میں آ گئے اور کھلی جگہ پر ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ صدر پاکستان کے دفتر کے سامنے واقع تھی وہاں پر مجھے شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا کہ صورتِ حال بے حد خطرناک اور تشویشناک ہے اور مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے۔ تا کہ اس صورت حال پر قابو پایا جا سکے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مجھے کہا کہ میں اس بات کو اچھی طرح سمجھ بوجھ چکا ہوں کہ پیپلز پارٹی ہی ایک ایسی مؤثر سیاسی جماعت ہے جس کے ساتھ مغربی پاکستان میں سیاسی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ باقی تمام سیاست دان اپنے مفادات کے پیش نظر میرا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اب یہ معاملہ آپ اور میرے درمیان یوں حل ہو سکتا ہے کہ آپ مغربی پاکستان کے وزیر اعظم بن جائیں میں مشرقی پاکستان کا وزیر اعظم بن جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ مجیب الرحمٰن نے مجھے آگاہ کیا۔ یحییٰ خان اور فوج پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔ اگر یہ پہلے مجھے تباہ کریں گے تو بعد میں تمہیں بھی قتل کر ڈالیں گے۔ چیئرمین بھٹو نے کہا کہ میں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو یقین دلاتے ہوئے کہا۔ شیخ صاحب میں تاریخ کے ہاتھوں مرنے کے بجائے ملٹری کے ہاتھوں مرنے کو ترجیح دوں گا۔ میں نے کہا کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی ملک کے دو وزیر اعظم کس طرح ہو سکتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں مزید غور وخوض کرنا ہوگا۔ جنرل یحییٰ خان جو اپنے دفتر کے پردے میں ہم دونوں کو باتیں کرتے دیکھ رہا تھا اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلانے کے لئے اے۔ ڈی۔ سی کو بھیجا۔

شیخ مجیب الرحمٰن وہاں سے روانہ ہو گیا اور میں جنرل یحییٰ خان کے پاس گیا۔ اس کا پہلا فقرہ تھا جو بڑی حیرانگی کا فقرہ تھا۔ اس نے مجھے کہا آپ دونوں میں کیا ہنی مون منایا جا رہا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ صدر صاحب یہ ہنی مون نہیں تھا دو لیڈروں کی باہمی گفتگو تھی۔ سیاسی تبادلۂ خیالات تھا۔ چیئرمین بھٹو کہتے ہیں کہ اس وقت جنرل کی باتوں سے مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کے دماغ میں کچھ اور ہی منصوبہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں طاقت کے استعمال پر شیخ مجیب الرحمٰن اور بنگالیوں کا دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔ بھٹو صاحب تحریر کرتے ہیں کہ اس مرتبہ میں بے حد مایوس ہو کر مشرقی پاکستان سے واپس مغربی پاکستان آیا تھا۔

جہانگیر بدر کی چیئرمین بھٹو کو یونیورسٹی میں خطاب کرنے کی دعوت

شیخ مجیب الرحمٰن نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طالب علموں سے خطاب کیا تھا۔ اس خطاب میں

www.bhutto.org

شیخ صاحب نے اعلان کیا تھا کہ میں پاکستان کا غلام وزیراعظم بننے کی بجائے بنگلہ بدھو بننا زیادہ پسند کرتا ہوں، اپنی قوم کا ہیرو بننا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ شیخ مجیب الرحمٰن طالب علموں سے خطاب کی شکل میں نئی نسل میں اپنی مقبولیت ظاہر کر رہا تھا۔ اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جس طرح چیئرمین بھٹو میں اور شیخ مجیب الرحمٰن میں اپنی اپنی قیادت کے سلسلے میں ایک طرح کا مقابلہ چل رہا ہو۔

چیئرمین بھٹو نے بھی مغربی پاکستان اکثریتی منتخب قومی نمائندے اور قائد کی حیثیت سے یونیورسٹی نیو کیمپس لاہور میں طالب علموں سے خطاب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس سلسلے میں چیئرمین بھٹو کو نیو کیمپس یونیورسٹی میں خطاب کرنے میں کوئی دِقت محسوس نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ یونیورسٹی نیو کیمپس میں انہیں دنوں جہانگیر بدر طالب علم یونین کا سالانہ انتخاب جیت کر سٹوڈنٹ یونین کا صدر بن چکا تھا۔

میں جہانگیر بدر کو تقریباً 1968ء سے دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے جس قدر سیاست میں اس شخص کو کامیابیاں حاصل کرتے دیکھا ہے اس قدر میں نے اپنی زندگی میں کسی دوسرے طالب علم لیڈر یا سیاسی کارکن کو کامیابیاں حاصل کرتے نہیں دیکھا۔ میں جہانگیر بدر کو 1968ء سے لے کر آج 2006ء تک ایک ہی طرح کے سیاسی موڈ میں دیکھا ہے۔ میں چونکہ اس زمانے میں خود بھی ایک نوجوان سیاسی کارکن تھا۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنے پورے عہد کی نوجوان نسل میں میں کچھ نمایاں بھی ہوتا تھا۔ میں نے جہانگیر بدر کی طرح کا ہوشیار طالب علم لیڈر کوئی دوسرا نہیں دیکھا تھا۔ یہ شخص طالب علم لیڈری میں بھی اقتدار کی سیاست کرتا تھا۔ یہ دوسرے طالب علم لیڈروں کی طرح غیر سنجیدہ قسم کی لیڈری ہرگز نہیں کرتا تھا۔ پنجابی کا محاورہ ہے۔

''سولا جمدیاں دے منہ تیکھے ہندے نیں''

یعنی کانٹوں کے منہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی تیز ہوتے ہیں۔ یہ بات جہانگیر بدر پر ہر طرح سے صادق آتی ہے۔

جہانگیر بدر کی خوش قسمتی ملاحظہ ہو کہ چیئرمین بھٹو کے ساتھ جہانگیر بدر کا تعارف ہی ایک منتخب طالب علم لیڈر کی حیثیت سے ہوا تھا۔ چیئرمین بھٹو طالب علم لیڈروں کو بے حد پسند کیا کرتے تھے مگر ان کے نزدیک جتنے بھی طالب علم لیڈر پہنچے تھے یا جن سے بھٹو صاحب کو ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان میں کچھ تو ناکام قسم کے طالب علم لیڈر تھے۔ کچھ راشد بٹ کی طرح غیر سنجیدہ قسم کے

طالب علم لیڈر تھے یا کچھ مال بٹورنے والے طالب علم لیڈر ہوتے تھے۔ جہانگیر بدر پہلا ایسا طالب علم لیڈر تھا۔ جو چیئرمین بھٹو کے مزاج کے مطابق تھا۔ جس کا تعلیمی اداروں میں باقاعدہ ایک کردار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جہانگیر بدر چیئرمین بھٹو کو ہمیشہ یاد رہتا تھا۔ جہانگیر بدر چونکہ میرا دوست ہے، چھوٹا بھائی ہے اس کا ذکر آیا تو بات لمبی ہوگئی۔

جہانگیر بدر نے چیئرمین بھٹو کو یونیورسٹی میں بڑی بہادری کے ساتھ خطاب کی دعوت دی۔ اس وقت یونیورسٹی پر جمعیت کا بڑا ہولڈ رہوتا تھا۔ جمعیت کے لٹھ برداروں کا یونیورسٹی کے اختیار واقتدار میں بڑا عمل دخل ہوتا تھا۔ ان دنوں یحییٰ خان کے ساتھ جماعت اسلامی کے سیاسی ہنی مون کی وجہ سے جماعت یونیورسٹی پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود جہانگیر بدر نے طالب علموں کا شاندار اجتماع کیا تھا۔ جس سے چیئرمین بھٹو نے تقریباً 2 گھنٹے خطاب کیا تھا۔ چیئرمین بھٹو کا یہ خطاب شیخ مجیب الرحمٰن کے ڈھاکہ یونیورسٹی سے خطاب کا جواب تھا۔ چیئرمین بھٹو کی تقریر کا آغاز تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی نوجوان نسل کو قائداعظم کا بنایا ہوا مکمل پاکستان دینا چاہتا ہوں۔ میں کسی بھی پہلو سے یا کسی بھی حوالے سے یا کسی بھی نکتے سے مغرب اور مشرق کی بات کر کے خود کو ہیرو نہیں بنانا چاہتا۔ میں پاکستان کو مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ ڈھاکہ جانے کو تیار ہوں۔ میں شیخ مجیب الرحمٰن کو کہتا ہوں۔ یہاں پر بھٹو صاحب نے فیض کی غزل کا مصرع کوٹ کیا۔ میں مجیب الرحمٰن کو کہتا ہوں" چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔" میں مشرقی پاکستان کے عوام کی بے حد عزت کرتا ہوں۔ "آئی۔ ہیو گریٹ ریسپکٹ فار دی پیپلز آف ایسٹ پاکستان" بالکل اسی طرح جس طرح میرے دل میں صوبہ سرحد کے لوگوں کی عزت ہے، صوبہ بلوچستان کے لوگوں کی عزت ہے، صوبہ سندھ کے لوگوں کی عزت ہے، صوبہ پنجاب کے لوگوں کی عزت ہے، آزاد کشمیر کے لوگوں کی عزت ہے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان کے عوام کی میرے دل میں عزت اور عظمت ہے۔ ان کا انٹرسٹ ان کا مفاد ہمارا مفاد ہے۔ ان کا نقصان ہمارا نقصان ہے۔

یہاں پر واضح رہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مجیب الرحمٰن کے خطاب کے دوران طالب علموں نے پاکستان کا جھنڈا جلا دیا تھا اور بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا تھا۔ چیئرمین بھٹو نے پاکستان کا جھنڈا جلانے کا ذکر کئے بغیر کہا کہ یہ بات کس قدر دکھ اور تکلیف کی حامل ہے کہ اس طرف نوجوانوں کو تعصب کی سیاست کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ وہاں پر صرف مشرقی پاکستان کی بات کی

www.bhutto.org

جارہی ہے۔ پورے پاکستان کی بات نہیں کی جارہی ہے۔

پاکستان کے حکمران قصوروار ہیں مگر پاکستان کے عوام بے قصور ہیں۔ ہمارے تمام نکات میں پاکستان سے استحصال ختم کرنے کی بات ہونی چاہئے۔ لوگوں کے روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور روزگار کی بات ہونی چاہئے۔ آج میں آپ تمام نوجوانوں کی طرف سے مشرقی پاکستان کی نوجوان نسل کو آپ کی طرف سے پیغام دینا چاہتا ہوں۔ آؤ ہم مل کر پاکستان کو جدید پاکستان بنائیں۔ اِدھر اور اُدھر کی نفرت کو ختم کردیں اور ایک قوم بن جائیں۔

چیئرمین بھٹو یہ تمام باتیں شیخ مجیب الرحمٰن کو واضح کرنے کے لئے کررہے تھے تاکہ اس کو علم ہوجائے کہ مغربی پاکستان میں اس کی حقیقی اتحادی پاکستان پیپلز پارٹی ہی ہوسکتی ہے۔ چیئرمین بھٹو اپنا یہ پیغام مجیب الرحمٰن کو ہر انداز میں پہنچانے کی کوشش کررہے تھے۔

ولی خان اور دولتانہ کا چیئرمین بھٹو کے خلاف بیان

چیئرمین بھٹو کی یونیورسٹی کی اس تقریر کے بعد خان عبدالولی خان اور میاں ممتاز دولتانہ نے اخبارات میں چیئرمین بھٹو کے خلاف بیان دیا جس میں دونوں لیڈروں کا ایک ہی موقف تھا۔ پہلے ولی خان کا بیان شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ بھٹو مغربی پاکستان کا قائد نہیں ہے۔ بھٹو مغربی پاکستان کا اکثریتی نمائندہ نہیں ہوسکتا۔ بھٹو صرف سندھ اور پنجاب کے دو صوبوں کا لیڈر ہے۔ سرحد میں اور بلوچستان میں ہماری اکثریت ہے۔ ہم اور بھٹو برابر کی حیثیت رکھتے ہیں لہٰذا بھٹو کا یہ دعویٰ ہی غلط ہے کہ وہ مغربی پاکستان کا متفقہ قائد ہے۔ خان عبدالولی خان کے بیان کے دوسرے دن یہی بات میاں ممتاز دولتانہ نے اپنے بیان میں دہرائی تھی۔ دولتانہ کا بیان تھا کہ بھٹو پورے مغربی پاکستان کا قائد نہیں ہے۔ ان دو حضرات نے یہ غلط بات کیوں کہی اور کس لئے کہی یہ بات اپنی جگہ ایک بہت بڑے سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتی ہے۔ جبکہ چیئرمین بھٹو مغربی پاکستان میں اسی طرح اکثریتی سیاسی نمائندگی رکھتے تھے جس طرح شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان میں اکثریت رکھتے تھے۔ مگر ان تمام باتوں کے علاوہ جہاں تک شیخ مجیب الرحمٰن کی بات تھی وہ اپنے چھ نکات پر ڈٹا ہوا تھا۔ وہ ان سے ہٹ کر کوئی بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ابتدا میں شیخ کے رویے میں کچھ نرمی دیکھائی دیتی تھی، مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رویہ بے حد سنگلاخ ہوتا چلا گیا۔ وہ مغربی پاکستان

www.bhutto.org

کے سیاست دانوں کی آپس کی ناچاقی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف فوجی حکمرانوں کا بھی یہی طرزِ عمل تھا وہ بھی ان سیاست دانوں کی آپس کی جنگ سے مجیب الرحمٰن کو مجبور کرنا چاہتے تھے کہ اس کو اگر سیاست میں کچھ حاصل ہوگا تو فوجی حکمرانوں سے حاصل ہوگا، اور اس کے لئے شیخ کو ان کی تمام شرائط کو تسلیم کرنا ہوگا۔ ان کا پپٹ بننا ہوگا ان کا ایجنٹ اور کارندہ بننا ہوگا۔ اس کے علاوہ فوجی حکمرانوں کے پاس ایک سیاست دان کے لئے اور کوئی مقام اور مرتبہ نہیں تھا۔

میری صاف گوئی کا واقعہ ملاحظہ کریں

ان دنوں جب چیئرمین بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن اور فوجی حکمرانوں کی سیاست اور حکومت کی جنگ عروج پر تھی۔ ان دنوں پاکستان پیپلز پارٹی کی جانب سے فوجی حضرات کا رابطہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کے ساتھ ہی ہوا کرتا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی اور فوج کے درمیان رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ لاہور میں سیکرٹری ریڈ کراس میجر محمد افضل خان ہوا کرتے تھے۔ میجر محمد افضل خان جنرل پیرزادے کے بیچ فیلو تھے اور بہت گہرے دوست تھے۔ جنرل پیرزادے کا سیاست دانوں کے ساتھ میل ملاپ کا تمام سلسلہ میجر محمد افضل خان کے ذریعے ہی ہوا کرتا تھا۔ میجر محمد افضل خان میرے رشتہ کے ماموں لگتے تھے۔ وہ میری والدہ صاحبہ کی سگی بڑی خالہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ہر چند میں ان کا بہت ادب کیا کرتا تھا مگر سیاست کے مسئلے پر میں کبھی کبھار ان سے کھل کر بات کر لیا کرتا تھا۔ میجر صاحب اکثر چیئرمین بھٹو کو اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کو ملنے کے لئے ہوٹل آیا کرتے تھے۔ فوجی حکمرانوں کی طرف سے کھر صاحب کے ذریعے بھٹو صاحب کے ساتھ پیغام رسانی کا کام کیا کرتے تھے۔ لاہور کے فلیٹیز ہوٹل کے لان میں میجر صاحب کے ساتھ ملک معراج خالد اور افتخار تاری اور حمید سرور ایڈووکیٹ اور شیخ جاوید الرحمٰن کھڑے تھے۔ میجر صاحب چونکہ میرے بزرگ تھے میں پاس ادب سے ان کے قریب گیا اور ان کو سلام کیا۔ ان دنوں ایک ہی بات ہر انسان کی زبان پر ہوا کرتی تھی کہ بنگالی پاکستان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ اس طرح کی باتیں حکومت کے بنگالیوں کے خلاف پراپیگنڈے کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں گھر کر رہی تھیں۔ افتخار تاری اور حمید سرور دونوں ایک ہی بات کہے چلے جا رہے تھے کہ بنگالی قوم غدار قوم ہے۔ مجیب الرحمٰن ہندوستان کا ایجنٹ ہے۔ بنگالی پاکستان توڑنا چاہتے ہیں۔ میں جو ان کے

قریب کھڑا تھا میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ غلط کہہ رہے ہیں اس ملک کو فوج دو ٹکڑے کرنا چاہتی ہے۔ یحییٰ خان اور اس کے ساتھی جنرل ایک بنگالی سیاست دان کو پاکستان کا اقتدار نہیں دینا چاہتے۔ مشرقی پاکستان کوئی مغربی پاکستان نہیں ہے جہاں فوجی حکمرانوں کے ٹاؤٹ سیاست دان ہیں وہاں پر خالص عوامی لیڈر قوم کی قیادت کر رہے ہیں۔

میں نے نہایت ایمان داری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ملک معراج خالد کو کہا کہ ملک صاحب آپ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو سمجھائیں کہ وہ فوج کی سازش کا شکار بن کر بنگالیوں کی مخالفت نہ کریں۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کا کھل کر ساتھ دیں۔ میجر افضل صاحب چیئرمین بھٹو کو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے تمام منتخب ممبران اسمبلی کو اپنے فارم جو ضلع گوجرانوالہ تحصیل کامونکی کے قریب گاؤں ماڑی ٹھاکراں میں واقع تھا جو میرا بھی گاؤں تھا وہاں پر کھانے کی دعوت دینے آئے ہوئے تھے۔ وہ جب اپنی دعوت کے سلسلے میں ملک معراج خالد کے ساتھ بھٹو صاحب کو ان کے کمرے میں ملنے گئے ان کے ساتھ افتخار تاری اور حمید سرور بھی بھٹو صاحب کے پاس گئے۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو کہا کہ باہر اسلم گورداسپوری فوج کے خلاف بڑی غیر ذمہ دارانہ باتیں کر رہا ہے۔ وہ میجر صاحب کے سامنے کہہ رہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں لوگ فوجیوں کی سڑکوں پر لاشیں لٹکا دیں گے۔ اس طرح کی باتیں فوج کو ناراض کرنے کی باتیں ہیں جس سے پیپلز پارٹی کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جب میجر صاحب وہاں سے چلے گئے تو بھٹو صاحب کمرے سے باہر آئے، میں کمرے کے سامنے کارکنوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ میں بھاگا بھاگا ان کے قریب گیا۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ انہوں نے مجھے ڈانٹ کر کہا کہ تم فوج کے خلاف بکواس کرتے ہو۔ تم کو حالات کی نزاکت کا کچھ علم نہیں ہے تم فوج کے لوگوں کے سامنے فوج کو گالیاں دیتے ہو۔ چیئرمین بھٹو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کر واپس کمرے میں چلے گئے۔ کارکن جو وہاں موجود تھے ان سب نے چیئرمین کو میرے ساتھ غصے ہوتے دیکھا تھا وہ مجھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ شاعرِ عوام معاملہ کیا ہے۔ میں نے ان کو کہا کہ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ ناراض ہو رہے تھے۔

دوسرے دن چیئرمین بھٹو کو پارٹی کے اراکین کے ساتھ میرے گاؤں جانا تھا۔ میرا بچپن اس گاؤں میں گذرا تھا۔ اسی گاؤں ماڑی ٹھاکراں میں مجھے جنرل صدر ایوب خان کی حکومت نے 9 ماہ

کے لئے گاؤں کی ریونیو حدود میں پابند کر دیا تھا، ایک طرح کا قید کر دیا تھا۔ مجھے اس گاؤں میں ایوب خان کی حکومت نے اس وقت قید کیا تھا جب یہ اراکین اسمبلی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ میں پاکستان پیپلز پارٹی کا واحد کارکن تھا جس کو پیپلز پارٹی کے قیام کے فوراً بعد یکم مارچ 1968ء کو فیلڈ مارشل ایوب خان کی حکومت نے لاہور سے شہر بدر کر کے مجھے میرے گاؤں میں جبراً نظر بند کر دیا تھا اس وقت ملک معراج خالد صدر ایوب خان کے ساتھ تھے۔ یا ان میں سے اکثریت اس وقت پارٹی کی رکن بھی نہیں تھی۔ اس گاؤں میں پیپلز پارٹی کا صرف ایک ہی گھر تھا وہ میرا گھر تھا۔ جس پر پارٹی کا جھنڈا لگا ہوا ہوتا تھا۔ خود میجر افضل خان کے چھوٹے بھائی اور میرے چھوٹے ماموں محمد اختر خان جو میرے بے حد پسندیدہ انسان اور دوست تھے وہ کنونشن لیگ کے چیئرمین تھے۔ ان کے علاوہ گاؤں میں کچھ غریب تھے جو پیپلز پارٹی کو پسند کرتے تھے۔ گاؤں میں میری ماں اور میرے بڑے بھائی صاحبزادہ محمد اکرم خان پیپلز پارٹی کا جھنڈا بلند کئے ہوئے تھے۔ میری بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ اتفاق سے جب چیئرمین بھٹو کو میرے گاؤں جانا تھا چیئرمین بھٹو میرے ساتھ ناراض ہو گئے۔ میرے لئے یہ بڑی شرمناک بات تھی کہ چیئرمین بھٹو میرے گاؤں جائیں اور میں ان کے ساتھ نہ جاؤں۔ میری ماں کا خیال تھا کہ بھٹو میرے بیٹے سے بڑھ کر کسی دوسرے کو پسند ہی نہیں کرتا۔ لہٰذا اپنی والدہ کی خوشی کی خاطر میں نے حفیظ پیرزادہ کو درمیان میں ڈالا کہ وہ چیئرمین سے میری سفارش کریں ان کو بتائیں کہ وہ میرے گاؤں میں تشریف لے کر جا رہے ہیں۔

مگر میرے چونکہ ستارے ہی گردش میں تھے۔ انہوں نے میرا نام ہی لیا تھا کہ چیئرمین بھٹو نے بے حد غصے میں اپنے سر کو جھٹک کر کہا۔ مت نام لو اس کا، حفیظ پیرزادہ صاحب پلٹ کر مجھ پر بگڑنے لگ گیا کہ تم نے خوامخواہ مجھے اپنی سفارش کرنے کو کہا ہے جبکہ وہ تمہارا نام سننا نہیں چاہتے۔ پہلے تو میرا خیال تھا کہ میں بھی اس ہجوم میں شامل ہو کر گاؤں چلا جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے اس قسم کا دھوکا اپنے ساتھ نہیں کرنا چاہیے۔

لاہور پیپلز پارٹی کا دفتر

کسے ترے وقت سی نیو لایا
اسی بیبے جیسا اُٹھیا دانیاں نوں

www.bhutto.org

آپ حیران ہوں گے کہ میں نے پیر وارث شاہ کا ایک تلخ ترین شعر کیوں رقم کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جب ہماری دوستی کا آغاز ہوا تھا وہ کچھ اچھا وقت نہیں تھا پنجابی میں بُرے وقت کو ترڑا وقت کہتے ہیں۔ ہماری دوستی کی بنیادیں ایسی ہی تھیں جس طرح بُھنے ہوئے دانے ہوتے ہیں۔ جن کو کاشت نہیں کیا جا سکتا۔ بویا نہیں جا سکتا اور نہ ہی ان سے کوئی فصل اُگ سکتی ہے۔ یعنی ہماری پارٹی کے اندر دوستیاں بے معنی اور بے مقصد قسم کی تھیں۔ ٹیمپل روڈ لاہور پر ایک بلڈنگ تھی جس کو اولمپک ہاؤس کہا جاتا تھا۔ اس بلند و بالا بلڈنگ کے اوپر والے لمبے چوڑے حصے میں لاہور پیپلز پارٹی کا دفتر کھولا گیا۔ اس وقت حالانکہ سقوطِ ڈھاکہ نہیں ہوا تھا۔ مگر خدا جانے وہ کونسی ایسی غیبی طاقت تھی جس نے اندر ہی اندر لوگوں کے ذہنوں میں ڈال دیا تھا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کو پاکستان کی حکومت ملنے والی ہے اقتدار ملنے والا ہے پاکستان کا تمام اقتدار پرست موقعہ پرست طبقہ ملک غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن کے گرد اکٹھا ہو چکا تھا۔ ملک غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کے مسلح لشکر پر مبنی سیاسی کارکنوں کے دماغ آسمان پر پہنچے ہوئے تھے وہ پارٹی کی سیاست میں ہر بات کو ہر چیز کو طاقت کے حوالے سے دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ وہ اپنی نیم قسم کی غنڈہ گردی کو سیاسی کارکنی خیال کرتے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ طور پر خود کو حکمران تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ملک غلام مصطفیٰ کھر کو اور ڈاکٹر مبشر حسن کو باقاعدہ حکمرانوں کی طرح کا پروٹوکول دیا کرتے تھے۔ پنجاب اور لاہور میں ان کی سیاست ان کی پیپلز پارٹی یا ان کا منشور صرف اور صرف ان دو انسانوں کی شخصیت اور ذات تھی۔ ان کے علاوہ نہ تو ان کی کوئی پارٹی تھی اور نہ ہی ان کی کوئی سیاست تھی۔ اس طرح پارٹی کے اقتدار سے بہت پہلے ہی ان لوگوں نے پارٹی کے ان دونوں حضرات کو حکمرانی کے ذہنی نشے کے کلچر میں مبتلا کر دیا تھا۔ ان غیر نظریاتی لوگوں کے انبوہ نے ان دو حضرات کو باقاعدہ بیوروکریٹ بنا دیا تھا۔ افسر بنا دیا تھا۔ ان دو حضرات کے بات کرنے کا انداز تبدیل ہو گیا تھا۔ خاص طور پر ملک غلام مصطفیٰ کھر جو ذہنی طور پر جاگیردار کلچر کی پیداوار تھے انہوں نے تو خود کو بے تاج بادشاہ تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ خود کو گورنر امیر ملک آف کالا باغ کی طرح کا ڈراؤنی قسم کا انسان خیال کرنے لگ گئے تھے۔ ہر چند ملک غلام مصطفیٰ کی شکل و صورت ایک خوبصورت محبت بھرے انسان کی تھی۔ حکمرانی کے جنون سے انہوں نے اپنی شخصیت پر خوامخواہ کا ایک دبدبہ تاری کر لیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کچھ مصنوعی انداز کی ہو گئی تھی۔ اوپر سے اَن پڑھ قسم کے خوشامدی سیاسی لوگوں کے فرشی

سلاموں نے ان کو ظلِ الٰہی اور عالم پناہ بنا دیا تھا۔ فوجی جرنیلوں کے ساتھ دوستی نے بھی ان کی گردن میں فوجیوں جیسا تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ اتنی اقسام کا بھاری بوجھ ان کی سمارٹ شخصیت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ان کا اپنی ذات کے بارے میں سیاسی انا الحق کہہ اٹھنا ممکن ہی نہیں امر ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اقتدار کے بہت ہی مختصر عرصہ کے بعد وہ چیئرمین بھٹو کے سامنے شہزادہ سلیم یعنی باغی بن کر کھڑے ہو گئے تھے اور اقتدار حاصل کرنے کے بہت ہی کم عرصے میں چیئرمین بھٹو اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کی دوستی کا واٹرلو ہو گیا تھا۔

لہٰذا لاہور پارٹی کو کھر صاحب کے جیالوں کا دفتر بنایا گیا تھا اسی طرح ڈاکٹر مبشر حسن صاحب جو پہلے ہی خود کو پاکستان پیپلز پارٹی کی عقلِ کُل تصور کرتے تھے۔ وہ اپنی ذات کو ہی پیپلز پارٹی تصور کرتے تھے۔ اپنی ذات کو ہی پارٹی کا منشور تصور کرتے تھے۔ اپنی ذات کو ہی پارٹی کی قیادت تصور کرتے تھے۔ ان کی پاکستان پیپلز پارٹی صرف ان کی ذات تھی۔ اس طریقے کے ساتھ ملک غلام مصطفیٰ کھر اور ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کا شخصی تصور ملتا جلتا تھا۔ دونوں حضرات انتہائی درجہ کے سلف سنٹرڈ لوگ تھے۔ اپنی شخصیت کی بڑائی کی انتہاؤں میں گرفتار تھے اس طرح ان دونوں میں ایک غیر سیاسی، غیر نظریاتی بیوروکریٹک رویئے کا اشتراک تھا اور قدر مشترک تھی۔ اس پر ستم یہ تھا کہ وہی افتخار تاری کا پستول مارکہ لشکر ملک غلام مصطفیٰ کھر کا درباری تھا اور وہی لشکر ڈاکٹر مبشر حسن کی جیالا فورس تھی۔

اولمپک ہاؤس کا دفتر ڈاکٹر صاحب کا اور ملک غلام مصطفیٰ کھر کا ایک قسم کا حکومتی سیکرٹریٹ تھا، اور پاکستان پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے مقدر کے اور عوام کی قسمت کے تمام فیصلے اسی دفتر میں ہوا کرتے تھے۔ پیپلز پارٹی لاہور کا دفتر قائم ہو جانے سے تمام لوگوں کا رخ اولمپک ہاؤس کی طرف ہو گیا۔

میں نے 4/A مزنگ کے دوستوں کو مشورہ دیا کہ ہمارا دفتر پنجاب پارٹی کا دفتر ہے نیا دفتر لاہور پارٹی کا دفتر ہے۔ ہم لوگوں کو اس دفتر کے کھلنے سے کسی قسم کی تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ ہم تمام کارکنوں کو اس دفتر میں آنا جانا چاہئے۔ ہر چند کچھ انتہا پسند سوچ کے کارکن میری بات سے اتفاق نہیں رکھتے تھے مگر میں نے اولمپک ہاؤس کے دفتر کو پارٹی کا دفتر تسلیم کرتے ہوئے وہاں آنا جانا شروع کر دیا۔ مگر اس دفتر میں کلچر ہی کچھ اور تھا۔ اس کا ماحول ہی مختلف تھا۔ وہاں پر ڈاکٹر صاحب کو ملنے کے لئے باقاعدہ ڈاکٹر صاحب کے عملے سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ڈاکٹر صاحب کھلے

بندوں ایک عوامی لیڈر کی طرح ورکروں کے ساتھ ملتے ہوں۔ان کا کمرہ بند ہو جاتا تھا۔جس کسی کی قسمت یاوری کرتی تھی اس کو اندر بلا لیا جاتا تھا۔یا جو لوگ وہاں پر بیٹھنے والے حمید سرور وغیرہ کے پسندیدہ ہوتے تھے ان کی ملاقاتیں آسانی سے ہو جاتی تھیں۔میری طبیعت میں شروع سے ایک خرابی چلی آ رہی ہے کہ میں کسی بھی بیوروکریٹک ماحول میں زیادہ دیر تک بیٹھ نہیں سکتا۔میں ایسی جگہ بہت کم بیٹھتا ہوں جہاں پروٹوکول کے ماحول کا تناؤ ہو۔شاید میں شاعر ہونے کی وجہ سے حساس طبع انسان ہوں۔جو اس طرح کی گھٹن کے ماحول کو پسند نہیں کر سکتا، برداشت نہیں کر سکتا۔

''میں وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی مجلس سے بھی بہت جلد اُٹھ کر باہر چلا جایا کرتا تھا۔ان کی موجودگی میں ان کے درباریوں نے بھی ماحول کو بے حد تند بنایا ہوتا تھا۔ایک طرح کا سناٹا برپا کر دیتے تھے۔خیر یہ باتیں تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔''

اولمپک ہاؤس کا ماحول باقاعدہ ایک سرکاری محکمے کی طرح کا بنا ہوتا تھا۔وہاں پر ہر وقت دفتر کے باہر لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی رہتی تھیں۔شہر کے تمام تاجر پیشہ لوگ وہاں جمع رہتے تھے۔تمام معطل شدہ پولیس افسر اور تمام معطل شدہ ایکسین، ایس ڈی او، مجسٹریٹ، سرکاری ملازم وہاں پائے جاتے تھے۔افتخار تاری جو اس دفتر کا ڈاکٹر صاحب کے بعد سب سے بڑا لیڈر ہوتا تھا اس کا کام ان تمام سرکاری افسروں کی سفارشیں کرنا ہوتا تھا۔

افتخار تاری کے ورکران افسران سے منہ مانگے دام وصول کیا کرتے تھے۔ان افسران میں برے بھلے ہونے کا کچھ سوال نہیں تھا۔جو افسران ورکروں کے ساتھ اس دفتر آ جاتا تھا۔اس کا کام بن جاتا تھا۔یہ اسٹاک ایکسچینج کی طرح کا دفتر تھا، ہر سفارش کا بھاؤ طے تھا۔اس دفتر کا تمام کام سرکاری ملازموں کے تبادلے کرانا یا ان کو بحال کرانا ہوتا تھا۔اس دفتر میں ایک قسم کی متوازی حکومت چل رہی ہوتی تھی۔اس دفتر میں بیٹھنے والے سیاسی کارکنوں کو اس بات کا کچھ پتہ نہیں ہوتا تھا کہ ڈھاکے میں کیا ہو رہا ہے۔مشرقی پاکستان کا کیا بن رہا ہے۔یہ کارکن بڑے چلتے پرزے قسم کے کارکن ہوتے تھے ان کا کام ہر صورت پیسے کمانا ہوتا تھا۔ان کی سیاست کا تصور ہی پیسے کمانے کا تھا۔سیاست ان کا نزدیک ذریعہ آمدنی تھی۔اولمپک ہاؤس میں نہ تو کبھی کوئی نظریاتی ڈبیٹ دیکھنے کو ملتی تھی۔نہ کبھی کوئی نظریاتی بحث ہوتی تھی۔اور نہ ملک وقوم کی سیاست پر کبھی کوئی اجلاس ہوا کرتا تھا۔وہاں صرف اور صرف لوگوں کی سفارشیں کی جاتی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ لاہور کا تمام مال دار بااثر طبقہ

www.bhutto.org

لاہور کے اس دفتر میں جمع ہو گیا تھا۔ جن کی وجہ سے اس دفتر کے کارکنوں میں بہت جلد مالی خوش حالی کی جھلک دیکھائی دینے لگ گئی تھی۔ میں چند دن تک تو اس دفتر میں جاتا رہا مگر بہت جلد اکتا کر میں نے وہاں جانا چھوڑ دیا۔ جب میں آخری مرتبہ اولسپک ہاؤس گیا تو ایک واقع سے مجھے بے حد نفرت پیدا ہو گئی۔ اولسپک ہاؤس میں شیر محمد بھٹی صاحب ڈاکٹر مبشر حسن کے نائب کی حیثیت سے بیٹھا کرتے تھے وہ ایک منجھے ہوئے نظریاتی سیاسی انسان تھے۔ اور ہم لوگوں سے سیاست میں سینئر سیاسی کارکن تھے ان کی اپنی سیاسی تربیت کے مطابق خواہش ہوتی تھی کہ وہ دفتر کو ایک سیاسی جماعت کے رنگ میں قائم کریں۔ مگر وہاں پر تو ان کی خواہش کے برعکس ایک ہنگامے کی پیداوار قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے جو خود کو سیاسی کارکن کہتے تھے۔ بھٹی صاحب ان لوگوں کو سیاسی کارکنوں کے قاعدے قانون سکھانا چاہتے تھے۔ ان کے غنڈہ گردی کے ماحول کو سیاسی ماحول میں تبدیل کرنا چاہتے تھے ان کی یہ بات افتخار تاری کے جتھوں کو بری لگتی تھی۔ ایک دن جب میں بھٹی صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ بھٹی صاحب کی تاری کے ایک خاص قسم کے کارکن کے ساتھ کچھ گرمی سردی ہو گئی۔ یہ گرمی سردی کسی طرح بھی غیر مناسب نہیں تھی۔ بھٹی صاحب ایک بزرگ رہنما انسان تھے انہوں نے اگر کسی کارکن کو سختی سے کچھ کہہ بھی دیا تھا تو اس کو اس طریقے سے محسوس نہیں کیا جانا چاہئے تھا مگر اس کارکن کی شکایت پر افتخار تاری نے بھٹی صاحب کے ساتھ انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ بھٹی صاحب کو بازاری لہجے میں کہنے لگا۔ اوئے ٹینڈے دے سر والے، اوئے کدو دے سر والے۔ تمہیں علم نہیں کہ یہ میرا جیالا ہے۔ بھٹی صاحب تو خاموش رہے مگر میں نے افتخار تاری کو کہا کہ میاں تاری تمہیں اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ بھٹی صاحب ایک سینئر انسان ہیں۔ میاں تاری میرے ساتھ بھی سیدھا ہو گیا۔ مجھے پنجابی میں کہنے لگ گیا توں وچ کیوں بولنا اے وڈا شاعر بنیا پھردا اے۔ یہ تم درمیان میں کیوں بول رہے ہو تم اپنے آپ کو بہت بڑا شاعر سمجھ رہے ہو۔ میاں افتخار تاری کا مجھے اتنا کہنا تھا میں اس دفتر سے واک آؤٹ کرنے کے انداز میں باہر آ گیا۔

آپ اندازہ کرلیں کہ یہ وہ سٹف تھا یہ وہ سیاسی کارکن تھے۔ جن کا طرزِ عمل اوپر بیان کیا گیا ہے جن کو چند ہی دنوں بعد ملک غلام مصطفیٰ کھر نے اور ڈاکٹر مبشر حسن نے اپنے ساتھ لیکر پاکستان کے ایوانِ اقتدار میں داخل ہونا تھا۔ جن کی جیبوں میں ہر وقت پستول اور خنجر ہوتے تھے۔ جن کا کام ہر وقت مال بنانا ہوتا تھا۔ جو اپنی غنڈہ گردی کو ہی سیاست تصور کرتے تھے۔ جن کے نزدیک نہ

www.bhutto.org

تو کسی نظریے کی کوئی وقعت تھی نہ کسی کے علم و تدبر کا کوئی مقام تھا، اور نہ کسی شرافت کی کوئی قدر و قیمت تھی۔ (نوٹ) افسوس کہ چیئرمین بھٹو کتنے عظیم سیاست دان تھے۔ مگر ان کے ساتھ شریک اقتدار ہونے والے لوگوں کا ذہنی پس منظران سے کس قدر مختلف تھا۔

لاہور پیپلز پارٹی کے دفتر کے برعکس ہمارے دفتر پیپلز پارٹی پنجاب کے دفتر میں لوگوں کا ہجوم رہتا تھا جن کا تعلق چھوٹے غریب طبقے سے ہوتا تھا۔ جن میں کسان مزدور اور عام لوگ ہوتے تھے۔ جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ جو غربت اور بے روزگاری کے ستائے ہوئے لوگ ہوتے تھے۔ یا جو پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں کے ستائے ہوئے لوگ ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام مزدور یونین کے عہدہ داروں کا ہمارے دفتر کے ساتھ رابطہ رہتا تھا۔ ایسے مزدور عہدہ دار جو اصلی مزدوروں کی تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ تمام ترقی پسند دانشور پنجاب دفتر میں کارکنوں کی تعلیم کیا کرتے تھے۔ اس طرح ہمارے پنجاب کے 4/A مزنگ دفتر میں اور لاہور کے دفتر میں ایک طبقاتی فاصلہ اور فرق قائم ہو گیا تھا۔ لاہور پیپلز پارٹی کے دفتر میں تمام خوشحال لوگوں کا ہجوم ہوتا تھا، تمام کاروباری لوگ کھاتے پیتے لوگ اس دفتر میں آتے جاتے تھے۔ تمام وارداتیئے اس دفتر میں جمع رہتے تھے، تمام جاہ پسند، موقع پرست، حکمرانوں کے کاسہ لیس، خوشامدی اور چلتے پرزے قسم کے لوگوں کا لاہور دفتر مرکز بن گیا تھا۔ اس کے علاوہ لاہور کے کچھ معروف کن ٹٹے جن کو غنڈے بدمعاش کہا جاتا تھا۔ ان کو سیاست کے لئے اہم خیال کیا جاتا تھا۔

4/A مزنگ کا دفتر پرولتاریوں کا دفتر مشہور ہو گیا تھا اور لاہور کا دفتر حکمرانوں کا دفتر بن گیا تھا، خواص کا دفتر بن گیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا اصل کلچر ہمارے دفتر مزنگ میں ہوتا تھا۔ ہم نے باقاعدہ مساوات میں اعلان کر کے عوام کو دعوت دی تھی کہ عوام کو جو بھی تکالیف ہوں، جس بھی مشکل کا سامنا ہو وہ پیپلز پارٹی پنجاب کے دفتر تشریف لائیں۔ اس صورت میں ہمارا دفتر اصل پیپلز پارٹی کا دفتر بن گیا تھا۔ جبکہ ہمارے دفتر کے مقابلے میں لاہور کا دفتر غیر عوامی قسم کے ماحول کا دفتر تھا۔ اس طرح لاہور پارٹی کا دفتر اپنے آغاز میں ہی حکمرانوں کا دفتر بن گیا تھا اور رجعت پسندوں کا غیر عوامی لوگوں کا دفتر مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہمارا دفتر عوامی لوگوں کا انقلابی اور نظریاتی اور پڑھے لکھے لوگوں کا دفتر مشہور تھا۔ باعزت سیاسی کارکنوں کا دفتر تصور کیا جاتا

www.bhutto.org

تھا۔ پیپلز پارٹی کے اصل وارثوں کا دفتر سمجھا جاتا تھا۔

چیئرمین بھٹو پر اسٹیبلشمنٹ کی ایجنسیوں کا الزام

فوجی حکمرانوں کی شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ اقتدار کی ٹسل ایک سال تک چلتی رہی۔ فوجی حکمران مختلف بہانوں کے ساتھ مذاکرات کو ٹالتے رہے۔ ایک سال تک فوجی جرنلوں کے کسی بھی اقدام سے اس بات کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ وہ سیاست دانوں کو اقتدار منتقل کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں۔ چونکہ ملک میں تمام نشرواشاعت کے ادارے ان کے پاس تھے جو بات ان کے مفادات کو تقویت دیتی تھی اس کو شائع کیا جاتا تھا۔ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ کی جانے والی اپنی ہر بات کو صیغہ راز میں رکھتے تھے۔ مگر چیئرمین بھٹو کی ہر بات کو شہ سرخیوں میں شائع کرتے تھے۔ چیئرمین بھٹو کا مطالبہ تھا کہ اسمبلی کا اجلاس صرف دو ماہ کے لئے ملتوی کیا جائے۔ دو ماہ کے بعد اجلاس بلایا جائے تا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ آئین پاکستان کے بارے میں کچھ بنیادی باتیں طے پالیں تا کہ اسمبلی میں جا کر کوئی ہنگامہ آرائی یا ڈیڈ لاک نہ ہو سکے۔ چیئرمین بھٹو کے اسمبلی کے وقتی طور پر بائیکاٹ کرنے کا اعلان فوجی حکومت کو اپنے اقتدار میں طول دینے میں مددگار نظر آتا تھا۔ جس کی وجہ سے یحییٰ خان نے اجلاس کی تاریخ کو تبدیل کر دیا تا کہ فوجی حکومت شیخ مجیب الرحمٰن سے اپنی باتیں منوانے میں کامیاب ہو جائے۔ مگر اس کی خفیہ ایجنسیاں ملک میں مشہور کر رہی تھیں کہ بھٹو مجیب الرحمٰن سے اقتدار میں حصہ مانگ رہا ہے۔ فرض کریں چیئرمین بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن سے اقتدار میں اپنا حصہ مانگتے تھے تو ان کے حصہ مانگنے میں ہرج ہی کیا تھا۔ کیا برائی تھی اس میں پوری دنیا میں سیاست اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہی کی جاتی ہے۔ مگر چیئرمین بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کا معاملہ تو ویسے ہی ایک طرح کا برابر برابر کا معاملہ تھا۔ شیخ کے پاس اکثریت ہوتے ہوئے بھی مغربی پاکستان میں اس کو اپنے اقتدار کی تکمیل کے لئے کسی ایک فریق کی ضرورت تھی۔ پیپلز پارٹی نے چونکہ مغربی پاکستان میں انتخابات میں اکثریت حاصل کی تھی۔ اس شکل میں چیئرمین بھٹو شیخ مجیب الرحمٰن کے قدرتی اتحادی تھے۔ چیئرمین بھٹو اگر مجیب الرحمٰن سے اقتدار میں حصہ طلب کرتے تھے تو ان کی یہ سیاست کسی طرح بھی سازشی قرار نہیں دی جا سکتی۔ کیا کسی سیاست دان کی حکمتِ عملی اور منصوبہ بندی کو سازش کہا جا سکتا ہے۔ سازش ہمیشہ غیر آئینی فریق کیا کرتا ہے۔ ایسا فریق جس کا آئین کی

www.bhutto.org

رو سے اقتدار میں کچھ حصہ نہیں ہوتا۔ وہ پاکستان میں صرف اور صرف فوجی جرنل ہیں۔ ان کا اقتدار ہمیشہ غیر آئینی ہوتا ہے۔ سیاست دانوں کا اقتدار آئینی اقتدار ہوتا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن اپنی سیاست کے پیش نظر بھٹو صاحب کو اپنا اتحادی نہ بناتا اور وہ مغربی پاکستان میں دوسرے سیاست دانوں کے ساتھ الحاق کر کے اپنی حکومت بنانا اپنے لئے زیادہ مناسب خیال کرتا۔ مگر ایسا تب ہوتا اگر فوجی حکمران اس کو اقتدار منتقل کر دیتے۔ اس کو تو اقتدار دیا ہی نہیں گیا۔ جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے عوام بددل ہو کر بغاوت کرنے پر مجبور ہو گئے۔

خدا کا شکر ہے پاکستان بچ گیا

یہ الفاظ چیئرمین بھٹو نے اس وقت کراچی ایئرپورٹ پر کہے تھے جب وہ آخری مرتبہ ڈھاکہ سے واپس آئے تھے جب ہندوستان نے پاکستان کے خلاف جنگ کا باقاعدہ اعلان کر دیا تھا۔ چیئرمین بھٹو نے یہ بیان افواج پاکستان کو وقت کی سنگینی کا احساس دلانے کے لئے دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستان کی فوج ہندوستان کی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔ مگر ان کی دعا اور ان کی توقع کے برعکس مشرقی پاکستان میں فوج کے کمانڈروں نے بغیر جنگ کئے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ کیا اس کے علاوہ بھی ان کے اس چند لفظوں کے کوئی اور معنی نکل سکتے ہیں۔ کیا اس دعا سے پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کا مفہوم نکل سکتا ہے۔ چیئرمین بھٹو ایک زیرک انسان تھے وہ آنے والے وقت کی سنگینی کو محسوس کر رہے تھے۔ ان کے یہ مبہم قسم کے الفاظ اپنے اندر معنی کا سمندر لئے ہوئے تھے۔ یہ الفاظ انہوں نے فوجی حکمرانوں کو خبردار کرنے کے لئے کہے تھے۔ ہر انسان خدا کا نام صرف اس وقت لیا کرتا ہے جب حالات خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ اسی قسم کی ہی صورت حالات میں ادا کئے گئے تھے۔ وہ فوجی حکمرانوں کے خوف سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان الفاظ کو ادا کر کے انہوں نے حکمرانوں کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ الفاظ نہیں تھے خطرے کی گھنٹی تھے۔

چیئرمین بھٹو کا جنگ سے پہلے راولپنڈی میں جلسہء عام

چیئرمین بھٹو نے راولپنڈی لیاقت باغ میں ٹھیک اسی دن شام تین بجے جلسہ عام سے

www.bhutto.org

خطاب کیا تھا جس شام جلسے کے بعد رات 2 بجے کے قریب ہندوستان کی ہوائی فوج نے پاکستان پر ہوائی حملہ کرنے کا آغاز کر دیا تھا۔

''دما دم مست قلندر کا نعرہ''

اس جلسہ عام سے کچھ عرصہ پہلے چیئرمین بھٹو نے پاکستان کے فوجی حکمرانوں کو ریگل چوک لاہور میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان ایک بین الاقوامی سازش کا شکار ہو چکا ہے جس کا حکومت ادراک نہیں کر رہی اور حکومت مشرقی پاکستان کے انتخابات کو تسلیم نہیں کر رہی۔ عوامی لیگ کے لوگوں کو نااہل قرار دے کر اپنے سرکاری ٹاؤٹوں کو یعنی جماعت اسلامی کے لوگوں کو ٹافیاں کی طرح سیٹیں بانٹ رہی ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہندوستان کی طرف نقل مکانی کر چکے ہیں۔ حکومت کو ہندوستان کی سازش پر آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ہندوستان کو جنگ سے باز رکھنے کے لئے اس کو ڈرانے کے لئے یہ الفاظ کہے تھے۔ اگر ہندوستان نے حملہ کیا تو پوری پاکستانی قوم ہندوستان کی فوج کا مقابلہ کرے گی۔ پھر دما دم مست قلندر ہو گا۔

راولپنڈی جلسہ میں طارق عزیز کا سفلہ پن

چیئرمین بھٹو کے ان الفاظ پر میں نے ہندوستان کے خلاف قوم میں جان پیدا کرنے کے لئے ہندوستان کو جنگ سے باز رکھنے کے لئے ایک پنجابی میں نظم لکھی تھی۔ جس نظم کو میں بھٹو صاحب کو سنا چکا تھا۔ اس جلسے میں چونکہ صورت حال بڑی ٹینس تھی۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ کوئی دوسرا مقرر تقریر نہ کرے صرف چیئرمین بھٹو ہی وقت کی نزاکت کے مطابق تقریر کریں گے۔ البتہ میری نظم کو جلسہ عام میں سنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جلسہ شروع ہونے سے پہلے جلسے میں طارق عزیز میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اگر آپ مہربانی کریں تو اپنی نظم جلسے میں مجھے پڑھنے کا موقعہ دے دیں۔ آج میں سوچتا ہوں کہ کچھ لوگ کس قدر ہلکے اور سفلے ہوتے ہیں۔ حالات خواہ کسی طرح کے بھی ہوں ان کو اپنی ہی چہرہ نمائی کا فتور رہتا ہے۔ جلسہ گاہ کے حالات بے حد سنجیدہ تھے۔ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی جنگ کا احساس ہر انسان کے ذہن میں گھر کئے ہوئے تھا۔ لوگ خوف سے سہمے ہوئے تھے۔ دنیا بھر کا پریس وہاں موجود تھا۔ وہ چیئرمین بھٹو کا خطاب سننے کے لئے بے چین تھے۔ خود چیئرمین بھٹو بھی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کو اپنے خطاب میں عقل کے

www.bhutto.org

ناخن لینے کا پیغام دینے والے تھے۔ معاملہ بہت تلخ تھا۔ مگر طارق عزیز اسٹیج پر آنے کے لئے بے حد بے تاب تھا۔ اس نے جس انداز میں مجھے میری نظم پڑھنے کی استدعا کی میں اس کو رَد نہ کر سکا۔ میں نے اپنی نظم طارق عزیز کو دے ڈالی۔ تلاوت کے بعد خورشید حسن میر کو نظم پڑھنے کا اعلان کرنا تھا۔ طارق عزیز خورشید حسن میر کے پاس چلا گیا اور اس کو کہا کہ اسلم گورداسپوری کی نظم میں جلسے میں پڑھوں گا۔ میر صاحب نے تلاوت کے بعد اعلان کر دیا کہ اسلم گورداسپوری کی نظم آپ کو طارق عزیز پڑھ کر سنائیں گے۔ طارق عزیز نے نظم سنانا شروع کر دی۔ وہ نظم کو اپنے ڈرامائی انداز میں لوگوں کو سنا رہا تھا۔ جس میں روانی وغیرہ کا نام باقی نہ رہا۔ کئی مصرعے بحر سے خارج پڑھے چلا جا رہا تھا۔ جس کا لوگوں پر قطعی کوئی تاثر قائم نہیں ہو رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے خورشید حسن میر کو کہا وہ اسلم خود کہاں ہے میں پیچھے بیٹھا تھا میں نے کہا سر میں یہاں بیٹھا ہوں۔ انہوں نے حکم دیا اٹھو اور خود نظم پڑھ کر سناؤ۔ اس طرح خورشید حسن میر نے طارق عزیز کو ہٹا کر میرا نام پکارا۔ میں نے اپنے خاص انداز میں نظم پڑھ کر جلسے میں جوش و خروش پیدا کر دیا اور میرے بعد چیئرمین بھٹو خود ہی اٹھ کر مائیک پر آ گئے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ہی ہندوستان کی جارحیت سے کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان پاکستان پر حملہ کرنے والا ہے۔ جس جوش و جذبے سے میں نے ان کو اس شام تقریر کرتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے اس طرح جذباتی میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی تقریر سے معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی بہت بڑا سانحہ ہونے والا ہے۔ کوئی بہت بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے۔ انہوں نے جنرل یحییٰ خان کی فوجی حکومت کو مخاطب کر کے کہا۔ تم اپنے عوام کے ساتھ الجھے ہوئے ہو۔ مشرقی پاکستان کو خطرناک سیاسی صورت حالات سے دوچار کر دیا گیا ہے۔ ہندوستان اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ میں آخری بار کہتا ہوں کہ اقتدار عوام کے نمائندوں کو دے کر پاکستان کو بچایا جائے۔ جلسے کے بعد چیئرمین بھٹو کے ساتھ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں ہم لوگ تمام رات جاگتے رہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی نہ سو سکا تھا۔ تمام رات ہم لابی میں کافی تعداد میں بیٹھے جنگ کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ رات ایک بجے کے بعد خطرے کے سارن بجنا شروع ہو گئے۔ سارن بجتے ہی چیئرمین بھٹو کے پہلے الفاظ تھے۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ لابی میں اس وقت تقریباً پورے مغربی پاکستان سے آئے ہوئے پارٹی کے عہدہ دار اور ممبران اسمبلی موجود تھے۔ چیئرمین بھٹو نے ہر علاقے کے پارٹی

www.bhutto.org

عہدہ داراور اراکین اسمبلی کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔ انہوں نے تمام پارٹی عہدہ داروں اور اراکین اسمبلی کو کہا کہ صبح پہلی فرصت میں اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں اور اپنے اپنے علاقے میں جا کر عوام کا حوصلہ بڑھائیں۔

مجھے چیئر مین بھٹو کی شفقت آج بھی یاد ہے مجھے یاد ہے کہ اس وقت میرے ساتھ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہء اردو کے انچارج ڈاکٹر سہیل احمد خان مرحوم بھی تھے۔ان دنوں وہ پروفیسر سہیل احمد خان تھے۔خاص طور پر جلسے میں شرکت کے لئے لاہور سے گئے تھےان کی موجودگی میں مجھے کہا اسلم تمہارے پاس کرایہ وغیرہ ہے۔ان کے اتنا کہنے سے ڈاکٹر غلام حسین، سید ناصر رضوی وغیرہ نے بہت سارے نوٹ اپنی جیبوں سے نکال کر میرے کوٹ کی جیب میں ڈال دیئے۔ میں ان کے چہرے کو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس قدر اداس اور پریشان ان کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔وہ ہر پارٹی عہدہ دار کو اس کا نام لے کر کہہ رہے تھے اپنے اپنے حلقے میں چلے جاؤ۔ اس طرح ان کے حکم کے مطابق وہاں سے تمام لوگ اپنے علاقوں میں واپس چلے گئے تھے۔

سقوطِ ڈھاکہ

یہ نمازِ عصر کا وقت تھا یہ گھڑی تھی دن کے زوال کی
یہ قیامتیں جو گذر گئیں تھیں علامتیں کئی سال کی

سقوطِ ڈھاکہ کوئی ایک دن میں واقع نہیں ہوا تھا۔سقوطِ ڈھاکہ مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں کے پچیس سالہ دورِ اقتدار کے اندھے جبر سے واقع ہوا تھا۔ایسا ہرگز نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان کے تمام سیاست دان پاکستان کے دو ٹکڑے کرنا چاہتے تھے یا بنگلہ دیش بنانا چاہتے تھے۔ معاملہ اصل یوں تھا کہ وہ فوجی حکمرانوں سے بے حد خوف زدہ ہو گئے تھے۔مشرقی پاکستان میں جب عوامی سطح پر ایک طرح کی بغاوت کی صورت پیدا ہو چکی تھی۔مغربی پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے ہر بنگالی کو غدار کہنا شروع کر دیا تھا اور ہندوستان کا ایجنٹ کہنا شروع کر دیا تھا۔مشرقی پاکستان کے منتخب اکثریتی قائد شیخ مجیب الرحمٰن کو دھان منڈی ڈھاکہ سے گرفتار کر کے مغربی پاکستان کی جیل میں پہنچا دیا گیا تھا۔عوامی لیگ کے بے شمار کارکنوں کو گرفتار کر کے مشرقی پاکستان کی جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا۔جب مشرقی پاکستان میں سیاسی صورتِ حال فوج نے اس قسم کی بنا دی تھی تب افہام وتفہیم

www.bhutto.org

کی بات کس طریقے کے ساتھ ہو سکتی تھی اور افہام و تفہیم کی بات کس کے ساتھ کی جا سکتی تھی۔ عقلمندی کا تقاضا یہ تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو کسی قیمت پر گرفتار نہ کیا جاتا۔ اگر شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا تھا تو اس کو ڈھاکہ جیل میں ہی رکھا جاتا۔ تاکہ شیخ مجیب الرحمٰن سے لوگوں کو امن پیدا کرنے کی درخواست کرائی جاتی۔ ان کا لیڈران کے قریب جیل میں ہوتا تو لوگوں کے ذہن میں بغاوت کی انتہا نہ پیدا ہوتی۔ مشرقی پاکستان کی عوامی لیگ کے اراکینِ اسمبلی اور عہدہ داروں اور ورکروں کا اپنی قیادت کے ساتھ کسی نہ کسی طریقے اور حوالے سے رابطہ رہتا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو غائب کر دینے سے لوگوں کے دلوں میں خوف و ہراس کا اندھیرا چھا گیا۔

وہ اپنی سیاست کے لئے نہیں بلکہ اپنی زندگیاں بچانے کے لئے جس طرف ان کو راستہ ملا انہوں نے اس طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ ان کو اس بات کا شک ہو چکا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو فوج نے گولی مار دی ہے۔ ہندوستان چونکہ ایک عرصے سے مشرقی پاکستان کی سیاست میں ملوث تھا۔ جس کی وجہ سے لوگ ہندوستان کی طرف بھاگنا شروع ہو گئے اور کچھ ہی دنوں میں مغربی بنگال کے کولکتہ شہر کے گرد و نواح میں لاکھوں بنگالیوں کا ہجوم جمع ہو گیا جو نقل مکانی کر کے ہندوستان کی طرف چل نکلے تھے۔ بنگالیوں کا ہندوستان کی سرزمین پر جانا ہندوستان کی سیاست اور سازش کی کامیابی کے لئے ایک بہت بڑا ہتھیار بن گیا جس کو ہندوستان نے خوب استعمال کیا۔ مشرقی پاکستانیوں کے عام شہریوں کے علاوہ عوامی لیگ کے منتخب اراکینِ اسمبلی کی کافی تعداد ہندوستان پہنچ گئی اور وہاں جا کر ان لوگوں نے بنگلہ دیش کی جلاوطن آزاد حکومت کا اعلان کر دیا۔ کولکتہ میں ایک بنگلہ دیش ریڈیو اسٹیشن قائم کر دیا گیا۔ جہاں سے عوامی لیگ کے نائب صدر اور جنرل سیکریٹری کے ہر روز بیانات نشر ہونے لگ گئے۔ ان لوگوں نے وہاں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کے لوگوں کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔ لوگوں کا حوصلہ بڑھانا شروع کر دیا۔ ان کو پیغام دیا کہ بنگلہ دیش کی آزادی کی مسلح فورس مکتی باہنی کا مشرقی پاکستان میں افواجِ پاکستان کے ساتھ جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام مکتی باہنی کا ساتھ دیں۔ اپنے گھروں کو مغربی پاکستان کی غاصب فوج کے خلاف مورچے بنا لیں۔ فتح ہماری ہوگی۔

اس طریقے کے ساتھ ہندوستان کی فوج کا عوامی لیگ کے جلاوطن رہنماؤں کے ذریعے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ساتھ مستقل رابطہ قائم ہو گیا۔ جبکہ ہندوستان کے اور عوامی لیگ کے

www.bhutto.org

جلاوطن رہنماؤں کے مقابلے میں افواجِ پاکستان کا مشرقی پاکستان میں ہوتے ہوئے بھی مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ساتھ کوئی سیاسی رابطہ یا ذہنی رابطہ نہیں تھا۔ فوجی حکمرانوں کا آہستہ آہستہ اقتدار اور اختیار سمٹتا جا رہا تھا۔ فوجی حکمرانوں کے براہِ راست مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں تھا۔ فوج کا مشرقی پاکستان میں صرف تھانوں کے ساتھ رابطہ تھا۔ یا تھانوں کے ذریعے لوگوں کے ساتھ رابطہ تھا جو وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بے حد کمزور پڑتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مقامی ٹاؤٹ جو فوجی حکمرانوں کو مقامی اطلاعات مہیا کرتے تھے وہ بھی بھاگنا شروع ہو چکے تھے۔ فوج کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ لوگوں کو ان کی زندگی کے تحفظ کا یقین فراہم کر سکتی۔ یا ان کو ہندوستان کی سازش سے آگاہ کر سکتی۔ فوج جب مشرقی پاکستان کے شہروں میں امن پیدا کرنے کے لئے فوجی گاڑیوں میں بندوقیں تان کر گشت کرتی تھی لوگوں کو گرفتار کرتی تھی۔ فوج کی اس طرح کی نقل و حرکت سے شہریوں کے دل میں فوج کے خلاف اور بھی نفرت پیدا ہو جاتی تھی۔ فوج کا ہر اقدام مشرقی پاکستان کے لوگوں کی نفرت میں اضافہ کرتا تھا۔ اس طرح تمام مشرقی پاکستان فوج کا دشمن بن گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی اور غیر بنگال کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ غیر بنگالی علاقوں میں لوگوں کا قتلِ عام جاری تھا۔ اس پر ستم ملاحظہ ہو کہ تقریباً دو سو کے قریب ایسے لوگوں کو گرفتار کر کے غائب کر دیا گیا جن کو ڈھاکہ میں دانشور تصور کیا جاتا تھا۔ ان دانشوروں کو اے۔ کے۔ نیازی کے حکم پر گرفتار کیا گیا تھا۔

فوج کے پاس آسان راستہ موجود تھا

پاکستان کے فوجی حکمران اگر پاکستان کے محبِ وطن تھے وہ اگر پاکستان کو ایک رکھنا چاہتے تھے تو ان کے پاس ایک آسان ترین راستہ تھا وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا وزیرِاعظم بنا دیتے۔ ان کو ڈھاکہ واپس لے جاتے۔ ان کو آزاد کر کے ڈھاکہ میں ان کی وزارتِ اعظمیٰ کا اعلان کر دیتے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا مطالبہ اگر چھ پوائنٹ تھا ان پوائنٹ کو وقتی طور پر تسلیم کر لیتے۔ کیا چھ پوائنٹ فوجی حکمرانوں کے لئے زیادہ شرمناک تھے یا ڈھاکہ ریس کورس میدان میں جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈالنا زیادہ شرمناک تھا۔ فوجی حکمرانوں کے پاس اس وقت بھی ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا موجود تھا۔ وہ اس طرح موجود تھا کہ مشرقی پاکستان کا لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن

فوج کے قبضے میں تھا۔شیخ مجیب الرحمٰن کی تمام تر لڑائی چھ پوائنٹ پر ہی تھی۔جب چھ پوائنٹ تسلیم کر لئے جاتے شیخ کو رہا کر دیا جاتا۔شیخ مجیب الرحمٰن ڈھاکہ ٹی۔وی پر آ کر اپنی قوم سے خطاب کرتا اور قوم کو ان کی فتح کا پیغام سنا کر ان کو پُر امن رہنے کا کہہ دیتا تو ہندوستان کی سازش کے غبارے سے ہوا نکل جاتی۔مکتی باہنی کا کام تمام ہو جاتا۔عوامی لیگ کو اقتدار منتقل ہو جانے سے لوگ معمول کی زندگی کی طرف آنا شروع ہو جاتے۔

ہمارے فوجی حکمرانوں نے اپنی اَنا کی خاطر پاکستان دو ٹکڑے کر دیا مگر شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار نہ دیا

کون کہہ سکتا ہے کہ فوجی حکمرانوں کے پاس مشرقی پاکستان کی خون آشام صورت حال سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں تھا۔ان کے پاس راستہ موجود تھا۔فوجی حکمرانوں نے جس طریقے کے ساتھ مشرقی پاکستان کے نورالامین کو وزیراعظم پاکستان بنا دیا تھا۔کیا وہ اسی طریقے کے ساتھ نورالامین کی بجائے خود شیخ مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا وزیراعظم نہیں بنا سکتے تھے۔

فوجی حکمران شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیراعظم پاکستان بنا سکتے تھے مگر انہوں نے اپنی اَنا اور اپنی طاقت کے فتور کی وجہ سے ایسا نہ کیا۔پاکستان کے فوجی حکمرانوں کی اَنا پاکستان کی سالمیت سے زیادہ بلند تھی۔ان کی طاقت اور ان کا غرور قومی سلامتی سے زیادہ بڑا تھا۔ایک بنگالی کو وزیراعظم پاکستان بنانا ان کی توہین کے مترادف تھا۔وہ مجیب الرحمٰن کو سلیوٹ مارنا اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے۔افسوس کہ فوجی حکمرانوں میں یا فوجی جرنیلوں میں ایک جرنیل بھی ایسا نہیں تھا جو اپنے ساتھی فوجی حکمرانوں کو مجیب الرحمٰن کو وزیراعظم بنانے کا مشورہ دیتا۔مجیب الرحمٰن کو اقتدار نہ دینے پر تمام جرنیلوں کا اتفاق تھا۔عین اس وقت بھی جب ڈھاکہ کی سرزمین پر ان کی فوجی راج کی کشتی ڈوبتی دکھائی دے رہی تھی۔اس وقت بھی وہ مشرقی پاکستان میں اپنے ایک ٹاؤٹ کو وزیراعظم پاکستان بنا رہے تھے۔مگر وہاں کے حقیقی لیڈر کو وزیراعظم بنانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

وہ اگر شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیراعظم بنا دیتے اور ان کی حکومت کا اعلان کر دیتے تو ہندوستان میں ہندوستان کے ایماء پر بنائی گئی بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کا خاتمہ ہو جاتا۔ہندوستان کسی صورت بھی مشرقی پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔

www.bhutto.org

مشرقی پاکستان میں اس کی مداخلت کرنے کا جواز ہی ختم ہو جاتا۔ افسوس کہ ان عقل کے اندھے جرنیلوں نے 93 ہزار افواجِ پاکستان کے جوانوں کے ساتھ ہندوستان کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذلت کو تو قبول کیا۔ مگر ایک بنگالی کو پاکستان کا وزیر اعظم بنانا برداشت نہ کیا۔

ترا اے کاش کہ مادر نہ زادے

قوم کی ذہنی حالت

اس وقت قوم کی ذہنی حالت نا قابلِ بیان ہے۔ پوری قوم ذہنی طور پر جنگ میں مبتلا تھی۔ ایک جنگ وہ ذہنی طور پر فوجی حکمرانوں کے خلاف اندرون ملک لڑ رہی تھی۔ دوسری جنگ وہ بھارت کی جارحیت کے خلاف لڑ رہی تھی۔ اس وقت کی قومی ذہنی صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے میری یہ نظم ہی بہت کافی ہے۔ نظم ملاحظہ فرمائیں۔

آج ہم طیش ہیں وحشت ہیں بہ میدانِ وفا

ہم نے ہر عہد میں انساں سے محبت کی ہے
ہم نے ہر عہد میں انصاف کیا ہے لوگو
ہم نے ہر عہد کو تہذیب کا زیور بخشا
ہم نے پیغام اخوت کا دیا ہے لوگو

○

ہم کہ وہ محسنِ انسان ہیں اس دنیا میں
جن کی تاریخ سے روشن ہے زمانے کا وجود
جن کے اوصاف سے پُرنور ہے بزمِ ہستی
جن کے کردار سے ہے رفعتِ دوراں مسعود

○

ہم وہ سُرخی ہیں رُخِ صبح پہ جس کی ضو سے
صحنِ گلشن میں گل و لالہ کا ہوتا ہے ظہور

www.bhutto.org

ہم وہ عرفان کے خورشید ہیں جن کے دم سے
آدمیت کو ملا دانش و حکمت کا شعور

ہم محبت کے مقامات پہ ہیں نکہتِ گل
اور نفرت کے لئے آگ کی دیواریں ہیں
دستِ شفقت کے لئے پھول ہیں صبحِ نو کے
گردنِ شر کے لئے امن کی تلواریں ہیں

صبرِ ایوب بھی ہیں جرأتِ شبیر بھی ہیں
شاخِ خوش رنگ بھی ہیں تیشہ و شمشیر بھی ہیں
دوستو کے لئے ہم نرم ہیں ریشم کی طرح
اور دشمن کے لئے نعرۂ تکبیر بھی ہیں

آج پھر کفر نے اسلام کو للکارا ہے
آج فرعون ہے موسیٰ کے مقابل آیا
آج پھر دشمنِ دیں ڈھاکہ کی جانب ہے بڑھا
آج میدان میں منہاس کا قاتل آیا

آج ہم طیش ہیں وحشت ہیں بہ میدانِ وفا
آج ہم اور ہی کچھ ہیں یہ خدا جانتا ہے
آج ہم کشتوں کے پشتوں پہ چلیں گے لوگو
آج یہ دل بھی کہاں اپنا کہا مانتا ہے

آؤ خشکی میں تمہیں نیست و نابود کریں
آؤ آؤ کہ تمہیں غرقِ سمندر کر دیں

www.bhutto.org

غیرتِ عشق کا فرمان ہے تاخیر نہ ہو
رزم گاہوں کے شب و روز کو محشر کر دیں

○

آج ہم قہرِ خدا بن کے ہوئے ہیں نازل
آج ہم غیض ہیں بے مہری قاتل کے لئے
آج ہم نکلے ہیں سینوں میں لئے عزمِ جہاد
دشمنِ دیں کے لئے قوتِ باطل کے لئے

○

آسماں نعرۂ تکبیر سے گونج اُٹھا ہے
اور زمیں لرزہ براندام ہے دیوانوں سے
ہم جہانگیر و جہاں ساز و جہاں کار رہے
یہ سبق سیکھئے توحید کے پروانوں سے

○

دشمنِ پاک وطن بچ کے نہیں جا سکتے
اب زمیں اُن کے لئے عرصہء محشر ہوگی
اب ہوا اُن کے تعاقب میں ہے بجلی کی طرح
ہر نظر ان کے لئے موت کا منظر ہوگی

○

آج ہم پھر سے کفن باندھ کے اپنے سر پر
اپنے اسلاف کی تاریخ کو دہرائیں گے
کود جائیں گے دہکتے ہوئے انگاروں میں
کوئی طوفان بھی ہو پار اُتر جائیں گے

○